The Spirit of Islam

روح اسلام

سیدّ امیر علی

بسم الله الرحمن الرحيم

روحِ اسلام

THE SPIRIT OF ISLAM

MAAB 1431
maablib.org

THE SPIRIT OF ISLAM

رُوحِ اسلام

سیّد امیر علی

ترجمہ: محمد ہادی حسین

الحمد پبلی کیشنز

راناچیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انارکلی) ۔ لیک روڈ۔ لاہور

☎ 37231490 - 37310944

ھماری کتابیں .....

خوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین واہتمام اشاعت

صفدر حسین

alhamd_publication@yahoo.com

ضابطہ:-

اشاعت	:	2011ء
مطبع	:	حاجی حنیف پرنٹرز لاہور
سرورق	:	شاہد مرزا
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	500 روپے

maablib.org

فہرست

پہلا حصہ

دیباچہ — سید امیر علی — ۷

مقدمہ — ۹

پہلا باب: محمد رسول اللہ ﷺ — ۷۱

دوسرا باب: ہجرت — ۱۱۸

تیسرا باب: رسول اللہ ﷺ مدینہ میں — ۱۲۹

چوتھا باب: قریش اور یہود کی دشمنی — ۱۳۵

پانچواں باب: قریش کا مدینہ پر حملہ — ۱۴۶

چھٹا باب: آنحضرت ﷺ کی رحم دلی — ۱۶۵

ساتواں باب: اشاعت اسلام — ۱۷۴

آٹھواں باب: عام الوفود — ۱۸۳

نواں باب: رسالت محمدی ﷺ کی تکمیل — ۱۹۱

دسواں باب: مسئلہ خلافت — ۲۰۶

دوسرا حصہ

پہلا باب: اسلام کا مثالی نصب العین ۲۱۹

دوسرا باب: اسلام کی مذہبی روح ۲۵۳

تیسرا باب: اسلام میں حیات بعد الممات کا تصور ۲۸۸

چوتھا باب: اسلام کا تبلیغی جہاد ۳۰۷

پانچواں باب: اسلام میں عورتوں کی حیثیت ۳۲۸

چھٹا باب: بندگی (غلامی) ۳٦۸

ساتواں باب: اسلام کی سیاسی رُوح ۳۷۹

آٹھواں باب: سیاسی فرقہ بندیاں ۴۰۴

نواں باب: اسلام ادبی و سیاسی رُوح ۴٦۴

دسواں باب: اسلام کی عقلیاتی اور فلسفیانہ رُوح ۵۱۱

گیارہواں باب: اسلام کی صوفیانہ اور مثالی رُوح ۵٦۴

دیباچہ

ذیل کے صفحات میں مَیں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ ایک عالمی مذہب کی حیثیت سے اسلام کی تاریخ پیش کروں اور یہ بیان کروں کہ وہ کتنی سُرعت سے دنیا میں پھیلا اور اس نے کیونکر ایک قلیل مدت میں کروڑوں انسانوں کے ضمیروں اور ذہنوں پر ایک حیرت انگیز غلبہ حاصل کر لیا۔ اسلام نے نوعِ انسانی کی نشو و نما کو جو فروغ بخشا اُس کا تو عام طور پر اعتراف کیا جاتا ہے۔ لیکن اس نے نوعِ انسانی کی حالت بہتر بنانے کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اُن میں یا تو تجاہل برتا جاتا ہے یا اُن کی کما حقہٗ قدر دانی نہیں کی جاتی۔ اسی طرح اس کی عقلی اساس اور اس کے مقاصد غائی کو پوری طرح سمجھا نہیں جاتا۔ میں نے اسلام کا جو تاریخی جائزہ پیش کیا ہے اس میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ تاریخ ادیان میں اس کا جو حقیقی مقام ہے اُسے واضح کروں۔ اسلام کی عقلی اساس اور اس کے مقاصد غائی کا جو مرقع میں نے کھینچا ہے وہ ہے تو بالکل سرسری لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو جو حال ہی میں واقع ہونے والے حادثۂ عظیمہ کی پیدا کی ہوئی کشمکشوں کے بعد کسی ایسے تعمیری نظام عقائد کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو نفسِ انسانی کو قرار بخش سکے۔ میری یہ بھی اُمید ہے کہ جو لوگ دین اسلام کے پیرو ہیں یہ جائزہ انہیں اپنے عقائد کی اساس کے سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے میں مدد دے گا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے سوانح حیات اور رسالت ﷺ کا جو خاکہ میں نے کھینچا ہے وہ کسی حد تک ابن ہشام کی سیرۃ الرسول ﷺ پر مبنی ہے، جس نے پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات کے قریباً دو سو سال بعد (۲۱۳ ہجری مطابق ۲۹۔۸۲۸ عیسوی میں) وفات پائی اور کسی حد

تک ابن الاثیر کی ضخیم تاریخ (الکامل) طبری کی تاریخ الامم والملوک، الحلبی کی انسان العیون (المعروف بہ سیرۃ الحلبیہ) اور دیگر کتابوں پر مبنی ہے۔ موجودہ ایڈیشن میں دو نئے ابواب کا اضافہ کیا گیا ہے، ایک امامت پر اور دوسرا اسلام کی مثالی اور صوفیانہ روح پر۔ مقدمے میں اور حصہ دوم کے دسویں باب میں بھی مزید مواد شامل کیا گیا ہے۔ میں اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اپنے محترم دوست کیمبرج کے پروفیسر ای جی براؤن کا، جن کا شمار مستشرقین کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے، شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے کتاب کے آخری باب پر ناقدانہ نظر ڈال کر مجھے اپنے بیش بہا مشوروں سے مستفید فرمایا۔ میں مسٹر محمد اقبال کا بھی، جو کیمبرج میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ریسرچ سکالر ہیں، ممنون ہوں کہ انہوں نے نہایت تن دہی سے کتاب کے پروف پڑھے اور اس کا اشاریہ بھی تیار کیا۔ اسی طرح میں مسز عبدالقیوم ملک کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے نئے ابواب کی عربی عبارات کو پرنٹر کے لیے نقل کیا اور قرآنی حوالوں کی تصدیق کی۔ میں اپنے پبلشروں کا بھی ممنون ہوں کہ ایسی کتاب کی طباعت میں جو دقتیں لازمی طور پر پیش آتی ہیں اُن کے باوجود وہ میرے ساتھ ہر وقت خوش خُلقی اور تحمل سے پیش آئے۔

کتاب مصروفیتوں کے ایک بے پناہ ہجوم کے درمیان چھپی ہے۔ اس بنا پر میں قارئین سے مستدعی ہوں کہ اگر کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں تو وہ براہِ کرم اُن سے چشم پوشی کریں۔

سید امیر علی

مقدمہ

اے کہ در ہیچ جانداری جا
بوالعجب ماندہ ام کہ ہر جائی

سنائی

کفرو دیں ہر دو درر ہت پویاں
وحدہٗ لاشریک لہ گویاں

سنائی

نوعِ انسانی کی دینی ترقی میں جو تسلسل پایا جاتا ہے وہ ایک ایسا موضوع ہے جو انسان کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے انتہائی دلچسپی رکھتا ہے۔ نفسِ انسانی کا تدریجاً ایک ہمہ گیر ذات، ایک محیط کائنات ارادے کو پہچاننا! اندھیرے میں بھٹکتے پھرنے کی جو زحمتیں کیا افراد اور کیا اقوام دونوں نے جھیلی ہیں، اس سے پیشتر کہ ان کے ذہنوں پر ایک ایسی رُوحِ مطلقہ کا تصور جلوہ گر ہوتا جو تمام موجودات میں جاری و ساری اور نظامِ فطرت کو قاعدہ و قانون کے سانچہ میں ڈھالنے والی ہے...... یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے نہایت معنی خیز سبق حاصل ہوتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا کہ جس عمل کے ذریعے نوعِ انسانی اشیائے مادی کی پرستش سے ترقی کر کے عبادتِ الٰہی تک پہنچی ہے وہ معرضِ تعویق میں پڑ گیا۔ اقوام اور افراد کثیر تعداد میں شاہرہِ ترقی سے منحرف ہو گئے اور اپنی خواہشات نفسانی کے غولِ راہ کا دھوکا کھا کر اپنے عہدِ طفولیت کے بتوں کی طرف لوٹ گئے جو محض اُن کے جذبات کے تراشے ہوئے مجسمے تھے لیکن خدا کی آواز، چاہے کوئی اُسے سنتا یا نہ سنتا، ہمیشہ دعوتِ حق دیتی رہی ہے اور وقت آنے پر اس کے بندگانِ خاص نے اُٹھ کر اعلان کیا ہے کہ انسان پر

دوسرے انسانوں کی طرف سے اور اس کے پیدا کرنے والے کی طرف سے کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ یہ بندگان خاص خدا کے حقیقی پیغمبر تھے۔ وہ اپنی قوموں میں اپنے وقت کی پکار بن کر آئے، جس میں سچائی، پاکبازی اور انصاف کے وہ تمام ولولے تڑپ رہے تھے جو روحِ انسانی میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے کے روحانی تقاضوں کا ترجمان تھا۔ ہر ایک اس لیے آیا کہ ایک گری ہوئی قوم کو سدھارے، نکھارے اور اُبھارے اور ایک بگڑی ہوئی مملکت کو بنائے۔ بعض ایک محدود تمدن کی تعلیم دینے کے لیے آئے، جو ایک چھوٹے سے دائرے کے اندر محصور رہا۔ دوسرے ایک عالمگیر پیغام لے آئے، ایک ایسا پیغام جو کسی ایک نسل یا قوم کے لیے نہ تھا۔ بلکہ ساری نوعِ بشر کے لیے۔ محمد ﷺ کا شمار موخرالذکر زمرے میں ہوتا ہے۔ آپ کا پیغام صرف عربوں کے لیے نہ تھا۔ آپ صرف ایک زمانے یا ملک کے لیے مبعوث نہ ہوئے تھے، بلکہ سارے بنی آدم کے لیے، اس دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جتنے بندگانِ خدا ہیں اُن سب کے لیے۔ اس معلمِ اعظم کا ظہور، جس کے سوانح حیات اس کی بعثت کے لمحے سے لے کر اخیر تک مصدقہ طور پر قلم بند ہو چکے ہیں، محض ایک اتفاقی حادثہ یا تاریخ عالم کے حاشیے پر لکھا ہوا ایک غیر متعلق اور ضمنی واقعہ نہ تھا۔ وہ اسباب، وہ زبان حال سے پکارتی ہوئی خرابیاں ساری کائنات میں جاری و ساری ایک قدرتِ مطلقہ پر یقینِ محکم پیدا کرنے کے وہ اندرونی داعیے جو قیصر آگسٹس کے زمانے میں گلیلی کے کنارے ایک ایسے پیغمبر کو وجود میں لائے تھے جس کی زندگی ایک المیہ تھی، وہی ساتویں صدی عیسوی میں دوبارہ بروئے کار آئے، اور اب کی بار پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ۔ جیسا کہ بجا طور پر کہا گیا ہے، ساتویں صدی عیسوی کا آغاز قومی، معاشرتی اور مذہبی انتشار کا زمانہ تھا۔ اس میں جو مظاہر رونما ہوئے وہ ویسے ہی تھے جیسے مثبت ایمان و ایقان کے کسی نئی صورت میں جلوہ گر ہونے کا باعث بنتے ہیں، تاکہ آوارہ و سرگرداں قوتوں کو مذہبی ارتقا کے اس ناگزیر راستے پر لایا جائے جس کی منزلِ مقصود ذاتی عبادت کی تکمیل و تنظیم ہے۔ یہ تمام مظاہر اس پر دلالت کر رہے تھے کہ یہودیت یا عیسائیت نے خدا کی مملکت کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس سے کہیں زیادہ مربوط مرقع کا صورت پذیر کیا جانا

ضروری تھا۔ زرتشت، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ نے جو شمع روشن کی تھی اس کی لو انسانی خون کے چھینٹوں سے بجھائی جا چکی تھی۔ ایک بگڑی ہوئی زرتشتیت نے اور ایک اُس سے بھی زیادہ بگڑی ہوئی عیسائیت نے جو ایک دوسرے سے برسر پیکار تھیں، انسانی ضمیر کی ناطقہ بندی کر رکھی تھی اور کرۂ ارض کے بعض شاداں ترین خطوں کو لہو کی ندیوں کا سنگم بنا رکھا تھا۔ بالادستی کی خاطر مسلسل رزم آرائیوں، دائمی خانہ جنگیوں اور مذہبوں اور فرقوں کی لگاتار چپقلشوں نے قوموں کا خونِ زندگی نچوڑ لیا تھا اور روئے زمین کے باشندے جو ایک بے جان مشائخ پرستی کی آہنی ایڑیوں سے کچلے جا رہے تھے، خدا سے اپنے آقاؤں کے مظالم کی فریاد کر رہے تھے، دنیا کی تاریخ میں ایک نجات دہندہ کی اس سے زیادہ ضرورت کبھی لاحق نہ ہوئی تھی اور نہ کبھی اس کے ظہور کے لیے اس سے موزوں تر وقت آیا تھا۔ چنانچہ محمد ﷺ نے دنیائے اخلاق میں جو کچھ کر دکھایا اس کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کی خاطر ضروری ہے کہ اسلام سے پہلے اور طلوعِ اسلام کے وقت اقوامِ عالم کے جو مذہبی اور معاشرتی حالات تھے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

باختر (Bactria) کی سطح مرتفع، جسے عرب جغرافیہ دانوں نے اُم البلاد کا موزوں نام دیا ہے، نوعِ انسانی کا گہوارہ، مذہبوں اور قوموں کا مرزبوم خیال کی جاتی ہے۔ نوعِ بشر کے بچپن پر تقابلی علم الاقوام جو مدہم سی روشنی ڈالتا ہے وہ روشنی ہمیں نسلِ انسانی کے اس ابتدائی مسکن میں خاندانوں کے چند در چند گروہ دکھاتی ہے، جو رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے ناطے جوڑ کر جرگوں اور قبیلوں کی شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ کے تحت موج در موج باہر نکل کر زمین کے مختلف خطوں کو آباد کرتے ہیں۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اس قدیم وطن کو خیر باد کہا۔ وہ غالباً حامی (Hamitic) نسل کے لوگ تھے۔ ان کے بعد جو لوگ نکلے وہ تورانی تھے یا، جیسا کہ انہیں کبھی کبھی ملقب کیا جاتا ہے، اگرو فنی (Ugro-Finnish) نسل کے لوگ، جو یافثی (Japhetic) خاندان کی ایک شاخ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض شمال کی طرف گئے اور پھر مشرق میں پھیل کر نوعِ انسانی کی موجودہ منگولی (Mongolian) شاخ کے مورثِ اعلیٰ بنے۔ ایک اور شاخ مغرب کی طرف چل نکلی اور آذر بائیجان، ہمدان اور گیلان میں آباد ہو گئی۔ جو بحیرۂ

خزر کے جنوب اور جنوب مغرب میں ہیں اور تاریخ قدیم ماد (Media) کے نام سے نسبتاً زیادہ معروف ہیں۔ اس شاخ کے ایک حصے نے کچھ مدت کے بعد سرزمین کے زرخیز میدانوں میں جا کر اپنے سے پہلے کی حامی نو آبادیوں کو مسخر کیا اور رفتہ رفتہ اُن میں مل جُل کر اکاذی (Accadian) قوم کی شکل اختیار کی جسے یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں میں کوشتی (Kushite) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس مخلوط نسل نے بابل کی بنیاد ڈالی اور ایک ایسا مذہب ایجاد کیا جو اپنی بلند سطحوں پر فطرت پرستانہ وحدت الوجودیت سے مشابہ تھا۔ لیکن زیریں سطحوں پر اس میں ہمہ دیوات (Pon Dacmonism) کا عقیدہ تھا اور سورج دیوتاؤں اور چاند دیوتاؤں کی پوجا تھی۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ لنگ پوجا تھی، جنسی خواہشوں کی تسکین کرنے والی رسمیں تھیں، بعل (Moloch) اور دیوتاؤں پر بچوں کی قربانیاں تھیں، بلتیس Beltis اور اشتورت (Ashtoriath) دیویوں پر کنوار پن کی بھینٹ چڑھانے کی ریت تھی۔ چنانچہ بابل کا مذہب ایک ایسے معاشرے کا مذہب تھا جس میں ایک طرف تو اعلیٰ درجے کی مادی ترقی تھی اور دوسری طرف پرلے درجے کی نفسانیت پرستی اور خون آشامی، جسے مذہب کی سندِ قبول حاصل تھی۔

اس کے بعد جس شاخ نے اُم البلاد سے کوچ کیا وہ سامی (Semitic) نسل تھی، سامی بھی تورانیوں کے نقشِ قدم پر چل کر مغرب کی طرف گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ بین النہرین (Mesopotamia) کے ڈیلٹے کے شمالی حصے میں آباد ہو گئے۔ بہت جلد انہوں نے تعداد اور قوت میں ترقی کر کے بابل کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس کی جگہ ایک وسیع سلطنت قائم کی، جس کا سکہ تمام ہمسایہ ملکوں میں چلتا تھا۔ مغربی ایشیا کے دو بڑے دریاؤں کے درمیان اشوریوں (Asoyrians) نے جو دارالحکومت بنایا اس میں جو مذہب رائج تھا وہ کبھی کبھی ایک مثبت تصورِ توحید کی بلندی تک جا پہنچتا تھا۔ ان کے یہاں جو ساوی سلسلہ مراتب تھا اس میں ایک افضل و اعلیٰ ہستی کے صریح اعتراف کے نشان ملتے ہیں۔

اِدھر ڈیلٹے کے شمالی حصے میں سامی نو آبادکاروں کی بڑی جماعت ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی، اُدھر سامیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ اُر (UR) کے علاقے میں داخل ہو گیا، جو کلدانی سلطنت کے زیرِ نگیں تھا۔ اس قبیلے کا شیخ، جس کی خود اختیاری جلاوطنی اور

بادیہ گردی بہت سے مذہبوں کے قصوں کا مضمون بن گئی ہے، مستقبل کے تاریخ آفرینوں کا جدِ امجد بنا۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ یافثی شاخ دوسری تمام شاخوں کے چلے جانے کے بعد بھی اپنے اصلی وطن میں مقیم رہی۔ جس زمانے میں دوسری شاخیں اپنے اصلی تنے سے جدا ہو کر سلطنتیں قائم اور مذاہب ایجاد کر رہی تھیں۔ اُسی زمانے میں یافثی شاخ اپنے طور پر نشوونما پا رہی تھی۔ لیکن قوموں کی جادہ پیمائی جب ایک بار شروع ہو گئی تو پھر کہاں تھمتی تھی؟ یافثی قبیلے کے بعد دیگرے مغرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ نہ جانے اس فطری بے چینی کے باعث جو وحشی قوموں کو ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتی یا اس وجہ سے کہ ان کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کی اصلی سرزمین ان کے راعیانہ مشاغل کے لیے ناکافی ہو گئی تھی۔ جو لوگ سب سے پہلے نکلے ان میں پلیسجین (The Pelasgians) اور کلٹ (The Celts) تھے۔ ان کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی کوسِ رحلت بجایا تا آنکہ بالآخر صرف خالص آریہ لوگ اپنے قدیم مسکن میں باقی رہ گئے۔ ان کا ایک گروہ بدخشاں کے نزدیک آباد تھا اور دوسرا بلخ کے نزدیک، جہاں وہ ہمسایہ قوموں سے الگ تھلگ اور ان کے جنگ وجدل اور نقل وحرکت سے کوئی سروکار رکھے بغیر صدیوں تک بودوباش کرتے رہے۔ تاریخ کی جو روشنی سلطنتوں اور تہذیبوں کی بنیاد رکھنے والی مغربی نسلوں پر پڑتی ہے وہ زمین کے ان قدیم باشندوں کا ایک دھندلا سا نقشہ بھی ہمیں دکھاتی ہے، جس میں ان کے بہت سے قبیلے اس سطح مرتفع پر رہتے سہتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مکمل وحشت سے ترقی کر کے نیم وحشت کے درجے تک پہنچے ہیں اور ایک عالمگیر مجرد ذات کا مبہم سا احساس ان کے ذہنوں میں شکل پذیر ہو رہا ہے۔ اب تک وہ خوف کے مارے لرزہ براندام ہو کر جن اشیائے فطری کی پرستش کرتے رہے تھے ان کی جگہ لاتعداد خیالی ہستیاں لے رہی ہیں۔ بعض قبیلوں کے یہاں مجرد شخصیتوں کا یہ لشکر دو جامع اصولوں کا تابع فرمان ہے، یعنی نور

---

[1] عربی روایتوں میں حضرت ابراہیم کے باپ کا نام آذر بیان کیا گیا ہے جو صریحاً اشور کی ایک دوسری صورت ہے آذر کے بنائے ہوئے خوبصورت بتوں کا ذکر اسلامی ادب میں اکثر آتا ہے۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اشوری النسل تھے۔

اور ظلمت۔ زندگی اور روشنی کا نقیب آفتاب ایک واحد خدائے رحیم کی علامت بن جاتا ہے جس کی قوت ابھی مزاحمتوں سے دوچار ہے، لیکن آخر الامر اپنے مخالف اصول، یعنی ظلمت اور شر پر غالب آجائے گی۔ دوسرے قبیلوں کے ہاں یہ صورتِ حال ہے کہ وہ اپنے معبود بُوں کو جن خیالی ہستیوں کا جامہ پہنا رہے ہیں وہ خیالی ہستیاں ایک دوسری میں مدغم ہو رہی ہیں۔ کبھی تو وہ جدا جدا شخصیتیں بن کر سامنے آتی ہیں اور کبھی یکجا ہو کر ذی حیات مادے کی ایک وحدت بن جاتی ہیں۔ دھند کے بادل رفتہ رفتہ چھٹ جاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ شعوب وقبائل بادشاہیوں میں تبدیل ہوگئے ہیں، زراعت نے آہستہ آہستہ راعیانہ مشاغل کی جگہ لے لی ہے، دھاتوں کا استعمال رائج ہو رہا ہے۔ اور ان سب سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ ایک افضل واعلیٰ شخصیت کا بلند تر تصور ذہنوں کے بند دریچے کھول کر بزور داخل ہو رہا ہے۔ کیومرس، ہوشنگ اور دوسرے شاہانِ پاکستان جن کے گیت ایک حیرت انگیز قادر الکلامی سے فردوسی نے گائے ہیں، ایک روبہ ترقی تہذیب کے اولین نشان بردار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں آریوں کے یہاں بادشاہی کا آغاز ہوا، اسی زمانے کے لگ بھگ آریائی خاندان کی دو شاخوں میں وہ مذہبی تنازعہ رونما ہوا جس کے نتیجے میں مشرقی شاخ اپنے مرز بوم سے جلاوطن ہوگئی۔ مغربی آریوں میں ایک معلم نے، جو اپنے مذہب کی کتابوں میں ستانہ زرتشت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایک زبردست انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس تحریک نے جو شدید مذہبی کش مکش پیدا کی اُس کے نشان اُن تبروں میں ملتے ہیں جو ویدوں کے بھجنوں میں مشرقی آریوں کی نسل و مذہب کے دشمن ''جو دشتی'' پر بھیجے گئے ہیں۔ اصلاح شدہ مذہب کے بارے میں ان بھجنوں کے لکھنے والوں کا جو ذہنی زاویہ تھا وہ ناموں کے غیر معمولی توارد سے بھی بڑھ کر اس امر کا قوی ترین ثبوت ہے کہ یہ مذہبی اختلاف ہی خالص آریوں کی دو شاخوں کے علیحدہ ہو جانے کا فوری اور بلا واسطہ سبب تھا۔ اس مذہبی جنگ میں، جو غالباً انسانی تاریخ کی پہلی مذہبی جنگ تھی، مغربی آریوں کے ثنویت مسلک (Dualist) قبیلے اپنے مشرقی بھائیوں کو، جن کا مذہب تعدادِ ارباب (Polytheism) اور وحدت الوجود (Pantheism) کی ایک معجونِ مرکب تھا پریمیساد (Paropamisadae) کی سرحدوں سے

باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ مشرقی آریہ ہندوستان پر ٹوٹ پڑے، جہاں انہوں نے اصلی سیاہ فام باشندوں کو اپنی آبادیوں سے نکال باہر کیا یا قتل کر دیا یا غلام بنا لیا۔ اور انہیں ہمیشہ اپنے سے کمتر ہستیاں، یعنی داس اور شودر سمجھتے رہے۔ بہر حال ویدوں کے مذہب اور زرتشتی مذہب میں جو اختلاف تھا وہ محض اضافی تھا۔ زرتشتیت مظاہر کی بجائے ان کے سبب کی پرستش کرتی تھی۔ جہاں تک ویدوں کے دیوتاؤں کا تعلق تھا، اس نے انہیں دیووں کا جامہ پہنا دیا اور دیو پرستوں کو کافر قرار دیا۔ ویدوں کے بھجن لکھنے والوں نے اس کے جواب میں اوستا کے خدا ہورا کو ایک خبیث دیوتا اور دیوتاؤں کا دشمن کہا اور ''جردشتی'' پر دل کھول کو سب وشتم کی بوچھاڑ کی۔

پہلا زرتشت کہاں اور کس زمانے میں ہوا۔ یہ پردۂ لاعلمی میں مستور ہے۔ بہر حال داریوش ہستاسپ کے عہد میں اسی نام کا ایک اور معلم گزرا، جس نے پرانی تعلیمات کی تجدید تدوین اور توسیع کی۔

اگر ہم ایک قدم پیچھے ہٹ کر نگاہ ڈالیں تو ہمیں ہندوستان میں آریائی فتوحات کا سیلاب صدیوں تک مشرق اور جنوب کی سمت بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ آریائی مذہب جو حملہ آور اپنے قدیم وطن سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ زیادہ تر دو چیزوں پر مشتمل تھا۔ یعنی اجداد کی ارواح کی پرستش اور مرئی مظاہر میں مجسم قوائے فطری کی پرستش۔ پنجاب میں روحانی تصور نے مزید نشوونما پائی۔ ویدوں میں ہمیں ترقی کا کارواں آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے، تا آنکہ ہم اُپنشدوں میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات کو اپنے اوجِ کمال پر پہنچا ہوا دیکھتے ہیں۔ اُپنشدوں میں روحانی ولولہ اس شدت سے ہے کہ وہ بلند ترین وحدانیت کے قریب جا پہنچتا ہے۔ اُپنشد نہ صرف خدا کے نفوذِ مطلق سے بحث کرتے ہیں، جو ایک ایسا تصور ہے جس نے بعد کے زمانوں میں مادی وحدت الوجود کی صورت اختیار کر لی، بلکہ یہ تعلیم بھی دیتے ہیں کہ روحِ مطلق پرم آتما، تمام موجودات کی محافظ اور ساری کائنات کی حاکم ہے، وہ انسانوں کے دلوں میں رہتی ہے اور آخر الامر انفرادی روحوں کو لا متناہیت میں یوں جذب کر لیتی ہے جیسے سمندر دریاؤں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ جب یہ انجذاب ہو جاتا ہے، تو انسانی روح پر کالبدِ خاکی میں جو تجربات گزرے ہوتے ہیں

وہ ان سب کا شعور کھو دیتی ہے لیکن انسانی ترقی کی ان دلچسپ دستاویزوں میں بلا شک و شبہ روحانی انحطاط کے جراثیم موجود تھے جنہوں نے بہت جلد ارتقا کے عمل کا رخ پلٹا دیا۔ چنانچہ مزید عروج کی بجائے ہمیں مسلسل تنزل دکھائی دیتا ہے۔ اُپنشدوں کا مقام پُران حاصل کر لیتے ہیں اور پھر تنتروں کا طریقِ پرستش پرانوں کو اس مقام سے ہٹا دیتا ہے۔

اُپنشدوں میں جو خیال بار بار دہرایا گیا ہے کہ پرم آتما مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اسی سے اوتاروں کا تصور پیدا ہوا جس طرح مغربی غیر اہلِ کتاب کا فلسفۂ کائنات نفسِ عامہ کی اس زبردست خواہش کی تسکین نہ کر سکا کہ اسے ایک ایسا شخصی خدا مل جائے جو انسانوں میں رہ چکا ہو اور اُن کے ساتھ آئے دن کا میل جول رکھ چکا ہو، اسی طرح اُپنشدوں کے موحدانہ دلولے ہندوستان کے عوام کو جذباتی تشفی بہم نہ پہنچا سکے۔ چنانچہ انہوں نے بہت جلد کشتری جاتی سے ایک ہیرو دیوتا ڈھونڈ نکالا، جس کے متعلق تھوڑی مدت کے بعد یہ عقیدہ رائج ہو گیا کہ وہ بنفسہٖ پرماتما تھا اور پرمیشور کا اوتار بن کر اس سنسار میں زندگی بسر کرنے آیا تھا۔

کرشن بھگتی کو اپنی حریف کالی پوجا کی طرح جو عام مقبولیت حاصل ہوئی وہ نہ صرف اس امر کی پرزور شہادت دیتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان کیسی مذہبی ابتری میں مبتلا تھا بلکہ اس وسیع خلیج کو بھی نمایاں کرتی ہے جو اُپنشدوں اور بھگوت گیتا[۱] کے لکھنے والے فلسفیوں کے ذہنوں اور عوام کے خیالات و جذبات کے درمیان حائل تھی۔ یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے جسے صحیح معنوں میں ہندوستان یا آریہ ورت کہا جاتا ہے، اُن آریوں نے جو پنجاب میں آباد تھے یا ان کے پروہتوں اور مذہبی معلموں نے بہت سخت قاعدے وضع کیے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ آریاؤں نے اپنے طول طویل فاتحانہ کوچ کے دوران جن قوموں کو مطیع و منقاد بنایا تھا ان میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔ ان قوموں کو سماج کے اسفل ترین طبقے میں جگہ دی گئی، اُن کو اچھوت قرار دیا گیا اور جو مذہبی رسومات اُونچی ذاتوں کے لیے مقرر تھیں وہ اُن کے

[۱] زمانۂ حال کا ایک مصنف کہتا ہے کہ بھگوت گیتا میں بیشک وحدانیت کے نشان پائے جاتے ہیں لیکن وہ غیر موحدانہ عناصر کے ساتھ مخلوط ہیں۔

لیے سختی سے ممنوع کر دی گئیں۔

وحدت الوجود کے موضوع پر آریائی ہندو فکر میں جو مدو جزر آئے ہیں اُن سب کے دوران ارواح، اسلاف کی پرستش مذہبی و معاشرتی نظام کا ایک لازمی جزو بن کر ہندوؤں کے ذہنوں میں جمی رہی ہے۔ یوں تو شودروں کو بھی اجازت تھی کہ اپنے آباؤ اجداد کی ارواح پر چڑھاوے چڑھائیں، لیکن اگر کوئی برہمن ان کی پوجا میں شریک ہوتا تو اُسے بڑی سنگین سزا دی جاتی۔ اگر کوئی شودر اتفاقاً کسی برہمن کو منتر پڑھتے ہوئے سن پاتا تو اس کے لیے یہ سزا مقرر تھی کہ اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے۔ اگر وہ کسی برہمن کے برابر چوکی پر بیٹھ جاتا تو اس کے بدن کو گرم لوہے سے داغ دیا جاتا۔ شودروں اور تین اونچی جاتیوں کے لوگوں کی آپس میں شادیاں انتہائی بیرحمانہ سزاؤں کی مستوجب اور قطعاً ممنوع تھیں۔ لیکن اس قسم کی قانونی پابندیاں بھی آریاؤں کے مذہبی افکار و عبادات کو اصلی باشندوں کے عقائد کا اثر قبول کرنے سے نہ روک سکیں۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ غیر آریہ قوموں اور قبیلوں کے دیوتا ہندوؤں کی دیو مالا میں داخل ہو گئے اور ان کی پوجا ہندوؤں کی آئے دن کی رسموں میں شامل ہو گئی۔ بھانت بھانت کے پختہ اور خام، نئے اور پرانے عقیدوں کے گڈ مڈ ہو جانے کا نتیجہ ناگزیر طور پر یہ ہوا کہ فلاسفہ صدیوں سے جس پیچیدہ اور دقیق وحدت الوجودی نظامِ خیال کے ارتقا میں مصروف تھے اس میں ابتذال آ گیا۔

جب تک تابعینِ اسلام نے وہ پردہ نہ اٹھایا جس کے پیچھے ہندوستان ہزاروں سالوں سے ایک پراسرار زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس وقت تک ہندوستان کی کوئی تاریخ نہ تھی۔ یہ کہنا ممکن ہے کہ واسودیو کرشن کس زمانے میں گزرا یا اس کی شخصیت کیسی تھی۔ اس کے بارے میں ان گنت کہانیاں ہیں، جو بے سروپا اور لچر معلوم ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کہانیاں پروہتوں نے گھڑیں، جو دیوتاؤں سے اُونچے نہیں تو ان کے ہمسر ضرور بن گئے تھے اور جن کا فائدہ اس میں تھا کہ عوام کے دلوں کو لبھائے اور رجھائے رکھیں۔ واسودیو کرشن کو ہندو دیو مالا میں وشنو کے اوتار کا مقام حاصل ہے اور اس حیثیت سے وہ بھگوت گیتا کے اس حصے کی جو بھگتی سے تعلق رکھتا ہے مرکزی شخصیت ہے۔ وہ بدیہی طور پر ایک

جامع شخصیات دیوتا ہے۔ اس کی ایک شخصیت وہ منش دیوتا، وہ رنگیلا کنہیا ہے جو گوکل کے گوالوں میں رہتا تھا اور براندابن کے مشہور کنجوں میں اپنی ہمجولیوں کے ساتھ لیلا رچا کر اپنا جی بہلاتا تھا۔[1]

واسودیو کرشن کے مسلک کا بنیادی رکن یہ تھا کہ پورا پورا دھرم یعنی ایمان مکتی یعنی نجات کی کنجی ہے جو کوئی وشنو کے اس اوتار پر ایمان لے آتا اس کے اعمال چاہے کیسے ہی ہوتے اسے ابدی سعادت کا نصیب ہونا یقینی تھا۔

اس کامل ایمان کے نظریے نے بعض ایسی رسومات اور عقائد کو جنم دیا جو اب تک ہندوستان میں رائج ہیں۔ چونکہ پارسائی اس پر مشتمل سمجھی جاتی تھی کہ کرشن کو پرماتما سمجھ کر اپنے من میں بسا لیا جائے اور پھر اپنے من سے پوری پوری لو لگالی جائے، اس لیے عام لوگ براگ اور سنیاس کو مہاپُن تصور کرنے لگے۔ آنکھیں اپنے بدن کے کسی ایک حصے پر جما کر اور من کو کرشن جی سے لگا کر سالہا سال تک جنگل میں بیٹھے رہنا، برسوں تک ایک ٹانگ پر کھڑے رہنا، بدن میں آنکڑے گڑوا کر ادھر ادھر گھسٹتے پھرنا، یہ سب ایسے کام تھے جو سب پاپ دھوڈالتے تھے۔ اگر کسی شخص کو کسی گناہ کا کفارہ دینا یا کوئی منت ماننا منظور ہوتا تو وہ کسی آدمی کو کچھ دان دے کر اس کام پر لگا دیتا کہ وہ اُس کے گھر سے دیوتا کے مندر تک کا راستہ اپنے بدن کی لمبائی سے ماپتا ہوا چلا جائے۔ بھگوت گیتا کا پورے دھیان کے ساتھ پاٹھ کرنے سے یا گنگا جل میں اشنان کرنے سے ساری برائیاں، دوش اور پاپ دُھل جاتے تھے۔

شکتی پوجا نے بہت سے ہندوؤں کے دلوں پر سکہ جما رکھا ہے وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ یہ سکہ اس نے کب جمایا۔ شکتی ہر ہندو دیوتا کا نسوانی نصف اور فعال تخلیقی پہلو ہے۔ شوجی کی شکتی یا استری وہ بھیانک دیوی ہے جو پاربتی، بھوانی، کالی، مہا کالی،

---

[1] سری کرشن کو عموماً گوپال کرشن (یعنی کرشن گوالا) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی ہمجولیوں کو گوپیاں (یعنی گوالنیں) کہا جاتا ہے۔ اہیروں، یعنی شمالی ہند کے گوالوں، کے اس سورما دیوتا کے بارے میں بہت سی پر لطف کہانیاں مشہور ہیں۔ بعض لوگوں نے اُسے ہندوؤں کے اپالو (Apollo) کا لقب دیا ہے لیکن یہ لقب کچھ پھبتا نہیں۔

maablib.org

درگا، چمندا، اوردوسرے ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ اس دیوی کی پوجا جیسے کہ وہ بھوابھوتی کے ڈرامے میں، جو غالباً ساتویں صدی عیسوی میں لکھا گیا، بیان کی گئی ہے، انسانی قربانیوں اور دوسری انسانیت سوز رسموں کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اُسے چاہے کسی نام سے پکارا جائے اور اس کی پوجا چاہے کسی طریقے سے کی جائے، اس میں عیسائی مذہب کی ''مادرِ غمخوار'' (mater dolorosa) کی سی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ اسکندریہ کے پجاری آئی سس (Isis) دیوی کی طرف جو انسانی رحم اور انسانی دکھ درد سے ہمدردی منسوب کرتے تھے اس کا بھی شائبہ تک ہندوؤں کی اس خوفناک دیوی میں موجود نہیں۔ یہ ہیبت ناک بلکہ دہشت انگیز تصور جو تنزل پذیر مذہبی نفوس کی پیداوار ہے، صریحاً غیر آریہ قوموں سے مستعار لیا گیا اور یہ ایک ایسا تصور ہے جس کی کوئی نظیر دنیا کے غیر اہلِ کتاب مذاہب میں نہیں ملتی۔ اور تو اور سبلی (Cybel) یعنی اہلِ رُوما کی مادرِ کبریٰ (Magna mosex) بھی اتنی بے رحم اور انسانوں کو دکھ پہنچانے کی اتنی شائق نہ تھی جتنی تباہی کے دیوتا شو کی شکتی تھی۔ اس دیوی کی پوجا تنتروں کی رسومات کے مطابق کی جاتی ہے جو گویا شکتی دھرم کی بائبل ہیں۔ تنتروں کے بہت سے بھجن بھگتی اور سادھنا سے بھرے ہوئے ہیں اور دیوی سے جو پرارتھنائیں کی گئی ہیں ان میں اکثر اس سے دیا اور کرپا کی بھیک مانگی گئی ہے، لیکن فلسفیوں کے لیے تنتروں میں خواہ کیسے ہی صوفیانہ معانی ہوں، عام لوگ ان کی بتائی ہوئی پوجا پر لغو اً عمل کرتے ہیں۔[1]

ہندوؤں کے دو بڑے حماسوں سے، جن میں سے ایک پانڈوؤں اور کوروؤں کی لڑائی اور دوسرا لنکا کے راجہ راون کے ہاتھوں سیتا کے اغوا کی کہانی بیان کرتا ہے، ہمیں کافی وضاحت کے ساتھ پتہ چل جاتا ہے کہ اس زمانے میں کس قسم کے مذہبی عقیدے اور طریقے عوام میں رائج تھے۔ دونوں حماسوں میں ایک خاصے ارتقا یافتہ معاشرے کا نقشہ

[1] تنتری پجاریوں کے دو بڑے بڑے گروہ ہیں: دکھنا چاری اور برہمچاری، یعنی دائیں ہاتھ کی اور بائیں ہاتھ کی رِیتوں پر عمل کرنے والے دکھنا چاریوں کی پوجا کھلے طور پر ہوتی ہے اور اس میں دوسری دیویوں، مثلاً وشنو دیوتا کی شکتی لکشمی یا مہالکشمی سے بھی خطاب کیا جاتا ہے۔ برہمچاری کی پوجا میں، جسے خاص طور پر تنتریکا کہا جاتا ہے، کالی دیوی بلا شرکت غیرے معبود ہوتی ہے۔ یہ پوجا تنہائی میں کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں بہت سی ناپاک رسمیں ہوتی ہیں۔ سارے ہندوستان میں برہمچاری پنتھ کے پیرو بڑی اور اس کی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

کھینچا گیا ہے، جس میں کافی مادی ترقی ہو چکی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ اخلاقی انحطاط بھی بہت بڑھ چکا تھا۔ چنانچہ بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کے خروج سے بہت مدت پہلے ہندوستان کے عوام میں مذہبی عبادت محض بلیدانوں اور چڑھاووں کا ایک رسمی مجموعہ بن کر رہ گئی تھی، جس میں ثواب کا معیار پوجا کرنے والے کی نیکی یا پرہیز گاری نہیں بلکہ پروہت (جس کے بغیر ان رسموں کا ادا کرنا سرے سے ممکن ہی نہ تھا) کی یہ صلاحیت ہوتی تھی کہ وہ مناسب جنتر منتر پڑھ کر دیوتا کو دعا قبول کرنے پر مجبور کر سکے۔ گوتم بدھ اور مہابیر نے جو بغاوت کی وہ خودغرض پروہتوں کے اقتدار کے خلاف ہندوؤں کے دل سے اُٹھنے والی ایک آواز تھی۔ دونوں مذہبی پیشوا اس کے منکر ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے یا اس پر کوئی ایسی عقلِ کل حکمراں ہے جو اس کا نظام چلا رہی ہے، لیکن دونوں یہ اعلان کرتے ہیں کہ انفرادی زندگی بالآخر معدوم ہو جائے گی اور دونوں یہ کہتے ہیں کہ یہ نیک انجام صرف اچھے کاموں کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان میں ایک فرق ہے۔ جین مت تو ہندومت سے وابستہ رہا ہے اور اب عملی طور پر برہمنوں کے مذہب کا ایک فرقہ بن گیا ہے۔ لیکن بدھ مت نے جرأت سے کام لے کر ایک نئی روش کی داغ بیل ڈالی اور اس پر چل نکلا۔ اس نے کرم یعنی عمل کو مکتی کا واحد وسیلہ قرار دیا اور اس کے جلیل المرتبت بانی نے عمر بھر عمل کے میدان میں جدوجہد کی۔ موت کے بعد انسان کی تقدیر کے بارے میں بدھ مت کا جو تصور تھا وہ برہمنی نظریوں کی عین ضد تھا اور اس کا سرّی تصوف بہت جلد دوسرے مذاہب میں سرایت کر گیا۔ لیکن اپنی جنم بھومی میں ایک مختصر مگر شاندار زندگی بسر کرنے کے بعد بدھ مت انتہائی مصائب سے دوچار ہوا۔ ظفر مند برہمن دھرم نے اُسے جو سنگین سزائیں دیں اُن کی روداد جنوبی ہندوستان کے مندروں کی دیواروں پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) بے شمار شاخیں ہیں۔ درگا پوجا میں، جو عموماً اگست کے مہینے میں منائی جاتی ہے، درگا کی مورتی کو سنگھاسن پر بٹھا کر جلوس نکالے جاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں اس مورتی کو ہلدیا رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ بنگال میں اس کی مورتی بالکل کالی ہوتی ہے۔ اس کے چار ہاتھ ہوتے ہیں اور وہ شیر پر سوار ہوتی ہے۔ کالی گھاٹ (جس سے کلکتہ کا نام پڑا) کے مندر میں دیوی خونچکاں سریوں کی ایک مالا پہنے ہوتی ہے۔ جے پور کے ایک مندر میں دیوی کا سر پیچھے کو مڑا ہوا ہے۔ روایت ہے کہ انسان کی بجائے اسے بکری بھینٹ چڑھائی گئی تو اُس نے گھن کے مارے منہ پھیر لیا۔

منقوش دکھائی دیتی ہے۔ بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اپنی اصلی صورت میں بدھ مت وہ کشش نہ رکھتا تھا جس کی بدولت برہمن دھرم نے اپنے پیرووٴں کے دل موہ لیے۔ اس نے کبھی ایک مثبت دین ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔ اس کی جزائیں اور سزائیں آئندہ زندگی میں راحت، سعادت کے وعدے، اس زندگی میں فرائض نہ ادا کرنے کے نتیجے، سب اتنے مبہم تھے کہ عام لوگوں کے دلوں پر اُن کا کوئی اثر نہ ہوسکتا تھا۔ بہت جلد اس کے لیے ضروری ہوگیا کہ یا تو خارجی دنیا سے مقابلہ ترک کردے یا جس مذہب کی جگہ لینے کی اس نے کوشش کی تھی اس سے سمجھوتہ کرے۔ چنانچہ اسے اپنے پیرووٴں کو یہ اجازت دینی پڑی کہ نیک کاموں کو چھوڑ کر پوجا پاٹ میں مگن ہو جائیں یا اس کی بے لطف تعلیمات میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے تنترک رسومات اختیار کریں۔ اُسے اپنے اصلی وطن میں نہایت ناموافق حالات کے تحت جو ناکامی ہوئی اس نے اس کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی کہ وہ اپنے آپ کو ایک ولولہ انگیز مذہبی نظام ثابت کرسکے، اگرچہ یہ درست ہے کہ اس کے بعض صوفیانہ پہلو مغربی ایشیا اور مصر کے فلسفوں پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئے ہیں۔

بدھ مت کے ہندوستان سے دیس نکالے کے بعد برہمن دھرم نے دوبارہ غلبہ حاصل کرلیا۔ جس زمانے میں بدھ مت کا راج تھا اس زمانے میں برہمن دھرم نے جو برے دن دیکھے تھے اُن سے اس نے کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔ اُس کے روحانی تصورات میں کوئی اصلاح نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ بے جان رسم پرستی جس کے خلاف مہاتما بدھ نے بغاوت کی تھی۔ پہلے سے بھی زیادہ اُستوار بنیادوں پر از سرِ نو قائم ہوگئی۔ بحال شدہ برہمن راج میں لوگوں کی زندگیوں پر ایک ایسے مذہب کا پہلے سے بھی کڑا پہرہ لگ گیا جو محض قربانیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ یہ مذہب لوگوں کے روحانی تقاضوں کی تو کیا تسکین کرتا؟ البتہ وہ ان کے حواس اور غالباً ان کے جذبات کو بھاتا تھا۔ عام لوگوں کی مذہبی عبادت بے معنی اور بیہودہ رسموں کا ایک روزمرہ معمول بن گئی۔ ان کے معبود پروہت تھے، اگلوں کی رُوحیں تھیں اور محض ظاہر داری کے طور پر ویدوں کے دیوتا تھے۔ ہندوستان کے اصلی باشندوں سے جو بت پرستی ہندووٴں نے سیکھی تھی اسے نہ ان کا فلسفہ اور نہ بدھ مت کی اخلاقی تعلیم مٹا سکی۔ اس نے اب تمام جاتیوں کی اندرونی زندگی میں گھر کرلیا۔ درخت،

پتھر، دوسری اشیائے فطری اور بت، جو گھروں اور خاندانوں کے دیوتاؤں اور پرانے دیوتاؤں کی علامتی مورتیاں تھے، عام لوگوں کے معبود بن گئے۔ منو کا دھرم شاستر، جس پر ہندوؤں کو بجا طور پر فخر ہے اور جو بعد کے زمانوں میں دوسری مشرقی اقوام کے قانونی نظریوں کا نمونہ بنا۔ ایک ایسی مملکت کا ضابطہ آئینی ہے جس میں ایک طرف تو مادی تہذیب بڑی ترقی کر چکی تھی اور دوسری طرف پروہتوں کے طبقوں کا مطلق اقتدار اور عوام میں ایک تعجب انگیز اخلاقی انحطاط تھا۔ پروہتوں کی طرح اب راجہ بھی دیوتا بن گیا تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں اگرچہ منوسمرتی کی اب بھی عزت کی جاتی تھی اور اسے ہر معاملے میں حتمی سند سمجھا جاتا تھا، لیکن اس کی جگہ دھیان گرو یجنولکیہ کی تفسیر نے لے لی۔ اُس کے نزدیک ذات پات کا فرق اُتنا ہی پتھر کی لکیر تھا جتنا منو کے نزدیک تھا۔ دونوں کی نگاہوں میں شودر اتنے ہی ملیچھ تھے جتنے وہ ابتدائی زمانوں میں سمجھے جاتے تھے۔

نوزائیدہ بچیوں کو مار ڈالنے کی رسم ہندوؤں میں اتنی ہی عام تھی جتنی دورِ جہالت کے عربوں میں تھی۔ اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا کہ ستی کی رسم کب شروع ہوئی، لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں عام تھی۔ بہر حال بیوائیں یقیناً جیتے جی جل جانا خوشی سے قبول کرتی ہوں گی، کیونکہ اگر ان کے اولاد نہ ہوتی تو ان کی زندگی اجیرن ہوتی تھی۔

عورتوں کو اجازت نہ تھی کہ ویدوں کا پاٹھ کریں اور اگلوں کی روحوں کو جو بھوگ دیئے جاتے تھے ان کے دینے میں شریک ہوں یا دیوتاؤں کو جو بھینٹیں چڑھائی جاتی تھیں اُن کے چڑھانے میں شمولیت کریں۔ استری کا دھرم یہی تھا کہ اپنے ناتھ کی سیوا کرے، اور اس کا جگ جگ کا سکھ چین اسی فرض کے ادا کرنے پر منحصر تھا۔ جو باوفا عورت اپنے سوامی کی چتا میں جل کر ستی ہو جاتی تھی اسے ہندو مذہب کے تمام پیرو اپنے دل میں جگہ دیتے تھے اور صنفِ نسواں کے بہترین اور برگزیدہ ترین افراد میں شمار کرتے تھے، بلکہ اکثر اسے دیوی بنا کر اس کی پوجا کرتے تھے۔

اگرچہ سوچ بچار کرنے والے لوگوں کو ہندو مذہب کی ان رکیک رسموں میں کوئی گہرے معانی نظر نہ آتے تھے اور اُن کی رُوحیں ان رسموں سے بلند تر فضاؤں میں

پرواز کرتی تھیں، لیکن کسی فلسفی یا پنڈت نے بے بس اور عموماً نو عمر بیواؤں کی ان ظالمانہ قربانیوں پر نفرت یا غصے کا اظہار نہ کیا۔ بہت سی دھرم سبھائیں وجود میں آ گئی تھیں جن میں مرد بھی شریک ہوتے تھے اور عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں اور جن کی امتیازی صفات میں پاکبازی شامل نہ ہوتی تھی۔ تجرد کی زندگی بسر کرنے والی بہت سی منڈلیاں بھی بن گئی تھیں۔ جو مختلف دیوتاؤں کو پوجتی تھیں۔ اُن کے اراکین ہمیشہ دھرم سالوں میں جمع ہوتے تھے جن میں عورتوں کو بھی داخلہ دیا جاتا تھا۔ ان منڈلیوں میں اور اسی طرح جوگیوں اور سناسیوں کی ان منڈلیوں میں جو اس زمانے کے لگ بھگ وجود میں آ گئیں کنوارپن کا بچن محض دھوکے کی ٹٹی تھا اور پالنے کی خاطر نہیں بلکہ توڑنے کی آسانی کی خاطر دیا جاتا تھا۔ جوگیوں کے جتھے مندروں اور مٹھوں میں مزے کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بہت سے بیراگی اور سنیاسی قرونِ وسطٰی کے بھک منگے راہبوں کی طرح یا فلیویس (Flavius) کے عہد کے تارک الدنیا کلبیوں (Cynics) کی طرح عقیدت مند لوگوں سے خیرات لے کر ثواب کمانے کی خاطر ادھر اُدھر پھرتے رہتے تھے۔ خیرات دینے والوں کی نظروں میں ان کی سندِ استحقاق کیا ہوتی تھی؟...... اُن کے گندھے ہوئے لمبے لمبے بال، اُلجھی ہوئی گھنی داڑھی، گیروے رنگ کا کُرتا، بھبوت ملا ہوا بدن، کشکول اور ڈنڈا۔

چونکہ دیوتا ناچ اور گانے کے رسیا ہوتے تھے، اس لیے مندروں میں بہت سی ناچنے گانے والی عورتیں ہوتی تھیں، جو نام کو تو دیوداسیاں کہلاتی تھیں لیکن دراصل پروہتوں کے آنند کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ عورتوں کو شروع شروع کے قوانین میں بہت پست درجہ دیا گیا تھا۔ منو نے عورتوں کے بارے میں جو نفرت و ملامت سے بھرے ہوئے الفاظ لکھے ہیں، ان کی نظیر صرف عیسوی سینٹ ٹرٹلین (Tertullina) کے تعصب آمیز اقوال میں ملتی ہے۔ منو کہتا ہے: ''عورتوں میں ناپاک خواہشیں ہوتی ہیں۔ وہ ارادے کی کچی اور چال چلن کی خراب ہوتی ہیں۔ ضروری ہے کہ انہیں دن رات کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔

جہاں تک شودروں کا تعلق تھا، اس نے تقریباً (Pandects) کے الفاظ میں اعلان کیا کہ خدا نے انہیں غلام پیدا کیا ہے اور اگر کوئی شودر غلامی سے آزاد کر بھی دیا جائے تو بھی وہ آزاد نہیں ہوتا۔ چونکہ غلامی اس کی فطرت میں ہے، اس لیے اُسے کون اس

سے چھٹکارا دلا سکتا ہے؟

اجمالاً یہ تھے آریہ قوم کی ایک سب سے زیادہ ترقی یافتہ شاخ کے مذہبی و معاشرتی حالات اس وقت جب پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنا پیغام دنیا کو دیا۔

آیئے اب ہم ایران پر ایک نگاہ ڈالیں۔ ایران ہماری سنجیدہ توجہ کا مستحق ہے، ایک تو اس لیے کہ وہ اسلام کے مرز بوم سے اتنا قرب رکھتا ہے اور دوسرے اس لیے کہ اس نے نہ صرف دین موسوی اور دین عیسوی کے مزاج پر بلکہ فکرِ اسلامی پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔

مغربی آریہ ایک قوم کی صورت میں متحد ہو کر اور روحانی نشو ونما کے مدارج طے کر کے اپنے قدیم وطن کی حدود سے باہر نکل پڑے اور اُن علاقوں میں جو آج کل ایران اور افغانستان کہلاتے ہیں پھیل گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں حامی اور کوشی (Kushite) نسلوں کے جو باشندے تھے انہوں نے ان کو مسخر کر لیا یا تباہ کر دیا اور رفتہ رفتہ بحیرۂ خزر تک جا پہنچے، جہاں وہ حامیوں اور کوشیوں سے زیادہ مضبوط اور جفاکش تورانیوں سے دوچار ہوئے جو ماد اور سوسیانہ (Susiana) میں آباد تھے لیکن اس سے پیشتر کہ وہ تورانیوں کو محکوم بناتے وہ خود ایک غیر ملکی حملہ آور کے حلقہ بگوش ہو گئے، جو کوشی تھا یا اشوری (اغلب یہ ہے کہ اشوری تھا) اور بڑی مدت تک اس کے زیرِ فرمان رہے۔[1] ان غیر ملکی فاتحین کے نکال دیئے جانے کے بعد ایرانیوں اور تورانیوں کی وہ جنگ شروع ہوئی جس میں کبھی ایک فریق غالب آجاتا تھا کبھی دوسرا اور جو صدیوں تک جاری رہنے کے بعد ماد اور سوسیانہ (Susiana) میں تورانیوں کے محکوم بن جانے پر ختم ہوئی۔ افراسیاب اور کیکاؤس کے پیروؤں کو رزم و بزم میں ایک دوسرے سے بسا اوقات جو سابقہ پڑا۔ اُس نے ایرانیوں کے مذہب پر ایک دائمی اثر ڈالا۔ تورانیوں کی انتہائی مادیت اُن کے ایرانی حریفوں اور ہمسایوں کی ناپختہ تصوریت میں پستی پیدا کیے بغیر نہ رہی۔ ایرانیوں نے ماد کے قدیم آبادکاروں پر غلبہ تو پالیا۔ لیکن تورانیوں کے طریقہ ہائے پرستش ان کے مذہب

---

[1] ایرانی روایات کے مطابق ضحاک نے ایک ہزار سے زیادہ سالوں تک ایران پر حکومت کی بہت سے محققوں نے اشوریوں کے اقتدار کی بھی یہی مدت بتائی ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو فریدون کا خروج اور نینوا کا سقوط دونوں ایک ہی زمانے میں ہوئے۔

میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ جہاں ایران میں صرف ہرمز کی پرستش کی جاتی تھی اور اہرمن کو ملعون سمجھا جاتا تھا، وہاں ماد میں خیر و شر کے ان دونوں نمائندوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ تورانی باشندوں کا ایرانی فاتحوں کے خدا کی بہ نسبت اپنے قومی دیوتا کی پرستش کی طرف زیادہ راغب ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ تورانی عوام اہرمن یا افراسیاب کو ہرمز پر ترجیح دیتے تھے۔

مادیوں اور بابلیوں کے ایک باہمی تعاون کے معاہدے کی بدولت جو تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا معروف معاہدہ ہے، اشوری سلطنت کا تختہ اُلٹ گیا، لیکن اشوری مذہب بہت سے ایسے علاقوں پر جو آریاؤں نے فتح کئے اتنی مدت تک مسلط رہ چکا تھا کہ زرتشتیوں کے تصورات پر اس کے نقوش کا ثبت رہنا ناگزیر تھا۔ سماوی رابطہ بندیوں اور ایک قدسی سلسلہ مراتب کا جو پیچیدہ تصور اشوریوں میں رائج تھا اس کا پیوند زرتشتی مذہب میں لگ گیا۔ اب ہرمز کی ایک اشور ثانی کے طور پر پرستش ہونے لگی۔ اور ایرانیوں نے روشنی کے خدائے مہربان کو مجسم کرنے کے لیے جو علامتی نشان انتخاب کیا وہ اشوریوں کا ایک پردار سپاہی تھا، جو ہاتھ اوپر کو اٹھائے اور ایک کمان تھامے سنسار چکر میں محصور کھڑا تھا۔ اُن کے یہاں جو جھاڑ نشوونما کی علامت تھا پہلے اس کی اوپر کو اٹھی ہوئی شاخیں مل کر صنوبر کے پھل کی شکل بناتی تھیں، اب وہ سرو کے پھل کی شکل بنانے لگیں اس سے قبل کہ کسریٰ نے آکر فتوحات کے ذریعے مملکت کو سالمیت بخشی، ابتدائی مہاجروں اور آباد کاروں میں جو علامتی پرستش رائج تھی وہ عوام کے یہاں بگڑ کر آتش پرستی بن گئی یا اس نے کلدانیوں اور اشوریوں کے صابی مذہب کی صورت اختیار کر لی۔

آشور کا شہر، جس نے تقریباً ایک ہزار سال سرحدِ ہندوستان تک سارے مغربی ایشیا پر حکومت کی تھی اور جس کے زیرِ فرمان آنے سے فراعنہ مصر کی سلطنت بال بال بچی تھی، طاقت ور سارگون اور عظیم سنحریب (Sennacherib) کا شہر بابلیوں اور مادیوں کے مجموعی لشکروں کے ہاتھوں زیر ہو چکا تھا۔ اور ایسے طور پر زیر ہو چکا تھا کہ پھر اسے اقوامِ عالم میں سر اٹھانا نصیب نہ ہوا۔ بابل، جو شروع شروع میں نینوا کا حریف رہ کر اشوریہ کے زیرِ نگیں آ گیا تھا پھر ایک بار ایشیائی تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اس نے ان تمام علوم و فنون کو

جو ایک ہزار سالوں کی نشوونما کا حاصل اور ''قوموں، مذہبوں، مندروں اور پروہتوں کے اختلاط کا نتیجہ تھے'' اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور زمانہ سلف کے بے جان مذہبوں اور جدید اعتقادات کے درمیان رابطے کی کڑی بن گیا۔ اشوریہ نے اکادیوں سے نہ صرف ان کا تمدن اور ادب حاصل کیا تھا بلکہ اُن کے مذہب سے بھی بہت کچھ اکتساب کیا تھا۔ بابل، جس کی عظیم تر شان وشوکت نے نینوا کی خاکستر کے اندر سے جنم لیا تھا، ایک ایسے مذہب کا علمبردار تھا جو اشوری اور کلدانی مذہبوں کا نچوڑ تھا بنوکدنصر (بخت نصر) کے عہدِ حکومت میں بابل کی سلطنت اپنے اوجِ اقتدار کو پہنچ گئی۔ یہودیہ اس کی قلمرو میں آ گیا اور اس کے چیدہ و برگزیدہ لوگ غلام بنا کر بابل میں منتقل کر دیئے گئے۔ تاکہ اس کے دریا کے کنارے بیٹھ کر یہواہ کی بادشاہی کا ماتم کریں۔ یہ طاقت ور فاتح عرب میں بھی داخل ہو گیا اور وہاں اس نے بنی اسماعیل کو مسخر کر کے قریب قریب تباہ کر دیا۔ اس نے صوریوں کو بھی زبردست ضربیں لگائیں اور فراعنۂ مصر کی قوت کا بھی خاتمہ کر ڈالا۔ اگرچہ عبرانی وطن پرست دل کھول کر بابل پر لعنتیں بھیجتے ہیں، تاہم بابل نے یہودیوں پر اتنی سختیاں نہ کیں جتنی مصر نے کیں۔ بنی اسرائیل خود اس فیاضانہ سلوک کی شہادت دیتے ہیں جو ان سے کیا گیا۔ جب تک نجات دہندہ نے ایک جری لشکر لے کر اس بدنصیب شہر پر چڑھائی نہ کی اُس وقت تک بنی اسرائیل نے بابل کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کی لیکن جب انہیں رہائی مل گئی تو انہوں نے سب وشتم، بددعاؤں اور ملامت ونفرین کا وہ ہنگامہ برپا کیا جو نسلِ عبرانی کے دورِ وحشت کا خاصہ تھا۔ ''بابل کے دریاؤں کے کنارے ہم بیٹھ گئے اور صیہون کو یاد کر کے روئے۔ اے دخترِ بابل! '' خوش نصیب ہوگا وہ شخص جو نوزائیدہ بچوں کو پتھروں پر پٹخ دے گا۔'' بنوکدنصر کے عہدِ حکومت میں بابل بلاشک وشبہ اس دور کی تمام تہذیبوں کا مرکز تھا اور اس کے پروہتوں کو جو اثر ونفوذ حاصل تھا وہ بابلیہ کی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ختم نہ ہو گیا۔ یہودی نظام پر بھی اور عیسوی نظام پر بھی بابلی تصورات کے نقوش نمایاں طور پر ثبت نظر آتے ہیں۔ یہودیوں نے کلدانی موبدوں کے درمیان غریب الوطنی کی جو طویل زندگی گزاری، بعض عبرانیوں کو شاہِ بابل کے دربار میں جو رسوخ حاصل ہوا اور دونوں قوموں میں ناگزیر طور پر جو میل جول ہوا، ان سب نے یکجا ہو کر قرونِ

اُخرٰی کی یہودیت کا مزاج بدل دیا۔ جب یہودی قیدی بنا کر بابل لے جائے گئے تو وہ نیم وحشی تھے۔ جب وہ دیارِ غربت کی طویل آزمائشوں کے بعد صیہون لوٹے تو وہ ایک ایسی قوم بن چکے تھے جو نظریات وعقائد میں ترقی یافتہ، بڑھے ہوئے حوصلوں سے مملو اور ایک وسیع تر سیاسی بصیرت کی مالک تھی۔

فتح بابل سے مذہب کے ارتقا کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب ایشیا پر مذہب مجوسیت کی حکومت قائم ہوگئی۔ کسریٰ نے یہودیوں سے جو فیاضانہ رواداری کی اس کے صلے میں انہوں نے قدرتی طور پر اسے ''مسیحا''، ''نجات دہندہ'' اور ''شفیع عالم'' کے القاب دیئے عبرانی قبیلوں کی اسیری، ایرانی اقتدار کے مرکز کے قریب اُن کا مجبوراً آباد ہونا اور کسریٰ کے تحت اُن کا ایرانیوں سے اختلاط، یہ چیز بھی غالباً زرتشتیوں کی اس مذہبی اصلاح کی محرک ہوئیں جو داریوش ہستاسپ کے تحت ظہور میں آئی۔ فعل وانفعال کا دوطرفہ عمل جاری رہا۔ اسرائیلیوں نے تجدید یافتہ زرتشتی مذہب پر ایک محیط کل قدسی شخصیت کا گہرا اور پائیدار تصور مرتسم کر دیا۔ اس کے بدلے میں انہوں نے ایرانیوں سے ایک سماوی سلسلۂ مراتب اور خیر وشر کی تخلیق کے اصولِ دوگانہ کا خیال اکتساب کیا۔ اب اسرائیلی یہ نہ کہتے تھے کہ خدا خود گناہگاروں کے اندر بدی کی رُوح داخل کر دیتا ہے۔ اہرمن کی طرح شیطان نے عبرانیوں کی مذہبی واخلاقی تاریخ میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔

کسریٰ کا عہدِ حکومت ملک گیری کا دور تھا، تنظیم کا دور نہ تھا۔ داریوش کا عہدِ حکومت استحکام کا دور تھا۔ وہ ہرمز کا پکا پرستار تھا۔ اپنی ساری فتوحات کو اس کا احسان کہتا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ کوشش کی کہ زرتشتی مذہب کو ساری غیر ملکی آلائشوں سے پاک کر دے، مادیوں کی مجوسیت کا قلعہ مسمار کر دے اور آریہ نژاد ایرانیوں کو مہذب دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنائے۔ لیکن انحطاط کا جو عمل شروع ہو چکا تھا وہ کسی کے روکے رُک نہ سکتا تھا۔ ایک سو سال نہ گزرنے پائے تھے کہ زرتشتی مذہب نے وہ ساری خرابیاں کوٹ کوٹ کر اپنے اندر بھر لیں جن کا اس نے اپنے عہدِ طفلی میں مقابلہ کیا تھا۔ جو لوگ بت پرستوں کے لیے عذاب کے فرشتے تھے اور جن کا جوشِ بُت شکنی اس غضب کا تھا کہ انہوں نے مصریوں کے متبرک بیل ایپس (Apis) کو ذبح کر ڈالا تھا اور اس کے استھان کی اینٹ

سے اینٹ بجادی تھی، انہوں نے بہت جلد ہرمزد کی پرستش میں اپنے محکوم ملکوں کے سامی خداؤں کو داخل کر لیا۔ پرانی مجوسی عناصر پرستی از سرِ نو تازہ ہوگئی، اور داریوش کے ایک قریبی جانشین اور شیر میمون (Artoxerxes mremon) نے زرتشتیوں میں محنت دیوتا متھرا کی پوجا رائج کرائی۔ یہ کلدانی دیوتا ملتا یا اناتی تیس کا مثنیٰ تھا اور اس کے ساتھ لِنگ پوجا بھی وابستہ تھی۔ اس متھرا پوجا کا نشوونما پا کر خوبصورت سورج دیوتا کی پرستش میں تبدیل ہو جانا تاریخ کے عجائبات میں سے ہے۔ جگمگاتا ہوا سورج پہاڑیوں کی درزوں کے اندر سے نکلتا ہوا، بیل کو باڑے میں لے جا کر ہلاک کرتا اور اس کے خون سے انسانی گناہوں کا کفارہ ادا کرتا ہوا، یہ ایک ایسا تصور ہے جو دنیا کے ایک عظیم مذہب پر اپنا اَن مٹ نقش چھوڑ گیا ہے، متھرا کی پوجا کو رومی لشکری وادیٔ فرات سے یورپ کے دور ترین گوشوں میں لے گئے اور قیصر ڈائیو کلیشین (Diocletian) کے زمانے میں وہ روما کا سرکاری مذہب بن گئی۔

مجوسی زرتشتیوں کے تحت عورتوں کے جو حالات تھے اس سے بدتر اور کبھی نہ ہوئے تھے۔ وہ مردوں کے من کی موج کی باندیاں تھیں۔ منو کے قوانین نے ایک قسم کی عصمت عائد کی اور اپنی گوت کے باہر بیاہ کرنے کا جو سخت ضابطہ ابتدائی آریوں میں رائج تھا، اس نے کسی حد تک نفسانی خواہشات پر لگام کا کام دیا۔ لیکن ایرانی جنسی تعلقات کے معاملات میں اپنی مرضی کے سوا کسی قانون کے تابع نہ تھے۔ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے شادی کر سکتے تھے اور اپنی خوشی سے بیویوں کو طلاق دے سکتے تھے۔ عورتوں کو پردے میں رکھنے کی رسم ایرانیوں ہی تک محدود نہ تھی۔ آیونیا (Ionia) کے یونانیوں کے یہاں عورتیں حرم سرا (Synaikonitis) میں بند رہتی تھیں۔ جس کے دروازے عموماً قفل بستہ ہوتے تھے، اور انہیں سرِ عام باہر آنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ بہر حال ابتدائی زمانے میں یونانی حرم سراؤں کی رہنے والیوں کو مجروح کر کے بے بس نہ کر دیا جاتا تھا۔ ایران میں عورتوں کی نگہبانی کے لیے خواجہ سراؤں کو ملازم رکھنے کا دستور قدیم ترین زمانوں سے چلا آ رہا تھا۔ یونان کی طرح ایران میں بھی جاریہ بازی یعنی باندیوں کو داشتہ بنا کر رکھنے کا دستور ایک معروف دستور تھا اور معاشرے کے رگ و پے میں ساری تھا۔ بہر حال

ایرانیوں نے شہوت رانی کو اپنی قومی عبادت میں داخل نہیں ہونے دیا۔ ان کے یہاں کوئی ایفروڈائٹی پینڈیموس (Aphrodite pandemos) نہ تھی۔ زرتشتی معاشرہ اس اخلاقی وبا میں بھی مبتلا نہ تھا، جو تمام بدکاریوں میں سب سے ذلیل بدکاری ہے اور جو یونان میں عام تھی اور پھر روم میں بھی پھیل گئی اور جس کا قلع قمع عیسائیت بھی نہ کرسکی۔

جب ہخامنشی سلطنت کو زوال آیا تو اس کے بعد زرتشتیت دنیا کی ترقی میں ایک قوتِ محرکہ نہ رہی۔ فاتحین کے اُن ٹڈی دل لشکروں نے جو ایران کی سرزمین پر جھکڑوں کی طرح آئے معاشی اور اخلاقی زندگی کا نظام تہ و بالا کر دیا۔ سکندر مقدونی کا ظفر مندانہ حملہ، وہ بھانت بھانت کے جتھے جو اس کے جلو میں آئے، ایشیائے کوچک کے وہ ذلیل ترین لوگ سلیشی، صوری، پمفیلی، فریزی اور لاتعداد دوسری قوموں کے لوگ، نیم یونانی، نیم ایشیائی، جو گار کی طرح اس طغیانی کے ساتھ آکر ایران کی سرزمین پر پھیل گئے اور جو کوئی اخلاقی قانون نہ مانتے تھے اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر خود فاتح کا جلد باز اور بے دھڑک مزاج...... ان سب نے مل کر زرتشتی مذہب کو پستی میں دھکیل دیا۔ قومی زندگی کے نمائندے موبد فاتح کی چیرہ دستیوں کے تختۂ مشق بنے، کیونکہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ایشیا کو یونانی رنگ میں رنگنا تھا۔

سکندر کی زندگی ایک شہابِ ثاقب کی طرح تھی قصے کہانیوں کا جو تانا بانا اُس کی شخصیت کے گرد بُنا گیا ہے اور جس نے اس کی زندگی کو ایک حماسہ بنا دیا ہے اُسے ہٹا بھی دیا جائے تو اُس صورت میں بھی وہ مبہم بالشان تصورات اور بلند ہمت مقاصد کا ایک مجسمہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جس میں اعلیٰ درجے کی اولوالعزمی تھی، ایک ایسی زبردست فطانت تھی جو ہر طرح کی مخالفت پر غالب آجاتی تھی اور ایک ایسی شخصی جاذبیت تھی جس کی بدولت وہ اپنے اردگرد کے تمام لوگوں کے دل و دماغ کو اپنے ارادوں کے سانچے میں ڈھال دیتا تھا۔ اس کی طبیعت ایک اجتماعِ ضدین تھی۔ وہ تھا تو ارسطو کا ایک شاگرد جس کا نصب العین یہ تھا کہ ایشیا کو ایک یونانِ ثانی بنا دے اور خود ساری دنیا سے خراجِ عبودیت وصول کرے اور دوسرے وہ فلاسفہ و حکما کا ہم صحبت بھی رہ چکا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی نفرت انگیز زیادتیوں سے مملو تھی۔ اس کا ایک مداح ذیل کے

الفاظ میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے: ''صور کی تاخت و تاراج اور اس کے باشندوں کو طوقِ غلامی پہنانا، ہندوستان اور باختر میں اس نے جو ہنگامہ قتال برپا کیا، کلائٹس کا قتل فلوئس اور وفادار پارمینیو کی موت کے فرمان جو اس نے جاری کیے، طوائفوں کے کہنے پر تخت جمشید کا جلانا اور اس کے کتب خانے کو راکھ کا ڈھیر بنا دینا، یہ سب ایسے کام تھے جن کی کوئی معذرت تاریخ پیش نہیں کر سکی۔'' سکندر کی فتح یابی اور ہخامنشی سلطنت کی بربادی کے بعد مذہب زرتشت کی جگہ یونانیت اور کلدانی تہذیب کی بدترین روایت نے لے لی۔ اساطیر الصنادید کے اس ہیرو کے دل میں بابل کی جو محبت اور اسے ایشیائی، قوی تر اور مکمل تر تہذیب کا مرکز بنانے کی جو زبردست خواہش تھی اس کی وجہ سے اس نے تمام ایسے مذاہب و عقائد اور سیاسی یا مذہبی اداروں کو پروان چڑھنے سے روکا جو اس کے واحد مقصد کے منافی تھے۔ سلیوکی حکمرانوں کے تحت ایرانیوں کی قومی خصوصیات کو تبدیل کرنے کا عمل ثابت قدمی سے جاری رہا، انٹیوکس ایپی فیز کو، جس نے یہواہ کے پرستاروں پر انتہائی مظالم توڑے، یہودیوں نے بھی اور زرتشتیوں نے بھی اہرمن کا نفرت انگیز لقب دیا۔ پارتھیوں کے برسرِ اقتدار آنے کا بھی یہ اثر ہوا کہ مذہب زرتشت کے زوال میں سرعت آ گئی۔ سلیوکی فرماں روا دجلہ اور اور دجلہ کے کناروں پر حکمران تھے۔ پارتھیوں نے ہخامنشی سلطنت کے وسط میں اپنی بادشاہی قائم کی، یونانی، باختری خاندان مشرقی علاقوں، یعنی باختر اور شمالی افغانستان پر قابض تھے۔ سلیوکیوں کا سرکاری مذہب کلدانی اور یونانی مذاہب کا مرکب تھا۔ یہودی اور زرتشتی جلاوطن اور معاشرتی حقوق سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ پارتھیوں کے تحت مزدکیت اگرچہ بالکل ختم نہ کی ہوگئی، پھر بھی حکمرانوں نظر بچا کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگئی۔ جن علاقوں میں امن و امان تھا وہاں زرتشتیت مادیوں اور کلدانیوں کی پرانی صابیت سے مخلوط ہوگئی۔ اگر کسی جگہ وہ اپنی اصلی صورت میں قائم بھی رہی تو وہاں بھی اُسے صرف چند ایسے موبدوں کے دلوں میں جگہ ملی جو ملک کے دور دراز حصوں میں رُوپوش تھے، لیکن جب پارتھیا پھیل کر ایک سلطنت بن گیا اور پارتھی حکمرانوں کے سینوں میں شہنشاہ کے لقب کا شوق پیدا تو انہوں نے جبر و تعدی کو چھوڑ کر رواداری کا شیوہ اختیار کیا۔ چنانچہ مجوسی زرتشتیت نے از سرِ نو مذاہب عالم

کی صف میں سر اُٹھایا۔ ساسانیوں کے عروج نے اسے مزید تقویت بخشی۔ نئی سلطنت کے بانی نے موبدوں کو اعیانِ مملکت کے منصب عطا کئے۔ ایک قریب المرگ مذہب کے یہ آخری نمائندے اُن تمام اُمیدوں کا مرجع تھے جو زرتشتیوں کے دلوں میں ساسانی خاندان کے زیرِ سایہ نئی زندگی پانے سے متعلق پیدا ہوئیں۔ اس نئی سلطنت کے بانی اردشیر بابکان کی اولوالعزم اُمنگیں کہاں تک پوری ہوئیں، یہ ایران کی تاریخ کی ایک چیستان ہے۔ ایران کی سیاسی آزادی، یعنی اس کی قومی زندگی تو بحال ہوگئی لیکن معاشرتی اور مذہبی زندگی اس حد تک زوال پزیر ہو چکی تھی کہ اُس کا احیا حکمرانوں کے بس میں نہ تھا۔ قدیم تعلیمات کتابوں کے اوراق میں تو محفوظ تھیں، لیکن لوگوں کے سینوں میں وہ گشتاسپ اور رُستم کی طرح مُردہ ہو چکی تھیں۔

ساسانیوں کے عہد میں زرتشتیوں کا اقتدار اپنے نقطہ عروج پر تھا۔ کئی صدیوں تک وہ ایشیا کی سلطنت کے لیے رومیوں کے حریف رہے، بارہا انہوں نے رومہ کی فوجوں کو شکست دی، اس کے شہروں کو تاخت و تاراج کیا، اس کے قیصروں کو قیدی بنایا، اور اس کی رعایا کی دولت لوٹی، لیکن ایک اخلاقی عامل کی حیثیت سے زرتشتیت کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ وہ آتشکدوں میں تو اب بھی جل رہی تھی، لیکن لوگوں کے دلوں میں بجھ چکی تھی۔ خدائے برحق کی پرستش کی جگہ کلدانی مجوسیت نے لے لی تھی، اردشیر نے جس سخت تعصب سے کام لے کر حریف مذہبوں کو دبانے کی کوشش کی، اس سے بھی زرتشتیت کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ آخری ساسانی بادشاہوں کے تحت ایرانی سلطنت میں فرقہ بازی کا جو بازار گرم تھا، اس کے بادشاہ جس شہوت پرستی میں مبتلا تھے، اُس کے اشراف و اعیان جس اخلاقی پستی میں گرے ہوئے تھے اور اس کے موبد اور کشیش جس تکبر کا شکار تھے، ان سب چیزوں میں اس کی واحد نظیر بازنطینیوں کی سلطنت تھی۔ بادشاہ دیوتا تصور کئے جاتے تھے، وہ رعایا کی جان و مال پر کلی اختیار رکھتے تھے، اور رعایا غلاموں کی طرح تمام حقوق سے محروم تھی۔ بدکاریوں اور خرابیوں کی انتہا اس وقت ہوئی جب مزدک نے چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں اس اشتراکیت کا پرچار کیا، جس سے یورپ حال ہی میں آشنا ہوا ہے اور ”لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ آگ، پانی اور گھاس کی طرح دولت

اور عورتوں کو اپنی مشترکہ ملکیت سمجھیں، نجی املاک کو ختم کر دیں، اور دنیا کی اچھی اور بری چیزوں میں برابر کے شریک ہوں[1]۔" مجوسی زرتشتیت نے بہنوں اور خون کے رشتے کی دوسری عورتوں کے ساتھ شادی پہلے ہی جائز قرار دے رکھی تھی۔ اس اشتراکیت کے پرچار نے صحیح الخیال ایرانیوں کو برگشتہ خاطر کیا۔ چنانچہ مزدک جو اپنے آپ کو زرتشت کا جانشین کہتا تھا، قتل کر دیا گیا، لیکن اس کے خیالات ایران میں جڑ پکڑ چکے تھے، وہاں سے وہ مغربی ایشیا میں بھی جا پہنچے۔

یہ خرابیاں اخلاقی زندگی کے انتہائی انحطاط کی علامتیں اور قوم کے مستقبل کے حق میں ایک فالِ بد تھیں، اس فالِ بد کو کسریٰ نوشیروان کی بلند سیرت نے کچھ مدت تک پورا ہونے سے روکے رکھا۔ لیکن اس کی موت کے بعد وہ پوری ہو کر رہی۔ بہر حال ایک معلمِ عظیم کا ظہور ہو چکا تھا جسے دنیا کے جسدِ مردہ میں نئی روح پھونکنی تھی۔

یہودیوں کو بابل کی قیدِ غلامی سے آزاد ہوئے گیارہ صدیاں گزر چکی تھیں اور ان کے حالات میں بڑے بڑے تغیر رونما ہو چکے تھے۔ جو قیامتیں ملتِ موسوی پر یکے بعد دیگرے ٹوٹیں ان میں قیامتِ کبریٰ قیصران ٹائی ٹس (Titus) اور ہیڈرین (Hadrian) کی جنگیں تھیں، روم نے ان کے ہیکل کو مسمار کر دیا اور تیغ و آتش سے اُن کا بحیثیت ایک قوم کے خاتمہ کر دیا تھا۔ عیسوی قسطنطنیہ نے بھی اتنی ہی بے رحمی سے ان کو مظالم کا نشانہ بنایا، لیکن انہوں نے ماضی کے تجربوں سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ انہوں نے شقی القلب جابروں کے ہاتھوں جو اذیتیں اٹھائی تھیں اُن سے انہوں نے انسانیت اور امن پسندی کا سبق نہ سیکھا۔ مصر، قبرص اور سیرینی (Cysrene) کے شہروں میں جہاں وہ مقامی باشندوں سے دوستی کا ڈھونگ رچا کر بود و باش کر رہے تھے، انہوں نے جو انسانیت سوز مظالم کئے وہ اُن کی حالتِ زار پر رحم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ قومِ اسرائیل کا گھر اُجڑ گیا، اس کے افراد روئے زمین پر آوارہ و سرگرداں تھے اور انہیں کہیں دور تک امان نصیب نہ ہوتی تھی۔ وہ جہاں جاتے اپنا متمردانہ غرور اور اپنی شقاوتِ قلبی، جس کی مذمت اُن

---

[1] "دبستانِ مذاہب" از محسن فانی۔ سر محمد اقبال کی کتاب "Development of Metaphysics in persia" بھی ملاحظہ کیجئے۔

کے انبیا کے بعد دیگرے کر چکے تھے، اپنے ساتھ لے جاتے۔ غیر ممالک میں جہاں کہیں انہیں پناہ ملی انہوں نے اپنی تاریخ دہرائی اور وہی پہلے سے کرتوت کیے۔ یہ قوم اُمیدوں پر زندہ تھی، لیکن اُن امیدوں میں ایک طرف تو ایک اکھڑ اور کٹر تعصب اور دوسری طرف شہوت رانی اور عیش پرستی ملی ہوئی تھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ کر جا چکے تھے، لیکن وہ ان کی حالت کو بدل نہ سکے تھے۔ ایک مسیحا کے آنے کے بارے میں اس وقت جو خیالات عام تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی فضا میں آنکھ کھولی اور تربیت پائی۔ ناممکن تھا کہ اس معلم کے دل پر جو اپنی قوم کے ادبار پر آنسو بہا رہا تھا، کتاب دانیال کا گہرا اثر نہ ہوتا، جو قوم کے سیاہ ترین ایام میں لکھی گئی تھی اور جو اس کی آرزوؤں کا اظہار اور اس کے لیے اُمید کا ایک پیغام تھا۔ پہاڑوں میں پناہ گزین زیلٹوں (Zealots) کا شدید تعصب، صدوقیوں کی بے جان رسم پرستی، فریسیوں کی ظاہردارانہ آزاد منشی، اسینیوں کا ایک ہاتھ اسکندریہ کی طرف اور دوسرا بدھ مت کے پیرو ہندوستان کی طرف پھیلائے اُمیدوں بھرے خواب دیکھنا، اُس درویشِ پرخروش کے ملامت آمیز وعظ جس کی زندگی ہیرودیس (Herod) کے دربار کی سیاہ کاری پر بھینٹ چڑھی، ان سب چیزوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو متاثر کیا۔ لیکن رومی عقاب نے یہودیہ کے دل کو اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا تھا اور رومہ کے لشکر کسی قسم کے انقلاب کو سر اُٹھاتے ہی کچل دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ترکِ دنیا کی جو تعلیم دی اور براہِ راست خدا کے ہاتھوں قائم کی جانے والی آسمانی بادشاہی کا جو پُر آرزو خواب انہوں نے دیکھا، دونوں ان کے وقت کی پیداوار تھے۔ وہ سے مصالحت نہ کرنے والے ہٹ دھرموں کی قوم میں عالمگیر اخوت اور محبت کے پیغام بر بن کر آئے۔ ایک اکھڑ اور اکل کھری قوم میں رہ کر انہوں نے فروتنی اور انکسار کو اپنا شیوہ بنایا۔ وہ اپنے حواریوں سے شفقت و مودت کا سلوک کرتے تھے اور اپنے تمام پیروؤں کی بہبودی کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک عالی ظرفانہ ایثارِ نفس کی مثال اپنے پیچھے چھوڑی۔ طاقتور، دولت مند اور حکمران طبقوں کے سینوں میں انہوں نے صرف نفرت، خوف اور دشمنی کے جذبات پیدا کیے تھے، لیکن غریبوں، جاہلوں، ستم رسیدوں اور محروموں کے دلوں کو انہوں نے شکر گزاری اور محبت کے جذبات سے معمور کر دیا تھا۔ ایک دن صبح

کے وقت وہ دل میں یہ اُمید لے کر کہ وہ مسیحائے موعود بن کر دنیا میں جو کام کرنے آئے تھے اس میں انہیں کامیابی حاصل ہونے ہی والی ہے یہودی تعصب کے قلعے میں وارد ہوئے تھے۔ دو ہفتے نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ اپنے وقت کی مفاد پرستی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور زندگی پر انسانوں کا جو پردہ پڑا ہوا ہے اُس کو ہٹایا جائے تو چند واقعات واضح طور پر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ وہ غریبوں میں پیدا ہوئے اوران کا پیغام بھی غریبوں ہی کے لیے تھا۔ وہ ربانوی علوم میں بڑی دسترس رکھتے تھے، لیکن ان کی مختصر المیعاد تبلیغ صرف دیہات کے مسکین لوگوں، یعنی غریب کسانوں اور گلیلی کے ماہی گیروں، کے لیے وقف رہی۔ اُن کے حواری بھی غریب اور اَن پڑھ لوگ تھے۔ اگر چہ یہ لوگ زود اعتقاد تھے اوراس پر طرہ یہ ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پراسرار طریقے سے غائب ہو جانے نے انہیں حیرت میں ڈال دیا، پھر بھی ان لوگوں نے انہیں ہمیشہ ایک انسان ہی خیال کیا۔ ان کے مجسم خدا یا فرشتہ ہونے کا تصور تو بعد میں سینٹ پال نے عیسائیت میں داخل کیا۔ کلیسا کا مورخ موشیم کہتا ہے کہ اگر چہ روح القدس کے خود بخود جلوہ گر ہونے کا وعدہ ہو چکا تھا، تاہم ''یہ ضروری سمجھا گیا کہ آسمانی پیغام کی حمایت کے لیے کوئی ایسا شخص ہو جو اتنی علمی فضیلت رکھتا ہو کہ یہودی علما اور غیر اہلِ کتاب فلاسفہ کا مقابلہ خود اُن کے ہتھیاروں سے کر سکے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود ایک آوازِ غیبی کی ہدایت پر ایک تیرھواں شخص اپنے حواریوں کے حلقے میں شامل کیا جس کا نام سال تھا (بعد میں بدل کر پال ہو گیا) اور جسے عبرانی اور یونانی علوم سے کافی واقفیت تھی۔''

مجوسی زرتشتیوں کا عقیدہ تھا کہ ایک نجات دہندہ فرشتہ یا سروشِ غیبی مشرق سے نمودار ہوگا۔ بدھ مت کے پیرو ایک مجسم دیوتا یا اوتار کے قائل تھے، جسے ایک کنواری کے بطن سے پیدا ہونا تھا، اسکندریہ کے صوفیوں نے کلام یا ایک ''نیم خدا کا'' نظریہ ایجاد کیا۔ اوسائرس (Osiris) کی پیدائش، موت اور دوسری زندگی کے سری تصورات، آئی سس سیریز (Isis Ceres) کا تصور یعنی اس کنواری ماں کا تصور جو نوزائیدہ سورج دیوتا ہورس (Hours) کو گود میں لیے ہوئے ہے...... یہ تصورات مصر میں بھی اور شام میں عام تھے۔

پال، جو ایک صاحب علم فریسی تھا، اُن نیم صوفیانہ اور نیم فلسفیانہ خیالات سے بڑی حد تک متاثر تھا۔ وہ ایک خیال پرست اور جوشیلی طبیعت کا آدمی تھا۔ سٹراس (Strauss) کے قول کے مطابق وہ جسمانی عارضوں میں مبتلا تھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کبھی قریب کا تعلق نہ رہا تھا۔ چنانچہ اس کے لیے آسان تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف الوہیت کی صفات منسوب کر دے اور انہیں ایک مجسم فرشتہ کہے۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیدھی سادی تعلیمات میں فیثا غورسیت جدیدہ کے پر اسرار نظریے داخل کر دیئے، جن میں مشرقِ بعید سے مستعار لیے ہوئے عقولِ سماویہ اور تین واجب الوجود ہستیوں کے تصورات بھی شامل تھے۔

ملکی اور غیر ملکی یہودی اور غیر یہودی تابعین میں جو رقابت تھی اس کا مظاہرہ سب سے نمایاں طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو شاگردوں، پطرس اور پال کی مشہور باہمی مخالفت میں ہوا۔ ابیونی (The Ebionites) غالباً نبیٔ ناصری کے اصلی شاگردوں کے خیالات کے نمائندے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کی تھی اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "عقلی اور حیوانی زندگی" کے تمام عمال میں اپنا ہم جنس اور ہم فطرت پایا تھا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بچپن، نوجوانی اور بلوغ کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے اور عقل و دانش میں ترقی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو عقیدہ تھا وہ اُن کی انسانی شخصیت سے اس واقفیت پر مبنی تھا۔ یہ اصلی عقیدہ تبدیلیوں کے ایک سلسلے سے گزر کر بگڑا جس کی قابلِ ذکر کڑیاں دوسیتی (The Docetes)، مارشونی (The Marcionites) پتری پاسی[1] (The Partripassians) اور ان سے اخیر میں نیقیہ کی کونسل ہے جو ۳۲۸ء میں منعقد ہوئی۔ اس زمانے میں جو عقیدہ رائج تھا کہ ذاتِ باری کا قرن بہ قرن صدور ہوتا ہے اُس کی بدولت ہر طبقے کے لوگوں نے، بالخصوص

---

[1] دوسیتی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خالص خدا سمجھتے تھے۔ مارسیونیوں کا عقیدہ تھا کہ "وہ سب سے زیادہ خدا سے مشابہ ہے، اس کا بیٹا یسوع مسیح ہے، اور جسم کی ایک سایہ نما سی شباہت کا جامہ پہنے ہوئے ہے تاکہ انسانی آنکھیں اسے دیکھ سکیں۔" پتری پاسی اس کے قائل ہیں کہ آسمانی باپ نے اپنے بیٹے کے ساتھ صلیب پر اذیت سہی (موشیم اور گبن) (مزید ملاحظہ کیجئے نیانڈر)

انہوں نے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تھا نہ ان کی انسانی شخصیت سے آشنا ہوئے تھے اور نہ اُن کی آئے دن کی زندگی ملاحظہ کی تھی، اُن کی الوہیت کا نظریہ قیل و قال کے بغیر قبول کر لیا۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تبلیغ شروع کی اُس وقت رومہ کی سلطنت نصف سے زیادہ یورپ پر پھیلی ہوئی تھی اور تقریباً سارا شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کا بہت بڑا حصہ اس کے زیرِ نگیں تھا۔ تاریخ کے ایک اتفاقی حادثے کی بدولت یہ وسیع اقلیم عیسائیت کی پود کیاری اور مخالف فرقوں کا میدانِ کارزار بن گئی۔

فریزیوں کی دیوی سبلی (Cybele)[1] کے روم لائے جانے سے ایک صدی پیشتر بطلیموس سوتر، جو اسکندر کے سب سے خوش قسمت اور غالباً سب سے دور اندیش جرنیلوں میں تھا، مصر پر قابض ہو چکا تھا۔ مصریوں اور یونانیوں کو ایک مشترک مذہب کے رشتے میں مربوط کر کے ایک واحد قوم بنانے کی خاطر اس نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک ایسا طریقِ عبادت ایجاد کرے جس میں دونوں قومیں شامل ہو سکیں، یہی خیال دو ہزار سال بعد اکبر اعظم کو سوجھا تھا، لیکن جہاں اکبر ناکام رہا وہاں بطلیموس کو کامیابی ہوئی، کیونکہ حالات سب کے سب اس کے مساعد تھے۔ یونانی، زیوس، دمیتر اور اپالو یا ڈایونیشیس کی پوجا کرتے تھے۔ مصری اوسائرس اور آئی سس کے بیٹے ہورس کی۔ عقیدہ تثلیث دونوں میں مشترک تھا۔ مصری مذہب کا مدار اور سائرس اور آئی سس کے بیٹے ہورس کی اذیت کشی اور رستخیز پر تھا، یونان کے شہر ایلیوسس (Elevisis) میں بھی پرستش کے پر اسرار طریقے تھے، جن میں نو واداروں کے داخلے کی مخفی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ مصری سرکشیش بھی آئی سس کی پراسرار پرستش اس قسم کی مخفی رسوم کے ساتھ کرتے تھے۔ نہ یونانیوں کے لیے اور نہ مصریوں کے لیے یہ بات کوئی اہمیت رکھتی تھی کہ جن دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی یا جن کے سامنے رسوم ادا کی جاتی تھیں ان کے نام کیا تھے۔ انہیں صرف پوجا اور رسوم سے مطلب تھا، ناموں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یوں سیراپیوم......(Serapeum) کا مسلک وجود میں آیا۔ سیراپس (Serapis) نے یونانیوں کے یہاں زیوس (Zeus) کی اور مصریوں کے

---

[1] سبلی کی پوجا ہندوؤں کی مشہور دیوی درگا یا کالی کی پوجا سے قریب کی مشابہت رکھتی تھی۔

یہاں اوسائی رس (Osiris) کی جگہ لے لی۔ آئی سس (Isis) نے اسکندریہ کے مسلک کی مادرِ غمخوار بن کر دیمتر (Demeter) کو برطرف کر دیا اور ڈایونیشیس کو اب تک جو خراج عبودیت پیش کیا جاتا تھا وہ اب ہورس ہپوکریٹیز (Horus Happocrates) کو پیش کیا جانے لگا۔ بہرحال ڈایونیشیس نے ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقوں میں اپنا مرتبہ نہ کھویا، چنانچہ عام لوگوں میں جو عقیدہ رائج تھا کہ ایک دیوتا انسانوں میں رہ چکا تھا اور اذیتیں اٹھا کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور پھر قبر سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اس عقیدے نے بعد میں عیسائیت کو پھیلنے میں سہولت بہم پہنچائی۔

کہا جاتا ہے کہ آئی سس (Isis) جس کی شان و شوکت کے سامنے اس کے شوہر کی عظمت ماند پڑ گئی تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے اسی سال پہلے روم میں پوجی جانے لگی۔ اس کی پوجا نے بہت جلد عوام کو بھی اور شائستہ طبقوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس کی بھڑکیلی رسومات، اس کے سر منڈے صفاچٹ داڑھیوں والے پروہت، اس کے سفید پوش نوعمر ادنیٰ خدام، جو مشعلیں اُٹھائے چلتے تھے، اس کے باوقار جلوس، جن میں اوسائی رس ہورس کی تکلیف اور موت پر غم واندوہ کے پرجوش جذبات اور اس کے دوبارہ زندہ ہونے پر دیوانہ وار خوشی کے جذبات کے اُکسانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جاتا تھا، اس کی صوفیانہ معانی سے مملو پراسرار عبادات اور ان سب سے بڑھ کر حیاتِ جاودانی کی بشارتیں ایک ایسی دنیا کے لیے جس کے پرانے دیوتا چپ ہو چکے تھے اور جو کائنات کے دائمی مسائل سے ایک قریب تر واسطے کی تمنائی تھی بڑی کشش رکھتی تھیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آئی سس نے رومیوں کے دلوں پر مضبوطی سے قبضہ جما لیا۔

اگرچہ ''دکھیاریوں پر ایک ماں کی ممتا نچھاور کرنے والی'' آئی سس کی پوجا لوگوں کے جذبات پر ہمیشہ مسلط رہی، لیکن حسین سورج دیوتا متھرا (Mythra) کے نسبتاً زیادہ مردانہ وار مسلک نے، جس میں پراسرار رسومات کے ساتھ ساتھ کفارہ گناہ کا نظریہ اور انسانوں کے ساتھ دیوتا کے براہِ راست تعلق پر اصرار بھی تھا، رومی لشکریوں میں خصوصی ہر دلعزیزی حاصل کر لی جہاں کہیں یہ لشکری گئے وہیں وہ متھرا پوجا کی یادگاریں چھوڑ آئے۔

عیسائیت کا جو دعویٰ ہے کہ اسے تمام مذاہب سے بڑھ چڑھ کر بلکہ کسی دوسرے

مذہب کی شرکت کے بغیر یہ حق ہے کہ وہ ساری نوعِ انسانی کو اپنے پرچم کے نیچے جمع کرے اور اس کے ضمیر پر فرماں روائی کرے اس دعوے پر منصفانہ رائے قائم کرنے کی خاطر ضروری ہے کہ اُن اسباب کو ذہن نشین کر لیا جائے جو شہنشاہ قسطنطین کی تخت نشینی سے پہلے دینِ ناصری کی اشاعت میں ممد و معاون ہوئے۔ حضرت عیسیٰ کے دوبارہ دنیا میں آنے کی بشارت نے اور اس خوش خبری نے کہ ان کے آنے کے ساتھ ہی خدا کی بادشاہی قائم ہو جائے گی، جس میں غریبوں کو سرفرازی حاصل ہوگی اور دولت مند ڈاؤیز (Dives) کی جگہ غریب لازرس (Lazarus) جنت کی نعمتوں کا لطف اٹھائے گا، ادنیٰ طبقوں کے دلوں میں اُمیدوں کی ایک ہل چل برپا کر دی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قریبی حواریوں اور پیروؤں کی ولولوں سے بھری ہوئی اُمیدوں نے آس پاس کے لوگوں کو بھی متاثر کیا اور جیسے جیسے دینِ عیسوی کے مبلغوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ویسے یہ پرجوش عقیدہ دور دراز علاقوں میں پھیلتا گیا۔ قدرتی امر تھا کہ ایک ایسے مذہب کو جو عدمِ مساوات، زیادتیوں اور بے انصافیوں کو بہت جلد رفع کرنے کا وعدہ کرتا تھا عوام میں فوراً ہر دلعزیزی حاصل ہو جائے۔ یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آتے ہی خدا کی بادشاہی قائم ہو جائے گی لوگوں کے دلوں میں اس قدر راسخ تھا کہ اگرچہ اس عہد کا ایفا، جس کے بارے میں یقین دلایا گیا تھا کہ وہ ابتدائی حواریوں کی زندگی ہی میں ہو جائے گا، مستقبل کی دھندلی دوریوں میں آنکھوں سے دور ہٹتا چلا گیا۔ تاہم جن توقعات اور اُمیدوں کو اس نے جنم دیا تھا اُن کا زور اُس وقت تک کم نہ ہوا جب تک عیسائیوں کو صلیبی جنگوں میں حتمی شکست نہ ہوئی۔ ایک ہزار سال کی مدت کے بعد جو پہلے مصائب کا اور پھر کامیابی کا دور تھی، دینِ عیسوی کے غازی اپنے آقا کے ظہورِ ثانی کا پختہ عقیدہ دل میں لیے ایک اور مذہب کے نام لیواؤں کو نیست و نابود کرنے کے ارادے سے میدان میں آئے۔

اس کے علاوہ اور بھی اتنے ہی قوی اسباب تھے جو عیسائیت کے اس صورت میں پھیلنے کے کفیل ہوئے جو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات یا ابیونی اور مسلم عقیدے کے مطابق اُن کے پردہ غیب میں چھپ جانے کے بعد اختیار کی۔

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں یہودیوں کے سوا ایشیائے کوچک، شام اور بحیرۂ

روم کے ساحلی علاقوں کے تمام لوگوں میں ایک مرکز بنے ہوئے خدا اور ایک تثلیث قدسیہ کا تصور عام تھا۔ مصریوں کے سراپسی مذہب کا ایک لازمی رکن تھا۔ لہٰذا آئی سس کی پوجا کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ رومی سلطنت کے ہر حصے میں تثلیث کا تصور سرایت کرتا چلا گیا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد عیسائیت نے جن عقائد کی صورت اختیار کر لی ان کے مانے جانے کے رستے میں نہ کوئی جذباتی اور نہ کوئی مذہبی رُکاوٹ تھی۔

ساتھ ہی ساتھ فلسفیوں نے بھی عیسائیت کو کمک پہنچائی، اگرچہ غیر شعوری طور پر اور اس کی حمایت کرنے کے ارادے کے بغیر، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے عقائد سے واقف ہوئے بغیر۔ انہوں نے فطرتِ الٰہی اور حیات بعد الممات کے بارے میں جو قیاس آرائیاں کیں اُن کا اثر یہ ہوا کہ آئی سس اور متھرا کے پراسرار اور پرانے مسلکوں کی رسومات وعبادات پر بہت سے صاحب فکر لوگوں کا یقین متزلزل ہو گیا، لیکن شائستہ طبقوں کے لوگ دینِ عیسوی کے انقلابی نظریات کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور اسکندریہ کے خداؤں اور سورج دیوتا نے ان کے دلوں پر کچھ اس طرح تسلط قائم کر رکھا تھا کہ تقریباً تین صدیوں تک عیسائیت کی اشاعت اَن پڑھ اور غیر متمدن طبقوں تک محدود رہی۔ جب تک عیسوی کلیسا نے اپنے عظیم اور مسخر القلوب حریفوں سے بہت سے ایمانیاتی مسائل اور اُن کے تقریباً تمام قاعدے، رسمیں، عملیات اور ادارے مستعار لے کر اپنے الٰہیاتی اور عباداتی نظام میں داخل نہ کئے اس وقت تک اُسے اصحابِ فرہنگ وثقافت میں مقبولیت حاصل نہ ہوئی پھر جب یہ لوگ مذہبی جبر یا سلطانی حکم کے دباؤ سے کلیسا کے حلقے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ وہ تمام عناصر لے کر آئے جنہوں نے جدید عیسائیت اور اس کے لاتعداد فرقوں کی تشکیل کی ہے۔ بہر حال دینِ عیسوی کی نشوونما کے ابتدائی دور میں اُس بے پناہ جبر وتشدد نے جو صدیوں تک جاری رہا، عقائد ونظریات میں ایک طرح کی وحدت برقرار رکھی۔

عوام الناس میں آئی سس کی پوجا نے مریم پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم مصری دیوی کی جگہ ''امن کا ملجا'' اور ''اور رحم کا ماویٰ'' بن گئیں۔ اب ان کی پرستش ''خدا کی ماں'' (Modre de dios) کے طور پر ہونے لگی، جیسی

کہ آج تک لاطینی نسلوں میں ہوتی ہے۔

ترکِ دنیا خدایانِ اسکندریہ کے پرستاروں کا ایک مرغوب دستور تھا۔ فیثا غورس اور آرفیس کے مسالک کے تابعین اس پر عمل کرتے تھے اور انہوں نے اُسے گنگا کے ڈیلٹے کے پروہتوں سے، جن کے یہاں یہ عام تھا، اکتساب کیا تھا۔ عیسوی کلیسا نے اُسے اختیار کیا اور مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے اُسے مقدس قرار دیا۔ بپتسمہ دینے والے یوحنا کے یہاں بپتسمہ کی رسم بالکل سیدھی سادی تھی۔ آئی سس پوجا کے زیرِ اثر وہ ایک پرتکلف اور پراسرار رسم بن گئی۔ داخلے کی رسم کی جگہ شرکتِ عشائے ربانی کا قاعدہ رائج ہو گیا۔ اور تو اور، آئی سس کی پراسرار عبادات سے جو یہ عقیدہ متعلق تھا کہ مرے ہوئے خدا کا لہو شراب میں تبدیل ہو جاتا ہے وہ بھی عیسوی نظام کا ایک لازمی جزو بن گیا۔ عیسوی کلیسا کے سرمنڈے صفاچٹ داڑھیوں والے پادریوں کو، سفید پوش خادموں کو، رسومات کی شان و شوکت کو عشائے ربانی کے طریقوں کو، روزوں اور ضیافتوں کی مدتوں کو تاریخ بین عینک لگا کر دیکھیے تو وہ قدیم تر مذاہب جن کی جگہ عیسائیت نے لی اپنے سارے طمطراق اور دھوم دھڑکے کے ساتھ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ عیسوی کلیسا کے مکالماتی دعائیہ سنگیتوں (Litanies) میں ہمیں وہ من موہنے بھجن سنائی دیتے ہیں جو ہزاروں سفید پوش لڑکے لڑکیاں مل کر اسکندریہ کی دیوی (یعنی مغربی غیر اہل کتاب دنیا کی ''مادرِ غمخوار) کے حضور گایا کرتے تھے اور سینٹ پیٹر یا سینٹ پال کے گرجا سے سراپیوم کے مندر تک خیالی سفر کرنے کے لیے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں پڑتی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بڑے بڑے حواریوں نے ان کے مذہب کو جس صورت میں پیش کیا اس میں صرف یہ مستعار دلکشیاں ہی نہ تھیں، بلکہ وہ بذاتِ خود بھی چند ایسی امتیازی صفات سے متصف تھا جو ایسے لوگوں سے خراجِ عقیدت وصول کر سکتی تھیں جو روحانی تصورات اور مذہبی عقائد کے طوفان میں اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر کوئی ایسی امان گاہ ڈھونڈ رہے تھے جہاں اعلیٰ اور ادنیٰ، عالم اور جاہل سب ہمسری کی سطح پر کھڑے ہو سکیں۔ اس کے اعلیٰ پہلو آئی سس اور متھرا کے مسلک کی بہ نسبت زیادہ پرزور طور پر نہیں تو زیادہ یقین آور طور پر ضرور نوعِ انسانی کے اشرف تر جبلی تقاضوں سے خطاب کرتے

تھے۔ زندگیٔ معاد کے بارے میں اس کا وعدہ اُن کے وعدوں سے کم مبہم اور پراسرار تھا، اور اس کے نظریے فلسفیوں کی مجرد قیاس آرائیوں کی بہ نسبت زیادہ ٹھوس اور مثبت تھے۔ وہ تمام پامال ستم لوگوں کے لیے راحت و تسکین کا پیغام اور ساری نوع بشر کے لیے اخوت و مساوات کا وعدہ لایا، (اگرچہ یہ وعدہ آج تک پورا نہیں ہوا) علاوہ بریں اس نے تمام ایمان لانے والوں کو چاہے وہ امیر ہوں یا غریب، نجاتِ اُخروی کا یقین دلایا۔ اگرچہ اس کے مبلغوں کی اذعانیت اور ادعائیت نے کبھی ملکی قوت کی مدد سے اور کبھی اس کی مدد کے بغیر، استفسار کرنے والوں کے ہونٹ سی دیئے۔ پھر بھی جو لوگ پرانے مذہبوں کی سرّیت اور فطرت پرستی کی مستور بے حیائیوں سے متنفر ہو کر اس یقین کے متلاشی تھے کہ دنیوی زندگی کسی وسیع تر زندگی کا ایک حصہ ہے اُن کی تمناؤں کی اس نے تسکین کی۔ مختصر یہ کہ ساری مغربی دنیا کسی مثبت اور بلاواسطہ الہامی انکشاف کے لیے چشم براہ اور گوش برآواز تھی، اور ماضی کی تمام تعلیمات نے اسے دعوتِ حق پر لبیک کہنے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ دینِ کلیلی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے پیشروؤں اور حریفوں کی چھوڑی ہوئی رسوماتی و نظریاتی میراث کو اپنا کر رفتہ رفتہ اُن قوموں کو جو روما کی اس مقصد سے کی گئی کہ انہیں زیادہ قابلِ قبول بنایا جائے، ترقی تھی یا رجعت، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہم سردست نہیں دیتے، لیکن مسلمان حضرت عیسیٰ کے تابعین کو جو الزام دیتے ہیں کہ انہوں نے دینِ عیسوی کا حلیہ بگاڑ دیا وہ الزام بالکل بے بنیاد نہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ کے بے وقت خاتمے نے اور اس امر نے کہ اُن کی تعلیمات میں کوئی ترکیبی نظام نہ تھا ایک طرف تو تخیل کو زیادہ وسیع میدان بہم پہنچایا اور جیسا کہ ابتدائی عیسائیوں کی زندگی سے ظاہر ہے، عقیدہ و عمل کی زیادہ آزادی عطا کی۔ لیکن دوسری طرف مدائل و عبادات کے بارے میں ہی نہیں بلکہ خود حضرت عیسیٰ کی فطرت کے بارے میں بھی بحث و نزاع کا معرکہ زار مہیا کر دیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا یروشلم سے نکالا جانا جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ایک انسان کی حیثیت سے بہت سی روایات تھیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تابعین کا غیر یہودی لوگوں سے مخلوط ہو جانا، جو انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور جن کے یہاں نظم و نسق کائنات سے متعلق نوفیثا

غوری یا افلاطونی خیالات رائج تھے، حضرت عیسیٰ کی شخصیت کا جو دھندلا نقشہ اُن کے تابعین کے تصور میں تھا...... ان سب چیزوں نے مل کر طرح طرح کے نظریوں اور فرقوں کو جنم دیا۔ قرنہا بعد قرن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک ایسا خیالی بت تراشا گیا جس کے نقش و نگار انسانوں سے کوئی مشابہت نہ رکھتے تھے اور جس کا سراپا محض مثالی اور خیالی صفات کا ایک مجموعہ اور ایک اوتار کا سراپا تھا۔ اُن کی دردناک داستانِ حیات جنوں اور پریوں کی کہانی بن گئی اور ان کی زندگی کے گرد افسانوں کا ایک ایسا تار و پود بُن دیا گیا کہ اب ہمارے لیے یہ جاننا ناممکن ہوگیا ہے کہ وہ درحقیقت کیسے تھے اور انہوں نے کیا کیا کیا۔

ظہورِ اسلام سے پہلے کی صدیوں میں عیسائیت نے جو عجیب و غریب روپ بدلے وہ دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ غناسطی عقائد، جو یہودی الاصل عیسائیوں کے خیالات کی عین ضد ہیں، پہلی صدی عیسوی کے اختتام کے لگ بھگ رائج ہوئے، یعنی تقریباً اس زمانے میں جب قیصر ہیڈرین (Hadrian) نے یروشلم کو فتح اور برباد کیا۔ سرِنتھس (Cerinthus) نے، جو اس صدی کے غناسطی معلموں میں سب سے ممتاز تھا، اپنے پیروؤں میں آسمانی باپ اور آسمانی بیٹے کی دوگانہ پرستش رائج کی۔ وہ باپ اور بیٹے کو یسوع، یعنی دنیا کے پیدا کرنے والے، سے بالکل جدا ہستیاں سمجھتا تھا۔

سینٹ پال کی تنگ نظر عیسائیت نے اور اس کے اپنے نظریوں اور اسکندریہ کے دبستانوں کے فلسفے میں مطابقت پیدا کرنے کی جو لاحاصل کوششیں کیں انہوں نے اسی زمانے کے لگ بھگ ایمونیس ساکس (Ammonius Saccas) کی نو افلاطونی اخذیت (Eclecticism) کو جنم دیا، جسے بعد میں اوریجن (Origen) اور دوسرے ممتاز عیسائیوں نے اختیار کیا۔ اس ہرفن مولا مصنف نے، جس کا اثر ابتدائی صدیوں کے تقریباً تمام عیسائی مفکرین کی تحریروں میں پایا جاتا ہے، تمام فرقوں اور عقیدوں میں ایک عام مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بعض باتوں کے اعتبار سے ایمونیس مانی کا پیشرو تھا اور اپنے تمام ہمعصروں میں سربرآوردہ تھا۔ اس نے ایک دبستان قائم کیا، لیکن اس کی تعلیمات نے کسی خاص جماعت کے اخلاق یا عقائد کی تشکیل نہ کی۔

دوسری صدی عیسوی کی ابتدا کش مکش اور بدامنی سے ہوئی۔ عیسوی کلیسا میں فرقہ بندی اور بدعت کا بازار گرم تھا۔ غناسطیت کا بول بالا تھا اور اس نے عیسائیت پر ایک اَن مٹ نقش مرتسم کیا۔ اس صدی میں جو فرقے قائم ہوئے اُن میں سے بعض ایک نگاہِ گزراں کے مستحق ہیں، کیونکہ وہ نہ صرف اُن خرابیوں کا پردہ کھولتے ہیں جو کلیسا کی تعلیمات سے پیدا ہوئیں، بلکہ اس اثر کو بھی ظاہر کرتے ہیں جو زرتشتیت، فیثا غورسیت جدیدہ اور کلدانیوں کی قدیم صابیت نے عیسائیت پر ڈالا۔

مارشونی (The Marcianites)، جو غالبًا ابتدائی غناسطیوں میں سب سے نمایاں تھے، دو اصولوں کے وجود کے قائل تھے، ایک خیرِ کل اور دوسرا شرِ کل۔ ان دونوں کے درمیان نیم خدا (The Demiurse) تھا، جو ایک طرح کا متوسط خدا تھا، نہ تو کاملاً نیک اور نہ کاملاً بد، بلکہ خیر و شر کا مرکب، جو جزائیں اور سزائیں دیتا تھا۔ مارشونی عقائد کے مطابق یہ نیم خدا اس دنیائے سفلی کا خالق تھا اور دائماً اصولِ شر سے برسرِ پیکار تھا (یہاں زرتشتی خیالات کا اثر قابلِ ملاحظہ ہے) اصولِ مطلق نے اس کش مکش کو ختم کرنے اور انسانی روح کو، جو قدسی الاصل ہے، ان مخالف اصولوں کی غلامی سے نجات دلانے کی خاطر یہودیوں کے پاس ایک ایسی ہستی کو بھیجا جو خدا سے قدیم ترین مشابہت رکھتی تھی، یعنی کدا کے بیٹے یسوع مسیح کو، جس نے انسانی شباہت کا ایک سایہ نما سا پیراہن پہن رکھا تھا تاکہ انسانی آنکھ اُسے دیکھ سکے۔ اس آسمانی پیغمبر کو جو کام تفویض کیا گیا، وہ یہ تھا کہ وہ اصولِ شر اور اس دنیا کے خالق دونوں کی سلطنت کو تباہ کردے اور بھٹکی ہوئی روحوں کو راہِ حق پر لائے۔'' اس وجہ سے اصولِ شر نے اس پر ناقابلِ بیان خونخواری اور غضب ناکی سے حملہ کیا۔'' اور اس حملے میں نیم خدا اصولِ شر کا شریک تھا، لیکن یہ حملہ ناکام رہا، کیونکہ صرف ایک مجازی جسم رکھنے کی بدولت آسمانی پیغمبر دُکھ درد سے مصئون تھا۔

ویلنٹینی (The Valentinians) جن کا اثر و نفوذ زیادہ دیرپا ثابت ہوا، یہ تعلیم دیتے تھے کہ ''خدائے برتر و بالا نے اپنے بیٹے یسوع کو اجازت دی کہ طبقاتِ علوی سے اُتر کر زمین پر آئے تاکہ وہ انسانوں کو اُن کے گناہوں سے پاک و صاف کرے اور جب وہ اُتر کر آیا تو اس نے ایک واقعی جسم کا نہیں، بلکہ ایک سماوی و ہوائی جسم کا جامہ پہن رکھا

تھا۔'' ویلنٹینی حضرت عیسیٰ کو ذات باری کا ایک صدور سمجھتے تھے، جس کا نزول اس دنیا پر تاریکی کے بادشاہ کی حکومت کو تاراج کرنے کی خاطر ہوا۔

اوفی (The Ophites)، جو مصر میں گزرے، جگنوں، مادے کی قدامت، دنیا کے خلاف رضائے الٰہی پیدا ہونے اور نیم خدا کی ستم پیشگی کے قائل تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ ''خداوند مسیح اور یسوع نامی بشر ایک ہو گئے ہیں تا کہ غاصب کی باطل حکومت کا قلع قمع کریں۔'' ان کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ سانپ جس نے آدمؑ وحوا کو ورغلایا خود مسیح تھا یا سانپ کے بھیس میں صوفیا (Sophia)۔

ادھر کلدانی فلسفے کے زیرِ اثر غناسطی مذاہب وجود میں آ رہے تھے، اُدھر یونانی اس کوشش میں معروف تھے کہ ''باپ، بیٹے، روح القدس اور دو فطرتوں کے مسیح کی صورت میں اتحاد'' کے بارے میں سینٹ پال کے جو عقائد تھے اُن میں اور نظامِ عالم سے متعلق اپنے خیالات میں ہم آہنگی پیدا کریں۔ پرکسیس (Praxeus) عیسائیت کے ان سوفسطائی مبلغین میں پہلا تھا اور اس نے آغازِ کلام یہ کہہ کر کیا کہ ''باپ، بیٹے اور رُوح القدس'' میں کوئی حقیقی فرق نہیں اور آسمانی باپ اپنے بیٹے مسیح سے اس درجہ متحد تھا کہ وہ بیٹے کی مصیبت بھری زندگی کے رنج والم اور اس کی شرمناک موت کی اذیت میں برابر کا شریک بنا!

موشیم (Mosheim) کہتا ہے: ''یہ فرقے فلسفے کی پیداوار تھے عیسوی کلیسا پر مونٹانس (Montanus) فریزی کی صورت میں ایک اور مصیبت آنے والی تھی۔'' اس شخص نے، جو علم و دانش سے نفور تھا، اپنے آپ کو وہ فارقلیط کہا جس کے آنے کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ بہت جلد لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس کی پیرو بن گئی۔ ان میں سب سے مشہور پریسلا (Priscilla) اور میکسملا (Maximilla) تھیں۔ یہ دونوں اپنے آپ کو نبیہ کہتی تھیں اور ''ان کا سرمایہ پاکبازی سے بڑھ کر دولت مندی تھا'' انہوں نے شمالی ایشیا کو ایک مذبح بنا دیا اور اپنی خون آشامی اور غضب ناکی سے نوعِ انسانی پر ہولناک مصیبتیں نازل کیں۔

جس زمانے میں مارشیونی، ویلنٹینی، مونتانی اور دوسرے غناسطی فرقے ساری

رومی سلطنت میں اپنے عقائد کی اشاعت کی خاطر مصروف کار تھے اُسی زمانے میں ایران کی سرزمین سے ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس کی شخصیت دو براعظموں کے فلسفے پر ایک اَن مٹ نقش ثبت کر گئی ہے۔ مانی بہمہ وجوہ اپنے زمانے کے فرہنگ و دانش کا کامل ترین نمائندہ تھا۔ وہ ہیئت دان تھا، وہ ماہر طبیعات تھا، موسیقی کا اُستاد تھا اور اعلیٰ درجے کا نقاش تھا۔ نگار خانہ مانی کی مشہور و معروف تلمیح اُسی کی یادگار ہے۔

وہ یہودیوں کے قبلہ (Cabbala) یعنی باطنی علم اور غناسطی اُستادوں کی تعلیمات سے پوری طرح واقف تھا۔ مشرق کا فلسفہ اور تصوف اُس کی گھٹی میں تھا۔ نسلاً تو وہ مجوسی تھا، لیکن تعلیماً عیسائی۔ اس کے اردگرد اختلاف و افتراق کا جو ہنگامہ برپا تھا اُس نے اس کے خلاف اعلانِ بغاوت کیا اور عقائد کے انتشار کے اندر سے ایک ایسا مذہب ایجاد کرنے میں کوشاں ہو گیا جس سے تمام لوگوں کے دلی تقاضوں اور آرزوؤں کی تسکین ہو سکے۔ اس نے بڑی جسارت سے کام لے کر متداول مذہبوں کی جڑیں کھوکھلی کیں۔ اس کا طریقِ کار یہ تھا کہ جس مذہب کو وہ اپنا نشانہ بناتا بظاہر اس کا اقرار کرتا لیکن درپردہ اس پر نہایت لطیف انداز سے نکتہ چینی کرتا جس سے لوگوں کے ایمان میں خلل آ جاتا۔ یہی طریقہ اس کے ہم مشرب اسماعیلیوں نے بعد میں اختیار کیا۔ اس جسارت نے اور مانی نے باطنیوں کی طرح تمام مذہبی عقائد سے مخفی معانی کا رمز آشنا ہونے کا جو دعویٰ کیا اس نے تمام مذہبوں اور فرقوں کو اس کا مخالف بنا دیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں کہیں وہ اور اس کے پیرو جاتے، ایسے ایسے مظالم کے مورد بنائے جاتے کہ تاریخ اُن کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مانی کا مسلک عیسائیت کے عقائد اور ایرانیوں اور کلدانیوں کے قدیم فلسفے کا ایک عجیب و غریب امتزاج تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ مادہ اور نفس دائمی طور پر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں۔ مادہ دو فطرتوں کا مالک ہے، ایک قدسی اور دسری مادی۔ اول الذکر آسمانی نور یا روح کا ایک جزو ہے۔ مادے اور نفس میں جو تنازعہ ازل سے جاری ہے اُس کے دوران مادے نے انسانوں کو تخلیق کیا۔ روحِ قدسی کو اس زندان سے آزاد کرانے کی خاطر جس میں وہ قید تھی، خدائے بزرگ و برتر نے اقلیمِ شمسی سے ایک

ایسے وجود کو بھیجا جس کی ساخت خود اس کے جوہر سے ہوئی تھی اور جس کا نام مسیح تھا۔ چنانچہ مسیح انسانی جسم کا ایک موہوم سا لباس پہنے یہودیوں میں نمودار ہوا اور اس نے اپنی تبلیغ کے دوران فانی انسانوں کو یہ سکھایا کہ وہ کیونکر نفسِ ناطقہ کو فاسد جسم سے علیحدہ کر سکتے ہیں اور کیوں کر مادے کے شر پر قابو پا سکتے ہیں۔ تاریکی کے سردار نے یہودیوں کو یہ ترغیب دلائی کہ وہ مسیح کو ہلاک کر دیں' چنانچہ مسیح کو سولی پر چڑھا دیا گیا، لیکن یہ محض آنکھ کا دھوکا تھا۔ درحقیقت مسیح اپنا کام انجام دے کر اقلیم شمسی میں واپس چلا گیا اور وہاں جا کر اپنے تخت پر بیٹھ گیا۔

چنانچہ مانوی مسیح نہ کھا سکتا تھا، نہ پی سکتا تھا نہ دکھ اٹھا سکتا تھا، نہ مر سکتا تھا، وہ ایک مجسم خدا یا اوتار بھی نہ تھا، بلکہ محض ایک پیکرِ خیالی تھا، یعنی ''ایک حاویٔ کل عنصرِ نور جو فطرت کے زندان میں قید تھا، لیکن فطرت کی کسی شکل میں نمودار نہ ہوا، بلکہ اس سے نجات پانے کے لیے کوشاں رہا۔' یہ عقائد کتنے ہی کفر آمیز اور خلافِ عقل کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں، مسلمانوں کو استحالۂ عشائے ربانی کا مسئلہ اور یہ عقیدہ کہ عشائے ربانی کے اجزا فی الواقع خدا کے گوشت اور خون میں تبدیل ہو جاتے ہیں ان سے بھی زیادہ کفر آمیز اور خلافِ عقل معلوم ہوتے ہیں۔

مانی نے اپنے مریدوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا: یعنی ''برگزیدگان'' اور ''شنوندگان''۔ برگزیدوں کے لیے گوشت اور نشہ آور مشروبات قطعاً حرام تھے اور ان پر شادی اور تمام لذاتِ حسی سے پرہیز واجب تھا۔ ''سننے والوں'' (شنوندگان) کے لیے جو پابندیاں تھیں وہ نسبتاً کم سخت تھیں۔ انہیں اجازت تھی کہ مکانوں، زمینوں اور زر و مال کے مالک بنیں، گوشت کھائیں اور شادی بیاہ کریں، لیکن ان مباحات پر بہت سی حدیں عائد تھیں اور ان کے بارے میں اعتدال اور میانہ روی کی سخت تاکید تھی۔

مانی بہرام گور کے حکم سے قتل کیا گیا، لیکن اس کے عقائد عیسائیت میں داخل ہو گئے، اور آگے چل کر کلیسا میں جو جدال انگیز تفرقے پیدا ہوئے ان میں ان عقائد کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

تیسری صدی عیسوی کے وسط میں سابلیوں (The Sabellians) کا فرقہ نمودار

ہوا، جو دین، عیسوی میں ایک نئی تحریک کا موسس تھا۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک انسان تصور کرتے تھے، لیکن اس کے قائل تھے کہ بزرگ و برتر آسمانی باپ سے ایک خاص قوت صادر ہو کر یسوع نامی بشر میں داخل ہوگئی اور اس طرح وہ خدا کا بیٹا بن گیا۔ یہ عجیب و غریب نظریہ، جسے گبن (Gibbon) عیسوی موحدیت سے مشابہ خیال کرتا ہے عیسوی کلیسا میں بڑے خلفشار کا باعث بنا اور اس کی تردید کی خاطر اوریجن (Origen) نے چوتھی صدی عیسوی کی ابتدا میں خدا کی تین جداگانہ شخصیتوں کا عقیدہ رائج کیا۔ تین خداؤں کا عقیدہ وہی پرانا غیر اہلِ کتاب کا عقیدہ تھا جسے عیسائیت کے پیروؤں کے مزاج کے مطابق ایک نئے سانچے میں ڈھال لیا گیا تھا۔ کثرت پرستی ان کی گھٹی میں تھی، چنانچہ تین خداؤں کی پرستش حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور لاتعداد خداؤں کی قدیم پرستش میں ایک قسم کی مصالحت تھی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ تین خداؤں کی پرستش عقیدۂ تثلیث میں ضم ہوگئی۔ لیکن اس واقع سے پیشتر اس نے عیسائیوں کے سب سے زیادہ فلسفی مزاج فرقے کو جنم دیا۔

اریوسیت (Arianism) کا خروج بڑی حد تک اس بغاوت کا نتیجہ تھا جس نے اسکندریہ میں، جو اس وقت عیسائی دنیا سب سے زیادہ تعصب زدہ شہر تھا، اپنے بشپ سے اختلاف رائے کر کے یہ تعلیم دینے کی جرأت کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے ہم جوہر نہ تھے۔ اریوسی مسلک بہت جلد مصر اور شمالی افریقہ میں پھیل گیا اور بے حد تم کیشانہ مخالفتوں کے باوجود ان علاقوں پر مسلط رہا۔ بالآخر اس کے پیرو حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئے[1]۔

اریوس کے تفرقے نے جو ابتری پھیلائی تھی اس کے تدارک کے لیے شہنشاہ قسطنطین (Constantine) نے ۳۲۵ء میں بتھینیا (Bithynia) کے مقام پر نیقیہ کی کونسل (The Council of Nice) منعقد کی۔ اس مجلس میں طرفین کے زبردست مجادلوں کے بعد اریوس کے نظریے کی تردید کی گئی اور حضرت عیسیٰ کو آسمانی باپ کا ہم ذات و ہم جوہر قرار دیا گیا۔

---

[1] سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہی اپنا کے سوی نس (Socinus) نے اریوس کے عقائد کی تجدید و توسیع کی۔ آج کل کے عیسائی موحدین سوی نوسیوں (The Socinians) کے بلا واسطہ روحانی جانشین ہیں۔ سوی نوسی حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے منکر تھے۔ وہ فطری معصیت اور کفارہ کے بھی قائل نہ تھے۔ اُن کے نزدیک صرف خدا قابلِ پرستش تھا۔

عیسوی کلیسا کی حالت اس سے پہلے کچھ بھی رہی ہو، اس کے بعد اس کی تاریخ ابتری، تشدد، خانہ جنگی، ہولناک جبر و تعدی، زہر آلود نفرت اور انسانوں کے دلوں سے عقل اور انصاف کو خارج کر دینے کی دائمی کوششوں کی ایک مسلسل اور تاسف انگیز روداد ہے۔ کلیسا کے منصب داروں کی سیاہ کاریاں حد سے گزر گئیں اور مشائخ کلیسا کی عیش پرستی، کبر و نخوت اور شہوت رانی کے افسانے زبانوں پر آنے لگے۔ ابتدائی دور کے ترک دنیا کی جگہ رہبانیت نے لے لی اور راہبوں کی اوباشی ضرب المثل بن گئی۔ یہ لوگ کلیسا کے آزاد سپاہی تھے اور ان کا مشغلہ ہر جگہ کھلبلی مچانا اور افراتفری پھیلانا تھا۔ ان کی بدعنوانیوں کے طفیل قسطنطنیہ، اسکندریہ اور روما کے کوچہ و بازار میں آئے دن خون کی ندیاں بہتی تھیں۔

ہائی پیشیا (Hypatia) کے قاتل سِرل (Cyril) کے ساتھ نسطوریس (Nestorius) کا مناقشہ عیسائیت کی تاریخ کا ایک نمایاں باب ہے۔ ایفی سیوس (Epheseus) کی دوسری کونسل کا ایک مقصد یہ تھا کہ کلیسا میں جو مخالف گروہ پیدا ہو گئے تھے اُن کی آپس میں مصالحت کرائی جائے، لیکن گبن کے الفاظ میں "بطریق اسکندریہ کی آمریت نے پھر ایک بار آزادی رائے کا گلا گھونٹ دیا۔ یسوع مسیح کی دو فطرتوں کے نظریے کی باقاعدہ طور پر تردید کی گئی۔" جو لوگ کلیسا کے ٹکڑے کرتے ہیں تلوار اُن کے ٹکڑے کرے"۔ "ان کے پرزے اُڑیں"۔ "وہ زندہ جلا دیئے جائیں"۔ یہ تھیں کلیسا کی ایک مجلسِ عالیہ کی کریم النفسانہ دعائیں"۔

کالسیدون (Chalcedon) کی کونسل میں، جو روما کے بشپ کی فرمائش پر منعقد ہوئی، یہ عقیدہ حتمی طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے اوتار کی حیثیت سے تھے تو ایک شخصِ واحد لیکن ان کے اندر دو فطرتیں جمع تھیں۔

مونوفیزیوں (The Monophysites) اور نسطوریوں (The Nestorians) نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مجسم خدا ہونے کے نظریے سے اختلاف کر کے کالسیدون کے فتوے کے خلاف موقف اختیار کیا۔ لیکن راسخ العقیدہ لوگ اپنے معلم کی فطرت کا معما حل کر چکے تھے، اور یہ اہلِ بدعت اُن کے شدید حملوں کی تاب نہ لا سکے۔ یروشلم پر راہبوں کے ایک لشکر نے قبضہ جما لیا اور ایک واحد الفطرت اوتار کے نام پر قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مزار انسانی خون سے داغ داغ ہوگیا۔ اسکندریہ کے عیسائی ایک عورت کا قتل تو کر ہی چکے تھے، اب انہوں نے اپنے بطریق کو بھی بپتسمہ گاہ میں ذبح کر ڈالا اور اس کی تکا بوٹی کر کے لاش کو جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اُڑا دی۔

چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں مونو فیزیوں کی قسمت کا ستارہ اُن کے ایک رہبر یعنی اوڈیسہ کے ذریعے چمکا اس کے جانشینوں کے زیرِ سایہ انہوں نے مشرقی سلطنت میں بالادستی حاصل کی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے نسطوریوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے اور کالسیدونیوں کے ساتھ جھگڑے کر کے عیسوی کلیسا کو خانہ جنگی اور کشت وخون میں غرق کر دیا۔ مونو فیزیوں کا یہ عقیدہ کہ ''مسیح کی قدسی اور بشری قوتوں کی سرشت کچھ ایسی تھی کہ وہ ایک واحد فطرت کی صورت میں مجتمع ہوگئی تھیں، لیکن اسی طرح کہ اُن میں نہ کوئی تغیر ہوا تھا، نہ کوئی اشتباہ، نہ کوئی امتزاج'' ایک غیر عیسائی کو کالسیدون کی کونسل کے طے کئے ہوئے عقیدے سے ذرہ برابر اختلاف دکھائی نہیں دیتا۔ بااین ہمہ یہ تمیز بلا تفریق انسانوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے مصیبتوں کا باعث بنی۔ بالآخر ۶۳۰ء میں ہریکلس (Heraclius) نے اس خلفشار کو ختم کرنے کے لیے ایک نیا فرقہ قائم کیا، یعنی مونو تھیلیوں (The Monothelites) کا فرقہ، جس کے عقائد اتنے ہی مہمل اور عقل سوز تھے۔ ان لوگوں کا ایمان تھا کہ ''مسیح کامل خدا بھی تھا اور کامل بشر بھی اور اس میں دو مستقل فطرتیں جمع تھیں، جو اس طرح متحد ہوئی تھیں کہ نہ کوئی امتزاج واقع ہوا تھا اور نہ کوئی اشتباہ۔ البتہ ان کے اجتماع سے ایک واحد شخصیت پیدا ہوگئی تھی۔'' بہر حال اس فرقے کے خروج نے عیسوی کلیسا میں امن قائم کرنے کی بجائے تفرقہ وفساد کو اور بھی بڑھا دیا۔ چنانچہ مغربی ایشیا، شمالی افریقہ اور یورپ کے بہت سے حصوں میں کشت وخون کا ہنگامہ برپا رہا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر ہر طرح کے انسانیت سوز مظالم ہوتے رہے۔

یہ تھی عیسوی دنیا کی مذہبی حالت اُن صدیوں میں جو ظہورِ اسلام سے پہلے گزریں۔

شہنشاہ قسطنطین کے بظاہر عیسائیت قبول کرتے ہی رومی سلطنت میں عیسائیت برسرِ اقتدار آ گئی۔ غیر اہلِ کتاب مذہب کا وقتِ آخر قریب آ پہنچا تھا۔ اگرچہ قیصرانِ روم میں سب سے جلیل القدر اور سب سے مخلص قیصر کی چارہ گری کی بدولت اُس نے کچھ

مدت کے لیے سنبھالا لیا، لیکن اس کا خاتمہ ناگزیر ہو چکا تھا۔ گبن کہتا ہے: ''غیر اہل کتاب مذہب کے ناپید ہو جانے کے بعد توقع ہو سکتی تھی کہ عیسائی امن و امان اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کر کے اپنی فتح یابی سے تمتع اندوز ہوں گے۔ لیکن تفرقے کا جو بیج اُن کے سینے میں بویا گیا تھا وہ پنپ رہا تھا۔ چنانچہ انہیں اپنے آبائی مذہب کے قوانین پر عمل کرنے کی بہ نسبت اُس کی فطرت کی چھان بین کرنے کی زیادہ فکر تھی[1]۔ سارا عیسائی یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور کلیسا تفرقوں اور بدعتوں کے ہاتھوں پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ عوام الناس کے مذہبی تصورات قبلِ عیسائیت جاہلیت کے مرحلے سے ایک قدم آگے نہ بڑھے تھے۔ مُردوں کی روحوں اور زندہ لوگوں کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ تبرکوں اور ولیوں کی پرستش عام تھی۔ مختصر یہ کہ عیسائیت کفر و الحاد کی طرف مراجعت کر گئی تھی۔

جو قومیں عیسائیت کے زیرِ نگیں تھیں اُن کی معاشرتی اور سیاسی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ آزادیٔ فکر و رائے کچل دی گئی تھی اور مسیح کی سلطنت کے جشن ایسے بدعتیوں کی قربانی سے منائے جاتے تھے جو کسی رائج الوقت خیال سے اختلاف کی جسارت کرتے۔

اسکندریہ کے بازار میں مہذب دنیا کی نگاہوں کے سامنے ازمنۂ قدیم کی برگزیدہ تریں عورت انتہائی سفاکی کے ساتھ ایک ایسے عیسائی کے ہاتھوں قتل ہوئی جس کا نام عیسائی اولیا کی فہرست میں درج ہے اور جس کی حمایت زمانۂ جدید کے ایک مصنف نے کی ہے۔ اس ہولناک اور نفرت انگیز جرم کو، جو عیسائیت کے دامن پر ایک بدنما تریں داغ ہے، ڈریپر (Draper) نے بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایک حسین، دانش مند اور نیکوکار عورت، جس کے درس میں اسکندریہ کے دولت مند اور شائستہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی تھی، اپنی درسگاہ سے باہر آ رہی تھی کہ جوشیلے عیسائیوں کے ایک ہجوم نے اس پر حملہ کر دیا۔ ان حامیانِ دین نے نعرے لگاتے ہوئے اُسے گھسیٹ کر پالکی سے اُتار لیا اور بھرے بازار میں سرتاپا عریاں کر دیا۔ اس کے بعد وہ اُسے گھسیٹ کر قریب کے ایک گرجا میں لے گئے، جہاں ایک نام نہاد

---

[1] شہنشاہ جسٹینین (Justinian) معروف بہ مُرتد، سے نقل ہے: ''کوئی درندہ بھی انسان کا اتنا دشمن نہ ہوگا، جتنا عیسائیوں کا ایک فرقہ دوسرے فرقوں کا دشمن ہے۔''

"ولی" نے ایک ڈنڈے سے اس کا کام تمام کر دیا۔ بچاری کی برہنہ لاش کی بے حرمتی کی گئی اور اس کا عضو عضو کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ لیکن اس شیطانی جرم کی تکمیل اس وقت تک نہ ہوئی جب تک کہ اس کا گوشت سیپیوں سے کھرچ کر ہڈیوں سے جدا نہ کر دیا گیا اور بچے کھچے ڈھانچے کو جلا نہ دیا گیا۔ اس بھیانک اور گھناؤنے جرم کے ارتکاب میں جس شیطان صفت انسان نے سرغنے کا کردار ادا کیا دنیائے عیسائیت نے اُسے "ولی" کا لقب دے کر سرافراز کیا۔ بالآخر ہائی پیشیا (Hypatia) کی شہادت کا انتقام عمرو بن العاص کی تلوار نے لیا۔

جسٹینین (Justinian) کے عہد میں جس کی عیسائیت نوازی اور قانون سازی کے قصیدے گائے جاتے ہیں قسطنطنیہ کے جو حالات تھے وہ اس اخلاقی پستی اور خواری کا بہترین آئینہ ہیں جو اُس وقت ساری عیسوی دنیا میں عام تھی۔ خلوت میں ہو کہ جلوت میں۔ پاکبازی ایک جنس مفقود تھی۔ معاشرے میں نہ اس کا کوئی وجود تھا، نہ کوئی تصور۔ قیصروں کے تخت پر ایک فاحشہ عورت براجمان تھی اور وہ قیصر کے اعزاز و اقتدار میں برابر کی شریک تھی۔ تھیوڈورا (Theodora) قسطنطنیہ میں پیشہ کر چکی تھی اور شہر کے اوباشوں میں اُس کا نام ضرب المثل تھا۔ اب اُسی شہر میں "ثقہ حکام، راسخ العقیدہ بشپ، فاتح جرنیل اور قیدی بادشاہ" اُسے خراجِ عبودیت پیش کرتے تھے۔ اس کی ستم طرازیوں نے، جو نہ مذہبی، نہ اخلاقی قوانین کی پابند تھیں، ساری سلطنت میں کہرام مچا دیا۔ آئے دن شورشیں، بلوے اور خونریز ہنگامے ہوتے تھے، جن میں پادری لوگ ہمیشہ نمایاں کردار ادا کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر ہر خدائی اور انسانی قانون پاؤں تلے روند دیا جاتا تھا۔ عبادت گاہیں قربان گاہیں بن جاتی تھیں، کسی جگہ کی حرمت ملحوظ نہ رکھی جاتی تھی، معاشرے کے تمام رابطے کٹ جاتے تھے اور روزِ روشن میں سیاہ ترین جرائم کا ارتکاب کیا جاتا تھا۔ جسٹینین کی حکومت کے پانچویں سال میں جو بلوے ہوئے اُن میں یہ ناپاک شہر جن ہولناک کارروائیوں کا معرکہ زار بنا، اُن کی مثال تاریخ کے صفحات میں مشکل سے ملے گی۔

اس وقت قسطنطنیہ کے مقابلے میں ایران ایک دارالامان تھا۔

عیسوی قسطنطنیہ کی تاریخ جن جرائم سے داغدار ہے۔ اُن کی رُوداد پڑھ کر انسان

کے دل میں انتہائی کراہت پیدا ہوتی ہے۔ ابھی پیغمبر اسلام ﷺ اپنے عہدِ شیر خواری ہی میں تھے کہ ایک عیسائی بادشاہ کے ایما پر ایک بازنطینی شہنشاہ کو جس کا شمار اس سلطنت کے نیک ترین فرمانرواؤں میں ہوتا ہے، بیوی بچوں سمیت انتہائی بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ قاتلوں نے اُسے ایک مقدس مقام سے، جہاں اس نے پناہ لی تھی، گھسیٹ کر باہر نکالا اور اس کے پانچ بیٹوں کو یکے بعد دیگرے اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کیا۔ سب سے اخیر میں شہنشاہ کی باری آئی۔ ملکہ اور اس کی بیٹیوں کو پہلے تو اذیتیں پہنچائی گئیں اس کے بعد اسی جگہ لے جا کر جہاں شہنشاہ موریس (Maurice) کو قتل کیا گیا تھا اُن کے سر قلم کر دیئے گئے۔ شہنشاہ کے دوستوں، رفیقوں اور طرفداروں پر جو مظالم ڈھائے گئے، وہ بازنطینی عیسائیوں کی اخلاقی زبوں حالی کے شاہد ہیں۔ اُن لوگوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دی گئیں۔ اُن کی زبانیں گدی سے کھینچ لی گئیں، اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے۔ بعضے تازیانے کی ضربوں سے مر گئے۔ بعضے جلا دیئے گئے اور بعضوں کو تیروں سے چھلنی کر دیا گیا۔ گبن کہتا ہے: ''عاجل موت ایک ایسی رحمت تھی جو اُن میں سے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔''

بازنطینی سلطنت، جس کا خونِ زندگی قطرہ قطرہ رس رہا تھا، جس کو سیاسی اور مذہبی تفرقوں نے پارہ پارہ کر دیا تھا، مذہبی مباحثوں نے پریشان کر رکھا تھا اور ''وحدت اعتقاد کو بزور عائد کرنے کی خواہش نے دیوانہ بنا دیا تھا'' کشت و خون فسق و فجور اور ظلم و ستم کا ایک ڈراؤنا اور گھناؤنا نظارہ پیش کر رہی تھی[1]۔ وہ ملک جو فرات کے مغرب کی طرف

---

[1] مل مین (Milman) اُس زمانے کی عیسائیت کی ہیئت کذائی کا نقشہ یوں پیش کرتا ہے ''قسطنطنیہ کا بشپ یا تو بازنطینی شہنشاہ کا صید بے چارہ یا غلام زر خرید یا حریفِ تفرقہ پرداز تھا وہ شہنشاہ کی آمریت پر کوئی اعلیٰ اخلاقی اثر نہ ڈال سکتا تھا۔ ادنیٰ طبقے کے پادری چاہے معاشرے کو کتنے ہی مخفی فائدے پہنچاتے ہوں، اُن کے قبضے میں اتنی طاقت، دولت اور مرتبت تھی کہ ان کے دلوں میں بڑائی کی آرزوئیں پیدا ہونا یا ان کا سازشوں کے جال بچھانا ایک قدرتی امر تھا، لیکن اتنی نہ تھی کہ وہ عوام کے ذہنوں پر کوئی صحت بخش اثر مرتب کر سکتے، ایک زوال پذیر عہد کی اخلاقی خرابیوں کو روک سکتے، مخالف مفادات میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے، ایک دوسری کی دشمن قوموں کو شیر و شکر کر سکتے۔ اُن کا حکم اگر کبھی چلتا بھی تھا تو صرف اس لیے کہ لوگ توہمات کی بنا پر اُن سے ڈرتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ لوگ اُن کی عزت کرتے تھے یا ان کے گرویدہ تھے۔ وہ عوام کی علمی سطح کو تو کیا بلند کرتے، خود ان کی جہالت کی دلدل میں ڈوب گئے اور بدترین قسم کی وحشت و بربریت یعنی ایک از کار رفتہ تہذیب کے شکار ہو گئے۔ رہبانیت بہت سے ایسے لوگوں کو جو مستعد اور مفید شہری (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

ایشیائی ترکی میں شامل تھے، پہلے تو کبھی پارتھیوں اور کبھی آریاؤں کے ہاتھوں تاراج ہوئے اور پھر کبھی ایرانیوں اور کبھی بازنطینیوں کے ہاتھوں چنانچہ وہ انتہائی مایوسی کا مرقع پیش کرتے تھے۔ اُن کی مادی خستہ حالی ان کی اخلاقی ذلت سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے ان خرابیوں کو رفع کرنے کی بجائے انہیں اور بھی شدید بنا دیا۔ بین النہرین میں مجوسی زرتشتیت زوال یافتہ عیسائیت سے الگ برسر جنگ تھی، نسطوری راسخ العقیدہ عیسائیوں سے الگ جدال آزما تھے۔ 'مونٹینس (Montanus) اور دائی نبوت عورتوں میں الگ چپقلشیں جاری تھیں۔ ان سب فتنوں کا نتیجہ یہ تھا کہ مغربی ایشیا ایک دشتِ مایوسی بنا ہوا تھا۔

فتوحات کے جو جھکڑ افریقہ میں چلے تھے اور دینِ عیسوی کے پیروؤں اور مبلغوں نے کشت وخون اور تاخت وتاراج کے جو طوفان برپا کئے تھے انہوں نے مصر میں اور روبہ زوال عیسوی سلطنت کے افریقی صوبوں میں اخلاقی زندگی کے تمام شعلے افسردہ کردیئے تھے۔ یورپ میں لوگوں کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ روزِ روشن میں اور نہ صرف عوام بلکہ پیشوایانِ دین کی آنکھوں کے سامنے اپنے ملک کا محسن نارسیز (Narses) قسطنطنیہ کے بازار میں زندہ جلا دیا گیا۔ روم کے گلی کوچوں میں اکسارک (Exarch) کی نگاہوں کے سامنے، مخالف بشپوں کے طرف داروں نے کھلم کھلا لڑائی کی اور گرجوں کو عیسائیوں کے خون سے رنگ دیا۔ ہسپانیہ تاراج اور خستہ حالی کا ایک جگر خراش منظر پیش کر رہا تھا۔ دولت مند اور خصوصی مراعات کے مالک معدودے چند لوگ، جو شہنشاہوں کے ماتحت صوبوں کی بڑی بڑی مجسٹریٹیوں پر فائز تھے یا صرف مجسٹریٹ کے خطاب سے عزت یافتہ تھے، ہر طرح کے ٹیکسوں سے سبکدوش تھے۔ وہ خوبصورت بنگلوں میں رہ کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۲) بن سکتے تھے عملی زندگی کے رستے سے ہٹا کر گوشہ غربت میں لے گئی، جہاں وہ ایک کاہلانہ مذہبی زندگی بسر کرتے تھے لیکن سوائے ایسے موقعوں کے کہ جب راہب لوگ سیاسی ریشہ دوانیوں یا مذہبی مناقشوں کی خاطر دھڑے باندھتے تھے، معاشرے سے ان کا کوئی سروکار نہ ہوتا تھا، اور وہ اس پر کوئی اثر نہ ڈال سکتے تھے۔ وہ دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ تارکینِ دنیا جنگلوں میں اور راہب اپنے بسم اللہ کے گنبدوں یعنی راہب خانوں میں۔ انہیں اپنی نجات کا یقین تو ہوتا ہی تھا، اس لیے وہ باقی انسانوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے تھے کہ جہنم واصل ہوتے ہیں تو ہوا کریں۔"

عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے، غلام اور لونڈیاں ان کی خدمت پر مامور تھیں اور ان کا زیادہ تر وقت حماموں میں گزرتا تھا، جو بدترین قسم کے قحبہ خانے تھے یا جوا کھیلنے یا شراب و کباب کی محفلوں میں۔ ایک طرف تو یہ عیش و عشرت اور دولت و ثروت تھی، اور دوسری طرف عوام میں انتہا درجے کی عسرت و خستہ حالی تھی۔ متوسط طبقے کے لوگ، جو مملکت کے آزاد شہری تھے، رومیوں کی ستم شعاریوں کے تختۂ مشق تھے۔ زرعی غلام تو اب ختم ہو چکے تھے، لیکن ان کی جگہ بسے نوآبادوں نے لے لی تھی جو نہ غلام تھے نہ پوری طرح آزاد۔ غلاموں سے ان کی حالت بعض باتوں کے اعتبار سے بہتر تھی۔ انہیں قانوناً شادی کرنے کی اجازت تھی۔ جن زمینوں کی وہ کاشت کرتے اُن کی پیداوار کا کچھ حصہ انہیں ملتا تھا اور اُن کے آقاؤں کو یہ اختیار نہ تھا کہ اُن کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیں۔ لیکن باقی ہر لحاظ سے وہ زمین کے غلام تھے۔ حکومت کو ان سے ہر طرح کا کام لینے کا اختیار تھا۔ گھریلو غلاموں کی طرح انہیں جسمانی سزائیں دی جاتی تھیں[۱]۔ وہ افراد کے غلام تو نہ تھے لیکن زمین کے غلام تھے۔ ان معنوں میں کہ جن زمینوں کی وہ کاشت کرتے تھے، ان کے ساتھ نہ صرف عمر بھر کے لیے بلکہ پشت ہا پشت تک موروثی طور پر بندھے رہتے تھے۔ ان نام نہاد آزاد لوگوں سے قطعِ نظر، آبادی کا بیشتر حصہ غلاموں پر مشتمل تھا، اور ان غلاموں کی حالت اتنی بری تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ اُن کے ساتھ جانوروں جیسا، بلکہ اس سے بھی بدتر، سلوک کیا جاتا تھا۔ وحشیوں کے حملے نے ہسپانیہ پر ایک نئی قیامت ڈھا دی۔ وہ اپنے جلو میں ہولناک تباہی کو لے کر آئے۔ وہ جدھر گئے انہوں نے کشت و خون اور لوٹ مار سے کہرام مچا دیا اور عورتوں اور بچوں اور پادریوں کو غلام بنا لیا۔

جزیرہ نمائے ہسپانیہ میں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد صدیوں سے آباد تھی۔ سسی بُت وزیگوتھ (Sisebut the Visigoth) کے عہدِ حکومت میں ۶۱۶ء کے لگ بھگ ان لوگوں پر پادریوں کے ہاتھوں جو دہشت ناک مظالم شروع ہوئے وہ اس وقت ختم ہوئے جب اسلام نے آ کر جہالت و تعصب کے ان ستم رسیدوں کو چھٹکارا دلایا۔ یہ اسلام ہی کی برکت تھی جس نے یہودیوں کو ابن میمون (Maimonides) اور ابن جبرول

---

[۱] چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر عموماً تین سو کوڑے لگائے جاتے تھے۔

(Ibn-e-Gabrol) جیسے آدمی پیدا کرنے کی توفیق بخشی۔

آیئے اب ہم اس پراسرار اور رومانی ملک ...... عرب ...... کی طرف متوجہ ہوں جو اب تک دنیا کی بڑی بڑی قوموں سے الگ تھلگ اور ان کی جنگی اور سیاسی کارروائیوں سے سروکار رکھے بغیر خاموشی اور تنہائی کے پردے میں مستور رہا ہے۔ خسروانِ ایران اور قیصرانِ روم کی فوجیں ملکِ عرب کی صدیوں کی نیند میں خلل ڈالے بغیر قرنہا بعد قرن اُس کی سرحدوں کے پاس سے کوچ کرتی ہوئی گزرتی رہی تھیں۔ بازنطین اور ایران کو جو طوفان آئے دن اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے تھے اکثر اوقات اُن کی گھن گرج اس کے کانوں میں پڑی تھی، لیکن وہ اپنی گہری نیند سے بیدار نہ ہوا تھا۔ بہر حال اب اس کے جاگنے کا وقت آ گیا تھا اور جب وہ جاگا تو اس کے برگزیدہ ترین فرزند کی آواز نے اس کی بیداری کا اعلان کیا۔

پہاڑوں کا وہ سلسلہ جو فلسطین سے خاکنائے سویز تک پھیلا ہوا ہے اور جو بحیرۂ احمر کے متوازی چل کر جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی سرے کو جا چھوتا ہے اُسے عربی زبان میں حجاز کہتے ہیں اور یمن تک جس علاقے سے وہ گزرتا ہے وہ سارا علاقہ اسی کے نام سے موسوم ہے۔ کہیں کہیں تو پہاڑ سمندر کے قریب ہیں اور کہیں کہیں ساحل سے دور ہٹے ہوئے ہیں۔ اُن کے اور ساحل کے درمیان بنجر اور غیر آباد نشیبی زمینیں ہیں جن میں جا بجا سرسبز وادیاں اور شاداب نخلستان ہیں، جو برساتی نالوں کی گزرگاہوں میں خود بخود پیدا ہو گئے ہیں۔ اس سلسلۂ کوہ سے پرے اور مشرق کی جانب نجد کا صحرا پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک وسیع و عریض سطحِ مرتفع ہے، جس میں بیاباں ہیں، گھاٹیاں ہیں اور کہیں کہیں اکا دکا ہرے بھرے شجر زار ہیں جو آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں۔ حجاز میں مکے اور مدینے کے مقدس شہر ہیں، جو اسلام کا مولد اور گہوارہ ہیں۔

یہ وسیع خطہ چار ملکوں میں منقسم ہے جن کی حدود بخوبی معین ہیں۔ شمال کی طرف عرب الحجر (Arabia Petraea) ہے، جس میں قدیم ادومیوں (Edomites) اور مدیانیوں (Midianites) کے ملک شامل ہیں۔ پھر خاص حجاز ہے جس میں یثرب کا مشہور شہر ہے، جو بعد میں مدینۃ النبی (مخفف مدینہ) کے نام سے سرفراز ہوا۔ خاص حجاز کے جنوب میں

تہامہ (Tihama) ہے، جس میں مکہ اور جدے کی بندرگاہ ہے، جہاں حاجی جہاز سے اترتے ہیں۔ چوتھا اور سب سے جنوبی حصہ عسیر (Asyr) کہلاتا ہے اور اس کی سرحد یمن کی سرحد سے ملتی ہے۔ خاص یمن جزیرہ نمائے عرب کا جنوب مغربی گوشہ ہے، جس کے مغرب میں بحیرۂ احمر ہے اور جنوب میں بحرِ ہند، شمال میں حجاز اور مشرق میں حضرموت۔ یمن کے لفظ کا اطلاق اکثر من حیث العام جنوبی عرب پر ہوتا ہے۔ جب اس کا اطلاق یوں کیا جائے تو اس میں یمنِ خاص کے علاوہ حضرموت اور اس کے مشرق کا علاقہ مہرہ (Mahra) بھی شامل کیا جاتا ہے۔ مہرہ (Mahra) کے پرے جزیرہ نمائے عرب کے جنوب مشرقی گوشے میں عمان ہے۔ اس کے شمال میں بحرین یا احساء جو خلیج فارس کے کنارے واقع ہے۔ موخرالذکر علاقے کو ہجر (Hijr) بھی کہتے ہیں، جو اس کے سب سے بڑے صوبے کا نام ہے۔

نجد اس سطح مرتفع کا نام ہے جو حجاز کے کوہستان کے مشرقی حصے سے شروع ہو کر سارے وسطی عرب پر پھیلی ہوئی ہے۔ نجد کا وہ حصہ جو یمن کی سرحد پر واقع ہے نجد الیمن کہلاتا ہے اور شمالی حصہ صرف نجد۔ ان دو حصوں کے درمیان ایک پہاڑی علاقہ ہے جس کا نام یمامہ ہے جو اسلام کی تاریخ میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ نجد کے شمال میں شام کا ریگستان ہے، جو فی الحقیقت عرب کا حصہ نہیں، لیکن اب اس میں عرب کے بدوی قبیلے اپنے قدیم ارامی پیشرووں کی طرح خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے شمال مشرق میں عراق کے صحرا ہیں جن کی سرحد دریائے فرات کے دائیں کنارے پر کالدیہ (Chaldaea) کے علاقے سے ملی ہوئی ہے، جسے وہ عرب کے مزروعہ حصے سے جدا کرتے ہیں۔ مشرق کی جانب نجد اور احساء کے درمیان حدِ فاصل اُن ریگستانوں میں سے ایک ریگستان ہے جنہیں اہلِ عرب نفود کہتے ہیں۔ جنوب کی طرف دہناء (Dahna) کا صحرا ہے جو نجد کو حضرموت اور مہرہ سے جدا کرتا ہے۔

اس وسیع و عریض خطے میں، جو اپنے عروج کے زمانے میں فرانس سے دُگنے رقبے پر مشتمل تھا، اس وقت بھی دو طرح کے باشندے تھے اور اب بھی ہیں، یعنی شہروں کے لوگ اور بادیہ نشین لوگ یا بدو۔ بدووں میں جو اچھائیاں اور برائیاں ہیں، مثلاً ان کی

اپنے قبیلے سے محبت، ان کی عجیب وغریب حمیت، ان کا منچلا پن، اُن کا جذبہ انتقام اور ان کی انسانی زندگی کے بارے میں لا پروائی، ان سب کو برٹن (Burton) اور پول (Poole) جیسے مشہور مصنفین نے بڑی عمدگی اور ہمدردی سے بیان کیا ہے۔ لیکن شہریوں اور بدوؤں میں چاہے کتنا بھی فرق ہو، عرب جبلتہً بادیہ زاد ہیں۔ اُن کی پر جوش حب آزادی اور اُن کی رُوحانی بلند پروازی ان کے صحرائی مسکن کی کھلی ہوا اور بیکراں پہنائیوں کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ مکّے اور عکاظ میں ہر سال میلے ہوا کرتے تھے، عرب کے شعوب وقبائل میں کسی قسم کی وحدت نہ تھی۔ ہر قبیلہ مدنی نشو ونما اور مذہب میں دوسرے قبیلوں سے مختلف تھا۔ یہ تنوع ان کے مختلف الاصل ہونے کا نتیجہ تھا۔ جزیرہ نمائے عرب میں مختلف قومیں مختلف زمانوں میں آباد رہ چکی تھیں۔ ان میں سے بہت سی صفحۂ ہستی سے مٹ چکی تھیں، لیکن اُن کے اچھے یا بُرے کارناموں کی یاد ان کے بعد آنے والوں کے ذہنوں میں تازہ تھی۔ یہ روائتیں مجموعی طور پر قومِ عرب کی تاریخ تھیں۔ خود عرب ان قوموں کو جو جزیرہ نمائے عرب میں آباد رہ چکی تھیں تین بڑے بڑے گروہوں میں تقسیم کرتے تھے۔

۱۔ عرب البائدہ، یعنی وہ عرب جو معدوم ہو چکے تھے اور جن میں وہ حامی (کوشی) قبیلے جنہوں نے سامیوں سے پہلے عرب میں بود وباش اختیار کی تھی اور ان کے علاوہ شام، فنیشیا اور دوسرے علاقوں کی ارامی قومیں۔

۲۔ عرب العاربہ یا متعاربہ، یعنی اصلی عرب اور خالص سامی قومیں جو روایت کے مطابق قحطان یا یقطان کی اولاد سے تھے اور جنہوں نے اپنی رو بہ جنوب نقل وحرکت کے دوران ابتدائی باشندوں کو تباہ کر دیا تھا۔ قحطانی عربوں نے جو طبعاً خانہ بدوش تھے، ان ملکوں کے ابتدائی باشندوں پر، جو حامی النسل ستارہ پرست تھے، اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ ان کا اصلی گہوارہ وہ خطہ تھا جہاں سے نسلِ ابراہیم بھی آئی تھی اور اس کی حدود کا تعین قحطان کے دو اسلاف کے ناموں سے ہوتا ہے، یعنی ارفخشد (Arphaxad) جس کے معنی ہیں، ''سرحدِ کالدیہ'' اور عیبر یا عابر (Eber) جس کے معنی ہیں ''دریا پار سے آیا ہو آدمی'' یعنی وہ آدمی جو دریائے فرات کے دائیں کنارے سے بابل یا عراق عرب میں آیا تھا۔

عرب المستعربہ یعنی وہ لوگ جو عرب میں آکر آباد ہوئے۔ یہ لوگ ابراہیمی

خاندان کے ساتھی تھے جو یا تو پر امن مہاجروں یا فوجی آباد کاروں کی حیثیت سے جزیرہ نمائے عرب میں آئے اور قحطانی عربوں کے ساتھ شادی بیاہ کر کے انہی کے ساتھ رہنے لگے۔ یہ تینوں الفاظ عاربہ متعاربہ اور مستعربہ ایک ہی مادے سے ماخوذ ہیں اور ان کی صرفی شکل سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مختلف گروہ کن کن زمانوں میں آکر سرزمینِ عرب میں آباد ہوئے[1]۔

اعراب العاربہ میں جو قومیں تاریخ اسلام کے ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں وہ بنی عاد[2] عمالقہ، بنی ثمود اور بنی جدیس ہیں، بنی عاد جو حامی الاصل تھے، جزیرہ نمائے عرب کے سب سے پہلے آباد کار تھے اور وہ زیادہ تر وسطی عرب کے اس حصے میں آباد تھے جسے عرب مورخ اور جغرافیہ دان احقاف الرمال کہتے ہیں، اور جس کی سرحد یمن، حضر موت اور عمان کی سرحدوں سے ملتی ہے۔ اپنی تاریخ کے ایک دور میں بنی عاد ایک طاقت ور اور فاتح قوم تھے۔ ان کے ایک بادشاہ شداد نے، جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے، اپنی حکومت عرب کی حدود کے باہر بھی قائم کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے عراق فتح کیا، بلکہ ہندوستان کی سرحد تک جا پہنچا۔ اس روایت کا اشارہ غالباً بابل اور کالدیا پر عربوں کے حملے کی طرف ہے جو دو ہزار سال قبلِ مسیح واقع ہوا، اور شاید اسی واقع کو ایرانی روایات میں حملہ ضحاک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی شداد نے یا غالباً اس کے کسی جانشین نے جو اس کا ہم نام تھا مصر پر بھی چڑھائی کی، بلکہ اور بھی مغرب کی طرف جا نکلا۔ بعض مورخین کی رائے میں مصر پر عربوں کا یہ حملہ وہی واقعہ ہے جسے ہکسوں (The Hyksos) کا حملہ بھی کہا گیا ہے۔ اس نظریے کی تائید کسی حد تک اس امر سے ہوتی ہے کہ ان خانہ بدوش حملہ آوروں کو بالآخر تھیبائڈ (The Thebaid) کے بادشاہوں نے اپنے جنوبی ہمسایوں، یعنی حبشیوں اور کوشیوں کی مدد لے کر افریقہ سے نکالا۔

---

[1] کوسین دپرسیول (Caussin de perceval) بائدہ اور عاربہ کو ایک ہی سمجھتا ہے اور متعاربہ کو دوسرا گروہ شمار کرتا ہے۔ بعد کے صفحات میں اس نے اس کی تقسیم پر عمل کیا ہے۔

[2] خیال کیا جاتا ہے کہ قحطانی عربوں نے بنی عاد پر غلبہ پا کر انہیں معدوم کر دیا اور بنی ثمود کو (جو ایک عجیب قسم کے غاروں میں رہنے والے لوگ تھے) خدالاعمر (Khedoralaomer) کے ماتحت اشوریوں نے ختم کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ بنی عاد کی بیشتر تعداد خشک سالی کا شکار ہو کر تباہ ہوگئی۔ جو تھوڑے سے لوگ بچ رہے اُن سے بنی عاد کی نئی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے یمن میں کچھ مدت خوشحالی کی زندگی بسر کی۔ بالآخر نئے بنی عاد بھی قحط و وبا کی لپیٹ میں آ کر ختم ہو گئے۔

عمالقہ، جنہیں لنورماں (Lenormant) نسلاً ارامی خیال کرتا ہے، بلا شک و شبہ وہی تھے جنہیں یہودی اور عیسائی کتب مقدسہ میں عمالقہ کے نام سے اور مصری آثار قدیمہ کے کتبوں میں شتشو کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور جنہیں اشوری بادشاہوں نے بابلیہ سے نکال باہر کیا۔ یہ لوگ عرب، میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ یمن، حجاز، فلسطین اور شام میں پھیل گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصر میں بھی جا پہنچے اور متعدد فراعنہ ان کی نسل سے تھے۔ حجاز کے عمالقہ بنی جُرہم کے ہاتھوں یا تو تباہ ہو گئے یا ملک سے نکال دیئے گئے۔ بنی جُرہم بنی قحطان کی ایک شاخ تھے۔ شروع میں یہ لوگ جنوب میں آباد ہوئے، لیکن بعد میں شمال کی طرف بڑھ کر عمالقہ پر غالب آئے۔

بنی ثمود جو بنی عاد کی طرح نسلاً کوشی یا حامی تھے، ادوم کے سرحدی علاقوں میں آباد ہوئے اور پھر حجر میں، جو عرب الحجر کے مشرق میں حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے۔ یہ لوگ چٹانوں میں غار کھود کر ان میں رہتے تھے۔ سر ہنری لے یارڈ (Sir Henry Layard) نے اپنی کتاب (Early Travels) میں اُن کے کوہستانی مسکنوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ چنانچہ زمانہ جدید کے سیاحوں کے بیان کردہ حالات اور جدید انکشافات سے عرب روایات کا مقابلہ کیا جائے تو بنی ثمود کے وطن کی تعیین کی جاسکتی ہے۔ شام، نجد اور حجاز کے درمیان جتنی تجارت ہوتی تھی وہ سب بنی ثمود کی وساطت سے ہوتی تھی۔ اس تجارت کی بدولت انہیں اچھی خاصی خوشحالی نصیب ہوئی۔ بالآخر ان کی بیشتر تعداد کو عظیم عیلامی فاتح خزارالاحمر نے شام اور عرب کی مہموں کے دوران ہلاک کر دیا۔ ان غار نشینوں پر جو اپنے سنگین مسکنوں میں رہ کر اپنے آپ کو خدا کے غضب سے محفوظ خیال کرتے تھے، جو ہولناک اُفتاد پڑی اُس کا ذکر قرآن میں قریش کی تنبیہ کی غرض سے اکثر کیا گیا ہے۔

اس مصیبت کے بعد جو بنی ثمود بچ رہے وہ خلیج عیلام کے شمال میں جبل سعیر

کے علاقے میں جا کر پناہ گزیں ہوئے۔ جہاں ان کے آباؤ اجداد حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے میں رہا کرتے تھے، لیکن بہت جلد وہ ہمسایہ قبیلوں میں جذب ہو کر معدوم ہو گئے اور ان کی جگہ ادومیوں نے لے لی، جنہوں نے جبل سیر پر کچھ مدت تک اپنا تصرف جمائے رکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر عربوں کے ایک گروہ نے، جسے بنی قحطان نے یمن سے دیس نکالا دیا تھا، ادومیوں کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ ڈیوڈورس سیکولس (Deodorus Siculus) کے زمانے میں یہ لوگ رومی فوجوں کو دستے مہیا کیا کرتے تھے۔

طسم، جدیس اور دوسرے چھوٹے قبیلے کسی ذکرِ خاص کے مستحق نہیں۔ اس لیے ہم ان سے قطع نظر کر کے بنی جرہم کا حال بیان کرتے ہیں، جو عرب العاربہ میں شمار کیے جاتے ہیں اور جنہوں نے حجاز میں عمالقہ کو مغلوب اور ہلاک کر کے اُن کی جگہ لے لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کے دو قبیلے تھے۔ ایک تو قدیم ترین قبیلوں میں سے اور بنی عاد کا ہمعصر تھا اور غالباً کوشی نسل سے تھا، دوسرا قحطان کی اولاد سے تھا، جس نے سخت خشک سالی کے زمانے میں یمن سے نکل کر حجاز پر قبضہ کیا اور عمالقہ کو وہاں سے ملک بدر کر کے خود اُن کی املاک پر قابض ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بنی جُرہم نے جو قحطانی النسل تھے، اس وقت خروج کیا جب اسمٰعیلی نسل کے عربوں نے عمالقہ میں، جن کے ملک میں وہ مدتوں سے رہتے چلے آرہے تھے، نمایاں حیثیت حاصل کرنی شروع کی۔ اسمٰعیلی عربوں نے حملہ آوروں سے سمجھوتہ کر لیا، اور کچھ مدت تک دونوں قومیں امن و امان سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرتی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ آلِ اسمٰعیل کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے بنی جُرہم کا وادی پر قبضہ ڈھیلا پڑتا گیا اور ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ حجاز اور تہامہ کی ولایتیں اولادِ ابراہیم کے ہاتھوں میں آگئیں۔ مستعربہ عربوں کی ترقی شاہِ بابل کی یورش کے باعث چندے رُک گئی، لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ابراہیمیوں نے بہت جلد اپنی کھوئی ہوئی قوت دوبارہ حاصل کر لی اور حجاز، نجد اور عراق و بین النہرین کے ریگستانوں میں پھیل گئے جہاں انہوں نے قحطانیوں کو، جو اُن کے پیش رو تھے، اپنے اندر جذب کر لیا۔

عرب المتعاربہ میں وہ قبیلے شامل تھے جو قحطان بن عابر کی اولاد سے تھے[1]۔ اور

---

[1] ابن الاثیر اُسے عابر یا غابر کہتا ہے۔

جو زیادہ تر یمن میں مقیم تھے۔ قحطانی قبیلے عرب کے شمال مشرقی کونے سے داخل ہوئے تھے اور پھر رفتہ رفتہ جنوب کی طرف بڑھتے گئے تھے جہاں وہ کچھ مدت تک تو کوشی النسل بنی عاد کے زیرِ سایہ بود و باش کرتے رہے اور پھر خود صاحبِ اقتدار بن گئے، لیکن قحطانی نسل کے باشندے صرف جنوبی عرب ہی میں نہ رہتے تھے۔ ان کا ابتدائی گہوارا بین النہرین تھا۔ وہاں سے یمن میں نقلِ سکونت کرنے کے دوران انہوں نے جزیرہ نمائے عرب کے پورے طول کو عبور کیا ہوگا اور قدرتی طور پر اپنی کچھ بستیاں جا بجا چھوڑ گئے ہوں گے۔

عرب مورخین کا خیال ہے کہ مہاجرین کی جو لہر اس وقت جزیرہ نمائے عرب میں اُمڈ کر آئی اس کے سردار دو بھائی تھے، قحطان اور یقطان جو عابر یا حابر کے بیٹے تھے۔ اُن کے نزدیک یمن کا پہلا بادشاہ قحطان کا بیٹا یعرب تھا جس کے نام پر اس کے تمام جانشینوں کا بھی اور سارے جزیرہ نما کا بھی نام رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یعرب کے بعد اُس کا بیٹا یشحب تخت پر بیٹھا جس نے ولایت کے قدیم دار الحکومت تارب کی بنیاد رکھی اور جو مشہور عبد الشمس ملقب بہ سبا کا باپ تھا۔ اس لقب کے معنی ہیں "ملک گیر" اور یہ اسے اس کی فتوحات کے صلے دیا گیا۔ سبا کے اخلاف قحطانی نسل کے مختلف قبیلوں کے اسلاف بنے، جو عربی روایات میں مشہور ہیں۔ سبا کے دو بیٹے تھے حمیر (Himyar) جس کے معنی ہیں سُرخ[1] اور کُہلان (Kuhlan)۔ اوّل الذکر اپنے باپ کے تخت پر بیٹھا اُس کے نام پر خاندانِ سبا کا نام حمیری پڑا[2] اُس کے اخلاف اور اُس کے بھائی کُہلان کے اخلاف ظہورِ اسلام سے ایک صدی پہلے تک یمن پر باری باری حکمران رہے۔ عظیم بادشاہ ذوالقرنین اور مشہور ملکہ بلقیس، جو حضرت سلیمان کے عہد میں یروشلم گئی، دونوں اسی خاندان سے تھے[3]۔

---

١ وہ فراعنہ مصر کی طرح سرخ چوغہ پہنا کرتا تھا۔

٢ معلوم ہوتا ہے کہ یمن کے حمیری بادشاہ، جن کا لقب تبابعہ (Tobbas) تھا۔ قدیم الایام سے ایران اور بازنطین کے ساتھ رہ و رسم رکھتے تھے۔

٣ ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں بہت سے شبہات ہیں۔ بہت سے مسلم مورخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس ذوالقرنین کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ سکندر مقدونی تھا، لیکن یہ خیال محلِ نظر ہے۔ "ذوالقرنین" کے اصلی معنی ہیں "دو سینگوں والا"۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱) جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ قدیم سبائی بادشاہ ہلال کی شکل کا تاج پہنتے تھے، جو انہوں نے غالباً ذوالقرنین کے زمانہ میں فراعنہ مصر سے مستعار لیا تو اس بارے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ قرآن میں جو اشارہ ہے وہ کسی مقامی خاندان کے بادشاہ کی طرف ہے جس کی وسیع فتوحات کو آئندہ پشتوں کے تخیل نے بڑھا کر عالمگیر سلطنت بنا دیا۔ لورماں (Lenormant) کا خیال ہے کہ شداد، ذوالقرنین اور بلقیس تینوں کوشی نسل کے تھے۔

حمیری بادشاہوں کی رعیت میں یہودیت کا بہت زور تھا۔ اگرچہ ۳۴۳ء میں شہنشاہ قسطنطین کے سفیر کی فرمائش پر شاہان یمن نے اپنی مملکت میں متعدد عیسائی گرجا بنانے کی اجازت دی۔ لیکن آبادی کا بیشتر حصہ قدیم سامی مذہب کا پیرو تھا۔

پانچویں صدی عیسوی کے اختتام کے قریب ذونواس نے خونخوار غاصب ذوشناتر (Zushinatir) کو قتل کر کے یمن اور اس کی مقبوضہ ولایتوں پر تسلط جمایا۔ اس نے یہودیوں کے ایما پر، جن کے مذہب میں وہ داخل ہو چکا تھا، عیسائیوں پر جو مظالم کئے اُن کا انتقام اس سے بازنطینی شہنشاہ نے لیا۔ قسطنطنیہ کا اشارہ پا کر حارث کے زیر قیادت ایک حبشی لشکر یمن کے ساحل پر اترا اور اس نے ذونواس کو قتل کر کے یمن پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ ۵۲۵ء کا ہے۔

تھوڑی مدت بعد (۵۳۷ء میں) ابرہہ الاشرم نے حارث کو قتل کیا اور حبشیوں کی طرف سے یمن کا وائسرائے مقرر ہوا۔ اسی ابرہہ کی قیادت میں عیسائی حبشیوں نے حجاز کو فتح کرنے کی ناکام کوشش کی۔ یمن تقریباً نصف صدی تک حبشیوں کے تصرف میں رہا۔ بالآخر معدی کرب (Madi Karib) نے جو اس مشہور سیف بن ذی یزن (Zul Yezen) کا بیٹا تھا، جس کے شجاعانہ کارناموں کے گیت بادیہ نشین عرب آج تک گاتے ہیں، کسریٰ نوشیروان سے فوجی امداد لے کر حمیری خاندان کو ۵۷۳ء میں بحال کیا۔ جب ۵۹۷ء میں عیسائیوں نے معدی کرب کو ہلاک کر دیا، تو یمن پر ایران کی براہ راست حکومت قائم ہوگئی اور دربار ایران کے مامور کیئے ہوئے وائسرائے اس کے نظم ونسق کے مختار ہو گئے، انہیں مرزبان کے لقب سے پکارا جاتا تھا پہلا مرزبان وہرز (Wahraz) تھا۔ اس کے تحت یمن، حضر موت، مہرہ اور عمان سلطنت عجم میں شامل کر دیئے گئے۔
آخری مرزبان باذان تھا، جسے خسرو پرویز نے ۶۰۶ء میں مامور کیا۔ یمن میں اسلام کی اشاعت باذان کے عہد مرزبانی میں ہوئی اور وہ خود بھی مشرف بہ اسلام ہوا۔ ایرانیوں نے یمن پر بڑی نرمی سے حکومت کی۔ تمام مذاہب سے رواداری برتی جاتی تھی اور تمام قبیلوں کے شیخ مرزبان کے زیر نگرانی اپنے اپنے علاقوں میں اپنے دستوروں کے مطابق انصرام امور کرتے تھے۔

کے قصوں سے جا ملتا ہے۔ آلِ اسمٰعیل علیہ السلام حجاز میں پھلتی پھولتی اور بڑھتی رہی۔ آخر کار بابل کے ہیبت آفریں بادشاہ بنوکدنصر (بخت نصر) نے اُسے بھی اور اس کے ساتھ بنی جُرہم کو بھی مغلوب کرلیا، بلکہ تقریباً تباہ کر دیا۔ جتنے بادشاہوں نے عرب کے دل پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی اُن سب میں یہ اکیلا بادشاہ ہے جو اس پر ضرب کاری لگانے میں کامیاب ہوا۔ مکہ معظمہ کا سنگِ بنیاد غالباً اُسی زمانے میں رکھا گیا جب ابراہیمی عرب عربستان میں آکر آباد ہوئے، کیونکہ عرب روایات کے مطابق اس کا موسس ایک جُرہمی سردار مضاض بن عمرو تھا، جس کی بیٹی سے عرب مستعربہ کے جدِّ امجد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے شادی کی۔ اُسی زمانے میں کعبے کی تعمیر ہوئی، جس نے مکے کو عرب کے باقی تمام شہروں پر فوقیت بخش دی۔ کعبہ، جس کی تعمیر قدیم الایام میں حضرت ابراہیم کے ہاتھوں ہوئی، ہمیشہ عرب قوم کا مقدس ترین معبد رہا ہے۔ اس میں تین سو ساٹھ بُت نصب تھے، گویا سال کے ہر دن کے لیے ایک بُت۔ اُن کے مرکز میں ہُبل تھا، جو سرخ عقیق کا بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ غزالین تھے، ایک سونے کا اور ایک چاندی کا۔ اور تو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بُت بھی تھے، یہاں سب قبیلوں کے لوگ ہر سال آتے تھے اور آکر سنگِ اسود کو بوسہ دیتے تھے، جو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں آسمانوں سے گرا تھا اور سرتاپا برہنہ ہوکر سات بار کعبہ کا طواف کرتے تھے"۔ چنانچہ مکہ ابتدائی ایام سے نہ صرف عربوں کی مذہبی عقیدت کا مرجع بلکہ اُن کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ چونکہ وہ پرانے زمانے کی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا اس لیے ہمسایہ ملکوں کی ساری دولت اور ثقافت اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھی۔ بابلی فاتح کو بھی اس کی مقدرت نہ ہوئی کہ مکے کی تجارتی خوشحالی کو کوئی نقصان پہنچا سکتا، کیونکہ عربوں کو جو جغرافیائی حیثیت حاصل تھی اس کی بدولت اقوامِ عالم کے اموالِ تجارت کا نقل وحمل خاص طور پر ان کے حصے میں آیا تھا۔

مکہ اس تجارتی سرگرمی کا مرکز تھا جس نے ہمیشہ عربوں کو دوسری ایشیائی اقوام سے ممتاز کیا ہے۔ مکے سے وہ قافلے روانہ ہوتے تھے جو یمن اور شہرہ آفاق ہندوستان کی پیداوار اور مصنوعات لے جا کر بازنطینی ولایتوں اور ایران میں پہنچاتے تھے اور شام سے ایرانی شہروں کے ریشمی کپڑے لاتے تھے۔ لیکن وہ صرف تجارتی مال ہی نہ لائے، ان

کے جلو میں عیش و عشرت کی وہ تمام عادتیں اور وہ تمام خرابیاں بھی آئیں جنہوں نے ہمسایہ سلطنتوں کو زنگ کی طرح کھالیا تھا۔ یونانی اور ایرانی کنیزیں، جو شام اور عراق سے لائی جاتی تھیں، نہ صرف رقص و سرود سے امیروں کے لیے مشغلۂ بیکاری مہیا کرتی تھیں بلکہ اُن کی نفسانی تسکین کا ذریعہ بھی بنتی تھیں۔ وہ شاعر جس کا کلام عربوں کا مایۂ افتخار ہے صرف موجودہ زندگی کی لذتوں کے گیت گاتا تھا اور لوگوں کی اخلاقی خرابیوں کو شہ دیتا تھا۔ فکرِ فردا کسی کو نہ تھی۔

عرب اور بالخصوص اہلِ مکہ شراب، جوئے اور گانے کے والہ و شیدا تھے۔ دوسرے ایشیائی ملکوں کی طرح عرب میں بھی ناچ اور گانا ادنیٰ طبقے کی عورتوں کا پیشہ تھا۔ جنہیں قیان (Kiyan) صیغۂ واحد میں قینہ (Kayna) کہتے تھے اور جن کی عصمت فروشی ضرب المثل تھی۔ اس کے باوجود ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور بڑے بڑے سردار اُن سے مفاخرانہ عشق بازی کرتے تھے[1]۔ ہندوؤں کی طرح عربوں میں بھی تعدّدِ ازدواج بے حد و حساب تھا۔ ماں کے سوا ہر بیوہ متوفی کے وارثوں کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور لڑکے کے استعمال میں لائی جاتی تھی نوزائیدہ بچیوں کو دفن کر دینے کا نفرت انگیز اور انسانیت سوز دستور بھی عام تھا۔

یہودیوں کو، جنہیں اشوریوں، یونانیوں اور رُومیوں نے یکے بعد دیگرے گھر سے بے گھر کیا تھا، عربوں کے یہاں امان مل گئی تھی۔ لیکن وہ اپنے ساتھ اپنا مذہب ہی نہ لائے تھے، بلکہ عربدہ جوئی کی وہ فطرت بھی جو اُن کی مصیبتوں کا سب سے بڑا سرچشمہ تھی۔ بہر حال انہوں نے عربوں میں سے بہت سے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا تھا، چنانچہ جب حضرت محمد ﷺ نے تبلیغ اسلام شروع کی تو اس وقت کہلان کے دو بیٹوں حمیرا

---

[1] لوگوں کی اخلاقی ذلت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ عورتیں اپنے گھروں میں ضیافتیں دیا کرتی تھیں جن میں شہر کے رؤسا و اُمرا شامل ہوتے تھے۔

شہری عرب قمار بازی کے اتنے شوقین تھے کہ ٹیسی ٹس جن جرمنوں کا تذکرہ کرتا ہے، اُن کی طرح وہ اپنی آزادی بھی بدد یا کرتے تھے۔ یہ اُن برائیوں کی وجہ سے اور اُن کے ساتھ جو اخلاقی خرابیاں وابستہ تھیں اُن کی وجہ سے تھا کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے پیروؤں پر جوئے ناچ اور شراب خوری کو حرام کر دیا۔

اور کِندہ کے جانشینوں میں سے ایک مقتدر گروہ یمن میں اور دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر (Nazair) جو بنی اسمٰعیل علیہ السلام میں سے تھے، لیکن قدیم الایام سے عرب میں بود باش کر رہے تھے، خیبر اور یثرب میں یہودی مذہب کے پیرو تھے۔ نسطوریوں اور جیکبی عیسائیوں نے بھی بستیاں بسا رکھی تھیں، ان دو حریف مذہبوں میں عرب پر تسلط حاصل کرنے کی خاطر جو کش مکش رہتی تھی، وہ جزیرہ نما کے سب سے زرخیز صوبوں میں خونریز لڑائیوں کا موجب بنتی رہتی تھی۔ ربیعہ ابن نزار کی نسل کے چند خاندان، مثلاً بنی تغلب جو بین النہرین میں اور بنی عبدالقیس جو بحرین میں آباد تھے، عیسائیت قبول کر چکے تھے۔ نجران میں بنی حارث ابن کعب، عراق میں بنی عباد، شام میں آل غسان اور خزاعہ، دومتہ الجندل میں اور بنی کلب اس کے پیرو بن چکے تھے جو قبیلے فلسطین اور مصر کے درمیان کے ریگستانوں میں بادیہ گردی کرتے رہتے تھے اُن میں سے بعض اس کے دائرے میں داخل ہو چکے تھے۔ مجوسیت اور صابیت کے نام لیوا بھی عربوں اور بالخصوص آلِ حمیر میں موجود تھے۔ بنی اسد عطارد کے، بنی جرہم مشتری کے، بنی طے سہیل کے اور قیس عیلان کے جانشین شعریٰ کے پجاری تھے۔ قریش کے چند گروہ تین چاند دیویوں، لات، منات اور عزیٰ کو پوجتے تھے اور انہیں بنات اللہ تصور کرتے تھے۔ مکّہ اس وقت دور دور تک پھیلی ہوئی بت پرستی کا مرکز تھا، جس کی شاخیں جزیرہ نمائے عرب کے ہر قبیلے میں پائی جاتی تھیں۔ کنانہ، جو قریش سے خون کا رشتہ بھی اور سیاسی اتحاد بھی رکھتے تھے، ستارۂ الدبران کے علاوہ عزیٰ کی پرستش کرتے تھے جو مکے سے ڈیڑھ دن کی مسافت پر ایک مقام نخلہ کے ایک درخت میں مجسم تصور کی جاتی تھی۔ ہوازن، جو مکے کے جنوب مشرق میں بادیہ گردی کرتے پھرتے تھے، لات دیوی کی پوجا کرتے تھے، جس کا بُت طائف میں نصب تھا۔ منات کو ایک چٹان میں مجسم سمجھا جاتا تھا جو مکہ اور شام کے درمیان کی سڑک کے کنارے تھی۔ ان بُتوں کی پرستش میں زیادہ تر لنگ پوجا کی رسومات پر عمل کیا جاتا تھا اور وہ قدیم سامیوں، فنیقیوں اور بابلیوں کی پوجا سے بڑی مشابہت رکھتی تھیں۔ لیکن بیشتر عرب بالخصوص آلِ مصر کے لوگ، ایک نہایت ذلیل قسم کی بت پرستی کے عادی تھے۔ جانور، پودے، غزال، گھوڑا، اُونٹ، کھجور کا درخت، چٹانیں، پتھر، یہ سب چیزیں اُن کی معبود تھیں بہر حال وہ

ایک خدائے بزرگ و برتر کے تصور سے بھی نا آشنا نہ تھے، لیکن یہ تصور معدودے چند لوگوں تک محدود تھا، جنہوں نے بت پرستی کی غلامی سے فرار کر کے ایک قسم کا فلسفیانہ تشکک اختیار کیا جس میں اُن کے ہمسایوں، صابیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے قصے کہانیوں کے رنگ بھرے ہوئے تھے۔ اس محدود طبقے کے بعض لوگ رب الاعلیٰ کے صراحۃً قائل تھے اور اپنے زمانے کی فحاشیوں اور مادہ پرستی سے متنفر ہو کر کسی نجات دہندہ کے لیے چشم براہ تھے جس کے جلد آنے کا ان کے دل میں یقین تھا۔

بعض قبیلوں میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی شخص مر جاتا تو اس کی قبر پر ایک اُونٹنی ذبح کی جاتی یا بے آب و دانہ باندھ دی جاتی تا کہ بھوک اور پیاس کے مارے مر جائے۔ یہ اس عقیدے کی بنا پر کیا جاتا کہ اونٹنی مرے ہوئے شخص کی آئندہ زندگی میں اس کی سواری کا کام دے گی۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ روح جسم سے جدا ہو کر ایک پرندے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جسے وہ ہامتہ یا صدیٰ کہتے تھے۔ اگر مرا ہوا شخص کسی کے ہاتھوں قتل کیا گیا ہوتا تو جب تک قتل کا قصاص نہ لیا جاتا پرندہ مقتول کی قبر کے اوپر اسقونی اسقونی کہتا ہوا منڈلاتا رہتا تھا۔ جنوں اور غولوں پر ایمان اور بتوں کے ذریعے غیب کی اطلاعات حاصل کرنے پر عقیدہ عام تھا۔ بتوں سے تیروں کے ذریعے بشارت لی جاتی تھی، جنہیں ازلام اور قداح کہتے تھے۔ ہر قبیلے کا جدا بُت اور جدا بت خانہ تھا۔ ان بت خانوں میں جو پروہت ہوتے تھے انہیں بیش بہا ہدیے دیئے جاتے تھے، اور مختلف بُت خانوں کے پرستاروں کے درمیان اکثر خونریز چپقلشیں ہوتی رہتی تھیں[1]۔

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا معبد، یعنی کعبہ، سب قبیلوں کے نزدیک سب سے زیادہ عظمت رکھتا تھا۔ یہودی اور صابی بھی کعبے پر نذریں چڑھاتے تھے۔ اس عبادت گاہ کی تولیت قبائل میں بڑی رقابت کا موجب تھی، کیونکہ اس کے ساتھ بہت سے ایسے اعزازات اور خصوصی حقوق وابستہ تھے جن کی عربوں کی نگاہوں میں بڑی

---

[1] سب سے مشہور بتکدے یہ تھے۔ یمن میں بنی خثعم کا دارالخلصہ، نجد میں بنی ربیعہ کا روضہ، عراق میں ذوسبات اور ساحلِ بحر کے قریب قدید کے مقام پر منات کا مندر جس میں اوس اور خزرج کے قبیلے جو یثرب میں آباد تھے، اپنے دیوتا کی پرستش کرتے تھے۔

قدر و منزلت تھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی ولادت کے وقت آپ ﷺ کا خاندان کعبے کا متولی تھا اور آپ ﷺ کے دادا اس کی مملکت کے رئیس تھے۔ انسانی قربانیوں کا دستور عام تھا۔ کعبے میں کچھ خاص خاص بُت نصب تھے ان کے علاوہ ہر خاندان کا ایک علیحدہ بت تھا جس کی عبادت کی رسوم سخت پابندی سے ادا کی جاتی تھیں۔

یہ تھی عربوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت نہ یہودیت اور نہ عیسائیت ان میں انسانی خوبیاں پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ میور (Muir) کہتا ہے: ''اگرچہ عیسائیت کی تبلیغ پانچ صدیوں سے ہو رہی تھی، تاہم عیسائیوں کے صرف اکا دکا گروہ کہیں کہیں دکھائی دیتے تھے، یعنی بنی حارث نجران میں، بنی حنیفہ یمامہ میں، بنی طے کے چند خاندان تماء میں، اور بس یہودیت نے بھی، جو عیسائیت سے کہیں زیادہ طاقت ور تھی، ذونو اس کے تحت وقتاً فوقتاً لوگوں کو اپنے دائرے میں داخل کرنے کی غیر مستقل سی کوششیں کی تھیں، لیکن اب اس کی تبلیغی سرگرمیاں ختم ہو چکی تھیں۔ مختصر یہ کہ اگر اس وقت مذہبی منظر کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائیت کی ضعیف کوششوں نے عربی زندگی کے سمندر کی سطح پر صرف خفیف سے ہلکورے پیدا کئے تھے۔ یہودیت کے نسبتاً زیادہ قوی اثرات ایک زیادہ گہرے اور زیادہ ہیجانی دھارے کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں، لیکن مقامی بت پرستی اور اسمٰعیلی توہم پرستی کا سیلاب جو ہر سمت سے اُٹھ کر لگاتار اُمڈتا ہوا کعبے کی طرف رواں دواں رہتا تھا اس امر کی وافر شہادت بہم پہنچاتا ہے کہ مکے کے مذہب اور طریق عبادت نے نفسِ عربی کو مضبوطی سے اور حتمی طور پر اپنی غلامی کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ قبیلوں کے باہمی تفرقوں اور رقابتوں[1] نے اور مذہبی اور نسلی اختلافات کے پیدا کئے ہوئے مخاصمانہ جذبات نے جو ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کے خلاف آمادہ پیکار رکھتے تھے، اشوریوں، بابلیوں یونانیوں اور ایرانیوں کو شمال، جنوب، مشرق اور جنوب مغرب میں مختلف اقطاع پر متصرف ہونے کا موقع بہم پہنچایا تھا۔ حبشی تو یہاں تک آگے بڑھ آئے تھے کہ انہوں نے کعبے کو مسمار کرنے کے ارادے سے حجاز پر حملہ بھی کر دیا تھا۔ لیکن

---

1. یہ قبائلی مخاصمے اور خاندانی جھگڑے، جن کا مفصل بیان آگے چل کر آئے گا۔ عرب شہنشاہی کی بربادی کا باعث بنے۔

عبدالمطلب کی حب الوطنی نے کعبے کے سامنے ان کی طاقت کو پاش پاش کر دیا تھا۔ بیس سالوں تک انہوں نے یمن کو اپنی ستم رانیوں کا تختۂ مشق بنایا۔ اس کے بعد ایک مقامی حکمران، یعنی نامور سیف ذوالیزن کے بیٹے نے انہیں ایران سے امداد لے کر یمن سے نکالا۔ جب اس حکمران کو عیسائیوں نے قتل کر دیا تو اس کی ریاست، جس پر وہ انوشیروانِ عادل کے زیرِ سایہ حکومت کر رہا تھا، ایرانیوں کے ہاتھ میں چلی گئی اور یمن شہنشاہ ایران کا باجگزار بن گیا[1]۔

قسطنطنیہ اور ایران کی سلطنتوں نے عرب کے مختلف خطوں پر جو تسلط قائم کر رکھا تھا اس کے علاوہ وہ سب سے بڑے عرب حکمران، یعنی غسان اور حیرہ کے بادشاہ، قیصروں اور خسرووں کے باجگزار تھے، اور اُن بے سود اور بے مقصد جنگوں میں جو ایرانیوں اور بازنطینیوں نے آپس میں لڑیں اور جن کی خاطر انہوں نے اپنی رعایا کا خونِ زندگی چوس لیا اہلِ غسان اور اہلِ حیرہ ایک دوسرے کے مقابل صف آرا یا ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوئے، اگرچہ بالعموم زرتشتی، عیسائیوں کی بہ نسبت زیادہ حق بجانب تھے۔

جزیرہ نمائے عرب کی آبادی نے یوں جن مختلف النوع عناصر سے ترکیب پائی تھی۔ انہوں نے ملک کی لوک کہانیوں میں بے انتہا تنوع پیدا کر دیا ہے۔ غیر متمدن قوموں میں ہمیشہ یہ رجحان ہوتا ہے کہ وہ واقعات کو قصے کہانیوں کا جامہ پہناتے ہیں ان کا تخیل دور کی چیزوں کو نہ صرف خوشنما رنگوں میں رنگ دیتا ہے بلکہ انہیں اصل سے بڑا بھی بنا دیتا ہے اور اگر کسی قوم کا تمدن بھانت بھانت کے تمدنوں کا مرکب ہو تو اس میں ایسی لاتعداد کہانیاں رائج ہو جاتی ہیں جو کم و بیش واقعات پر مبنی ہوتی ہیں۔ یمن اور جنوب مغربی خطوں میں جو حامی لوگ آ کر آباد ہوئے وہ خالص سامی جو ان کے عقب میں آئے جیسے آریہ لوگ مشرق میں آئے تھے۔ یہودی، عیسائی یہ سب اپنی اپنی روایات، اساطیر اور

---

[1] یمن، بحرین اور عراق کے شہری ایرانیوں کے تابع فرمان تھے۔ ان ملکوں کے بدو کسی کا حکم نہ مانتے تھے۔ شام کے عرب رومیوں کے مطیع تھے۔ بین النہرین کے عرب کبھی بازنطینیوں کے اور کبھی ایرانیوں کے وسطی عرب اور حجاز کے بدو، جن پر حمیری بادشاہ موثر طور پر حکومت کرتے رہے تھے، برائے نام ایرانیوں کے زیرِ اقتدار آ گئے تھے، لیکن فی الواقعہ وہ آزاد تھے۔

داستانیں ساتھ لے کر آئے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ماضی کی ان باقیات میں ایک طرح کی مطابقت پیدا ہوگئی۔ لیکن وہ بظاہر چاہے کتنی ہی بے بنیاد معلوم ہوں، اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی سطح کے نیچے ہمیشہ واقعات کی ایک تہ دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً شداد اور اس کے باغِ ارم کی بابت جو قصہ مشہور ہے اس کے دُھندلے آئینے میں ہمیں ایک زبردست سلطنت کا عکس نظر آتا ہے، جس نے مصر کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ یہ سلطنت ایک دولت مند قوم کی سلطنت تھی، جس نے شاندار عمارتیں بنائیں جس کی تہذیب کالدیہ کی تہذیب سے مشابہ اور ترقی یافتہ تھی اور جس کا مذہب بابل کے مذہب سے ملتا جلتا تھا۔ اس قوم کی مادی ترقی کے پہلو بہ پہلو شدید قسم کی اخلاقی خرابیاں اور فحش رسوم تھیں۔ اسی طرح قوم عاد اور قوم ثمود کی تباہی کے بارے میں جو نیم افسانوی اور نیم تاریخی روایات ہیں۔ اُن میں ہمیں اشوریوں اور عربوں، یعنی سامیوں کے سیلاب کے ہاتھوں نسلِ حامی کی تباہی کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔

آلِ یعقوب علیہ السلام جب اپنے بے پناہ دشمنوں سے بھاگ کر جزیرہ نمائے عرب میں آئی تو اپنے قصے اور روایات اپنے ساتھ لائی جنھوں نے عربی لوک کہانیوں میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا۔ سامی مہاجرین میں سے جو لوگ سب سے اخیر میں آئے وہ اپنے آپ کو اولادِ ابراہیم علیہ السلام کہتے تھے اور ان کے ہمسائے بھی اس امر کو تسلیم کرتے تھے۔ یہ اعتقاد پشت بہ پشت روایۃً چلا آ رہا تھا اور اس نے ایک مسلمہ امر کی صورت اختیار کر لی تھی۔

جب مانوی مذہب کے پاؤں ایران اور بازنطین سے اُکھڑ گئے تو اس نے بھی سرزمینِ عرب کا رُخ کیا۔ اس آزاد ملک میں دوسیتیوں (The Docetes) مارشینیوں (The Marcionites) ویلنٹینیوں (The Valentinians) سب کے نام لیوا موجود تھے۔ ان سب نے اپنے خیالات اور اپنی روایات کی اشاعت کی، جو رفتہ رفتہ مقامی خیالات و روایات کے ساتھ خلط ملط ہوگئیں۔ یہ عیسائی فرقے تقلید پرستوں کے جبر و تشدد کے باوجود اس عقیدے پر مضبوطی سے قائم تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدائے مجسم یا کم از کم خدا کے بیٹے اور خدا کا کلام تھے، جس نے ابدیت کے بطن سے جنم لیا اور جو نورِ عرش کا ایک صدور تھا اور جس کا صلیب پر مر جانا محالات میں سے تھا۔ ان کا یہ بھی ایمان تھا کہ رنج و

کرب کے وہ کلمات جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، ہرگز ان کے لب پر نہیں آ سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ جس شخص نے صلیب پر کھینچے جانے کی اذیت سہی وہ خداوند عیسیٰ علیہ السلام نہ تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جلادوں کے ہاتھوں سے بچ کر عرشِ بریں پر واپس چلے گئے۔ یہ نظریہ بظاہر چاہے کتنا ہی مستبعد کیوں نہ لگتا ہو، پھر بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کے عقیدے سے نسبتہً زیادہ مطابقت رکھتا ہے اور چند مضبوط قیاسات پر مبنی معلوم ہوتا ہے، فلوطس (Pilate) کی جس کی بابت ٹرٹلین (Tertullian)، کہتا ہے کہ وہ در پردہ عیسائی تھا، یہ زبردست خواہش کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جان کسی طرح بچائے۔ ہیرودیس (Herod) کا اس پر آمادہ نہ ہونا کہ نبیٔ ناصری کے قتل سے اپنے خلاف نفرتِ عام کو اور بڑھائے، جب یہ عظیم محسنِ انسانیت دن بھر کے ہولناک ہنگاموں کی تکمیل کی خاطر صلیب کی طرف لایا گیا تو اس وقت جو جھٹ پٹا چھایا ہوا تھا، وہ خارقِ عادت تاریکی جو اس ڈرامے کے سب سے دہشت ناک منظر کے وقت روئے ارض پر طاری تھی۔ یہ سب حالات و واقعات اس عقیدے کو قرینِ قیاس بنا دیتے ہیں کہ معصوم بچ گیا اور مجرم نے سزا پائی[1]۔

ظہورِ محمدی ﷺ سے پہلے یہ روایات، جو واقعات پر مبنی تھیں لیکن خیالی رنگوں میں رنگی گئی تھیں لوگوں کے عقاید میں مضبوطی سے گھر کر چکی ہوں گی اور ملک کی لوک کہانیوں کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہوں گی۔ جب حضرت محمد ﷺ نے تبلیغِ اسلام شروع کی تو آپ ﷺ نے ان روایات کو معاشرتی اور اخلاقی پستی کے اس گڑھے سے نکالنے کی خاطر جس میں وہ گرے ہوئے تھے ایک بیرم کے طور پر استعمال کیا۔ وہ نور جو طورِ سینا میں چمکا تھا، وہ نور جس نے گلیلی کے کسانوں اور ماہی گیروں کی زندگیوں کو روشن کر دیا تھا، اب فاران کی چوٹیوں پر جلوہ نما ہوا[2]۔

---

[1] اگر اس عجیب و غریب عقیدے کو کوئی چیز اس سے بھی زیادہ قرینِ صحت بنا سکتی ہے تو وہ کتاب لوقس کا یہ بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قبر سے اُٹھنے کے بعد اپنے شاگردوں کو اس کی اجازت دی کہ وہ ان کے جسم کو چھو کر اپنی تسلی کر لیں کہ وہ فی الواقعہ زندہ ہیں اور جیسا کہ وہ خیال کیے ہوئے تھے، محض ایک روح نہیں ہیں اور پھر انہوں نے کچھ کھانے کو مانگا اور ایک اُبلی ہوئی مچھلی اور شہد کھایا۔

[2] ''جاء اللہ من سیناء و اشرق من ساعیر و استعلی من فاران''

یاقوت ''معجم البلدان'' میں لکھتا ہے: ''ساعیر فلسطین کی اور فاران مکے کی ایک پہاڑی ہے''۔

پہلا باب

محمد رسول اللہ ﷺ

بَلَغَ العُلٰی بِکَمَالِہٖ   کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ
حَسُنَت جَمِیعُ خِصَالِہٖ   صَلُّوا عَلَیہِ وَآلِہٖ

یہ چار مصرعے، جن کا حُسنِ بیان ترجمے کا متحمل نہیں ہو سکتا، اُس انسان کی سیرتِ عالیہ کی توصیف میں کسی مبالغے سے کام نہیں لیتے جس کی زندگی، کارگزاریوں اور تعلیمات کا ذیل کے صفحات میں بیان کرنا ہمیں منظور ہے۔ ساتویں صدی کی ابتدا ہے۔ ایک خاموش اور غور و فکر میں منہمک شخص، جس کی عمر کا آفتاب نصف النہار سے قدرے تجاوز کر چکا ہے، عربی لبادہ کندھوں پر ڈالے اور طیلسان کو چہرے پر جھکائے اکثر مکے کے بازار میں سے گزرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی تو وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہے اور کبھی تیز تیز، لیکن دونوں صورتوں میں وہ نہ تو آنے جانے والوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے اور نہ اپنے اردگرد کے لہو و لعب کے مناظر کی طرف متوجہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ہی خیالات میں مگن رہتا ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ انسان بھی اسے سلام کرے تو وہ اس کا جواب دینے سے کبھی نہیں چوکتا، اور نہ کبھی وہ اُن چھوٹے چھوٹے بچوں سے محبت و شفقت کی دو باتیں کرنے سے دریغ کرتا ہے جو بڑے شوق سے آ آ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ "الامین" ہے۔ اس نے اپنی زندگی ایسی خودداری اور

محنت وریاضت سے گزاری ہے کہ اس کی قوم نے اُسے یہ باعزت خطاب دے رکھا ہے، لیکن اب اس کی عجیب وغریب تعلیم کے باعث اس کے شہر کے لوگ اسے بدگمانی کی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ایک دوراز کار باتیں سوچنے والا خبطی ہے، ایک انقلاب پسند دیوانہ ہے، جو معاشرے کی قدیم امتیازی حدود فاصل کو ہموار کر دینا چاہتا ہے، ان کی پشتینی مراعات ان سے چھین لینا چاہتا ہے اور ان کے قدیم دین و مذہب اور رسم ورواج کو ان سے چھڑا دینا چاہتا ہے۔

جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس زمانے میں مکہ اپنے تاریخی پسِ منظر اور اپنی جائے وقوع دونوں کے اعتبار سے عرب کے شہروں میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ مکہ ایک نشیبی وادی میں واقع تھا، جو شمال سے جنوب کی طرف پھیلتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ اس کے مغرب کی جانب پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا اور مشرق کی جانب سنگِ خارا کی اُونچی اُونچی چٹانیں۔ اپنی مرکزی عمارت یعنی کعبہ، اپنے باترتیب اور پتھر کے فرش والے گلی کوچوں، اپنے قلعہ بند مکانوں اور اپنے دارالندوہ کی بدولت شہر خوشحالی اور مضبوطی کا ایک غیر معمولی منظر پیش کرتا تھا۔ خانہ کعبہ کی تولیت، جو دراصل اولادِ اسماعیل کا موروثی حق تھی۔ اہلِ بابل کے حملے کے بعد جرہمیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ دینی اور دنیوی اقتدار کے اجتماع نے بنی جرہم کے سرداروں کو یہ درجہ بخش دیا تھا کہ انہوں نے ملک کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ تیسری صدی عیسوی کے اوائل میں ایک قحطانی قبیلے نے جس کا نام بنی خزاعہ تھا، یمن سے اُٹھ کر مکہ اور حجاز کے جنوبی علاقے قبضہ کر لیا تھا اور بنی جُرہم کے اقتدار کو ختم کر دیا تھا۔ اسی مدت میں اپنی سابقہ قوت از سرِ نو حاصل کر رہے تھے۔ خاندانِ اسمٰعیل کے ایک فرد عدنان نے جن کا زمانہ پہلی صدی قبل مسیح کے لگ بھگ ہے، اپنے جدِّ امجد کی طرح جرہمی سردار کی لڑکی سے شادی کی تھی اور مکے ہی میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ عدنان کے بیٹے معد حجاز ونجد میں آباد ہونے والے بنی اسماعیل کے مورث اعلیٰ بنے۔ معد کے ایک جانشین فہر، جن کا لقب قریش اور جن کا زمانہ تیسری صدی عیسوی تھا، اس قبیلے کے بانی تھے جس میں عرب کا پیغمبر اور شارح پیدا ہوا۔

بنو خزاعہ دو صدیوں سے کچھ زیادہ مدت تک خانہ کعبہ کے متولی اور اس منصب

سے جو بزرگی اور فضیلت متعلق تھی اسکے مالک رہے۔ بنوخزاعہ کے آخری سردار حلیل کی وفات پر فہر کے ایک جانشین قصی[1] نے، جو حلیل کے داماد تھے، بنوخزاعہ کو مکے سے نکال دیا اور شہر کے سارے دینی اور دنیوی اقتدار پر قابض ہوگئے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ حقیقی معنوں میں حجاز[2] کے حکمران بن گئے۔ اب ہم مصدقہ تاریخی واقعات کی اقلیم میں داخل ہوتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ قصی پانچویں صدی عیسوی کے لگ بھگ مکے پر قابض ہوئے۔ انہوں نے فوراً شہر کے نظم ونسق میں باقاعدگی پیدا کرنے کی طرف توجہ دی۔ قصی کے زمانے تک قریش کے مختلف خاندان شہر کے مختلف حصوں میں متفرق طور پر رہا کرتے تھے۔ ان کی آبادیاں کعبہ سے کافی فاصلے پر تھیں، اور ان کے دلوں میں کعبہ کا جو انتہائی احترام تھا اس کے باعث وہ اس کے قرب و جوار میں رہنے سہنے کے مکانات بنانے سے احتراز کرتے تھے۔ اس غیر محفوظ حالت میں ہونے کی وجہ سے قومی معبد جن خطرات سے دوچار تھا انہیں محسوس کر کے قصی نے قریش کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ کعبے کے آس پاس مقیم ہو جائیں، لیکن اس کے چاروں طرف طواف کے لیے کافی جگہ چھوڑ دیں۔ جن خاندانوں کو کعبے کے قرب وجوار میں سکونت کے لیے زمین دی گئی انہوں نے اپنے لیے مستحکم قلعہ بندیاں تعمیر کیں۔

قصی نے اپنے لیے ایک محل تعمیر کیا جس کا دروازہ صحنِ کعبہ کی طرف کھلتا تھا۔ اس محل کا نام تھا دارالندوہ[3] اور اس میں قصی کے زیرِ صدارت امورِ عامہ پر بحث کی جاتی تھی اور ان کے متعلق احکام جاری کیے جاتے تھے۔ اس میں چالیس سال سے کم عمر کا کوئی شخص داخل ہونے کا مجاز نہ تھا، البتہ قصی کے جانشین اس شرط سے مستثنیٰ تھے۔ تمام ملکی

---

[1] قصی فہر کی پانچویں پشت میں تھے، ان کی پیدائش ۳۹۷ء کے لگ بھگ ہوئی۔ لفظ قریش ''قرش'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں تجارت کرنا۔ فہر اور ان کی اولاد کا پیشہ تجارت تھا۔

[2] بنوخزاعہ کا ذکر اس کے بعد ہم اس وقت سنتے ہیں جب قریش نے رسولِ خدا کے خلاف ان سے امداد طلب کی۔

[3] یہ عمارت جس کی تعمیر متعدد مرتبہ از سرِ نو ہوئی بالآخر اموی خلیفہ عبدالملک ثانی کے عہد میں ایک مسجد کی شکل میں تبدیل کر دی گئی۔

معاملات کا انصرام اسی دارالندوہ میں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب قریش کسی جنگی مہم پر روانہ ہونے لگتے تھے تو یہیں انہیں قصی کے ہاتھ سے پرچم جنگ ملتا تھا۔ قصی اپنے ہاتھوں سے ایک نیزے کے سرے پر سفید کپڑا باندھ دیتے تھے اور پھر نیزہ یا تو خود قریش سرداروں کے حوالے کر دیتے تھے یا اپنے کسی بیٹے کے ہاتھ بھیج دیتے تھے۔ یہ رسم جو عقد اللّوا کہلاتی تھی اُس وقت سے لے کر جب قصی نے اس کی ابتدا کی عرب سلطنت کے اختتام تک جاری رہی۔ قصی کا جاری کیا ہوا ایک اور دستور اس سے بھی زیادہ مدت تک قائم رہا۔ انہوں نے قریش پر ان غریب حاجیوں کے لیے جو ہر سال زیارت کعبہ کے لیے آتے تھے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی ضرورت واضح کی اور انہیں ان کے فرائضِ میزبانی جتا کر ایک سالانہ ٹیکس یا چندہ ادا کرنے پر آمادہ کیا، جس نام 'رفادہ' رکھا گیا اور جو ایام المنیٰ میں غریب زائرینِ کعبہ کو کھانا کھلانے پر صَرف کیا جاتا تھا۔ ایام المنیٰ[1] سے مراد تھی قربانی کا دن اور اس کے بعد کے دو دن جو مقامِ مِنیٰ پر گزارے جاتے تھے۔ یہ دستور اسلام کی آمد کے بعد بھی جاری رہا۔ خلفا اور ان کے بعد سلاطین کے نام پر جو کھانا ہر سال دورانِ حج مقامِ مِنیٰ پر تقسیم کیا جاتا تھا اس کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ ندوہ، لوا اور رفادہ کے الفاظ ان وظائف منصبی پر دلالت کرتے ہیں جو قصی ادا کیا کرتے تھے۔ یعنی قومی مجلس کا انعقاد، اور اس کی صدارت، جھنڈا عطا کرنا جو فوج کی سرداری کا نشان ہوتا تھا اور زائرینِ حرم کو خوراک مہیا کرنے کے لیے ٹیکس وصول کرنا۔ ان مناصب کے علاوہ چند اور فرائض بھی قصی کے سپرد تھے، مثلاً مکے اور اس کے گردونواح میں جو کنوئیں تھے ان کے پانی کی تقسیم (سقایا)، خانہ کعبہ کی کلیدی برداری (حجابہ) اور بتانِ کعبہ سے استخارے کی خدمت۔

یوں قصی نے تمام بڑے بڑے دینی، ملکی اور سیاسی مناصب اپنی ذات میں مجتمع کر رکھے تھے۔ وہی بادشاہ تھے، وہی منصفِ اعلیٰ تھے اور وہی سب سے بڑے مذہبی پیشوا تھے۔ ان کے اقتدار نے، جو تقریباً شاہانہ تھا، قریش کے نام کو، جن کے وہ مسلّمہ طور پر سردار تھے، چار چاند لگا دیئے اور انہی کے زمانے سے قریش نے بنی اسمٰعیل کے دوسرے قبائل پر ایک نمایاں تفوق حاصل کیا۔

---

1. مِنیٰ مکے کے نواح میں ایک مقام کا نام ہے۔

قصی نے طویل عمر پائی اور ۴۸۰ء کے قریب فوت ہوئے۔

انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کی وفات پر عبدالدار پُر امن طریقے سے اور کسی مزاحمت کے بغیر اپنے باپ کے منصب اعلیٰ پر فائز ہو گئے۔ لیکن عبدالدار کی وفات پر ان کے پوتوں اور ان کے بھائی عبدمناف کے بیٹوں کے درمیان سخت تنازعات برپا ہو گئے۔ مختلف قبیلے اور اُن کے حلیف اور ہمسائے دو مخالف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ بہر حال ان تنازعات کا عارضی طور پر صلح صفائی سے فیصلہ ہو گیا۔ مفاہمت اس بنیاد پر ہوئی کہ ''سقایہ'' اور رفادہ' کے مناصب عبد مناف کے بیٹے عبدالشمس کو سونپ دیئے جائیں اور حجابہ ندوہ اور ''لوا'' عبدالدار کے خاندان ہی میں رہیں۔ عبدالشمس نے، جو نسبتاً غریب آدمی تھا۔ وہ مناصب جو ان کے حصے میں آئے تھے اپنے بھائی ہاشم کے حوالے کر دیئے جو عزت و جاہ اور مال و دولت کے لحاظ سے قریش میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔

قصی نے حاجیوں کی مالی اعانت کے لیے قریش پر جو ٹیکس عائد کیا تھا اب اُسے ہاشم وصول کرنے لگے۔ اس ذریعے سے جو آمدنی ہوتی تھی اس میں اپنے مال و جنس کو شامل کر کے وہ ان غریب الدیار لوگوں کے لیے جو ہر سال حج کے موسم میں مکے میں جمع ہوتے تھے خورد و نوش کا انتظام کرتے تھے۔

اکثر اہلِ مکہ کی طرح ہاشم بھی تجارت کرتے تھے۔ قریش میں اس دستور کی بنا انہی نے رکھی تھی کہ مکے سے باقاعدہ طور پر دو کارواں روانہ کئے جائیں۔ ایک سردیوں میں یمن کی طرف اور دوسرا گرمیوں میں شام کی طرف۔ ہاشم نے شہر غزہ میں ۵۱۰ء کے قریب وفات پائی، اور اپنی اولاد میں ایک اکلوتا بیٹا چھوڑا، جس کا نام شیبہ تھا اور جو ایک یثربی خاتون سلمٰی کے بطن سے تھا۔ ان کے انتقال بعد رفادہ' اور سقایہ' کے انتظامات ان کے چھوٹے بھائی مطلب کے ہاتھ آئے جنہوں نے اپنے ہم وطنوں کی نظروں میں بڑی قدر و منزلت حاصل کر رکھی تھی اور جو اپنی بزرگی اور فیاضی کے باعث 'الفیض' کے خطاب سے سرفراز تھے۔ مطلب، شیبہ[1] کو یثرب سے مکے لے آئے۔ اہلِ مکہ نے شیبہ کو غلطی سے

---

[1] سفید بالوں والا نوجوان۔

مطلب کا غلام سمجھ لیا اور انہیں عبدالمطلب (مطلب کا غلام) کہنے لگے۔ چنانچہ تاریخ پیغمبر اسلام ﷺ کے دادا کو عبدالمطلب کے سوا کسی دوسرے نام سے نہیں جانتی[1]

مطلب نے ۵۲۰ء کے آخر میں یمن کے شہر غزوان میں وفات پائی اور ان کے بعد ان کے بھتیجے عبدالمطلب مکے کی جمہوری ریاست کے سربراہ بنے۔ مکے کی حکومت اس وقت ارباب اقتدار کی ایک جماعت خواص (Oligarchy) کے ہاتھوں میں تھی جو خاندان قصی کے سربرآوردہ افراد پر مشتمل تھی۔ جب عبدالمطلب نے چاہ زم زم کو از سر نو دریافت کیا اور اس کی نگرانی کے بارہ جو تنازعات تھے ان کا تصفیہ ہوگیا تو اس وقت جو جماعت برسر اقتدار آئی وہ دس افراد پر مشتمل تھی جو "شریف" کے لقب سے ملقب تھے۔ ان عمائدین کا مرتبہ ریاست میں سب سے بلند تھا اور ان کے عہدے موروثی ہوتے تھے جن کا حق خاندان کے سب سے بڑے رکن یا سربراہ کو پہنچتا تھا۔ یہ عہدے حسب ذیل تھے:۔

۱۔ حجابہ (سدانہ) خانہ کعبہ کی چابیوں کی نگہداشت، ایک متبرک عہدہ جو اونچا درجہ رکھتا تھا۔ یہ عہدہ خاندان عبدالدار کے حصہ میں آیا تھا، اور جب اہل مکہ نے اسلام قبول کیا تو اس عہد پر عثمان بن طلحہ فائز تھے۔

۲۔ سقایہ یعنی زم زم کے مقدس کنوؤں کا اور اس تمام پانی کا اجارہ جو حجاج کے استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ یہ عہدہ بنو ہاشم کے خاندان میں تھا اور فتح مکہ کے وقت رسول خدا ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس پر مامور تھے۔

۳۔ دیات: یعنی دیوانی اور فوجداری عدالت، جو مدتِ دراز تک تیم ابن مرہ کے خاندان میں رہی تھی اور پیغمبر خدا کی بعثت کے وقت عبداللہ ابن قحافہ یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس منصب پر فائز تھے۔

۴۔ سفارۃ یا حکومت کی نمائندگی: جس شخص کے ہاتھوں میں یہ عہدہ ہوتا تھا وہ

---

[1] عبد مناف کے بیٹوں میں سب سے پہلے ہاشم نے غزہ میں وفات پائی اس کے بعد عبدالشمس نے مکے میں اس کے بعد مطلب نے غزوان میں اور سب سے اخیر میں نوفل نے مطلب کے کچھ مدت بعد عراق کے شہر میں سلمان میں وفات پائی۔

ریاست کا وکیلِ مطلق سمجھا جاتا تھا اور اسے اس کا پورا اختیار حاصل ہوتا تھا کہ قریش اور دوسرے عرب قبائل اور غیر ملکی لوگوں کے درمیان جو اختلاف رونما ہو جاتے تھے ان کے بارے میں مذاکرات اور تصفیے کرے۔ اس عہدے پر حضرت عمرؓ متعین تھے۔

۵۔ لِواء: یعنی جس جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر قوم دشمن سے جنگ کرنے جاتی تھی اس کی محافظت۔ قومی جھنڈے کا محافظ تمام افواج کا سپہ سالار ہوتا تھا۔ یہ فوجی عہدہ خاندانِ بنو اُمیہ میں تھا اور اس پر آنحضرت ﷺ کا بدترین دشمن ابوسفیان بن حرب قابض تھا۔

۶۔ رفادۃ: یعنی اس رقم کا انتظام جو خیرات سے جمع کی جاتی تھی اور جو غریب حجاج کے لیے، عام اس سے کہ وہ مسافر ہوں یا مقامی لوگ جنہیں حکومت خدا کے مہمان سمجھتی تھی، کھانے پینے کا انتظام کرنے پر خرچ کی جاتی تھی۔ یہ خدمت، جو ابوطالب کو مطلب سے ملی، ان کی وفات کے بعد، نوفل بن عبد مناف کے خاندان میں منتقل ہوگئی اور رسولِ اکرم ﷺ کے زمانہ میں حارث بن عمرو اس پر مامور تھے۔

۷۔ ندوۃ: یعنی قومی مجلس کی صدارت۔ جو شخص اس عہدے پر مامور ہوتا تھا وہ حکومت کا مشیرِ اعلیٰ تصور کیا جاتا تھا اور تمام امورِ سلطنت اسی کے مشورہ سے انجام پاتے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے زمانے میں یہ عہدہ عبدالعزیٰ بن قصی کے خاندان کے ایک فرد اسود کے قبضے میں تھا۔

۸۔ خائمہ:۔ یا قبہ: یعنی قومی جلسہ گاہ کی تولیت۔ یہ منصب، جس کے مالک کو یہ حق ہوتا تھا کہ مجلس کو اکٹھا کرے، بلکہ یہ حق بھی ہوتا تھا کہ فوجوں کو جنگ کے لیے جمع کرے، خالد بن ولید کے سپرد تھا جو مخزوم بن مرہ کے خاندان میں سے تھے۔

۹۔ خازنۃ: یعنی بیت المال کا انتظام، حسن بن کعب کے خاندان میں تھا اور حارث بن قیس اس پر قابض تھے۔

۱۰۔ ازلام: یعنی ان تیروں کی نگہبانی جو بتوں سے استخارہ کرنے کے لیے چلائے جاتے تھے۔ یہ عہدہ ابوسفیان کے بھائی صفوان کے ہاتھوں میں تھا۔

یہ سب عہدے اپنی اپنی جگہ تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ ایک مسلمہ دستور تھا کہ اشراف میں جو شخص عمر میں سب سے بڑا ہوتا تھا اسے سب سے زیادہ اثر و رسوخ حاصل

ہوتا تھا اور اُسے رئیس یا سید کے خطاب سے پکارا جاتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کے زمانے میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو یہ مرتبہ حاصل تھا۔

اختیار و اقتدار کی اس تقسیم کے باوجود عبدالمطلب کی ذاتی سیرت اور اثر و نفوذ نے انہیں اپنے ہم چشموں میں ایک امتیازی درجہ دے رکھا تھا۔ اس محترم سردار کو جس نے اپنی قوم کے دستور کے مطابق اپنے ایک بیٹے کو اصنام کعبہ کے سامنے قربان کرنے کی منت مانی تھی، خدا نے کثیر[1] اولاد بخشی تھی۔ وہ یہ منت پوری کرنے کے ارادے سے اپنے سب سے پیارے بیٹے عبداللہ کو کعبہ کے سنگدل بتوں کی بھینٹ چڑھانے کے لیے لے گئے۔ لیکن تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ کعبہ کی کاہنہ[2] نے انسانی قربانی کو ایک سو اونٹوں کی قربانی میں تبدیل کر دیا۔ اس وقت سے قریش میں سو اونٹ ایک آدمی کا خوں بہا مقرر ہوئے۔

عبداللہ کی شادی قبیلۂ زہرہ کے سردار وہب کی بیٹی آمنہ سے ہوئی۔ عبداللہ کی شادی سے ایک ایسے سال کا آغاز ہوا جو نہایت اہم واقعات سے مملو تھا۔ سال کے شروع ہی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ساری قوم میں سنسنی پیدا کر دی۔ یمن کے حبشی نژاد نائب السلطنت ابرہۃ الاشرم نے صنعا میں ایک گرجا تعمیر کیا تھا اور اس کی یہ تمنا تھی کہ اس مال و دولت کو جو کعبے کی حرمت و عظمت کے میں کھینچ لائی تھی اپنے شہر میں لے جائے۔ اہلِ مکہ میں سے ایک شخص نے اس کے گرجا کی بے حرمتی کی تھی۔ اس واقعے نے

---

[1] عبدالمطلب کے بارہ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں سب سے بڑے حارث تھے، جو ۵۳۸ء کے قریب پیدا ہوئے۔ دوسرے بیٹے حسب ذیل تھے: عبدالعزی یا ابولہب جس نے رسولِ خدا ﷺ کو ستایا، عبد مناف جو ابو طالب کے نام سے زیادہ مشہور ہیں اور ۵۴۰ء میں پیدا ہوئے اور ۶۲۰ء میں انتقال کیا۔ زبیر اور عبداللہ جو ۵۴۵ء میں، فاطمہ بنت عمر و مخزومی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ضرار اور عباس (۵۶۶ء تا ۶۵۲ء) جو نتیلہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ مقوم، جحم (معروف بہ الغیداق) اور حمزہ جو ہالہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ بیٹیوں میں عاتکہ، اُمیمہ، اروٰی، برہ اور اُم حکیم البیضاء، فاطمہ کے بطن سے تھیں۔ صفیہ ہالہ کے بطن سے پیدا ہوئیں اور انہوں نے عوام سے شادی کی جو تاریخِ اسلام کے مشہور سپہ سالار عبداللہ ابن زبیر کے دادا تھے۔ عبدالمطلب کے باقی دو لڑکوں کے نام نامعلوم ہیں، غالباً اس لیے کہ انہوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی (بعض تاریخوں کے مطابق ان کے نام قثم اور حجل تھے۔)

[2] کاہنہ کا نام سجاع بتایا جاتا ہے۔

اُسے ایک عذر مہیا کر دیا۔ چنانچہ وہ ایک زبردست فوج لے کر خانہ کعبہ کو گرانے کے لیے روانہ ہوا۔ وہ خود ایک آراستہ و پیراستہ ہاتھی پر سوار ہو کر فوج کے آگے آگے تھا۔ اس عظیم الجثہ جانور کو دیکھ کر، جو ایک لشکرِ جرار کے درمیان بڑے باوقار انداز سے چل رہا تھا، عرب کے قبائل اتنے مرعوب ہوئے کہ انہوں نے عام الفیل کے نام سے ایک نئے سن کا آغاز کیا (یہ ۵۷۰ء کا واقعہ ہے) جب افواجِ حبشہ قریب آ پہنچیں تو قریش اپنے بیوی بچوں کو لے کر قریب کے پہاڑوں میں چلے گئے اور وہاں سے واقعات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ ان کے دل میں یہ اُمید تھی کہ خدایانِ کعبہ خود اپنے مسکن کی حفاظت کریں گے۔ صبح ہوئی تو اہلِ حبشہ مکے کی طرف بڑھے۔ روایات کہتی ہیں کہ اس وقت ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا۔ یکا یک آسمان کی وسعتوں پر چھوٹے چھوٹے پرندوں کا ایک دل بادل چھا گیا۔ یہ ابابیلیں تھیں جنہوں نے اس بدنصیب فوج پر چھوٹی چھوٹی کنکریوں کی بے پناہ بارش شروع کر دی۔ ان کنکریوں نے، جو آدمیوں کی زرہوں کو چھیدتی ہوئی ان کے اندر گھس گئیں حملہ آوروں میں ایک دہشتناک تہلکہ مچا دیا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ آسمان کے روزن کھل گئے اور بارش کا ایک سیلاب اُتر آیا جو مردوں اور نیم جان زخمیوں کو بہا کر سمندر میں لے گیا۔

ابرہہ زخموں سے چور، صنعا کی طرف بھاگ نکلا اور وہاں پہنچنے کے تھوڑی مدت بعد مر گیا۔ ابنِ ہشام اس خارقِ عادت واقعے کو بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ ''یہی وہ سال ہے جب چیچک پہلی دفعہ ملکِ عرب میں رونما ہوئی۔'' کوسین دا پرسیول (Caussinide Perceval) لکھتا ہے ''اس سے معجزہ کی توجیہ ہو جاتی ہے۔'' یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ابرہہ کی فوج کی تباہی کسی ایسی ہی خوفناک وبا کا نتیجہ تھی۔ جیسی سنحریب[1] (Sennacherib) کی فوجوں کی ہلاکت کا سبب بنی۔ اس پر مستزاد غالباً بارش کے ان بے پناہ طوفانوں میں سے ایک طوفان تھا جو اکثر وادیٔ مکہ کو خوفناک سیلابوں میں غرق کر دیا کرتے تھے۔

اس واقعے کے کچھ مدت بعد عبداللہ نے ۲۵ برس کی عمر میں یثرب کے ایک سفر کے دوران وفات پائی[2]۔ ان کی وفات کے چند روز بعد ان کی غمزدہ بیوی کے ہاں ایک

---

[1] اشوریا کا بادشاہ (۷۰۵ سے ۶۸۱ قبل مسیح۔ (مترجم)

[2] وہ عدی کے بیٹوں کے مکان میں دفن کیے گئے جو ان کے ماموں تھے۔

بچہ پیدا ہوا جس کا نام محمد ﷺ رکھا گیا۔ آپ ﷺ بارہویں ربیع الاول کے دن عام الفیل میں پیدا ہوئے۔ اس وقت افواجِ حبشہ کی تباہی کو پچاس سے کچھ زیادہ دن گزر چکے تھے۔ سن عیسوی کے حساب سے اگست ۵۷۰ء کی انتیسویں تاریخ تھی[۱]۔ روایت ہے کہ آپ کی ولادت پر چند ایسی نشانیاں ظاہر ہوئیں جن سے اقوام وعالم کو معلوم ہوگیا کہ جس نجات دہندہ کا انہیں انتظار تھا اس کا ظہور ہوگیا ہے۔ عقلیت پرست مورخ لوگوں کے ان نشانیوں پر ایمان لانے کا حال سن کر مسکراتا ہے۔ وہ عیسائی مناظر، جو محض قیاسی استدلال کی بنا پر کسی حیل وحجت کے بغیر ان تین سیانوں کی روداد کو قبول کر لیتا ہے جو ایک طلوع ستارے کو دیکھ دیکھ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش تک جا پہنچے تھے، ان خارقِ عادت نشانیوں کا تذکرہ پڑھ کر اُن کا تمسخر اُڑاتا ہے۔ لیکن ایک ایسے شخص کے لیے جو تاریخ پر ناقدانہ نظر ڈالتا ہے، جو اگلے لوگوں کے اندازِ فکر کو ہمدردانہ طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور جس کا دل تعصب سے پاک ہے، یہ نشانیاں، جو مسلمانوں کی روایت اور عقیدہ کے مطابق ولادتِ نبوی ﷺ پر نمودار ہوئیں ایسے امورِ واقعہ کا درجہ رکھتی ہیں جو تاریخی تجزیہ کے مستحق ہیں۔ ہم لوگوں کو، جو جدید زمانے میں پیدا ہوئے اقوام اور افراد کی زندگیوں کے معمولی واقعات میں ایک اٹل قانون جاری وساری دکھائی دیتا ہے پھر اس پر تعجب کیسا کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کے لوگوں کو ایک قوم کی یادگاری عمارت کے گرنے میں خدا کا ہاتھ اس کے ظلموں اور بدکاریوں کے ناگزیر انجام کی طرف اشارہ کرتا ہوا دکھائی دیا[۲]۔

عربوں کے دستور کے مطابق بچے کو شیر خوارگی کے زمانے میں ایک بدوی خاتون حلیمہ سعدیہ) کے سپرد کر دیا گیا جو ہوازن کی ایک شاخ یعنی بنی سعد کے قبیلے سے تھیں[۳]۔ جب حلیمہ بچے کو واپس لائیں تو اس کی ماں آمنہ نے بڑی محبت سے اسے پالا پوسا۔ لیکن تھوڑی ہی مدت بعد آمنہ وفات پا گئیں اور یتیم بچے کی نگرانی کا ذمہ اس کے دادا عبدالمطلب نے

۱۔ کسریٰ نوشیروان کی حکومت کے چالیسویں سال کے اواخر میں اور سن سلوقسی کے ۸۸۰ کے اختتام پر

۲۔ غالباً کسریٰ نوشیروان کے محل کے کنگروں کے گر جانے کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ چند سال بعد حلیمہ قریش کے ہاتھوں گرفتار ہو کر کے لائی گئیں تو آنحضرت ﷺ نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا اور ان کی عمر بھر کفالت کا انتظام کر دیا۔

لے لیا۔ عبدالمطلب نے بڑی شفقت سے اپنے پوتے کی دیکھ بھال کی لیکن دادا کی شفقت والدین کی اس محبت کا بدل نہ ہو سکتی تھی۔ جو بچپن کی ایک نعمت غیر مترقبہ ہوتی ہے۔ والد کا انتقال آپ ﷺ کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا تھا، والدہ بھی چھ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گئیں اور اس ناقابلِ تلافی نقصان نے حساس بچے کی طبیعت پر بہت گہرا اثر کیا۔ تین چار سال نہ گزرنے پائے تھے کہ دادا کا سایہ عاطفت بھی سر سے اُٹھ گیا۔ عبدالمطلب کا انتقال ۵۷۹ء میں صنعا سے ایک سفر سے واپسی پر ہوا، جہاں وہ قریش کی طرف سے ذوالیزن کے بیٹے سیف کو ایرانیوں کی مدد سے تابعہ کے تخت پر بیٹھنے کی مبارک باد دینے گئے تھے[1]۔

عبدالمطلب کی وفات کے بعد اس طفلِ یتیم کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ عبدالمطلب نے بسترِ مرگ پر اپنے پوتے کو اس کے چچا ابو طالب کی کفالت میں دیا جن کے گھر میں آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام گزارے۔ ہم چشمِ تصور سے اس نوعمر بچے کو جس کی گہرے غور و فکر میں ڈوبی ہوئی آنکھیں گویا مستقبل کی گہرائیوں کے اندر جھانک رہی تھیں، اپنے چچا کے غریبانہ اور سیدھے سادے گھر میں چلتا پھرتا یا صحرا میں جا کر حسنِ فطرت کا مشاہدہ کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ پاک طینت طفلِ صحرا، طبیعت کا شریف، مزاج کا حلیم، دوسروں کے دُکھ درد سے متاثر ہونے والا، اس چھوٹے سے گھرانے میں ہر کسی کو عزیز تھا۔ بالخصوص چچا اور بھتیجے میں دلی محبت کا رشتہ تھا۔ "خدا کے فرشتوں نے اس کا سینہ چاک کر کے نور سے بھر دیا۔" رسولِ خدا ﷺ کی ابتدائی زندگی محنت و مشقت کے بوجھ سے آزاد نہ تھی۔ آپ ﷺ کو اکثر اپنے چچا کے گلوں کی رکھوالی کے لیے صحرا میں جانا پڑتا تھا۔ ہاشم اور عبدالمطلب کی شاہانہ ضیافتوں کے باعث ان کے ورثا

---

[1] سقایہ اور رفادہ کے جو دو مناصب عبدالمطلب کے پاس تھے ان میں سے سقایہ (زمزم کی نگہبانی کے ساتھ) ان کے بیٹے عباس کے حصہ میں آیا۔ رفادہ کا منصب ابو طالب کو ملا جو مکے میں بڑے صاحب اختیار و اعتبار تھے۔ لیکن ابو طالب نے رفادہ کا منصب اپنی اولاد کو منتقل نہ کیا۔ اُن کی وفات پر یہ نوفل بن عبد مناف کے ہاتھوں میں آیا۔ جب رسولِ اکرم ﷺ نے مکہ فتح کیا تو اس وقت جیسا کہ ہم اُوپر کہہ آئے ہیں، رفادہ کے فرائض عمرو کے بیٹے اور نوفل کے پوتے حارث کے سپرد تھے۔

کو بہت کم ترکہ ملا۔ چنانچہ ہاشمی اپنی ناداری کی وجہ سے وہ اختیار و اقتدار جو انہیں کبھی حاصل تھا بڑی تیزی سے کھو رہے تھے۔ زائرینِ حرم کو کھانا کھلانے کا منصب ان کے حریف بنو اُمیہ کے ہاتھوں میں آچکا تھا، جنہوں نے آلِ ہاشم کو ہمیشہ رشک و حسد کی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

حضرت محمد ﷺ ابھی کم سن ہی تھے کہ حرب فجار کی ابتدا ہوئی۔ یہ لڑائی جس میں قریش اور بنی کنانہ ایک طرف تھے اور قیس عیلان دوسری طرف، عکاظ کے مقام پر چھڑی اور کئی سالوں تک جاری رہی۔ اس میں جان و مال کا بہت نقصان ہوا۔ عکاظ مکے سے تین چھوٹی چھوٹی منزلوں پر طائف اور نخلہ کے درمیان واقع ہے۔ اس مقام پر جو تاریخِ عرب میں مشہور ہے، ذوالقعدہ کے مقدس مہینے میں ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا، اس موقع پر جنگ کرنا یا غضب میں آکر انسانی خون بہانا ممنوع سمجھا جاتا تھا، گویا یہ ایک قسم کا مذہبی متارکۂ جنگ تھا۔ دو اور میلے بھی لگتے تھے، ایک تو مجنہ کے مقام پر جو مکّے سے تھوڑے سے فاصلے مرالظہران کے قریب واقع ہے۔ اور دوسرا عرفات کے دامن میں ذوالمجاز کے مقام پر۔ لیکن عکاظ کا میلہ ایک بہت بڑی قومی تقریب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں اس مقدس مہینے میں، جب تمام قبائلی دشمنیاں اور خانہ جنگیاں عارضی طور پر فراموش کر دی جاتی تھیں، عرب کے تمام حصوں سے بلکہ دور دراز ملکوں سے عالمی تجارت کا ایک دریا بہتا ہوا چلا آتا تھا۔ یہاں حجاز اور نجد کے تاجر آتے تھے، صحرا کے مبارز شاعر آتے تھے اور خطیب آتے تھے، جو اپنے آپ کو خون کا انتقام لینے والوں سے چھپانے کے لیے چہرے پر نقابیں ڈالے ہوتے تھے اور جو ان تمام قوموں سے جو میلوں میں جمع ہوتی تھیں داد وصول کرنے کی خاطر اپنی نظمیں پڑھ کر سناتے تھے۔ عکاظ عرب کا اولمپیا[1] تھا۔ یہاں لوگ محض تجارت کی غرض سے نہ آتے تھے بلکہ اپنی قوت و شہامت اور اپنی شان و شوکت کے نغمے گانے اور اپنے شاعرانہ اور ادیبانہ کمالات کے جوہر دکھانے کے لیے بھی۔ ان کے قصیدے جو سامعین کے عظیم مجمعوں سے خراجِ تحسین وصول کرتے تھے، سنہری حرفوں

---

[1] یونان قدیم کا ایک شہر جہاں کھیلوں کے مقابلے ہوا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں ایک بہت بڑا جشن منعقد ہوتا تھا۔

maablib.org

میں قلمبند کئے جاتے اور آنے والی نسلوں کے لیے یادگار کے طور پر قومی صنم کدے یعنی کعبے میں لٹکا دیئے جاتے تھے[1]۔ میلے کے ایام میں عکاظ خوشی اور چہل پہل کا ایک عجیب منظر پیش کرتا تھا۔ لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی تھا۔ ناچنے والی عورتیں جو اپنے نشاط آور گیتوں اور قہقہوں اور چہچہوں سے صحرا کے شعلہ مزاج فرزندوں کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہوئی خیمہ بہ خیمہ پھرتی تھیں، اوباشوں کے جمگھٹ، جو فنِ موسیقی کی ابجد سے بھی واقف ہوئے بغیر گانے بجانے کے اوٹ پٹانگ مظاہرے کرتے پھرتے تھے، سر بازارے نوشیاں جو اکثر دنگوں اور خونریزیوں پر ختم ہوتی تھیں، جوا کھیلنے کے اڈے، جہاں اہلِ مکہ رات رات بھر جوا کھیلتے رہتے تھے، شاعروں کی ذاتی چشمکوں کی پیدا کی ہوئی نفرتیں اور دشمنیاں، جو کبھی ہنگامی چپقلشوں اور کبھی مستقل اور تباہ کن لڑائیوں کی صورت اختیار کرلیتیں...... ان سب باتوں نے تصویر کے دوسرے رُخ کو تاریک بنا دیا تھا اور انہوں نے آمنہ کے یتیم بچے کے دل پر ایک گہرا نقش ثبت کیا۔

وہ دو قبائلی لڑائیاں جنہیں اس لیے 'حربُ الفجار' کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس مہینے کی حُرمت شکنی کی جس میں تمام لڑائی جھگڑے ممنوع تھے، ان دو لڑائیوں کے درمیانی وقفے میں رسولِ اکرم ﷺ اپنے چچا اور سر پرست کے ہمراہ شام کے ایک تجارتی سفر پر گئے[2]۔ شام میں آپ ﷺ کی آنکھوں نے معاشرتی خستہ حالی اور مذہبی پستی کا ایک ایسا منظر دیکھا جس کی یاد آپ ﷺ کے دل و دماغ سے کبھی نہ محو ہوئی۔ اسی طرح خاموشی اور مسکینی کے عالم میں' طرح طرح کے خیالات کی اُدھیڑ بن میں مصروف، یہ دُرِ یتیم بچے سے جوان اور جوان سے مرد رعنا ہوا۔

آپ ﷺ اپنے ملک کی روایتی معلومات پر تو پورا پورا عبور رکھتے تھے، لیکن جن معنوں میں تعلیم کی اصطلاح جدید زمانے میں استعمال ہوتی ہے، ان معنوں میں آپ ﷺ

---

1. اسی مناسبت سے انہیں ''معلقات'' کا نام دیا جاتا تھا۔

2. ابو طالب اپنے باپ اور دادا کی طرح شام اور یمن کے ساتھ خاصے بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔ وہ دمشق، بصرہ اور شام کے دوسرے شہروں میں حجاز اور ہجر کی کھجوریں اور یمن کے عطر لے جاتے تھے اور ان کے بدلے میں بازنطینی اشیا لاتے تھے۔

تعلیم یافتہ نہ تھے۔ آپ ﷺ کو اپنی قوم سے محبت تھی، لیکن عادات و خصائل اور اندازِ فکر میں آپ ﷺ اپنے ہم قوموں سے بالکل مختلف تھے۔ ایک درہم برہم معاشرے کے درمیان تنِ تنہا کھڑے آپ ﷺ ایک ازکار افتادہ اور زوال یافتہ دور کا متحرک نظارہ غائر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اہلِ مکہ کی عام بے آئینی عکاظ کے میلے میں آنے والے قبیلوں کے بے وجہ خوں ریز جھگڑے، قریش کا فسق و فجور اور بے دینی، یہ سب چیزیں قدرتی طور پر اس حساس نوجوان کے دل میں انتہائی نفرت اور کراہت کے جذبات پیدا کرتی تھیں۔

اپنی عمر کے پچیسویں سال میں نبی کریم ﷺ نے پھر ایک بار شام کا سفر کیا۔ اس دفعہ آپ ﷺ اپنے خاندان کی ایک معزز قریشی خاتون خدیجہ کے مہتمم اور کارندہ کی حیثیت سے ان کا مالِ تجارت لے کر گئے۔ آپ ﷺ نے جس قابلیت اور دیانت داری سے اپنے فرائض کو انجام دیا اس سے خدیجہ بہت متاثر ہوئیں اور اس تاثر نے رفتہ رفتہ محبت کی صورت اختیار کر لی۔ جلد ہی شادی کا انتظام ہو گیا اور شادی پر سارے قریش نے خوشیاں منائیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسولِ اکرم ﷺ سے عمر میں بہت بڑی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود میاں بیوی میں انتہا درجہ کی محبت تھی۔ اس شادی کی بدولت '' آپ ﷺ کو وہ دلجمعی اور فارغ البالی حاصل ہوگئی جس کی آپ ﷺ کو نبوت کے سے کارِ عظیم کی تیاری کرنے کے لیے ضرورت تھی۔ اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ آپ ﷺ کو ایک محبت کرنے والی عورت کی دلی رفاقت نصیب ہوئی، جو سب سے پہلے آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لائی اور جس نے ہر وقت آپ ﷺ کی ڈھارس بندھائی اور جس وقت کوئی شخص آپ ﷺ پر یقین نہ لاتا تھا اور دنیا آپ ﷺ کو تاریک نظر آتی تھی، اس وقت اُمید کے جھلملاتے ہوئے شعلے کو آپ ﷺ کے سینے کے اندر زندہ رکھا۔''

خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک اعلیٰ شخصیت ہیں اور ان کی زندگی مسلمان عورتوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ تھی۔ اسلامی شریعت پر جو تہمت باندھی جاتی ہے کہ اس نے عورتوں کے درجہ کو پست کر دیا اس کی تغلیط اسی بلند درجہ سے ہوتی ہے جو مسلمانوں کے نزدیک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور رسولِ خدا ﷺ کی سب سے چھوٹی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو حاصل ہے۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے آنحضرت ﷺ کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں، لیکن سب

کے سب بیٹے بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ ان سے آنحضرت ﷺ کو بڑی محبت تھی اور ان کی بے وقت وفات سے آپ ﷺ کو بہت صدمہ پہنچا۔ قریش نے بعد میں آنحضرت ﷺ کے لیے جو ناشائستہ خطاب[1] تراشا اس کی وجہ تسمیہ آپ ﷺ کے بیٹوں کی وفات ہی تھی۔ بیٹیاں بعثت نبوی ﷺ کے بہت بعد تک زندہ رہیں۔ آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی کے آئندہ پندرہ سال مجاہدہ و مراقبہ، غور و فکر اور توجہ الی اللہ میں گزرے۔ صرف چند موقعے ایسے تھے جب آپ ﷺ اپنی نجی ضروریات یا شہری زندگی کے تقاضوں کے تحت اپنے گوشہ خلوت سے باہر آئے۔ عبدالمطلب کی وفات کے بعد مکے کی حکومت کے اختیارات کم و بیش تقسیم ہو چکے تھے۔ تمام اعیانِ حکومت کا حلقہ اختیار محدود ہو گیا تھا اور عدل کا ایسا کوئی ادارہ نہ تھا جس کے زیرِ سایہ افراد اپنے حقوق اور املاک سے پرامن طور پر متمتع ہو سکتے۔ خونی رشتوں اور خاندانی یگانگی کی بدولت ہر شہری کسی حد تک ناانصافی اور غارت گری سے محفوظ رہتا تھا، لیکن اجنبی ہر قسم کے جور و تعدی کا نشانہ بن سکتے تھے۔ نہ صرف ان کا مال و متاع لوٹ لیا جاتا بلکہ ان کی بیویاں اور بیٹیاں بھی اکثر ان سے چھین لی جاتی تھیں۔ قبیلہ بنی قین کا ایک مشہور شاعر حنظلہ اگرچہ ایک ذی رتبہ قریش عبداللہ ابن جدعان کے زیرِ حمایت مکے میں آیا لیکن اس کے باوجود سرِ بازار لٹ گیا۔ بے آئینی کے ایک اور ایسے ہی واقعے نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی کہ اس کا تدارک ضروری ہو گیا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی تحریک پر بنی ہاشم بنی مطلب اور خاندانِ زہرہ و تیم نے متحد ہو کر معاہدہ کیا کہ تمام افراد کو، چاہے وہ مکی ہوں یا اجنبی، آزاد ہوں یا غلام، مکے کی حدود کے اندر ہر طرح کے ظلم اور ناانصافی سے محفوظ رکھا جائے گا اور ظالموں کے ہاتھوں ان کے نقصانات کی پوری پوری تلافی کرائی جائے گی۔ فداکاروں کی اس انجمن کا نام بنی جرہم کی ایک پرانی انجمن کے نام پر انجمن حلف الفضول، رکھا گیا، جس کے چار ارکان، فضل، فضالہ، مفضل اور فُضیل مجموعی طور پر فضول کہلاتے تھے۔ یہ انجمن آنحضرت ﷺ کی شادی کے فوراً بعد، ۵۹۵ء کے لگ بھگ قائم ہوئی اور آنحضرت ﷺ اس کے رکنِ اعلیٰ تھے۔ اس کی بدولت کمزوروں اور مظلوموں کو بڑی حد تک امن و امان نصیب ہو گیا۔ اپنے قیام کے پہلے ہی سال میں اسے اتنا

---

[1] الابتر لغوی معنی دم کٹا، ثانوی معنی بے اولاد۔

رعب و داب نصیب ہو گیا کہ اس کی طرف سے کسی معاملے میں مداخلت کا اشارہ ہی زبر دستوں کی بے آئینی کو روکنے اور زیر دستوں کے نقصانات کی تلافی کرانے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ یہ انجمن تاریخ اسلام کی پہلی نصف صدی کے اختتام تک پوری قوت سے قائم رہی۔ انجمن حلف الفضول کے قیام کے چند سال بعد یعنی ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں عثمان بن حویرث نے بازنطینی دولت کے بل بوتے پر حجاز کو رومی سلطنت کا ایک صوبہ بنانے کی کوشش کی۔ آنحضرت ﷺ کی دخل اندازی کی بدولت یہ منصوبہ ناکام رہا اور عثمان نے بھاگ کر شام میں پناہ لی جہاں بعد میں اسے غسانی شہزادہ عمرو نے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے مختلف خاندانوں کے درمیان جو کعبے کی از سرِ نو تعمیر میں مصروف تھے ایک ایسے جھگڑے کا فیصلہ کرادیا جو ممکن تھا ایک خوں ریز جنگ کی صورت اختیار کر لیتا۔ ان پندرہ سالوں میں آنحضرت ﷺ کی زندگی کے یہی واقعات ہیں جن کا ہمیں علم ہے۔ آپ ﷺ کی حلیم طبیعت، آپ ﷺ کا سیدھا سادہ طریق بود و باش، آپ ﷺ کی پاکیزہ زندگی، آپ ﷺ کی نفاست و شائستگی، آپ ﷺ کا ہر وقت غریبوں اور کمزوروں کی امداد کے لیے تیار رہنا، آپ ﷺ کی خودداری، آپ ﷺ کی دیانت و امانت، آپ ﷺ کی فرض شناسی، ان سب چیزوں نے آپ ﷺ کو اپنے ہم وطنوں سے الامین کا بلند اور قابلِ رشک خطاب دلوایا تھا۔

اسی دورِ زندگی میں آنحضرت ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کے احسانات کے بدلے میں اُن کے بیٹے علی رضی اللہ عنہ کو اپنے زیرِ تربیت لیا۔ ابو طالب اپنے خاندان کی قدیم حیثیت کو برقرار رکھنے کی کوششوں کی بدولت بڑی حد تک تنگدست ہو چکے تھے۔ آنحضرت ﷺ، جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی بدولت خوشحال تھے، اور ابو طالب کے بھائی حضرت عباس رضی اللہ عنہ یہ دونوں اس وقت مکّے کے سب سے دولت مند لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ عرب میں ایک سخت قحط پڑا جس کے دوران آنحضرت ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ابو طالب کے ایک بیٹے کی کفالت قبول کرنے پر آمادہ کیا اور دوسرے کی کفالت خود قبول کی۔ اس طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جعفر کو اور خود آنحضرت ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو اپنی کفالت میں لیا اور عقیل اپنے باپ ہی کے پاس رہے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ

آئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے تمام بیٹے ابتدائے طفولیت ہی میں وفات پا گئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت نے ان کے داغ مفارقت کو مٹا دیا۔ بعد میں آنحضرت ﷺ کی سب سے چھوٹی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح نے اس رشتہ محبت و مودت پر مہر ثبت کر دی۔ انہی دنوں میں آنحضرت ﷺ نے رحم دلی اور انسان نوازی کی ایک ایسی مثال قائم کی جس نے اہل مکہ پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ ایک عرب نوجوان زید بن بن حارث ایک دشمن قبیلے کے ہاتھوں جنگی اسیر بن کر مکے لایا گیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ایک بھتیجے نے اُسے خرید کر اپنی پھوپھی کو دے دیا۔ آنحضرت ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ کو بطور نذر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے قبول کیا اور فوراً آزاد کر دیا۔ اس رحم و کرم کا صلہ زید نے پوری پوری محبت و عقیدت سے دیا۔ وہ اپنے باپ کے کہنے پر بھی آنحضرت ﷺ کو چھوڑ کر اپنے قبیلے میں واپس جانے پر راضی نہ ہوا۔

یوں گزرے آزمائش و امتحان کے یہ پندرہ سال، جو بہت سے آلام سے داغدار تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ انسانی رنج ومحن پر دلسوزی سے بھی منور تھے۔

آپ ﷺ کی آنکھوں کے سامنے آپ ﷺ کا ملک خون میں نہا رہا تھا۔ خاندانی جنگوں اور قبائلی دشمنیوں نے اس کے ٹکڑے کر دیے تھے۔ آپ ﷺ کے ہم وطن جہالت میں ڈوبے ہوئے، فحش رسوم اور اوہام پرستی کے عادی اور اپنے تمام صحرائی اوصاف کے باوجود بے آئین اور سفاک تھے۔ آپ ﷺ نے دو دفعہ شام کا جو سفر کیا تھا اس کے دوران آپ ﷺ نے اخلاقی اور معاشرتی زبوں حالی کا ایک ناگفتہ بہ نظارہ دیکھا تھا۔ حریف مذہب اور فرقے ایک دوسرے کے ٹکڑے اُڑا رہے تھے۔ جس فرضی خدا کی پرستش کے وہ دعویدار تھے اس کے وجود جسمانی پر جھگڑے کر رہے تھے، اپنے جذباتِ نفرت کو حجاز کی وادیوں اور صحراؤں تک پھیلا رہے تھے اور عرب کے شہروں میں نفاق کا فتنہ برپا کر رہے تھے۔ آپ ﷺ کی آنکھوں کے سامنے جو نقشہ تھا وہ انتہا درجہ کا یاس انگیز تھا۔ جو معدودے چند لوگ اپنے قدیم عقائد کو ترک کر کے کسی امن کو تلاش کرتے ہوئے تاریکی میں بھٹکتے پھر رہے تھے وہ ایک عالمگیر بے اطمینانی کی نمائندگی کر رہے تھے[1]۔ ان کے ذہنوں میں

[1] زید ورقہ بن نوفل (جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے) اور دو اور اشخاص (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

کوئی ایسی چیز نہ تھی جو ان کے محدود حلقے کے باہر نوعِ انسانی کے لیے کوئی معنیٰ یا اہمیت رکھتی۔ لیکن حضرت محمد ﷺ کی روح آسمانوں کی رفعتوں کی سیر کر رہی تھی اور اس کوشش میں مصروف تھی کہ کائنات، حیات و موت اور خیر و شر کے اسرار کا پردہ فاش کرے اور اپنے ارد گرد کی پراگندگی کے درمیان کوئی نظام دریافت کرے۔ خدا نے اپنا جو کلام آپ ﷺ پر نازل فرمایا وہ دنیا کے لیے ایک زندگی بخش قوت بن کر جلوہ گر ہوا۔ نکاح کے بعد کئی سال تک آپ ﷺ کا یہ معمول رہا تھا کہ کبھی تو اہل و عیال کے ساتھ اور کبھی تنہا، کوہِ حرا[1] کے ایک غار میں جا کر عبادت و مراقبہ میں منہمک رہتے۔ ''کوہِ حرا ایک بہت بڑا بنجر ٹیلہ ہے جس میں بہت سی گھاٹیوں نے شگاف ڈال رکھے ہیں اور جو صحرا کی چلچلاتی دھوپ میں اکیلا کھڑا ہے۔ اس میں نہ کہیں کوئی سایہ دار جگہ ہے، نہ کوئی پھول ہیں، نہ کوئی کنواں ہے نہ کوئی چشمہ۔'' عزلت نشینی آپ ﷺ کو بہت مرغوب ہو گئی تھی۔ غارِ حرا میں آپ ﷺ اکثر ساری ساری رات عمیق ترین فکر میں ڈوبے کائنات کے اَن دیکھے لیکن محیطِ کل خدا کے حضور میں حاضر رہتے[2] آہستہ آہستہ زمین و آسمان جلال و جمالِ الٰہی کے اس الہامی مکاشفے سے لبریز ہو گئے جو روزِ ازل سے مقدر تھا۔ آپ ﷺ کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ آپ ﷺ کے اردگرد کی بے جان چیزوں، پتھروں، چٹانوں اور درختوں سے ایک آواز آ رہی ہے۔ جو آپ ﷺ سے اس کام کی انجام دہی کا تقاضا کر رہی ہے جو ایک قدرتِ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۷) (عبداللہ اور عثمان) یہ چار شخص اپنے ہم وطنوں کی بُت پرستی کو ترک کر کے، دینِ برحق کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ان میں زید سب سے سربرآوردہ تھے۔ اس سے پیشتر کہ آنحضرت ﷺ خدا سے رابطہ قائم کرنے کی غرض سے غارِ حرا میں معتکف ہوئے۔ آپ ﷺ کی ملاقات زید سے ہو چکی تھی اور زید کو بُت پرستی سے جو نفرت تھی اس کی آپ ﷺ کے دل میں بڑی قدر تھی۔ بعد میں زید کے رشتہ کے ایک بھائی نے آنحضرت ﷺ سے زید کے حق میں شفاعت کی درخواست کی تو، اگرچہ آنحضرت ﷺ خود اپنے دادا عبدالمطلب کے لیے دعائے مغفرت مانگنے پر راضی نہ تھے کیونکہ انہوں نے موت سے پہلے شرک سے توبہ نہیں کی تھی پھر بھی آپ نے زید کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔

[1] کوہِ حرا کو آج کل ''جبلِ نور'' کہتے ہیں۔ ابن ہشام اور ابن الاثیر کا کہنا ہے کہ آنحضرت ﷺ عموماً رمضان کا مہینہ غارِ حرا میں جا کر عبادت، غریبوں کی امداد اور بھوکے پیاسے صحرا نوردوں کی دستگیری میں صرف کیا کرتے تھے۔ لیکن طبری ماہِ رجب کا ذکر کرتا ہے۔

[2] صحیح بخاری میں اس کے لیے ''تحنث'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

مطلقہ آپ ﷺ کو تفویض کرنا چاہتی ہے۔ کیا روح کی شعریت اس سے آگے بڑھ سکتی ہے؟ فرشتوں کی جو شکلیں ان لمحات میں آپ ﷺ کو دکھائی دیں وہ ان عقائد کی تجریدی جلوہ گریاں تھیں جن کے ذریعے آپ ﷺ دنیا کو نئی زندگی بخشنے والے تھے۔ مادی زندگی کے تاریک و شب گرفتہ راستوں میں بسا اوقات ہر بڑے آدمی کو ایسے غیر مادی لیکن مرئی اثرات کا روحانی شعور ہوا ہے جن کی بدولت نوعِ انسانی کے چند عظیم ترین کارنامے انجام پائے۔ اس قدیم صاحب بصیرت سموئیل سے لے کر، جس کی پر جلال شکل ماضی کے دھندلے اُفق کی دوریوں میں دکھائی دیتی ہے، مسیح علیہ السلام تک' جو ویرانہ میں اپنی قوم کی تیرہ بختی اور اپنے کام کی عظمت پر فکر و تامل میں ڈوبا ہوا خدائے برحق کے شیریں الفاظ کو سنتا تھا، پھر مسیح سے لے کر غارِ حرا کے معتکف محمد ﷺ تک ان اثرات کی کارفرمائیوں کا سلسلہ لگاتار چلا آتا ہے۔ رات کی پرسکون گھڑیوں میں، صبح کی خاموشیوں میں، تنہائی کی گہرائیوں میں، جب کوئی ہمدرد آپ ﷺ کے پاس نہ ہوتا تھا، آپ ﷺ کو نسیمِ صبح کی دھیمی دھیمی سرگوشیوں کی طرح، آسمان سے ایک آواز آتی۔ ''تو ہی وہ انسان ہے، تو ہی خدا کا پیغمبر ہے۔'' یا جب آپ ﷺ اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے ہوتے تو آواز گرج کر کہتی: ''بول! اپنے ربّ کے نام پر''۔ ان ہیجانی لمحوں میں نفس ایک رویائی تصویر آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے۔' ان کارکنانِ ساوی کی تصویر جو ربّ السمٰوات کے پیغام لاکر اس کے بندگانِ خاص کو دیتے ہیں۔ ''حق تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو منتخب کر لیتا ہے اور ان سے رعد کی کڑک سے بھی بلند آواز میں خطاب کرتا ہے۔'' یہ وہی اندرونی آواز ہے جس کے ذریعہ خدا ہم سب سے مخاطب ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آواز رفتہ رفتہ اتنی دھیمی پڑ جائے کہ ہمیں بمشکل سنائی دے۔' ہو سکتا ہے کہ اس کا الہامی لہجہ زائل ہو جائے اور وہ دنیوی زیرکی کی زبان میں گم ہو کر رہ جائے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آواز اپنی اصلی صورت میں خدا کے چیدہ و برگزیدہ بندوں کے کانوں تک پہنچے اور انہیں آسمانی آواز معلوم ہو''۔

ایک عظیم مصنف کہتا ہے۔ ''ذات باری تعالیٰ کی نسبت حضرت محمد ﷺ کے وسیع تصور کو ذہنی فضا سے جو تعلق قدرتی طور پر تھا صرف اس سے اس امر کی کچھ توجیہ ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کو جو مہتمم بالشان الہامات ہوئے ان کے باوجود آپ ﷺ نے اپنی سلامتیٔ طبع

اور ضبطِ نفس کو قائم رکھا''۔اس کے بعد وہ کہتا ہے۔'' یہ محض ایک اتفاقی امر نہ تھا کہ اس وقت کی سب سے زبردست قوت اس وسیع جزیرہ نما کی تنہائیوں سے ظاہر ہوئی۔ جس کے ساحل پر سلطنتوں کا مدو جزر ہوتا رہا۔ایک افضل واعلیٰ ادارۂ مطلق کے نام پر جو پیغام بھی دنیا کو دیا گیا وہ صحرا سے بلند ہونے والی ایک آواز تھا۔ نبی ناصری نے ایک مافوق البشر روحانی قوت سے رابطہ قائم کرنے کی خاطر دنیا سے کنارہ کش ہو کر ملکِ عرب کو جو علامتی معنویت بخش دی تھی اُسے محمد ﷺ نے ایک علامت سے بڑھ چڑھ کر کچھ اور چیز بنا دیا۔ عرب ایک فردِ واحد کی ذات میں مرکوز ہو کر ساری نوعِ انسانی کا نمائندہ اور پیغمبر اسلام ﷺ اس کا کلام ناطق بن گیا۔ صحرا نے اپنے اس فرزند پر، جس کی تربیت اس کی بلند روایات کے دامن میں ہوئی تھی اور جو ایک مخفی اندرونی تقاضے سے مجبور ہو کر تاروں بھری رات کی تنہائیوں میں بے یارومددگار نکل کھڑا ہوا تھا، اپنے سارے اسرار کھول کر رکھ دیئے۔''

ایک ایسی رات (قدرت فضیلت کی رات) جب ایک قدسی سکون موجودات پر طاری تھا اور ساری کائنات اپنے مالک کی طرف رجوع کئے ہوئے تھی، آدھی گزر چکی تھی کہ اللہ کی کتاب حضرت محمد ﷺ کی تشنۂ حق روح پر نازل ہوئی۔ آپ ﷺ مراقبہ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ایک زبردست آواز نے، جس میں سمندر کی لہروں کی سی گھن گرج تھی۔ آپ ﷺ کو حکم دیا: ''بول!'' دو مرتبہ آواز آئی اور دونوں مرتبہ آپ ﷺ اس کے حکم کی تعمیل سے قاصر رہے لیکن اس کے بعد ایک زبردست قوت نے آپ ﷺ کو بھینچ لیا اور بولنے پر مجبور کیا۔ آواز نے تیسری بار کہا "بول!" آپ ﷺ نے پوچھا "میں کیا بولوں؟" جواب ملا "بول! اپنے رب کے نام سے۔"

جب آواز آپ ﷺ کو یہ بتا چکی کہ کیونکر انسان ایک قطرۂ ناچیز سے شروع ہو کر وجود میں آیا اور کیوں کر اُسے خدائے رحیم ورحمٰن نے عقل وعلم دے کر بلندی بخشی اور قلم کی بدولت اُسے وہ چیزیں بتائیں جن کا اسے علم نہ تھا۔ تو اس وقت آنحضرت ﷺ عالم بے خودی سے بیدار ہوئے اور آپ ﷺ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ الفاظ جو آپ ﷺ کی روح کہے گئے تھے۔

آپ ﷺ کے دل کی تختی پر لکھ دیئے گئے ہیں۔ آپ ﷺ کے جسم پر کپکپی طاری

ہوگئی۔ آپ ﷺ جلدی سے گھر گئے اور حضرت خدیجہ ؓ سے کہا! مجھے کیا ہوگیا ہے''؟ آپ ﷺ نے فرمایا'' اے خدیجہ ؓ! وہ شخص جس کے بارے میں کسی کو ایسی بات کا یقین نہ آسکتا تھا (یعنی آپ ﷺ) یا تو کاہن[1] بن گیا ہے یا مجنون'' حضرت خدیجہ ؓ نے جواب دیا'' نعوذ باللہ اے، بوالقاسم! (یہ آپ ﷺ کے ایک بیٹے کی نسبت سے آپ ﷺ کی کنیت تھی) خدا کبھی آپ ﷺ پر ایسی واردات نہ ہونے دیگا کیونکہ آپ ﷺ ہمیشہ سچ بولتے ہیں، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے، ایمان دار ہیں، نیکوکار ہیں اور اقربا اور دوستوں سے مہربانی کا سلوک کرتے ہیں۔ آپ ﷺ بازاروں میں بے ہودہ باتیں بھی نہیں کرتے۔ آپ ﷺ کو کیا واقعہ پیش آیا ہے؟ کیا آپ ﷺ نے کوئی خوفناک چیز دیکھی ہے؟'' آنحضرت ﷺ نے جواب دیا ''ہاں'' اور پھر آپ ﷺ کو جو کچھ پیش آیا تھا اس کا ماجرا سنایا۔ اس پر حضرت خدیجہ ؓ نے کہا'' آپ ﷺ کو خوش ہونا چاہیے۔ وہ خدا جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میرا گواہ ہے کہ آپ ﷺ اس زمانے کے پیغمبر ہیں'' پھر حضرت خدیجہ ؓ انھیں اور اپنے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو بوڑھے اور نابینا تھے اور یہود و نصاریٰ کی مقدس کتابوں کے عالم تھے۔ جب خدیجہ ؓ نے انہیں سارا واقعہ سنایا تو وہ پکارا تھے:۔'' قدوس! قدوس! یقیناً یہ وہی ناموس اکبر[2] ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام پر اُترا تھا۔ محمد ﷺ اپنے زمانہ کا پیغمبر ہوگا۔ اُسے جا کر بتا دو اور کہو کہ اپنا دل مضبوط رکھے۔''

سلطنتوں اور قوموں کی تباہی اور قبائل کے وحشیانہ شور و فساد کے درمیان ایک آواز فضا میں گونج رہی تھی، مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک، کہ خدا کا پیغمبر ظاہر ہونے والا ہے: وہ گڈریا قریب آپہنچا ہے جو بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو خدا کے باڑے میں واپس لے آئے گا۔ یہ آواز ورقہ کے گوشِ دل نے بھی سنی۔

---

[1] آپ ﷺ کو کاہنوں اور پیش گوئیاں کرنے والوں سے بے حد نفرت تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر بت خانوں سے وابستہ تھے۔

[2] عربی میں ناموس کا اصلی مطلب پیغمبر ہے، یعنی جو کوئی مخفی پیغام لے کر آتا ہے۔ اس کے ثانوی معنی ہیں قانون۔ Deutsch کہتا ہے،'' تلمود کی زبان میں اس سے مراد ہے الہامی قانون۔ ورقہ کے ذہن میں یہ دونوں معنی یکجا ہوگئے۔ پیغمبر بھی اور پیغام بھی، جو دونوں کے دونوں قدسی تھے، حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوئے جس طرح وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے۔

جب کچھ عرصے بعد حضرت محمد ﷺ اور ورقہ ایک دوسرے سے بازار میں ملے تو یہودی اور عیسوی صحائف کے نابینا اور سن رسیدہ عالم نے، جس نے اطمینانِ قلب کی جستجو میں یہ صحائف چھان مارے تھے لیکن ان سے اطمینان حاصل نہ کر سکا تھا، لیکن جسے اس وعدے کا علم تھا جو بنی نوع انسان سے ایک نجات دہندہ کے آنے کے بارے میں کیا گیا تھا۔ اپنے ایمان و یقین کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔ ''میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضے میں ورقہ کی جان ہے کہ خدا نے تمہیں اس قوم کا نبی منتخب کیا ہے۔ تم پر ناموسِ اکبر نازل ہوا ہے۔ لوگ تمہیں جھوٹا کہیں گے، تمہیں ایذا پہنچائیں گے، تمہیں جلا وطن کریں گے، اور تمہارے ساتھ جنگ کریں گے۔ کاش میں اس دن تک زندہ رہتا، جب یہ سب کچھ تمہیں پیش آئے گا۔ میں زندہ رہتا تو یقیناً تمہارے لیے جنگ کرتا۔'' یہ کہہ کر ورقہ نے آنحضرت ﷺ کی پیشانی کو چوم لیا۔ ان اُمید اور یقین سے بھرے ہوئے کلمات نے آپ ﷺ کے مضطرب دل کو تسکین دی[1]۔ اس کے بعد کچھ مدت ایسی گزری جب آپ ﷺ اس کے منتظر رہے کہ ندائے غیب پھر آپ ﷺ کو سنائی دے اور آسمان سے جو الہام آپ ﷺ پر نازل ہوا تھا وہ دوبارہ آپ ﷺ کے بے قرار دل کے لیے وجہ تسکین بنے۔

جو روحانی اذیتیں، شکوک و شبہات اور اُمیدوں کی جو زبردست ذہنی کشمکشیں آنحضرت ﷺ کے دل کو مسوس رہی تھیں اُن کا کچھ اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اپنی رسالت کا پوری طرح یقین ہونے سے پہلے آپ ﷺ خودکشی کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس ارادے سے فرشتے نے آپ ﷺ کو وہ فرض یاد دلا کر جو نوعِ انسانی کی طرف سے آپ ﷺ پر عائد ہوتا تھا، باز رکھا، اور آپ ﷺ کے مضطرب دل کو، جو شبہات اور اندیشوں کے پیچ و تاب میں مبتلا تھا، اس روشن مستقبل کی ایک جھلک دکھا کر جب ساری افواجِ عالم ایک سچے دین کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گی، اُمید اور یقین دلانے کی کوشش کی[2]۔

---

[1] اس واقعے کے کچھ ہی دن بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا۔

[2] مصنف نے یہاں آنحضرت ﷺ کے بارے میں جن شکوک و شبہات یا باطنی کشمکش اور خلش کا ذکر کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ایک تو وہ انداز ہے جو بعض محدثین نے اختیار کیا اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

اس بشارت کی بدولت خودکشی سے باز آ کر آپ ﷺ، ذہنی اور جسمانی طور پر تھکے ماندے، جلدی جلدی صحرا سے گھر گئے اور اپنی جاں نثار بیوی سے کہا، ''مجھے کمبل اوڑھادو''، گویا آپ ﷺ میں جلال الٰہی کے عینی مشاہدے کی مزید تاب نہ تھی۔

آپ ﷺ کا خدا کے ساتھ جو رابطہ تھا وہ ان خود پرست لوگوں کا سانہ تھا جو صحراؤں اور جنگلوں میں جا کر گوشہ نشین ہو جاتے ہیں اور محض اپنے ذاتی سکون کی خاطر ترکِ دنیا اختیار کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کو ایک کٹھن مہم درپیش تھی۔ ایک ایسی مہم جس کی طرف تقدیرِ الٰہی آپ کو کشاں کشاں لے جا رہی تھی، یعنی اپنی قوم کو بُت پرستی کی غلامی سے آزاد کرانے کی مہم۔ تقدیر کو آپ ﷺ سے جو کام لینا تھا وہ آپ ﷺ پر اس وقت واضح ہوا جب آپ ﷺ غمگین اور اُداس، عمیق تفکر میں ڈوبے ہوئے تھے اور آپ ﷺ کے کانوں میں وہی آواز آئی جس نے آپ ﷺ سے پہلے نبیوں کو پکارا تھا، اور جو آپ ﷺ سے اُٹھ کر دینِ حق کی تبلیغ میں مصروف ہو جانے کا تقاضا کر رہی تھی۔ ''اے چادر میں لپٹے ہوئے اُٹھ اور لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرا اور اپنے رب کی کبریائی بیان کر۔'' (سورۂ مدثر) آپ ﷺ اُٹھے اور جس کام کی دعوت آپ ﷺ کو دی جا رہی تھی اس کے لیے کمر باندھ لی۔ اس کے بعد آپ ﷺ کی زندگی تمام کی تمام نوعِ انسانی کی صلاح و فلاح کے لیے وقف ہوگئی۔ بے پناہ ظلم وستم اور تذلیل و توہین کے باوجود آپ ﷺ ثابت قدمی سے تنبیہ و اصلاح کی راہ پر گامزن رہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۲) وہ یہ ہے کہ اس کشمکش یا خلش کا تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ کو خدانخواستہ ایسے منصب کی حقانیت میں کوئی شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ بلکہ اس کا تعلق تحمل سے ہے۔ یعنی اس حقیقت سے ہے کہ منصب کی حقانیت کے باوجود، تشویش اس خبر کی تھی کہ کیا آپ ﷺ نبوت کی ان گرانقدر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں گے یا دوسرے لفظوں میں آیا نبوت کے اس غیر معمولی ظہور کو انسانی فکر و تعقل کا یہ کمزور ڈھانچہ آسانی سے قبول کر سکے گا۔؟

دوسرا انداز وہ ہے، جس کو علامہ شبلی نے اختیار کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے سرے سے یہ روایت ہی مرفوع متصل نہیں جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ شدت احساس سے خودکشی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ان کے نزدیک اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس کو زہری نے بیان کیا ہے اور بس یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے جیسا کہ شارحین بخاری نے تصریح کر دی ہے۔ ظاہر ہے ایسے عظیم الشان واقعہ کے لیے سند مقطوع کافی نہیں

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سب سے پہلی ہستی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لائیں جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الہامی پیغام کو قبول کیا بُت پرستی کو چھوڑا اور صفائے قلب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شامل ہو کر خدائے رحیم و رحمٰن کے حضور میں سجدہ گزار ہوئیں۔ یہی نہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے والی پہلی ہستی تھیں، بلکہ اس جدوجہد میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آنے والی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی غمگسار بھی تھیں۔ روایت کہتی ہے: ''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈھارس بندھائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حوصلہ افزائی کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بوجھ ہلکا کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ایمان کا یقین دلایا اور لوگوں کی بے ہودہ باتوں کی پروا نہ کرنے کی تاکید کی۔''

شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اپنے عزیزوں پر اپنے دل کا راز کھولا اور ان سے اپنے آباؤ اجداد کی قبیح رسوم و عادات چھڑانے کی کوشش کی۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد علی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بسا اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیوی اور چچیرے بھائی کو ہمراہ لے کر مکے کے اردگرد کے صحرا کی تنہائیوں میں چلے جاتے تاکہ تینوں مل کر رب العٰلمین کے احسانوں کا شکر ادا کریں۔ ایک دن ایسا ہوا کہ جب یہ تینوں نماز میں مصروف تھے تو اچانک ابو طالب ادھر آ نکلے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھ کر پوچھا: ''بھتیجے، یہ کون سا مذہب ہے جس کی تم پیروی کر رہے ہو؟'' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔ ''یہ خدا کا، اُس کے فرشتوں کا، اس کے نبیوں کا اور ہمارے جدِّ امجد ابراہیم علیہ السلام کا مذہب ہے۔ خدا نے مجھے اپنے بندوں کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ میں انہیں سچائی کا راستہ دکھاؤں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم، اے میرے چچا، اُن میں سب سے اچھے بندے ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ آپ کو میں اپنا پیغام دوں اور مناسب ہے کہ آپ سچائی کو قبول کریں اور اس کی اشاعت میں مجھے مدد دیں۔'' ابو طالب نے ایک قدیم سامی کے شایانِ شان غیرت و حمیت سے جواب دیا۔ ''بھتیجے، میں اپنے باپ دادا کا مذہب نہیں چھوڑ سکتا، لیکن قسم ہے خدائے بزرگ و برتر کی کہ جب تک میں زندہ ہوں کوئی تیرا بال بیکا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔'' اس کے بعد اس معزز بزرگ نے اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر اس کے مذہب کے بارے میں استفسار کیا۔ علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

"میرے باپ، میں خدا اور اس کے نبی پر ایمان رکھتا ہوں اور اس نبی کی پیروی کرتا ہوں۔" ابو طالب نے کہا "اچھی بات ہے، میرے بیٹے۔ وہ تجھے صرف نیکی کی طرف بلائے گا، اس لیے میری طرف سے اجازت ہے کہ تو اُس کی پیروی کرے[1]۔"

تھوڑی ہی مدت کے بعد زید بن حارث جنہوں نے آزاد کئے جانے کے باوجود آنحضرت ﷺ کا دامن نہ چھوڑا تھا، دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور ان کے بعد قبیلۂ قریش کے ایک معزز رکن عبداللہ بن ابوقحافہ، جنہوں نے آگے چل کر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نام سے شہرت پائی[2]۔ آپ رضی اللہ عنہ خاندان تیم ابن مرّہ کے ایک ممتاز فرد اور ایک دولت مند تاجر تھے۔ سلیم الطبع۔ صائب الرائے، بیدار مغز، دیانتدار اور ہردلعزیز۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ اپنے ہم عصروں میں بڑی وقعت رکھتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے صرف دو سال چھوٹے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے بلاحیل و حجت قبولِ اسلام کا لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑا۔ پانچ ممتاز افراد نے ان کی مثال کی تقلید کی، جن میں اُموی خاندان کے عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان بھی تھے، جو بعد میں خلیفۂ سوم ہوئے۔ عبدالرحمٰن عوف، سعد بن ابی وقاص، جنہوں نے بعد میں ایران فتح کیا اور زبیر بن عوام، جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے۔ ان سب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ ادنیٰ طبقے کے کئی لوگ بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ رسولِ عربی ﷺ کی داستانِ حیات کا یہ ایک وصفِ جمیل ہے، جو آپ ﷺ کے صدق وخلوص' آپ ﷺ کی تعلیمات کی پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ پر آپ ﷺ کے راسخ یقین و ایمان پر پرزور دلالت کرتا ہے، کہ آپ ﷺ کے سب سے قریبی رشتہ دار، یعنی آپ ﷺ کی بیوی اور چچیرے بھائی، اور آپ ﷺ کے گہرے دوست آپ ﷺ کی رسالت کی سچائی اور آپ ﷺ کے مبعوث من اللہ ہونے پر پورا پورا یقین لائے۔ جو لوگ آپ ﷺ کو اچھی طرح جانتے تھے، یعنی قریبی رشتہ دار اور عزیز ترین دوست، جو آپ ﷺ کے ساتھ رہتے سہتے تھے، یہی لوگ آپ ﷺ کے مخلص اور سب سے وفادار پیرو بنے۔ اگر ان لوگوں کو،

---

[1] ہم نے اس واقعے کو اسی طرح پیش کیا ہے جس طرح اسے ابن ہشام اور ابن الاثیر نے بیان کیا ہے۔

[2] Desverser ایک حاشیے میں لکھتا ہے کہ قبولِ اسلام سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عبدالکعبہ کے لقب سے ملقب تھے۔

جو شریف النّسب اور عقل مند تھے اور گلیل کے ماہی گیروں سے کسی صورت کم تعلیمیافتہ نہ تھے، معلّمِ اسلام میں دنیا پرستی، فریب کاری یا ضعفِ ایمان کا شائبہ تک نظر آتا تو اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے بارے میں آپ ﷺ کی تمام اُمیدیں ایک لمحے کے اندر خاک میں مل جاتیں۔ ان لوگوں نے آپ ﷺ کی خاطر ظلم وستم سہا، خطرات کا سامنا کیا، جسمانی اذیتیں برداشت کیں اور معاشرتی تعلقات کے انقطاع کی ذہنی تکلیف اٹھائی، یہاں تک کہ اپنی جانیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اگر ان لوگوں کو اپنے آقا میں شمّہ بھر خامی بھی دکھائی دیتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ یہ سب کچھ کرتے؟ لیکن اگر یہ لوگ آپ ﷺ پر اتنا راسخ ایمان نہ بھی لاتے تو یہ امر آپ ﷺ کے کام کی عظمت اور آپ ﷺ کے خلوصِ نیت پر شک کرنے کا کوئی جواز مہیا نہ کرتا۔ نبیوں میں بہت کم ایسے ہوئے ہیں جن پر اُن کے قریب ترین رشتہ داروں نے یقین کیا۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کو لیجئے۔ ان کے بھائی اُن پر ایمان نہ لائے۔ بلکہ یہاں تک کہ ان کے مخالف تھے کہ ایک مرتبہ انہیں دیوانہ سمجھ کر قید و بند میں ڈالنے کی کوشش کی۔ اور تو اور اُن کے قریب ترین حواریوں کا عقیدہ بھی راسخ نہ تھا[1]۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی یہ سُست اعتقادی غالباً اُن لوگوں کی سیرت کی کمزوری کا نتیجہ تھی، یا جیسا کہ ملمین کا خیال ہے، اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اندازِ تکلم ہر وقت بدلتا رہتا تھا۔ بہر حال اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حواریوں کا ایمان پوری طرح راسخ نہ تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کے مقربین کا وثوقِ عقیدہ وایمان آپ ﷺ کے خلوص اور کارِ نبوّت میں والہانہ استغراق کی افضل ترین شہادت ہے۔

تین سالوں کی طویل مدت میں آپ ﷺ اپنی قوم سے بُت پرستی چھڑانے کی کوششوں میں خاموشی سے مصروف رہے لیکن شرک عربوں کی گھٹی میں تھا۔ علاوہ بریں پرانے مذہب میں ایسی ایسی دلکشیاں تھیں جو نیا مذہب اپنی پاکیزگی کے باعث پیش نہ کر

---

[1] جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ رہا تھا اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے خبر دینے والے کو جواب میں کہا کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی؟ اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا، دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں۔" (متی ۱۲(۴۶ تا ۴۸)، مرقس ۳(۳۲۔۳۳)

سکتا تھا۔ قریش کے مفادات بُت پرستی سے وابستہ تھے اور ان کی عزت و وقار کا دارومدار اس کے قائم رکھنے پر تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو نہ صرف اپنے شہر کی بت پرستی کا مقابلہ کرنا پڑا، جسے صدیوں کے رواج اور اعتقاد نے استحکام بخش رکھا تھا، بلکہ عمائدین کی مخالفت کا بھی جو شہر کے سفید و سیاہ کے مالک تھے اور جو عرب کے عام لوگوں کی طرح توہم پرستی اور کفر میں مبتلا تھے۔ ان مخالف قوتوں کی موجودگی میں مقام تعجب نہیں کہ تین سال کی جاں فشانیاں صرف تیس پیرو پیدا کر سکیں۔ پھر بھی اس معلمِ عظیم نے ہمت نہ ہاری اور اس قادرِ مطلق پر بھروسہ کئے ہوئے جس کے احکام کی وہ تعمیل کر رہا تھا، اپنے موقف پر قدم جمائے کھڑا رہا۔ آپ ﷺ اب تک نہایت خاموشی سے بلاتعرض تبلیغ کرتے رہے تھے، آپ ﷺ کے ہم وطنوں نے آپ ﷺ کو شک کی نظروں سے دیکھا تھا، آپ ﷺ کی صحتِ دماغ پر شبہ کیا تھا، آپ ﷺ کو خبطی اور دیوانہ سمجھا تھا، لیکن آپ ﷺ کی خاموش تبلیغ میں خلل اندازی نہ کی۔ اب آپ ﷺ نے تہیہ کر لیا کہ آپ ﷺ قریش کو بت پرستی ترک کرنے کی دعوتِ عام دیں گے۔ اس مقصد کی خاطر آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر لوگوں کو جمع کیا اور انہیں بتایا کہ ان کی بدکاریاں خدا کی نگاہ میں کتنی معیوب ہیں اور اپنے ہاتھوں کے گھڑے ہوئے بتوں کا پوجنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ آپ ﷺ نے انہیں ان قوموں کے حالات سنا کر عبرت دلائی جنہوں نے اپنے وقت کے رسولوں کی بات نہ سنی تھی اور انہیں اس کی دعوت دی کہ اپنے قدیم ناپاک طریقہ ہائے عبادت کو ترک کر دیں اور محبت، صداقت اور پاکیزگی کے اس مذہب کو اختیار کریں جس کی تبلیغ آپ ﷺ کر رہے تھے۔ تمسخر اُڑانے والوں نے آپ ﷺ کی باتوں کا تمسخر اُڑایا، نوجوان علی رضی اللہ عنہ کے جوش و خروش کی تضحیک کی اور طعن آمیز بول بولتے ہوئے چلے گئے، لیکن ان کے دل اس روحِ انقلاب کے خوف سے کانپ رہے تھے جو انہی کے درمیان سے یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ یوں آسمانی تنبیہوں کو قریش تک پہنچانے میں ناکام رہ کر آپ ﷺ نے اپنی توجہ ان اجنبیوں پر مبذول کی جو شہر میں تجارت یا حج کی غرض سے آتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان تک خدا کا پیغام پہنچانے کی کوشش کی، لیکن قریش اس میں بھی مزاحم ہوئے۔ جب حجاج شہر کے نواح میں آنے شروع ہوئے تو قریش نے مختلف راستوں پر آدمی متعین کر دیئے اور آنحضرت ﷺ کو ایک خطرناک

جادوگر کہہ کر آپ ﷺ کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ قائم کرنے سے منع کر دیا۔ لیکن اس چال بازی کا نتیجہ ایسا نکلا جس کی اہلِ مکہ کو توقع نہ تھی۔ جب حجاج اور تجار اپنے دور دراز ملکوں میں واپس گئے تو اپنے ساتھ اس عجیب اور جوشیلے معلّم کے ظہور کی خبریں لے گئے جو اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اقوامِ عرب کو اپنے آباؤ اجداد کے طریقۂ عبادت کو ترک کر دینے کی علی الاعلان دعوت دے رہا تھا۔

اگر قریش اس زعم میں تھے کہ آنحضرت ﷺ کے اعزہ اقرباء آپ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیں گے تو ابو طالب کی غضب آلود ملامت نے بہت جلد اُن کے دماغ درست کر دیئے۔ یہ بزرگ سال سردار، جس نے اپنی مخصوص وفاداری واستواری سے کام لے کر اپنے قدیم مذہب کو ترک کرنے اور نئے مذہب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس ناانصافی اور اس ناداری کو دیکھ کر تڑپ اُٹھا جو اس کے ہم وطن معلّمِ اسلام سے کر رہے تھے۔ چنانچہ اس نے ایک قصیدہ لکھا جو اب تک تاریخ میں یادگار چلا آرہا ہے۔ اس میں اُس نے صحرانشینوں کی قدیم جواں مردی سے کام لے کر قریش کی ان زیادتیوں پر اظہارِ افسوس کیا جو ایک ایسے شخص پر کر رہے تھے، جو یتیموں اور بیواؤں کا محسن تھا اور جو'الامین' تھا یعنی کبھی اپنے قول وفعل میں جھوٹا نہ نکلا تھا۔ اسی قصیدہ میں ابو طالب نے اعلان کیا کہ ہاشم اور مطلب کے خاندان کا بچہ بچہ اپنی جان پر کھیل کر بھی اس معصوم نوجوان کی حمایت اور حفاظت کرے گا۔ انہی دنوں ایک یثربی سردار نے قریشِ مکہ کو ایک خط لکھا جس میں اس نے پرانے زمانے کی مثالیں دے کر انہیں خانہ جنگیوں اور لڑائیوں میں اُلجھنے سے بچنے کی تاکید کی۔ اس نے انہیں مشورہ دیا کہ نئے معلم کی باتیں سُنیں۔ ''ایک صاحبِ عزّت شخص نے ایک خاص مذہب اختیار کیا ہے۔ تم لوگ کیوں اُسے ستاتے ہو؟ دلوں کے راز صرف آسمانوں کے مالک کو معلوم ہیں۔'' اس کے مشورہ سے قریش کسی حد تک اثر پذیر ہوئے اور ان کا طرزِ عمل قدرے بدل گیا۔ چنانچہ انہوں نے کچھ مدت کے لیے کھلم کھلا ظلم وستم کی جگہ سب وشتم، افترا، بدزبانی اور توہین آمیز حرکات سے کام لیا۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو کعبے میں نماز ادا کرنے سے روک دیا۔ جہاں آپ ﷺ جاتے وہ آپ ﷺ کا پیچھا کرتے، آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے متبعین پر نماز کی حالت میں گندگی اور

کیچڑ پھینکتے اور بچوں اور شہر کے بدمعاشوں کو آپ ﷺ کی تذلیل کے لیے آپ ﷺ کے پیچھے لگاتے۔ جن راستوں سے آپ ﷺ عبادت یا مراقبے کے لیے گزرتے اُن پر کانٹے بچھا دیتے۔ اس خار افشانی میں آنحضرت ﷺ کے چچا ابولہب کی بیوی اُم ِ الجمیل ہمیشہ پیش پیش رہتی۔ آپ ﷺ کے ستانے والوں میں وہ سب سے زیادہ بے رحم تھی۔ جہاں جہاں بھی آنحضرت ﷺ یا آپ ﷺ کے متبعین عبادت کے لیے جاتے وہاں کانٹے بکھیر دیتی۔ اس کی اسی ایذا رسانی کی بدولت اس پر حَمَّالَةَ الْحَطَبُ (خار دار لکڑیاں لاد کر لانے والی) کا لقب نازل ہوا۔

ان تمام آزمائشوں کے درمیان آنحضرت ﷺ کے قدم نہ ڈگمگائے۔ آپ ﷺ کو اپنی رسالت پر جو کامل اعتماد تھا اس کی بدولت، آپ ﷺ ثابت قدمی سے اپنے کام میں مصروف رہے۔ کئی مرتبہ قریش کے ہاتھوں آپ ﷺ کی جان کو خطرہ لاحق ہوا، ایک مرتبہ آپ ﷺ نے اُن کے قاتلانہ غضب کو اپنی طبیعت کی نرمی اور صبر و تحمل سے فرو کیا۔ لیکن ظلم و ستم نے دینِ حق کو اور بھی تقویت بخشی۔ یہ مشہور مقولہ کہ ''شہدا کا خون کلیسا کا بیج ہے۔'' صرف دینِ عیسوی پر ہی صادق نہیں آتا۔ قریش نے آنحضرت ﷺ پر جو سختیاں کیں اور اُن سے جو شدید تعصب روا رکھا، اسے دیکھ کر عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے حمزہ رضی اللہ عنہ، جو سپہ گری میں اپنا حریف نہ رکھتے تھے، دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ یہ بہادر فراخ دل اور راست باز سپاہی، جس کی شمشیر صف شکن سے تمام قریش کا زہرہ آب ہوتا تھا، انہی دنوں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لایا، اور اسلام کا ایک جاں باز پیرو بن گیا۔ بالآخر اس نے اسلام پر اپنی جان قربان کر دی۔

اس جبر و تعدّی کے باوجود آنحضرت ﷺ اپنی قوم کو، جو فسق و فجور میں بری طرح مبتلا تھی، اپنی بدکاریوں اور مکروہات کو ترک کرنے کی مسلسل تلقین کرتے رہے۔ آپ ﷺ دل و جان سے تبلیغ میں مشغول رہے۔ آپ ﷺ نے شعلوں کی طرح دہکتے ہوئے الفاظ میں وہ عذابِ الٰہی قریش کو یاد دلایا جو عاد و ثمود کے قبیلوں پر نازل ہوا جنھوں نے خدا کے رسولوں کی تنبیہوں پر کان نہ دھرے تھے۔ قومِ نوح علیہ السلام کی بد افعالیوں پر جو قہرِ الٰہی نازل ہوا تھا اس کے قصے بھی آپ ﷺ نے انہیں سنائے۔ آپ ﷺ نے انہیں فطرت کے

حیرت انگیز نظاروں کی، دھوپ کی بھڑکیلی چمک کی اور رات کی، جب وہ اپنی سیاہ چادر پھیلا دیتی ہے اور دن کی، جب وہ شان وشکوہ سے ظاہر ہوتا ہے، قسمیں دلائیں اور تاکید کی کہ آپ کی تنبیہوں کو سنیں تاکہ وہ اسی طرح کی تباہی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ آپ ﷺ نے انہیں یوم الحساب سے ڈرایا، جب وہ تمام اعمال جو انسان نے اس دنیا میں کئے ہیں منصف ازلی کے روبرو تولے جائیں گے، جب ان بچیوں سے جنہیں زندہ گاڑ دیا گیا تھا پوچھا جائے گا کہ انہیں کس جرم کی پاداش میں ہلاک کیا گیا، جب زمین وآسمان تہ کر دیئے جائیں گے اور جب خدا کے سوا کوئی نزدیک نہ ہوگا۔ آپ ﷺ نے انہیں عقبیٰ کی جزا وسزا کا حال سنایا اور اُن مادہ پرست لوگوں کی آنکھوں کے سامنے جنت کی لذتوں اور جہنم کی عقوبتوں کا مرقع پیش کیا۔ آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ منکرین کی ''مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اندھیری رات میں آگ جلائے اور جب اس کی اردگرد کی تمام چیزیں چمک اٹھیں تو خدا روشنی کو سلب کر لے اور اُسے اندھیرے میں چھوڑ دے۔ پھر وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے''۔

''وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں اور اس لیے کبھی راہِ راست پر نہیں آ سکتے۔''

''وہ اُن لوگوں کی طرح ہیں جو اس وقت جب آسمان کے تاریک بادل انہیں گھیر لیتے ہیں اور بجلی کڑکتی ہے بجلی کی کڑک سے ڈر کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ خدا نے کافروں کو گھیرے میں ڈال رکھا ہے۔''

''بجلی اس زور سے چمکتی ہے کہ جیسے ابھی ان کی بینائی اُچک لے گی۔ جب وہ چمکتی ہے تو وہ اس کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں لیکن جب انہیں تاریکی گھیر لیتی ہے تو وہ رُک جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یقیناً انہیں کانوں اور آنکھوں سے محروم کر دیتا۔ بے شک اللہ ہر بات پر قادر ہے''۔

''جہاں تک کافروں کا تعلق ہے ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے ریگستان میں سراب جسے پیاسا راہگیر پانی سمجھتا ہے، اور جب وہ اس کے قریب پہنچتا ہے تو اُسے وہاں کچھ نہیں ملتا، لیکن وہ خدا کو ہر سمت موجود پاتا ہے اور خدا اس کا پورا پورا حساب چکائے گا، کیونکہ خدا سریع الحساب ہے''۔

یا ''(کفار کے اعمال) اس تاریکی کی طرح ہیں جو گہرے سمندر پر پھیلی ہوئی

ہے۔ موجوں پر موجیں سوار چلی جاتی ہیں اور اوپر تاریک بادل چھائے ہوئے ہیں، یعنی ایک تاریکی کے اُوپر دوسری تاریکی، ایسی تاریکی کہ آدمی اگر اپنا ہاتھ پھیلائے تو اُسے نہ دیکھ سکے۔ جسے اللہ نور عطا نہ کرے اُسے کوئی نور عطا نہیں کر سکتا"۔

ان بیانات سے لوگوں پر ہیبت طاری ہو گئی اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔

اب قریش کے دل میں بہت اندیشہ پیدا ہوا کیونکہ آنحضرت ﷺ کی تبلیغ ایک خطرناک انقلابی تحریک کا پیش خیمہ معلوم ہوتی تھی۔ ان کا اقتدار و وقار خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ وہ لوگ ان بتوں کے محافظ تھے جنہیں آپ ﷺ تباہ کر دینا چاہتے تھے۔ وہ اس عبادت کے کفیل تھے جسے آنحضرت ﷺ برا کہتے تھے۔ اُن کی ہستی پرانے اداروں کے قائم رہنے پر منحصر تھی۔ انہیں خوف ہوا کہ اگر مبلغ اسلام کی پیشگوئیاں پوری ہو گئیں تو قبائل عرب میں ان کو جو تفوق حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ اس نئے مبلغ کا انداز کلام انتہا درجہ کا جمہوری تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اس کے خدا کی نگاہوں میں سب انسان برابر ہیں۔ پرانے امتیازات کا ہموار ہو جانا، ان کی تمام روایات کے منافی تھا۔ انہیں یہ مساوات قبول نہ تھی کیونکہ یہ ان کی خصوصی مراعات کے حق میں مضر تھی۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس تحریک کے مزید قوت حاصل کرنے سے پہلے فوری اقدامات کئے جائیں۔

چنانچہ انہوں نے ایذا رسانی کا ایک منظم طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن چونکہ وہ انتقام کے قوانین کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہتے تھے، اس لیے ہر خاندان اپنے ان افراد و متعلقین اور غلاموں کو اذیت دیتا جن کے بارے میں یہ شک ہوتا کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ جنہیں ابو طالب اور ان کے قرابت داروں کی حمایت حاصل تھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور چند دوسرے لوگ جو یا تو خود صاحب مرتبہ تھے یا قریش میں کوئی بارسوخ دوست یا حامی رکھتے تھے، کچھ مدت تک فوری جبر و تشدد سے محفوظ رہے، لیکن دوسرے لوگوں کو قید میں ڈال دیا گیا، بھوکا رکھا گیا، اور جسمانی سزائیں دی گئیں۔ رمضا کی پہاڑی اور بطحا یہ دونوں مقام ان بے رحمانہ ایذا رسانیوں کا معمل بن گئے۔ جو مرد اور عورتیں بت پرستی کو ترک کر دیتے، انہیں صحرا کی جلا دینے والی دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیا جاتا۔ جب وہ پیاس کی شدت سے جاں بلب ہو جاتے تو انہیں موت سے بچنے کی

صرف ایک ہی صورت بتائی جاتی، یعنی بُت پرستی۔ بعض لوگ اس کا اقرار کر لیتے اور اذیتوں سے چھٹکارا پاتے ہی پھر سے دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے، لیکن اکثر و بیشتر لوگ نہایت استقلال سے اپنے ایمان پر قائم رہے۔ انہی لوگوں میں اسلام کے پہلے مؤذن بلال رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کا آقا اُمیہ بن خلف ہر روز انہیں ٹھیک دوپہر کے وقت بٹھا لے جاتا۔ وہاں اُن کی پیٹھ ننگی کر کے اور اُن کا منہ سورج کی طرف کر کے لٹا دیتا اور اُن کے سینے پر پتھر کی چٹان رکھ کر کہتا "تو اسی حال میں رہے گا جب تک یا تو تیری جان نہ نکل جائے یا تو اسلام سے توبہ نہ کر لے"، لیکن بلال رضی اللہ عنہ اس بھاری بوجھ کے نیچے پیاس سے جاں بلب ہوتے ہوئے بھی "اَحَد، اَحَد" کے سوا کوئی جواب نہ دیتے۔ یہ سزا کئی دنوں تک جاری رہی اور بے چارے بلال رضی اللہ عنہ موت کے کنارے تک پہنچ چکے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں خرید کر ان کی جان بچائی (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس سے پہلے بھی ایسے ہی چھ غلام آزاد کرا چکے تھے) یاسر رضی اللہ عنہ اور اس کی بیوی سمیہ رضی اللہ عنہا کو ایسے ہی دردناک عذابوں کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا۔ اور ان کے بیٹے عمار رضی اللہ عنہ کو خوفناک اذیتیں پہنچائی گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ اپنی آنکھوں سے اپنے متبعین کی اذیتوں کو دیکھا، جو ایسے صبر و تحمل سے برداشت کی گئیں جو راہِ حق میں شہید ہونے والوں کو زیب دیتا تھا۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ اسی طرح کے لاتعداد شہیدوں کی داستانوں سے رنگین ہے۔[1]

جس طرح فریسیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تحریصوں سے آزمایا تھا اسی طرح قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جادۂ فرض سے منحرف کرنے کی خاطر دنیوی جاہ و حشم کی ترغیبیں دلاتے۔ مورخ لکھتا ہے کہ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں مخالف سرداروں کے مجمع سے الگ بیٹھے تھے کہ ان میں سے ایک یعنی عتبہ بن ربیعہ، جو دوسروں کی بہ نسبت معتدل مزاج تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور بولا۔ "اے میرے بھائی کے بیٹے تو اپنے اوصاف اور حسب و

---

[1] مثلاً خبیب رضی اللہ عنہ بن عدی جنہیں دغابازانہ طور پر قریش کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ قریش نے جیتے جی ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے اور ان کے گوشت کو بوٹی بوٹی کر ڈالا۔ جب انہیں یہ عذاب دیا جا رہا تھا تو کسی نے ان سے پوچھا۔ "خبیب رضی اللہ عنہ کیا تم نہیں چاہتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری بجائے اس حالت میں ہوتا"؟ انہوں نے جواب دیا۔ "واللہ! میں اپنی، اپنے بیوی بچوں اور مال و دولت کی اتنی قیمت بھی ادا کرنے کو تیار نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کانٹا بھی چبھ جائے۔" بعض مورخین اس گفتگو کو زید رضی اللہ عنہ بن الدثنہ سے منسوب کرتے ہیں (شبلی)

نسب کی بدولت ہم سب میں ممتاز ہے لیکن تو نے ہمارے درمیان افتراق کا بیج بو دیا ہے، اور خاندانوں میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ تو ہمارے دیوتاؤں اور دیویوں کو برا کہتا ہے اور ہمارے آباؤ اجداد پر ناپاکی کی تہمت دھرتا ہے۔ ہم تیرے پاس ایک تجویز لے کر آئے ہیں۔ اچھی طرح سوچ کر دیکھ لے کہ اس میں تیرے لیے بھلائی ہے یا نہیں"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "بولو ابو ولید، میں سن رہا ہوں"۔ عتبہ نے کہا "تو جو کچھ کر رہا ہے اگر اس سے تیرا مقصد دولت پیدا کرنا ہے تو ہم تیرے لیے اتنی دولت جمع کر دیں گے کہ تم ہم میں سب سے امیر ہو جائے گا۔ اگر تجھے عزت و حشمت کی خواہش ہے تو ہم تجھے اپنا سردار بنالیں گے اور تیرے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کریں گے، اگر تجھے مملکت کی خواہش ہے تو ہم تجھے اپنا بادشاہ بنالیں گے اور اگر تو آسیب میں مبتلا ہے تو ہم طبیبوں کو بلائیں گے اور وہ تیرے علاج کے لیے جتنی دولت چاہیں اتنی دولت انہیں دیں گے"۔ جب عتبہ اپنی بات ختم کر چکا تو رسولِ خدا ﷺ نے پوچھا "ابو ولید! تمھیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے؟" عتبہ نے جواب دیا "ہاں" آنحضرت ﷺ نے کہا "تو اب میری بات سنو۔ میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ یہ کلام اس رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں۔ یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں ہے اور ایسے لوگوں کی ہدایت کے لیے ہے جو دانشمند ہیں۔ اس میں سمجھنے والوں کے لیے بشارتیں ہیں اور نہ سمجھنے والوں کے لیے تنبیہیں۔ لیکن اکثر لوگ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور اس پر کان نہیں دھرتے اور کہتے ہیں۔ "جس بات کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے وہ ہمارے دل کو نہیں لگتی" ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور تیرے اور ہمارے درمیان ایک پردہ ہے، اس لیے تو اپنی سی کیے جا اور ہم اپنی سی کیے جائیں۔ کہہ دے اُن سے کہ میں تمھی جیسا آدمی ہوں، مگر مجھ پر وحی آئی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک خدا ہے اس لیے سیدھے اس کی طرف جاؤ اور اسی سے معافی مانگو۔ بدبخت ہیں وہ مشرک جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے آخرت میں ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔" (حٰم السجدہ ۱ تا ۸) جب آنحضرت ﷺ ان آیات کی تلاوت ختم کر چکے تو آپ ﷺ نے عتبہ سے کہا "تم نے

سن لیا اب جو راستہ تم بہتر سمجھو وہ اختیار کرو''۔

اپنے متبعین کی تکلیفیں دیکھ کر، جن کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی' آپ ﷺ کو بے حد رنج ہوتا۔ اس لیے آپ ﷺ نے انہیں ہدایت کی کہ وہ قریب کی عیسائی سلطنت حبشہ میں جہاں ایک خدا ترس بادشاہ حکومت کرتا تھا، جا کر اس وقت تک پناہ لیں جب تک کہ خدائے تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے قریش کے جذبات کو تبدیل نہ کر دے۔ آپ ﷺ نے اس عیسائی بادشاہ کی نیکو کاری، رواداری اور مہمان نوازی کے تذکرے سُن رکھے تھے اور آپ ﷺ کو یقین تھا کہ وہ ان کے ساتھ مدارات سے پیش آئے گا۔

پندرہ لوگوں نے اس ہدایت پر فوراً عمل کیا اور نجاشی کے ملک کو ہجرت کر گئے۔ تاریخ اسلام میں یہ پہلی ہجرت کہلاتی ہے اور یہ بعثتِ نبوی کے پانچویں سال (۶۱۵ء) میں واقع ہوئی۔ راہِ حق کے بہت سے دوسرے جاں باز بہت جلد اُن لوگوں سے جا ملے، یہاں تک کہ مردوں کی تعداد ۸۳ تک اور عورتوں کی ۱۸ تک پہنچ گئی۔ لیکن قریش کی ان تھک مخالفت نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ اپنے شکار کے ہاتھ سے نکل جانے پر جھنجلا اُٹھے چنانچہ انہوں نے نجاشی کے دربار میں جا کر یہ مطالبہ کیا کہ مہاجرین کو ان کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ انہیں موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ انہوں نے مہاجرین پر جو الزام لگائے اُن میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ انہوں نے اپنے آبائی مذہب کو ترک اور نئے مذہب کو اختیار کیا ہے۔ اس نے دریافت کیا ''وہ کون سا مذہب ہے جس کی خاطر تم لوگوں نے اپنا پرانا مذہب ترک کر دیا اور اس کی بجائے نہ میرا مذہب اور نہ کسی اور قوم کا مذہب اختیار کیا ہے؟'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی جعفر بن ابو طالب نے جو مہاجرین کی نمائندگی کر رہے تھے، ذیل کے الفاظ میں جواب دیا: ''اے بادشاہ ہم لوگ جہالت اور بربریت میں ڈوبے ہوئے تھے، ہم بتوں کو پوجتے تھے، ناپاکی کی زندگی بسر کرتے تھے، مردار کھاتے تھے اور فحش باتیں کرتے تھے۔ انسانیت کے تمام احساسات ہم میں مفقود ہو چکے تھے اور ہم مہمان نوازی کے فرائض اور حقوقِ ہمسائیگی کو فراموش کر چکے تھے۔ ہم طاقت کے سوا کسی قانون کو نہ مانتے تھے۔ ایسے میں خدائے تعالیٰ نے ہم میں سے ایک ایسا انسان پیدا کیا جس کی شرافت نسب، راست بازی، امانت داری اور پاکیزگی سے ہم

سب واقف تھے۔ اس نے ہمیں خدا کی وحدانیت کی طرف دعوت دی اور ہمیں یہ سکھایا کہ کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں[1] اس نے ہمیں بت پرستی سے منع کیا اور ہمیں یہ ہدایت کی کہ سچ بولیں، اپنے وعدوں کو پورا کریں، صلۂ رحمی کا طریقہ اختیار کریں اور اپنے ہمسایوں کے حقوق کا احترام کریں۔ اس نے ہمیں عورتوں کے ساتھ بری بری باتیں کرنے اور یتیموں کا مال کھانے سے باز رکھا۔ اس نے ہمیں برائیوں سے دور رہنے، خرابیوں سے بچنے، نماز ادا کرنے، زکوٰۃ دینے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے اس کی اس ہدایت و تعلیم کو قبول کیا ہے کہ ہم صرف خدا کی عبادت کریں اور کسی دوسری ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ان وجوہ کی بنا پر ہماری قوم کے لوگ ہمارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور انہوں نے ہمیں اس پر مجبور کرنے کے لیے کہ ہم خدائے واحد کی عبادت سے روگرداں ہو کر لکڑی اور پتھر کے بنے ہوئے بتوں کی پوجا اور اس طرح کی دوسری مکروہات کی طرف لوٹ جائیں۔ انہوں نے ہمیں اس حد تک دکھ پہنچائے ہیں اور اذیتیں دی ہیں کہ ہم اُن سے تنگ آ کر تیرے ملک میں پناہ گزین ہوئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو ہمیں اُن کے ظلم وستم سے محفوظ رکھے گا۔[2]

نجاشی نے قریش کے مطالبات رد کر دیئے اور اُن کے ایلچی ناکام و نامراد مکے کو واپس چلے گئے۔

جس زمانے میں حضرت محمد ﷺ کے متبعین دوسرے ممالک میں دشمنوں کے ظلم وستم سے پناہ ڈھونڈ رہے تھے آپ ﷺ خود ہر طرح کی توہین و تحقیر کے باوجود نہایت ہمت و استقلال سے سرگرم تبلیغ تھے۔ قریش پھر ایک بار جاہ و دولت کی پیشکش لے کر آپ ﷺ کو جادۂ فرض سے منحرف کرنے کی خاطر آپ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے پھر ویسا ہی جوشِ ایمان سے پر جواب دے کر انہیں لوٹا دیا ''مجھے نہ مال و دولت کی خواہش ہے، نہ شوکت و مملکت کی ہوس۔ مجھے خدا نے بھیجا ہے تا کہ تمہیں بشارت دوں۔ میں تمہیں خدا کا

1۔ بت پرستوں کو قرآن میں تقریباً ہر جگہ مشرکین کے لقب سے پکارا گیا ہے کیونکہ وہ دوسری ہستیوں کو خدا کا شریک گردانتے تھے۔

2۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے کارناموں اور تعلیمات کا کیا اس سے بہتر کوئی خلاصہ ہو سکتا ہے؟ ابن الاثیر، ابن ہشام

کلام سناتا ہوں اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ اگر تم وہ پیغام قبول کرو جو میں لایا ہوں تو خدا تم پر اس دنیا میں بھی اور دوسری دنیا میں بھی مہربان ہوگا۔ اگر تم میری نصیحتوں کو رد کر دو تو میں صبر سے کام لوں گا اور اس کو خدا پر چھوڑ دوں گا کہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے۔" قریش نے آنحضرت ﷺ کی باتوں کو تمسخر میں اڑا دیا اور ٹیڑھے میڑھے سوالوں سے آپ ﷺ کی تعلیمات کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی[1]۔ لیکن آپ ﷺ کا سیدھا سادا اور اٹل ایمان باللہ قریش کے مادہ پرستانہ تشکک پر غالب رہا۔ انہوں نے آپ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ آپ ﷺ زمین کو پھاڑ کر چشمے اور دریا جاری کر دیں، آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُن کے اوپر گرا دیں، اپنے لیے سونے کا ایک گھر بنا کر کھڑا کر دیں یا سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائیں۔ (بنی اسرائیل ۹۰ تا ۹۳) یہ وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام والے پرانے قصے کا اعادہ تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خود ان کے پیرو تقاضا کرتے تھے کہ وہ اپنی رسالت کی سچائی ثابت کرنے کے لیے معجزے دکھائیں۔ پروفیسر مومری کا کہنا ہے: "حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے اُن کو اور اُن کے کام کو کبھی نہ سمجھا۔ وہ ان سے یہی مطالبے کرتے رہے کہ وہ آسمان سے آگ برسائیں، یہودیوں کا بادشاہ ہونے کا اعلان کریں اور اُن لوگوں کو اپنے تخت کے دائیں بائیں بٹھائیں۔ وہ اُن کے آسمانی باپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ آپ علیہ السلام سے ایسے ایسے کام کرانا اور خود ایسے کام کرنا چاہتے تھے جو اُن کے عظیم الشان منصوبے سے کوئی مطابقت نہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اخیر تک ایسا ہی سلوک کرتے رہے اور جب ان کا انجام آپہنچا تو انہیں اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے"۔

ان غیر مطمئن اور ڈھلمل یقین لوگوں کو جو خارقِ عادت کرشموں کی خواہش میں قریش سے کسی طرح کم نہ تھے اور جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قابلِ احترام ہستی کو ایک ایسی دھند میں مستور کر دیا جس کا پردہ جدید عینیت پرست عیسائیت بھی اُن کے چہرے سے نہیں ہٹا سکی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کبھی نرمی سے اور کبھی غصہ سے یہ جواب دیا کرتے تھے صرف بدکار اور شہوت پرست لوگ نشانیاں طلب کرتے ہیں، اور وہ انہیں نشانیاں دکھانے

---

[1] ابن ہشام۔ ایک عیسائی مورخ بت پرستوں کی موشگافیوں کا تذکرہ بڑا لطف لے لے کر کرتا ہے۔

سے انکار کر دیا کرتے تھے، کیونکہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں پر ایمان نہیں لائے وہ اس صورت میں بھی توبہ نہیں کریں گے کہ کوئی پیغمبر مردوں میں سے اُٹھ کر اُن کے سامنے آجائے۔[1]

رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین اس بارے میں لائقِ تحسین ہیں کہ انہوں نے کبھی اپنے آقا سے معجزوں کی فرمائش نہیں کی۔ وہ سب کے سب، عالم ہوں کہ تاجر یا سپاہی، صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی اخلاقی شہادتوں پر نظر رکھتے تھے۔ وہ اپنے تمام دنیاوی مفادات اور اپنی تمام دنیاوی اُمیدوں کو قربان کر کے، اپنے بے یار و مددگار معلّم کے گرد جمع ہو گئے اور زندگی اور موت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی شخصیت کے ساتھ ایسی وفاداری و جاں نثاری سے وابستہ رہے جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈھنے سے نہیں ملتی۔

ایک ایسے زمانہ میں جب معجزے آئے دن کے واقعات سمجھے جاتے تھے جنہیں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ بزرگ بھی ایک اشارہ سے رونما کر سکتا تھا اور جب صرف عرب ہی میں نہیں بلکہ ان ہمسایہ ممالک میں بھی جہاں تہذیب بہت زیادہ ترقی کر چکی تھی، ساری فضا مافوق العادات سے معمور تھی، عقلیت کا یہ عظیم علمبردار معجزوں کا مطالبہ کرنے والے کفار کو بلا تامل جواب دیتا ہے...... ''خدا نے مجھ کو کرشمے دکھانے کے لیے نہیں بھیجا، اُس نے مجھے تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔ قابلِ تعریف ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟...... فرشتے زمین پر آباد نہیں، ورنہ خدا کسی فرشتے کو تمہارے پاس پیغمبر بنا کر بھیجتا (بنی اسرائیل ۹۲، ۹۴، ۹۵)...... میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ خدا کے خزانے میرے قبضے میں ہیں یا مجھے غیب کا علم ہے یا میں کوئی فرشتہ ہوں''۔

''میں خود اپنی ذات کے لیے کسی نفع و ضرر کا اختیار نہیں رکھتا، مگر اسی حد تک کہ

---

[1] قدامت پرست عیسائیت کا یہ عقیدہ تھا اور اب بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے اُن کی الوہیت کی دلیل تھے۔ جدید عیسائیت معجزوں کے لیے Aberglzub کا لفظ استعمال کرتی۔ جیسا کہ Literature & Dogma کا مصنف کہتا ہے، ایک نہ ایک دن معجزوں پر یقین اُٹھ جائے گا اور دینِ عیسوی میں معجزوں کی جو روایات ہیں وہ مشرقی اور مغربی قصے کہانیوں میں شامل ہو کر رہ جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ چاہے''۔ (الاعراف ۱۸۸) ان باتوں میں نہ کوئی غیر معمولی ادّعا ہے، نہ کوئی مبالغہ آمیزی ہے، نہ اپنی سیرت یا شخصیت کو ساحرانہ کشش سے آراستہ کرنے کی کوشش ہے۔ ''میں صرف خدا کے کلام کا مبلغ اور بنی نوع انسان کو خدا کا پیغام دینے والا ہوں''۔ بار بار آپ ﷺ اسی کا اعادہ کرتے ہیں۔ اول سے آخر تک آپ ﷺ کے منہ سے کوئی ایسا کلمہ نہیں نکلتا جس کو ''اس پر محمول کیا جا سکے کہ آپ ﷺ انسانوں سے اپنی پرستش کا مطالبہ کرتے ہیں''۔ اول سے آخر تک آپ ﷺ کے کلام میں ایک غیر مبدّل متانت ہے جو زمانے اور ماحول کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور بھی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ اول سے آخر تک آپ ﷺ کا کلام اپنے خالق کے حضور میں ایک سیدھے سادے اور عمیق عجز و انکسار سے پر ہے۔ آپ ﷺ کے جذبات اپنے عروج کے لمحوں میں بھی عاجزانہ شکر گزاری کے جذبات ہیں:۔

''میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ جو چیزیں بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں، جو بادشاہ ہے، عیبوں سے پاک ہے، زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ وہی ہے جس نے عرب کے ناخواندہ لوگوں میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور اُن کو (عقائد باطلہ اور اخلاقِ ذمیمہ سے) پاک کرتا ہے، اور انہیں کتابِ الٰہی اور دانشمندی سکھاتا ہے، ورنہ اس سے پہلے یہ صریح گمراہی میں مبتلا تھے...... یہ خدا کا فضل ہے، وہ فضل جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے''۔ (الجمعہ ۱ تا ۴)

ہر قسم کی طاقتِ کرشمہ سازی سے معرا ہونے کا اعلان کر کے پیغمبر اسلام ﷺ صرف اپنی تعلیمات کو اپنی قدسی رسالت کی سچائی کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ وہ اپنی قوتِ نفوذ کا لوہا منوانے یا اپنی تنبیہات کو موثر بنانے کے لیے کبھی معجزوں کی آڑ نہیں لیتا۔ وہ ہمیشہ فطرت کے جانے پہچانے مظاہرے سے وجودِ باری تعالیٰ پر دلیل لاتا ہے[1]۔ وہ مستقلاً

---

[1] اس موضوع پر سر ولیم میور کی عبارت ذیل قابلِ غور ہے۔ ''یہ محل نظر ہے کہ آیا کہ مکہ کی بُت پرستی کسی مقابلے کے بغیر محمد ﷺ کی تعلیمات کے سامنے جنہیں آپ مدلّل شواہد سے تقویت بخشتے تھے، سپر انداز ہو جاتی'' قریش کی طرح میور بھی خرقِ عادات کی تائید کے بغیر تعلیمات محمد ﷺ کو کافی نہیں سمجھتا۔

انسان کی فطری کمزوری یا زود اعتقادی کی بجائے اس کے شعور باطنی اور اس کی عقل سے خطاب کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔ اپنے اردگرد نظر ڈالو، یہ حیرت انگیز دنیا، سورج، چاند اور ستارے، جو آسمان کے نیلے گنبد میں خاموشی اور تیزی سے اپنے مقررہ راستے پر چلے جاتے ہیں، یہ قانون اور نظام جو کائنات پر حکمران ہے، یہ بارش کے قطرے جو مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کر دیتے ہیں، یہ جہاز جو انسان کی منفعت کی چیزوں سے لدے ہوئے سمندر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جاتے ہیں، زریں پھلوں سے لدے ہوئے کھجور کے درخت...... کیا یہ چیزیں تمہارے لکڑی اور پتھر کے دیوتاؤں کی بنائی ہوئی ہیں (مبنی بر الفرقان (۴۹ تا ۵۹ اور سورۂ ق)

''نادانو' تم نشانیاں چاہتے ہو جب کہ ساری کائنات خدا کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنے جسم کی بناوٹ ہی کو دیکھو۔ کیسی حیرت انگیز طور پر پیچیدہ اور کس خوبصورتی سے ترتیب دی ہوئی ہے۔ رات اور دن کا ایک دوسرے کے بعد آنا جانا، زندگی اور موت، تمہارا سونا اور جاگنا، خدا کی فراواں نعمتوں سے متمتع ہونے کی جو خواہش تمہارے دل میں ہے، ہوائیں پانی سے لدے ہوئے بادلوں کو خدا کی رحمت کا پیش خیمہ بنا کر لاتی ہیں، گونا گونی میں ہم آہنگی اور حُسنِ ترتیب، نسلِ انسانی کی رنگا رنگی میں باہمی وابستگی، پھل پھول، چرندے پرندے خود انسان...... کیا یہ چیزیں ایک عقلِ کل کے وجود کا کافی ثبوت نہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی نگاہوں میں فطرت بجائے خود ایک الہام اور معجزہ ہے۔

ہر گیاہے کہ از زمین دوید   وَحدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ گوید

وحدانیت کا پیغمبر از بسکہ فطرت کا پیغمبر تھا۔ اس کی تعلیمات کی اخلاقی دلنشینی اور توحیدِ الٰہی کے پر ذوق وشوق دعوے کی بنیاد ایک محیط کل نظام کے عقلی وذہنی ادراک پر ہے اور ایک واحد عقل اور واحد ارادہ کے عینی شواہد پر جو کائنات کی تنظیم، ہدایت اور حکومت کا ذمہ دار ہے۔ اس کا سب سے عظیم الشان معجزہ وہ کتاب ہے جس میں اُس نے ''فطرت، ضمیر اور رسالت کے تمام انکشافات'' کو الہامی زبان میں بیان کر دیا۔'' اے منکر لوگو، کیا تم کوئی اس سے بھی بڑا معجزہ چاہتے ہو جو کہ تمہاری عامیانہ زبان میں وہ بے مثال کتاب نازل کی گئی جس کے آگے تمہاری ساری شاعری اور تمہارے سارے

معلقات بیچ ہیں، تاکہ اس کے ذریعہ ساری کائنات کو رحم و کرم کی بشارت دی جائے، اور تکبر و جبر کرنے والوں کو ڈرایا جائے۔''

لیکن قریش نے آپ ﷺ کے مواعظ و نصائح پر کان نہ دھرے۔ ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ پڑا ہوا تھا کہ وہ خدا کی نشانیوں کو اور کارخانہ قدرت میں ذات باری تعالیٰ کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان کے کان اتنے بہرے تھے کہ انہوں نے اس صاحب بصیرت کی بات نہ سنی جو انہیں نیکی کی طرف لوٹ آنے اور اپنے قدیم جرائم و مکروہات کو ترک کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ انہوں نے رسولِ خدا ﷺ کو جو جواب دیا اس سے ایسی شدید مخاصمت ٹپکتی تھی جس کی مثال صرف اس تشدد میں ملتی ہے جو عیسائیت کی تاریخ میں ایرانیوں اور فلیجیوں نے کیا۔ ان کا جواب یہ تھا: ''جان رکھ، اے محمد ﷺ! ہم تیری تبلیغ کو روکنے سے اس وقت تک باز نہ آئیں گے جب تک یا تو فنا نہ ہو جائے یا ہم فنا نہ ہو جائیں''۔

انہی دنوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی تعبیر مسلم مورخین نے ایک طریقہ سے کی ہے اور آنحضرت ﷺ کے عیسائی سوانح نگاروں نے دوسرے طریقے سے۔ ایک دن آپ ﷺ پر وحی کی حالت طاری تھی اور آپ ﷺ چند آیات تلاوت فرما رہے تھے جو اب قرآن کے ترپنویں (۵۳ ویں) سورۂ نجم کا جز ہیں۔ جب آپ ﷺ الفاظ تک پہنچے، کہ کیا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ اور وہ جو تیسری دیوی مناۃ ہے، اُن کے بارے میں بھی غور کیا ہے؟''

ایک بُت پرست نے جو اس موقع پر موجود تھا اور جسے روایات نے اب شیطانؑ میں تبدیل کر دیا ہے ان دیویوں کی مذمت کی پیش بندی کرنے کے ارادہ سے پکار کر کہا: ''یہ حسین اور سربلند دیویاں ہیں جن سے عند اللہ شفاعت کی اُمید کی جا سکتی ہے''۔ اس نے یہ کلمات ایسے طور پر کہے کہ گویا یہ وحی کا جز ہیں۔ قریش یا تو اس چالاکی کی کامیابی پر خوش ہوئے یا اُن الفاظ کو آنحضرت ﷺ کے الفاظ تصور کر کے یہ سمجھے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے بتوں کی رعایت کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً مصالحت کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ جب آنحضرت ﷺ کو حقیقت حال کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے فوراً اعلان کیا: ''وہ کچھ بھی نہیں، محض چند خالی خولی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑ لیے ہیں''۔

مسلمان مورخین اور راویانِ حدیث نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔ لیکن عیسائی سوانح

نگاروں نے اُسے ایسے طریقے سے پیش کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے آنحضرت ﷺ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کسی قسم کی مصالحت سے قریش کے ساتھ جھگڑے کو ختم کیا جائے۔ متعصب لوگ اسے لغزش اور تعصب سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن فراخ دل اور غیر متعصب مورخین کے نزدیک یہ واقعہ رسول عربی ﷺ کے جمالِ سیرت کو اور بھی تاباں بنا دیتا ہے۔ ظلم وستم روز بروز بڑھتا چلا جاتا تھا، آپ ﷺ کے متبعین کی تکالیف شدید تر ہوتی چلی جاتی تھیں اور شہر کی ساری آبادی مسلح ہو کر آپ ﷺ کے مقابلے پر تلی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ کو اپنے متبعین کی حالت زار دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا۔ کوئی مقامِ تعجب نہیں اگر اپنے متعصب دشمنوں کے حق میں تھوڑی سی رعائت کر کے کش مکش کو ختم کرنے کا خیال لمحہ بھر کے لیے آپ ﷺ کے دل میں آیا[1]۔ اس طرح آپ ﷺ نے مشرکین کے حق میں اپنی پہلی اور آخری رعایت کی۔ آپ ﷺ نے قرآن کی ایک آیت تلاوت کی جس میں آپ ﷺ نے ان تین چاند دیویوں کا تذکرہ احترام سے کیا اور اس کا اقرار کیا کہ ان سے عنداللہ شفاعت کی اُمید کی جا سکتی ہے، پس خدا کے آگے جھک جاؤ اور اس کی بندگی کرو۔ سارا مجمع اس مصالحت سے خوش ہو کر آپ ﷺ کے خدا کے حضور سجدہ میں گر گیا۔ سارے شہر نے اس دوگونہ مذہب کو قبول کر لیا۔ لیکن صحرا کا یہ رویا دیکھنے والا ایسا شخص نہ تھا کہ ایک جھوٹی بات پر توقف کرتا۔ مکے کا سارا شہر بھی اس کی نذر کر دیا جاتا تو وہ اپنے اندر کی صداقت کو جھٹلاتے رہنے پر راضی نہ ہوتا۔ اس نے میدان میں آ کر اقرار کیا کہ اس سے لغزش ہوگئی تھی: اسے شیطان نے ورغلا دیا تھا۔ اس نے کھلم کھلا اپنے الفاظ کو واپس لیا اور کہا: ”جہاں تک ان بتوں کا تعلق ہے وہ محض خالی خولی نام ہیں جنہیں انہوں نے اور ان کے آباؤ اجداد نے وضع کر لیا ہے“۔

---

[1] غرانیق کا قصہ بالکل لغو اور بیہودہ ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب سورۂ نجم کی ان آیات کی تلاوت کی ہو تو کسی شریر نے کہہ دیا ہو کہ آنحضرت ﷺ نے چند لمحوں کے لیے ہی سہی بتوں کی عظمت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور ان کی شفاعت کو پذیرائی کے لائق سمجھ لیا تھا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کا فی الواقع ایسا کرنا قطعی قرینِ عقل نہیں۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل نکات پر غور کر لینا چاہیے۔

(۱) قرآن حکیم نے منصب نبوت کے بارہ میں جن خصائص کی تشریح کی ہے۔ اُن میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ پیغمبر کبھی بھی باطل سے سمجھوتا نہیں کرتا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مغربی سوانح نگاروں نے آنحضرت ﷺ کی اس ''لغزش'' پر بڑی شماتت آمیز خوشی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن جھگڑا چکانے کا یہ حیلہ ایسا تھا کہ بہت کم لوگ اس سے کام لینے سے انکار کرتے۔ پھر آپ ﷺ کی زندگی کسی دیوتا کی زندگی نہیں بلکہ ایک انسان کی زندگی ہے، ایسے واردات و تجربات سے پورے طور پر مملو جو انسانوں کے لیے مخصوص ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اہلِ مکہ کی تالیفِ قلوب اور ان کے شدید جبر و ستم سے امان حاصل کرنے کی خاطر آپ ﷺ نے ان کی بات کی تغلیط نہ کی تو ہم اس بارے میں کیا کہیں گے کہ اس نے اس مصالحت کے ذریعے جو کچھ حاصل کیا تھا اس سے وہ مردانہ وار دست بردار ہو گیا اور اپنی غلطی کا علانیہ اقرار کر کے دوبارہ قریش کی توہین و تحقیر کا مورد بننے کے لیے سینہ سپر ہو گیا؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۱) کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ مصالحت اور تالیف قلب اپنی جگہ اچھی چیز ہے۔ مگر پیغمبر اس کے لیے اس بنیادی عقیدہ سے انحراف نہیں کر سکتا کہ جس پر اس کی دعوت کا دار و مدار ہوتا ہے۔ وہ اپنے منصب جلیل کے اعتبار سے ایک طرح سے مجبور ہے کہ توحید کے انوار کو عام کر کے رہے۔ منصب نبوت کے بارہ میں چند آیات ملاحظہ ہوں۔

غرض آپ ﷺ کو جس بات کا حکم کیا گیا ہے اس کو صاف صاف سنا دیجئے اور مشرکین کی پروانہ کیجئے۔ (الحجر ۹۴)

آپ ﷺ یہ کہہ دیجئے کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کروں، بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ پہنچا ہے۔ (یونس ۱۵)

اگر یہ پیغمبر ہمارے ذمہ جھوٹی باتیں لگا دیتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے پھر ہم ان کی رگ دل کاٹ دیتے۔ (الحاقہ ۴۶)

کیا ان شواہد کے بعد بھی ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ بتوں کی تعریف میں آنحضرت ﷺ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہوں گے؟

(۲) مصنف نے اپنی طرف سے جملہ بڑھا دیا ہے لیکن کبار محدثین مثلاً علامہ عینی، حافظ منذری بیہقی قاضی عیاض اور نووی نے اس قصہ کو باطل اور موضوع قرار دیا ہے۔ نووی کا کہنا ہے۔ لا فصیح فیہ شئی لا من جھۃ النقل ولا من جھۃ العقل۔ کہ یہ قصہ نہ تو روایت کے اعتبار سے صحیح ہے اور نہ عقل و درایت کے اعتبار سے ہی درست ہے۔

(۳) آخری اور اہم نکتہ یہ ہے کہ سورہ نجم کی جن آیات کے بعد اس جملہ کو بڑھایا گیا ہے۔ سیاق و سباق کے لحاظ سے اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ کیونکہ اگر اس قصہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مضمون و معنیٰ کا پورا کارخانہ ہی مختل ہو کر رہ جائے گا۔ یہی نہیں لات اور منات سے متعلق قرآن حکیم نے جو اعتراض کیا ہے یعنی یہ سب تو مؤنث ہیں اور کیا انصاف ہے کہ تم اپنے لیے تو بیٹے تجویز کرتے ہو اور اللہ کے لیے بیٹیاں۔

آپ ﷺ کے یہ اعلان کرتے ہی کہ لات، عزیٰ اور منات صرف نام ہی نام ہیں ظلم وستم آگے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ از سرِ نو شروع ہو گیا۔ لیکن آپ ﷺ کو تائید ایز دی کا جو یقین واثق تھا اور فرشتہ رحمت آپ ﷺ کو جو آسمانی پیغام دے رہا تھا اُن کے بل بوتے پر آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں کی مخالفت اور ایذا رسانیوں کی پروانہ کر کے اپنی تبلیغ کو جاری رکھا۔ چنانچہ ہر طرح کی مزاحمت کے باوجود آپ ﷺ کی تعلیمات آہستہ آہستہ لیکن استقلال کے ساتھ پھیلتی گئیں۔ سچائی کے جو بیج اس طرح بوئے گئے اُن کو پنپنے سے کوئی چیز روک نہ سکتی تھی۔ صحرا کے وحشی عرب اور وہ تاجر جو دور دراز شہروں سے قومی میلے میں آتے تھے وہ اس عجیب وغریب انسان کی باتیں سُنتے جسے اس کے دشمن آسیب میں مبتلا سمجھتے تھے، اس کی وہ تعلیمات سُنتے جو اُس کی رُوح کی گہرائیوں سے نکلتی تھیں، خوف و حیرت سے اُس کے وہ ملامت آمیز کلمات سُنتے جو وہ اُن کے بتوں، ان کی توہم پرستیوں، اُن کی بد افعالیوں اور اُن کے بُرے طور طریقوں کے بارے میں کہتا تھا۔ وہ یہ سب کچھ سُنتے اور اس سے غیر شعوری طور پر ایک نئی روشنی اور ایک نئی زندگی حاصل کر کے اپنے دور اُفتادہ علاقوں میں اپنے ساتھ لے جاتے۔ وہ ہجو آمیز باتیں اور گالیاں جو آنحضرت ﷺ کے دشمن آپ ﷺ کی شان میں بکتے تھے اُلٹا آپ ﷺ کے کلام کی شہرت کو دوبالا کر دیتیں۔

اس اثناء میں اہلِ مکہ بھی نچلے نہ بیٹھے رہے تھے۔ کئی مرتبہ قریش نے ابو طالب کے پاس وفد بھیجے کہ وہ اپنے بھتیجے کو اُن کے مذہب کے خلاف تبلیغ کرنے سے روک دیں۔ شروع شروع میں تو ابو طالب انہیں خلق اور نرمی سے واپس کر دیتے رہے۔ لیکن جب قریش کے الحاد و ناپاکی کے خلاف آنحضرت ﷺ کی آتش بیانیاں جاری رہیں تو انہوں نے آپ ﷺ کو کعبہ سے نکال دیا، جہاں آپ ﷺ تبلیغ کیا کرتے تھے، اور پھر اکٹھے ہو کر آپ ﷺ کے چچا کے پاس آئے اور کہا۔ ''ہم آپ کی بزرگی اور رُتبے کا لحاظ کرتے ہیں، لیکن آخر اس کی کوئی حد بھی ہے۔ آپ ﷺ کا بھتیجا ہمارے بتوں اور ہمارے آباد اجداد کے بارے میں جو گستاخانہ باتیں کہتا ہے اب وہ ہمارے دائرہ برداشت سے باہر نکل گئی ہیں۔ یا تو آپ ﷺ اُسے اس سے باز رکھیں یا خود اس کے ساتھ شامل ہو جائیں، تاکہ تلوار ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور ہم دونوں میں سے ایک گروہ ہلاک ہو جائے۔

یہ کہہ کر وہ لوگ رخصت ہو گئے۔ ابو طالب کو نہ تو اپنی قوم سے جدا ہونا گوارا تھا نہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے بھتیجے کو بت پرستوں کے حوالے کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو بلا بھیجا اور آپ ﷺ کو قریش کی باتوں سے مطلع کر کے تبلیغ ترک کر دینے کی التجا کی۔ آنحضرت ﷺ کے دل میں خیال گزرا کہ غالباً آپ ﷺ کے چچا آپ ﷺ کی حمایت سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں لیکن بیکسی کے اس لمحے میں بھی آپ ﷺ کا عزم بلند برقرار رہا۔ آپ ﷺ نے مضبوطی سے جواب دیا: ''اے میرے چچا، اگر یہ لوگ میری دائیں ہتھیلی پر سورج اور بائیں ہتھیلی پر چاند رکھ دیں اور مجھے اپنے کام سے باز آنے کو کہیں تو میں پھر بھی باز نہ آؤں گا، جب تک کہ خدا کا منشا پورا نہ ہو جائے یا میں اس کے پورا کرنے کی کوشش میں فنا نہ ہو جاؤں''۔ لیکن اپنے مشفق چچا کے ترک حمایت کے خیال سے غمزدہ ہو کر آپ ﷺ پلٹ کر جانے ہی کو تھے کہ ابو طالب نے پکار کر کہا: ''ادھر آؤ میرے بھتیجے، جو تمہارا جی چاہتا ہے کہتے چلے جاؤ، میں کبھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گا''۔ قریش نے پھر ایک مرتبہ کوشش کی کہ ابو طالب اپنے بھتیجے کو اُن کے سپرد کر دیں۔ آنحضرت ﷺ کے بدلے میں انہوں نے قبیلۂ مخزوم کا ایک شخص دینے کی پیشکش کی لیکن یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ ابو طالب نے اپنے بھتیجے کی حمایت کا جو اعلان کیا تھا اس سے قریش بہت خشمناک ہوئے اور آگے سے بھی زیادہ جبر و تشدد کی دھمکیاں دینے لگے۔ اس محترم رئیس قبیلہ نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کو، جو آنحضرت ﷺ کے قرابت دار تھے، ان کی عزت کا واسطہ دلایا اور اُن سے التجا کی کہ اپنے خاندان کے اس ممتاز فرد کو حریف قبیلوں کی نفرت اور عداوت کا ہدف بننے سے بچائیں۔ اس التجا کا سب نے احترام کیا، نہ کیا تو صرف بھینگے ابولہب نے۔

اس زمانہ میں اسلام کو ایک قوی، جری حامی ہاتھ آیا یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ جن کی مستعدی و سرگرمی عمل نے انہیں مملکتِ اسلامیہ میں آگے چل کر بڑی اہمیت بخشی انہوں نے دین محمدی ﷺ کی جو خدمات انجام دیں اُن کی بدولت اُن کا نام جریدۂ تاریخ پر ثبت ہے۔ وہ عدی بن کعب رضی اللہ عنہ کے خاندان کے ایک ممتاز فرد اور خطاب کے فرزند تھے، جو مسلمانوں کی ایذا رسانی میں پیش پیش تھے۔ قبولِ اسلام سے پہلے وہ اسلام کے شدید

مخالف اور پیغمبر اسلام ﷺ کے سخت دشمن تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا قبولِ اسلام قرآن کی ایک سورت کے معجز اثر کا نتیجہ تھا، جس کی تلاوت انہوں نے بہن کے مکان پر سُنی، جہاں وہ انتہائی غضب کے عالم میں قاتلانہ ارادے سے گئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے کانوں میں جو کلام پڑا اس سے آپ رضی اللہ عنہ اس قدر متاثر ہوئے کہ سیدھے آنحضرت ﷺ کے پاس گئے۔ اُن کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی جو وہ آنحضرت ﷺ اور اُن کے متبعین کے قتل کی خاطر گھر سے لے کر نکلے تھے۔ جو مومنین آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے آپ ﷺ کے ارشادات سن رہے تھے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس عالم میں آتے دیکھ کر ہراساں ہو گئے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ چوم لیا اور دین حق کے دائرے میں داخل کئے جانے کی درخواست کی۔ مومنین نے ان پر خدا کے فضل کا یہ نزول دیکھ کر نعرۂ تشکر بلند کیا۔ قبولِ اسلام کے بعد وہ اسلام کے لیے زبردست پشت پناہ ثابت ہوئے۔

اب مسلمانوں کو اس کی ضرورت نہ رہی کہ کونوں کھدروں میں چھپے رہیں اور درپردہ نماز ادا کریں۔ طبقہ غربا کے کثیر التعداد پیروؤں کے علاوہ اب آنحضرت ﷺ کے گرد چیدہ برگزیدہ اصحاب کی ایک جماعت بھی جمع ہوگئی تھی، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے مستعد، قابل اور صاحب عزت لوگوں پر مشتمل تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اگرچہ نوعمر تھے، لیکن تیزی سے امتیاز حاصل کر رہے تھے۔

ان اہم شخصیتوں کے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے مسلمانوں کے حوصلے بڑھے اور اب وہ کھلم کھلا نماز ادا کرنے لگے۔ قریش، جن پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے سے گویا بجلی سی گر پڑی، صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرنے لگے۔ لیکن ایک فیصلہ کُن ضرب لگانے کے موقعے کی تاک میں رہے۔

جب ان کا وفد اپنی ناکامی کی خبر لے کر حبشہ سے واپس آیا تو اُن کے غضب کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے بالآخر ہاشم اور مطلب کے خاندانوں کو ایک ضرب کاری سے مٹا دینے کی ٹھان لی۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے بعثت نبوی ﷺ کے ساتویں سال، یعنی ۶۱۶ء کے اواخر میں، بنی ہاشم اور بنی مطلب کے خلاف ایک انجمن قائم کی۔ انہوں نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جو کعبہ میں محفوظ کر دیا گیا اور جس کا مضمون یہ تھا کہ وہ

ہاشمیوں کے ساتھ رشتہ و نکاح اور لین دین نہ کریں گے۔ بنی ہاشم اور بنی مطلب، جن میں مسلمان بھی تھے اور بت پرست بھی، اس معاہدے سے خوفزدہ ہوئے اور اس اندیشے سے کہ مبادا یہ کسی مزید حملے کا پیش خیمہ ہو، انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر، جو شہر میں جا بجا بکھرے ہوئے تھے، ایک جگہ جمع ہو کر رہیں۔ چنانچہ سب شعب ابو طالب میں چلے گئے، جو مکے کے مشرقی مضافات میں ایک لمبی اور تنگ گھاٹی ہے، جسے چٹانوں اور دیواروں نے شہر سے جدا کر رکھا ہے اور جہاں سے شہر میں آمد و رفت کا ایک چھوٹے سے دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ اکیلا، ابولہب ان میں شامل نہ ہوا، بلکہ دشمنوں کے ساتھ مل گیا۔

یہ لوگ آنحضرت ﷺ کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے تین سال تک اس گھاٹی میں رہے۔ قریش نے انہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور انہیں ہر طرح کی تنگی سے دو چار ہونا پڑا تھا۔ کھانے پینے کا جو سامان وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے وہ جلد ہی ختم ہو گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ فاقہ زدہ بچوں کے رونے کی آوازیں باہر سے سنائی دینے لگیں۔ قریش میں جو لوگ نسبتاً کم متعصب تھے اگر وہ لوگ کبھی کبھی چوری چھپے اُنہیں مدد نہ پہنچا دیا کرتے تو غالباً وہ سب کے سب تباہ ہو جاتے۔ قریش کے بعض سردار اپنی ناانصافیوں پر شرمندگی محسوس کرنے لگے تھے۔ بعثتِ نبوی ﷺ کے دسویں سال میں یعنی ۶۱۹ء میں ہشام بن عمرو نے جسے ہاشمیوں سے بہت دلچسپی تھی ہاشم و مطلب کے خاندانوں اور قریش کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی۔ وہ زبیر ابن ابو اُمیہ کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گیا، چنانچہ اس کی اور دوسرے لوگوں کی تحریک پر قریش کا معاہدہ منسوخ ہو گیا اور ہاشم و مطلب کے خاندانوں کو اجازت مل گئی کہ مکے میں واپس آجائیں اور شہری حقوق سے از سر نو مستفید ہوں۔

جتنا عرصہ آنحضرت ﷺ شعب میں اپنے عزیز و اقارب سمیت پناہ گزین رہے، اسلام مکے میں کوئی ترقی نہ کر سکا۔ ان متبرک مہینوں میں جب لڑائی بھڑائی حرام سمجھی جاتی تھی، آپ ﷺ اپنی جائے پناہ سے باہر آتے اور حاجیوں کو تبلیغ کرنے کی کوشش کرتے، لیکن ابولہب آپ ﷺ کے پیچھے لگا رہتا اور آپ ﷺ کو جھوٹا اور صابی کہہ کر

آپ ﷺ کی تبلیغ میں خلل انداز ہوتا۔

اس کے بعد کا سال تاریخِ اسلام میں ''عام الحزن' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سال میں ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ نے یکے بعد دیگرے وفات پائی۔ ابو طالب کی وفات نے آپ ﷺ کو اپنی نوجوانی کے سرپرست سے محروم کر دیا جو آپ ﷺ کے اور آپ ﷺ کے دشمنوں کے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل رہا تھا۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات آپ ﷺ کے لیے شدید صدمہ تھی۔ جب ابھی آپ ﷺ پر کوئی ایمان نہ لایا تھا، اور جب آپ ﷺ کے چاروں طرف تاریکی اور نا اُمیدی تھی، ایسے آڑے وقت میں حضرت خدیجہؓ کی محبت اور ایمان و یقین نے آپ ﷺ کا ساتھ دیا تھا ''وہ ہمیشہ آپ ﷺ کے لیے اُمید و تسکین کا فرشتہ رہیں''۔ ان کی محبت و مودت کی یاد تادمِ آخر آنحضرت ﷺ کے دل میں تازہ رہی......''

☆☆☆☆☆☆☆

پہلے باب پر نوٹ

سر ولیم میور کا خیال ہے کہ موسیو کوسین دی پرسیوال نے بطحا کو کسی جگہ کا نام تصور کرنے میں غلطی کی ہے۔ ان کے خیال میں وہ سنگریزوں والی زمین ہے جس پر مسلمانوں کو اذیت دی جاتی تھی (جلد دوم صفحہ ۱۲۸) اپنے بیان اور موسیو کوسین دی پرسیوال کے بیان کی تصدیق میں میرے لیے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ بطحا کا موجود ہونا ایک ایسا امر ہے جس کے بارے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مسلم مصنفین نے اکثر بطحا کا ذکر ایک ایسے مقام کی حیثیت سے کیا ہے جو مکے کے قرب و جوار میں واقع ہے۔ مثلاً مشہور شاعر حکیم سنائی کہتا ہے:-

چو علمت ہست خدمت کن چو بے علماں کہ زشت آید
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحے

دوسرا باب

ہجرت

محمد سید الکونین و الثقلین   والفریقین من عرب و من عجم

بنی اُمیہ اور دوسرے مخالف قبائل نے کچھ تو اس وابستگی کی بنا پر جو انہیں اپنے قدیم مذہب سے تھی اور کچھ ہاشمیوں سے حسد و نفرت کی بناء پر، اسلام کو مکے میں کچل دینے کا یہ موقع غنیمت جانا۔ ابو طالب کے ذاتی رسوخ اور نیک سیرتی نے ان کے غصہ کو اب تک حد سے نہ بڑھنے دیا تھا۔ لیکن ابو طالب کے وفات پاتے ہی انہوں نے اپنا ظلم و ستم دگنی شدت سے شروع کر دیا۔

اپنے محترم سرپرست اور اپنی محبوب بیوی کی وفات سے آپ ﷺ کو جو صدمہ ہوا، اور قریش کو بُت پرستی ترک کرنے پر آمادہ کرنے سے آپ ﷺ کو جو نا اُمیدی تھی، اس کے باوجود آپ ﷺ کے دل میں اپنی تبلیغ کی صداقت کا پورا پورا یقین تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے لیے کوئی نیا میدان تلاش کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اہلِ مکہ نے تو خدا کے کلام کو رد کر دیا تھا۔ ممکن تھا کہ اہلِ طائف اس پر کان دھریں۔ اپنے وفادار خادم زید رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیے ہوئے آپ ﷺ بنی ثقیف کے یہاں پہنچے۔ آپ ﷺ نے انہیں اپنی رسالت سے مطلع کیا، ان کی برائیوں پر متنبہ کیا اور انہیں خدا کی عبادت کی طرف بلایا۔ آپ ﷺ کی تقریر سے غیظ و غضب کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ خبطی شخص کون ہے جو انہیں اُن خوبصورت دیوتاؤں کی پوجا کو ترک کرنے کی دعوت دیتا ہے جن کی پرستش وہ اتنی سُبک دلی اور اخلاقی آزادی سے کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے آپ ﷺ کو شہر سے نکال دیا۔ آوارہ

لوگوں اور غلاموں کا ایک گروہ آوازے کستا ہوا اور پتھر برساتا ہوا آپ ﷺ کے پیچھے دوڑا، یہاں تک کہ شام ہوگئی اور وہ لوگ آپ ﷺ کا پیچھا چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ زخموں سے چور، آبلہ پا اور تھکے ماندے، آپ ﷺ کھجوروں کے درختوں کے سائے تلے ٹھہر گئے اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر پکارے: ''الٰہی میں اپنی بے بسی اور تدبیر کی ناکامی اور لوگوں کے ہاتھوں اپنی توہین کا شکوہ تیرے ہی حضور کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے اور میرا بھی۔ اے پروردگار! تو مجھے چھوڑ کر کسے سونپ رہا ہے، جو مجھے اور بھی کمزور بنادیں گے؟ مجھے میرے دشمنوں کے حوالے نہ کر۔ اگر تو میری اس حالت میں بھی مجھ پر خفا نہیں تو میں مطمئن و مصئون ہوں۔ میں تیرے اس نور کی روشنی میں رہنا چاہتا ہوں جس نے ظلمات کو منور بنا رکھا ہے اور جس کے پرتو سے دنیا اور آخرت دونوں کی اصلاح حاصل ہوتی ہے۔ الٰہی! اپنے غضب کو مجھ پر نازل نہ فرما اور جس طرح تو چاہے میری مشکلات حل کردے۔ اللہ کے سوا نہ کوئی قدرت ہے، نہ کوئی طاقت۔''

آنحضرت ﷺ نہایت آرزدہ خاطر مکے واپس آئے۔ یہاں آپ ﷺ کچھ مدت تک لوگوں سے الگ تھلگ رہے۔ آپ ﷺ کبھی کبھی تبلیغ فرماتے تھے، لیکن آپ ﷺ کی کوششیں زیادہ تر ان اجنبیوں تک محدود تھیں جو حج کے موقع پر مکے اور اس کے قرب و جوار میں ہر سال جمع ہوتے تھے۔ طبری کے قول کے مطابق آپ ﷺ کو اُمید تھی کہ ان اجنبیوں میں آپ ﷺ کو کچھ ایسے لوگ مل جائیں گے جو آپ ﷺ پر ایمان لائیں گے اور پیغامِ حق لے جا کر اپنے ہم وطنوں تک پہنچائیں گے۔

ایک روز جب آپ ﷺ یوں غمزدہ لیکن پھر بھی دل میں اُمید لیے ہوئے ان نیم تاجروں اور نیم حاجیوں کو تبلیغ فرمارہے تھے تو آپ ﷺ کو یثرب کے دور دراز شہر کے چھ باشندے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے نظر آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''بیٹھ کر میری بات سنو'' اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ آپ ﷺ کے جوش و خلوص اور آپ ﷺ کے کلام کی صداقت سے متاثر ہو کر وہ لوگ ایمان لے آئے۔ (یہ ۶۲۰ء کا واقعہ ہے) چنانچہ اپنے وطن واپس جا کر ان لوگوں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ یہ خبر پھیلا دی کہ عربوں میں ایک پیغمبر پیدا ہوا ہے جو لوگوں کو خدا کی طرف بلائے گا اور اُن کے صدیوں پرانے

جھگڑوں کا خاتمہ کردے گا۔

دوسرے سال یہ یثربی اپنے ساتھ اپنے چھ ہم شہریوں کو لے کر آئے جو شہر کے دو سب سے بڑے قبیلوں کے نمائندے تھے۔

جس مقام پر پہلے چھ یثربی ایمان لائے تھے وہیں ان نوواردوں نے اسلام قبول کیا۔ اس پہاڑی کے نام پر جہاں یہ واقعہ ہوا اسے بیعتِ عقبۂ اولیٰ کہتے ہیں[۱] ان لوگوں نے مندرجہ ذیل اقرار کیے: ''ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ ہم چوری نہ کریں گے، زنا کاری نہ کریں گے، ہم اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے، باہم بہتان طرازی سے اپنا دامن بچائیں گے، ہم ہر امر معروف میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کریں گے اور شادی وغم میں ان کے وفادار رہیں گے''۔

بیعت کے بعد جب یہ لوگ اپنے وطن واپس گئے تو اپنے ساتھ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو لے گئے تا کہ وہ انہیں ارکانِ دین کی تعلیم دیں۔ چنانچہ اس طرح اسلام یثرب کے باشندوں میں بڑی تیزی سے پھیل گیا۔

پہلی اور دوسری بیعت کا درمیانی وقفہ رسالت محمدی ﷺ کا نازک ترین دور ہونے کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ﷺ کا کامل توکل علی اللہ اور آپ ﷺ کا علوِ ہمت جس طرح اس دور میں نمایاں ہوا، اس طرح اور کسی دور میں نہ ہوا۔ آپ ﷺ اپنی قوم کو بت پرستی کی لعنت میں بری طرح مبتلا دیکھ کر رنجیدہ خاطر ہوتے۔ لیکن آپ ﷺ کے غم کو یہ امید تسکین دیتی کہ انجام کار حق باطل پر غالب آئے گا۔ ممکن ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی اس وقت تک وفا نہ کرے، لیکن باطل کا حق کے سامنے کافور ہو جانا اسی طرح یقینی ہے جس طرح تاریکی کا سورج کی کرنوں کے سامنے غائب ہو جانا۔ اس دور کے بارے میں میور کی زبان سے غیر شعوری طور پر ذیل کے کلماتِ تحسین بے اختیار نکل گئے ہیں۔

''محمد ﷺ اس طرح اپنی قوم کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے، فتح کی اُمید میں انتظار کرتے ہوئے، بظاہر بے یار و مددگار، اپنے حامیوں کی چھوٹی سی جماعت کے ساتھ گویا شیر کے

---

[۱] تاریخ اسلام میں اس بیعت کو بیعت النسا بھی کہا گیا ہے تاکہ اسے عقبہ کی دوسری بیعت سے ممتاز کیا جا سکے جس میں یثرب کے مندوبین نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو دشمنوں کے حملوں اور توہین آمیز حرکتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جنگ بھی کریں گے۔

منہ میں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس قادر مطلق پر بھروسہ کئے ہوئے جس کا پیغمبر وہ اپنے آپ ﷺ کو سمجھتے تھے اور اس بھروسے کی بدولت ثابت قدم اور مضبوط ...... یہ انسانی عظمت کا ایک ایسا نظارہ ہے جس کی مثال صحائفِ مقدسہ میں صرف پیغمبر اسرائیل پیش کرتا ہے۔ جب وہ اپنے آقا سے شکوہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں، صرف میں، تن تنہا رہ گیا ہوں۔

بیتابانہ انتظار کا یہ زمانہ اس رویائے معراج کی بدولت بھی قابلِ تذکرہ ہے جس نے شاعروں اور راویانِ حدیث کی تخیلی فطانت کے لیے زریں خوابوں کی اقلیمیں مہیا کر دیں۔ ان لوگوں نے قرآن کے ان سادہ الفاظ پر خوبصورت اور شاندار قصوں کے حاشیے چڑھا دیئے ہیں: "پاک ہے وہ جو ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا' جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ حقیقت میں وہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے[1]۔ (بنی اسرائیل۔۱) قرآن مزید کہتا ہے: "یاد کر: ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ تمہارے رب نے انسانوں کو گھیرے میں لے رکھا ہے، اور ہم نے تمہیں جو کچھ دکھایا وہ آزمائش تھا"۔ (بنی اسرائیل۔۶۰) راویوں نے اس واقعہ کو جو خوبصورت لباس پہنایا ہے اس کے باوجود "یہ ایک عظیم الشان رویا ہے، جو پرشوکت تمثالیں اور عمیق معنی لیے ہوئے ہے[2]"

۱۔ معراج کی نسبت جس چیز پر کہ مسلمانوں کو ایمان لانا فرض ہے وہ اس قدر ہے کہ پیغمبر خدا نے اپنا مکہ سے بیت المقدس پہنچنا ایک خواب میں دیکھا اور اسی خواب میں انہوں نے درحقیقت اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں مشاہدہ کیں۔" (سرسید احمد خاں۔ آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کے متعلق بارہ تحقیقی اور تنقیدی مقالات۔ مقالہ یازدہم)۔ میور لکھتا ہے: "اولین روایات ایک واقعی جسمانی سفر کی طرف نہیں بلکہ محض ایک رویا کی طرف اشارہ کرتی ہیں"۔ ابن ہشام نے جو ابتدائی روایات پیش کی ہیں وہ اسی نظریہ کی تائید کرتی ہیں۔ میرے خیال میں منصفانہ طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ عیسائی، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ زندہ ہو جانے اور ایلیاہ نبی کے جسمانی طور پر آسمان کا سفر کرنے پر اعتقاد کرتے ہیں، ان مسلمانوں کو جو حضرت محمد ﷺ کے جسمانی معراج پر ایمان رکھتے ہیں اپنے سے کم عقلیت پسند کیوں سمجھتے ہیں۔

۲۔ مصنف نے مسئلہ معراج میں عقلیت پسندانہ انداز تعبیر اختیار کیا ہے۔ جمہور اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ سیر اور اسراء کا یہ منہاج جسمانی تھا۔ ہمارے نزدیک اس بحث میں سارا الجھاؤ اس چیز سے پیدا ہوا ہے کہ یار لوگوں نے مدرسیت کے تتبع میں انسان کو جسم و روح کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

آئندہ سال (۶۲۲ء میں) وہ یثربی جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا پچھتر (۷۵) کی تعداد میں اپنے بت پرست بھائی بندوں کو ساتھ لیے ہوئے مکے میں آئے تاکہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے شہر میں آنے کی دعوت دیں۔ لیکن بت پرستوں کو اپنے ساتھیوں کا علم نہ تھا۔

رات کی خاموشی میں[1]، جب تمام مخالف عناصر سوئے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اسلام کے یہ پہلے علمبردار اسی پہاڑی کے دامن میں جمع ہوئے جہاں بیعتِ اولیٰ لی گئی تھی۔ آنحضرت ﷺ اپنے چچا عباس کی معیت میں آئے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ابھی اسلام قبول نہ کیا تھا، لیکن اس کی ترقی میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ آپ نے مذاکرات کا افتتاح کیا اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱) دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حالانکہ انسان محض ایک "انا" ہے جس میں جسم و روح کی دونوں سطحیں برابر شامل ہیں۔ اس کے ظہور کی ایک خارجی سطح جسم کہلاتی ہے اور داخلی سطح روح..... انسان بہرحال ایک ہے اور اس کے کسی بھی فعل کو محض جسمانی یا روحانی قرار نہیں دے سکتے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو مسئلہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ معراج کے معنی یہ ہوں گے کہ حضور ﷺ کی "انا" کو جس میں جسم بھی داخل ہے اللہ تعالیٰ نے سیر و اسراء کے ذریعہ اُن تمام بہرہ مندیوں سے نوازا کہ جن کا تعلق اسرار دین اور رموز کائنات کے عجیب و غریب انکشافات سے تھا۔ یہی وجہ ہے، قرآن حکیم نے واشگاف الفاظ میں اسراء کو اپنے "عبد" کی طرف منسوب ٹھہرایا ہے امام بخاری نے بھی صحیح بخاری میں صلوٰۃ، حج، انبیاء، توحید، مناقب اور ادب و تفسیر کے متعدد ابواب میں جو الفاظ ذکر کئے ہیں وہ اس انداز کے ہیں۔ عرج بالنبی، عرج بی، یا حیث عرج بہ۔ ترمذی اور مسند امام احمد بن حنبل میں بھی واقعہ معراج کے لیے اسی طرح کا پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ معراج کا تعلق ایک بلندتر "انا" سے ہے، گرامی قدر ذات اور شخصیت سے ہے۔ صرف روح اور اس کے کوائف سے نہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں قرآن نے اس کو ایسا رویا قرار دیا ہے کہ جس نے لوگوں کو کفر و ایمان کی آزمائش میں ڈال دیا۔ ظاہر ہے، کہ رویا کے معنی محض خواب ہی کے ہوتے تو اس میں انکار ہی کیا تھا اور اس کے ادراک کے لیے صرف حضرت صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے ظرف عالی کو یہ توفیق کیوں نصیب ہوتی کہ وہ اس کو بلا تامل مان لیں۔ مزید برآں واقعہ معراج کے بعد اختلاف کا جو طوفان اٹھا، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تاریخ کا غیر معمولی واقعہ تھا۔ محض خواب نہ تھا۔

[1] رسومات حج ادا کرنے کے بعد تین دن کی جو مدت تشریق ہوتی ہے، اس کے پہلے اور دوسرے دن کی درمیانی رات۔

یثربیوں کو ان خطرات سے واضح طور پر آگاہ کیا جن میں وہ اپنے آپ کو اسلام قبول کر کے اور معلمِ اسلام کو اپنے شہر میں آنے کی دعوت دے کر ڈال رہے تھے۔ ان لوگوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ انہوں نے ان خطرات کی پوری آگاہی کے ساتھ اسلام اختیار کیا تھا اور کہا "یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ اپنے اور اپنے خدا کے لیے ہم سے جو عہد لینا چاہیں لے لیں"۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے معمول کے مطابق چند آیاتِ قرآنی کی تلاوت سے آغازِ کلام کیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے خدا کی عبادت کی دعوت دی اور اسلام کی برکات تفصیلاً بیان کیں۔ یثربیوں نے اپنے عہد کو دہرایا، کہ وہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے، اسلام کے احکام کو بجالائیں گے، ہر امرِ معروف میں آنحضرت ﷺ کی ہدایات پر عمل کریں گے اور آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے متعلقین کی حفاظت اسی طرح کریں گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی کرتے ہیں۔

پھر انہوں نے دریافت کیا "اگر ہم راہ حق میں جانیں دے دیں تو ہمیں کیا صلہ ملے گا؟" جواب ملا "عقبیٰ کی راحت"۔ انہوں نے مزید پوچھا "ایسا تو نہ ہوگا کہ آپ ﷺ کامیابی اور خوشحالی کے وقت میں ہمارا ساتھ چھوڑ کر اپنی قوم کے پاس واپس چلے جائیں گے؟" پیغمبر خدا ﷺ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "نہیں، ہرگز نہیں، تمہارا خون میرا خون ہے۔ میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو۔" وہ بولے "تو اپنا ہاتھ بڑھائیے۔" آنحضرت ﷺ نے دستِ مبارک بڑھایا اور ہر ایک نے اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کا حلف اُٹھایا۔ معاہدہ ابھی مکمل ہوا ہی تھا کہ ایک مکی کی آواز آئی جو دور بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس آواز نے، جو رات کی فضا میں لہراتی ہوئی آئی، ان جاں نثاروں کے دل ہلا دیئے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے تقویت بخش الفاظ نے اُن کی ڈھارس بندھائی۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے اُن لوگوں سے رائے لے کر ان میں سے بارہ افراد انتخاب کیے جو صاحبِ مرتبہ افراد تھے اور انہیں اپنا نقیب مقرر کیا[۱]۔ اس طرح دوسری بیعتِ عقبہ انجام پذیر ہوئی۔

---

[۱] ابن ہشام۔ اس معاہدے میں ۷۳ افراد (مرد و عورتیں) شریک تھے۔ یہ معاہدہ ماہِ ذی الحج میں ہوا اور آنحضرت ﷺ نے اس مہینے کے باقی دن اور محرم و صفر کے مہینے مکے میں گزارے۔ ربیع الاول میں آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے۔

کی مخبر نے اس معاہدے کی خبر سارے شہر میں پھیلا دی تھی۔ قریش آنحضرت ﷺ کی جرات پر متعجب ہوئے اور اکٹھے ہو کر یثربی کارواں میں پہنچے تا کہ آنحضرت ﷺ سے معاہدہ کرنے والوں کی حوالگی کا مطالبہ کریں۔ لیکن ان لوگوں کا سراغ نہ مل سکا' اس لیے انہوں نے کارواں کی بلامزاحمت واپس چلے جانے کی جازت دے دی۔ لیکن قریش کی یہ ظاہری بردباری آنحضرت ﷺ اور ان کے متبعین پر ظلم وتشدد کی تمہید تھی۔ دینِ حق کے علم برداروں کی حالت روز بروز زیادہ خطرناک ہوتی چلی گئی۔ آنحضرت ﷺ کے دل میں قتلِ عام کا اندیشہ پیدا ہوا۔ اس لیے آپ ﷺ نے اپنے پیروؤں کو یثرب میں پناہ لینے کی ہدایت کی۔ چنانچہ تقریباً ایک سو خاندان دو دو تین تین کی ٹولیوں میں چپ چاپ مکے سے یثرب چلے گئے، جہاں ان کا خیر مقدم بڑے تپاک سے کیا گیا۔ اس طرح شہر کے بہت سے محلے خالی ہو گئے۔ عتبہ بن ربیعہ نے ان خالی مکانوں کو دیکھ کر جن میں کبھی چہل پہل تھی، ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور ایک پرانا شعر پڑھا کہ "ہر مکان، چاہے اس میں کتنی ہی مدت تک برکت وخوشحالی رہی ہو، ایک نہ ایک دن رنج وغم اور خستہ حالی کا موجب بنتا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے بھتیجے کا کیا دھرا ہے، جس نے ہماری انجمنوں کو منتشر کر دیا ہے، ہمارے معاملات کو خراب کر دیا ہے اور ہم میں پھوٹ ڈال دی ہے۔"

جو معاملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیش آیا تھا وہی رسولِ اکرم ﷺ کو پیش آیا۔ فرق اتنا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود فرمایا: "یہ خیال نہ کرو کہ میں دنیا میں امن پھیلانے آیا ہوں۔ میں امن لے کر نہیں آیا بلکہ تلوار لے کر آیا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ بیٹے کو باپ سے، بیٹی کو ماں سے بہو کو ساس سے جدا کروں۔" (انجیل متی۔ ۱۰: ۳۴۔۳۵) لیکن آنحضرت ﷺ کو اُن کے ایک بدترین دشمن نے خاندانوں میں تفرقہ ڈالنے کا الزام دیا۔

اس تمام مدت میں جبکہ طوفان اپنے عروج پر تھا اور ممکن تھا کہ کسی وقت ٹوٹ پڑے، آنحضرت ﷺ نے ہمت نہ ہاری۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا آپ ﷺ کے تمام صحابی یثرب جا چکے تھے۔ ان دو رفیقوں کی معیت میں آپ ﷺ نہایت بہادری سے اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔

دریں اثناء بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے بچ کر نکل جانے کے

خوف سے قریش نے بعجلت تمام دار الندوہ میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں دوسرے قبائل کے چند افراد بھی مدعو کیے گئے۔ معاملہ اب زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ جلسے میں بڑا گرما گرم مباحثہ ہوا۔ کیونکہ قریش کے دلوں میں خوف گھر کر چکا تھا۔ عمر قید اور شہر بدر کرنے کی سزاؤں پر باری باری سے بحث کی گئی۔ اس کے بعد قتل کی تجویز کی گئی۔ لیکن قتل اگر ایک آدمی کے ہاتھ سے ہوتا تو اسے اور اس کے خاندان کو خون بہا کا خطرہ لاحق ہو جاتا۔ بالآخر ابو جہل[1] نے یہ تجویز پیش کر کے یہ مسئلہ حل کر دیا کہ مختلف خاندان کے چند چیدہ منچلے مل کر آنحضرت ﷺ پر حملہ کریں اور بیک وقت اپنی تلواریں آپ ﷺ کے سینے میں پیوست کر دیں تاکہ سب مجموعی طور پر اس عمل کے ذمہ دار ٹھہرائے جائیں اور آنحضرت ﷺ کا خاندان اس طرح انتقام لینے سے معذور رہ جائے۔ یہ تجویز منظور کر لی گئی اور چند نوجوان امیر زادے اس کام کے لیے منتخب کیے گئے۔ کچھ رات گذرے قاتلوں نے آنحضرت ﷺ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ یہ لوگ ساری رات تاک میں بیٹھے رہے تاکہ جب آنحضرت ﷺ صبح سویرے گھر سے نکلیں تو آپ ﷺ کو قتل کر دیں۔ وقتاً فوقتاً وہ کواڑوں کی درزوں میں سے جھانک کر اطمینان کر لیتے تھے کہ آپ ﷺ ابھی بستر پر آرام فرما رہے ہیں۔ لیکن حفظِ ذات کی اس جبلی حس نے جس نے بسا اوقات نبیٔ ناصری کو اپنے دشمنوں سے بچ کر نکل جانے میں مدد دی تھی آنحضرت ﷺ کو بھی خطرے سے آگاہ کر دیا۔ قاتلوں کی توجہ کو بستر پر مرکوز رکھنے کی خاطر آپ ﷺ نے اپنی سبز چادر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اوڑھا دی اور انہیں اپنے بستر پر لٹا دیا۔ اور خود ''حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح کھڑکی میں

---

[1] ابن ہشام۔ ابن الاثیر۔ القرآن سورۂ انفال۔ ۳۰۔ ابن ہشام لکھتا ہے کہ ابو جہل کی اس تجویز کی تائید ایک اجنبی نے کی جو نجد کے ایک معزز شیخ کے بھیس میں آیا تھا اور جسے روایت خود شیطان کہتی ہے۔ ابو جہل آنحضرت ﷺ کے بدترین دشمنوں میں تھا۔ اس کا نام عمرو تھا اور چالاکی و ہوشیاری کی بنا پر اس کا لقب ابو الحکم تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے تعصب اور ہٹ کی بنا پر جس کی وجہ سے اُسے اسلام میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی، اسے ابو جہل کا لقب دیا۔ جہالت نے ہر زمانے میں اپنے آپ کو راسخ العقیدگی کے سرپرست کے لباس میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ اس طرح ابو جہل کا نام ایک ضرب المثل بن گیا ہے۔ مشہور صوفی شاعر حکیم سنائی نے ذیل کے شعر میں ابو جہل کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

احمد مرسل نشستہ کی روا داد خود　　　دل اسیر سیرت بوجہل کافر داشتن

سے باہر نکل گئے''۔ گھر سے نکل کر آپ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے۔ وہاں سے دونوں چپ چاپ مکے سے روانہ ہو گئے۔ کئی دنوں تک وہ کوہ ثور کے ایک غار میں چھپے رہے جو مکے کے جنوب میں واقع ہے۔

قریش کے غضب کی اب کوئی حد نہ رہی۔ اس خبر نے کہ قاتل ناکام واپس آ گئے تھے اور آنحضرت ﷺ بچ کر نکل گئے تھے ان کے تمام جذبات دشمنی کو بیدار کر دیا۔ آس پاس کے سارے علاقے میں سوار دوڑائے گئے اور آپ ﷺ کے قتل کے لیے انعام کا اعلان کیا گیا۔ ایک دو مرتبہ تو خطرہ اس قدر قریب آ پہنچا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دل خوف سے لرز گیا۔ انہوں نے کہا، ''ہم صرف دو ہیں۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا، ''نہیں ہم تین ہیں، خدا بھی ہمارے ساتھ ہے۔'' اور خدا فی الواقع ان کے ساتھ تھا۔ تین دنوں کے بعد قریش کی تگ و دو سست پڑ گئی۔ اس تمام عرصے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک بیٹی آپ دونوں کو رات کے وقت کھانا لا کر دیتی رہیں۔ تیسرے دن شام کے وقت آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار سے نکلے اور بڑی مشکل سے دو اونٹوں کا انتظام کر کے غیر آباد راستوں سے یثرب کی طرف روانہ ہوئے لیکن یہ راستے بھی خطروں سے خالی نہ تھے۔ آپ ﷺ کے قتل کے لیے جو بھاری انعام مقرر کیا گیا تھا اس کے لالچ میں کئی سوار مکے سے نکل پڑے تھے اور ابھی تک ان بے یار و مددگار مسافروں کی تلاش میں تندہی سے مصروف تھے۔ ان میں سے ایک نے، جو ایک وحشی اور تند خو سپاہی تھا، آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھ لیا اور ان کا تعاقب کیا۔ پھر ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دل ڈوب گیا اور وہ بولے، ''اب ہم نہیں بچ سکتے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ڈرو نہیں، خدا ہماری حفاظت کرے گا۔'' جب سوار آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچا تو اس کا گھوڑا چراغ پا ہو گیا اور وہ اس کی پیٹھ پر سے گر پڑا۔ سوار پر ایسا خوف طاری ہوا کہ جس شخص کا وہ تعاقب کر رہا تھا اسی سے اس نے گڑگڑا کر معافی کی التجا کی اور معافی کی نشانی مانگی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک ہڈی پر معافی نامہ لکھ کر اسے دے دیا۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کوئی خطرہ پیش نہ آیا اور دونوں تین دن کے سفر کے بعد یثرب کے علاقے میں پہنچ گئے۔ جون ۶۲۲ء کا ایک گرم دن تھا

جب آنحضرت ﷺ نے اپنی اونٹنی سے اُتر کر اس سرزمین پر قدم رکھا جو آئندہ آپ ﷺ کا مسکن و مامن بننے والی تھی۔ سب سے پہلے ایک یہودی نے، جو ایک مینار پر تاک لگائے کھڑا تھا، آپ ﷺ کو دیکھ کر پہچانا۔ چنانچہ یوں قرآن کے یہ الفاظ پورے ہوئے: 'جن لوگوں پر کتابیں اُتری ہیں وہ اسے اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں۔'' (الانعام۔۲۰) آپ ﷺ نے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چند روز تک قبا نام کے ایک گاؤں میں قیام کیا، جو یثرب سے دو میل جانب جنوب واقع ہے اور اپنی خوبصورتی و زرخیزی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے آملے۔ کفار کو آنحضرت ﷺ کے قتل میں جو ناکامی ہوئی تھی اس کا بدلہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سخت اذیتیں پہنچا کر لیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ قریش کے خوف سے دن کو چھپتے ہوئے اور رات کو سفر کرتے ہوئے مکے سے پیادہ پا آئے تھے۔

عمرو بن عوف نے، جو اس گاؤں کے مالک تھے، آنحضرت ﷺ کو کچھ اور عرصہ قیام کرنے کی دعوت دی۔ لیکن آپ ﷺ کا فرض آپ ﷺ کو آگے بلا رہا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ اپنے متبعین کی ایک جماعت کو ساتھ لیے ہوئے یثرب کو روانہ ہو گئے۔ آپ ﷺ جمعہ ۱۶ ربیع الاول مطابق ۲/ جولائی ۶۲۲ء کی صبح کو شہر میں داخل ہوئے۔

اس طرح آپ ﷺ کی ہجرت واقع ہوئی، جسے یورپی تواریخ میں ''محمد ﷺ کے فرار'' کا نام دیا گیا ہے اور جس سے سنینِ اسلام کی ابتدا ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆☆

دوسرے باب پر نوٹ نمبر ا

سن ہجری کا اجرا ہجرت کے سترہ سال بعد خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ کے حکم سے ہوا۔ لیکن اس کی ابتدا آنحضرت ﷺ کے مکے سے رخصت ہونے کے وقت سے نہیں ہوئی، جو ۴/ ربیع الاول کو واقع ہوئی، بلکہ سالِ قمری کے پہلے مہینے یعنی محرم کے پہلے دن سے جس سال سے سن ہجری جاری ہوا اس سال میں یکم محرم کو ۱۵/ جولائی تھی۔

اگر چہ حضرت عمرؓ نے سن ہجری کا اجرا کیا تاہم واقعات کے متعلق یہ کہنے کا قاعدہ کہ وہ ہجرت سے قبل یا بعد ہوئے تھے چند روایتوں کے مطابق خود آنحضرتؐ کا ایجاد کردہ ہے ...... یہ ایک قدرتی امر تھا، کیونکہ رسالت محمدیؐ کی تاریخ میں ہجرت کا واقعہ سب سے بڑا بحران تھا...... مقابلہ کے لیے دیکھئے الحلبی 'انسان العیون'۔

دوسرے باب پر نوٹ نمبر ۲

بارہ اسلامی مہینے حسب ذیل ہیں:۔ محرم (متبرک مہینہ)؛ صفر (سفر کا مہینہ) ربیع الاول، (موسم بہار کا پہلا مہینہ) ربیع الثانی (موسم بہار کا دوسرا مہینہ) جمادی الاول (پہلا خشک مہینہ) جمادی الثانی (دوسرا خشک مہینہ) رَجب (یعنی جس کی تعظیم کی جاتی ہو اسے رجب الرجب بھی کہتے ہیں) شعبان (کونپلیں پھوٹنے کا مہینہ) رمضان (گرمی کا مہینہ) شوال (اتصال کا مہینہ) ذوالقعد (صلح، امن اور آرام کا مہینہ) ذوالحج (حج کا مہینہ) قدیم عرب قمری سال پر کار بند تھے، جس میں ۳۵۴ دن، آٹھ گھنٹے اور ۴۸ ثانیے اور جو باری باری سے انتیس اور تیس دنوں کے بارہ مہینوں پر تقسیم کیا جاتا تھا۔ اپنے قمری سالوں اور یونانیوں اور رومیوں کے شمسی سالوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی خاطر اور اس غرض سے بھی کہ ہر مہینہ صحیح موسم میں آئے، عرب لوگ ہر تیسرے سال میں ایک مہینے کا اضافہ کر دیا کرتے تھے۔ لوند کا یہ مہینہ بڑھانے کا عمل نسئ کہلاتا تھا۔ اس سے حساب بالکل ٹھیک تو نہ بیٹھتا تھا، لیکن پھر بھی اتنا فائدہ ہوتا تھا کہ مہینوں کے ناموں اور موسموں میں قدرے مطابقت قائم رہتی تھی۔ چونکہ لوند کے سال (سالِ کبیسہ) میں عرب لوگ رسومات قبیحہ مناتے تھے، اس لیے یہ قائدہ ترک کر دیا گیا۔ اس وقت سے مہینوں کے ناموں اور موسموں میں کوئی مطابقت باقی نہیں رہی۔

تیسرا باب

رسول اللہ ﷺ مدینہ میں

پیش از ہمہ شاہانِ غیور آمدہ ای | ہر چند کہ آخر بہ ظہور آمدہ ای
اے ختمِ رُسل قربِ تو معلوم شد | دیر آمدہ ای ز راہِ دور آمدہ ای

جو متصوفانہ اشعار اس باب کا زیبِ عنوان میں، موجودہ زمانہ کے بہت کم مسلمان ان کے پورے معانی کو سمجھ سکتے ہیں، لیکن اس عظیم صاحب بصیرت سے جو گہری عقیدت ان میں مضمر ہے اسے سب مسلمان پوری طرح محسوس کرتے ہیں۔ یہ عقیدت ایسی عقیدت نہیں جو قصے کہانیوں کے کسی فرضی کردار سے وابستہ یا محض امتدادِ زمانہ کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ جس دن آپ ﷺ نے یثرب میں ورود کیا اُسی دن سے آپ ﷺ کی زندگی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ تاریخ کی روشنی جن عظیم الشان ہستیوں پر پڑی ہے آپ ﷺ ان میں سب سے عظیم الشان ہیں۔ آپ ﷺ کی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بھی نہایت احتیاط سے قلم بند ہو کر نسلاً بعد نسل ہم تک پہنچی ہیں۔ لیکن ''ان کی ظاہری صورت ایسی سختی سے متعین ہو گئی ہے جو آپ ﷺ کی حقیقی تعلیمات کی روح کے منافی ہے[1]'' کیونکہ ان

---

[1] احادیث کے بارہ میں مصنف کی رائے میں کھلا ہوا تضاد پایا جاتا ہے، ایک طرف تو ان کا کہنا ہے کہ ''آپ ﷺ کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی نہایت احتیاط سے قلم بند ہو کر نسلاً بعد نسل ہم تک پہنچی ہیں۔'' دوسری طرف یہ شکایت ہے کہ جو جزئیات نہایت احتیاط کے ساتھ قلم بند ہوئی ہیں ان کی ظاہری صورت اسی سختی سے متعین ہو گئی ہے جو آپ ﷺ کی حقیقی تعلیمات کی روح کے منافی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب زندگی کی جزئیات مرتب ہوں گے تو اس سے ایک متعین نقشہ ضرور بنے گا۔ غالباً مصنف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ احادیث نے زندگی کے جن تعینات کی نشاندہی کی ہے۔ اُن سے اسلام کی آفاقی و عالمگیر روح مجروح ہوئی ہے لیکن اس کا تعلق تو نقطۂ نگاہ اور تعبیر سے ہے۔ احادیث کی روایت و تحریر سے نہیں۔

تعلیمات کا منشا نوعِ انسانی کی دائمی نشو ونما تھا۔ ہم نے اس حیرت انگیز انسان کو ایک یتیم بچے کی صورت میں دیکھا ہے جسے کبھی شفقتِ پدری نصیب نہ ہوئی، جو شیر خواری کے زمانے ہی میں اُلفتِ مادری سے بھی محروم ہو گیا اور جس کی ابتدائی زندگی مصائب سے پر تھی۔ وہ ایک پر فکر بچپن سے گزر کر ایک اس سے بھی زیادہ پر فکر جوانی میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی جوانی اس کے بچپن جیسی پاکیزہ اور معصوم ہے۔ وہ بڑا ہو کر بھی اتنا ہی متقی و پرہیز گار رہتا ہے جتنا نوجوانی میں تھا۔ اس کے کان کمزوروں اور غریبوں کے رنج و مصیبت کی کہانی سننے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس کا دل ہمیشہ خدا کی تمام مخلوق کے لیے ہمدردی و صلہ رحمی سے لبریز رہتا ہے۔ وہ اس فروتنی اور پاکیزگی سے چلتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو اشاروں سے بتاتے ہیں۔ ''دیکھو وہ الامین جا رہا ہے، جو راست باز، نیکو کار اور دیانت دار ہے۔'' وہ ایک مخلص دوست ہے، ایک وفا شعار اور فرض شناس خاوند ہے، وہ ایک مفکر ہے جو حیات و موت کے اسرار پر، انسانی اعمال کی ذمہ داریوں پر اور انسانی زندگی کے مقصد و مدعا پر غور کرتا ہے۔ وہ ایک قوم ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی اصلاح کا کام ایسے وقت میں سنبھالتا ہے جب اس کو تسلی دینے والا اور اس کی ہمت بندھانے والا ساری دنیا میں صرف ایک محبت کرنے والا دل ہے۔ اُسے ناکامیاں ہوتی ہیں، لیکن اس کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی۔ اُسے شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، لیکن وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اُسے جو کام تفویض کیا گیا ہے اُس کی انجام دہی کے لیے وہ ایک غیر متزلزل ہمت کے ساتھ جدوجہد کیے جاتا ہے۔ اس کی سیرت کی پاکیزگی اور شرافت، خدا کے رحم وکرم پر اس کا واثق اور اٹل ایمان آخر کار جاں نثاروں کی ایک روز افزوں تعداد اس کے گرد جمع کر دیتا ہے۔ جب اس کے امتحان کا سخت ترین لمحہ آتا ہے تو ایک فرض شناس ناخدا کی طرح وہ ثابت قدمی سے اپنے منصبی مقام پر کھڑا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے تمام مسافر خطرے سے محفوظ ہو جاتے ہیں، اور اس وقت وہ خود ساحلِ عافیت پر قدم رکھتا ہے۔ یہ ہے اس کا وہ نقشہ جو ہم نے اب تک دیکھا ہے۔ اب ہم اسے ایک بادشاہ، انسانی دلوں کے حکمران، سردار، قانون دان اور منصفِ اعلیٰ کے لباس میں دیکھیں گے، لیکن ان حیثیتوں میں بھی اُسے تکبر سے پاک اور تواضع و انکسار کا مجسمہ پائیں گے۔ اب اس کی

داستانِ حیات اس دولتِ عامہ کی تاریخ میں مدغم ہو جاتی ہے جس کا وہ مرکز تھا۔ اب وہی معلم جو اپنے ہاتھوں سے اپنے کپڑوں کو پیوند لگایا کرتا تھا اور اکثر فاقے ہی سے بسر کرتا تھا دنیا کے قوی ترین فرمانرواؤں سے بھی قوی تر ہو جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے اپنا لوہا منوالیا تھا۔ اس کی سیرت کی شرافت' اس کی دوست نوازی، اس کا استقلال، اس کی جرأت اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر اس کی اولوالعزمی اور اشاعتِ حق میں اس کا جوش و خروش، ان سب باتوں نے ایک ہیرو کا نقشہ لوگوں کی نظروں کے سامنے بے نقاب کیا تھا، یعنی ایک ایسے آقا کا نقشہ جس کی نافرمانی بھی ناممکن تھی اور جس سے محبت نہ کرنا بھی ناممکن تھا۔ مزید کام کے لیے صرف وقت درکار تھا جب مدینے کے لوگ اس سے واقف ہو جائیں گے تو وہ بھی دل و جان سے اس کے والہ وشیدا ہو جائیں گے اور اس کا جوشِ ایمان ملتہب ہو کر قبیلوں میں پھیل جائے گا، یہاں تک کہ سارا عرب خدائے واحد کے رسول ﷺ کے قدموں پر جھک جائے گا۔ جس محبت و عقیدت سے لوگ اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی کملی اوڑھنے والے انسان کو دیکھتے تھے اس محبت و عقیدت سے کبھی کوئی تاج پوش شہنشاہ بھی نہیں دیکھا گیا۔ اس میں انسانوں کو متاثر کرنے کا ملکہ تھا اور اس میں اتنی شرافت تھی کہ اس نے ہمیشہ لوگوں کو نیکی کی طرف راغب کرنے کی خاطر متاثر کیا۔"

مدینہ منورہ جس کے کئی نام ہیں، مکہ کے شمال میں اور وہاں سے گیارہ دن کی مسافت پر واقع ہے۔ آج کل اس شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل ہے۔ لیکن اُن دنوں یہ بیرونی حملوں سے بالکل محفوظ نہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اُسے قریش کے حملوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر اس کے گرد ایک خندق کھدوائی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر ایک عمالقی سردار نے آباد کیا تھا اور آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے قبل اُسی کے نام سے موسوم تھا۔ پرانے زمانے میں یثرب اور اس کے قرب و جوار میں عمالقہ ہی آباد تھے۔ ان لوگوں کو یہودی نو آبادکاروں نے تباہ کر دیا جو یکے بعد دیگرے بابلی، یونانی اور رومی ظلم و ستم یا انتقام سے پناہ لینے کی خاطر عرب میں داخل ہوئے اور حجاز کے شمالی حصے میں آباد ہو گئے۔ ان میں

اہم ترین نو آبادیاں تین تھیں۔ خیبر میں بنی نضیر، فدک میں بنی قریظہ اور مدینہ کے قریب بنی قینقاع۔ یہ لوگ آطام یعنی قلعہ بندیوں میں رہتے تھے اور جب تک دو قحطانی قبائل یعنی اوس اور خزرج یثرب میں آباد نہ ہوئے اس وقت تک ہمسایہ عربی قبائل پر غالب تھے۔ اوس و خزرج نے شروع شروع میں تو یہودیوں کی محکومی قبول کر لی، لیکن بعد میں یہودیوں کو اپنا باجگزار اور موالی بنا لیا۔ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ان کے آپس میں جھگڑے شروع ہو گئے اور جس زمانے میں آنحضرت ﷺ نے مکے میں اپنی بعثت کا اعلان کیا، اسی زمانہ کے قریب طول طویل اور تباہ کن لڑائیوں کے بعد ان کی باہمی صلح ہوئی۔

یہ تھی یثرب کی سیاسی حالت جب رسول اللہ ﷺ نے وہاں ورود فرمایا۔

آپ ﷺ کے ورود سے شہر میں ایک نیا دور طلوع ہوا۔

اوس خزرج کے پرانے اور تباہ کن جھگڑے اخوتِ اسلامی نے بھلا دیئے اور وہ اسلام کے علم کے گرد جمع ہو کر اسلامی دولتِ عامہ کا قلب بن گئے۔ پرانے امتیازات مٹ گئے اور انصار کا معزز لقب ان سب لوگوں کا مشترک لقب بن گیا جنہوں نے اسلام کے نازک وقت میں اس کی مدد کی تھی۔ جاں نثاروں کا وہ گروہ جس نے اپنے محبوب وطن کو چھوڑا اور سارے رشتے منقطع کر دیئے مہاجرین کے لقب سے سرفراز ہوا۔

انصار اور مہاجرین کے تعلقات کو زیادہ استوار بنانے کی غرض سے آنحضرت ﷺ نے انہیں ایک ایسے رشتہ اخوت میں مربوط کر دیا جس نے انہیں شادی و غم میں ایک دوسرے کا رفیق بنا دیا۔

یثرب کا قدیم نام بدل گیا اور اب وہ مدینۃ النبی یا مختصراً مدینہ کہلانے لگا۔

جلد ہی ایک مسجد بنائی گئی، جس کی تعمیر میں آنحضرت ﷺ خود شریک ہوئے اور اپنے ہاتھوں سے کام کیا۔ مہاجرین کے لیے بھی مکانات بن گئے۔ جس قطعۂ زمین پر مسجد بنائی گئی اس کے مالک دو بھائی تھے۔ انہوں نے زمین کو بلا معاوضہ نذر کرنا چاہا لیکن چونکہ وہ یتیم تھے اس لیے آنحضرت ﷺ نے انہیں اس کی قیمت ادا کر دی۔ مسجد کی وضع قطع اور بناوٹ ہر قسم کے تکلفات سے بری اور مذہب اسلام کی سادگی کی تصویر تھی۔ دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں، اور ان پر برگ خرما کا چھپر تھا۔ مسجد کا ایک حصہ ان لوگوں کے رہنے

رہنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا جن کا اپنا کوئی گھر بار نہ تھا۔

اس غریبانہ عبادت گاہ میں ہر کام نہایت سادگی سے کیا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ زمین پر کوئی فرش بچھائے بغیر نماز ادا کرتے اور کھجور کے ایک ستون کے سہارے کھڑے ہو کر وعظ فرماتے اور جو جاں نثار آپ ﷺ کے اردگرد جمع تھے اُن کے دل آپ ﷺ کے روح کی گہرائیوں میں تلاطم پیدا کر دینے والے الفاظ کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر دھڑکنے لگتے۔

آپ ﷺ فرماتے ''جو شخص خدا کی مخلوق اور اپنی اولاد پر شفقت نہیں کرتا خدا اس پر شفقت نہیں کرتا۔ جو مسلمان ننگوں کو کپڑے پہنائے گا اُسے خدا جنت میں سبز خلعت بخشے گا۔''

ایک وعظ میں آپ ﷺ نے مسئلہ خیرات پر ذیل کے الفاظ ارشاد فرمائے:

''جب اللہ تعالیٰ نے زمین بنائی تو وہ لرزتی اور کانپتی تھی۔ اسے پختہ کرنے کے لیے خدا نے پہاڑ بنا کر اس پر کھڑے کیے۔ فرشتوں نے پوچھا ''یا اللہ تیری مخلوقات میں کیا پہاڑوں سے زبردست کوئی چیز ہے۔؟'' خدا نے جواب دیا ''لوہا پہاڑوں سے بھی زبردست ہے، کیونکہ وہ انہیں توڑ دیتا ہے۔''

''کیا تیری مخلوق میں لوہے سے بڑھ کر کوئی زبردست چیز ہے؟''

''ہاں! آگ لوہے سے زیادہ زبردست ہے۔ کیونکہ وہ اسے پگھلا دیتی ہے۔''

''کیا تیری مخلوقات میں کوئی چیز آگ سے بھی زبردست ہے؟''

''ہاں! پانی، کیونکہ وہ آگ کو بجھا دیتا ہے''۔

''یا مولا! کیا تیری مخلوقات میں کوئی ایسی چیز ہے جو پانی سے بھی زبردست ہے؟''

''ہاں! ہوا، کیونکہ وہ پانی پر غالب آتی اور اسے حرکت میں لاتی ہے۔''

''اے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں ہوا سے بھی۔ بڑھ کر کوئی چیز زبردست ہے؟''

''ہاں، ایک خیرات دینے والا نیک آدمی۔ اگر وہ دائیں ہاتھ سے خیرات دے اور بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو تو وہ ہر چیز پر غالب آسکتا ہے۔''

آپ ﷺ نے خیرات کی جو تعریف کی وہ ہر قسم کے احسان اور لطف و کرم پر حاوی ہے۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے۔ ''ہر نیک کام خیرات ہے، تمہارا اپنے بھائی کے

ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا خیرات ہے۔ اگر تم اپنے ہم جنسوں کو نیک کاموں کی تلقین کرو تو وہ بھی خیرات ہے۔ مسافروں کو راستہ دکھانا بھی خیرات ہے۔ اندھوں کی دستگیری کرنا، راستے پر سے کنکر، پتھر اور کانٹے ہٹانا بھی خیرات ہے۔ پیاسوں کو پانی پلانا بھی خیرات ہے۔"

"آخرت میں انسان کی حقیقی دولت وہ نیکیاں ہیں جو وہ اس دنیا میں اپنے ہم جنسوں سے کرتا ہے۔ جب کوئی مرتا ہے تو لوگ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا جائیداد چھوڑ گیا ہے؟ لیکن وہ فرشتے جو اس سے قبر میں حساب لیں گے اس سے پوچھیں گے کہ "تم نے کون سے نیک اعمال اپنے آگے بھیجے ہیں؟"

ایک صحابی نے پوچھا "یا نبی' میری ماں اُمِ سعد فوت ہو گئی ہے۔ وہ بہترین خیرات کونسی ہے جو میں اس کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے دے سکتا ہوں؟" آپ ﷺ نے صحرا کی تپش کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دیا: "پانی۔ اس کی روح کے ثواب کی خاطر ایک کنواں کھدواؤ اور پیاسوں کو پانی پلاؤ۔" صحابی نے اپنی ماں کے نام پر کنوآں کھدوایا اور کہا "میں نے یہ اپنی ماں کے لیے کھدوایا ہے تا کہ اس کا ثواب اس کی روح کو پہنچے۔"

ارونگ لکھتا ہے: "زبان کی خیرات جو اہم ترین خیرات ہے، لیکن جس کی مشق سب سے کم کی جاتی ہے، اس کی تلقین بھی رسولِ اکرم ﷺ نے بڑی تاکید سے کی۔ ابو جاریہ رضی اللہ عنہ جو بصرہ کے باشندے تھے، مدینہ میں آئے تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، "کبھی کسی کی برائی نہ کرو۔" ابو جاریہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں "اس وقت سے میں نے کبھی کسی شخص کی، چاہے اور آزاد ہو یا غلام، بدگوئی نہیں کی۔"

اسلام کی تعلیمات زندگی کی عام تواضعات کو محیط ہیں۔ "کسی گھر میں داخل ہوتے وقت اور اس سے رخصت ہوتے وقت گھر والوں کو سلام کرو۔" دوستوں، آشناؤں اور راہگیروں کے سلام کا جواب دو۔ سوار، پیادہ یا چلنے والے کو، چلنے والا بیٹھے ہوئے کو، چھوٹا گروہ بڑے گروہ کو اور چھوٹا بزرگ کو سلام کرنے میں سبقت کرے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چوتھا باب

قریش اور یہود کی دشمنی

(یکم سن ہجری مطابق ۱۰/ اپریل ۶۲۲ء سے لے کر ۷/ مئی ۶۲۳ء تک)

بلغ اللہ صلاتی و سلامی ابدا	لنبی عربی مدنی حرمی
شمس فضل وضیاً وّ سناء اسنیٰ	نور بدرو بھاء و سماء الکریم
اکرم الخلق و جودا وجودا وجودا	احسن الناس سخاء العطاء النعم

اس وقت مدینے میں تین جدا جدا گروہ تھے۔ مہاجرین اور انصار اسلام کا قلب تھے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ سے بے پایاں محبت وعقیدت تھی۔ مہاجرین نے نہ صرف اپنے وطن کو چھوڑا تھا، بلکہ تمام عربی روایات کے خلاف اسلام کی خاطر آل اولاد و عزیز و اقارب سے تمام رشتے منقطع کر دیئے تھے۔ انہوں نے راہِ حق میں ہر طرح کی تکالیف کو برداشت کیا تھا اور ہر قسم کی تحریصات کو ٹھکرا دیا تھا۔ ان میں بہت سے دارالامانِ مدینہ میں بالکل تہی دست آئے تھے۔ مدینہ کے مسلمانوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور ان میں جو زیادہ غریب تھے انہیں اپنے مال و دولت میں برابر کا شریک کر لیا تھا۔ رسولِ خدا ﷺ کے تدبر نے جو دینی مواخاۃ قائم کی تھی اس نے ایک طرف تو رقابتوں کے پیدا ہونے کو روکا اور دوسری طرف خدا اور رسول ﷺ کی خاطر جان و مال کی قربانی دینے کے معاملے میں انصار و مہاجرین کے درمیان ایک عالی ظرفانہ مسابقت کی بنا ڈالی۔ وہ ذوق وشوق اور جوش وخروش جس سے ان لوگوں نے اسلام کی خاطر اپنے آپ کو وقف کر دیا، یہاں تک کہ اپنی جانیں

قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کیا، اس کی مثال ظہور عیسائیت کے زمانے کے بعد دیکھنے میں آئی۔ دوسرا گروہ، جو کچھ کم اہم نہ تھا، ایسے لوگوں پر مشتمل تھا جنھوں نے بظاہر اسلام قبول کرلیا تھا، لیکن پورا پورا ایمان نہ رکھتے تھے بلکہ ابھی تک بت پرستی کی طرف مائل تھے۔ اس گروہ کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی تھا جو شہر کے صاحب حیثیت لوگوں میں تھا اور مدینہ کی بادشاہت کا آرزومند تھا۔ اس آرزو کی تکمیل کی خاطر اس نے اپنے طرفداروں کی ایک زبردست جماعت اپنے گرد جمع کر رکھی تھی، جیسا کہ ابوسفیان نے مکہ میں کیا تھا۔ وہ عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے ہی والا تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے ورود نے اس کے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ اسلام کے بارے میں جو عام جوش پھیلا ہوا تھا اس نے عبداللہ ابن ابی اور اس کے پیروؤں کو مجبور کیا کہ وہ دکھاوے کی خاطر اسلام قبول کرلیں، لیکن چونکہ یہ لوگ اسلام کی مخالفت کے لیے ہر وقت موقعے کی تلاش میں رہتے تھے اس لیے وہ اس نئی دولتِ عامہ کے لیے سخت خطرے کا سرچشمہ تھے اور آنحضرت ﷺ کو ہر وقت ان پر نگاہ رکھنی پڑتی تھی۔ آپ ﷺ ان لوگوں کے ساتھ انتہائی صبر و تحمل کا سلوک کرتے، کیونکہ آپ ﷺ کے دل میں اُمید تھی کہ بالآخر آپ ﷺ انہیں سچے دل سے مسلمان بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ نتائج نے ثابت کر دیا کہ آپ ﷺ کی اُمید بے بنیاد نہ تھی۔ عبداللہ ابن ابی کی وفات پر اس کی جماعت، جسے منافقین کا نام دیا گیا ہے، کچھ مدت کے لیے نظروں سے غائب ہوگئی۔[1]

تیسرا گروہ یہودیوں کا تھا، جو سب سے خطرناک عنصر تھا۔ قریش سے یہودیوں کے بہت قریبی کاروباری تعلقات تھے اور ان کی شاخیں بہت سے ایسے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھیں جو ابھی اسلام کے مخالف تھے۔ ابتداء انہوں نے آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کو قدرے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ انہوں نے آپ ﷺ کو اپنا مسیح موعود تو قبول نہ کیا، لیکن ان کے دل میں توقع تھی کہ دور دراز کے خواب دیکھنے والا مبلغ، جو ان کے سابق دشمنوں اور اس وقت کے مربیوں یعنی اوس و خزرج کی مہماں نوازی پر منحصر تھا، شاید ان کا انتقام

---

[1] قرآن سورہ الشوریٰ۔ ابن ہشام۔ منافقین جسدِ سیاست اسلامیہ سے کبھی پوری طرح غائب نہیں ہوئے۔ وقتاً فوقتاً انہوں نے ملتِ اسلامیہ پر بہت مضر اثرات ڈالے ہیں۔ قرونِ اُخریٰ میں انہوں نے راسخ العقیدگی کے حامیوں کا بھیس بدلا۔ مثال کے طور پر افریقہ کے خارجی فرقے کو لیجئے۔

لے اور انہیں عربوں پر غلبہ پاکر یہوداہ کی ایک نئی سلطنت قائم کرنے میں مدد دے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر وہ رسول اللہ ﷺ کے استقبال میں اوپرے دل سے اہل مدینہ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ کچھ مدت تک ان کا رویہ صلح پسندانہ رہا۔ لیکن بمشکل ایک مہینہ گزرا تھا کہ ان کی پرانی روح بغاوت، جس نے ان کے ہاتھوں ان کے نبیوں کو مصلوب کرایا تھا، اپنے آپ کو اعلانیہ سرکشیوں اور خفیہ سازشوں میں ظاہر کرنے لگی۔ ورود مدینہ کے بعد آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلے جو کام کیے تھے اُن میں ایک یہ تھا کہ آپ ﷺ نے مدینہ اور اس کے مضافات کی آبادی کے مختلف النوع اور باہم برسرِ پیکار عناصر کو باہمی عہد و پیمان کے ذریعے ایک منظم جماعت کی صورت میں متحد کر دیا تھا۔ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے ایک معاہدہ مرتب فرمایا تھا جس میں مسلمانوں کے باہمی حقوق و فرائض اور مسلمانوں اور یہودیوں کے باہمی حقوق و فرائض واضح طور پر مقرر کر دیئے گئے۔ صلح و آشتی کی اس زبردست تحریک سے مغلوب ہو کر یہودیوں نے معاہدے کو بخوشی منظور کر لیا تھا۔ یہ دستاویز، جو ابن ہشام کے اوراق میں پوری طرح محفوظ ہے، اس انسان کی حقیقی عظمت کو ظاہر کرتی ہے جو نہ صرف اپنے زمانہ کا جیسا کہ میور کہتا ہے، بلکہ سارے زمانوں کا حکیم یگانہ تھا۔ وہ کوئی پریشان خواب دیکھنے والا نہ تھا جو معاشرہ کا موجودہ شیرازہ بکھیرنے پر تلا ہوا تھا، بلکہ ایک عدیم المثال مدبر تھا جس نے ایک مکمل اور یاس انگیز تشتت کے زمانے میں اس ساز و سامان اور اس سیاسی تدبر سے جو خدا نے اسے عطا کیا تھا ایک سلطنت، ایک دولتِ عامہ، ایک معاشرے کی از سرِ نو تعمیر کا کام سنبھالا۔ آزادی ضمیر کا یہ پہلا منشور یوں شروع ہوتا ہے: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' یہ معاہدہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زیرِ نگرانی مومنوں، خواہ وہ قریش ہوں خواہ اہل یثرب، اور تمام ان غیر مسلم اشخاص کے درمیان ہوا جو' چاہے وہ کسی قوم یا قبیلے سے ہوں جو، مسلمانوں کے مقاصد سے متفق ہیں۔ یہ سب مل کر ایک قوم شمار ہوں گے'' اس کے بعد مختلف قبیلوں کے دیت ادا کرنے کے قاعدے اور مسلمانوں کے باہمی انفرادی فرائض سے متعلق چند دانشمندانہ اصول مقرر کیے گئے ہیں۔ ''صلح اور جنگ دونوں حالتوں میں تمام مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوں گے۔ ان میں سے کسی کو یہ حق نہ ہوگا کہ اپنے ہم مذہبوں

کے خلاف صلح یا جنگ کرے۔ جن یہودیوں نے ہماری دولتِ عامہ کے ساتھ الحاق کیا ہے انہیں ہر طرح کی توہین و تعرض سے محفوظ رکھا جائے گا۔ انہیں مسلمانوں کے برابر ہماری نصرت و امداد کا حق ہوگا۔ مختلف قبائل کے ساتھ مل کر ایک متحد قوم شمار ہوں گے۔ انہیں اپنے مذہب کے احکام کی بجا آوری میں اتنی ہی آزادی ہوگی جتنی مسلمانوں کو۔ یہودیوں کے موالی اور حلیفوں کو انہی کے برابر حفاظت اور آزادی حاصل ہوگی۔ مجرموں سے مواخذہ کیا جائے گا اور انہیں سزا دی جائے گی۔ یہودی یثرب (مدینہ) کو دشمنوں سے بچانے میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ جو لوگ اس عہد نامے کو قبول کریں گے ان سب کے لیے اندرون یثرب حرم یعنی دارالامان ہوگا۔ مسلمانوں اور یہودیوں کے متعلقین اور حلیفوں کا اتنا ہی احترام کیا جائے گا جتنا ان کے مربیوں کا۔ تمام سچے مسلمان ہر ایسے شخص سے جو کسی جرم، ناانصافی یا بدامنی کا مرتکب ہوگا نفرت کریں گے۔ کوئی شخص کسی مجرم کی مدد نہیں کرے گا، چاہے وہ اس کا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔'' پھر امورِ مملکت کے اندرونی انتظامات کے بارے میں چند شرائط بیان کر کے یہ حیرت انگیز دستاویز یوں ختم ہوتی ہے۔ ''جن لوگوں نے یہ معاہدہ قبول کیا ہے ان لوگوں میں آئندہ کوئی جھگڑے ہوں گے تو وہ اللہ کے نام پر رسول ﷺ کے سامنے پیش ہوں گے۔''

اس طرح عربوں کے اس نراجی دستور کو ایک جان لیوا ضرب لگی جس کے تحت اب تک مظلوموں کو انتقام یا انصاف کی خاطر اپنے رشتہ داروں کے زورِ بازو پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ اس دستاویز کی رو سے آنحضرت ﷺ، نہ صرف اپنے منصب رسالت کی بدولت بلکہ لوگوں کے ساتھ ایک معاہدہ کی بنا پر، قوم کے حاکمِ اعلیٰ مقرر ہوگئے۔

ابتداءً مدینے کے قرب و جوار کے تین یہودی خاندان، بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع، اس معاہدہ میں شریک نہ تھے، لیکن یہ تینوں خاندان بھی تھوڑے عرصے کے بعد بخوشی شامل ہوگئے۔

۲ھ ۷/مئی ۶۲۳ء تا ۲۶/اپریل ۶۲۴ء

لیکن آنحضرت ﷺ چاہے یہودیوں پر کتنی ہی مہربانیاں اور فیاضیاں کرتے انہیں راضی نہ ہونا تھا اور نہ ہوئے۔ ان کے دل میں عداوت کے جو جذبات بھرے ہوئے

تھے ان کی تسکین کسی طرح ممکن نہ تھی۔ انہیں بالخصوص غصہ اس بات پر تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو تمام عرب کو یہودی بنانے میں آلۂ کار کے طور پر استعمال نہ کر سکے۔ وہ اس پر بھی جھنجھلائے کہ اسلام کے عقائد ان کے تلمودی قصوں کے مقابلے میں بالکل سادہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں سے روابط ترک کر دیئے اور دشمنانِ اسلام کی صفوں میں جا ملے۔ جب ان سے یہ پوچھا جاتا کہ وہ بت پرستی یا اسلام کو ترجیح دیتے ہیں تو اکثر عیسائی مناظرین کی طرح یہی جواب دیتے کہ وہ بت پرستی کو اس کی تمام برائیوں کے باوجود دینِ محمدی ﷺ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ آنحضرت ﷺ کی شان میں نامناسب کلمات استعمال کرتے اور قرآن کے الفاظ، نماز کے کلمات اور مسلمانوں کے عام راہ رسم کے الفاظ کا تلفظ جان بوجھ کر کچھ ایسی طرح بگاڑ دیتے کہ وہ مہمل اور مضحکہ خیز یا کلماتِ کفر بن جاتے۔ یہودی شعرا اور شاعرات جن کی اس وقت بھرمار تھی۔ تہذیب و شائستگی اور عربوں کے مسلمہ ضابطہ شرافت و قوت کو بالائے طاق رکھ کر مسلمان عورتوں کی ہجو میں فحش اشعار لکھتیں۔ لیکن یہ سب تو ان کے لیے خفیف سی بدتمیزیاں تھیں، مسلمان عورتوں کی توہین اور آنحضرت ﷺ کی شان میں بدگوئیوں سے ان کی تسلی نہ ہوئی۔ چنانچہ جس ریاست کی حفاظت میں رہنا انہوں نے باقاعدہ طور پر قبول کیا تھا اس کے دشمنوں کے پاس انہوں نے اپنے ایلچی بھیجے۔ قریش، جو آنحضرت ﷺ کے قتل پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، عبداللہ ابن ابی اور غدار اسرائیلیوں کی مخبری کی بدولت مسلمانوں کی کمزور حالت سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہودیوں نے محض وقتی مصلحت کی بناء پر آنحضرت ﷺ سے اتحاد کیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے قرب و جوارِ مدینہ میں منہ دکھاتے ہی یہواہ کے پرستار آنحضرت ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر بت پرستوں سے جا ملیں گے۔

اب مسلمانوں کی سخت ترین آزمائش کا وقت آن پہنچا۔ آنحضرت ﷺ شہر کے تحفظ کے بندوبست اور مسلمانوں کی تنظیم سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ کفار کی یورشیں شروع ہو گئیں۔ خود مدینہ کے اندر بغاوت اور غداری کی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کا یہ فرض ہو گیا کہ مسلمانوں کو اس آفت سے بچانے کے لیے جو کسی اندرونی بغاوت یا بیرونی حملے کی صورت میں ان پر آتی مناسب تدابیر کریں۔ آپ ﷺ

صرف اسلام کے مبلغ ہی نہ تھے بلکہ اپنی اُمت کے جان و مال اور آزادی کے محافظ بھی تھے۔ ایک پیغمبر کی حیثیت سے آپ ﷺ دشمنوں کے طعنوں اور بدزبانیوں کو برداشت کر سکتے تھے، لیکن رئیس مملکت کی حیثیت سے اور تقریباً "مسلسل جنگ کے زمانہ میں ایک جرنیل" کی حیثیت سے، جب کہ مدینہ عسکری مدافعت کی حالت میں اور ایک قسم کے فوجی نظم و نسق کے تحت تھا، آپ ﷺ کے لیے غداری سے چشم پوشی کرنا ناممکن تھا۔ رعایا کی طرف سے آپ ﷺ پر جو فرضِ منصبی عائد ہوتا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ آپ ﷺ ایک ایسے گروہ کو دبا دیں جو حملہ آور فوجوں کے ہاتھوں شہر کو تاخت و تاراج کرا سکتا تھا اور کرانے کی کوشش سے بھی نہ چوکا۔ مملکت کے تحفظ کے لیے ضروری تھا کہ ایسے غداروں کا قلع قمع کر دیا جائے جو یا تو مدینہ کے اندر بغاوت کا بیج بو رہے تھے یا مشترک دشمن کو خبریں دے رہے تھے۔ چنانچہ تقریباً چھ آدمی غداری کے مجرم قرار دے کر قتل کر دیئے گئے۔ لیکن ہم اس واقعے کا تذکرہ قبل از وقت کر رہے ہیں۔

اس سے بیشتر کہ آنحضرت ﷺ کو دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم ملتا قریش کی فوجیں میدانِ جنگ میں آ پہنچیں۔

وہ جس نے ساری عمر کوئی ہتھیار استعمال نہ کیا تھا، جس کا دل انسانی تکالیف کو دیکھ کر انتہائی درد و رحم سے بھر آتا تھا، جو عربوں کے آئینِ مردانگی کے خلاف اپنے بچوں اور پیروؤں کی موت پر بے اختیار رو دیا کرتا تھا اور جس کی طبیعت ہمیشہ اتنی رقیق اور رحیم رہی کہ اس کے دشمنوں کو اسے نسائیت کا طعنہ دینے کا موقع ملا۔ وہ شخص اب حالات کے تقاضوں سے اس پر مجبور ہو گیا کہ اپنے میلانِ طبع کے خلاف اپنے دشمنوں کے حملوں کو بزورِ شمشیر روکے، اپنے متبعین کو اپنی حفاظت کے لیے منظم کرے اور اکثر غدارانہ اور ناگہانی حملوں کی پیش بندی کے لیے فوج بھیجے۔ اب تک عربوں کا طریقِ جنگ یہ رہا تھا کہ یا تو اکثر رات کے وقت یا صبح کے دھندلکے میں دشمن پر ناگہانی اور خوں ریز چھاپے مارے جاتے تھے، یا اگر دشمن کو حملہ آوروں کے ارادے کی خبر ہو جاتی تو ایک ایک، دو دو آدمی آپس میں مقابلہ کرتے یا ایک عام حملہ کر دیا جاتا۔ آنحضرت ﷺ چونکہ اپنی قوم کی عادات سے بخوبی واقف تھے، اس لیے آپ ﷺ کو اکثر ناگہانی حملوں کی پیش بندی کے

لیے طلیعہ بھیجنا پڑتا تھا۔

اہل مکہ اور ان کے ساتھیوں نے مدینے کے مضافات میں حملے شروع کر دیئے۔ وہ ان کے پھلدار درخت تباہ کر دیتے اور ان کے گلے ہانک کر لے جاتے۔ ہر طرح کے ساز و سامان سے لیس ایک ہزار آدمیوں کی فوج مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے اور قریش کے کاروان کی حفاظت کے لیے ابو جہل کی سرکردگی میں مکے کی طرف روانہ ہوئی۔ مسلمانوں کو ان کی نقل و حرکت کی بابت خبر مل گئی اور وہ کفار کو وادی بدر میں آنے سے روکنے کے لیے، جس پر ابو جہل کا لشکر چڑھائی کر رہا تھا، تین سو (۳۰۰) کی تعداد میں نکل کھڑے ہوئے۔ جب آنحضرت ﷺ نے لشکرِ کفار کو متکبرانہ انداز میں وادی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر مومنین کے چھوٹے سے گروہ کے بچاؤ کی دعا مانگی: ”یا مولا! اپنے امداد کے وعدے کو نہ بھولیو۔ یا مولا! اگر یہ چھوٹا سا گروہ فنا ہو گیا تو تیری سچی عبادت کرنے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔“

قریش کے تین آدمی اس کھلی جگہ میں آئے جو مسلمانوں اور کفار کے درمیان تھی اور عربوں کے دستور کے مطابق مسلمانوں سے مبارز طلب ہوئے۔ حمزہ رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ اور عبیدہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر مقابلہ کیا اور فتحیاب ہوئے۔ اس کے بعد دونوں لشکر گتھم گتھا ہو گئے۔ ابتدا میں کبھی مسلمانوں کا پلہ بھاری ہو جاتا تھا اور کبھی کفار کا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے پر جوش الفاظ نے لڑائی کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں کر دیا۔ ”یہ موسمِ سرما کا ایک طوفانی دن تھا اور ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ وادی میں چل رہے تھے۔“ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمانی فرشتے مسلمانوں کی طرف سے جنگ کر رہے ہیں۔ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے متبعین کے لبریز عقیدت دلوں کو، جنہیں فطرت کے تمام عطیوں میں، زندگی کے تمام تعلقات میں اور اپنے انفرادی اجتماعی حالات کے ہر موڑ پر خدا کا دستِ قدرت کارفرما دکھائی دیتا تھا، اس نازک لمحہ میں ہوا اور ریت کے یہ جھکڑ، دشمنانِ خدا سے جنگ کرتے ہوئے فطرت کے یہ عناصر تائید آسمانی کے ثبوت معلوم ہوئے، گویا فرشتے ہوا کے پروں پر سوار کافروں کو تتر بتر کر رہے ہیں۔ اہل مکہ شدید نقصان کے ساتھ پسپا ہوئے، ان کے بہت سے سردار کام آئے، اور ابو جہل نے اپنے غرور و تکبر کی سزا پائی۔

بہت سے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے، لیکن ان میں سے صرف دو قتل کیے گئے۔ یہ دینِ اسلام کے شدید دشمن تھے۔ اس لیے عربوں کے قانونِ جنگ کے مطابق انہیں کیفرِ کردار کو پہنچا دیا گیا۔

باقی قیدیوں کے ساتھ عربوں کے تمام قواعد و روایات کے خلاف، انتہائی انسانیت کا سلوک کیا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے تاکیدی احکام صادر کیے کہ ان لوگوں کو ذلیل نہ کیا جائے، بلکہ ان کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا جائے۔ جن مسلمانوں کے سپرد یہ قیدی کیے گئے انہوں نے ان ہدایات کی پوری پوری بجا آوری کی۔ ان لوگوں نے قیدیوں کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا، یہاں تک کہ روٹی، جو عربوں کی غذا کا بہترین حصہ سمجھی جاتی تھی، انہوں نے قیدیوں کو دی اور خود کھجوروں پر گزارا کیا[1]

مالِ غنیمت کی تقسیم نے مسلمان سپاہیوں میں شدید جھگڑے پیدا کر دیئے۔ آنحضرت ﷺ نے سب کو مساوی حصہ دے کر مستقل طور پر جھگڑے کا فیصلہ کیا[2]۔ چونکہ عربوں جیسے شورش پسند لوگوں میں اس قسم کے جھگڑوں سے فتنے برپا ہونے کا امکان تھا، آنحضرت ﷺ نے مالِ غنیمت کے معاملے میں آئندہ تنازعوں کی پیش بندی کرنے کی غرض سے ایک حکم خاص جاری کیا۔ جو سورۂ انفال میں شامل ہے۔ اس حکم کے تحت مالِ غنیمت کی تقسیم کا قطعی اختیار رئیسِ مملکت کو دیا گیا۔ غریبوں اور محتاجوں کی امداد کی خاطر

---

1. ابن ہشام، کوسین دی پرسیوال۔ میور یوں رقمطراز ہے، "حضرت محمد ﷺ کی ہدایات کے مطابق اہلِ مدینہ نے اور ان مہاجرین نے جن کے پاس خود رہنے کو مکان تھے، قیدیوں کو اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کے ساتھ بڑی مدارات سے پیش آئے۔ بعد میں ان میں سے ایک قیدی نے کہا "خدا کی رحمت ہو مدینہ کے لوگوں پر، وہ ہمیں سواری دیتے تھے اور خود پیدل چلتے تھے۔ ان کے ہاں گندم کی روٹی کی کمی تھی۔ پھر بھی انہوں نے ہمیں وہ کھانے کو دی اور خود کھجوروں پر بسر کی۔"

2. Sale کہتا ہے "یہ قابلِ ملاحظہ امر ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے پیروؤں میں بدر کے مالِ غنیمت کی تقسیم پر جو جھگڑا ہوا وہ ایک ایسے ہی موقعے پر ہوا، جیسا عمالقہ کے مالِ غنیمت کے بارے میں حضرت داؤد کے سپاہیوں میں ہوا تھا۔ جو لوگ جنگ میں شریک ہوئے تھے ان کا اصرار تھا کہ جن لوگوں نے محض مالِ غنیمت کی پاسبانی کی ہے انہیں کوئی حصہ نہ دیا جائے۔ دونوں موقعوں پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں قسم کے لوگوں کو برابر کا حصہ دیا جائے اور یہ آئندہ کے لیے قانون بن گیا۔"

پانچواں حصہ بیت المال کے لیے وقف کر دیا گیا۔[1]

جو عجیب و غریب حالات فتحِ بدر کا باعث بنے اور اس فتح سے جو نتائج حاصل ہوئے انہوں نے مسلمانوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر کیا۔ مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ خدا کے فرشتوں نے ان کی طرف لشکرِ کفار سے جنگ کی تھی۔

فرشتوں کے خدا کی طرف سے جنگ کرنے کے تصور میں جو شاعرانہ عنصر ہے اس کے نقش و نگار کو قرآن میں موقلم کی جن چند سادہ جنبشوں سے ابھارا گیا ہے وہ خوبصورتی اور عظمت میں زبور کی بلیغ ترین عبارتوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ دونوں میں ایک ہی طرح کی شعریت ہے۔[2]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کی طرح حضرت محمد ﷺ بھی خدا کے پیغامات انسان تک پہنچانے والی متوسل ہستیوں کے قائل تھے۔ فرشتوں کے بارے میں آج کل کے لوگوں کا عدمِ اعتقاد اس کا کوئی جواز مہیا نہیں کرتا کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے تصورات کی ہنسی اڑائیں۔ ہمارے عدمِ اعتقاد اور ان کے اعتقاد دونوں کو وہم و قیاس کا نام دیا جا سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک سلبی ہے دوسرا ایجابی۔ جن چیزوں کو ہم جدید

---

1. سورۂ انفال آیت ۴۱۔ اگرچہ تقسیم کا اختیار رئیسِ مملکت کو دیا گیا، تاہم چند مروجہ قاعدوں پر عمل کیا جاتا تھا۔ جنہوں نے خلفا کے تحت اسناد نظائر کی حیثیت اختیار کر لی اور یوں اس قانون کو ایک معین شکل بخشی۔

2. سورۂ بدر میں فرشتوں کا نازل ہونا صرف تاریخ و روایات کی طرفہ طرازی نہیں کہ اس کو شاعرانہ اندازِ بیان پر محمول ٹھہرایا جائے۔ بلکہ اس کا تعلق قرآن کی نص سے ہے، چنانچہ سورۂ انفال کی جس آیت کی طرف تحشیہ میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے: اذ تستغیثون ربکم نا ستجاب لکم انی ممد کم بالف من الملئکة مردفین (انفال) جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان جنگِ بدر میں اللہ تعالیٰ سے غیر معمولی امداد کا مطالبہ کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اس مطالبہ کو شرفِ قبولیت بخشا اور فرمایا کہ میں تم کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد دوں گا جو سلسلہ وار میدانِ کارزار میں اتریں گے۔ یہاں عربیت کی رو سے تین قرائن ایسے ہیں۔ جو اس بات پر دلالت کناں ہیں کہ اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ امرِ واقعہ ہے، اسلوبِ بیان کی ساحری یا شاعرانہ بلاغت نہیں صرف تاکید۔ لفظ ممد اور ملائکہ کے ذکر کے بعد صفت مردفین کا اضافہ۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ غزوہ بدر معمولی لڑائی نہیں تھی، بلکہ حق و باطل کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکہ تھا۔ یعنی یہ جنگ اقدار کی جنگ تھی، خیر و شر کی لڑائی تھی، اس لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص نوازشیں مسلمانوں کے شاملِ حال نہ ہوں۔

زمانہ میں قوانین فطرت کہتے ہیں انہیں کو وہ لوگ فرشتے یعنی آسمانی کار پرداز تصور کرتے تھے۔ آیا، جیسا کہ لاک (Locke) کا خیال ہے، خدا اور انسان کے درمیان کوئی متوسط ہستیاں ہیں، جس طرح انسان اور حیوانی مخلوق کی اسفل ترین صورتوں کے درمیان ہیں، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی تہہ تک عقلِ انسانی کی رسائی محال ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح حضرت محمد ﷺ بھی اس کے قائل تھے کہ ایک اصولِ شر موجود ہے جو ایک وجودِ شخصی میں مجسم ہے۔ لیکن جب آپ ﷺ کے اقوال کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں ایک عقلی عنصر دکھائی دیتا ہے، یعنی ایک موضوعی تصور جسے آپ ﷺ نے اپنے متبعین کے فہم کے مطابق الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ ایک مرتبہ کسی نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ شیطان کہاں رہتا ہے تو آپ ﷺ نے جواب دیا، ''انسان کے دل میں۔'' اس کے مقابلہ میں عیسائی روایات نے اس فریسی کو جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آزمائش میں ڈالا سچ مچ کا رئیس جہنم بنا کر پیش کیا[1]

ملائکہ و شیاطین پر اعتقاد نے اسلام میں بھی اور عیسائیت میں بھی قصص و اساطیر کی ایک حیرت انگیز تعداد کو جنم دیا۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ آسمان کے اولیا اور فرشتے ان کی طرف سے جنگ کرتے ہیں۔ مسلمان صرف جہادِ زندگی میں فرشتوں کی معاونت قبول کرتا ہے۔

---

[1] Schleiermacher کے دبستان کے سارے مفکر یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آزمائش میں ڈالنے والا پجاریوں کا سرخیل تھا۔ مل مین اس خیال کا بھی ذکر کرتا ہے اور اس بارے میں راسخ العقیدہ کلیسا کا جو خیال ہے اس کا بھی لیکن وہ بڑی ہوشیاری سے کام لے کر اس کا فیصلہ پڑھنے والے پر چھوڑ دیتا ہے کہ کون سا خیال زیادہ قابلِ قبول ہے۔ Reuss نے اپنی کتاب (History of Christian Theology in the Apostolic Ages) میں فرشتوں پر جو باب لکھا ہے اور اس میں جو سیر حاصل حوالے دیئے گئے ہیں، ان سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اولین عیسائی، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور بلا واسطہ متبعین اس پر کامل اعتقاد رکھتے تھے کہ فرشتے اور شیاطین اشخاص ہیں جن میں تھوڑا سا ساوی عنصر تو ہے لیکن باقی ہر لحاظ سے انسانی صفات پائی جاتی ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ عقیدہ ان حواریوں اور متبعین نے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اکتساب کیا ہوگا، جن کا اندازِ فکر، جیسا کہ Renan کہتا ہے، اپنے ہمعصروں کے اندازِ فکر سے مختلف نہ ہو سکتا تھا۔

چوتھے باب پر نوٹ

یہ ایک بالکل بے سروپا افسانہ ہے کہ جب عقبہ بن معیط کو مقتل کی طرف لے جا رہے تھے تو اس نے آپ ﷺ سے فریاد کی اور آپ ﷺ نے اُسے بے رحمانہ جواب دیا۔ افسانہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جب عقبہ نے یہ پوچھا کہ "میرے بچوں کی دیکھ بھال کون کریگا؟" تو آپ ﷺ نے جواب دیا "دوزخ کی آگ"۔ یہ افسانہ بجائے خود اتنا بیہودہ ہے اور آپ ﷺ کی سیرت کے اس قدر نقیض ہے (جس کے اوصاف جمیلہ میں ایک یہ وصف تھا کہ آپ کو بچوں سے بہت محبت تھی اور آپ ہمیشہ یتیموں پر شفقت اور ان کی دستگیری کو ایک قطعی فرض اور خدا کے نزدیک پسندیدہ عمل کہہ کر اس کی تلقین کیا کرتے تھے) کہ اس کے ماخذ کا کھوج لگانا تحصیل حاصل ہے لیکن عیسائی مصنفین اسے ایسے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں کہ اس افسانے کی اصلیت کا سراغ لگانا ضروری ہے۔

قیاسِ اغلب یہ ہے کہ اس کی بنیاد وہ نام ہے جس سے عقبہ کے بچے پکارے جاتے تھے، یعنی صبیۃ النار" (آگ کے بچے) عقبہ خود قبیلۂ عجلان سے تھا، جس کی ایک شاخ صفرا کے قریب کی چند وادیوں میں آباد تھی۔ اس شاخ کو بنی النار کہتے تھے۔ عقبہ کے بچوں کا نام بھی غالباً اسی مناسبت سے صبیۃ النار پڑ گیا اور اسی کی بنا پر یہ افسانہ گھڑ لیا گیا۔

ایک اور افسانہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بت پرستوں کے مردے دفن کرتے وقت اُن سے بہت سخت الفاظ میں خطاب کیا۔ جن واقعات کی بنا پر یہ بہتان باندھا گیا۔ طبری انہیں یوں بیان کرتا ہے: "رسول اللہ ﷺ اس قبر کے قریب کھڑے ہو گئے جو ان مردوں کے لیے کھودی گئی تھی۔ جب لاشیں قبر میں اتاری گئیں تو ہر ایک کا باری باری نام لیا گیا۔ اس وقت آنحضرت ﷺ نے فرمایا: 'میرے رشتہ دار، جب دوسرے لوگ مجھ پر ایمان لے آئے تو اس وقت بھی تم لوگوں نے مجھے جھوٹا کہا۔ جب دوسروں نے مجھے آسرا دیا تم نے مجھے گھر بار سے نکال دیا۔ تمہارے مقدر میں کیسا انجام تھا افسوس! خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہا"۔ یہ الفاظ صریحاً رحم و تاسف کے اظہار کے لیے کہے گئے تھے، لیکن انہیں موڑ توڑ کر سخت کلامی سے تعبیر کر دیا گیا۔

پانچواں باب

قریش کا مدینے پر حملہ

(۲ ہجری مطابق ۶۲۴ عیسوی)

كالزّهر في ترف و البدر في شرف
والبحر في كرم و الدهر في همم

۲ ہجری
سچائی کی جو بہترین کسوٹیاں ہیں اُن میں ایک کامیابی ہے۔ عیسائیت کے ابتدائی ایام میں بھی نیک فریسی نے کہا تھا۔ ''ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اگر یہ جھوٹے ہیں تو خود بخود نیست و نابود ہو جائیں گے، ورنہ تم خود فنا ہو جاؤ گے۔'' اگر قسطنطین کو آسمان پر صلیب نظر نہ آئی ہوتی یا اُسے یہ خیال نہ ہوا ہوتا کہ اسے صلیب نظر آئی ہے، اگر وہ اس کے زیرِ سایہ جادہ کامرانی پر گامزن نہ ہوتا، اگر وہ اس کی ہمت بڑھا کر اُسے فتح و نصرت اور تخت و تاج نہ دلواتی، تو ہم تصور نہیں کر سکتے کہ عیسائیت کا کیا حشر ہوتا۔ فتح بدر مسلمانوں کے لیے جو معنی رکھتی تھی وہی معنی عیسائیوں کے لیے ملوین کے پل کی فتح رکھتی تھی[1] اس فتح کے بعد عیسائیت نے قیصروں کے تخت پر بیٹھ کر حکومت کی۔

مسلمانوں کے لیے فتح بدر بہت مبارک ثابت ہوئی۔ اس لیے کوئی مقام تعجب

---

[1] عیسائی خود قسطنطین کے ہاتھوں میکنٹین کی شکست کو اپنے دین کی سب سے شاندار کامیابی تصور کرتے ہیں۔ اس بارے میں گبن کا باب، جو طنز اور تاریخ کا آمیزہ ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ عیسائیت کی کامیابی کیونکر اس واقع سے شروع ہوئی۔

نہیں کہ قدیم اسرائیلیوں اور عیسائیوں کی طرح انہیں بھی اپنی کامیابی میں تائیدایزدی کار فرما نظر آئی۔ اگر مسلمان ناکام رہتے تو ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ان کا حشر کیا ہوتا۔ ایک قتل عام۔

جن دنوں آنحضرت ﷺ مہم بدر میں مصروف تھے انہیں دنوں میں آپ ﷺ کی ایک چہیتی بیٹی رقیہ رضی اللہ عنہا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بیاہی ہوئی تھیں وفات پا گئیں۔ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حال ہی میں ہجرت حبشہ سے واپس آئے تھے) لیکن کفار کے دل میں جو آتش انتقام بھڑک رہی تھی اس نے آپ کو خانگی غموں میں حصہ لینے کی فرصت نہ دی۔ قریشی قیدیوں کے گھر لوٹتے ہی ابوسفیان دو سو سوار لے کر مکے سے نکلا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک رسول اللہ ﷺ اور ان کے متبعین سے بدلہ نہ لے لے گا اس وقت تک واپس نہ آئے گا۔ مدینے کے قرب وجوار کے علاقوں سے گزرتا ہوا وہ جلدی جلدی بے خبر مسلمانوں پر ایک بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ وہ جدھر سے گزرا لوگوں کو قتل کرتا گیا اور کھجور کے نخلستانوں کو جن پر عربوں کا زیادہ تر گزارہ تھا، تباہ کرتا چلا گیا۔ اہلِ مکہ اس مہم کے لیے سویق (ستو) کے تھیلے لائے تھے[۱]۔ لیکن مسلمانوں کا اس کشت وخون کا انتقام لینے کے لیے مدینہ سے نکلنا تھا کہ اہلِ مکہ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور بھاگنے میں اپنے جانوروں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے سویق کے تھیلے پھینک گئے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں نے اس لڑائی کا نام غزوۃ السویق رکھا[۲]۔

۵/ذی الحجہ یکم اپریل ۶۲۴ء

اس موقع پر آنحضرت کو ایک واقعہ پیش آیا جسے واشنگٹن اردنگ نے بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ ایک دن اپنے لشکر گاہ سے کچھ دور ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے کسی آواز نے آپ ﷺ کو جگا دیا آپ ﷺ نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ایک دشمن سپاہی تلوار سونتے آپ ﷺ

---

[۱] عرب کے لوگ ہرے جو بھون کر اور کوٹ کر ان میں کھجور کا سفوف یا شکر ملا دیا کرتے تھے۔ ان کا عربی نام سویق ہے۔ وہ لوگ دوران سفر جب کھانا پکانا مشکل ہوتا تھا اسی کو پھانک کر گزر کر لیتے تھے۔

[۲] جس جگہ یہ واقع ہوا، اُسے آج کل سویقیہ کہتے ہیں۔ وہ مدینے کے جنوب مغرب میں چند گھنٹوں کی مسافت پر واقع ہے۔

کے سر پر کھڑا ہے۔ اس نے کہا، "اے محمد ﷺ، اب تجھے بچانے والا کون ہے؟" رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا "اللہ!" یہ سن کر وحشی بدوی پر کچھ ایسا خوف طاری ہوا کہ تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ آنحضرت ﷺ نے جلدی سے تلوار اٹھالی اور ہوا میں لہرا کر بدوی سے پوچھا، "اے دعثور! اب تجھے بچانے والا کون ہے؟" سپاہی نے جواب دیا "افسوس! کوئی نہیں۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "تو پھر مجھ سے رحم کا سبق سیکھ۔" یہ کہہ کر آپ ﷺ نے تلوار سے واپس کردی اس برتاؤ سے اعرابی کا دل اتنا متاثر ہوا کہ وہ فوراً مسلمان ہوگیا اور مستقبل میں آنحضرت ﷺ کے جاں نثاروں میں پیش پیش رہا[1]۔

لیکن مسلمانوں اور کافروں کے درمیان یہ جھڑپ اور بہت سی جھڑپوں کی طرح جو اس کے بعد ہوئیں اس عظیم الشان ڈرامے کی محض ایک تمہید تھی جو بعد میں ہونے والا تھا۔

۳ ہجری (۲۶/اپریل ۶۲۴ء سے لے کر ۱۵/اپریل ۶۲۵ء تک)

انتقام کی آگ کفار کے سینوں میں سلگ رہی تھی۔ وہ قبائل کنانہ و تہامہ کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور ان کی متحدہ فوجوں کی تعداد بہت جلد تین ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ تین ہزار سپاہی ہر طرح کے سامانِ جنگ سے لیس تھے، اور ان میں سات سو زرہ پوش جنگجو بھی تھے۔ ان سب کے دلوں میں انتقام کا جذبہ بھڑک رہا تھا۔ عرب کے قبائل کے لیے یہ فوج اتنی ہی خوفناک تھی جتنا ایران کے خشایارشا کا لشکر جرار یونانی ریاستوں کے لیے تھا۔

یہ فوج سخت گیر ابوسفیان کی قیادت میں کوچ کرتی ہوئی کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر مدینے کے شمال مشرق میں ایک مقام پر پہنچ گئی جہاں اس نے پڑاؤ ڈالا۔ اب اس کے اور مدینے کے درمیان صرف احد کی پہاڑی اور ایک وادی حائل تھی۔ اس مقام برتری

---

[1] اس سال کے آخری مہینہ میں دو اہم واقعات ہوئے۔ عثمان رضی اللہ عنہ بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں تھے جو سب سے پہلے ایمان لائے اور مہاجرین میں سب سے پہلے انہوں نے وفات پائی۔ انہیں نواح مدینہ کے ایک مقام "بقیع" میں دفن کا گیا جہاں بہت سے مشاہیر و اکابر دفن ہیں جن کے مزاروں کا احترام مسلمان آج تک کرتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نسبت مہم بدر سے کچھ پہلے ہو چکی تھی لیکن نکاح ۳ مہینے کے بعد ہوا۔ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ ۲۱ ویں سال میں تھے اور حضرت فاطمہ پندرہویں سال میں۔

سے وہ اہلِ مدینہ کے کھیتوں اور نخلستانوں کو تباہ کرنے لگی۔

اپنے مال و املاک کی یہ تباہی دیکھ کر مسلمانوں کو بہت غصہ آیا۔ ان کے جوش نے آنحضرت ﷺ کو مجبور کیا کہ آپ ﷺ مدینہ سے ایک ہزار مسلمانوں کی اپنے مال و املاک کی یہ تباہی دیکھ کر مسلمانوں کو بہت غصہ آیا۔ ان کے جوش نے آنحضرت ﷺ کو مجبور کیا کہ آپ ﷺ مدینہ سے ایک ہزار مسلمانوں کی فوج لے کر نکلیں۔ یہودیوں کی کھلم کھلا دشمنی کے بل بوتے پر منافقوں کا سرغنہ عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو پیروؤں کو لے کر واپس مدینہ چلا گیا۔ اب مسلمانوں کی تعداد صرف سات سو رہ گئی اور اس پر ان کے پاس لے دے کر صرف دو گھوڑے تھے۔ اس کے باوجود جاں بازوں کا یہ دستہ ثابت قدمی سے بڑھتا چلا گیا اور درختوں کے جھنڈوں کی آڑ میں کوچ کرتا ہوا بہت جلد احد کی پہاڑی پر قابض ہو گیا۔ ان لوگوں نے گھاٹی میں رات گزاری اور دوسرے دن نمازِ فجر ادا کر کے میدان میں نکل پڑے۔ آنحضرت ﷺ نے پہاڑی کے عین نیچے صف آرائی کی[1]۔ آپ ﷺ نے فوج کے عقب میں ایک اُونچی جگہ پر تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین کیا اور اسے تاکیدی حکم دیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے اپنے مقام سے نہ ہٹے۔ بلکہ دشمنوں کے رسالے کو دق کرے اور مسلمانوں کے میمنہ و میسرہ کو دشمنوں سے بچائے۔ کفار اپنی تعداد

---

[1] برٹن اس مقام کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:۔ یہ مقام جو اسلام کی تاریخ میں مشہور ہے کوہ احد کے جنوبی دامن کے قریب ایک ڈھلوان قطعہ زمین ہے۔ کفار کی فوج اپنے جرنیل ابوسفیان اور اس کے بتوں کو قلب میں لیے ہوئے اور ایک ہلالی شکل بنائے ہوئے آگے بڑھی۔ یہ مقام مدینہ کے شمال میں تقریباً ۳ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جب کوئی شخص یہاں آئے تو اُسے اپنے سامنے صرف کنکریلی زمین دکھائی دیتی ہے جس پر رنگا رنگ کے سنگ خارا، سرخ ریتلے پتھروں اور سنگِ ساق کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں پڑی ہیں۔ یہ ڈھیریاں شہداء کی قبروں کے نشان ہیں۔ اس نقطہ سے اس مقدس پہاڑی پر نظر ڈالئے تو وہ بھیانک سی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے جلے ہوئے اور دندانہ پہلو لوہے کے تودوں کی طرح میدان سے اُٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ڈراونی دیوار میں صرف ایک شگاف ہے۔ یہ وہ شگاف ہے جس میں مسلمانوں نے اُس وقت پناہ لی تھی جب ان کے تیر اندازوں نے حکم عدولی کر کے اور مالِ غنیمت کی طرف لپک کر خالد بن ولید کی عقب سے حملہ کرنے کا موقع دیا تھا۔ اس کی سطح پر، جو ہر وقت تپتی رہتی ہے، کوئی درخت یا جھاڑی یا گھاس نہیں۔ میں جتنی مدت وہاں رہا مجھے کوئی چرند یا پرندہ دکھائی نہیں دیا۔ اس کی گنجی اور اداس پیشانی کو نیلا اور شفاف آسمان گویا اوپر سے گھور رہا تھا، اور اُسے اور بھی گھناؤنا بنا رہا تھا۔

کے گھمنڈ میں اپنے بتوں کو فوج کے قلب میں لیے ہوئے میدان میں اترے۔ ان کے سرداروں کی بیویاں رجز گاتی اور دف بجاتی ہوئی آگے آگے چلیں[1]۔ قریش کا پہلا شدید حملہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت دستہ نے نہایت بہادری سے پسپا کر دیا۔ دشمن کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ان کی صفوں میں گھس گئے اور دودستی تلوار سے دشمنوں میں تہلکہ مچاتے ہوئے بڑھتے چلے گئے۔ مسلمانوں کی فتح کا نقارہ بجنے ہی والا تھا کہ ان کے تیر انداز رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو بھول کر اور دشمنوں کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر مالِ غنیمت کی خاطر ادھر ادھر بکھر گئے[2]۔ چنانچہ بعد میں طورس[3] کے مقام پر جو کچھ ہوا وہی جنگِ احد میں ہوا۔ قریش کے ایک میرِ لشکر خالد بن ولید نے فوراً مسلمانوں کی غلطی بھانپ لی اور اپنے سواروں کو جمع کر کے ان کے عقب پر حملہ کر دیا۔ ادھر کفار کی پیادہ فوج بھی پلٹی۔ چنانچہ مسلمانوں کی فوج آگے اور پیچھے دونوں طرف سے گھر گئی اور مسلمانوں کو اس نرغہ میں پھنس کر نئے سرے سے لڑنا پڑا۔ ان کے بہت سے بہادر سردار لڑتے ہوئے مارے گئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور کئی اور سردار شہید ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ[4] جنہوں نے کفار کی رجز کا سب سے پہلے اپنی تلوار سے جواب دیا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سخت

---

[1] ابن الاثیر نے ان رجزیہ اشعار کے کچھ ملخصات دیئے ہیں: ''ویھاً بنی عبدالدار! ویھاً حماۃ الادبار! ضرباً بکل بتّار! (ہمت! اے عبدالدار کے بیٹو! ہمت! اے عورتوں کے محافظو! اپنی تلواروں سے ضرب کاری لگاؤ)...... ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں، ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں، اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گے اور پیچھے قدم بڑھایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گے

[2] اس نافرمانی کی طرف سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۵۲ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

[3] فرانس کے ایک مقام کا نام جہاں ۷۲۲ء میں مسلمانوں کو کچھ ایسے ہی اسباب کی بنا پر فرنگیوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔

[4] طبری لکھتا ہے کہ کفار کا علمبردار طلحہ جو ایک بہادر جنگجو تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے آیا اور تلوار گھما کر ان سے یوں مبارز طلب ہوا۔ ''تم مسلمان کہتے ہو کہ ہمارے مردے دوزخ میں جاتے ہیں اور تمہارے بہشت میں۔ آؤ میں دیکھوں میں تمہیں بہشت میں بھیج سکتا ہوں یا نہیں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''بہت اچھا'' چنانچہ دونوں میں لڑائی ہوئی۔ طلحہ زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا اور پکارا۔ ''رحم کر اے میرے ابن عم۔'' علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''اچھا رحم سہی، تو دوزخ کی آگ کے قابل نہیں۔''

زخمی ہوئے لیکن کفار کی کوششوں کا مرکز زیادہ تر خود آنحضرت ﷺ تھے، جو اپنی فوج سے الگ چند جاں نثاروں کے حلقہ میں کھڑے تھے۔ کفار ہر طرف سے آپ ﷺ کی طرف جھپٹے۔ جو جاں نثار آپ ﷺ کو حلقہ میں لیے کھڑے تھے۔ وہ کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ آپ ﷺ بھی زخمی ہوئے۔ لیکن اس حالت میں بھی آپ ﷺ اپنے محبوں کو نہ بھولے اور ان ہاتھوں کے لیے دعائے رحمت فرمائی جنہوں نے آپ ﷺ کی پیشانی سے خون بند کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال کمک نزدیک ہی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی جو دشمن کے قلب میں جان توڑ کر لڑ رہے تھے، دشمن کے نرغہ سے نکل کر پہاڑی کے ایک محفوظ مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں دشمن ان تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ لیکن دشمنوں نے آنحضرت ﷺ کی شہادت کا جو جھوٹا اعلان کر دیا تھا اس سے یہ سب لوگ سخت سراسیمہ تھے۔ بہر حال مسلمانوں کی ایک اور جماعت کو میدان کے ایک اور حصہ میں لڑتے دیکھ کر وہ دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے۔ صفیں چیرتے ہوئے وہ اس جگہ پہنچے جہاں مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ آنحضرت ﷺ کو حلقہ میں لیے ہوئے تھا اور آپ ﷺ کو زندہ پا کر جاں توڑ کوششوں کے ساتھ آپ ﷺ کو کوہِ احد کی بلندیوں پر لے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ڈھال میں چٹان کے ایک سوراخ سے پانی لائے اور اس سے آنحضرت ﷺ کے چہرہ مبارک اور زخموں کو دھویا۔ اس کے بعد سب نے مل کر بیٹھے بیٹھے ظہر کی نماز ادا کی۔

قریش میں اب اتنی سکت نہ رہی تھی کہ مدینے پر حملہ کرتے یا مسلمانوں کو کوہِ احد کی بلندیوں سے ہٹاتے۔ اس لیے وہ نہایت سفاکی سے مسلمان شہدا کی لاشوں کا مثلہ کرنے کے بعد، قرب و جوار مدینہ کے ان علاقوں سے نکل گئے جن پر انہوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ ابو سفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے قریش کی چند عورتوں کو ساتھ لے کر اس وحشیانہ انتقام میں سب سے زیادہ گرم جوشی دکھائی۔ اس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چیر کر ان کا کلیجہ نکال لیا اور دوسرے شہدا کے کانوں اور ناکوں کا ہار بنا کر گلے میں پہن لیا۔

قریش نے شہدا کی لاشوں سے جو سفاکانہ سلوک کیا اس سے مسلمانوں کے جذبات سخت برانگیختہ ہوئے۔ خود آنحضرت ﷺ کو ابتداءً اس قدر غصہ آیا کہ آپ ﷺ نے اعلان کر دیا کہ آئندہ کفار کے مردوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے۔ لیکن آپ ﷺ کی فطرت

میں جو رحم و کرم ودیعت کیا گیا تھا وہ اس عارضی غصے پر غالب آ گیا۔ آپ ﷺ نے ہدایت کی۔ ''دشمن کی زیادتیوں کو صبر سے برداشت کرو، یقیناً صبر و تحمل کرنے والے سب سے زیادہ فلاح پائیں گے۔ اس دن سے مردوں کی برید اعضا کا یہ نفرت انگیز دستور جو تمام قدیم اقوام میں رائج تھا، مسلمانوں کے لیے نہایت سختی سے ممنوع ہو گیا[1]

مدینے میں واپس آ کر آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا دستہ بھاگتے ہوئے دشمنوں کے تعاقب میں روانہ کیا تا کہ قریش پر واضح ہو جائے کہ جنگ میں شدید نقصان اٹھانے کے باوجود مسلمانوں کی ہمت پست نہ ہوئی تھی اور وہ اتنے کمزور نہ تھے کہ اگر ان پر کوئی حملہ کرے تو بچ کر چلا جائے۔ اس تعاقب کی خبر سن کر ابو سفیان جلدی جلدی مکے واپس گیا اور راستے میں دو مسلمان شہید کر گیا۔ اس نے آنحضرت ﷺ کو پیغام بھیجا کہ وہ آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے متبعین کو فنا کرنے کے لیے بہت جلد دوبارہ آئے گا۔ اسے جو جواب ملا وہ پہلے کی طرح ایمان وایقان سے پر تھا: ''خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ اچھا محافظ ہے۔''

اس المناک جنگ کے مضر اثرات ان تیاریوں سے ظاہر ہوئے جو ہمسایہ خانہ بدوش قبائل مدینہ پر چھاپے مارنے کے لیے کر رہے تھے۔ ان میں سے اکثر آنحضرت ﷺ کے اس مستعدانہ اقدام سے مرعوب ہو گئے۔ لیکن بعض مخالف قبیلے اسلام قبول کرنے کے وعدے کر کے مسلمانوں کو دھوکے سے اپنے علاقوں میں لے جاتے اور وہاں انہیں قتل کر دیتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر ستر (۷۰) مسلمان ایک چشمے کے قریب، جس کا نام بیر معونہ تھا، دغا بازی سے قتل کر دیئے گئے، چشمہ قبائل بنی عامر و بنی سلیم کے علاقے میں تھا اور اس کارستانی میں مؤخر الذکر کا خاص طور پر ہاتھ تھا۔ ان مسلمانوں میں سے دو آدمی بچے، جن میں سے ایک مدینے کی طرف بھاگ آیا۔ راستے میں اُسے بنی عامر کے غیر مسلح

---

[1] یہودی اپنے قیدیوں کو زندہ جلا دیا کرتے تھے اور مقتولوں کی لاشوں کو نہایت وحشیانہ طور پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کرتے تھے۔ یونانیوں، رومیوں اور ایرانیوں کے ہاں بھی ایسی سفاکیاں رائج تھیں۔ عیسائیت نے اس کی کوئی اصلاح نہ کی۔ سولھویں صدی تک ہمیں تاریخ کے اوراق میں ان انسانیت سوز زیادتیوں کی روداد یں ملتی ہیں۔

آدمی ملے، جو آنحضرت ﷺ سے پروانہ پناہ لے کر سفر کر رہے تھے۔ اس نے انہیں دشمن سمجھا اور قتل کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ کو بہت رنج ہوا۔ آپ ﷺ کے ایک پیرو نے لاعلمی ہی میں سہی، ایک زیادتی کی تھی، اور جو دو آدمی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے ان کے رشتہ دار خوں بہا کے مستحق تھے۔ چنانچہ مسلمانوں اور دوسرے معاہد قبائل سے دیت جمع کرنے کا حکم دیا گیا۔ بنی نضیر، بنی قریظ اور دوسرے یہودی قبائل پر مسلمانوں کے برابر دیت ادا کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی[1]۔ آنحضرت ﷺ خود چند صحابیوں کے ہمراہ بنی نضیر کے ہاں گئے اور اُن سے اُن کا حصہ طلب کیا۔ انہوں نے بظاہر یہ مطالبہ قبول کر لیا اور آپ ﷺ سے قدرے توقف کرنے کو کہا۔ لیکن جب آپ ﷺ ایک مکان کی طرف پشت کئے بیٹھے تھے تو کمینوں کی نقل و حرکت سے آپ ﷺ کو علم ہو گیا کہ ان کی نیت آپ ﷺ کو قتل کر دینے کی تھی۔

یہود کی دشمنی کے اسباب واضح کرنے کی خاطر ہمیں گزشتہ واقعات کی طرف مراجعت کرنی پڑے گی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے دورِ مدینہ کے لمحے سے وہ کس طرح ہاتھ دھو کر آپ ﷺ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں بد دلی کا بیج بونے کی کوشش کی، آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے متبعین پر بہتان باندھے، قرآن کے الفاظ کو خراب معنیٰ پہنانے کی خاطر ان کے تلفظ کو بگاڑا۔ انہوں نے اسی پر بس نہ کی۔ یہودی اپنی نسبتہً اعلیٰ تعلیم اور بہتر ذہانت کی بدولت، منافقین کے ساتھ گٹھ جوڑ کی بدولت اور اپنے اس اتفاق کی بدولت، جو عربوں کی نا اتفاقی سے اس قدر مختلف تھا، اس وفاقی مملکت میں جو معلم اسلام کے تحت وجود میں آئی تھی ایک نہایت خطرناک عنصر تھے۔ اخبارات کو عصر جدید میں جو حیثیت اور اثر و نفوذ حاصل ہے غیر ترقی یافتہ اقوام میں وہ

---

[1] ابن الاثیر، طبری، میور اور اسپرینگر نے معاملہ کے اس پہلو کو ایک عجیب طرح سے مسخ کیا ہے کوسین دی پرسیوال کے اس قول کے لیے کہ یہودی دیت ادا کرنے کے ذمہ دار تھے، سر ولیم میور کو کوئی سند نہیں ملی۔ اگر وہ طبری کی ورق گردانی کرتے تو انہیں ذیل کا بیان ملتا: ''بعد میں حکم دیا کہ رقم جمع کی جائے یا مدینہ کے لوگوں سے وصول کی جائے اور یہ حکم بھی دیا کہ اس میں یہودی قبائل، مثلاً بنی نضیر، بنی قریظ اور وہ جو فدک میں رہتے تھے، جن سب پر معاہدہ کی رو سے ذمہ داری عائد ہوتی تھی، برابر کا حصہ ادا کریں۔

شعراء کو حاصل تھا[1]۔ یہودی شعراء اپنی علمی و ثقافتی فضیلت کی بنا پر قدرتی طور پر اہل مدینہ میں بہت صاحب رسوخ تھے اور اس رسوخ سے وہ زیادہ تر مسلمانوں میں نفاق کا بیج بونے اور ان کے اور ان کے مخالفوں کے درمیان جو خلیج حائل تھی اُسے وسیع تر بنانے کا کام لیتے تھے۔ جنگ بدر میں کفار کی شکست یہودیوں کو بھی اتنی ہی ناگوار گزر رہی جتنی اہل مکہ کو۔ جنگ کے فوراً بعد یہودی قوم کے ایک معزز فرد کعب بن اشرف نے، جو قبیلہ نضیر سے تھا، برسرِ عام کفار کی شکست پر اظہارِ افسوس کیا اور عازمِ مکہ ہوا۔ وہاں اس نے یہ دیکھ کر کہ لوگ غم میں ڈوبے ہوئے ہیں اُن کے حوصلے بڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اس نے آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے متبعین کی ہجویں سنا سنا کر اور بدر میں جو اہلِ مکہ قتل ہوئے تھے ان کے مرثیے گا گا کر قریش میں وہ جوشِ انتقام پیدا کیا جو میدان احد میں ظاہر ہوا۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر وہ اپنے گھر واپس آیا، جو مدینے کے قریب بنی نضیر کے قلعے میں تھا، اور آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں پر طنزیہ اور فحش اشعار میں حملے کرتا رہا، یہاں تک کہ اس نے مسلمانوں کی عورتوں کا بھی پاس نہ کیا اور ان کی شان میں مغلظات بکتا رہا۔ اس کے یہ افعال کھلم کھلا اس دولتِ عامہ کے خلاف تھے جس کا وہ خود ایک فرد تھا۔ اس کا قبیلہ ان قبیلوں میں تھا جنہوں نے مسلمانوں سے معاہدہ کیا تھا اور مملکت اسلامیہ کے اندرونی اور بیرونی تحفظ کا حلف اٹھایا تھا۔ بنو نضیر کا ایک اور یہودی ابو رافع سلام بن ابی الحقیق بھی مسلمانوں کا اتنا ہی جانی دشمن تھا۔ وہ اپنے قبیلے کی ایک شاخ

---

[1] غیر ترقی یافتہ قوموں میں شاعروں اور رجز خوانوں کو جو اثر و رسوخ حاصل تھا اس کی مثال جنگِ احد سے متعلق ایک واقعہ میں ملتی ہے۔ جب قریش اس اہم مہم کی تیاریاں کر رہے تھے تو انہوں نے ابوعزہ نامی ایک شاعر سے فرمائش کی کہ وہ صحرا کے قبائل میں دورہ کر کے انہیں اپنے اشعار اور رزمیہ گانوں سے مسلمانوں کے بر خلاف اُبھارے اور انہیں اس میثاق میں شامل ہونے کی ترغیب دے جو آنحضرت ﷺ اور ان کے متبعین کی تباہی کے لیے اہل مکہ کی سرپرستی میں مختلف قبائل کے درمیان ہوا تھا۔ یہ شخص جنگِ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہو گیا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے اسے فدیہ لیے بغیر اس شرط پر رہا کر دیا تھا کہ وہ آئندہ کبھی مسلمانوں کے خلاف ہتھیار نہ اُٹھائے گا۔ اس رحم دلی کے باوجود اس نے وعدہ خلافی کی اور قبائل میں دورہ کر کے انہیں اپنی شاعری سے مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کام میں اسے بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ جنگِ اُحد کے بعد وہ پھر مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ ابن ہشام

کے ساتھ خیبر کے علاقے میں رہتا تھا جو مدینے کے شمال مغرب کی طرف چار پانچ دن کی مسافت پر واقع تھا۔ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں سے اتنی نفرت تھی کہ اس نے ہمسایہ عرب قبائل مثلاً سلیم اور غطفان کو، مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے میں ہر طرح کے جتن کیے۔ دولتِ عامہ اسلامیہ کے لیے ناممکن تھا کہ ان لوگوں کی دغا بازیوں سے درگزر کرتی، جن کے ساتھ ہر طرح کی پاسداری کی گئی تھی، اس مقصد سے کہ اگر وہ مدد نہیں کر سکتے تو کم از کم غیر جانب دار ہی رہیں۔ اب امتِ اسلامیہ کی ہستی تک خطرے میں تھی اور تحفظ کا ہر اصول اس بات کا متقاضی تھا کہ ان غدارانہ سازشوں کو خاموشی سے ناکام بنا دیا جائے۔ اہلِ مدینہ نے خود انہیں بغاوت کی سزا کا مستوجب قرار دیا۔ چنانچہ ایک تو بنی اوس کے ایک فرد نے اور دوسرے کو بنی خزرج کے ایک فرد نے قتل کر دیا۔

عیسائی مناظرین نے اسے دغا بازانہ قتل سے تعبیر کیا ہے۔ اور چونکہ اس سزا کی انجام دہی کے لیے دو مسلمان خفیہ طور پر بھیجے گئے اس لیے وہ آنحضرت ﷺ سے تعصب کی بنا پر اس سزا کے مبنی بر عدل ہونے اور اس کے عاجلانہ اور خفیہ طور پر انجام دیئے جانے کی ضرورت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس وقت انفرادی جرموں کی سزا دینے کے لیے کوئی پولیس کورٹ یا فوجداری عدالت بلکہ فوجی عدالت بھی نہ تھی۔ چونکہ کوئی سرکاری جلاد نہ تھا، اس لیے حکومت کی طرف سے سزا دینے کا اختیار کسی فرد کو دیا جا سکتا تھا۔ ان لوگوں نے ایک باضابطہ معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ انہیں نہ برسرِ عام گرفتار کیا جا سکتا تھا کہ شدید خوں ریزی ہوتی اور ثار، یا انتقامِ خون کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ مملکت کی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ ان لوگوں کے خلاف جنہیں رائے عامہ مستحق سزا قرار دے چکی تھی جو کچھ بھی کرنا تھا وہ فی الفور اور خاموشی سے کیا جائے۔[1] مملکت کی بقا اور شہر کا امن و امان اس پر منحصر تھا کہ مجرموں کو فی الفور سزا دی جائے اس سے پیشتر کہ وہ اپنے اہلِ قبیلہ کو اپنے گرد جمع کر لیں۔

---

[1] ہمارے عیسائی مورخین اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ خود دانشمند سولن (Solon) نے اپنے چھوٹے سے شہر کے تحفظ کے لیے ایتھنز کے باشندوں کے لیے یہ لازمی قرار دیا تھا کہ وہ مفسدوں کا تعاقب کریں اور یا فساد یا شورش کی صورت میں دو مخالف گروہوں میں سے ایک کے ساتھ شامل ہو جائیں اور یوں حکومت کی طرف سے سزا دینے والے بن جائیں۔ وہ اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ اور تو اور عیسائی انگلستان کا قانون بھی ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ وہ کسی راندۂ قانون کا پیچھا کرے اور اسے قتل کر دے۔

شوال ۲ھ (فروری ۶۲۴ء)

ان غداروں کے حشر اور ان کے برادران بنی قینقاع کے مدینہ سے اخراج نے بنی نضیر کے سینوں میں پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف شدید عداوت کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ بنی قینقاع کی جلا وطنی کے حالات مجمل بیان کے محتاج ہیں۔ جہاں دوسرے یہودی قبیلے زیادہ تر زراعت پیشہ تھے وہاں بنی قینقاع کا نہ کوئی کھیت تھا نہ نخلستان۔ یہ لوگ زیادہ تر دستکار تھے جو ہر طرح کی صنعت وحرفت میں مشغول تھے۔ یہ لوگ باغی فطرت اور شورش پسند تھے۔ اسکندریہ کے یہودیوں کی طرح ہر وقت لڑائی جھگڑے کے لیے تیار رہتے تھے اور اپنے پست اخلاق کے لیے بدنام تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ دیہات کی ایک نوجوان لڑکی ان کے بازار میں دودھ بیچنے آئی۔ یہودی نوجوانوں نے اس کی سخت توہین کی۔ ایک مسلمان نے جو ادھر سے گزر رہا تھا، لڑکی کی حمایت کی۔ اس پر بلوہ ہو گیا جس میں بے حرمتی کرنے والا لڑکا مارا گیا۔ لڑکے کا قتل ہونا تھا کہ جتنے یہودی وہاں موجود تھے وہ تمام اُٹھ کھڑے ہوئے اور مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد ایک خوفناک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مسلمانوں نے اپنے بھائی کے قتل پر غضبناک ہو کر ہتھیار اُٹھا لیے۔ خون کی ندیاں بہہ نکلیں اور طرفین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ اس ہنگامہ کی خبر پاتے ہی آنحضرت ﷺ موقع پر پہنچے۔ آپ ﷺ کی موجودگی نے آپ ﷺ کے متبعین کے غصے کو حد سے تجاوز کرنے سے روکا۔ آپ ﷺ پر فوراً واضح ہو گیا کہ اگر ان بغاوتوں اور شورشوں کی روک تھام نہ کی گئی تو ان کا نتیجہ کیا ہوگا۔ مدینہ کشت وخون کا اکھاڑا بن جائے گا جس میں مخالف گروہ کسی قانونی گرفت کے بغیر ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے۔ یہودیوں نے کھلم کھلا اور دیدہ ودانستہ معاہدے کی شرائط کو توڑا۔ ضروری تھا کہ ان امن شکنیوں کو سختی سے روکا جائے ورنہ امن وسلامتی کی تمام اُمیدوں کو الوداع کہنا پڑے گا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ فوراً بنو قینقاع کے علاقے میں گئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ اسلام قبول کر کے قطعی طور پر دولتِ عامہ اسلام میں داخل ہو جائیں، ورنہ مدینہ خالی کر دیں۔ یہودیوں نے نہایت گستاخانہ الفاظ میں اس مطالبہ کا جواب دیا: ''اے محمد ﷺ اپنی قوم (یعنی قریش) پر فتح حاصل کر کے آپے سے باہر نہ ہو جا۔ تجھے اب تک ایسے لوگوں سے معاملہ پڑا ہے جو فنِ جنگ سے ناواقف ہیں۔ اگر تجھے

ہمارا مقابلہ کرنے کی خواہش ہے تو ہم تجھے دکھا دیں گے کہ ہم مرد ہیں[1]۔" یہ جواب دے کر یہودیوں نے اپنے قلعے کے دروازے بند کر لیے اور آنحضرت ﷺ کی حاکمیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا مطیع فرمان بنانا قطعی ضروری تھا۔ اس لیے فوراً ان کے قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا۔ پندرہ دن کے بعد انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ پہلے تو انہیں سخت سزا دینے کا ارادہ تھا، لیکن آنحضرت ﷺ کی رحم دلی عدل کے سخت گیر تقاضے پر غالب آ گئی اور صرف جلاوطنی پر اکتفا کیا گیا۔

یہ تمام واقعات بنی نضیر کے سینوں میں کانٹوں کی طرح کھٹک رہے تھے۔ وہ آنحضرت ﷺ سے چھٹکارا پانے کے لیے کسی مناسب موقع کی تاک میں تھے۔ آنحضرت ﷺ کو اپنے علاقے میں دیکھ کر اُن کی مراد بر آئی۔ لیکن، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اُن کے ناپاک منصوبے آنحضرت ﷺ کی آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ آپ ﷺ یہودیوں کے دل میں شکوک پیدا کئے بغیر فی الفور واپس چلے گئے ورنہ آپ ﷺ کے متبعین کی ہلاکت یقینی تھی[2]۔

اب بنی نضیر نے اپنے لیے بالکل وہی صورتِ حال پیدا کر لی تھی جو ان سے پہلے بنی قینقاع اپنے لیے پیدا کر چکے تھے۔ انہوں نے خود اپنے افعال کی بدولت اپنے آپ کو معاہدے کی حدود سے خارج کر دیا تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مدینے میں آتے ہی بنی نضیر کو اسی مضمون کا پیغام بھیجا، جیسا بنی قینقاع کو بھیجا تھا۔ بنی نضیر نے منافقین اور عبداللہ ابن ابی کی حمایت کے بل بوتے پر گستاخانہ جواب دیا، لیکن عبداللہ نے اور اُن کے برادران بنی قریظہ نے امداد کا جو وعدہ کیا تھا جب وہ پورا نہ ہوا تو پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد انہوں نے صلح کی التجا کی جو شرائط بنی قینقاع کو پیش کی گئی تھیں وہی اُن کو پیش کی گئیں اور انہوں نے اپنے علاقے خالی کر دینے کا اقرار کیا۔ اسلحۂ جنگ کے سوا انہیں تمام

---

[1] ابن ہشام۔ طبری قینقاع کے جواب کو قدرے مختلف طور پر بیان کرتا ہے لیکن تمام مورخین متفق ہیں کہ گستاخانہ اور توہین آمیز تھا۔ گبن (Gibbon) نے یہودیوں کی طرف سے جو عاجزانہ جواب قلمبند کیا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اسے کہاں سے دستیاب ہوا۔

[2] اگر آنحضرت ﷺ یا آپ کے صحابی یہودیوں پر یہ ظاہر ہونے دیتے کہ آپ کے دل میں شک پیدا ہو گیا ہے تو یہودی فوراً کچھ کر گزرتے اس لیے آنحضرت ﷺ اکیلے وہاں سے تشریف لے گئے اور اپنے ساتھیوں کے پیچھے چھوڑ گئے۔ اس سے یہودیوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے اور جلد ہی لوٹ آئیں گے۔

اسباب منقولہ لے جانے کی جازت دی گئی، لیکن جانے سے پہلے انہوں نے اپنے تمام مکان مسمار کر دیے تا کہ مسلمان ان میں نہ رہ سکیں۔

ربیع الاول ۴ ھ مطابق جون تا جولائی ۶۲۵ء

ان کی زمینوں کو اور ان کے سامان جنگ وغیرہ کو جو وہ اٹھا کر اپنے ساتھ نہ لے جا سکتے جا سکتے تھے، آنحضرت ﷺ نے انصار کی اجازت سے، جو بخوشی تمام دی گئی، مہاجرین میں تقسیم کر دیا، جواب تک اہلِ مدینہ کی فیاضی کے محتاج تھے۔ مہاجرین اور انصار میں جو برادرانہ محبت تھی اس کے باوجود آنحضرت ﷺ کو معلوم تھا کہ مہاجرین کے لیے اہلِ مدینہ کی امداد پر مستقلاً انحصار کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے آپ ﷺ نے انصار کے اکابر کو جمع کیا اور ان سے دریافت کیا کہ اگر آپ ان کے غریب بھائیوں میں جو آپ کے جلو میں مکہ سے آئے تھے، یہودیوں کا چھوڑا ہوا مال تقسیم کر دیں تو انہیں کچھ اعتراض تو نہ ہوگا۔ انہوں نے یک آواز ہو کر جواب دیا، ''یہودیوں کا مال ہمارے بھائیوں میں تقسیم کر دیجئے، بلکہ ہمارے مال کا بھی کچھ حصہ انہیں دے دیجئے۔ ہم بخوشی اجازت دیتے ہیں'' چنانچہ آنحضرت ﷺ نے یہودیوں کی جائیداد مہاجرین میں اور دو انصاریوں میں جو نہایت غریب تھے تقسیم کر دی[1]

بنی نضیر کی جلاوطنی ربیع الاول ۴ ھ میں ہوئی[2] اس سال کا باقی حصہ اور آئندہ سال کا ابتدائی حصہ خانہ بدوش قبائل کی وقتاً فوقتاً شورشوں اور مدینے پر چند خوں ریز حملوں کی سرکوبی میں صرف ہوا[3]

---

[1] ابن ہشام، ابن الاثیر، طبری۔ اس کے بعد یہ اصول مقرر ہو گیا کہ جنگ کے مالِ غنیمت کے علاوہ اگر کوئی اموال واملاک ہاتھ آئیں تو انہیں مملکت یا رئیس مملکت کی ملکیت سمجھا جائے اور ان کے استعمال کا اختیار صرف رئیس مملکت کو ہو۔ سورۂ حشر میں جن واقعات کی طرف اشارہ ہے وہ تقریباً تمام تر بنی نضیر کی جلاوطنی سے تعلق رکھتے ہیں۔

[2] بقول ابن ہشام وابوالفداء۔ طبری کہتا ہے کہ یہ صفر کا مہینہ تھا۔

[3] اسی قبیل کی ایک وہ مہم تھی جو دومۃ الجندل (جو بقول ابوالفداء دمشق کے جنوب کی طرف سات دن کی مسافت پر واقع تھا) کے عیسائی عربوں کے خلاف بھیجی گئی جنہوں نے مدینہ والوں کے لیے شام کا رستہ بند کر دیا تھا، بلکہ مدینہ پر حملہ کرنے کی دھمکیاں بھی دیتے تھے۔ لیکن یہ قزاق مسلمانوں کے آنے پر بھاگ نکلے۔ اور آنحضرت ﷺ ایک ہمسایہ سردار سے معاہدہ کرنے کے بعد مدینہ واپس آ گئے۔ اس سردار کو آپ ﷺ نے مدینے کی چراگاہوں میں ریوڑ چرانے کی اجازت دی۔ کوسین دی پرسیوال اور طبری۔

اس اثنا میں دشمنانِ دین بھی بے کار نہ رہے تھے۔ کفار نے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے کے لیے دور دراز علاقوں میں اپنے سفیر بھیجے تھے۔ ان کوششوں میں یہود سب سے زیادہ سرگرمی دکھا رہے تھے۔ بنی نضیر کے کچھ لوگوں نے اپنے بھائی بندوں کے ساتھ جو خیبر کے قریب آباد تھے بود و باش اختیار کر لی تھی۔ وہاں انتقام کی آگ سینہ میں بھڑکائے وہ لوگ مسلمانوں کی تباہی کے لیے ایک اور انجمن بنانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ان کی کوششیں ان کی اُمیدوں سے بھی بڑھ کر بار آور ہوئیں۔ ایک زبردست اتحاد وجود میں آ گیا، اور شقی القلب ابوسفیان کی قیادت میں دس ہزار سپاہیوں کی ایک فوج، جو ساز و سامان سے آراستہ تھی، مدینے پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوئی۔ اس کو راستہ میں کوئی مزاحمت پیش نہ آئی، چنانچہ اس نے مدینے سے چند میل کے فاصلے پر رُک کر اُحد کی سمت، جو مدینے کا سب سے غیر محفوظ پہلو تھا، پڑاؤ ڈالا۔

شوال ۵ ھ۔ ۲/ فروری ۶۲۷ء

اس لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمان صرف تین ہزار آدمی جمع کر سکے۔ اپنی تعداد کی قلت اور مدینے کے اندر رہنے والے منافقین کی فتنہ پردازیوں کی وجہ سے، انہیں دشمنوں پر حملہ آور ہونے کی بجائے دفاعی تدابیر اختیار کرنے پر اکتفا کرنا پڑا۔ چنانچہ انہوں نے مدینے کے غیر محفوظ حصوں کے اردگرد ایک گہری خندق کھودی اور اپنے بیوی بچوں کو حفاظت کی خاطر اپنے قلعہ بند مکانوں میں چھوڑ کر شہر کے باہر خندق کے پیچھے پڑاؤ ڈالا۔ جہاں تک شہر کے دوسرے پہلو کا تعلق تھا اس کی حفاظت کے لیے انہوں نے اس پر بھروسہ کیا کہ بنی قریظہ اگر ان کی امداد نہ کریں گے تو کم از کم غیر جانبدار تو رہیں گے۔ مدینہ سے تھوڑی دور جنوب مشرق میں بنی قریظہ کے متعدد قلعے تھے اور معاہدے کی رو سے ان کا فرض تھا کہ وہ ہر حملہ آور کے خلاف مسلمانوں کی امداد کریں، لیکن کفار کے ایما پر انہوں نے عہد شکنی کی اور قریش کے ساتھ مل گئے۔ جب آنحضرت ﷺ کو اُن کی عہد شکنی کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے سعدین، یعنی سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کو اُن کے فرائض کی یاد دہانی کے لیے اُن کے پاس بھیجا۔ انہوں نے سرکشی اور بدمزاجی سے جواب دیا۔ ''کون ہے یہ محمد ﷺ رسول اللہ کہ ہم اس کی اطاعت کریں؟ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں۔''

چونکہ یہودی موقع و محل سے بخوبی واقف تھے اور محاصرہ کرنے والوں کو ایسے مقامات دکھا کر جو دفاع کے نقطہ نظر سے کمزور تھے اُن کی مدد کر سکتے تھے مسلمانوں میں بہت سراسیمگی پھیل گئی۔ اندرونِ شہر میں منافقین کی موجودگی نے خطرہ اور بھی بڑھا دیا[1]۔ جب کفار اور یہود مسلمانوں کو کھلے میدان میں لانے یا یہودی مخبروں کی رہنمائی میں شہر پر ناگہانی حملہ کی کوششوں میں ناکام رہے تو انہوں نے ایک باقاعدہ حملہ کا تہیہ کر لیا۔ انہیں محاصرہ کئے بیس دن ہو چکے تھے۔ صحرا کے آتش زیر پا اور نچلے نہ بیٹھنے والے قبیلے، جنہوں نے مسلمانوں کو آسانی سے ہاتھ آنے والا شکار سمجھ کر قریش اور یہود سے قول و قرار کیا تھا اس طویل محاصرہ سے اُکتا گئے تھے۔ اس نازک مرحلے پر محاصرہ کرنے والی فوج کے سرداروں نے خندق عبور کرنے اور مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت پر ٹوٹ پڑنے کی انتہائی کوششیں کیں لیکن مسلمانوں کی چوکسی نے ان کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ موسم اور حالات نے مل کر محاصرہ کرنے والوں کے خلاف محاذ قائم کر لیا ہے۔ ان کے گھوڑے یکے بعد دیگرے بھوک سے مر رہے تھے اور ان کا سامانِ رسد کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ان میں پھوٹ پڑ رہی تھی، اور مسلمانوں کے دور اندیش سردار نے بے مثال زیرکی سے کام لے کر اس کو اور بھی بڑھا دیا۔ یکایک یہ ٹڈی دل، جس نے مسلمانوں کی ناگزیر تباہی کے آثار پیدا کر دیئے تھے، ہوا میں کافور ہو گیا۔ رات کے اندھیرے میں، جب ایک طوفانِ باد و باراں برپا تھا، دشمنوں کے خیمے اکھڑ اُکھڑ کر گر رہے تھے اور اُن کی روشنیاں گل ہو رہی تھیں، ابوسفیان اپنے ہیبت ناک لشکر کو لے کر بھاگا، اور جو تھوڑے بہت لوگ بچ رہے انہوں نے بنی قریظ کے یہاں پناہ لی۔

---

[1] اس تمام منظر کا مرقع اس خوبصورتی سے قرآن کے سورۂ الاحزاب میں کھینچا گیا ہے کہ میں اس کی چند آیات کا اقتباس پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ''جب ان لوگوں نے تم پر اوپر سے بھی اور نیچے سے چڑھائی کی اور تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور تمہارے کلیجے منہ کو آنے لگے، اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کر رہے تھے، اس وقت مومنوں کا امتحان کیا گیا، اور ان پر شدید لرزہ طاری تھا، اور جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں (شک کا مرض ہے) کہہ رہے تھے کہ ہم سے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے محض دھوکے ہی کا وعدہ کر رکھا ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے رات ہی کو دشمنوں کے انتشار کی پیش گوئی کر دی تھی۔ صبح ہوتے ہی مسلمانوں نے اس پیش گوئی کو پورا ہوتے دیکھ لیا۔ اور خوش خوش شہر میں واپس آئے۔

۵ھ ۲۸/فروری ۶۲۶ء تا ۲۴/مارچ ۶۲۷ء

لیکن جب تک بنی قریظہ اس قدر قریب تھے کہ مدینے کو ان سے ہر وقت خطرہ تھا اس وقت تک مسلمان اپنی فتح کو مکمل نہ سمجھ سکتے تھے۔ بنی قریظہ نے اپنے حلف و اقرار کے باوجود غداری کی تھی بلکہ ایک دفعہ بے خبری میں حملہ بھی کرنے والے تھے۔ اگر وہ ایسا کر پاتے تو اس کا نتیجہ مسلمانوں کا قتل عام ہوتا۔ اس لیے مسلمانوں نے ان کی غداری کا جواب طلب کرنا فرض سمجھا۔ یہود نے اپنی ہٹ پر قائم رہ کر جواب دینے سے انکار کر دیا۔ نتیجۃً یہودیوں کا محاصرہ کر لیا گیا اور وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے صرف ایک شرط پیش کی۔ وہ یہ کہ ان کے بارے میں فیصلہ بنی اوس کے سردار سعد ابن معاذ پر چھوڑ دیا جائے۔ سعد بن معاذ ایک تند مزاج سپاہی تھے۔ وہ حملہ کے درمیان زخمی ہوئے تھے (اور ان زخموں ہی کی وجہ سے انہوں نے کچھ مدت بعد وفات پائی) یہودیوں کے غدارانہ طرز عمل پر غضبناک ہو کر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے جنگ کے قابل آدمی قتل کر دیئے جائیں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو مسلمانوں کی غلامی میں لے لیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلہ پر عمل کیا گیا۔ لیکن پول لکھتا ہے۔ "یہ ایک ایسا سخت اور خونین فیصلہ تھا جو البی پر حملہ کرنے والی کلیسائی افواج کے جرنیلوں کو زیب دیتا تھا، یا اس کی مثال آکسٹن دور کے پیورٹینوں کے ہاں ملتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان لوگوں کا جرم مملکت سے غداری تھا اور وہ بھی ایک محاصرے کے دوران، اور جن لوگوں نے تاریخ میں یہ پڑھا ہے کہ ولنگٹن کی فوج جس راستے سے گزری اس کی نشاندہی مفرور سپاہیوں اور لوٹ مار کرنے والوں کی لاشیں کرتی تھیں جو درختوں پر لٹکی ہوئی تھیں، انہیں ایک غدار قبیلے کے ایک سرسری فیصلہ کی رو سے قتل کئے جانے پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔

مختلف یہودی قبائل کو جو سزا دی گئی اس نے میور، اسپرینگر وائل اور اوز برن جیسے آنحضرت ﷺ کے سوانح نگاروں کے لیے آپ ﷺ پر حملے کرنے کا ایک موقع مہیا کر دیا ہے۔ بنی قینقاع اور بنی نضیر کو جو سزا دی گئی وہ اس سزا سے بہت ہلکی تھی جس کے وہ

چونکہ یہودی موقع و محل سے بخوبی واقف تھے اور محاصرہ کرنے والوں کو ایسے مقامات دکھا کر جو دفاع کے نقطہ نظر سے کمزور تھے اُن کی مدد کر سکتے تھے مسلمانوں میں بہت سراسیمگی پھیل گئی۔ اندرونِ شہر میں منافقین کی موجودگی نے خطرہ اور بھی بڑھا دیا[1]۔ جب کفار اور یہود مسلمانوں کو کھلے میدان میں لانے یا یہودی مخبروں کی رہنمائی میں شہر پر ناگہانی حملہ کی کوششوں میں ناکام رہے تو انہوں نے ایک باقاعدہ حملہ کا تہیہ کر لیا۔ انہیں محاصرہ کئے بیس دن ہو چکے تھے۔ صحرا کے آتش زیر پا اور نچلے نہ بیٹھنے والے قبیلے، جنہوں نے مسلمانوں کو آسانی سے ہاتھ آنے والا شکار سمجھ کر قریش اور یہود سے قول و قرار کیا تھا اس طویل محاصرہ سے اُکتا گئے تھے۔ اس نازک مرحلے پر محاصرہ کرنے والی فوج کے سرداروں نے خندق عبور کرنے اور مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت پر ٹوٹ پڑنے کی انتہائی کوششیں کیں لیکن مسلمانوں کی چوکسی نے ان کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ موسم اور حالات نے مل کر محاصرہ کرنے والوں کے خلاف محاذ قائم کر لیا ہے۔ ان کے گھوڑے یکے بعد دیگرے بھوک سے مر رہے تھے اور ان کا سامانِ رسد کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ان میں پھوٹ پڑ رہی تھی، اور مسلمانوں کے دور اندیش سردار نے بے مثال زیرکی سے کام لے کر اس کو اور بھی بڑھا دیا۔ یکایک یہ ٹڈی دل، جس نے مسلمانوں کی ناگزیر تباہی کے آثار پیدا کر دیئے تھے، ہوا میں کافور ہو گیا۔ رات کے اندھیرے میں، جب ایک طوفانِ بادوباراں برپا تھا، دشمنوں کے خیمے اکھڑ اُکھڑ کر گر رہے تھے اور اُن کی روشنیاں گل ہو رہی تھیں، ابوسفیان اپنے ہیبت ناک لشکر کو لے کر بھاگا، اور جو تھوڑے بہت لوگ بچ رہے انہوں نے بنی قریظہ کے یہاں پناہ لی۔

---

[1] اس تمام منظر کا مرقع اس خوبصورتی سے قرآن کے سورۂ الاحزاب میں کھینچا گیا ہے کہ میں اس کی چند آیات کا اقتباس پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ''جب ان لوگوں نے تم پر اوپر سے بھی اور نیچے سے چڑھائی کی اور تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور تمہارے کلیجے منہ کو آنے لگے، اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کر رہے تھے، اس وقت مومنوں کا امتحان کیا گیا، اور ان پر شدید لرزہ طاری تھا، اور جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں (شک کا مرض ہے) کہہ رہے تھے کہ ہم سے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے محض دھوکے ہی کا وعدہ کر رکھا ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے رات ہی کو دشمنوں کے انتشار کی پیش گوئی کر دی تھی۔ صبح ہوتے ہی مسلمانوں نے اس پیش گوئی کو پورا ہوتے دیکھ لیا۔ اور خوش خوش شہر میں واپس آئے۔

۵ھ ۲۸/فروری ۶۲۶ء تا ۲۴/مارچ ۶۲۷ء

لیکن جب تک بنی قریظہ اس قدر قریب تھے کہ مدینے کو ان سے ہر وقت خطرہ تھا اس وقت تک مسلمان اپنی فتح کو مکمل نہ سمجھ سکتے تھے۔ بنی قریظہ نے اپنے حلف و اقرار کے باوجود غداری کی تھی بلکہ ایک دفعہ بے خبری میں حملہ بھی کرنے والے تھے۔ اگر وہ ایسا کر پاتے تو اس کا نتیجہ مسلمانوں کا قتل عام ہوتا۔ اس لیے مسلمانوں نے ان کی غداری کا جواب طلب کرنا فرض سمجھا۔ یہود نے اپنی ہٹ پر قائم رہ کر جواب دینے سے انکار کر دیا۔ نتیجۃً یہودیوں کا محاصرہ کر لیا گیا اور وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے صرف ایک شرط پیش کی۔ وہ یہ کہ ان کے بارے میں فیصلہ بنی اوس کے سردار سعد ابن معاذ پر چھوڑ دیا جائے۔ سعد بن معاذ ایک تند مزاج سپاہی تھے۔ وہ حملہ کے درمیان زخمی ہوئے تھے (اور ان زخموں ہی کی وجہ سے انہوں نے کچھ مدت بعد وفات پائی) یہودیوں کے غدارانہ طرز عمل پر غضبناک ہو کر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے جنگ کے قابل آدمی قتل کر دیے جائیں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو مسلمانوں کی غلامی میں لے لیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلہ پر عمل کیا گیا۔ لیکن پول لکھتا ہے۔ ''یہ ایک ایسا سخت اور خونین فیصلہ تھا جو ابلی پر حملہ کرنے والی کلیسائی افواج کے جرنیلوں کو زیب دیتا تھا، یا اس کی مثال آگسٹن دور کے پیورٹینوں کے ہاں ملتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان لوگوں کا جرم مملکت سے غداری تھا اور وہ بھی ایک محاصرے کے دوران، اور جن لوگوں نے تاریخ میں یہ پڑھا ہے کہ ولنگٹن کی فوج جس راستے سے گزری اس کی نشاندہی مفرور سپاہیوں اور لوٹ مار کرنے والوں کی لاشیں کرتی تھیں جو درختوں پر لٹکی ہوئی تھیں، انہیں ایک غدار قبیلے کے ایک سرسری فیصلہ کی رو سے قتل کیے جانے پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔

مختلف یہودی قبائل کو جو سزا دی گئی اس نے میور، اسپرینگر وائل اور اوزبرن جیسے آنحضرت ﷺ کے سوانح نگاروں کے لیے آپ ﷺ پر حملے کرنے کا ایک موقع مہیا کر دیا ہے۔ بنی قینقاع اور بنی نضیر کو جو سزا دی گئی وہ اس سزا سے بہت ہلکی تھی جس کے وہ

مستحق تھے۔ صرف بنی قریظہ کے ساتھ سختی برتی گئی۔

انسانی فطرت کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ کسی شخص کے افعال چاہے کتنے ہی مجرمانہ ہوں، اگر اس سے ایسا برتاؤ کیا جائے جو ہمیں درشت یا ظالمانہ معلوم ہوتا ہے تو ہماری طبیعت میں قدرتی طور پر اس برتاؤ کے خلاف ایک جذبہ بغاوت پیدا ہو جاتا ہے اور رحم انصاف پر غالب آ جاتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بنی قریظہ کو جو سزا دی گئی وہ ہمارے نقطہ نگاہ سے سخت تھی، لیکن اس امر پر چاہے کتنا ہی افسوس کیوں نہ ہو کہ ان لوگوں کی قسمت کا فیصلہ (اگرچہ خود ان کی درخواست پر) ایک غضبناک سپاہی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا، اور چاہے ہمیں اس امر پر بھی کتنا ہی افسوس کیوں نہ ہو کہ اس شخص کے فیصلے پر فوراً عمل کیا گیا، پھر بھی ہمیں جذبات رحم سے متاثر ہو کر جرم اور اس کی منصفانہ سزا کے مسئلہ کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔ ہمیں ان لوگوں کے جرائم کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے...... ان کی غداری، ان کی کھلم کھلا دشمنی اور ان کا ایک ایسے معاہدہ سے انحراف جس کی پابندی کا انہوں نے حلف اُٹھایا تھا۔ ہمیں ان ترغیبات کو بھی نہ بھولنا چاہیے جو پاک یہواہ کے یہ پرستار کفارِ عرب کو بت پرستی کی رسم جاری رکھنے کے لیے دیتے تھے۔ ممکن ہے کہ بعض مسلمان عیسائی ناصحِ اخلاق کے ہمنوا ہو کر یہ کہنے پر مائل ہوں: "برے لوگوں کا ایک بار نہیں بلکہ سو بار تباہ کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو جو ابھی تک بے گناہ ہیں اپنی جماعت میں شامل ہونے کی ترغیب دیں۔"

یہ مسلمان اس ناصح کے ہمنوا ہو کر اور صرف ایک لفظ میں تصرف کر کے، یہ بھی کہہ سکتے: "آیئے ہم ذرا اس پر غور کریں کہ ہمارا اور تمام دوسری اقوام کا جو اس وقت آسمان کے نیچے آباد ہیں کیا حشر ہوتا اگر عربوں[۱] کی تلوار اپنا کام پوری طرح انجام نہ دیتی۔ عربوں کی تلوار نے اپنے خونین سے خونین قتال میں بھی دنیا کے تمام ملکوں کے حق میں ایک ایسا کارِ رحمت انجام دیا جو رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔" اگر عیسائی کا استدلال صحیح ہے اور خلاف انسانیت نہیں ہے تو یقیناً مسلمان کا استدلال بھی صحیح ہے اور خلاف انسانیت نہیں ہے۔ بہر حال ممکن ہے کہ بنی قریظہ کو جو خوفناک سزا دی گئی اسے دوسرے مسلمان اسی

۱ اصل عبارت میں "اسرائیلیوں" کا لفظ ہے۔

روشنی میں دیکھیں جس میں کارلائل ڈروگیڈا کے باشندوں کے بارے میں کرامویل کے حکم قتل عام کو دیکھتا ہے: "یہ ایک مسلح سپاہی اس ایقانی شعور کے ساتھ کہ وہ خدا کا سپاہی ہے (اور یہ ایک ایسا شعور ہے جو تمام سپاہیوں اور تمام انسانوں کو ہر وقت رکھنا چاہیے) ایک مسلح سپاہی، فرشتہ اجل کی طرح ہیبت ناک' تقدیر کی طرح بے رحم، خدا کے دشمنوں کو خدائی فیصلہ کے مطابق سزا دیتا ہے۔"

لیکن ان یہودیوں کو جو سزا دی گئی ہم اسے ان دونوں میں سے کسی ایک نقطہ نگاہ سے بھی نہیں دیکھتے۔ ہم اسے خالصتاً ایک ایسا عمل سمجھتے ہیں جو ان قوانینِ جنگ کے مطابق کیا گیا جو اس وقت اقوامِ عالم میں رائج تھے: "اس زمانہ کے مسلمہ آدابِ جنگ کا پورا پورا اطلاق۔ ان لوگوں پر جو کچھ گزری وہ ان کے اپنے کیئے کی سزا تھی۔ اگر انہیں سعد بن معاذ کے فیصلہ کے بغیر بھی قتل کر دیا جاتا تو یہ اس زمانے کے قوانین کے بالکل مطابق ہوتا۔ لیکن انہوں نے خود سعد بن معاذ کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے انتخاب کیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ سعد کا فیصلہ مسلمہ قوانین کے منافی نہیں ہے۔ اسی لیے انہوں نے کوئی عذر پیش نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر فتح ان کی ہوئی ہوتی تو وہ اپنے دشمنوں کو کسی تردد یا تامل کے بغیر ذبح کر ڈالتے۔ لوگ حضرت داؤد علیہ السلام کی خوں ریزیوں کو اس وقت کی "روشنی میں" دیکھتے ہیں[1] عیسائیوں نے ابتدائی ایام میں کشت و خون کا جو بازار گرم کیا وہ بھی خاص "روشنیوں" میں دیکھا جاتا ہے۔ پھر ابتدائی مسلمانوں کی دفاعی لڑائیاں اسی نقطہ نگاہ سے کیوں نہ دیکھی جائیں؟ بہر حال، نقطہ نظر چاہے کوئی بھی ہو، بے تعصب طبائع تسلیم کریں گی کہ بنی قریظہ کے قتل کے لیے پیغمبر اسلام ﷺ کو کسی طرح موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مقتولین کی تعداد زیادہ سے زیادہ دو اڑھائی سو تھی۔

کہا جاتا ہے کہ بقیۃ السیف کی تقسیم میں ریحانہ نام کی ایک نوجوان یہودن آنحضرت ﷺ کے حصہ میں آئی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ تقسیم سے پہلے ہی آپ ﷺ کے لیے الگ کر لی گئی تھی۔ عیسائی مؤرخین جو ہر وقت آنحضرت ﷺ پر حملہ کرنے کے موقع کی تاک میں

---

[1] سموئیل ۲-۱۲ "اور اس نے ان لوگوں (یعنی ہارے ہوئے بنی عمون) کو جو اس میں تھے) باہر نکال کر اُن کو آروں اور لوہے کے ہینگوں اور لوہے کے کلہاڑوں کے نیچے کر دیا اور ان کو اینٹوں کے پزاوے میں سے چلوایا......"

رہتے ہیں، اس افسانہ سے بھی ناجائز فائدہ اُٹھانے سے نہیں چوکے۔ غلامی کے موضوع سے ہم ایک آئندہ باب میں بحث کریں گے۔ یہاں ہم صرف اتنا بتا دینے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ ریحانہ آنحضرتؐ کے حصہ میں آئی تو پھر بھی ہمیں جدید خیالات کے نقطہ نگاہ سے اس پر نکتہ چینی کرنے کا کوئی حق نہیں، کیونکہ اس وقت جنگ کے جو مانے ہوئے دستور تھے۔ یہ تقسیم بالکل ان کے مطابق تھی۔ ریحانہ کے آنحضرتؐ کی زوجیت میں آنے کی کہانی سراسر جھوٹ ہے، کیونکہ اس واقعہ کے بعد اس کا کوئی تذکرہ تاریخ کے اوراق میں نہیں ملتا، حالانکہ آپؐ کی سب ازواجِ مطہرات کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

چھٹا باب

آنحضرت ﷺ کی رحمدلی

دَعَا اِلی اللہ فالمُستمسکون بہٖ
مُستمسکونَ بحَبْلٍ غیرِ مُنقصِمٖ

۶ھ ۲۳/اپریل ۶۲۷ء تا ۱۲/اپریل ۶۲۸ء

مدینے کی نئی دولتِ عامہ کی تباہی و بربادی کے لیے یہود و کفار نے جو زبردست اتحاد قائم کیا تھا وہ یکسر ناکام ہو چکا تھا اور ایسے طور پر کہ مسلمانوں کے لیے یہ ایک معجزہ تھا۔ لیکن قرب و جوار کے وحشی اور خونخوار قبائل حدودِ مدینہ کے اندر لوٹ مار اور کشت و خون کرتے رہتے تھے۔ مملکت کی بقاء متقاضی تھی کہ ان کی سرکوبی کے لیے سخت اقدامات کیے جائیں۔ ان غارت گروں کے خلاف کئی مہمیں بھیجی گئیں لیکن یہ گریز پا ابنائے صحرا مسلمانوں کی آمد کی خبر سنتے ہی غائب ہو جاتے تھے۔ بنی لحیان، جنہوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کر کے ارکانِ اسلام کی تعلیم کے لیے چند مبلغ اپنے علاقے میں بلوائے تھے اور اُن کے آتے ہی بعضوں کو تو قتل کر دیا تھا اور بعضوں کو اہلِ مکہ کے ہاتھ بیچ دیا تھا، انہیں ابھی تک کوئی سزا نہ دی گئی تھی۔ لیکن اب اس جرم کی سزا دینے کا وقت آ گیا تھا۔ اس سال جمادی الاول میں فوج کا ایک دستہ آنحضرت ﷺ کے زیرِ قیادت بنی لحیان کے خلاف روانہ ہوا، لیکن ان قزاقوں کو آنحضرت ﷺ کے آنے کی بروقت اطلاع مل گئی اور وہ بھاگ کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ چنانچہ فوجی دستہ اپنے مقصد کی تکمیل کیے بغیر مدینہ واپس آ گیا۔

تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ خانہ بدوش بنی غطفان کی ایک شاخ بنی فزارہ نے مضافاتِ شہر کے کھلے حصہ پر اچانک حملہ کر دیا، مسلمانوں کے اونٹ ہانک کر لے گئے، جو آدمی اُن کی خبر گیری کر رہا تھا اُسے قتل کر دیا اور اس کی بیوی کو اُٹھا کر لے گئے۔ مسلمانوں نے فوراً ان کا تعاقب کیا اور چند اونٹ واپس لے آئے، لیکن بدوی لوٹے ہوئے مال کا باقی حصہ لے کر صحرا کی طرف بھاگ گئے۔

اسی زمانہ کے لگ بھگ آنحضرت ﷺ نے کوہِ سنائی کے قریب واقع راہب خانۂ سینٹ کیتھرین کے راہبوں کو، بلکہ سارے عیسائیوں کو ایک سند نامہ حقوق عطا فرمایا جس کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ دنیا کی تاریخ روشن خیالی اور رواداری کی جو اشرف ترین یادگاریں پیش کر سکتی ہے یہ ان میں سے ایک ہے۔ یہ دستاویز' جسے مورخینِ اسلام نے حرف بحرف قلم بند کیا ہے، وسعتِ نظر اور آزادیٔ خیال کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ اس دستاویز کی رو سے عیسائیوں کو چند ایسی استثنائی مراعات حاصل ہوئیں جو انہیں اپنے ہم مذہب حکمرانوں کے تحت بھی نصیب نہ ہوئی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے اعلان کر دیا کہ اس دستاویز میں جو احکام مندرج ہیں اگر کوئی مسلمان ان کی خلاف ورزی کرے گا یا ان سے ناجائز فائدہ اُٹھائے گا تو اسے معاہدہ الٰہی سے روگردانی کرنے والا، اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والا اور اس کے دین کی تذلیل کرنے والا تصور کیا جائے گا۔ آپ ﷺ نے عیسائیوں کی حفاظت، ان کے گرجاؤں اور ان کے پادریوں کے مکانوں کی پاسبانی اور انہیں ہر طرح کے گزند سے بچانے کی ذمہ داری اپنی ذات پر بھی اور اپنے متبعین پر بھی عائد کی۔ عیسائیوں سے یہ وعدہ کیا گیا کہ ان پر کوئی ناجائز ٹیکس نہ لگائے جائیں گے، ان کا کوئی پادری اپنے علاقے سے نہ نکالا جائے گا کسی عیسائی کو اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا، کسی راہب کو اس کے راہب خانے سے خارج نہ کیا جائے گا اور کسی زائر کو سفرِ زیارت سے نہ روکا جائے گا۔ ان کو اس کی بھی ضمانت دی گئی کہ مسجدیں یا مسلمانوں کے رہنے کے مکان بنانے کے لیے کوئی گرجا مسمار نہ کیا جائے گا۔ جن عیسائی عورتوں نے مسلمانوں سے شادی کر رکھی تھی ان کو یقین دلایا گیا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہنے کی مجاز ہوں گی اور اس بارہ میں ان پر کوئی جبر واکراہ نہ کیا جائے گا۔

اگر عیسائیوں کو اپنے گرجاؤں یا خانقاہوں کی مرمت کے لیے یا اپنے مذہب کے کسی اور امر کے بارے میں امداد کی ضرورت ہو گی تو مسلمان انہیں امداد دیں گے۔ اس امداد کو ان کے مذہب میں شریک ہونے سے تعبیر نہ کیا جائے گا۔ بلکہ اسے حاجت مندوں کی حاجت براری اور خدا اور رسول ﷺ کے ان احکام کی اطاعت سمجھا جائے گا جو عیسائیوں کے حق میں صادر کئے گئے تھے۔ اگر مسلمان کسی بیرونی عیسائی طاقت سے برسرِ جنگ ہوں گے تو مسلمانوں کی حدود کے اندر رہنے والے کسی عیسائی سے اس کے مذہب کی بناء پر حقارت کا برتاؤ نہ کیا جائے گا۔ اگر کوئی مسلمان کسی عیسائی سے ایسا برتاؤ کرے گا تو وہ رسول ﷺ کی نافرمانی کا مرتکب تصور ہو گا۔

جو شخص بدی کا بدلہ بدی سے دینے کی طاقت رکھتا ہو، لیکن اس کے باوجود عفو کے خدائی اصول کی نہ صرف تلقین کرے بلکہ اس پر عمل بھی کرے، اس کی سیرت سے متعلق انسانوں کے دل میں ہمیشہ عظمت و بزرگی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ جب آنحضرت ﷺ رئیسِ مملکت اور رعایا کی جان و آزادی کے محافظ کی حیثیت سے عدل کرتے تھے تو آپ ﷺ ہر مجرم کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دیتے تھے۔ لیکن رسولِ خدا ﷺ اور معلّمِ اسلام کی حیثیت سے اپنے بدترین دشمنوں سے بھی نرمی اور رحم کا سلوک کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی ذات میں وہ افضل ترین صفات جن کا تصور انسان کر سکتا ہے، یعنی عدل اور رحم مجتمع تھیں۔

مسلمانوں نے شورش پسند بدویوں کے خلاف جو مہمیں بھیجیں ان میں سے ایک میں قبیلۂ حنیفہ کا ایک سردار ثمامہ بن اُثال گرفتار ہوا۔ وہ مدینہ میں لایا گیا جہاں وہ آنحضرت ﷺ کے کریمانہ برتاؤ سے اتنا متاثر ہوا کہ دشمنی ترک کر کے آپ ﷺ کا جاں نثار ترین پیرو بن گیا۔ اس نے اپنے قبیلہ میں واپس جا کر یمامہ سے کھانے پینے کی چیزیں مکے بھجوانا بند کر دیا۔ اس سے مکے میں کھانے پینے کی چیزوں کی بڑی تنگی ہو گئی۔ بنی حنیفہ کو راضی کرنے سے عاجز آ کر انہوں نے بالآخر آنحضرت ﷺ سے رجوع کیا اور ان سے مداخلت کی درخواست کی۔ آپ ﷺ کو ان کی حالت پر رحم آ گیا اور آپ ﷺ نے ثمامہ سے سفارش کی کہ بنی حنیفہ مکہ کو ضرورت کی چیزیں بہم پہنچنے دیں۔ چنانچہ ثمامہ کے کہنے پر

کاروانوں کو لُکے جانے کی از سرِ نو اجازت مل گئی۔

آنحضرت ﷺ کی رحم دلی کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن ہم صرف دو مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ آنحضرت ﷺ کی ایک صاحبزادی، جو آپ ﷺ کو بہت عزیز تھیں، صلح حدیبیہ کے بعد مکے سے ہجرت کر رہی تھیں۔ وہ اس وقت حاملہ تھیں۔ جب وہ اونٹ پر سوار ہو رہی تھیں تو ہبار نامی ایک قریش نے اپنے نیزے کا دستہ ان کے اس زور سے مارا کہ وہ گر کر زمین پر آ رہیں اور اس کے نتیجہ میں کچھ مدت کے بعد وفات پا گئیں۔ فتح مکہ کے بعد ہبار کو اشتہاری قاتل قرار دیا گیا۔ کچھ دنوں تک روپوش رہنے کے بعد وہ خود بخود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے رحم کا ملتجی ہوا۔ اس کا جرم نہایت سنگین تھا، لیکن آنحضرت ﷺ کو جو صدمہ پہنچا تھا وہ ذاتی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قاتل اپنے کئے پر پشیمان ہے اور سچے دل سے ایمان لایا ہے۔ چنانچہ اسے غیر مشروط طور پر معافی دے دی گئی۔ اسی طرح ایک یہودن جس نے آنحضرت ﷺ کو خیبر میں زہر دیا اور عکرمہ بن ابوجہل جسے آنحضرت ﷺ سے شدید ذاتی دشمنی تھی؛ دونوں معاف کر دیئے گئے۔

عیسائی بدویوں کا ایک قبیلہ (بنی کلب)، جو دومتہ الجندل کے قریب رہتا تھا، لوٹ مار کرتا ہوا حدود مدینہ تک آ پہنچا۔ ان لوگوں کو دعوتِ اسلام دینے اور انہیں قانون شکنیوں سے منع کرنے کے لیے ایک مہم بھیجی گئی۔ اس مہم کے سربراہ کو ہدایات دیتے وقت آنحضرت ﷺ نے یہ قابلِ یادگار الفاظ ارشاد فرمائے: ''کسی حالت میں بھی فریب یا دغا بازی سے کام نہ لینا اور کسی بچے کو قتل نہ کرنا۔''[1]

جتنی مہمیں بھی غارت گر اور دشمن قبائل کے خلاف بھیجی جاتی تھیں ان کے سرداروں کو آپ ﷺ ہمیشہ یہ تاکیدی حکم دیتے تھے کہ کمزوروں کو ہرگز نہ ستایا جائے۔ آپ ﷺ

---

[1] ابن ہشام۔ رسولِ عربی ﷺ کی ان ہدایات اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ جو آپ ﷺ نے یزید بن ابوسفیان کو مہمِ بازنطین پر روانہ کرتے وقت ارشاد فرمائے۔ ان دونوں کا مقابلہ اسرائیلی پیغمبر کے الفاظِ ذیل سے کیجئے:
''ربّ الافواج یوں فرماتا ہے...... سو اب تو جا اور عمالیق کو مار اور جو کچھ ان کا ہے سب کو بالکل نابود کر دے اور ان پر رحم مت کر بلکہ مرد اور عورت، ننھے بچے اور شیرخوار، گائے بیل اور بھیڑ بکریاں، اونٹ اور گدھے سب کو قتل کر ڈال۔'' سیموئیل ۱۵ : ۲-۳ ''تم بوڑھوں اور جوانوں اور لڑکیوں اور ننھے بچوں اور عورتوں کو بالکل مار ڈالو......''

نے جو فوج بازنطینیوں کے خلاف روانہ کی اس سے مخاطب ہو کر آپ ﷺ نے فرمایا:
"ہمیں جو گزند پہنچائے گئے ہیں ان کا انتقام لیتے وقت ایسے بے ضرر لوگوں کو تنگ نہ کرنا جو اپنے گھروں میں خلوت نشین ہیں۔ طبقہ اناث کی کمزوری کا لحاظ رکھنا، دودھ پیتے بچوں اور صاحب فراش بیماروں کو تکلیف نہ دینا۔ جو لوگ تمہارے مقابلہ پر نہ آئیں ان کے مکانوں کو مسمار نہ کرنا، ان کے ذریعۂ معاش اور ان کے پھلدار درختوں کو تباہ نہ کرنا اور کھجور کے درختوں کو ہاتھ نہ لگانا۔" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے آقا کے تتبع میں اپنے سردار فوج کو یہ ہدایات دیں: "اے یزید! اپنے لوگوں پر ظلم وستم نہ کرنا اور انہیں پریشان نہ کرنا، بلکہ اپنے تمام معاملات میں ان کا مشورہ لینا اور وہی کرنا جو حق اور مبنی بر انصاف ہو، کیونکہ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کے کاموں میں کبھی برکت نہیں ہوتی۔ جب دشمن تمہارے سامنے آئے تو مردانہ وار اس کا مقابلہ کرنا اور اُسے پیٹھ نہ دکھانا اور اگر تمہیں فتح نصیب ہو تو چھوٹے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجور کے درختوں کو تباہ نہ کرنا اور غلے کے کھیتوں کو نہ جلانا، کوئی ثمر دار درخت نہ کاٹنا اور مویشیوں کو کوئی گزند نہ پہنچانا، الا یہ کہ تم انہیں خوراک کے لیے ذبح کرو۔ جب تم کوئی معاہدہ یا پیمان کرو تو اس پر قائم رہو اور اپنا قول پورا کرو۔ جب تم آگے بڑھو گے تو تمہیں کچھ ایسے دیندار لوگ ملیں گے جو راہب خانوں میں رہتے ہیں۔ انہوں نے خدا کی بندگی کا یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ ان سے تعرض نہ کرنا، نہ انہیں قتل کرنا اور نہ ان کے راہب خانوں کو مسمار کرنا۔" عیسائیوں نے، خواہ وہ کیتھولک تھے، یا پروٹسٹنٹ یا یونانی کلیسا کے پیرو، سینٹ لکٹانٹس کے زمانہ سے لے کر کوینانٹروں کے زمانے تک اپنے دشمنوں پر جو خوفناک پھنکاریں بھیجیں، ان میں اور ان ہدایات میں کتنا عجیب تباین ہے...... [1]"شہزادۂ امن" (The Prince Of Peace) کے پیرو زمانہ حال تک انتہائی بے دریغی سے آبروریزی، خانہ سوزی، تاخت وتاراج اور جوانوں اور بوڑھوں، مردوں اور عورتوں کے بلاتمیز قتل میں مشغول رہے ہیں۔ روئے ارض پر ان کے نائب کیا پوپ اور کیا بطریق، کیا بشپ اور کیا پادری، ان جرائم کو نگاہ

---

[1] بیسویں صدی میں ایک عظیم عیسائی طاقت کی فوجوں نے مانچوریا کے مقام بلاگووشنک پر پانچ ہزار چینی مردوں، عورتوں اور بچوں کا جو قتلِ عام کیا وہ محتاجِ بیان نہیں۔

استحسان سے دیکھتے رہے ہیں اور اکثر انتہا درجہ کے انسانیت سوز مظالم سے مکمل بریت کے فتوے دیتے رہے ہیں۔

اسی سال ماہِ شعبان (نومبر دسمبر ۶۲۷ء) میں بنی مصطلق کے خلاف ایک مہم روانہ کی گئی۔ ان لوگوں کے اب تک مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رہے تھے لیکن اپنے سردار حارث بن ابی ضرار کی تحریک پر انہوں نے رشتہ اتحاد توڑ دیا اور مضافاتِ مدینہ پر چھاپے مارنے لگے۔ یہ مہم پورے طور پر کامیاب ہوئی۔ اور بہت سے لوگ قید ہوئے جن میں جویریہ بنتِ حارث بھی تھیں۔

مہاجرینِ مکہ کو اپنے دین کی خاطر اور اس ذاتِ باری کی خاطر جس نے ان کے اندر ایک بالکل نیا شعور حلول کر دیا تھا اور اتحاد، محبت واخوت کی روح بیدار کر دی تھی اپنا وطن چھوڑے ہوئے اب چھ سال ہو گئے تھے۔ عرب کے گوشے گوشے سے لوگ جوق در جوق اس حیرت انگیز انسان کے الفاظ سننے آتے تھے جس نے یہ سب کچھ کر دکھایا تھا اور وہ آ کر اس سے اپنی روزانہ زندگی کے معاملات کے بارے میں مشورہ لیتے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح زمانہ قدیم میں بنی اسرائیل سموئیل نبی سے مشورے لیا کرتے تھے۔

لیکن ان غریب الدیاروں کے دل ابھی تک اپنے مولد کے لئے ترستے تھے، اپنے گھروں کو چھوڑنے پر مجبور ہو کر انہوں نے ایک اجنبی شہر میں پناہ لی تھی۔ وہ اس مقدس حرمِ کعبہ سے نکالے گئے تھے، جو ان کی ہر طرح کی راہ و رسم کا شاندار مرکز اور ان کی قومی تاریخ کا واحد محور تھا۔ چھ سال سے وہ اس مقدس معبد کی زیارت سے محروم تھے، جو ایک ایسا دستور تھا جس کے گرد مرورِ زمانہ نے اپنی عتیق روایات کے ساتھ تقدس کا ہالہ ڈال دیا تھا۔ خود پیغمبرِ اسلام کے دل میں اپنے وطن کو دیکھنے کی اتنی ہی آرزو تھی۔ کعبہ کی عبادت گاہ تمام عرب قوم کی ملکیت تھی۔ قریش اس عبادت گاہ کے صرف محافظ تھے اور ملک کا قانون انہیں اس امر کا کوئی اختیار نہ دیتا تھا کہ اگر کوئی دشمن بھی کسی معاندانہ نیت کے بغیر اور اپنے فرائض مذہبی ادا کرنے کی غرض سے کعبہ میں آئے تو اسے داخل ہونے سے روک دیں۔

زیارتِ کعبہ کا موسم قریب آ گیا تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ نے عمرہ کی نیت کی

منادی کرادی۔ فوراً ایک ہزار آوازوں نے لبیک کہا۔ جلدی جلدی تیاریاں کی گئیں اور آنحضرت ﷺ سات سو انصار و مہاجرین کو ہمراہ لیے، جو سب کے سب غیر مسلح تھے، عازم کعبہ ہوگئے۔[1] لیکن قریش کی آتشِ عناد ابھی تک نہ بجھی تھی۔ وہ زائرین کا راستہ روکنے کے لیے ایک فوج کثیر لے کر کے سے چند میل باہر آکر کھڑے ہوگئے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد شہر کی طرف پلٹ گئے، تاکہ شہر کے اندر جانے کے تمام راستے بند کر دیں۔ انہوں نے حلف اٹھائے کہ آنحضرت ﷺ کے متبعین کو حرمِ کعبہ میں داخل نہ ہونے دیں گے اور مسلمانوں نے جو سفیر زیارت کعبہ کی اجازت لینے کے لیے ان کے پاس بھیجا تھا اس کے ساتھ بہت بدسلوکی کی۔ مکیوں کا ایک گروہ مسلمانوں کے خیموں کے اردگرد چکر لگانے لگا، اس ارادہ سے کہ اگر کوئی مسلمان خیمہ گاہ سے باہر نکلے تو اسے قتل کر دیں۔ اور تو اور انہوں نے آنحضرت ﷺ پر بھی پتھر اور تیر برسائے[2]۔ جب آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ کفار ٹس سے مس نہیں ہوتے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں اور قریش کی جنگ کو ختم کرنے کے لیے اہلِ مکہ کی تمام شرائط مان لینے پر رضامندی ظاہر کی۔ بڑی ردّ و کد کے بعد ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ لڑائی دس سال کے لیے ملتوی کر دی جائے۔ اگر قریش میں سے کوئی شخص اپنے سردار یا مربی کی اجازت کے بغیر آنحضرت ﷺ کے پاس چلا آئے تو اُسے واپس کر دیا جائے گا۔ اگر کوئی مسلمان اہلِ مکہ کے پاس جائے تو اُسے واپس نہ کیا جائے گا۔ اگر کوئی قبیلہ قریش یا مسلمانوں سے اتحاد کرنا چاہے تو اُسے بلا مزاحمت اس کی اجازت ہوگی۔ اس سال مسلمان وہیں سے واپس چلے جائیں گے اور آئندہ سال انہیں

---

[1] ابن ہشام، طبری، ابن الاثیر۔ ابو الفداء کہتا ہے کہ آپ ﷺ کے ہمراہیوں کی تعداد ۱۴۰۰ تھی۔

[2] ان پتھر اور تیر برسانے والے لوگوں میں سے کچھ لوگ پکڑے گئے اور آنحضرت ﷺ کے سامنے لائے گئے تو آپ ﷺ نے انہیں معاف کر دیا اور چھوڑ دیا (ابن ہشام) اس موقع پر مسلمانوں نے وہ بیعت کی جو بیعت الرضوان یا بیعت الشجر کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دوسرا قاصد بنا کر قریش کے پاس بھیجا گیا تو قریش نے انہیں نرغے میں لے لیا۔ مسلمانوں کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ مبادا حضرت عثمان قتل کر دیے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے گرد جمع ہو کر قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کی قسم کھائی (ابن ہشام) سورۂ فتح ۱۸۔ میور نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔

اجازت ہوگی کہ صرف اپنے سفری[1] ہتھیار (یعنی تلواریں نیام میں اور نیام جلبان میں) لیے ہوئے مکے میں داخل ہوں اور تین دن تک مکے میں قیام کریں۔

اس معاہدہ صلح میں آنحضرت ﷺ نے جس اعتدال اور عالی ظرفی سے کام لیا وہ آپ ﷺ کے بعض جوشیلے متبعین کو، جن کے دلوں میں قریش کی زیادتیوں اور بے رحمیوں کی خلش ابھی باقی تھی، ناگوار گزری۔ معاہدہ کی تیسری شرط کے تحت، جس کی رو سے مسلمان اس پر مجبور تھے کہ وہ ایسے تمام کفار کو واپس کر دیں جو اپنے مربیوں یا سرداروں کی اجازت کے بغیر ان کے پاس چلے آئے تھے، قریش نے آنحضرت ﷺ کے متعدد صحابہ کی واپسی کا مطالبہ کیا اور یہ مطالبہ فوراً پورا کیا گیا، اس کے باوجود کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اس امر سے ناخوش نظر آتے تھے[2]۔ مدینہ واپس آکر آنحضرت ﷺ نے اپنی اس وسیع المشربانہ خواہش کی تکمیل کے لیے کہ آپ ﷺ کا دین ساری نوع انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے ہمسایہ ملکوں کے بادشاہوں کے پاس اپنے سفیر بھیجے تاکہ انہیں اور ان کی رعایا کو آبِ حیات کا وہ پیالہ پیش کریں جس کا نام اسلام تھا۔ اس ضمن میں دو سفارتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو ہرقل شہنشاہِ روم اور خسرو پرویز شہنشاہ ایران کے دربار میں بھیجی گئیں۔ شہنشاہِ ایران مکے کے اس مہاجر کی اس جسارت پر حیران ہوا کہ وہ خسرو اعظم سے ایک ہمسر کی طرح خطاب کر رہا تھا اس نے غضبناک ہو کر آنحضرت ﷺ کے خط کو پرزے پرزے کر ڈالا اور سفیر کو سخت سست کہہ کر دربار سے نکلوا دیا۔ جب اس بدسلوکی کی خبر آنحضرت ﷺ کو دی گئی تو آپ ﷺ نے آہستگی سے فرمایا، ''اسی طرح کسریٰ کی سلطنت ایک دن پارہ پارہ

---

[1] صلاح الرا......، ابن ہشام، ابن الاثیر، مشکوٰۃ۔ اس صلح کے موقعہ پر قریش کا ایک سفیر جو مسلمانوں کی خیمہ گاہ میں بھیجا گیا، آنحضرت ﷺ کے متبعین کی آپ ﷺ کے ساتھ حیرت انگیز عقیدت و محبت دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ قریش کے پاس واپس جا کر بولا'' میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں، جہاں ہر طرح کی شاہانہ شان و شوکت تھی لیکن محمد کے پیرو جیسی اس کی عزت و اطاعت کرتے ہیں اس کی مثال میں نے کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں دیکھی۔ ابن ہشام، ابن الاثیر، طبری، ابوالفدا۔

[2] چونکہ عورتیں اس شرط میں شامل نہ تھیں، اس لیے کفار نے مسلمان عورتوں کی واپسی کا مطالبہ کیا وہ رد کر دیا گیا۔

ہو جائے گی۔'' اس پیشگوئی کی تکمیل تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔ ہرقل، جو طبیعت کا نسبۃً زیادہ متواضع تھا، سفیر سے بڑے احترام کے ساتھ پیش آیا اور شائستگی اور خوش خلقی سے آنحضرت ﷺ کے پیغام کا جواب دیا۔ لیکن شام سے رخصت ہونے سے پہلے اس شخص نے اس کی سیرت و شخصیت سے متعارف ہونے کی کوشش کی جس نے اسے پیغام بھیجا تھا۔ اس مقصد سے اس نے چند عرب سوداگروں کو' جو غزہ میں ایک کاروان لے کر آئے ہوئے تھے، اپنے دربار میں بلا بھیجا۔ ان سوداگروں میں ابوسفیان بھی تھا، جو اب تک آنحضرت ﷺ کا سخت ترین دشمن تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رومی شہنشاہ نے آنحضرت ﷺ کے متعلق ابوسفیان سے چند سوالات کیے۔ اس کے جواب تقریباً لفظ بلفظ اس خلاصے سے ملتے ہیں جو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے تعلیماتِ محمدی ﷺ کے بارے میں نجاشی کے سامنے پیش کیا۔ ہرقل نے پوچھا۔ ''محمد ﷺ کن عقائد کی تعلیم دیتا ہے؟'' ابوسفیان نے جواب دیا۔ ''وہ ہمیں اپنے قدیم بتوں کی پرستش ترک کرنے اور خدائے واحد کی عبادت اختیار کرنے کو کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خیرات دو، سچائی اور پاکی سے کام لو، زنا و بدکاری سے پرہیز کرو اور مکروہات سے دور ہو۔'' ہرقل نے پوچھا'' محمد ﷺ کے پیرو تعداد میں بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں؟'' ابوسفیان نے جواب دیا، ''اس کے پیرو روز بروز بڑھ رہے ہیں اور اُن میں ایک بھی ایسا نہیں جس نے اس کا ساتھ چھوڑا ہو۔''

ایک اور سفیر اس کے کچھ مدت بعد غسانی شاہزادے کی طرف بھیجا گیا جو ہرقل کا باجگزار تھا اور دمشق کے قریب بصریٰ میں رہتا تھا بجائے اس کے کہ سفیر کے ساتھ اس عزت و احترام کا سلوک کیا جاتا جو سفیروں کے شایانِ شان ہے، اسی خاندان کے ایک اور سردار نے، جو ایک عیسائی قبیلہ کا امیر اور بازنطین کا تابع فرمان تھا، اسے نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔ بین الاقوامی واجبات کی یہ بے ہودہ خلاف ورزی بالآخر اس جنگ کا باعث بنی جس نے اسلام اور سارے عالمِ عیسائیت کو ایک دوسرے کے مقابلہ پر صف آرا کر دیا۔ بہر حال اس کی تفصیل ہم آئندہ بیان کریں گے۔

ساتواں باب

اشاعت اسلام

فَما تطاوُل اَمَالِ المدیحِ الیٰ مافیہ مِن کَرَمِ الآخلاقِ وَالشّیم

۷ ہجری ۱۲/ اپریل ۶۲۸ء سے یکم مئی ۶۲۹ء تک

یہودی قبائل ہزیمتیں اُٹھانے کے باوجود، اب بھی خطرناک تھے اور ابھی مسلمانوں کی تباہی کی تدبیروں میں منہمک تھے۔ مدینے سے تین چار روز کی مسافت پر شمال مشرق کی جانب ان کے قبضے میں ایک ایسا علاقہ تھا جس میں جا بجا قلعے تھے۔ ان میں سب سے بڑا قلعہ ''القموص'' ایک دشوار گزار پہاڑی پر واقع تھا۔ قلعوں کے اس مجموعے کا نام خیبر تھا (خیبر کے معنی ہیں قلعہ بند مقام) خیبر میں جو لوگ آباد تھے ان میں بنی نضیر اور بنی قریظ کی بہت سے شاخیں بھی تھیں، جو ان قلعوں میں پناہ گزین تھیں۔ خیبر کے یہودیوں کو آنحضرتﷺ اور آپﷺ کے متبعین سے سخت دشمنی اور نفرت تھی، جسے ان کے بھائی بندوں کی آمد نے اور بڑھا دیا۔ ان لوگوں کا بنی غطفان اور دوسرے بدویوں کے ساتھ دیرینہ اتحاد تھا۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کے خلاف ایک اور متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوششوں میں متواتر سرگرم کار تھے۔ صحرائی قبائل مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی جو قوت رکھتے تھے مسلمان اس سے بخوبی آگاہ تھے اور انہیں اس کا احساس تھا کہ مدینے کے خلاف ایک نئے اتحاد کا سدِّ باب کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس سال ماہِ محرم کے ابتدائی ایام میں چودہ سو (۱۴۰۰) آدمیوں پر مشتمل ایک مہم خیبر بھیجی تھی۔ یہودیوں نے اپنے حلیفوں سے مدد طلب کی۔ بنی فزارہ فوراً ان کی امداد

کو پہنچے، لیکن اس خوف سے کہ کہیں مسلمان پہلو بدل کر ان کی غیر موجودگی میں اچانک ان کے گلوں اور ریوڑوں پر حملہ آور نہ ہو جائیں، وہ لوگ جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ اس طرح یہودی میدانِ جنگ میں اکیلے رہ گئے۔ مسلمانوں نے انہیں صلح کی شرائط پیش کیں لیکن انہوں نے منظور نہ کیں۔ اگرچہ یہودیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن ایک کے بعد ایک قلعے نے اپنے دروازے کھول دیئے۔ اخیر میں سب سے زبردست قلعے قموص کی باری آئی۔ یہودیوں نے جی توڑ کر اس کے بچاؤ کی کوشش کی لیکن وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس قلعے کی تسخیر سے باقی یہودیوں پر واضح ہو گیا کہ مزید مقابلہ بے سود ہے۔ وہ معافی کے خواستگار ہوئے اور انہیں معافی دے دی گئی۔ انہیں اس امر کی ضمانت بھی دے دی گئی کہ اگر ان کا آئندہ طور طریقہ اچھا رہا تو ان کی زمینیں اور غیر منقولہ جائدادیں ان کے قبضے میں رہنے دی جائیں گی اور انہیں اپنے مذہب پر کاربند رہنے کی آزادی ہوگی۔ کیونکہ وہ عام محصولات سے مستثنیٰ تھے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان پر یہ فرض عائد کیا کہ تحفظ کے بدلے میں وہ حکومت کو اپنی زمینوں کی پیداوار کا آدھا حصہ دیا کریں گے جو قلعے مسلمانوں نے باقاعدہ محاصرہ سے تسخیر کئے ان میں جو جائداد منقولہ تھی وہ اسلامی فوج کے حق میں ضبط کر لی گئی اور فوجیوں میں تقسیم کر دی گئی۔ سواروں کو تین حصے ملے اور پیادوں کو ایک حصہ ملا[1]۔

۷ھ کے اواخر میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے قریش کے ساتھ صلح کا فائدہ اٹھا کر زیارتِ کعبہ کی وہ خواہش پوری کی جو مدتوں سے ان کے دلوں میں تھی۔ اس سفر کو اسلامی تاریخ میں عمرۃ القضاء' کے محترم نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مارچ ۶۲۹ء میں

---

[1] ابن ہشام۔ ابن الاثیر۔ یہ سراسر جھوٹ ہے کہ پوشیدہ خزانے کا پتہ چلانے کے لیے کنانہ کو اذیت دی گئی۔ اس مہم کے دوران آنحضرت ﷺ کو ہلاک کرنے کی متعدد کوششیں کی گئیں۔ مثلاً جب آپ ﷺ خیبر میں داخل ہوئے تو ایک یہودن نے آپ ﷺ کی اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم کی دعوت کی اور کھانے میں زہر ملا دیا۔ ایک صحابی تو دو چار نوالوں کے بعد ہی جاں بحق ہو گیا۔ آنحضرت آپ ﷺ کی جان بچ گئی، لیکن زہر آپ ﷺ کے جسم میں سرایت کر گیا اور اس کے اثرات تادمِ آخر باقی رہے۔ آنحضرت آپ ﷺ نے یہودن کو معاف کر دیا اور اسے اپنے لوگوں میں رہنے کی اجازت دے دی۔ طبری، ابن الاثیر

آنحضرتؐ دو ہزار صحابہؓ کے ہمراہ عمرہ کے لیے عازم مکہ ہوئے۔ قریش کو ان زائرین سے ملنا یا بات تک کرنا گوارا نہ تھا۔ چنانچہ رسوم عمرہ کی سہ روزہ مدت کے لیے انہوں نے شہر خالی کر دیا اور قریب کی پہاڑیوں پر سے مسلمانوں کے عمرہ ادا کرنے کا تماشا دیکھتے رہے۔ میور لکھتا ہے: ''وہ یقیناً ایک عجیب وغریب نظارہ تھا، جو اس وقت وادی مکہ میں دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ایسا نظارہ جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تین دن کے لیے اس قدیم شہر کے تمام باشندے، کیا اعلیٰ اور کیا ادنیٰ، شہر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ہر گھر خالی ہو جاتا ہے۔ اِدھر اہلِ مکہ شہر سے باہر جا رہے ہیں اور ادھر جلا وطن مسلمان جنہیں اپنے مولد سے شہر بدر ہوئے کئی سال گزر چکے تھے، اپنے حلیفوں کے ہمراہ جوق در جوق شہر کے اندر داخل ہوتے ہیں، ان خالی گھروں میں جاتے ہیں جہاں ان کا بچپن گزرا تھا اور اس مختصر مہلت میں جو انہیں دی گئی ہے زیارتِ کعبہ کی رسوم ادا کرتے ہیں۔ مکے والے اردگرد کی بلندیوں پر چڑھ کر خیموں میں یا پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں جہاں کہیں بھی وہ سر چھپا سکتے ہیں پناہ لیتے ہیں۔ ابوقبیس کی آگے کو نکلی ہوئی چوٹی پر جھرمٹ بنا کر زائرین کی نقل وحرکت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو اپنے نبی کی سربراہی میں کعبے کا طواف کر رہے ہیں یا صفاء ومروہ کے درمیان تیز قدمی سے چل رہے ہیں۔ اوپر والے نیچے والوں میں سے ہر شخص کو متجسسانہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں کہ شاید انہیں کوئی مدتوں سے بچھڑا ہوا دوست یا عزیز نظر آ جائے۔ جن شدائد ومصائب سے اسلام کو اپنی ابتدائی زندگی میں دوچار ہونا پڑا، ان کے بغیر ناممکن تھا کہ یہ نظارہ دیکھنے میں آتا۔''

مسلمانوں نے شرائط صلح کی سختی سے پابندی کی اور تین دن کے قیام کے بعد مکہ خالی کر دیا جس پُر امن طریقے سے مسلمانوں نے اپنی زیارت کعبہ کی آرزو پوری کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے اور بہت سے اہم افراد دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان کے ضبط وتحمل اور ایفائے عہد نے دشمنوں پر بہت گہرا اثر کیا۔ قریش کے جو لوگ آنحضرتؐ کے شدید ترین مخالف تھے اور جن میں بہت سے صاحب حیثیت اور ذی اثر لوگ بھی تھے جنہوں نے آپؐ سے جنگ کی تھی اور آپؐ کو برا بھلا کہا تھا، وہ آنحضرتؐ کی کریم النفسی شرافت اور عفو ورحم سے اس قدر متاثر

ہوئے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا[1]

شہنشاہِ روم کے ایک باجگوار سردار کے ہاتھوں مسلمان سفیر کا قتل ایک ایسا جرم تھا جسے خاموشی سے اور سزا دیئے بغیر نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا غسانی شہزادہ سے تاوان کا مطالبہ کرنے کے لیے تین ہزار آدمیوں کی ایک مہم روانہ کی گئی۔ بازنطینی شہنشاہ کے ماتحت عمال نے اس جرم سے برءت ظاہر کرنے کی بجائے اس کی ذمہ داری اپنے سر لے لی جس کے معنی یہ تھے کہ ساری بازنطینی سلطنت مسلمانوں سے برسرِ جنگ تھی۔ ان عمال نے اپنی فوجیں جمع کر کے موتہ کے قریب مسلمانوں پر حملہ کر دیا، جو شام کے شہر بلقا سے کچھ دور، جہاں مسلمان سفیر قتل کیا گیا تھا، ایک گاؤں تھا۔ مسلمانوں نے بازنطینیوں اور ان کے حلیفوں کو پسپا تو کر دیا، لیکن دشمنوں کی فوج تعداد میں مسلمانوں سے بہت زیادہ تھی اس لیے مسلمان مدینہ واپس آگئے[2]

اسی زمانہ کی بات ہے کہ قریش نے بنی بکر کے ساتھ مل کر صلحِ حدیبیہ کی شرائط کی خلاف ورزی کی اور بنی خزاعہ پر حملہ کر دیا، جو مسلمانوں کے حلیف اور ان کی حفاظت میں تھے۔ انہوں نے بنی خزاعہ کے بہت سے آدمی ہلاک کر دیئے اور باقیوں کو منتشر کر دیا۔ بنی خزاعہ فریاد لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انصاف کا مطالبہ کیا۔ مکے میں بڑی مدت سے ناانصافی اور ظلم و ستم کی گرم بازاری تھی، اہلِ مکہ نے خود شرائطِ صلح کو توڑا تھا اور ان کے کئی سرداروں نے بنی خزاعہ کے قتلِ عام میں حصہ لیا تھا۔ آنحضرت ﷺ خود دس ہزار مجاہدوں کو لے کر میدان میں نکلے۔ عکرمہ اور صفوان کی سرکردگی میں ان کے قبائل نے تھوڑی سی مزاحمت کی جس میں چند مسلمان شہید ہو گئے۔ ان کے سوا کوئی مقابلہ میں نہ آیا اور آنحضرت ﷺ نے مکہ میں ورود کیا۔

اس طرح آنحضرت ﷺ ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے۔ وہ جو کسی زمانہ میں غریب الوطن اور موردِ ظلم و ستم تھا، اپنی رسالت کو رحم و کرم سے ثابت کرنے کے

---

[1] مثلاً خالد بن ولیدؓ جو جنگِ اُحد میں قریش سواروں کے سردار تھے اور عمرو بن العاص۔

[2] کوسین دی پرسیوال، ابن الاثیر۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کے سالارِ لشکر زید بن حارثؓ، عم زادۂ رسول ﷺ جعفرؓ اور بہت سے دوسرے نمایاں افراد شہید ہوئے۔

لیے اپنے شہر میں واپس آیا۔ جس شہر نے اس کے ساتھ اتنی بے رحمی کا سلوک کیا تھا، جس نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے جاں نثاروں کو اجنبیوں کی پناہ لینے پر مجبور کیا تھا، جس نے آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے عقیدت مندوں کی جان لینے کی قسم کھا رکھی تھی، وہ شہر اب آپ ﷺ کے قدموں پر پڑا تھا۔ اس کے ظالم وسفاک دشمن، جنھوں نے پرامن مردوں اور عورتوں پر ظلم وستم ڈھا کر بلکہ مردوں کی بھی بے حرمتی کر کے اپنے ننگِ انسانیت ہونے کا ثبوت دیا تھا، اب آپ ﷺ کے رحم وکرم کے محتاج تھے۔ لیکن فتح وظفر کی اس گھڑی میں تمام برائیاں بھلا دی گئیں، تمام زیادتیاں معاف کر دی گئیں اور مکے کی تمام آبادی کو عام معافی دے دی گئی۔ اپنے بدترین دشمنوں کے شہر میں فاتحانہ داخل ہونے کے بعد آپ ﷺ نے واجب القتل لوگوں کی جو فہرست بنائی وہ صرف چار مجرموں پر مشتمل تھی جنھیں عدل مستوجب سزا قرار دے چکا تھا۔ فوج نے بھی آپ ﷺ کی مثال کی تقلید کی اور پرامن طریقے سے شہر میں داخل ہوئی۔ ''کوئی گھر نہ لوٹا گیا اور کسی عورت کی توہین نہ کی گئی۔ بالکل بجا طور پر کہا گیا ہے کہ فتوحات کی تاریخ میں اس فاتحانہ ورود کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن عربوں کے بت بے دریغی سے توڑ دیئے گئے۔ کفار غم وتاسف کے عالم میں کھڑے اپنے معبود بتوں کے ہبوط کا نظارہ دیکھ رہے تھے اور پھر اُن پر حقیقت آشکار ہوگئی، جب بتوں کے سرنگوں ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس پرانی جانی پہچانی آواز کو، جسے وہ تمسخر میں اڑا دیا کرتے تھے، یہ اعلان کرتے سنا ''حق آگیا اور باطل گیا گزرا ہوا اور واقعی باطل آنی جانی چیز ہے۔'' ان کے اصنام کتنے بے دست وپا نکلے!

ان قدیم بتوں کو توڑنے اور جاہلیت کی تمام رسوم کو مٹانے کے بعد رسولِ خدا ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا۔ اس میں آپ ﷺ نے پہلے تو انسانوں کی فطری مساوات واخوت کے بارے میں قرآن کے احکام بیان کیے اور پھر فرمایا: ''اے قریش! میری طرف سے تمھیں اپنے لیے کس سلوک کی توقع ہے؟'' انھوں نے جواب دیا۔ ''آپ ﷺ ہمارے شفیق برادر اور مہربان برادر کے فرزند ہیں۔ ہمیں آپ ﷺ سے بھلائی ہی کی توقع ہے۔'' طبری کہتا ہے کہ یہ الفاظ سن کر آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اچھا میں بھی تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے

کہا تھا:۔لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھوارحم الراحمین (خدا تمہیں معاف کرے، آج پر کوئی ملامت نہیں۔وہ بڑا رحیم ورحمٰن ہے۔'')

اب ایک ایسا منظر رونما ہوا جس کی کوئی مثال تاریخ عالم میں نظر نہیں آتی جوق در جوق لوگ آتے اور اسلام قبول کرتے چلے جاتے۔آپ ﷺ نے کوہ صفا پر بیٹھ کر ان سب سے وہی عہد لیا جو آپ ﷺ نے مدینے والوں سے لیا تھا:''ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے، زنا نہ کریں گے اور اولاد کو قتل نہ کر دیں گے، ہم جھوٹ نہ بولیں گے اور عورتوں کے بارے میں بری باتیں نہ کہیں گے''۔

اس طرح قرآن کی پیشگوئی پوری ہوئی۔''جب خدا کی مدد آپہنچے اور فتح ہو جائے اور تم لوگوں کو جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھو تو اپنے رب کی حمد و ثناء کرو اور اس سے توبہ کی درخواست کرو۔وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے''۔

اب آپ ﷺ کی رسالت کا مقصد تکمیل کے قریب تھا۔آپ ﷺ نے اکابر صحابہ کو تمام اطراف میں صحرا کے بدوی قبائل کی طرف بھیجا تا کہ انہیں دعوتِ اسلام دیں اور انہیں تاکیدی احکام دیئے کہ امن و خیر سگالی کی تبلیغ کریں۔انہیں صرف تشدد سے اپنا تحفظ کرنے کی خاطر ہتھیار اُٹھانے کی اجازت دی گئی۔ایک موقعے کے سوا ان ہدایات پر پورا پورا عمل کیا گیا۔خالد بن ولید کے آدمیوں نے اپنے شعلہ مزاج نو مسلم سردار کے حکم پر قبیلہ بنی جدیمہ کے چند بدوی یہ سمجھ کر کہ وہ دشمن سپاہ کے آدمی ہیں قتل کر ڈالے۔لیکن دوسرے مسلمانوں نے دخل اندازی کر کے مزید خوں ریزی روک دی۔جب اس بے جا خوں ریزی کی خبر رسول رسول اللہ ﷺ نے سُنی تو آپ ﷺ فرطِ غم سے بے قرار ہو گئے اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر پکارے:''یا اللہ میں خالد کے اس فعل سے بری الذمہ ہوں!'' آپ ﷺ نے فوراً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنی جدیمہ کے پاس بھیجا تا کہ ہر ممکن طریقہ سے انہیں اس زیادتی کا معاوضہ ادا کیا جائے۔یہ کارِ خیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طبیعت سے موافقت رکھتا تھا اور آپ ﷺ نے ہدایاتِ نبوی کے عین مطابق اس کو انجام دیا۔انہوں نے مقتولین کی تعداد، ان کی حیثیت اور ان کے ورثا کو جو نقصان پہنچا تھا ان سب کی بکمال احتیاط تحقیقات کی اور ہر کسی کے حق کے مطابق اسے دیت عطا کی۔نقصانات

کی تلافی کے بعد جو رقم بچی وہ انہوں نے مقتولین کے رشتہ داروں اور قبیلے کے لوگوں میں تقسیم کر دی۔ واقعہ نگار لکھتا ہے کہ ان کی اس فیاضی اور رحمدلی سے لوگوں کے دل میں خوش ہو گئے۔ لوگوں کی دعائیں لیتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جی کھول کر آپ رضی اللہ عنہ کی تعریف کی۔

ہوازن، ثقیف اور بہت سے دوسرے جنگجو بدوی قبیلے جن کی چراگاہیں مکے کے قرب و جوار میں تھیں اور جن میں سے بعض طائف سے مضبوط قلعہ بند قصبوں میں رہتے تھے مقابلہ کئے بغیر مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنے پر راضی نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس نیت سے ایک اتحاد قائم کیا کہ مسلمانوں پر اچانک حملہ کر دیں اور انہیں مدافعت کا موقع ہی نہ دیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مستعدی نے ان کی سازش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ حنین[1] کے قریب جو مکے سے دس میل دور شمال مشرق کی جانب ایک گہری اور تنگ گھاٹی ہے، گھمسان کی لڑائی ہوئی، جس میں کفار کو نقصانِ عظیم کے ساتھ شکست ہوئی[2]۔ دشمن کی فوجیں دو گروہوں میں بٹ گئیں۔ ایک گروہ نے، جس میں زیادہ تر بنی ثقیف کے لوگ تھے، شہرِ طائف میں پناہ لی، جس کے حدود سے آٹھ نو سال پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اہانت کے ساتھ نکال دیا گیا تھا۔ دوسرا گروہ بھاگ کر وادی اوطاس کے ایک محفوظ مقام میں پناہ گزین ہوا۔ یہ مقام تسخیر کر لیا گیا اور ہوازن کے اہل و عیال اپنے تمام مال و متاع، ریوڑوں اور گلوں سمیت مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ پھر طائف کا محاصرہ کیا گیا، لیکن کچھ دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محاصرہ اُٹھا لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب معلوم تھا کہ حالات اہلِ طائف کو کسی خون ریزی کے بغیر خود بخود ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیں گے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام کو لوٹے جہاں ہوازن کے قیدی بغرضِ حفاظت رکھے گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طاقتور قبیلے کا ایک وفد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منتظر پایا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

[1] کوسین۔ دی۔ پرسیوال۔ قاموس میں محض اتنا ذکر ہے کہ حنین مکے سے طائف جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ معجم البلدان میں یہ کہا گیا ہے کہ حنین ذوالمجاز کے جنوب میں اور مکے سے تین رات کی مسافت پر واقع ہے۔

[2] سورہ توبہ (آیات ۲۵۔۲۶) میں اس جنگ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ابن ہشام۔ ابن الاثیر

اپنے اہل وعیال کی واپسی کی درخواست کرے۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ عرب اپنے حقوق کے معاملے میں کس قدر حساس ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ نے بدوی مندوبین کو یہ جواب دیا کہ آپ ﷺ اپنی قوم کو ثمرات فتح سے دست بردار ہونے پر مجبور نہ کر سکتے تھے اور اگر ہوازن اپنے اہل وعیال کو واپس لینا چاہتے تھے تو انہیں کم از کم اپنے مال واسباب سے دست کش ہو جانا چاہیے۔ ہوازن اس بات پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ دوسرے دن جب مسلمان آپ ﷺ کی امامت میں نماز ظہر ادا کر رہے تھے تو ہوازن نے آ کر اپنی درخواست کو دہرایا: ''ہم رسول اللہ ﷺ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے سفارش کریں اور مسلمانوں سے التجا کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے سفارش کریں کہ ہمارے بیوی بچے ہمیں واپس دے دیئے جائیں۔'' آنحضرت ﷺ نے جواب دیا۔ ''میں اپنا اور بنی عبدالمطلب کا حصہ فوراً تم لوگوں کو واپس کرتا ہوں۔'' آپ ﷺ کی فیاضی سے متاثر ہو کر آپ ﷺ کے متبعین نے فوراً آپ ﷺ کی مثال کی تقلید کی۔ چنانچہ ایک لمحے میں چھ ہزار قیدی رہا کر دیئے گئے۔ اس دریادلی نے بنی ثقیف کے دل جیت لیے اور وہ بیعت کر کے سچے دل سے مسلمان ہو گئے۔ ہوازن کے گلوں اور ریوڑوں کی تقسیم کے بعد جو واقعہ پیش آیا، اس سے صرف یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ آنحضرت ﷺ کہ اہلِ مدینہ کے دلوں پر کیسا تسلط تھا اور انہیں آپ ﷺ سے کیسی گہری عقیدت تھی، بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کے کسی دور میں بھی آپ ﷺ کے پاس اپنے متبعین کو دینے کے لیے کوئی مادی انعامات نہ تھے۔ مالِ غنیمت کی تقسیم میں نومسلم اہلِ مکہ کو اہلِ مدینہ کی بہ نسبت زیادہ حصہ ملا۔ بعض انصار نے اسے جانب داری سے تعبیر کیا۔ جب اس کی اطلاع آپ ﷺ کو ملی تو آپ ﷺ نے انہیں جمع ہونے کا حکم دیا۔ پھر آپ ﷺ نے ان سے مخاطب ہو کر ذیل کے الفاظ فرمائے: ''اے انصار! تم لوگوں کی باتیں میرے کانوں تک پہنچی ہیں۔ جب میں تم لوگوں کے پاس آیا تو تم تاریکی میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ خدا نے میرے ذریعے سے تمہیں سیدھا رستہ دکھایا، تم غمزدہ تھے، اس نے تمہیں راحت بخشی، تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کی۔ مجھے بتاؤ کیا یہ درست نہیں؟'' آپ ﷺ نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: بخدا! تم یہ بھی

کہہ سکتے تھے کہ اگر تم ایسا کہتے تو سچ کہتے اور میں اس کی سچائی کی گواہی دیتا کہ 'ساری دنیا نے تجھ کو جھٹلایا اور ہم نے تیری تصدیق کی، تو ہمارے پاس بے یار و مددگار آیا اور ہم نے تیری مدد کی، تو غریب و بے خانماں تھا، ہم نے تجھے پناہ دی، تو مضطرب و پریشان تھا، ہم نے تیری ڈھارس بندھائی۔'' اے انصار! متاعِ دنیا کے لیے کیوں اپنے دلوں کو پریشان کرتے ہو؟ کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ دوسرے لوگ یہاں سے لوٹیں تو اونٹ اور بکریاں ہمراہ لے کر جائیں اور تم اپنے گھروں میں خدا کے رسول ﷺ کو ہمراہ لے کر جاؤ۔ قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ میں تمہارا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں گا۔ اگر ساری دنیا اکٹھی ہو کر ایک راستے پر چلے اور انصار دوسرے راستے پر چلیں تو میں انصار کے ہم راہ چلوں گا۔ اے اللہ انصار اور انصار کے لڑکوں اور ان کے لڑکوں کے لڑکوں پر رحم کر۔'' واقعہ نگار کہتا ہے کہ یہ الفاظ سن کر سب انصار اس قدر روئے کہ ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور سب یک زبان ہو کر پکار اُٹھے: ''ہم سب اپنے اپنے حصہ پر مطمئن ہیں۔'' اس کے بعد مسرور و دلشاد سب لوگ رخصت ہو گئے۔

تھوڑی مدت کے بعد آنحضرت ﷺ نے مدینے مراجعت فرمائی۔

آٹھواں باب

عام الوفود

فَاقَ النَّبیینَ فِی خلقٍ و فِی خُلُقٍ　　ولم یدا فوھفی عِلمٍ ولا کرم،
دع مادعتہ النّصاری فی نبیھم　　وَاحُکُم مَاشِئتَ مد حاً فیہ واحتکم
(قصیدۃ البردہ)

اِنَّ الرَّسُولَ لانور یستضا بہٖ
وَصَارِمُ من سیُوفِ اللہ مسلول
(بانت سعاد)

ہجرت کا نواں سال وفود کی وجہ سے مشہور ہے جو پیغمبرِ اسلام کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے جوق در جوق مدینہ میں آئے۔ حَمیت جاہلیت، خون کے بدلے خون اور کفر و شرک کی جو کالی گھٹا اس سرزمین پر چھائی ہوئی تھی وہ ہمیشہ کے لیے کھل گئی۔ جاہلیت کا دور ختم ہو چکا تھا۔

۹ ہجری۔ ۲۰/اپریل ۶۳۰ تا ۹/اپریل ۶۳۱ء

فتح مکہ نے عرب میں صنم پرستی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ جو لوگ اپنی خوبصورت چاند دیویوں، لات، مناۃ اور عزیٰ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے، بت پرستی کے اس حصنِ حصین کے سقوط نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ اہل مکہ کی اطاعت نے صحرا کے وحشی قبائل پر بہت گہرا اثر کیا۔ اب تک جو قبیلے مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے ان کی طرف سے اطاعت و وفاداری کا حلف اٹھانے کے لیے اطراف واکناف سے وفود آنے لگے۔ کبائرِ

صحابہ اور مدینے کے ممتاز شہری ان سفیروں کو اپنے گھروں میں اتارتے اور عربوں کے قدیم دستورِ مہمان نوازی کے مطابق ان کی خاطر و مدارات کرتے۔ رخصت ہوتے وقت انہیں زادہ راہ کے طور پر معقول رقمیں دی جاتیں اور ہر ایک کے رتبے کے مطابق مزید تحائف بھی پیش کیے جاتے۔ اکثر قبائل کو ان کے حقوق و مراعات کے بارے میں تحریری عہد نامے عطا کئے جاتے اور ہر وفد کے ساتھ ایک معلم بھیجا جاتا تاکہ وہ ان نومسلموں کو ارکانِ اسلام کی تعلیم دے اور ان کے یہاں بت پرستی کا کوئی نشان باقی نہ رہنے دے۔

جس اثنا میں یہ مدبر اعظم قبائل عرب کو اسلامی علم کے نیچے متحد کر رہا تھا وہ ان خطرات سے بھی آگاہ تھا جو اس نئی وفاقی مملکت کو بیرونی ممالک کی طرف سے درپیش تھے۔

اس زمانہ میں اہلِ بازنطین از سرنو وہی خواب دیکھ رہے تھے جنہوں نے اس سے قبل سلطنت روما کے بانی کو عرب میں مہمیں بھیجنے پر آمادہ کیا تھا[1]۔ ہرقل ایرانیوں کو شکست دے کر غرور و نخوت سے سرشار اپنے ملک واپس گیا تھا۔ عرب میں جو عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے تھے وہ اس کی سیاسی بصیرت سے چھپے نہ رہ سکتے تھے اور اس کے نائبین کے لشکرِ کثیر کو مٹھی بھر عربوں کے مقابلہ میں جو ناکامی ہوئی تھی وہ غالباً اسے بھی نہ بھولا تھا۔ قیامِ شام کے دوران اس نے اپنے باجگزاروں کو عرب پر حملہ کرنے کے لیے ایک زبردست فوج جمع کرنے کا حکم دیا تھا۔ ان تیاریوں کی خبر مدینے میں پہنچی اور مسلمانوں کے دل میں قدرے ہراس پیدا ہو گیا اگر یہ خبر صحیح تھی تو دولتِ عامہ اسلامیہ کے لیے ایک خطرہ عظیم پیدا ہو گیا تھا۔ حملہ کے سد باب کے لیے تمام اطراف سے رضا کار طلب کئے گئے۔ سوءِ اتفاق سے حجاز اور نجد کو خشک سالی نے نڈھال کر رکھا تھا۔ کھجوروں کی فصل تباہ ہو گئی تھی اور بار برداری کے جانور بڑی تعداد میں مر گئے تھے۔ دیہات کے لوگ ایسے میں اپنے گھروں سے دور کسی مہم پر جانے کے لیے رضا مند نہ تھے۔ بعضوں نے تو یہ عذر پیش کیا کہ موسم لڑائی کے لیے ناموزوں تھا۔ جو لوگ لڑنے سے جی چراتے تھے ان کے خوف کو گرمی کی شدت، سفر کی صعوبتوں اور بازنطینی سلطنت کی قوت و شہامت کے بارے میں لمبی چوڑی کہانیوں نے اور بھی بڑھا دیا۔ بہت سوں نے جنگی خدمت سے

[1] میری مراد ایلیس گیلس (Elius Gallus) کے حملے سے ہے جو قیصر آگسٹس کے عہد حکومت میں ہوا۔

مستثنیٰ قرار دیے جانے کی درخواست پیش کر دی۔ آنحضرت ﷺ نے ایسے لوگوں کی درخواست منظور کر لی جو کمزوری کی وجہ سے ہتھیار نہ اٹھا سکتے تھے یا غریبی کی وجہ سے ہتھیار اور زادِ راہ مہیا نہ کر سکتے تھے یا اپنے گھروں میں اکیلے مرد تھے اور گھر والوں کو چھوڑ کر نہ جا سکتے تھے۔[1]

بے دلوں کی نارضامندی کو منافقین کی سازشوں نے بڑھا دیا، جنھوں نے اس نارضامندی کو بے اطمینانی کی صورت میں تبدیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔[2] بہر حال صحابۂ کبار اور دوسرے مخلص مسلمانوں کی مثال نے بزدلوں کا حوصلہ بڑھایا اور جی چرانے والوں کو شرمندہ کر کے ان میں جوش پیدا کر دیا۔ یہ جوش جلد ہی تمام لوگوں میں پھیل گیا۔ مصارفِ جنگ کے لیے ہر طرف سے چندے آنے لگے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا پورا اثاث البیت حاضر کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک بڑے دستے کے مصارف اور اسلحہ کے کفیل ہو گئے۔ دوسرے ذی مرتبہ اور صاحب دولت مسلمانوں نے بھی ایسی ہی دریا دلی سے کام لیا۔ عورتیں اپنے جواہرات اور زیور لے کر آئیں اور آنحضرت ﷺ سے ملتجی ہوئیں کہ انہیں مملکت کی ضروریات کے لیے قبول کیا جائے۔ اس طرح کافی تعداد میں فوج فراہم ہو گئی اور مجاہدین نے آنحضرت ﷺ کی معیت میں سرحد کی طرف کوچ کیا۔[3]

آنحضرت ﷺ نے اپنی غیر موجودگی میں مدینے کا انتظام حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سونپا۔ عبداللہ بن ابی اور دوسرے منافقین ثنیۃ الوداع تک فوج کے ساتھ گئے لیکن اس کے بعد وہ آنکھ بچا کر پیچھے رہ گئے اور مدینہ واپس آ گئے۔ مدینہ میں آ کر انہوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ آنحضرت ﷺ مہم کے خطرات کے خوف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ اس شرارت آمیز افواہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بہت غیرت آئی اور وہ ہتھیار سنبھال کر

---

[1] ان لوگوں کو 'البکاؤن' کا لقب دیا گیا۔ اس بنا پر کہ وہ ایک خطرناک دشمن کے خلاف جہاد میں شریک ہونے سے معذور رہنے پر گریہ و بکا کرتے تھے (ابن ہشام، الحلبی، انسان العیون۔)

[2] منافقین کی سازشوں کی مذمت سورہ توبہ۔۸۳ میں کی گئی ہے۔ یہ سازشی سویلم نامی ایک یہودی کے گھر میں جمع ہوتے تھے۔ یہ گھر بعد میں تباہ کر دیا گیا۔ انہیں دنوں میں آنحضرت ﷺ نے یہ پیش گوئی کی کہ ملت اسلامیہ میں ہمیشہ منافقین رہیں گے جو مومنین کی مخیرانہ کوششوں میں مزاحم ہوا کریں گے۔

[3] اس فوج کے فراہم کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں ان کی مناسبت سے اسے 'جیش العسرۃ' کا نام دیا گیا۔

فوج کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ جب آپ رضی اللہ عنہ نے فوج کو جا لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معاملہ کہہ سنایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک کمینہ بہتان سے تعبیر کیا۔ ابن ہشام لکھتا ہے:۔ ''فقال کذبو اولکنی خلفتك لما ترکت وراء ی فارجع فاخلفنی فی اهلی و اهلك افلا ترضی یا علی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسی[1]۔'' چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینے واپس آ گئے۔

مسلم مجاہدین نے گرمی اور پیاس کی وجہ سے شدید تکلیفیں سہیں۔ ایک لمبے اور کٹھن سفر کے بعد وہ تبوک پہنچے جو مدینہ اور دمشق کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ یہاں ان لوگوں نے آرام کیا۔ وہ یہ سن کر متعجب بھی ہوئے اور انہوں نے اطمینان کا سانس بھی لیا کہ رومی حملے کی خبر محض ایک ہوائی خبر تھی۔ شہنشاہِ روم کو اپنے گھر ہی میں مسائل درپیش تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ مدینہ کی دولت عامہ کو کوئی خطرہ نہ تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو واپسی کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے تبوک میں بیس دن تک قیام کیا۔ وہاں انہیں اپنے استعمال کے لیے کافی پانی اور بار برداری کے جانوروں کے لیے کافی چارہ میسر آیا۔ وہ رمضان کے مہینے میں مدینے لوٹے[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے واپس آتے ہی طائف کے شوریدہ سر اور شقی القلب کفار کا ایک وفد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو توہین و تشدد کے ساتھ اپنے شہر سے نکال دیا تھا۔ طائفی سردار عروہ جو واقعہ حدیبیہ کے بعد قریش کا سفیر بن کر کے آیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا تھا۔ اسے اپنے شہر کے متعصب لوگوں کی طرف سے جو خطرہ تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس سے متعدد مرتبہ متنبہ کیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ جلدی جلدی طائف واپس گیا تا کہ واپس جا کر اپنے ترک بت پرستی کا اعلان کرے اور اپنے ہم شہریوں کو اسلام کی برکات سے بہرہ

---

[1] اہلِ تشیع ان ارشادات سے یہ نتیجہ مستنبط کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

[2] کوسین دی پرسیوال کہتا ہے وسط دسمبر ۶۳۰ء سورۂ نساء میں یہ واقعات بڑی صراحت سے بیان کئے گئے ہیں۔ تبوک میں بہت سے ہمسایہ سرداروں نے آ کر بیعت کی۔ ابن الاثیر

اندوز ہونے کی دعوت دے۔ وہ شام کے وقت شہر میں پہنچا اور پہنچتے ہی شہریوں کو جمع کر کے اپنی تبدیلی مذہب کا اعلان کر دیا اور انہیں شریکِ اسلام ہونے کی دعوت دی۔ دوسرے دن صبح کے وقت اس نے پھر لوگوں سے خطاب کیا۔ لیکن عزیٰ کے پروہت اور پجاری اس قدر مشتعل ہوئے کہ انہوں نے اسے سنگسار کر کے ہلاک کر دیا۔ اس نے مرتے دم کہا کہ میں اپنی قوم کی بھلائی کے لیے اپنا خون اپنے آقا کی نذر کرتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے شہادت کا درجہ عطا فرمایا۔ اس نے یہ وصیت بھی کی کہ اسے شہدائے حنین کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ عروہ نے جیتے جی اہل طائف کو قبولِ اسلام پر آمادہ کرنے کی جو کوششیں کی تھیں ان سے کہیں زیادہ اثر اس کے آخر الفاظ نے کیا۔ شہید کے خون نے اس کے قاتلوں کے دل میں چراغ ایمان روشن کر دیا۔ اہلِ طائف کو اس سے بہت پشیمانی ہوئی اور بدوی قبائل کے ساتھ جو دشمنی چلی آرہی تھی غالباً وہ اس سے بھی تنگ آگئے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے وہ وفد بھیجا جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ یہ وفد معافی اور دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی اجازت مانگنے آیا تھا۔ لیکن اہلِ وفد نے اپنے بتوں کے لیے تھوڑی سی مہلت کی درخواست کی: پہلے دو سال کی مہلت، پھر ایک سال کی، پھر چھ مہینے کی، لیکن یہ درخواست منظور نہ کی گئی۔ اخیر میں وہ صرف ایک مہینے کی مہلت پر اُتر آئے، لیکن آنحضرت ﷺ اپنے موقف سے نہ ٹلے۔ اسلام اور بتوں کا ایک ساتھ موجود ہونا ناممکن تھا۔ پھر انہوں نے نماز سے بریت کی درخواست کی۔ آنحضرت ﷺ نے جواب دیا "جس دین میں عبادت نہ ہو اس میں اور کیا بھلائی ہو سکتی ہے؟" بالآخر انہوں نے طوعاً وکرہاً سارے مطالبات منظور کر لیے۔ بہر حال انہیں اپنے ہاتھوں بتوں کے توڑنے سے معذور رکھا گیا، اور یہ کام ابوسفیان بن حرب اور عروہ کے قرابت دار مغیرہ کو تفویض کیا گیا۔ انہوں نے طائف کی عورتوں کے نالہ وشیون کے درمیان یہ کام انجام دیا۔[1]

اب قبیلہ طے نے اپنے پروہتوں کے بھڑکانے پر سرتابی کی۔ انہیں مطیع بنانے

---

[1] ابن ہشام، طبری ۹ ہجری کو جو کثیر التعداد وفد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کی مناسبت سے اس سال کا نام عام الوفود پڑ گیا۔ بنی ثقیف کے قبولِ اسلام کے بعد جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ان میں یمن، مہرہ، عمان اور بحرین کے حمیری شہزادے اور یمامہ کے نزدیک آباد قبائل تھے۔

اور بتوں کے توڑنے کے لیے ایک چھوٹی سی فوج حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں بھیجی گئی۔ اس قبیلے کا سردار عدی تھا۔ جو اس حاتم کا بیٹا تھا جس کی فیاضی اور دریا دلی مشرقی ادب اور شاعری میں ضرب المثل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آتے ہی عدی شام کی طرف بھاگ نکلا، لیکن بنی طے کے چند مقتدر افراد، جن میں عدی کی بہن بھی تھی، مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوئے۔ انہیں ہر طرح کی عزت مراعات کے ساتھ مدینہ لایا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاتم کی بیٹی اور اس کے ہم قوموں کو فوراً آزاد کر دیا اور بیش بہا تحائف بھی عطا فرمائے۔ اس نے شام جا کر اپنے بھائی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کریمانہ سلوک کا حال سنایا۔ عدی کا دل ممنونیت سے لبریز ہو گیا اور وہ فوراً خود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈالنے کے لیے عازمِ مدینہ ہوا۔ اور بالآخر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ پھر اس نے واپس جا کر اپنے قبیلے کے لوگوں کو بت پرستی پر ترک کر دینے کی تلقین کی۔ چنانچہ بنی طے، جو کسی زمانہ میں بت پرستی کی لعنت میں بری طرح مبتلا تھے، دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص پیرو بن گئے [۲] اسی زمانہ میں ایک اور نمایاں شخصیت نے اسلام قبول کیا اور یہ واقعہ ایسے طریقے سے ہوا جو تفصیلی بیان کا مستحق ہے۔ قبیلۂ مزینہ کا ایک ممتاز شاعر کعب ابنِ زُہیر اپنے قبیلے کو

---

[۲] ابن ہشام، ابن الاثیر، انسان العیون۔ عدی کا قبول اسلام ۹ ہجری کے ربیع الثانی (جولائی اگست ۶۳۰ء) میں واقع ہوا، لہٰذا اس کا ذکر مہم تبوک سے پہلے ہونا چاہیے لیکن میں نے عرب مورخین کی ترتیب واقعات کا تتبع کیا ہے۔ جب حاتم کی بیٹی، جس کا نام سفانہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائی گئی تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح خطاب کیا! ''میرا والد وفات پا چکا ہے، میرا بھائی جو میرا سرپرست ہے، مسلمانوں کے آنے پر پہاڑوں میں جا کر روپوش ہو گیا ہے۔ میں اپنا فدیہ ادا نہیں کر سکتی، اس لیے میں اپنی آزادی کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رحم و کرم کی التجا کرتی ہوں۔ میرا باپ ایک مشہور آدمی تھا، اپنے قبیلے کا سردار تھا، قیدیوں کو آزاد کراتا تھا، عورتوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتا تھا، غریبوں کو کھانا کھلاتا تھا، مصیبت زدوں کو تسکین دیتا تھا اور کبھی کسی کی درخواست رد نہ کرتا تھا۔ میں حاتم کی بیٹی سفانہ ہوں۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرے باپ میں مسلمانوں کے اوصاف تھے۔ اگر مجھے اس کی اجازت ہوتی کہ کسی ایسے شخص کے لیے خدا کے رحم کی دعا مانگوں جس کی زندگی بت پرستی میں گزری ہے تو میں حاتم کی روح کے لیے دعائے مغفرت مانگتا۔'' پھر مسلمانوں کے مجمع سے مخاطب ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کیا ''حاتم کی بیٹی آزاد ہے۔ اس کا باپ ایک نیک اور رحم دل آدمی تھا، خدا رحم دلوں سے محبت کرتا ہے اور انہیں اجر دیتا ہے۔ سفانہ کے ساتھ اس کی قوم کے سارے آدمی آزاد کر دیئے گئے۔ سعدی نے اس واقعہ کو بوستان میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا کرتا تھا اور اس لیے وہ واجب القتل قرار دیا گیا تھا۔ کعب کے بھائی نے، جو مسلمان ہو چکا تھا، اسے بت پرستی ترک کرنے اور اسلام قبول کرنے کی تاکید کی۔ کعب اس تاکید پر عمل کر کے خفیہ طور پر مدینے میں آیا اور مسجد نبوی میں پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ بہت سے عرب ایک شخص کے گرد بیٹھے انتہائی تعظیم و تکریم سے اس کی باتیں سن رہے ہیں۔ اس نے فوراً پہچان لیا کہ یہی رسولِ خدا ﷺ ہیں اور صفوں کو چیرتا ہوا آنحضرت ﷺ کے قریب گیا اور بولا، ''یا رسول اللہ ﷺ! اگر میں کعب کو مسلمان بنا کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر کردوں تو کیا آپ ﷺ اسے معاف فرما دیں گے؟'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''ہاں''۔ یہ سن کر کعب نے کہا ''میں ہی کعب بن زہیر ہوں۔'' مجمع میں سے کئی لوگوں نے اسے قتل کرنے کی اجازت چاہی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''ٹھہرو! میں اسے امان دے چکا ہوں'' اس کے بعد کعب نے اجازت لے کر ایک قصیدہ پڑھا۔ جو ہمیشہ عربی شاعری کا شاہکار سمجھا گیا ہے[1]۔

اب تک کفار کو کعبے میں داخل ہونے اور اپنی بت پرستانہ رسوم ادا کرنے کی ممانعت نہ کی گئی تھی۔ اب فیصلہ کیا گیا کہ اس انمل بے جوڑ بات کو ختم کر دیا جائے اور اس کا امکان سرے سے رفع کر دیا جائے کہ جو لوگ ابھی پوری طرح اسلام کے رنگ میں نہ رنگے گئے تھے وہ از سرِ نو بت پرستی کی طرف مائل ہو جائیں۔ چنانچہ اس سال کے آخری مہینے یعنی ذوالحجہ میں قربانی کے دن (یوم النحر) آنحضرت ﷺ کے ارشاد پر حضرت علی رضی اللہ عنہ

[1] یہ قصیدہ اپنے شروع کے الفاظ کی مناسبت سے قصیدہ بانت سعاد کہلاتا ہے۔ تشبیب میں شاعر اپنی محبت کا دردناک قصہ بیان کرتا ہے۔ اس کی محبوبہ سعاد اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے اور وہ بادلِ غمزدہ و پریشان اس کی تلاش میں ایک پابجولاں قیدی کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ وہ اس کے حسن و جمال، اس کی نرم و ملائم آواز، اس کی شوخ ہنسی، اس کے دلربا تبسم کی تعریف کرتا ہے۔ گریز کے بعد قصیدہ مدحِ رسول ﷺ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قصیدے کے الفاظ میں شروع سے آخر تک ایک ایسی شوکت و بلند آہنگی ہے جو بعد کی عربی شاعری میں نہیں پائی جاتی: الحان کے زیر و بم کو بڑی عمدگی سے قائم رکھا گیا ہے۔ جب کعب اس بیت پر پہنچا جو اس باب کا زیبِ عنوان ہے تو آنحضرت ﷺ نے اپنا خرقہ اُتار کر اسے دے دیا جو بعد میں کعب کے خاندان نے چالیس ہزار درہم میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بیچ دیا اور بنی اُمیہ اور بنی عباس کے قبضے میں رہنے کے بعد اب سلطنت عثمانیہ کے پاس محفوظ ہے۔

نے ایک بڑے مجمع کے روبرو ایک علان پڑھ کر سنایا، جس کا مقصد یہ تھا کہ بت پرستی اور اس کی متعلقہ رسوم قبیحہ کو یک قلم ختم کر دیا جائے۔ ''اس سال کے بعد کوئی بت پرست کعبے کا حج نہ کرے گا، کسی شخص کو برہنہ طواف کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

جن قبائل نے رسول اللہ ﷺ سے معاہدات کئے ہیں وہ ان کے ختم ہونے تک ان پر قائم رہیں گے۔ دوسروں کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے کہ اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جائیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کے سوا جن کے ساتھ معاہدے ہو چکے ہیں۔ کسی کے بارے میں آنحضرت ﷺ پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔''

یہ اعلان جو اعلانِ برأت کہلاتا ہے آنحضرت ﷺ کی دانائی و دوراندیشی کا ایک بین ثبوت تھا معاشرے اور اخلاق عامہ کی اس وقت جو حالت تھی ناممکن تھا کہ اسے جاری رہنے دیا جاتا۔ اگر کفار کو اجازت دی جاتی کہ بدستور حج کے موقعے پر آ کر مسلمانوں سے ملتے رہیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے اپنی فحش اور ذلیل رسومات کو بجا لاتے رہیں تو آنحضرت ﷺ نے اتنی محنت و جانفشانی سے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ سب ضائع ہو جاتا۔ تاریخ عربوں کی نسل کی ایک اور شاخ کو جو انہی کی طرح غیر متمدن اور انہیں کی طرح صاحب جوہر تھی، بت پرستوں میں آباد ہوتے دیکھ چکی تھی۔ اس کے پیشواؤں نے یہواہ کی پرستش کو برقرار رکھنے کے لیے بعل کے پرستاروں کو گروہ در گروہ ذبح کیا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ بنی اسرائیل نہ صرف اپنے ماحول کے مضر اثرات کا شکار ہوگئے تھے، بلکہ جن لوگوں کو وہ شروع شروع میں مکروہات و مذمومات پر کاربند ہونے کی وجہ سے بہ نظرِ حقارت دیکھتے تھے وہ ان مذمومات و مکروہات پر عمل کرنے میں ان سے بھی سبقت لے گئے آنحضرت ﷺ کو یہ احساس تھا کہ کفر و شرک کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت و مصالحت آپ ﷺ کے کئے کرائے کام کو یکسر تباہ کر دے گی۔ اس لیے آپ ﷺ نے ایک ایسا طریقہ کار اختیار کیا جو بظاہر تو درشت معلوم ہوتا تھا لیکن بلحاظِ نتائج منفعت بخش تھا۔ وہ کثیر التعداد لوگ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خطبہ سنا اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے، لیکن آئندہ سال ابھی حج کے دن نہ آئے تھے کہ ان کی اکثریت مشرف بہ اسلام ہوگئی۔

نواں باب

رسالت محمدی ﷺ کی تکمیل

اذا جآء نصرُ الله والفتح o ورایت الناس یدخلون فی دین الله افواجا o فسبّح بحمد ربّک واستغفرہ انّہ کان توابا o

۱۰ ہجری اپریل ۶۳۱ء تا ۲۹/ مارچ ۶۳۲ء

پچھلے سال کی طرح اس[1] سال بھی عرب کے مختلف حصوں سے قبیلوں اوران کے سرداروں کی اطاعت کا پیغام لے کر متعدد وفود بارگاہِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ جن معلمین کو مختلف علاقوں میں بھیجتے انہیں ہمیشہ ذیل کی ہدایات دیتے: ''لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنا اور کبھی ان پر سختی نہ کرنا، انہیں بشارت دینا اور وحشت زدہ نہ کرنا تمہیں بہت سے ایسے اہل کتاب ملیں گے جو تم سے پوچھیں گے کہ آسمان کی کلید کیا ہے۔ انہیں یہی جواب دینا کہ آسمان کی کلید حق کی شہادت دینا اور نیک کام کرنا ہے۔''

اب آنحضرت ﷺ کی رسالت پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ جہالت و بربریت میں ڈوبی ہوئی ایک قوم میں ایک نبی مبعوث ہوا تھا ''جوان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، انہیں بری باتوں سے پاک کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے، ان لوگوں کو جو اس سے پہلے مکمل تاریکی میں تھے۔'' اس نے انہیں ذلت، خونخواری اور وہم پرستی میں غرق پایا اوران کے سینوں میں ایک سچے اور محبت کرنے والے خدائے واحد پر ایمان پیدا

[1] ۱۰ ہجری میں یمن اور حجاز کے باقی ماندہ قبائل نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد حضر موت اور کندہ کے قبائل مشرف بہ اسلام ہوئے۔

کیا۔ اس نے انہیں متفرق و منتشر اور ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل میں مصروف پایا، اور انہیں اخوت و مروت کے رشتے میں پرو دیا۔ قدیم الایام سے جزیرہ نمائے عرب پر مکمل اخلاقی ظلمت طاری تھی، روحانیت کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ نہ یہودیت اور نہ عیسائیت عربوں کے دل و دماغ پر کوئی دیرپا نقوش ثبت کر سکی تھی۔ عرب توہم پرستی، جفا پیشگی اور بدکاری میں ڈوبے ہوئے تھے۔ محرمات سے نکاح اور بیٹیوں کو قتل کرنے کا شیطانی دستور عام تھا۔ سب سے بڑا بیٹا باپ کی دوسری جائیداد کے ساتھ اس کی بیواؤں کو بھی ورثہ میں پاتا تھا۔ انسانیت سے گرے ہوئے باپ اپنی نوزائیدہ بچیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے، اور یہ جرم، جو قبائل قریش و کندہ میں خاص طور پر رائج تھا، اسی طرح مایہ فخر سمجھا جاتا تھا جس طرح ہندو راجپوتوں کے ہاں سمجھا جاتا تھا۔ حیات بعد الممات اور نیکی و بدی کی جزا و سزا کا تصور انسانی عمل کے محرکات کی حیثیت سے مفقود تھا۔ یہ تھی عرب کی حالت چند سال پیشتر۔ ان چند سالوں میں کیسی زبردست تبدیلی ہوئی تھی۔ یقیناً فرشتہ سماوی اس زمین کے اوپر سے گزر گیا تھا اور ان لوگوں کے دلوں میں، جو نیم بربریت کی کراہت انگیز رسموں میں مبتلا تھے، ہم آہنگی اور محبت کی روح پھونک گیا تھا۔ وہی سرزمین جو کسی زمانہ میں اخلاقی نقطہ نگاہ سے ایک لق و دق بیابان تھی، جہاں خدا اور انسان کے تمام قوانین کی بے محابا خلاف ورزی کی جاتی تھی، اب تمدن و شائستگی کا گلستان بن گئی تھی۔ بت پرستی اب اپنی بے شمار قباحتوں کے ساتھ نیست و نابود ہو چکی تھی۔ بڑے مذاہب میں اسلام واحد مذہب ہے جس کی ابتدائی تبلیغ ایک ایسی قوم میں ہوئی اور جس نے زیادہ تر ایک ایسی قوم پر حکومت کی جو ابھی تک بد تہذیب کے جھٹپٹے میں بھٹک رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے مؤثر طور پر اپنے پیروؤں کو بت پرستی سے روک دیا۔ بجا طور پر نادر الشہود واقع کو اسلام کی شاندار ترین کامیابی اور اس کے بانی کی حکمت و فطانت کا بین ترین ثبوت تسلیم کیا گیا ہے۔ ایک مدت مدید سے یہودیت اور عیسائیت عرب قبائل کو ان کے مکروہ تو ہمات، ان کی انسانیت سوز رسوم اور اُن کی بے لگام ہوس رانی سے باز رکھنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ لیکن جب تک انہوں نے اس معبوث من اللہ نبی کے "روح میں ہیجان پیدا کرنے والے نغمے" نہ سُنے اس وقت تک اُن کے ذہنوں میں خدائے برحق کا شعور پیدا نہ

ہوا، جو ساری کائنات کو اپنے حیطۂ قدرت و محبت میں لیے ہوئے ہے۔ اس کے بعد محض حیات دنیا اُن کی دوڑ دھوپ کا میدان نہیں رہتی قبر کے ماوراء کوئی اور چیز ہے، اس دنیا کی تمام چیزوں سے بلند تر، پاکیزہ اور مقدس تر جو انہیں عطا و احسان نیکو کاری، انصاف اور ہمہ گیر محبت کی طرف دعوت دے رہی ہے۔ خدا صرف امروز یا فردا کا خدا نہیں، یعنی ایک ایسا بت جو لکڑی اور پتھر کو تراش کر بنایا گیا ہے، بلکہ اس دنیا کا قدرت رکھنے، محبت کرنے والا اور رحیم و رحمٰن آفرید گار ہے۔ آنحضرت ﷺ اس نئی بیداری کے مصور و منبع تھے، یعنی اُن لوگوں کی حیاتِ ابدی کی اُمیدوں کا سرچشمہ اور وہ اس سرچشمے سے سیراب ہونے کے متمنی تھے۔ اب ان کی صرف ایک ہی آرزو تھی، وہ یہ کہ خلوص اور پاکیزگی سے خدا کی بندگی کریں اور زندگی کے تمام معاملات میں اس کے احکام کو بجا لائیں۔ وہ حقائق، وہ نکاتِ حکمت وہ نصائح و احکام جن کے ذریعے گزشتہ بیس سالوں میں آنحضرت ﷺ وقتاً فوقتاً اپنے پیروؤں کو ہدایت کرتے رہے تھے، سب ان کے دلوں پر کالنقش فی الحجر ہو چکے تھے اور اُن کا لائحۂ عمل بن چکے تھے۔ قانون اور اخلاق متحد ہو چکے تھے۔'' اس زمانے سے لے کر جب ابتدائی عیسائیت نے سوئی ہوئی دنیا کو یکدم بیدار کر دیا اور کفر کے خلاف ایک ہلاکت آفریں لڑائی لڑی، روحانی زندگی کی ایسی بیداری دیکھنے میں نہ آئی تھی، یعنی ایسا ایمان جو اُف کیے بغیر قربانیاں برداشت کرتا تھا اور ضمیر کی خاطر دنیوی مال و منال کی بربادی قبول کرتا تھا۔

اب آپ ﷺ کا فریضۂ رسالت تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ یہ امر کہ آپ ﷺ کا تمام کام آپ ﷺ کی زندگی ہی میں مکمل ہو گیا آپ ﷺ کو دوسرے زمانوں اور ملکوں کے پیغمبروں، حکیموں اور فلسفیوں پر ایک امتیازی تفوق بخشتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، زرتشت، ساکیہ منی اور افلاطون، ہر ایک کے خدا کی حاکمیت اور اپنی جمہوریتوں کے متعلق اپنے اپنے تصورات تھے، جن کے ذریعے وہ پستی میں گری ہوئی انسانیت کو اخلاقی زندگی کی ایک نئی بلندی پر لے جا کر کھڑا کر دینا چاہتے تھے، لیکن وہ سب کے سب اپنی آرزوئیں پوری کیے بغیر اور اپنے درخشاں خوابوں کی تعبیر دیکھے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے یا اپنے ہم جنسوں کی اصلاح کا کام خون آشام متبعین اور تاجدار شاگردوں پر

چھوڑ گئے۔ یہ صرف حضرت محمد کے لیے خاص طور پر مقدر تھا کہ آپ ﷺ نہ صرف اپنی رسالت بلکہ اپنے پیشرو نبیوں کی رسالت کا کام پایہ تکمیل کو پہنچائیں۔ یہ صرف آپ ﷺ ہی کی قسمت میں تھا کہ نوع انسانی کو اصلاح کا کام مکمل کر کے جائیں: کوئی تاجدار پیرو فرامین شاہی کے ذریعے آپ ﷺ کی تعلیمات کو نافذ کرانے نہ آیا۔ کیا مسلمان یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ یہ سب کام خود خدا نے انجام دیا؟

وہ بے برگ ونوا مبلغ، جو ابھی اگلے دن اپنے مولد سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور جسے اس جگہ سے جہاں وہ خدا کا پیغام سنانے گیا تھا پتھر مار کر نکال دیا گیا تھا، نو سال کی قلیل مدت میں اپنی قوم کو اخلاقی اور روحانی ذلت کی تاریک گہرائیوں سے نکال کر پاکیزگی اور انصاف کی بلندیوں پر پہنچا گیا۔

آپ ﷺ کی زندگی ایک گراں قدر کام کے بعنوان احسن انجام دینے کی بہترین سرگزشت ہے۔ آپ ﷺ نے ایک مردہ افسردہ قوم میں زندگی کی روح پھونک دی۔ آپ ﷺ نے باہم برسرِ پرخاش قبیلوں کے مجموعہ متفرقات کو وحدت بخش کر ایک ایسی قوم بنا دیا جس کا محرک عمل حیات ابدی کی اُمید تھی روشنی کی جو منتشر شعاعیں اس وقت تک علیحدہ علیحدہ دل انسانی پر پڑی تھیں اُنہیں لے کر آپ ﷺ نے ایک نقطۂ ماسکہ پر مرکوز کر دیا۔ یہ تھا آپ ﷺ کا کارنامہ اور آپ ﷺ نے اسے ایک ایسے ذوق وشوق اور جوش خروش سے انجام دیا جو مخالف قوتوں سے کسی قسم کی مصالحت قبول نہ کرتا تھا اور جس کے لیے کسی ایک مقام پر پہنچ کر ساکن ہو جانا بعید از تصور تھا۔ ایک ایسی ہمت مردانہ سے انجام دیا جو کسی قسم کی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتی تھی اور جو خوف نتائج سے بالکل بری تھی، ایک ایسی وحدتِ مقصد سے انجام دیا جس میں اپنی ذات کے خیال کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وحدتِ الٰہی کا وہ دین جس کی تعلیم خلیل کے کنارے دی گئی تھی مسخ ہو کر ایک ایسے خدا کی پرستش میں تبدیل ہو چکا تھا، جو گوشت و پوست میں مجسم تھا، اور جو لوگ معلم ناصری کے دین کا اقرار باللسان کرتے تھے، ان کے یہاں ایک دیوی کی قدیم پوجا از سرنو رائج ہو چکی تھی۔ معتکف حرا، وہ حکیم اُمی جو ایک کثر بت پرستوں کی قوم میں پیدا ہوا، اُن قوموں کے دلوں پر جنھوں نے اُس کی آواز ایک بار بھی سنی خدا کی وحدانیت اور انسانی مساوات کا اَن مٹ نقش ثبت کر گیا۔ آوازہ

جمہور کی وہ گرج جو اس کے گلے سے نکلی پروہتوں اور بادشاہوں کے استبداد کے خلاف عقلِ انسانی کی بغاوت کا نقارہ تھی۔ متخاصم مذاہب اور مستبدانہ اداروں کے اس زمانے میں، جب روحِ انسانی بعید از فہم اذعانی عقائد کے بوجھ تلے پس رہی تھی اور جسم انسانی اجارہ دارانہ مفادات کی ایڑیوں تلے کچلا جا رہا تھا، اس نے ذات پات اور امتیازی مراعات کی حدود فاصل کو توڑ کر رکھ دیا۔ ذاتی مفادات نے خدا اور انسان کے درمیان جو مورچے باندھ رکھے تھے اس نے انہیں ایک پھونک سے تارِ عنکبوت کی طرح اُڑا دیا اور عبد و معبود کے باہمی تعلقات کے بارے میں تمام اجارہ داریاں ختم کر دیں۔ اس اُمی نبی نے، جو جمہور نوعِ بشر کے نام پیغام لے کر آیا تھا۔ علم و دانش کی قدر و منزلت کا اعلان کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ قلم کے ذریعے انسان کے کارنامے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ قلم ہی کے ذریعے اس کا محاکمہ کیا جاتا ہے اور قلم ہی خدا کی نگاہوں میں اعمالِ انسانی کا آخری منصف ہے۔ اس نے انسان کی عقل اور اس کی اخلاقی قوت ممیزہ سے کام لینے کی جو تاکید کی، اس کا معجزوں سے انکار، اس کا حکومتِ الٰہی کے بارے میں کاملاً جمہوری تصور، اس کے مذہبی مطمح نظر کی عالمگیری، اس کی انسانیت نواز شریعت، یہ سب چیزیں اسے اپنے پیشروؤں سے ممتاز اور عصر جدید سے ملحق کرتی ہیں۔ اس کی زندگی اور اس کے کام کسی پردہ اسرار میں مکتوم نہیں۔ اس کی شخصیت کے گرد جن و پری کی کہانیوں کا کوئی جال نہیں بنا گیا۔

جب عرب کے لوگ جوق در جوق آ کر داخلِ اسلام ہو گئے تو آنحضرت ﷺ نے محسوس کیا کہ آپ ﷺ کا کام پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اور اس خیال سے کہ آپ ﷺ کی حیات دنیوی قریب الاختتام ہے آپ ﷺ نے الوداعی زیارتِ کعبہ کا ارادہ فرمایا۔ ۲۵/ ذوالقعدہ (۲۳/ فروری ۶۳۲ء) کے دن آنحضرت ﷺ مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ[۱] مدینہ سے روانہ ہوئے۔ مکے پہنچ کر مناسک حج ادا کرنے سے پہلے، آپ ﷺ نے جبل العرفات کی چوٹی پر سے ایک خطبہ ارشاد فرمایا (۸/ ذوالحجہ، ۷/ مارچ) جو ابدالآباد تک مسلمانوں کے دل سے محو نہ ہوگا:۔

---

[۱] ابن ہشام، ابن الاثیر۔ مذکور ہے کہ نوے ہزار اور ایک لاکھ چالیس ہزار کے درمیان حاجی آپ ﷺ معیت میں گئے۔ اس حج کو تین ناموں سے یاد کیا جاتا ہے: حجتہ البلاغ، حجتہ الاسلام، حجتہ الوداع

''اے لوگو! میں جو کچھ کہوں اُسے غور سے سنو: شائد آئندہ سال اور اس کے بعد پھر کبھی یہاں تم لوگوں سے میری ملاقات نہ ہو سکے۔''

''اے لوگو! تم پر ایک دوسرے کی جان و مال تا بہ قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینے میں اور شہر میں حرام (قابلِ احترام) ہے۔ تمہیں عنقریب خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کا حساب طلب کرے گا...... اے لوگو! تمہارے عورتوں پر اور عورتوں کے تم پر کچھ حقوق ہیں...... ان کے ساتھ محبت و مہربانی سے پیش آؤ، کیونکہ تم نے انہیں خدا کی ضمانت پر بیوی بنایا ہے اور خدا کے کلام سے ان کا جسم اپنے اوپر حلال کیا ہے۔''

''اپنی امانتوں میں دیانت دار رہو اور گناہ سے بچو!''

''آج سے ہر قسم کا سود ختم کیا جاتا ہے[1]۔ مقروض پر اصل کے سوا کچھ واجب الادا نہیں، اور سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن مطلب کا جو سود دوسروں کے ذمہ واجب الادا ہے اسے باطل کرتا ہوں[2]......'' ''جاہلیت کے تمام انتقام خون موقوف کر دیئے گئے۔ سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے ربیعہ[3] بن حارث بن عبدالمطلب کا خون معاف کرتا ہوں......''

''تمہارے غلام! تمہارے غلام! جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ جو خود پہنو وہی ان

---

[1] ربا، یعنی جنس کی صورت میں سود ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن کاروباری یا تجارتی مقاصد کے لیے دیئے ہوئے قرضوں پر واجب نفع منع نہ تھا۔ جو لوگ اس سے واقف ہیں کہ عرب کے اقتصادی حالات کیا تھے۔ وہ اس قاعدے کی حکمت و دانائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جن اسباب کے پیشِ نظر پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے ملک میں سود خواری کی ممانعت کی انہیں اسباب کی بناء پر عیسائی علمائے دینیات سترہویں صدی کے آخر تک سود خواروں پر لعنتیں بھیجا کرتے تھے۔

[2] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ صاحب ثروت تھے۔ ربا اور خون کے بدلے خون کے خلاف قانون کا نفاذ کرتے وقت آنحضرت ﷺ نے اپنی مغلوب الغضب قوم کو اپنے افراد خاندان کے ایثار کی عملی مثال پیش کی۔

[3] ابن ربیعہ، آنحضرت ﷺ کے عم زاد بھائی بچپن ہی میں غور و پرداخت کے لیے بنی لیث کے خاندان کو سونپ دیئے گئے تھے۔ انہیں بنی ہذیل کے کچھ لوگوں نے بڑی بیدردی سے قتل کر دیا تھا، لیکن اس قتل کا بدلہ ابھی تک نہ لیا گیا تھا۔

کو پہناؤ، اور اگر اُن سے کوئی ایسا قصور ہو جائے جو تم معاف نہ کر سکو تو انہیں جدا کر دو، کیونکہ وہ بھی اسی خدا کے بندے ہیں اور اُن پر ظلم کرنا روا نہیں۔"

"اے لوگو! میری بات کوشِ ہوش سے سنو۔ جان رکھو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور اس رشتے کی وجہ سے کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان بھائی کی کسی شے پر اس کی اجازت کے بغیر تصرف جائز نہیں۔ ورنہ یہ ایک دوسرے پر ظلم ہوگا۔"

"جو لوگ اس وقت یہاں موجود ہیں وہ یہ باتیں ان لوگوں کو سنا دیں۔ جو یہاں موجود نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ جنہیں یہ باتیں بتائی جائیں، ان لوگوں سے بہتر انہیں یاد رکھیں جنہوں نے اپنے کانوں سنیں[1]۔"

اس خطبے میں نہ تو اتنی شاعری ہے نہ اتنا تصوف جتنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پہاڑی خطبے میں تھا، لیکن اس میں نہ صرف ایسی عملی دانشمندی ہے جو اعلیٰ طبائع کو پسند آتی ہے بلکہ ادنیٰ طبائع کی صلاحیتوں اور تقاضوں سے مطابقت بھی ہے، جنہیں اخلاقی رہنمائی کے لیے مثبت اور مکمل ہدایات کی ضرورت ہوتی ہے۔

لوگوں نے جس ذوق وشوق سے آپ ﷺ کے ارشادات کو سنا اس سے آپ ﷺ اس قدر متاثر ہوئے کو خطبے کے اختتام پر آپ ﷺ نے فرمایا: "یا خدا! میں نے اپنا پیغام پہنچا دیا اور اپنا کام پورا کر دیا!" مجمع بیک آواز پکار اُٹھا "ہاں! آپ ﷺ نے اپنا کام پورا کر دیا۔" اس پر آپ ﷺ نے فرمایا، "اے خدا! تو گواہ رہنا!" ان الفاظ کے ساتھ آنحضرت ﷺ نے اپنا خطبہ ختم فرمایا، جو روایات کے مطابق طوالت، فصاحت و بلاغت اور جوش وخروش میں آپ اپنی مثال تھا۔ مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد آپ ﷺ اپنے متبعین کے ہمراہ مدینے واپس آ گئے۔

۱۱ ہجری ۲۹/ مارچ ۶۳۲ء تا ۱۸/ مارچ ۶۳۳ء

آنحضرت ﷺ کی زندگی کا آخری سال مدینے میں گزرا، جو علاقے اور قبیلے اسلام قبول کر کے اسلامی مملکت کے حصے بن چکے تھے آپ ﷺ نے انہیں منظم کیا۔ اگرچہ شام وعراق کے زیادہ تر عرب ابھی تک

[1] ہر جملہ کے بعد آنحضرت ﷺ توقف فرماتے اور ربیعہ بن اُمیہ بن خلف بآواز بلند آپ کے الفاظ کا اعادہ کرتے، تاکہ مجمع کے سب لوگ ساری باتیں پوری طرح سن لیں۔

عیسائی تھے، لیکن تمام عرب داخلِ اسلام ہو چکا تھا۔ مختلف صوبوں اور قبیلوں میں فرائض اسلام کی تعلیم دینے، عدالت کرنے اور جزیہ وصول کرنے کے لیے حکام بھیجے گئے۔ معاذ ابن جبل یمن بھیجے گئے اور انہیں رخصت کرتے وقت آنحضرت ﷺ نے یہ ہدایت کی کہ نظم و نسق کے معاملات میں اگر انہیں قرآن سے سند نہ ملے تو اپنی ذاتی رائے پر اعتماد کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمامہ بھیجتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''جب کوئی معاملہ لے کر تمہارے پاس آئیں تو فریقین کی بات سُنے بغیر فیصلہ نہ کرنا۔''

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں اس مقصد سے بازنطینیوں کے خلاف ایک مہم بھیجنے کی تیاریاں کی گئیں کہ شام میں مسلم سفیر کے قتل کا خون بہا جو ایک مدت سے واجب الوصول چلا آ رہا تھا، وصول کیا جائے۔ فوج شہر کے باہر خیمے لگائے کوچ کے لیے تیار کھڑی تھی۔ لیکن خیبر میں ایک یہودن نے آنحضرت ﷺ کو جو زہر دیا تھا اور جو آہستہ آہستہ جسم میں سرایت کر گیا تھا، اس کے اثرات اب ظاہر ہونے لگے اور یہ دکھائی دینے لگا کہ اب آپ ﷺ کی زندگی کے زیادہ دن باقی نہیں۔ اس لیے مہم کو روک دیا گیا۔ آپ ﷺ کی علالت کی خبر سے دور افتادہ صوبوں میں بدنظمی بھی پیدا ہوگئی۔ نبوت کے تین جھوٹے دعویدار اُٹھ کھڑے ہوئے تاکہ نبوت کا سوانگ رچا کر اوباشی اور غارت گری کا دور دورہ قائم کریں۔ انہوں نے اپنے قبیلوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی جعلسازیوں سے کام لیا۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک الاسود بن کعب تھا، وہ یمن کا سردار تھا، امیر کبیر، چالاک و ہوشیار اور شعبدہ بازی میں طاق سادہ لوح قبائلیوں نے اس کے شعبدوں کو معجزے سمجھا اور اس کی اطاعت قبول کر لی۔ چنانچہ وہ ان کی مدد سے گردونواح کے کئی شہر فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے شہر یار کو قتل کر دیا جسے آنحضرت ﷺ نے اس کے باپ بازان کی جگہ، جس کی موت انہی دنوں میں واقع ہوئی تھی، صنعا کا حاکم مقرر کیا تھا۔ بازان خسروانِ ایران کے ماتحت یمن کا وائسرائے تھا اور قبولِ اسلام کے بعد آنحضرت ﷺ نے اسے اس عہدے پر قائم رہنے دیا تھا۔ اپنی زندگی میں اسے نہ صرف ان ایرانیوں پر جو یمن میں آباد تھے اور ابنا کہلاتے تھے بلکہ وہاں کے عربوں پر بھی بہت اثر و رسوخ حاصل رہا تھا، چنانچہ اس کی مثال کی تقلید میں یمن کے تمام

ایرانی داخل اسلام ہو گئے تھے۔ جعلساز اسود نے شہر کو قتل کر کے اس کی بیوہ مرزبانہ سے جبراً شادی کر لی تھی۔ ایک رات جب وہ رنگ رلیاں منانے کے بعد شراب کے نشے میں دُھت پڑا تھا اپنا نے اُسے مرزبانہ کی مدد سے قتل کر دیا۔ باقی دو مدعیانِ نبوت، طلیحہ بن خویلد اور ابو ثمامہ حران بن حبیب معروف بہ مسیلمہ کی سرکوبی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مسند نشینِ خلافت ہونے کے بعد ہوئی۔ مسیلمہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ذیل کا خط لکھنے کی جسارت کی:۔

''خدا کے رسول مسیلمہ کی طرف سے خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام! میں تمہارا شریکِ کار ہوں' اقتدار ہم دونوں میں تقسیم ہو جانا چاہیے۔ آدھی مملکت میری ہو اور آدھی تمہاری۔ لیکن قریش غاصب لوگ ہیں اور انصاف کے عادی نہیں۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوِ طبع کا مظہر ہے:'' خدائے رحمٰن ورحیم کے نام پر، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مسیلمہ کذاب کی طرف۔ سلام ہو اُن پر جو سیدھا، راستہ اختیار کرتے ہیں۔ زمین خدا کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اُسے عطا کرتا ہے۔ فلاحِ آخرت صرف اہلِ تقویٰ کے لیے ہے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری ایام ایک نمایاں سکونِ خاطر اور اطمینان قلب سے گزارے، جس کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضعف و نقاہت کے باوجود وفات سے تین دن قبل تک نماز کی امامت کرتے رہے۔ ایک روز آدھی رات کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنت البقیع میں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے پرانے رفقاء کی آخری آرامگاہ تھی، تشریف لے گئے اور رو رو کر ان کے لیے دعائے مغفرت مانگتے رہے۔ علالت کے دوران قیام کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مکان انتخاب کیا، جو مسجد سے متصل تھا۔ اور جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں تاب وتواں باقی رہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم جماعت کے ساتھ شریکِ نماز ہوتے رہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری مرتبہ مسجد میں تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سہارا دیئے ہوئے تھے۔ جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس تھے ان سب نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر ایک پرسکون تبسم ہے۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع سے یوں خطاب کیا:۔ ''مسلمانو! اگر میں نے تم میں

سے کسی پر کوئی زیادتی کی ہے تو میں اس کے قصاص کے لیے حاضر ہوں۔ اگر مجھے کسی کا کچھ دینا ہے تو میرا جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے۔" مجمع میں سے ایک شخص نے اُٹھ کر تین درہموں کا مطالبہ کیا جو اس نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد پر کسی غریب شخص کو دیئے تھے۔ آپ ﷺ نے تین درہم فوراً ادا کر دئے اور فرمایا۔ "اس دنیا میں شرمسار ہونا آخرت میں شرمسار ہونے سے بہتر ہے۔" پھر آپ ﷺ نے حاضرین کے حق میں اور ان مسلمانوں کے حق میں جو دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے دعائے خیر مانگی۔ سب کو فرائضِ دینی کی بجا آوری اور قیامِ صلح و امن کی ہدایت کی اور قرآن کے ان الفاظ پر خاتمہ کلام کیا: "دارِ آخرت ہم اُن لوگوں کے لیے خاص کرتے ہیں جو تکبر اور فساد نہیں کرتے۔ آخرت کی بھلائی متقیوں کے لیے ہے" (القصص ۸۳)

اس کے بعد آپ ﷺ کبھی مسجد میں تشریف نہ لے جا سکے۔ آپ ﷺ کی نقاہت بسرعت بڑھتی چلی گئی دوشنبے کو دوپہر کے وقت (۱۲/ ربیع الاول ۱۱ء۔ ۸/ جون ۶۳۲ء کے دن) خشوع و خضوع سے زیرِ لب دعا مانگنے کے عالم میں اس پیغمبر اعظم ﷺ کی روح عالمِ قدس میں "الرفیق الاعلیٰ من الجنۃ" کے پاس پہنچ گئی۔

یوں ختم ہوئی ایک ایسی زندگی جو شروع سے آخر تک خدا اور اس کی مخلوق کی خدمت کے لیے وقف تھی۔ کیا اور کوئی زندگی ایسی نظر آتی ہے جو اتنی آزمائشوں اور تحریصوں سے گزر کر اتنی بلندی تک پہنچی ہو؟ کیا اور کوئی زندگی ایسی ہے جو اتنے مخالفانہ حملوں کا ہدف بنی ہو اور جسے پھر بھی کوئی گزند نہ پہنچا ہو؟ وہ جو ایک بے جاہ و حشم مبلغ تھا عرب کا فرماں روا، کسراؤں اور قیصروں کا ہمسر اور قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والا بن گیا۔ لیکن اس کی فطرت و سیرت کے امتیازی اوصاف وہی رہے......وہی انکسار وفروتنی، وہی کریم النفسی، وہی پاکیزہ دلی، وہی زہد و قناعت، وہی نفاست و لطافتِ احساس، ادائے فرض میں وہی جاں فشانی، یعنی تمام وہ خوبیاں اور محبوبیاں جنہوں نے اُسے "الامین" کا لقب دلوایا تھا۔ اپنی ابتدائی زندگی میں ایک مرتبہ، جب آپ مکے کے ایک بارسوخ شہری سے مذہبی گفتگو میں مصروف تھے تو آپ ایک نابینا طالب حق کی طرف متوجہ نہ ہوئے تھے جو آپ سے ہم کلامی کا آرزومند تھا۔ آپ ہمیشہ تاسف و پشیمانی کے

ساتھ اس واقع کا ذکر کرتے اور یہ اعلان کرتے رہے کہ خدا نے آپ کے عمل کو ناپسند فرمایا[1] ایک ایسی پاکیزہ، ایسی رقیق و شفیق اور ساتھ ہی ساتھ ایسی عالی ہمت طبیعت کو دیکھ کر دل میں نہ صرف عزت، بلکہ محبت پیدا ہوتی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ عرب مصنفین بڑے فخر سے ابن عبداللہ کے محاسب اخلاق اور فراست و کیاست کا تذکرہ کرتے ہیں۔ بڑوں کے ساتھ آپ ﷺ کی تواضع، چھوٹوں کے ساتھ آپ ﷺ کی نرمی و شفقت اور متکبروں کے ساتھ آپ ﷺ کا پر وقار طرز عمل آپ کو ہر کسی سے تعظیم و تحسین کا خراج دلواتا۔ آپ ﷺ کا چہرہ آپ ﷺ کی نیک دلی کا آئینہ تھا۔ صحیفۂ فطرت کا یہ عالم تبحر، اُمی ہونے کے باوجود، ایک وسیع قلب کا مالک تھا، جسے روحِ کائنات کے ساتھ گہرے رابطے نے بلندی بخش دی تھی اور جسے عالم وامی دونوں پر یکساں اثر انداز ہونے کا ملکہ عطا ہوا تھا۔ آپ ﷺ کے چہرے پر ایک شاہانہ تمکنت اور ذکاوت و ذہانت برستی تھی جو ہر اس شخص کو جو آپ ﷺ سے ملتا عزت و محبت سے مملو کر دیتی۔

آپ ﷺ کی حیرت انگیز عالی طبعی، آپ ﷺ کی لطافتِ احساس، آپ ﷺ کی نفاستِ جذبات، آپ ﷺ کی پاکیزگی و راست بازی احادیث کے مستقل موضوع ہیں۔ آپ ﷺ اپنے سے ادنیٰ کے ساتھ بڑی نرمی و دلجوئی کے ساتھ پیش آتے تھے اور کبھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی آپ ﷺ کے ذاتی خدمت گار کو جھڑکے خواہ وہ کچھ بھی کرے۔ آپ ﷺ کے خدمت گار انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ ''میں دس سال تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہا اور اس تمام عرصے میں آپ ﷺ نے مجھے کبھی اُف تک نہ کہی۔'' آپ ﷺ کو

---

[1] اسی واقعہ کی طرف سورۂ عبس میں اشارہ کیا گیا ہے۔

''پیغمبر چیں بجبیں ہو گیا اور متوجہ نہ ہوا، کیونکہ اس کے پاس اندھا آیا (اے پیغمبر) تجھے کیا خبر کہ شاید وہ پاک ہو جاتا یا نصیحت حاصل کرتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی۔ جو شخص دین سے بے پروائی کرتا ہے، اس کی طرف تو تو خوب متوجہ ہوتا ہے۔ حالانکہ تجھ پر کوئی الزام نہیں اگر وہ پاک وصاف نہ بن جائے اور جو شخص خدا سے ڈر کر تیرے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے تو اس سے بے اعتنائی برتتا ہے۔ آئندہ ایسا ہرگز نہ کیجیو ......''

اس سورہ کے نزول کے بعد جب کبھی آنحضرت ﷺ اس نابینا (عبداللہ ابن ام مکتوم۔ مترجم) کو دیکھتے تو اس کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتے اور فرماتے ''اس شخص کا آنا میرے سر آنکھوں پر جس کی خاطر میرے خدا نے مجھے تنبیہ کی۔'' آپ نے اسے دو مرتبہ مدینے کا عامل مقرر کیا۔

اپنے کنبے والوں سے بڑی محبت تھی۔ آپ ﷺ کے ایک بیٹے نے اپنی کھلائی کے دھوئیں سے بھرے ہوئے گھر کے اندر آپ ﷺ کی گود میں دم توڑا۔ آپ ﷺ کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ آپ ﷺ اکثر راستہ چلتے ہوئے انہیں روک لیتے اور ان کے گالوں کو پیار سے تھپکتے۔ آپ ﷺ نے زندگی بھر کبھی کسی پر ہاتھ نہ اُٹھایا۔

سخت ترین کلمات جو آپ ﷺ نے کبھی اثنائے گفتگو میں کسی کی بابت کہے یہ تھے، ''اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس کی پیشانی پر کیچڑ![1]'' جب آپ ﷺ سے کسی پر لعنت بھیجنے کو کہا جاتا تو آپ ﷺ فرماتے، ''میں دنیا کے لیے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

آپ ﷺ بیماروں کی عیادت کو جاتے، ہر جنازے میں شریک ہوتے، غلاموں کی دعوت بھی قبول کرتے، اپنا لباس اپنے ہاتھوں سے رفو کرتے، اپنی بکریاں خود دوہتے اور اپنے سارے کام خود کرتے۔ مصافحہ کرتے وقت آپ ﷺ کبھی دوسرے کا ہاتھ نہ چھوڑتے جب تک وہ خود نہ چھڑاتا اور اس وقت تک رخصت نہ ہوئے جب تک دوسرا رخصت نہ ہوتا۔ آپ ﷺ کا ہاتھ سب سے زیادہ سخی، آپ ﷺ کا سینہ سب سے زیادہ پُر ہمت اور آپ ﷺ کی زبان سب سے زیادہ راست گو تھی۔

---

[1] لین پول نے آنحضرت ﷺ کے شمائل و خصائل کا ایسا عمدہ اور صحیح نقشہ پیش کیا ہے کہ میں اُس کا اقتباس دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ''اس شخص میں ہمت و شجاعت کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی ملائمت و لطافت تھی کہ اس کے بارے میں رائے قائم کرتے وقت ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ اس قبیل کی طبیعت انسان کے دل میں عزت بلکہ محبت کے جو جذبات پیدا کرتی ہے اس سے انسان کی قوتِ فیصلہ کہیں غیر شعوری طور پر متاثر نہ ہو جائے۔ یہ شخص جس نے سالہا سال تک تن تنہا اپنی قوم کی مخالفت کا مقابلہ کیا وہی شخص ہے جس نے کبھی اپنا ہاتھ کسی کے دوستانہ مصافحہ سے نہ ہٹایا وہی شخص ہے جو بچوں کا محبوب تھا اور جس نے کبھی ایسا نہ کیا کہ اگر راہ چلتے اسے بچوں کا کوئی چھوٹا سا گروہ ملا تو اس نے اُن کی طرف مسکرا کر نہ دیکھا ہو اور اِن سے شفقت و محبت کی دو باتیں نہ کی ہوں، جن میں اس کی شیریں آواز لطف و مہربانی کی اور بھی زیادہ چاشنی ملا دیتی تھی۔ اس کی بے لاگ دوستی، اس کی کریمانہ فیاضی، اس کی بے خوف جرأت، اُس کی عالی ہمت رجائیت، یہ سب اوصاف تنقید کو تحسین میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس میں ایک والہانہ جوش و خروش تھا، ان مستحسن معنوں میں جن میں جوش خروش انسان کی ایک صفتِ حمیدہ ہوتی ہے، یعنی وہ واحد صفت جو انسانوں کو اپنی زندگیاں نباتات و جمادات کی طرح بے مصرف گزار دینے سے بچاتی ہے۔ جوش و خروش کا استعمال اکثر مفسدانہ طور پر کیا جاتا ہے۔ وہ اس وقت جب وہ ذمیم مقاصد سے وابستہ ہو یا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ بنجر زمین میں ہل چلانے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

آپ ﷺ جس کسی کی حمایت کا وعدہ کرتے اس کی حمایت میں سب سے زیادہ استوار رہتے۔ آپ ﷺ کی گفتگو سب سے زیادہ شیریں اور دلنواز تھی۔ جو کوئی آپ ﷺ سے ملتا اس کا دل جذبہ احترام سے لبریز ہو جاتا۔ جو لوگ آپ ﷺ کے قریب آتے وہ آپ ﷺ کے والہ و شیدا ہو جاتے۔ جو لوگ آپ ﷺ کا تذکرہ کرتے وہ یہی کہتے: ''میں نے اگلوں اور پچھلوں میں نہ ایسا کوئی اور شخص دیکھا نہ اس کا حال سُنا۔'' آپ ﷺ نہایت کم گو تھے اور جب آپ ﷺ گفتگو کرتے تو اس طرح سوچ سوچ کر اور بات پر زور دے دے کر کہ سننے والا کبھی آپ ﷺ کی بات نہ بھولتا۔ ''تواضع و دلنوازی، صبر و تحمل، ایثار اور سخاوت، یہ تھیں وہ صفات جو آپ ﷺ کے کردار سے ٹپکتی تھیں اور جو ہر ایک کے دل کو مسخر کر لیتی تھیں۔ محروموں اور غمزدوں سے آپ ﷺ بڑی دلجوئی اور ہمدردی سے پیش آتے ...... عسرت کے دنوں میں بھی آپ ﷺ دوسروں کو اپنے کھانے میں شریک کرتے اور اپنے ارد گرد کے لوگوں کے آرام کا حد درجہ خیال رکھتے۔'' اگر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی آپ ﷺ کو راستے میں روک کر اپنا دکھڑا سنانا چاہتا تو آپ ﷺ کھڑے ہو کر اس کی بات اول سے آخر تک سنتے۔ آپ ﷺ کم مایہ سے کم مایہ لوگوں کے بھی گھر جا کر غم و مصیبت کے وقت انہیں تسلی دیتے۔ ادنیٰ ترین غلام بھی آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر آپ ﷺ کو لے جاتے تاکہ آپ ﷺ اُن کے آقاؤں سے بدسلوکی کی تلافی کرائیں یا غلامی سے رہائی دلوائیں۔ آپ ﷺ خدا سے دعا کے بغیر کبھی کھانا کھانے نہ بیٹھے اور خدا کا شکر ادا کیے بغیر کبھی دستر خوان سے نہ اُٹھے۔ آپ ﷺ نے اپنے اوقات کو بڑی باقاعدگی سے تقسیم کر رکھا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۱) کے مترادف ہوتا ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ محمد ﷺ کا جوش و خروش اس قسم کا نہ تھا۔ اس نے جوش و خروش سے ایسے میں کام لیا۔ جب جوش خروش دنیا میں انقلاب کی آگ لگا دینے کا واحد وسیلہ تھا اور اس کا جوش و خروش ایک اعلیٰ مقصد کے حاصل کرنے کا ایک افضل طریقہ تھا۔ وہ ان معدودے چند خوش اقبال لوگوں میں تھا جنہیں ایک عظیم صداقت کو اپنا سر چشمۂ حیات بنانے کی سعادتِ غیر مترقبہ نصیب ہوئی۔ وہ خدائے واحد کا پیغمبر تھا، اور اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس نے اس امر کو فراموش نہ کیا اور نہ اس نے اس پیغام کو فراموش کیا جو اس کا مدارِ زندگی تھا۔ اس نے اپنی قوم کو جو بشارت دی وہ ایک ایسے عظیم الشان وقار کے ساتھ دی جس کا سرچشمہ وہ احساس تھا جو اُسے اپنے اونچے منصب کے بارے میں تھا، اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایسے انکسار سے دی جس کی بنیاد اس کا ایک انسانِ ضعیف البنیان ہونے کا شعور تھا۔''

دن کے وقت، نماز کے اوقات کے علاوہ، آپ ﷺ لوگوں سے ملاقات کرتے اور حکومت کا کاروبار انجام دیتے۔ رات کو آپ ﷺ بہت تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتے اور باقی رات عبادت میں گزارتے۔ آپ ﷺ کو غریبوں سے محبت تھی اور آپ ﷺ اُن کی عزت کرتے تھے۔ بہت سے بے خانماں لوگ رات کو مسجد میں سوتے، جو آپ ﷺ کے گھر سے ملحق تھی۔ ہر شام آپ ﷺ کا معمول تھا کہ آپ ﷺ اُن میں سے چند ایک کو بلا کر اپنے غریبانہ کھانے میں شریک کرتے۔ باقی لوگ آپ ﷺ کے سربرآوردہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مہمان بنتے۔ آپ ﷺ اپنے بدترین دشمنوں سے بھی عفو درگزر اور رحم و کرم کا سلوک کرتے۔ اگرچہ آپ ﷺ مملکت کے دشمنوں کا بڑی سختی سے محاسبہ کرتے لیکن جہاں تک آپ ﷺ کی ذات کا تعلق تھا آپ ﷺ فتح و کامیابی کی گھڑیوں میں م جو دل انسانی کے لیے آزمائش کی گھڑیاں ہوتی ہیں، کیا استہزا، کیا توہین، کیا زیادتیاں، کیا ظلم و ستم سب کچھ فراموش کر دیتے اور بدترین مجرموں کو بھی معافی بخش دیتے۔

آپ ﷺ کی عادات میں انتہا درجے کی سادگی و بے تکلفی تھی۔ آپ ﷺ کا طریق بود و باش، آپ ﷺ کا لباس، آپ ﷺ کے گھر کے سامان سب میں اخیر تک ایک بد ویانہ سادگی رہی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ کئی کئی وقت آپ ﷺ فاقے سے رہتے۔ اکثر آپ ﷺ کا گزارہ صرف کھجوروں اور پانی پر ہوتا تھا۔ ایسا بارہا ہوا کہ مہینوں تک ناداری کی وجہ سے آپ ﷺ کے گھر میں آگ نہ جلی۔ مسلمان مورخین کہتے ہیں کہ خدا نے دنیا کے خزانوں کی کنجیاں آپ ﷺ کے سامنے رکھ دی تھیں، لیکن آپ ﷺ نے انہیں قبول نہ کیا۔

اس حیرت انگیز معلم کا دماغ اپنی عقلیت نوازی اور ترقی پسندی کے اعتبار سے عہد جدید کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، اس کی تعلیم کے مطابق دائمی جد و جہد انسانی زندگی کا ایک لازمہ ہے۔ لیس الانسان الا ما سعیٰ اور السعی منی والا تمام من اللہ۔ یہ تھے اس کے بنیادی سبق۔ اس نے یہ تعلیم دی کہ دنیا ایک قرینے سے ترتیب دی ہوئی تخلیق ہے جس کا انتظام و اہتمام ایک عقل کل کر رہی ہے جو ساری کائنات پر محیط ہے۔ اس نے اعلان کیا، کل امرٍ مرھونٌ بما وقتھا۔ لیکن اس کے باوجود انسانی ارادہ اپنی نجات کی کوشش کرنے کے لیے آزاد ہے۔ اس کی ہمدردی آفاق گیر تھی۔ اُسے اس لیے

رحمۃ اللعالمین کا لقب ملا کہ اس نے ساری مخلوقات کے حق میں خدا سے رحمت کی دعا کی۔ وہی تھا جس نے یہ کہا تھا کہ ایک زندگی کا بچانا ساری نوع انسانی کے بچانے کے برابر ہے۔

اس کا معاشرتی تصور تعمیری تھا، تخریبی نہ تھا۔ انتہا درجے کی روحانی ازخودرفتگی کی کیفیت میں بھی اس نے کبھی عائلی زندگی کے تقدس کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس کے نزدیک خدمتِ خلق افضل العبادات تھی۔ اس نے اپنے پیرووں کو کبھی یہ تلقین نہ کی کہ جن لوگوں کی طرف سے اُن پر فرائض عائد ہوتے تھے ان کا ساتھ چھوڑ دیں، بلکہ اس نے ہمیشہ انہیں یہی تعلیم دی کہ وہ ان فرائض کو ادا کر کے ثواب و اجر کمائیں۔ بچے اس کی نگاہ میں خدا کی امانت تھے اور ان کا محبت و شفقت سے پالنا پوسنا ایک خدائی فرض تھا۔ اسی طرح بچوں کا فرض تھا کہ والدین سے عزت و محبت سے پیش آئیں۔ اس کے مقرر کیے ہوئے دائرہ فرائض میں رشتہ دار، ہمسائے اور غربا و مساکین بھی داخل تھے۔

اُسے اپنا پیغام دیے ہوئے چودہ صدیاں گزر گئی ہیں، لیکن جو محبت و عقیدت اس نے لاتعداد انسانوں کے دلوں میں پیدا کی مرورِ زمانہ سے اُس میں کوئی فرق نہیں پڑا، اور اس کے متبعین کے دلوں میں اور ان کی زبانوں پر جس طرح اُس وقت یہ الفاظ تھے اسی طرح اب بھی ہیں:

رُوحِی فِداکَ یَا رسُولَ اللہ

دسواں باب

مسئلہ خلافت

واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا

وہ روحانی زندگی جو پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی قوم میں پھونک دی تھی آپ ﷺ کی وفات کے ساتھ ختم نہ ہوگئی۔ شروع ہی سے یہ ایک رکنِ ایمان تھا کہ جہاں کہیں نماز باجماعت ادا کی جاری ہو وہاں آپ ﷺ روحانی طور پر موجود ہوتے ہیں اور آپ ﷺ کے جانشین آپ ﷺ کے روحانی نمائندے تھے۔ ہادیٔ اسلام کی روح کا مسلمانوں کی نماز میں ہر جگہ موجود ہونا وہ رشتہ ہے جو انسان کی روح اور ذاتِ باری کے درمیان رابطہ قائم کرتا ہے۔ خاندانی رقابتوں اور فرقہ وارانہ تنازعوں کے باوجود آپ ﷺ کی روحانی موجودگی کے اس صوفیانہ تصور نے دینِ اسلام کو ایک ایسی قوت و سالمیت بخشی ہے جس کے بارے میں جتنا کچھ بھی کہا جائے کم ہے[1]۔

دو بڑے فرقے جن میں اسلام ایک ابتدائی مرحلے ہی میں تقسیم ہوگیا اس پر متفق ہیں کہ شریعت نے جو مراسم و فرائض مقرر کئے ہیں اُن کے کما حقہ، ادا کئے جانے کا دارومدار پیغمبر اسلام ﷺ کے ایک نمائندہ و نائب کی موجودگی پر ہے، جو دین و ملت کا امام ہوتا ہے۔

ائمۂ اہل بیت کے متبعین نے اپنا ہی ایک فلسفہ وضع کیا ہے جو اہلِ سنت کے عقیدے سے بالکل مختلف ہے۔ اُن کی رائے میں آنحضرت ﷺ کا ورثہ روحانی حضرت علی ؓ

---

[1] آنحضرت ﷺ کی روح کا نمازوں میں موجود رہنا قطعی اسلام کا رکن نہیں۔ تعجب ہے فاضل مصنف نے اُسے آرٹیکل آف فیتھ کیونکر قرار دیا ہے۔

کو ملا اور پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ان کی جو اولاد تھی اس کو ملا۔ اُن کے نزدیک امامت بامرِ الٰہی سلسلہ بہ سلسلہ خاندانِ نبوی ﷺ میں چلی آرہی ہے۔ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کو برحق تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنہیں خود رسولِ خدا ﷺ نے اپنا جانشین کہا، بر بنائے حق پہلے خلیفہ المسلمین اور امام المومنین تھے اور اُن کی شہادت کے بعد روحانی پیشوائی اُن کی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولادِ نرینہ کو یکے بعد دیگرے ملی، تا آں کہ یہ سلسلہ گیارھویں امام یعنی امام حسن رضی اللہ عنہ عسکری تک پہنچا، جن کی وفات عباسی خلیفہ معتمد کے زمانے میں ۸۷۴ء یا ۲۶۰ھ میں ہوئی۔ امام حسن رضی اللہ عنہ عسکری کی وفات پر امامت اُن کے بیٹے محمد المہدی کے حصے میں آئی، جو امامِ آخر الزمان تھے۔ خانوادۂ نبوی ﷺ کے ان اماموں کی داستان بڑی دردناک ہے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ عسکری کے والد کو جابر متوکل نے مدینے سے سامرہ جلا وطن کر دیا اور مرتے دم تک وہیں قید رکھا۔ اسی طرح متوکل کے جانشینوں کے حسد و رشک کی وجہ سے امام حسنؑ مدتوں تک قید رہے۔ ان کا بیٹا، جو ابھی صرف پانچ برس کا تھا، انہیں تلاش کرتے کرتے ایک غار میں داخل ہوا جو اُن کے گھر کے قریب ہی تھا۔ اُس غار سے وہ پھر کبھی واپس نہ آیا۔ اس حادثہ دلگداز کی رقت انگیزی اُس اُمید کا سرچشمہ بنی جو شیعوں کے سینوں میں مدتوں تک زندہ رہی کہ یہ معصوم بچہ ایک دن واپس آکر دنیا کو فسق و فجور اور ظلم و ستم سے پاک کرے گا۔ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں، جب ابن خلدون اپنی عظیم کتاب کی تصنیف میں مصروف تھا، شیعہ لوگ شام کے وقت اس غار کے منہ کے سامنے جمع ہو کر اس بچے سے واپسی کی التجائیں کیا کرتے تھے، ایک طویل اور حسرت آگیں انتظار کے بعد وہ مایوس ہو کر اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے تھے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ یہ اُن کا آئے دن کا معمول تھا۔ ”جب ان سے کہا جاتا کہ بچے کا اتنی مدت تک زندہ رہنا محال تھا تو وہ جواب دیتے کہ اگر حضرت خضر زندہ رہ سکتے تھے تو اُن کا امام کیوں زندہ نہ رہ سکتا تھا۔“ اس امام کو اہلِ تشیع امامِ منتظر، حجتہ اور قائم کے القاب سے پکارتے ہیں۔

مذاہب کا کوئی فلسفی مزاج طالب علم ضرور محسوس کرے گا کہ کیا شیعہ اور کیا سنی دونوں کے عقائد پرانے عقائد سے ایک عجیب و غریب مشابہت رکھتے ہیں۔ زردشتیوں

کے یہاں سلیوقی حکمرانوں کے جبر وتشدد نے اس عقیدے کو جنم دیا کہ ایک مبعوث من اللہ نجات دہندہ، جس کا نام سوسیوش تھا، خراسان سے خروج کرے گا اور انہیں غیر ملکی حکمرانوں کے پنجہ ستم سے رہائی دلائے گا۔ کچھ اسی قسم کے اسباب نے یہودیوں کے سینوں میں مسیحا کی آمد کی پرتب وتاب اُمیدیں پیدا کیں۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ مسیحا کا ظہور ابھی نہیں ہوا۔ اسی طرح سُنیوں کا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا نجات دہندہ ابھی پیدا نہیں ہوا۔ عیسائیوں کا ایمان ہے کہ نجات دہندہ ایک بار آ کر جا چکا ہے، لیکن دوبارہ آئے گا۔ عیسائیوں کی طرح اثنا عشری امام مہدی کے ظہورِ ثانی کے منتظر ہیں، جو دنیا کو شر اور ظلم سے پاک کریں گے۔ ان تصورات کی اصل وابتدا اور ان کے تنوع کی وجوہات ایک ہی قسم کے اسباب میں ملتی ہیں۔ جس دور میں امام مہدی کا تصور دو جدا جدا صورتوں میں شکل پذیر ہوا، اس کے مظاہر ان مظاہر سے مشابہہ تھے جو قدیم تر مذاہب کی تاریخ میں رونما ہوئے۔ عیسوی اور یہودی دنیا کی طرح دنیائے اسلام میں بھی ایک ہادی موعود کے آنے اور آ کر دنیا کو معصیت اور مصیبت سے نجات دلانے کی دعائیں ہر شام گنبد نیلی میں گونجتی ہیں۔

شیعوں کا ایمان ہے کہ ان کا امام اگرچہ غائب ہے پھر بھی ان کی عبادتوں میں روحانی طور پر موجود ہوتا ہے۔ مفسرانِ شریعت اور پیشوایانِ دین روئے زمین پر اس کے نائب ہیں۔ بلکہ سربراہان حکومت بھی دنیوی معاملات میں اُس کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ایک اور چیز جو سنیوں اور شیعوں میں مابہ الاختلاف ہے یہ مسئلہ ہے کہ امام میں کون کون سے اوصاف کا موجود ہونا لازمی ہے۔ شیعوں کے نزدیک امام کو معصوم یعنی بری از گناہ ہونا چاہیے اور ان کی رائے میں یہ وصف صرف ان کے ائمہ میں پایا جاتا ہے۔ علاوہ بریں وہ یہ کہتے ہیں کہ امام صرف وہی ہوسکتا ہے جو افضل البشر ہو۔

سنی عقائد، جو مسلمانوں کی اکثریت کی زندگیوں، افکار اور کردار پر حکمران ہیں، شیعہ تصورات کی عین ضد ہیں۔ سنی شریعت اس پر مصر ہے کہ مسلمانوں کی نماز کو بار گاہِ ایزدی میں مقبول بنانے کی خاطر امام کا فی الواقع جسمانی طور پر موجود ہونا ضروری ہے اور جہاں کہیں امام بذاتِ خود موجود نہ ہو سکے وہاں اس کے ایسے نمائندوں کو موجود ہونا چاہیے جو تمام لازمی صفات سے متصف ہوں۔

یہ مسائل اکثر کتب فقہ و دینیات میں بالتفصیل بیان کیے گئے ہیں۔ خلافت کی تصریح یوں کی جاتی ہے کہ وہ رسولِ خدا ﷺ کی نیابت ہے، جو اسلام کے دوام اور اُس کے قوانین اور قواعد و ضوابط کی بجا آوری کو برقرار رکھنے کی خاطر حکم ربی سے مقدر ہے۔ چنانچہ اسلام کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ اس میں ہر وقت ایک خلیفہ، یعنی آقائے اسلام کا قرار واقعی اور بلا واسطہ نائب، موجود ہو۔ امامت روحانی پیشوائی کا نام ہے۔ لیکن یہ مناصب ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔ خلیفہ ہی واحد شخص ہے جو جب بھی وہ ذاتی طور پر موجود ہو، نماز کی امامت کا حق رکھتا ہے۔ کوئی اور شخص یہ وظیفہ ادا نہیں کر سکتا۔ الا اُس صورت میں کہ خلیفہ اُسے بلا واسطہ یا بالواسطہ مندوب کرے۔ امام اور ماموم (یعنی جماعت) کے درمیان ایک روحانی رشتہ ہوتا ہے جو انہیں اقرارِ دین میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ یہ ایمانی اصول اس امر سے کہ اسلام میں پروہتوں کا کوئی طبقہ نہیں کوئی عدمِ مطابقت نہیں رکھتا۔ ہر مسلمان بارگاہِ ایزدی میں اپنی وکالت آپ کرتا ہے اور ہر روح کسی اور انسان کی وساطت کے بغیر خدا سے تعلق رکھتی ہے۔ امام انفرادی عبادت گزار اور صحیفہ اسلام کے درمیان ایک کڑی ہے۔ دینِ اسلام کا یہ صوفیانہ عنصر اس کی حیرت انگیز وحدت و سالمیت کی بنیاد ہے۔

ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے اُس سے ''در المختار'' کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ امامت دو طرح کی ہوتی ہے: امامت کبریٰ اور امامتِ صغریٰ، یعنی سب سے اونچے درجے کی پیشوائی، اور نماز کی قیادت کا نسبتاً ادنیٰ منصب، امامِ کبیر سنی دنیا کا خلیفہ ہوتا ہے۔ اُس کی ذات میں پیغمبر اسلام ﷺ کے نائب کی حیثیت سے دینی و دنیوی اختیارات جمع ہوتے ہیں۔ امورِ دنیوی کا انصرام وہ یا تو شوریٰ کے مشورے سے کرتا ہے، جیسا کہ خلافتِ راشدہ میں ہوا، یا، جیسا کہ بعد کے زمانوں میں ہوا، اپنے مندوبین کے ذریعے، جو اجتماعی طور پر یا انفرادی طور پر اس کے تفویض کیے ہوئے اختیارات سے کام لیتے ہیں۔ ایسا ہی روحانی معاملات میں ہوتا ہے، لیکن جہاں تک جماعتِ نماز کا تعلق ہے، اُس پر واجب ہے کہ ذاتی طور پر اس کی امامت کرے، الا اس صورت کے کہ وہ جسمانی طور پر معذور ہو۔

شیعوں میں، عام نمازوں کا تو ذکر ہی کیا، جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی انفرادی طور پر اور خلوت میں ادا کی جا سکتی ہیں۔ سنیوں کے یہاں، اگر مسجد یا کوئی اور عبادت گاہ قریب ہو تو نماز با جماعت فرض ہے۔ کسی معقول وجہ کے بغیر جماعتِ نماز میں شریک نہ ہونا گناہ ہے اور جو لوگ اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں وہ بعض ملکوں میں حکومت کی طرف سے بھی مستوجب سزا قرار پاتے ہیں۔ نجد میں وہابیوں کے تحت نماز سے جی چرانے والوں کو کوڑے مار کر مسجد میں لے جایا جاتا تھا اور آج بھی ابن سعود کی حکومت میں اس کے متبعین، جو اپنے آپ کو اخوان کے لقب سے ملقب کرتے ہیں، مراسم دینی کی بجا آوری اسی قسم کے طریقوں سے کراتے ہیں۔ چونکہ نماز با جماعت فرضِ عین تھی اس لیے امام کی موجودگی لازمی تھی[1]

سُنیوں کا دعویٰ ہے کہ اپنی آخری علالت کے دوران رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ نمازوں کی امامت کے لیے مقرر فرمایا۔ آپ ﷺ کی وفات پر لیکن تجہیز و تدفین سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نامزدگی مجمعِ عام میں قبول کر لی گئی اور وہ بہ اجماعِ اُمت مسند نشینِ خلافت ہو گئے۔ اس وقت سے یہی طریقہ انتخاب سنیوں میں مسلم چلا آ رہا ہے۔

منصبِ خلافت کے لیے جو صفات ضروری ہیں اُن میں سب سے اہم یہ ہیں کہ خلیفہ اہل سنت والجماعت سے ہو، اختیارِ اعلیٰ کی اہلیت رکھتا ہو، کسی کا تابع فرمان نہ ہو۔ سنی یہ تقاضا نہیں کرتے کہ امام المسلمین کو معصوم یا افضل البشر ہونا چاہیے اور وہ یہ بھی ضروری نہیں سمجھتے کہ وہ خاندانِ نبوی سے ہو۔ ان کے نزدیک یہ کافی ہے کہ وہ ایک خود مختار حاکم ہو، ذاتی معائب سے بری ہو، نیک سیرت ہو اور امورِ سلطنت کے انصرام اور نماز کی امامت کی قابلیت رکھتا ہو، متقدمین فقہا نے آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد کی سند پر ایک اور شرط شامل کر لی ہے جو اس عبارت کے اخیر میں آتی ہے جو لوازمِ امامت کے موضوع پر کتب احادیث میں پائی جاتی ہے: وہ یہ کہ امام قبیلہ قریش سے ہونا چاہیے

---

[1] اس معاملے میں تمام سنی مذاہب کا مکمل اجماع ہے۔ فقہ مالکی کی جید کتاب کا مصنف خلیل ابن اسحٰق اس ضمن میں جو قوانین شرعی بیان کرتا ہے وہ بالکل وہی ہیں جو حنفیوں اور شافعیوں کے یہاں مسلم ہیں۔

(الائمہ من قریش)۔ اس شرط کے شامل کرنے کا مقصد، جیسا کہ درالمختار اور ردالمختار دونوں میں مذکور ہے، شیعوں کے اس دعوے کا باطل کرنا تھا کہ امامت خانوادۂ نبوی ﷺ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد تک محدود تھی اور پہلے تین خلفا اور اموی اور عباسی خلفا کو مستحق خلافت ثابت کرنا تھا۔ عظیم فقیہ مورخ ابن خلدون نے، جو امیر تیمور کا ہمعصر تھا اور جس نے ۱۴۰۶ء میں خاندانِ عثمانی کے مسند نشین خلافت ہونے سے بہت پہلے وفات پائی، اپنے مقدمہ میں اس شرط پہ بہت سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ اس روایت کی صحت سے جس پر یہ شرط مبنی ہے انکار نہیں کرتا، لیکن کہتا ہے کہ یہ محض ایک سفارش تھی جو حالاتِ وقت کی بنا پر کی گئی۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ جب اسلام دنیا میں آیا تو اس وقت قبیلہ قریش عرب کے تمام قبائل میں سب سے ترقی یافتہ اور صاحب اقتدار تھا اور جب آنحضرت ﷺ نے یہ سفارش کی یا یہ خواہش ظاہر کی کہ مسلمانوں کی دینی و دنیوی پیشوائی آپ ﷺ کے قبیلہ کے افراد تک معدود رہے تو آپ ﷺ کے پیش نظر وہ حالات تھے جو آپ ﷺ کے وصال کے فوراً بعد رونما ہونے والے تھے اور آپ ﷺ کا مقصد یہ نہ تھا کہ جانشینی کے بارے میں کوئی لگا بندھا قاعدہ نافذ کریں۔ اس وقت صرف قریش میں کوئی ایسا شخص مل سکتا تھا جو مسلمانوں کا حاکم بننے کی اہلیت و قابلیت رکھتا تھا۔ صرف یہی وجہ تھی کہ آنحضرت ﷺ نے قریش میں سے خلیفہ و امام منتخب کرنے کی سفارش کی۔ اس رائے کو، جو سنی ماہرین فقہ میں سے ایک فاضل ترین ماہر نے بیان کی ہے، تمام متاخرین قبول کرتے ہیں، اور اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ تمام دوسری شرائط کے پورا ہو جانے کی صورت میں قانون امام کے انتخاب پر کوئی قبائلی یا نسلی حدود عائد نہیں کرتا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کیا اور اس تقرر کو جمیع المسلمین نے جن میں اہلِ بیت نبی بھی شامل تھے قبول کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عیسائی یا مجوسی مذہبی جوشیلے کے ہاتھوں، جسے اس عظیم خلیفہ کے بعض احکام کے خلاف شکایت تھی، زخمی ہو کر شہادت پائی۔ انہوں نے جانبداری یا رورعایت کے الزامات کا سدباب کرنے کی خاطر وفات سے پہلے اپنے جانشین کے انتخاب کے لیے چھ ممتاز مسلمانوں پر مشتمل ایک مجلس قائم کی تھی۔ ان لوگوں کی نگاہِ انتخاب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر پڑی، جو خاندانِ اُمیہ میں

سے تھے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اُمت کے اتفاق رائے سے مسند نشین خلافت ہوئے۔
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی المناک شہادت پر دامادِ نبی حضرت علی رضی اللہ عنہ جو شیعوں کی رائے میں بر بنائے وراثت بلا واسطہ جانشین نبی بننے کے حقدار تھے، خلیفہ و امام بنے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات میں موروثی و انتخابی دونوں استحقاق جمع تھے۔ لیکن انہوں نے عہد عثمانی کے نظم و نسق میں اصلاحی تبدیلیاں کرنے کی جو کوششیں کیں ان کی وجہ سے ان کے لاتعداد دشمن پیدا ہو گئے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے، جو اموی النسب تھے اور عہدِ عثمانی میں شام کے عامل تھے، علَم بغاوت بلند کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بغاوت کو فرد کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں آئے، لیکن ایک غیر فیصلہ کن لڑائی کے بعد کوفے کی جامع مسجد میں نماز ادا کرتے ہوئے ایک قاتل کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد وہ دور ختم ہو گیا جسے ابتدائی سنی فقہا و علمائے دین اس بنا پر ''خلافت کاملہ'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں کہ ملت کے اجماعِ رائے نے چاروں خلفا کے استحقاقِ خلافت پر مہرِ تکمیل ثبت کی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر اُن کے بڑے صاحبزادے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کوفہ اور اس کے ماتحت علاقوں کے لوگوں کے اتفاقِ رائے سے منصب خلافت پر مامور ہوئے، لیکن انہوں نے یہ منصب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو تفویض کر دیا۔ شام کے لوگوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے تقرر کو قبول کر لیا۔ یہ ٦٦١ء کا واقعہ ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بنی اُمیہ اور بنی ہاشم ایک ہی قبیلے یعنی قریش کی دو شاخیں تھے۔ ان دو خاندانوں کے درمیان بڑی زبردست رقابت تھی جس کا دور کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے مقاصد میں سے ایک مقصد تھا۔ خاندانِ ہاشم کے بانی ہاشم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد تھے۔ ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب کے متعدد بیٹے تھے۔ خلفائے عباسی ان میں سے ایک یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد تھے۔ عبدالمطلب کے ایک اور فرزند ابو طالب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد تھے اور سب سے چھوٹے، یعنی عبداللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بنو اُمیہ کے پہلے خلیفہ تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے پوتے کی وفات پر خاندانِ اموی کی حکمی شاخ کے ایک فرد مروان نے عہدہ خلافت سنبھالا۔ مروان کے بیٹے

عبدالملک اور پوتے ولید کے عہدِ حکومت میں سنی خلافت نے اپنی انتہائی وسعت حاصل کی۔ وہ بحرِ اوقیانوس سے لے کر بحرِ ہند تک اور دریائے ٹیگس سے لے کر صحرائے اعظم اور حدودِ حبشہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۷۴۹ء میں ابوالعباس سفاح نے، جو عم نبی حضرت عباس کی اولاد سے تھا، اموی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کی جگہ کوفہ کی جامع مسجد میں لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کی۔ بیعت کے بعد اس نے منبر پر چڑھ کر ایک خطبہ دیا، جو اس کے جانشینوں نے من وعن برقرار رکھا۔ یہ خطبہ عرب مورخ ابن الاثیر کی کتاب میں پوری طرح قلمبند ہے۔ اس میں طول طویل دلائل سے بنوعباس کے استحقاق خلافت کو ثابت کیا گیا ہے۔ اب ابوالعباس سنی دنیا کا جائز فرمانروا اور سنی مذہب کا مسلم پیشوا بن گیا۔ اس کے پہلے چھ جانشین نمایاں قابلیت کے لوگ تھے۔ جو ان کے بعد آئے اُن کی قابلیت کے مختلف مدراج تھے، لیکن ان میں سے بعض غیر معمولی علم وفضل اور استعداد کے مالک تھے۔ سفاح کے بھائی منصور نے، جو اس کے بعد خلیفہ ہوا، بغداد کی بنیاد رکھی جو عباسیوں کا مستقرِ حکومت بن گیا اور عموماً دارالخلافہ اور دارالسلام کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں خاندانِ عباسی کو صدیوں تک کسی مخالفت کے بغیر دینی ودنیوی اختیار حاصل رہا۔ اس کے عظیم حریف، جن کا دارالخلافہ قاہرہ تھا، صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ قرطبہ کا شاندار اموی خاندان گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں ناپید ہوگیا۔ الموحد، المرابطہ اور وہ متعدد بربر اور عرب خاندان جو المرابطہ کے زوال پر یکے بعد دیگرے برسر اقتدار آئے سنی مذہب کی پیشوائی کا کوئی واجب التسلیم حق نہ رکھتے تھے۔ سنی دنیا کی امامت پر عباسیوں کا حق بحرِ اوقیانوس سے لے کر دریائے گنگا تک اور بحرِ اسود دریائے سیحوں سے لے کر بحرِ ہند تک مسلم تھا۔ ۴۹۳ھ (۱۰۹۹ء) میں الموحد فاتح یوسف بن تاشقین نے زلاقہ کی عصر آفرین لڑائی کے بعد، جس میں عیسائی لشکروں کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔ عباسی خلیفہ مقتدی سے خلعت وعلم اور امیر المسلمین کا خطاب حاصل کیا۔ بعد میں خلیفہ المستظہر نے اس کی توثیق کر دی۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ نہ تو قرطبہ کے ''خلفا'' نے اور نہ زمانہ مابعد کے مسلم حکمرانوں نے خلیفۃ الرسول ﷺ ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ امیر

المومنین کا خطاب اختیار کیا۔

پوری پانچ صدیوں تک بغداد دنیائے اسلام کی تمام ذہنی سرگرمیوں کا مرکز رہا اور یہاں خلافت اور دوسرے امورِ دینی و دنیوی کے بارے میں قواعد وضوابط کو ایک منظم شکل دی گئی۔ چنانچہ یہ تصور کہ خلیفہ و امام مامور من اللہ نائب رسول ﷺ تھا جمہور مسلمین کی مذہبی زندگی کا ایک جزوِ لاینفک بن گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ سنی عقائد کے مطابق خلیفہ محض ایک حاکمِ دنیوی نہیں، وہ ایک ملت اور دولتِ عامہ کا مذہبی سربراہ ہے۔ یعنی حکومتِ الٰہیہ کا قرار واقعی نمائندہ و نائب۔

خلافت عباسیہ پانچ صدیوں تک قائم رہی۔ اس کا خاتمہ ۱۲۵۸ء میں منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی پر ہوا۔ اس وقت مستعصم باللہ خلیفہ تھا۔ وہ، اس کے بیٹے اور اس کے خاندان کے برگزیدہ افراد قتلِ عام میں ہلاک ہوگئے: خاندان عباسی کے صرف وہ افراد بچ پائے جو اس وقت دارالخلافہ میں نہ تھے یا جن پر منگولوں کی نگاہ نہ پڑی۔

مستعصم باللہ کے قتل کے دو سال بعد تک سنی دنیا ایک امام و خلیفہ کی ضرورت شدت سے محسوس کرتی رہی۔ خلفا کے عرب مورخ[1] نے بڑے دردناک انداز میں بیان کیا ہے کہ ملت اسلامیہ کے روحانی پیشوا کی غیر موجودگی سے کتنا رنج و قلق پیدا ہوا اور لوگوں نے کس شدت سے ایک نائب رسول ﷺ کی ضرورت محسوس کی جو ان کے لیے تسکین قلب اور فلاح دارین کا سرچشمہ بنتا۔ جو لوگ زندہ تھے ان کی عبادات اس قبولیت و فضلیت سے محروم تھیں جو ایک مسلم امام کی موجودگی سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح مردوں کی ارواح کو ثواب پہنچانا ممکن نہ تھا۔ سلطان بیبرس نے ساری سنی دنیا کی طرح ایک خلیفہ و امام کی اشد ضرورت محسوس کی۔ خلافت کا حق پانچ صدیوں کی مسلسل حکومت اور اجماعِ اُمت کی بدولت خاندانِ عباسی کی ملکیت بن چکا تھا۔ چنانچہ اس خاندان کے ایک فرد ابوالقاسم احمد کو، جو منگولوں کے قتلِ عام سے بچ نکلا تھا، قاہرہ میں آکر مسندِ خلافت سنبھالنے کی دعوت دی گئی۔ ابوالقاسم قاہرہ کے قریب پہنچا تو سلطان قاضیوں اور ارا کینِ سلطنت کو ہمراہ لے کر اس کے استقبال کو گیا۔ مسند نشینی کی رسومات بڑی شان و شوکت

---

[1] عباسیوں کا امتیازی رنگ سیاہ تھا، امویوں کا سفید اور جانشینان بنی فاطمیوں کا سبز۔

سے بجالائی گئیں۔ پہلے تو قاضی القضاۃ کے سامنے ابوالقاسم کے سلسلہ نسب کا ثبوت بہم پہنچایا گیا۔ اس کے بعد اُسے مستنصر باللہ کے لقب سے مسندِ خلافت پر بٹھایا گیا سب سے پہلے خود سلطان بیبرس نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی، اس کے بعد قاضی القضاۃ تاج الدین اور مشائخ و وزراء نے سب سے آخر میں درجہ بدرجہ عمائد سلطنت نے۔ یہ ۱۲/مئی ۱۲۶۱ء کا واقعہ ہے۔ نئے خلیفہ کا نام سکوں پر مسکوک کرایا گیا اور اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا گیا۔ جمعہ کے دن خلیفہ عباسیوں کی سیاہ ردا اوڑھے ہوئے جلوس کے ساتھ جامع مسجد میں آیا اور وہاں اس نے خطبہ خلافت دیا۔ چونکہ اب خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے اس کی مسند نشینی مکمل ہو چکی تھی، اس لیے اس نے سلطان بیبرس کو مسند و خلعت عطا کر کے نائب السلطنت مقرر کیا۔

جس خلافتِ عباسیہ کی بنیاد اس طرح قاہرہ میں رکھی گئی وہ اڑھائی صدیوں تک قائم رہی۔ اس مدت میں جو بادشاہ مصر پر حکمران رہے۔ وہ مملوک سلاطین کہلاتے ہیں۔ ہر سلطان تخت نشین ہوتے ہی خلیفہ و امام الوقت سے سند حاصل کرتا تھا اور اپنے آپ کو اس کا نائب السلطنت کہتا تھا۔ مذہبی منصب داروں اور قاضیوں کا تقرر خلیفہ کی باضابطہ منظوری سے ہوتا تھا۔ اگرچہ خلیفہ کی ملکی اور سیاسی طاقت سلب ہو چکی تھی، تاہم اسے اس قدر مذہبی وقار حاصل تھا اور اس وقار کی ضرورت کا احساس سنیوں کے دلوں میں اس قدر گہرا تھا کہ زوالِ بغداد کے بعد دو مرتبہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے خلفائے عباسی سے سندِ نیابت حاصل کی۔ تغلق آباد کے نامکمل شہر کے بانی سلطان محمد جونا خاں نے ۱۳۴۳ء میں خلیفہ کے سفیر کا جو شاندار استقبال کیا اس سے ہمیں اس امر کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی، جو ان دنوں مصر سے پورے چھ مہینوں کی مسافت پر تھا، منصب خلافت کا کتنا احترام کیا جاتا تھا۔ جب سفیر شہر کے قریب پہنچا تو سلطان سادات و اراکین کو ہمراہ لیے اُسے خوش آمدید کہنے کو اپنے دارالسلطنت سے نکلا، اور جب خلیفہ کا وثیقہ سلطان کو پیش کیا گیا تو اس نے اُسے انتہائی ادب کے ساتھ لیا۔ خلیفہ کی سندِ نیابت نے سلطان کے اختیارات پر مہرِ جواز ثبت کر دی۔ یہ سارا واقعہ مشہور شاعر بدر الدین چاچ نے ایک قصیدہ میں بیان کیا ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں خاندانِ عثمانی کے سلطان سلیم اول (الملقب بہ سفاح) کا ستارہ افق پر طلوع ہوا۔ اس سلطان نے دشمنانِ اسلام پر بے شمار فتوحات حاصل کیں۔ اور کوئی دوسرا مسلم بادشاہ، یہاں تک کہ ایران میں صفوی خاندان اور پہلی شیعہ مملکت کا بانی شاہ اسماعیل بھی، عظمت و اقتدار میں اس عثمانی سلطان کا ہم پایہ نہ تھا۔

پندرھویں صدی کے اواخر میں مصر کے حالات بڑی حد تک دگرگوں ہو چکے تھے اور بعد کے مملوک سلاطین کے زمانے میں جو بدنظمی شروع ہوئی تھی وہ چند سال بعد اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ مصریوں کے ایک طبقے نے سلیم کو دعوت دی کہ وہ آ کر ان کے پراگندہ حال ملک میں امن و امان از سرِ نو قائم کرے۔ سلیم نے نہایت آسانی سے نا اہل مملوکوں کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور مصر کو اپنی قلمرو میں جو پہلے ہی بہت وسیع تھی، داخل کر لیا۔ اس وقت جو خلیفہ نیابت رسول پر مامور تھا المتوکل علی اللہ کے لقب سے ملقب تھا۔ سنی تواریخ کے مطابق اس خلیفہ نے یہ محسوس کیا کہ سلیم واحد مسلمان بادشاہ ہے، جو امام کے مناصب دوگانہ کو اپنی ذات میں جمع کر سکتا ہے، خلافتِ اسلامیہ کو نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے از سرِ نو قائم کر سکتا ہے اور موثر طور پر اس منصب کے وظائف کو ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ۱۵۱۷ء میں ایک باضابطہ وثیقہ تفویض کے ذریعہ فاتح عثمانی کو خلافت منتقل کر دی اور اپنے تمام عمائد و اراکین کے ساتھ اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اسی سال شریف مکہ محمد ابوالبرکات نے جو خاندانِ علوی سے تھا، خانہ کعبہ کی کنجیاں ایک سیمیں کشتی میں رکھ کر اپنے بیٹے کے ہاتھ سلطان سلیم کو بھجوا دیں اور اس کے بیٹے نے اس کی طرف سے سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ سلیم کی ذات میں تفویض بیعت کے ذریعے عباسیوں کے حقوق جمع ہونے سے اور خاندانِ نبوی ﷺ کے نمائندے اور متولی حرمین کے اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے عثمانی سلطان کے استحقاقِ خلافت پر مہر تکمیل ثبت ہوگئی''۔ بالکل اسی طرح جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نے پہلے تین خلفا کے حق کی تصدیق کی تھی''۔ مکہ و مدینہ میں سلطان کے لیے جو دعائیں مانگی گئیں اور اس کے نام کے خطبے پڑھے گئے انہوں نے سلیم کے حقِ خلافت کو بالکل مسلم الثبوت بنا دیا۔ اس وقت سے اس کا مستقرِ حکومت ''دار الخلافہ'' بن گیا اور اسے اسلام (استاپول) بول کا نام

دیا گیا۔ کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ سلیم اور اس کے بیٹے سلیمان ذی شان کے دربار میں سنی مملکتوں کے حکمرانوں کی طرف حلفِ وفاداری اٹھانے کے لیے سفیر آئے۔ چنانچہ اس طرح سنیوں کے قول کے مطابق خلافتِ اسلامی خاندانِ عثمانی کا ورثہ بن گئی، جس پر وہ کسی مخالفت کے بغیر چار صدیوں سے قابض چلا آرہا ہے۔ (مصنف کے وقت میں خلافت عثمانی قائم تھی)

رُوحِ اسلام

دوسرا حصہ

maablib.org

پہلا باب

اِسلام کا مثالی نصب العینؒ

هُلم اليّلا تقصدَ سِوانی
اَنا المنّانُ فاطلُبنی تجدنی
اتذکر ليلةً ناديت سراً
فَلم اسمعک فاطلبنی تجدنی
اذا المضطّر قال الاترانی
نظرت اليه فاطلبنی تجدنی
اذا عبدی عصانی لم تجدنی
سريع الاخذ فاطلبنی تجدنی

مرے در پہ آ، کوئی دوسرا تو نہ کر تلاش مرے سوا — میں ہوں صاحب کرم وعطا، تو جو مجھ کو ڈھونڈھے تو پائے گا
تجھے یاد ہے کوئی ایسی شب ترے دل نے جب مری کی طلب — تو سنی نہ میں نے تری صدا، مجھے ڈھونڈھ، تو مجھے پائے گا
جو کبھی پکارے کوئی حزیں "تجھے کیا تلاش مری نہیں؟" — تو میں اس کو دیتا ہوں یہ ندا" مجھے ڈھونڈھ تو مجھے پائے گا"
کوئی بندہ جب مرے حکم سے کرے سرکشی تو بلا مجھے — ہے سریع میرا مواخذہ، مجھے ڈھونڈھ تو مجھے پائے گا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جس مذہب کی بنیاد رکھی وہ ان کے نام کی مناسبت سے عیسائیت اور ان کے لقب مسیح کی مناسبت سے مسیحیت کہلاتا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مہاتما بدھ جو مذاہب لائے وہ انہی کے ناموں سے موسوم ہیں، لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس مذہب کے معلم تھے اس کا نام ان کے نام سے متعلق نہیں، اور وہ نام ہے ''اسلام''

دینِ محمدی ﷺ کے مناسب طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم لفظِ ''اسلام'' کے صحیح معنوں سے کما حقہ، واقف ہوں۔ سَلَم کے ابتدائی معنی ہیں سکون، قرار، فرض سے عہدہ برآئی، فرض سے سبکدوشی، کامل امن و آشتی۔ اس کے ثانوی معنی ہیں اس ہستی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا جس سے انسان نے رابطہ آشتی قائم کر رکھا ہے۔ اس مادے سے جو اسمِ ماخوذ ہے اس کے معنی ہیں امن، سلام، سلامتی، نجات۔

قضا و قدر

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس لفظ میں مشیتِ ایزدی کے سامنے مکمل سپر اندازی کا مفہوم مضمر ہے، لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس کے برعکس اس لفظ کا مطلب ہے حصولِ تقویٰ کی خاطر جد و جہد۔

اسلام میں جو اخلاقی اصول مضمر و مجسم ہیں ان کا لب لباب قرآن کے دوسرے سورے نے ذیل کے الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

''اس کتاب کے بارے میں کوئی شک نہیں۔ یہ ہدایت ہے ان پرہیز گاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے اس پر اور اُن کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی ہیں۔ ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کی ہدایت سے فیض یاب ہیں۔'' (البقرۃ۔ ۱ تا ۵)

اسلامی نظام کے بنیادی ارکان حسب ذیل ہیں:۔

(۱) خالقِ کل کی وحدت، غیر مجسمیت، قدرت اور ہمہ گیر محبت پر ایمان (۲) نوعِ انسانی میں باہمی اخوت و ہمدردی (۳) جذباتِ سفلی کی تسخیر۔ (۴) تمام نعمتوں کے بخشنے والے کا شکریہ احسان۔ (۵) حیات بعد الممات میں تمام انسانی اعمال کی باز پرس ذاتِ باری کی قدرت و محبت کے جو اعلیٰ اور عظیم الشان تصورات قرآن نے پیش کئے ہیں اُن کے مقابلے کی کوئی چیز دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ خدا کی وحدت، اس کی غیر مادیت، اس کی عظمت و جبروت اور اس کا رحم و کرم قرآن کی سب سے فصیح و بلیغ اور رُوح میں ہیجان پیدا کر دینے والی عبارتوں کے مستقل اور لامتناہی موضوع ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی، نور اور روحانیت کا ایک دریا ہے جو رکے تھمے بغیر موجزن ہے، لیکن

از عانیت و ادعائیت کا شائبہ بھی موجود نہیں۔ شروع سے آخر تک کہیں کوئی دعویٰ بے دلیل نہیں پایا جاتا۔ ہر بات میں صرف انسان کے شعورِ باطنی اور اس کی عقلِ وجدانی سے خطاب کیا گیا ہے۔

آیئے اب ہم ان مذہبی تصورات پر ایک نگاہِ بازپسیں ڈالیں جو اس وقت اقوامِ عالم میں رائج تھے جب پیغمبرِاسلام ﷺ نے اپنی پیغام رسانی کا آغاز کیا۔ کفارِ عرب کے یہاں خدائی کا تصور افراد و قبائل کے تمدنی اختلافات کے پہلو بہ پہلو مختلف تھا۔ بعضوں کے یہاں وہ فطرت کو لباسِ خدائی پہنانے کی حد تک مقابلتًا بلند تھا اور بعضوں کے یہاں خالی خولی بت پرستی کی حد تک گرا ہوا، مثلاً گندھی ہوئی مٹی یا ایک لکڑی یا ایک پتھر کی پوجا۔ بعض ایک آئندہ زندگی پر اعتقاد رکھتے تھے اور بعضوں کو اس کا سان گمان بھی نہ تھا۔ زمانہ قبلِ اسلام کے عربوں کے یہاں سوری فینقیوں......(Syro-Phoenicians) کی طرح مقدس کنج تھے۔ ایسے درخت تھے جن سے استخارہ کیا جاتا تھا، اور غیبی بشارتیں دینے والی پجارنیں تھیں۔ آلاتِ تناسل کی پوجا سے بھی وہ نا آشنا نہ تھے۔ چنانچہ پتھر اور لکڑی کے مندر بنا بنا کر عسا کرِ ساوی کی طرح تولیدی قوتوں کی پرستش کی جاتی تھی۔ یہ قرینِ قیاس نہیں کہ جب یہ غیر متمدن بادیہ نشین ہوا تو وہ جھکڑ چلتے تھے جو پورے کے پورے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے تھے یا جب ان کی نظر واہمہ کے بنائے ہوئے اُن حسین مناظر پر پڑتی تھی جو مسافر کو دھوکہ دے کر تباہی کی طرف لے جاتے تھے، تو ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا نہ ہوتا ہو کہ یہ کسی دستِ غیب کی شعبدہ طرازیاں ہیں۔ چنانچہ ایک برترین خدا یعنی ایک خدائے خدایان کا نا قابلِ فہم اور مبہم سا تصور عربوں کی شعوری دنیا کی فضا میں منڈلانے لگا۔

غالبًا یہودیوں نے، جنہیں عموماً تاریخ میں نظریہ وحدانیت کے بہت بڑے محافظ خیال کیا جاتا ہے، اس تصور کی تشکیل میں مدد دی ہوگی۔ لیکن خود انہوں نے اس حقیقت کا عملی مظاہرہ کیا کہ جب کسی قوم کے ضابطہ دینی میں کوئی تاریخی اور عقلی عنصر موجود نہ ہو جو اسے ثبات بخش سکے تو اس کے خیالات میں کیسا عجیب و غریب قلب ماہیت واقع ہو جاتا ہے۔

یہودی مختلف ادوار میں اور مختلف واقعات کے زیرِ اثر عرب میں داخل ہوئے تھے چنانچہ قدرتی امر تھا کہ ان میں تارکینِ وطن، پناہ گزینوں اور نو آبادکاروں کے جو مختلف گروہ تھے اُن کے افکار و خیالات میں بہت سی گونا گونی ہو۔ جن لوگوں کو اہلِ آشور اور اہلِ بابل نے دیس نکالا دیا تھا لازمی تھا کہ ان کے تصورِ خدائی میں اُن لوگوں کے تصورِ خدائی کی بہ نسبت جنہیں قیصران روم ویسپیزین (Vespasian) ٹریجن (Trajan) اور ہیڈ رین (Hadrian) نے جلا وطن کیا تھا انسان سے جسمانی مشابہت[1] اور جذباتی مماثلت[2] کا عنصر زیادہ ہو۔ بنی اسرائیل کے جن خواصِ طبعی نے انہیں اپنے اصلی وطن میں جہاں اُن کی بے راہ روی کی مذمت کرنے والے اربابِ بصیرت موجود تھے، بار بار بت پرستی کی لعنت میں مبتلا کیا تھا وہ انہیں عربوں کے الحاد و شرک سے کیوں کر محفوظ رکھ سکتے تھے قدرتی بات تھی کہ وہ خدائے ابراہیم کے تصور میں خدا کے مادی تصور کی آمیزش کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے حرمِ کعبہ کے اندر حضرت ابراہیم کا ایک بت نصب کیا، جس کے پہلو میں ایک مینڈھا قربانی کے لیے تیار کھڑا تھا۔

جو یہودی بعد کے ادوار میں آئے تھے ان میں مشائیوں (Shammaites) اور غلاۃ (Zealots) کی بہت بڑی اکثریت تھی۔ ان گروہوں میں قوانین دینی کی اطاعت بت پرستی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانون نویسوں (Scribes) اور ربیوں کا احترام پرستش سے لگا کھانے لگا۔ یہ حضرات اپنے متعلق یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اُمت کے مربی و محافظ، قانون و روایت کے برقرار رکھنے والے اور قوانینِ الٰہی کے عین مطابق زندگی بسر کرنے کے جیتے جاگتے نمونے اور آئینے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو زبدۂ اُمت سمجھتے تھے اور عام عقیدہ یہ تھا کہ خدا سے راہ رسم رکھنے کی بدولت وہ مستقبل کے بارے میں بشارتیں دینے کا ملکہ بھی رکھتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ وہ بھی اپنے آپ کو اور لوگ بھی ان کو خدا کے خاص

---

[1] غیر انسانی اشیاء و اشخاص (بالخصوص خدا) کو انسان کی جسمانی صفات سے متصف کرنا۔ Anthropomorphism

[2] غیر انسانی اشیاء و اشخاص (بالخصوص خدا) سے انسانی جذبات و احساسات کا منسوب کرنا۔ Anthropopathism

الحاص منظور نظر تصور کرتے تھے جوزیفس (Josephus) کے قول کے مطابق یہودیوں کے دلوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا احترام اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ خدا کے نام کے بعد ان کے نام کی عزت کرتے تھے اور یہ عزت انہوں نے حضرت عزیر (عزرا) Ezra کو منتقل کر دی تھی، جنہوں نے خاندانِ کیانی کے عہد میں یہودی قانون اور زندگی کو نشاۃ ثانیہ بخشی۔

مزید بریں قیاسِ غالب ہے کہ یہود کے عامتہ الناس نے ''تیرافم'' (Teraphim) کی پوجا مکمل طور پر ترک نہ کی تھی، جو ایک طرح کے خاندانی دیوتا تھے جن کے بت انسانی شکل پر بنائے جاتے تھے اور جن سے ہر موقع پر شگون لیا جاتا تھا، بلکہ جنہیں اغلباً رومیوں کے Penates کی طرح محافظ دیوتا خیال کیا جاتا تھا۔ یہ بت پرستی یقیناً کفارِ عرب سے مس کی بدولت اور بھی استوار ہوگئی ہوگی۔

جب یہودیہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا تو صرف ایک قوم تھی، یعنی یہواہ کے پرستاروں کی قوم، جو اللہ کی وحدت کا نظریہ اور یہ تصور کہ ایک افضل و اعلیٰ ارادہ ذاتی ساری کائنات کو اپنے حیطۂ قدرت و رحمت میں لیے ہوئے ہے، قبول کرتی تھی۔ اس قوم کے یہاں ہر طرح کی انسدادی کوششوں کے باوجود الوہیت کا تصور یا تو کافر قوموں سے مس کے باعث مسخ ہو چکا تھا، یا غیر اہل کتاب قوموں کے فلسفے کے زیر اثر متغیر ہو گیا تھا۔ ایک طرف تو کلدانی مجوسی (Haldeo Magian) فلسفے نے یہودی روایات پر اپنی متصرفانہ انگلیوں کے اَن مٹ نشان چھوڑے تھے اور دوسری طرف یہودیوں کے بہترین دماغوں نے جہاں یونانی اور رومی فلسفیوں کو ایک عظیم سبب اول کے تصور سے آشنا کیا تھا وہاں خود اسکندریہ کے مکتبوں میں ایسے ایسے افکار و خیالات بھی سیکھے تھے جو اُن کے وحدانی مذہب کے ساتھ کوئی مطابقت نہ رکھتے تھے۔

کہیں ہندو اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کے جم غفیر کو لیے ہوئے تھے، کہیں مجوسی زردشتی اپنے دو مخالف خداؤں کو لیے ہوئے جو ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لیے برسرِ پیکار تھے، کہیں یونانی، رومی اور مصری اپنے اپنے دیومنڈ (Pantheon) لیے ہوئے، جن کے افراد اخلاق میں اپنے پجاریوں سے پست تر تھے...... یہ تھی مہذب دنیا کی حالت اُس وقت جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی تعلیم و تلقین کا آغاز کیا...... اپنے تمام حسین خوابوں اور

اپنی تمام دور و دراز اُمنگوں کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذہن ان سب ادعاؤں سے مبرا تھا جو ان کے مجنونانہ جوش رکھنے والے پیروؤں نے اُن سے منسوب کئے ہیں۔ انہوں نے کبھی خدا کا تتمہ یا ذات خداوندی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

اگرچہ عہد حاضر کی عیسائیت میں ایک فکری رفعت پیدا ہوگئی ہے لیکن اس کے باوجود وہ گزشتہ قرنوں کی تشبیہیت (Anthropomorphism) کے ورثے کا جوا اُتار کر نہیں پھینک سکی۔ قرنہا بعد قرن اس معلم عظیم کی تاریخ سے انسان صفتی کا ہر عنصر خارج کیا جاتا رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی شخصیت انسانوں کے ایک طومار میں گم ہو کر رہ گئی ہے اور تو اور نئی انجیل بھی ایک صدی تک مراقبے میں رہنے کے باوجود اس بزرگ ہستی کے چہرے پر سے توہمات کی دھند کا پردہ ہٹا نہیں سکی۔ روز روز یہ خیال کہ اس کی زندگی " ابدیت کبریٰ کے سینے میں ایک ابدیت صغریٰ" تھی، زور پکڑتا جا رہا ہے، تا آنکہ نیقیہ کی کونسل (The Council of Nice) اس خیال کو ایک شکل اور ٹھوس پن بخشتی ہے اور اسے ایک ادعائی عقیدے میں مجسم کر دیتی ہے۔

بہت سے ذہن عالمگیر باپ کی دور افتادی سے گھبرا کر ایک انسانی شخصیت میں، جسے وہ الٰہیت کا درجہ بخشتے ہیں، ایک درمیانی منزل تلاش کرتے ہیں۔ ایک قریبی معبود کی یہ ضرورت ہی وہ چیز ہے جس نے جدید عیسائیت کو مجبور کیا ہے کہ وہ ایک مثالی چیز کو نام دے، اُسے گوشت و پوست کا پیرہن پہنائے اور ایک بشر نما خدا (Man - God) کے طور پر اس کی پرستش کرے۔

"جدید عیسائیت کے نقائص" (The Defects of Modern Christianity) کے فاضل مصنف کا خیال ہے کہ جس تواتر و اصرار سے نبی ناصری نے خدا کا بیٹا ہونے کا دعویٰ اور خدا کی طرح معبود بنائے جانے کا تقاضا کیا ہے وہ بجائے خود اس کی الٰہیت کا ثبوت ہے۔ ہم اس امر سے مطلق انکار کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا، ان معنوں میں جن معنوں میں عیسائی علمائے الٰہیات اور متکلمین نے ان الفاظ کو سمجھا ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے حتمی طور پر ثابت کیا ہے کہ نئی انجیل کی عبارات کئی امور کے اعتبار سے کاملاً ناقابل اعتماد ہیں۔ جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی کا تعلق ہے

ہمیں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ یہ افسانہ کیونکر تدریجاً گھڑا گیا۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ جو الفاظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب کیے جاتے ہیں وہ انہوں نے فی الواقع استعمال کیے ہیں، پھر بھی کیا اُن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے خدا کا اکلوتا بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا؟ کیا عیسائی متکلمین نے اس مشرقی درویش کا نام نہیں سُنا جو ابن حلاج کے نام سے مشہور ہے اور جس نے خود خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا؟ اس نے کہا تھا ''انا الحق'' یعنی ''میں خدا ہوں، میں سچائی ہوں۔'' چنانچہ مسلم علما نے یہودی سنہدریوں (Sanhedrim) کی طرح اُسے کفر کا مجرم گردانا اور سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ اس طرح ایک سادہ لوح انسان، جس کا سینہ جوشِ معرفت سے لبریز تھا، موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ بابیوں کا اب بھی یہ عقیدہ ہے کہ ان کا آقا ''الباب'' (یعنی حیاتِ ابدی کا دروازہ) قتل نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک معجزانہ طریقہ سے آسمان پر پہنچا دیا گیا تھا۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب ابومغیث[1] الحلاج نے اپنے آپ کو ''حق'' اور باب نے اپنے آپ کو ''جنت کا دروازہ'' کہا تو ان کا منشا یہ دعویٰ کرنا تھا کہ وہ خدا کے شریک ہیں؟ اور اگر اُن کا یہ منشا تھا بھی تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا دعویٰ بجائے خود دلیل ہے؟ لیکن جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں، ہم ہرگز یہ تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے، جن کے تصورات میں، جب ہم انہیں اُن کے پیرووں کے چڑھائے ہوئے ملمع سے پاک کر کے دیکھیں، ان کی اپنی صفات یا شخصیت کے بارے میں مبالغہ کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، کسی موقع پر بھی ایسے الفاظ استعمال کیے جن سے ان ادعاؤں کا جواز دستیاب ہو سکے جو ان کے پیرووں نے ان کے سر منڈھ دیئے ہیں۔ ان کا خدا کی ابوت کے بارے میں جو تصور تھا وہ ساری نوعِ انسانی پر حاوی تھا۔ ان کے نزدیک تمام انسان خدا کے بچے تھے اور وہ خود ابدی باپ کے بھیجے ہوئے ایک معلم تھے[2] اس طرح عیسائیوں کے سامنے بشری فضیلت کی ایک زندہ مثال موجود

---

[1] ابومغیث ابن منصور الحلاج عین جوانی میں مارا گیا۔ وہ پاکیزہ سیرت، سادہ دل اور غریبوں کا دوست تھا، لیکن تخیل پرست اور جوشیلا تھا۔

[2] خدا کی نسبت باپ کے لفظ کا استعمال اسی وجہ سے نہیں کیا گیا کہ اس زمانہ کے عیسائیوں نے ابوت الٰہی کے تصور کو بگاڑ دیا تھا۔

تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نبی ناصری کی تعلیم سے عیسائی خدا کا ایک منزہ تر تصور اخذ کرتے۔ لیکن ہوا یہ کہ چھ صدیوں کے مرور نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کے اردگرد ایسے قصوں کا ایک ہالہ سا ڈال دیا جنھوں نے ان کے اپنے ارشادات کے علی الرغم انہیں الوہیت کا مجسمہ یعنی خدا کا اوتار بنا دیا۔ دنیا نے آقا کی جگہ بندے کی پرستش شروع کر دی۔ عوام الناس میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ جدید فیثا غورسیت (Neo - Pythagoreanism) افلاطونیت' یہودی و یونانی فلسفے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے اس عجیب وغریب امتزاج کو سمجھ سکتے۔ چنانچہ انہوں نے یا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک مجسّم خدا کے طور پر پوجنا شروع کر دیا، یا قدیم زمانہ کی تبرکات پرستی کی طرف عود کیا' یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدۂ مطہرہ کو ایک دیوی بنا کر پوجنے لگے[1]...... کالیریدیوں، (Collyridians) کے اہم فرقے نے تو یہاں تک غلو کیا کہ عیسائیوں کے دیومنڈل میں سے خدا کو خارج کر کے اس کی جگہ حضرت مریم کو دے دی اور ایک بل دار کیک کا چڑھاوا چڑھا کر ان کی پوجا کرنے لگا۔ اس بل دار کیک کو (Collyris) کہتے تھے، جس پر اس فرقے کا نام رکھا گیا۔ نیس کونسل (The Council of Nice) میں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماہیت و جبلت کے بارے میں آخری فیصلہ کیا گیا، بعض ایسے لوگ بھی تھے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ (God the Father) آسمانی باپ کے علاوہ اور خدا ہیں یعنی حضرت مسیح اور حضرت مریم۔ کہا جاتا ہے کہ رومی کلیسا والے اب بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو تثلیث کا تکملہ تصور کرتے ہیں۔

تو ہم کی طویل رات میں عیسائی نبی ناصری کی تعلیم سے بہت دور بھٹک گئے تھے۔ بتوں، ولیوں متبرک باقیات کی پرستش دینِ عیسوی کا ایک جزوِ لاینفک بن چکی تھی۔ وہ سب طور طریقے جن کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مذمت کی تھی، وہ سب خبائث ورذائل جن کو انہوں نے ممنوع قرار دیا تھا ایک ایک کر کے اُن کے مذہب میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ مقدس سرزمین جس پر اس محترم معلم نے زندگی کے دن گزارے تھے، معجزوں اور خارق

---

[1] Issurian بادشاہوں نے اسلام سے بالواسطہ متاثر ہو کر ایک صدی سے زیادہ مدت تک عیسائیت کے تنزل کے خلاف جدوجہد کی اور اس امر کی کوشش میں پورا زور لگا دیا کہ وہ کسی طرح اپنے معلم عظیم کی تعلیمات کی طرف عود کر جائے۔ لیکن ان کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔

عادت شعبدوں کے بادلوں میں گھر گئی تھی اور عیسائیوں کے دماغی اعصاب تقلید اور اندھا دھند اعتقاد کی بدولت مفلوج ہو گئے تھے[1]۔

جو بیہودگیاں ہم نے اُوپر بیان کی ہیں۔ ان سب کا قلع قمع حضرت محمد ﷺ کا مقصد زندگی تھا۔ جب بھی اس ملک الکلام نے (جس لقب سے اسے بجا طور پر ملقب کیا گیا ہے) اپنا آوازۂ حق بلند کیا، جس میں کلام خدا کی الہامی گونج ہوتی تھی، تو چاہے اس کے مخاطب عرب کے بت پرست قبیلے ہوں یا مسخ شدہ عیسائیت اور یہودیت کے پیرو، اس نے کبھی عقل کی سرحدوں سے تجاوز نہ کیا اور ہمیشہ ان لوگوں کو اپنے عقائد کی انسانیت سوز مہملیت پر شرمندہ کیا۔ وحدت اللہ کا داعی اعظم محمد ﷺ اس طرح تاریخ کے میدان میں انسان کے اس رجعت پسندانہ رجحان سے کہ وہ مخلوق ہستیوں کو خالقِ کائنات کا شریک گردانے سرگرمِ جہاد دکھائی دیتا ہے۔ قرآن میں بار بار ذیل کی آیات کے سے جوش وخروش اور آتش نوائی سے بھری ہوئی آیات نظر آتی ہیں:۔

"تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے۔ اس رحمٰن و رحیم کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں، رات اور دن کے لگاتار ایک دوسرے کے بعد آنے میں اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے سمندروں میں چلتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے ابر آسمان سے برساتا ہے اور جس کے ذریعے وہ مردہ زمین کو نت نئی زندگی بخشتا ہے اور پھر

---

[1] موشیم کی تاریخ کلیسا (Mosheims Ecclesiastical Hist) جلد اول صفحہ ۳۲۳ مزید ملاحظہ کیجئے۔ ہلم کی "انگلستان کی دستوری تاریخ" (Constitutional hist of England) باب ۲ صفحہ ۵۷۔ ان کتابوں کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جو دعویٰ کیا جاتا ہے، کہ اسلام میں جو جو اچھی باتیں ہیں وہ سب اُس نے یہودیت یا عیسائیت سے اخذ کیں، اس دعوے میں کہاں تک صداقت ہے۔ ڈوئش Deutsch کہتا ہے: "یہ ایک عام قاعدہ بن گیا ہے کہ اسلام میں جو جو خوبیاں ہیں اُنہیں عیسائیت سے منسوب کیا جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نظریہ دیانت دارانہ تحقیق کے نتائج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ رسولِ اللہ کے زمانہ میں جزیرہ عرب کی عیسائیت ناگفتہ بہ حالت میں تھی...... اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ اس کے مقابلے میں تو جدید مصری Modern Amharic عیسائیت بھی، جس کے بارے میں ہم نے تحیر انگیز قصے سُنے ہیں خالص اور اعلیٰ معلوم ہوتی ہے۔ کوارٹرلی ریویو نمبر ۲۴۹۵ صفحہ نمبر ۳۱۵۔

زمین پر ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان وزمین کے درمیان مطیع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں......
ان سب چیزوں میں سمجھدار لوگوں کے لیے اللہ کی نشانیاں ہیں۔ لیکن ان کے باوجود کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا خدا بناتے ہیں اور اُن کے ساتھ ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی انہیں خدا سے رکھنی چاہیے[1]۔"

(البقرۃ ۱۶۳ ۔ ۱۶۴ ۔ ۱۶۵)

ان الفاظ میں گمراہ لوگوں کے ساتھ کتنی گہری ہمدردی مضمر ہے!

مکرر:۔

"وہی ہے جو تمہیں بجلیاں دکھا کر ڈراتا بھی ہے اور اُمیدیں بھی دلاتا ہے اور جو پانی سے لدے ہوئے بادل اُٹھاتا ہے۔ بادلوں کی گرج اس کی خوبیوں کی اور فرشتے اس کی ہیبت کی تسبیح کرتے ہیں...... وہ کڑکتی ہوئی بجلیاں بھیجتا ہے اور جب لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں تو اس وقت ان بجلیوں کو جس پر چاہتا ہے گرا دیتا ہے......

اسی کو پکارنا حق ہے۔ وہ دوسری ہستیاں، جنہیں یہ لوگ اسے چھوڑ کر پکارتے ہیں، اُن کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ انہیں پکارنا تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر یہ سمجھے کہ پانی خود اس کے منہ تک پہنچ جائے گا، حالانکہ وہ کبھی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔"

(الرعد ۱۲ تا ۱۴)

اس نے آسمان وزمین کو برحق پیدا کیا ہے اور وہ بہت بالا و برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے۔ اس نے انسان کو ایک ننھی سی بوند سے پیدا کیا...... اور انسان کو دیکھو کہ وہ کھلے بندوں جھگڑالو اور بڑبولا بن گیا۔ اس نے چوپائے بنائے، جن سے تمہیں گرم پوشاک بھی

---

[1] نوٹ:۔ اگرچہ قرآن مجید کی انہیں آیات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے جن کا انگریزی ترجمہ مصنف نے اقتباسا دیا ہے، تاہم اس نے جو حوالے دیئے ہیں وہ بڑی حد تک غلط ہیں اس لیے ان کی تصحیح ضروری سمجھی گئی ہے۔ اردو ترجمہ کی جسارت مترجم نے خود کی ہے۔

حاصل ہوتی ہے، خوراک بھی، اور دوسرے فائدے بھی۔ جب تم انہیں چرنے کو بھیجتے ہو اور شام کو گھر واپس لاتے ہو تو وہ تمہارے لیے سرمایہ جمال بنتے ہیں......"

(النحل ۳ ۔ ۴ ۔ ۵ ۔ ۶)

"اور اُس نے رات اور دن، سورج اور چاند کو تمہارے کاموں پر مامور کر رکھا ہے، اور تمام ستارے بھی اس کے تابع فرمان ہیں...... وہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے...... اور تم دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے چلتے ہیں...... تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو...... پھر کیا یہ ممکن ہے کہ وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے ایک برابر ہوں؟ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے۔ اللہ فی الحقیقت بڑا بخشنے والا اور رحیم ہے۔ وہ تمہارے کھلے اور چھپے دونوں کاموں سے واقف ہے۔ رہیں وہ ہستیاں جنہیں لوگ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں، وہ کچھ پیدا نہیں کرتیں، بلکہ خود مخلوق ہیں، وہ مردہ ہیں نہ کہ زندہ۔"

(النحل ۱۱ ۔ ۱۲ ۔ ۱۴ ۔ ۱۷ ۔ ۱۸ ۔ ۱۹ ۔ ۲۰)

اللہ، جس کے سوا کوئی خدا نہیں، زندۂ جاوید ہے اور کائنات کا قائم رکھنے والا ہے۔ اُسے نہ نیند آتی ہے، نہ اونگھ لگتی ہے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اس کا ہے۔ کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کی جناب میں کوئی سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں سے اوجھل ہے۔ اُسے بھی اور جو کچھ اُن کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے۔ جو کچھ اس کے علم میں ہے وہ اُن کے حیطۂ ادراک میں نہیں آسکتا، سوائے اس صورت کے کہ وہ خود کسی چیز کا علم انہیں بخشے۔ اس کی کرسی حکومت آسمانوں اور زمین دونوں کو محیط ہے، اور اُن کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں......"

(البقرہ ۲۵۵)

"وہ دن کو رات کے پردے سے ڈھانپ دیتا ہے اور پھر رات دوڑتی ہوئی اس کا تعاقب کرتی ہے۔ سورج، چاند اور تارے اس کے مطیع ہیں۔ خبردار ہو کر اُسی کا کام ہے خلق کرنا اور حکم فرمانا۔ بڑا بابرکت ہے اللہ، سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔"

(الاعراف ۵۴)

''کہو کہ اللہ ایک ہے اور کسی کا محتاج نہیں۔ نہ اُس نے کسی کو اور نہ اُس کو کسی نے جنا، اُس کا کوئی ہمسر نہیں۔''

(الاخلاص)

''سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، جو سارے جہانوں کا رب ہے، رحمٰن اور رحیم ہے اور روزِ جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا یعنی اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا، جو تیرے معتوب نہیں ہوئے اور جو بھٹک نہیں گئے۔''

(الفاتحہ ۱ تا ۷)

''میں پناہ لیتا ہوں خدائے صبح کی ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے بنائی۔''

(الفلق ۱ ـ ۲)

''تم چاہے پکار کر بات کہو، وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات کو بلکہ اس سے بھی مخفی تر بات کو جانتا ہے۔''

(طٰحہٰ ۷)

''اُن سے پوچھو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہو سب کچھ اللہ کا ہے، جس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔''

(الانعام ـ ۱۲)

''اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، جن سے اس کے سوا کوئی واقف نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ بحر و بر میں کیا کچھ ہے۔ کوئی پتا ایسا نہیں جھڑتا جس کا اُسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی چھپا ہوا دانہ ایسا نہیں اور کوئی ہری یا سوکھی ایسی چیز نہیں جو اُس کی کھلی ہوئی کتاب میں درج نہ ہو۔ وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے اور دن کے وقت تم جو کام دھندا کرتے ہو اس سے واقف ہے۔ پھر دوسرے روز وہ تمہیں اٹھاتا ہے تاکہ تمہاری زندگی کی مقررہ میعاد پوری ہو۔ آخر کار تم اُس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے، اور اس وقت وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کیا کرتے رہے ہو۔''

(الانعام ۵۹ ـ ۶۰)

"وہ اللہ ہی ہے جو دانے اور گٹھلی کو پھوڑتا ہے، زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے۔ یہ ہے اللہ! تم کدھر بہکے چلے جاتے ہو؟"

(الانعام ۹۵)

"وہی پردۂ شب کو چاک کر کے صبح نکالتا ہے، اسی نے آرام کے لیے رات بنائی اور اُسی نے سورج اور چاند کو دن اور رات کے حساب کے لیے پیدا کیا۔ یہ ہے وہ اہتمام جو اس توانا و دانا رب نے کیا ہے۔"

(الانعام ۹۷)

"یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے۔ لہٰذا اس کی بندگی کرو، کیونکہ وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔"

(الانعام ۱۰۲)

"نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں لیکن وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے، کیونکہ وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے۔"

(الانعام ۱۰۳)

"کہو کہ میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔"

(الانعام ۱۶۲)

"کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں سب وہ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں، اور وہ پرندے بھی جو پر پھیلائے اُڑ رہے ہیں؟ سب کو اپنی اپنی دُعا اور اپنی اپنی تسبیح معلوم ہے۔ آسمانوں اور زمین کی پادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے، اور اُسی کی طرف ہر ایک کو پلٹنا ہے۔"

(النور ـ ۲۴ ـ ۴۱ ـ ۴۲)

"وہی زمین اور آسمانوں کی پادشاہی کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔"

(الاعراف ـ ۱۵۸)

''وہی ازل سے ابد تک زندہ رہنے والا ہے۔ اُس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں تم سب ایمان خالص سے اُسے پکارا کرو۔''

(المومن۔ ۱۶۲)

''میری نماز اور میری عبادت، میری زندگی اور میری موت، سب اللہ ربّ العٰلمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔''

(الانعام ۱۶۲ ۔ ۱۶۳)

''وہی ہے جس نے تمہیں بنا کھڑا کیا، جس نے تمہیں کان اور آنکھیں دیں اور دل بھی دیا لیکن کتنے کم ہیں وہ لوگ جو اس کے شکر گزار ہیں! وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا اور اسی کی طرف تم اکٹھے لوٹو گے۔''

(الملک ۲۳ ۔ ۲۴)

''اے خدا مجھے ان گناہ گار قوموں میں داخل نہ کر۔''

(المومنون ۹۴)

''وہی ہے جس نے رات تمہاری اوڑھنی کے طور پر بنائی اور نیند تمہارے آرام کی خاطر، اور جس نے دن تمہارے دوبارہ جی اُٹھنے کی خاطر بنایا۔''

(الفرقان ۴۷)

''کون ہے اُس کے سوا جو مصیبت زدوں کی پکار سنتا ہے جب وہ اُسے پکارتے ہیں، اور اُن کی گتھیاں سلجھا دیتا ہے اور تمہیں روئے زمین پر غالب بناتا ہے۔''

(النمل ۶۲)

''......اللہ زبردست، ہر چیز کا جاننے والا، گناہ کا بخشنے والا اور توبہ کا قبول کرنے والا......''

(المومن ۱۶۲)

''کہو کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لیے تلاش کروں، حالانکہ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اُس کا ذمہ دار وہ خود ہوتا ہے۔ کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھاتا۔ بالآخر سب کو اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔

اُس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تمہیں جتلا دے گا۔''

(الانعام ۱۶۵)

''وہ ہر چھپی اور کھلی چیز کا جاننے والا، بہت بڑا اور سب سے اُونچا ہے۔ چاہے کوئی چپکے سے بات کہے یا پکار کر، چاہے کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں سربازار پھر رہا ہو، اُس کے لیے سب یکساں ہیں۔''

(الرعد ۸ ـ ۹)

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک شیشے میں ہو اور شیشہ ایک طاق میں رکھا ہوا شیشے کی یہ شان ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا۔ وہ ایک مبارک (کثیر النافع) درخت یعنی زیتون کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو، جو نہ کسی آڑ کے مشرق کی طرف ہو۔ نہ مغرب کی طرف اور جس کا تیل ایسا بھڑک اُٹھنے والا ہو کہ اگر اس کو آگ نہ بھی لگے تو پھر بھی وہ خود بخود جل پڑے اور جب اس کو آگ لگ جائے تو نورٌ علیٰ نور ہو جائے۔ اللہ اپنے اس نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے اور اللہ لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ مثالیں بیان فرماتا ہے۔ وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

(النور ۳۵)

''وہ ایسے گھروں میں عبادت کرتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا اور جن میں اپنے نام کا ذکر کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ ان گھروں میں وہ صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔''

(النور ۳۶)

''جن لوگوں کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامتِ نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں اُلٹ جائیں گی۔ انجام اُن لوگوں کا یہ ہوگا کہ اللہ انہیں اُن کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ دے گا اور مزید اپنے فضل سے نوازے گا۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔''

(النور ۳۷ ـ ۳۸)

''جن لوگوں نے کفر کیا اُن کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹیل میدان میں سراب جسے پیاسا دور سے پانی سمجھے ہوئے تھا، مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ بھی نہ پایا، بلکہ قضائے الٰہی کو پایا، چنانچہ اللہ نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا۔ اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی''

(النور ۳۹)

''یا پھر اُن کی مثال ایسی ہے جیسے بڑے گہرے سمندر میں اندرونی اندھیرے جن پر ایک موج چھائی ہوئی ہو۔ اُس پر ایک اور موج، اور اُس کے اوپر بادل۔ غرض اوپر تلے بہت سے اندھیرے ہی اندھیرے ہیں، ایسے اندھیرے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ جسے اللہ نور نہ بخشے اُسے کہیں سے بھی نور میسر نہیں ہو سکتا۔''

(النور ۴۰)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اُڑ رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی دعا اور اپنی تسبیح جانتا ہے۔، اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے واقف ہے۔''

(النور ۴۱)

''کیا تم کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ ایک بادل کو دوسرے بادل کی طرف آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر اُن کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے اور اُنہیں سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے؟ پھر تم دیکھتے ہو کہ اس بادل کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے ہیں اور وہ آسمان سے اولوں کے پہاڑ برساتا ہے۔ پھر وہ جن پر چاہتا ہے اُنہیں گراتا ہے، اور جنہیں چاہتا ہے اُن سے بچالیتا ہے۔ اُس کے کوندے کی لپک کا یہ حال ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اب آنکھیں نکال لے جائے گی۔''

(النور ۴۳)

''رات اور دن کا اُلٹ پھیر وہی کر رہا ہے۔ اس میں آنکھوں والوں کے لیے ایک سبق ہے۔''

(النور ۴۴)

پیغمبر اسلام ﷺ نے قران کی شکل میں مظاہر فطرت سے خدا کی قدرت و حکمت کی جو شہادتیں پیش کیں اُن کی بہترین مثالوں میں سے ایک مثال سورۂ رحمٰن ہے، جسے عربی مصنفین نے بجا طور پر اسلام کی ''بینڈسی'' (Benedicite) کہا ہے:۔

''سورج اور چاند حساب کے ساتھ چلتے ہیں اور بوٹیاں اور پیڑ اسے سجدہ کرتے ہیں اور اُسی نے آسمان کو اونچا کیا اور ایک ترازو متعین کی تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو اور انصاف سے سیدھی ترازو تولو اور تول کو نہ گھٹاؤ۔ اُس نے خلقت کے واسطے زمین بنائی جس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل پر غلاف ہوتا ہے اور غلہ ہے جس میں بھس بھی ہوتا ہے اور خوشبودار پودے بھی ہیں۔''

(الرحمٰن ۵ ۔ ۱۲)

''اس نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی ہوئی مٹی سے بنایا اور جنات کو خالص آگ سے۔''

(الرحمٰن ۱۵)

''پھر اُس نے آسمان بنانے کی طرف توجہ کی، جو اُس وقت محض ایک دھواں سا تھا۔''

(حٰم ۱۱)

''وہ ایک مشرقوں اور مغربوں کا مالک ہے......''

(الرحمٰن ۱۷)

''اس نے دو دریاؤں کو یوں پہلو بہ پہلو چلایا کہ وہ بظاہر باہم ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، لیکن درحقیقت ان کے درمیان ایک ایسا پردہ ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتے۔''

(الرحمٰن ۱۹ ۔ ۲۰)

''ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے۔''

(الرحمٰن ۲۲)

''اُسی کے ہیں وہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے نظر آتے ہیں۔''

(الرحمٰن ۲۴)

''اُن میں سے ہر ایک فانی ہے اور صرف تمہارے عظمت و احسان والے خدا کا چہرہ باقی رہے گا۔''

(الرحمٰن ۲۶ ۔ ۲۷)

''سب آسمانوں اور زمین والے اُسی سے اپنی اپنی حاجتیں مانگتے ہیں۔ وہ روز ایک نیا کام کرتا ہے۔''

(الرحمٰن ۲۹)

''ہر انسان کی تقدیر کی تختی ہم نے اس کے گلے میں لٹکا رکھی ہے اور قیامت کے دن ہم اسے اس کا نوشتۂ اعمال دکھائیں گے، جسے وہ ایک کھلی کتاب کی طرح پائے گا۔''

(بنی اسرائیل ۱۳)

''قسم ہے انسان کی روح کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے درست بنایا اور اُسے بدکرداری و پرہیزگاری دونوں کی تمیز بخشی، یقیناً وہ شخص مراد کو پہنچا جس نے اپنی روح کو پاک کرلیا اور نامراد ہوا وہ شخص جس نے اُسے خاک میں ملا دیا۔''

(الشمس ۔ ۷ ۔ ۱۰)

''کیا تجھے خدائے رحمٰن کے بنائے ہوئے میں کچھ خلل دکھائی دیتا ہے؟ دوبارہ نگاہ ڈال۔ کہیں بھی تجھے کوئی نقص نظر آتا ہے؟ ایک بار پھر نگاہ ڈال۔ تیری نگاہ عیب نکالنے میں ناکام ہوکر اور تھک کر لوٹ آئے گی......''

(الملک ۳ ۔ ۴)

''وہ مری ہوئی زمین کو دوبارہ زندگی بخشتا ہے۔ اسی طرح تم دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے۔''

(الروم ۱۹)

''یہ آسمان اور یہ زمین دونوں اس کے حکم سے قائم ہیں۔ بالآخر جب وہ تمہیں پکارے گا تو تم زمین کے اندر سے نکل کر کھڑے ہو جاؤ گے۔''

(الروم ۲۵)

"جب سورج تہ کر دیا جائے گا، جب تارے گر پڑیں، جب پہاڑ چلنے لگیں گے جب اونٹنیاں بے مہار پھریں گی، جب جنگلی جانوروں میں ہلچل مچ جائے گی، جب سمندر اُبلنے لگیں گے، جب روحوں کے جوڑے بندھیں گے، جب ان بیٹیوں سے جو جیتی گاڑ دی گئی تھیں، یہ پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کی پاداش میں ماری گئیں، جب اعمالناموں کے ورق کھولے جائیں گے، جب آسمان چھلکے کی طرح اُتار دیئے جائیں گے، جب دوزخ کی آگ دہکائی جائے گی اور جب جنت قریب آجائے گی، اُس وقت ہر روح کو پتہ چل جائے گا کہ وہ کیا ساتھ لے کر آئی ہے۔"

(التکویر ۱ تا ۱۴)

"(اے محمد ﷺ) تمہیں اُس گھڑی کا کیا علم ہے؟ اُس کا علم صرف تمہارے خدا ہی کو ہے، تمہارا کام تو صرف اتنا ہے کہ تم ایسے لوگوں کو جو ڈرنے والے ہیں اُس سے ڈراؤ۔"

(النزعت ۴۳ ۔ ۴۴ ۔ ۴۵)

"تمہیں کیا خبر ہے کہ وہ ہو کر رہنے والی چیز کیسی ہے؟ ثمود اور عاد نے اس کھڑکے والی چیز کو جھٹلایا۔ چنانچہ ثمود تو ایک زور کی آواز سے ہلاک کر دیئے گئے اور عاد ایک تیز و تند ہوا سے برباد ہو گئے۔"

(الحاقہ ۳ تا ۶)

'پھر بھی' اس قدرت و جبروت کے باوجود اس کی ربوبیت و رحمت ہمہ گیر ہے۔

"قسم ہے چڑھتی دھوپ کی اور چھائی ہوئی رات کی۔ تمہارے رب نے نہ تمہارا ساتھ چھوڑا اور نہ تم سے بیزار ہوا۔ یقیناً تمہارا مستقبل ماضی سے بدرجہا بہتر ہوگا۔ بالآخر وہ تمہیں اتنا کچھ دے گا کہ تمہارا دل خوش ہو جائیگا۔ کیا اُس نے تمہیں ایک یتیم نہیں پایا اور پھر تمہیں ٹھکانا نہیں دیا؟ تمہیں بھٹکتا نہیں پایا اور پھر ہدایت نہیں دی؟ تمہیں نادار نہیں پایا اور پھر تمہیں مالدار نہیں بنایا؟ (اس کے شکریئے میں) یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو نہ جھڑکو اور خدا کے احسانوں کا تذکرہ کرتے رہو۔"

(الضحیٰ)

"کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تمہیں یونہی (کسی حکمت کا بغیر) پیدا کر دیا ہے اور تم ہمارے پاس واپس نہیں لائے جاؤ گے؟"

(المؤمنون ۱۱۵)

• "......اے ہمارے رب، ہم سے مواخذہ نہ کر، اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے......ہم سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے......"

(البقرہ ۲۸۶)

"اے مولا، ہم پر عفو و رحم کر، کیونکہ تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے۔"

(مومنون ۱۱۸)

"......کوئی شخص کسی اور کے گناہ کا بوجھ نہیں اُٹھاتا اور ہم کبھی سزا نہیں دیتے جب تک کسی رسول کو نہیں بھیج لیتے۔"

(بنی اسرائیل ۱۵)

"قسم ہے اس کتاب واضح کی کہ ہم نے اُسے ایک برکت والی رات میں اتارا۔ ہم ہیں آگاہ کرنے والے۔"

(الدخان ۲ ۔ ۳)

"ہم نے قرآن تم پر اس لیے نہیں اُتارا کہ تمہارے لیے باعث تکلیف ہو۔"

(طٰہٰ ۲)

یوں رواں دواں چلی جاتی ہے یہ معجز کتاب، جس کا خطاب انسان کے اشرف جذبات سے ہے، یعنی اُس کے شعور باطنی سے اور اس کی حس اخلاقی سے، اور یوں یہ بت پرستانہ عقائد کی انسانیت سوزی کو بے نقاب اور ثابت کرتی ہے۔ کوئی سورت ایسی نہیں جس میں خدا کی قدرت، رحمت اور وحدت کے موضوع پر کوئی پر جوش و خروش عبارت نہ ہو۔ قادرِ مطلق کے بارے میں اسلام کا جو تصور ہے اس کے متعلق عیسائی مصنفین غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ خدائے اسلام کو یوں پیش کرتے ہیں کہ گویا وہ "ایک بے رحم اور جابر حاکم ہے، جو انسانوں سے شطرنج کے مہروں کی طرح کھیلتا ہے اور اپنی بازی کا نقشہ جماتے وقت اس امر کا کوئی لحاظ نہیں رکھتا کہ مہروں کا کیا حشر ہوگا۔"

آیئے ہم یہ دیکھیں کہ آیا یہ خاکہ درست ہے۔ اسلام کا خدا قادرِ مطلق ہے، عالم کل ہے، عادلِ کامل ہے، رب العلمین ہے، آسمانوں اور زمین کا صانع ہے، زندگی اور موت کا خالق ہے جس کے قبضہ اختیار میں حکومت ہے اور اٹل قوت، اور جو عرش معلیٰ کا مالک اور ساری موجودات پر حاوی ہے، قوی ہے، مستعال ہے، خلاق ہے، صناع ہے، صورت گر ہے، حکیم ہے، عادل ہے، حق ہے، سریع الحساب ہے۔ وہ ہر شخص کی نیکی و بدی کی چیونٹی کے برابر مقدار سے بھی واقف ہے اور اس کے فرمانروا بندے جس انعام کے مستحق ہیں اس کے ایک ذرہ سے بھی وہ انہیں محروم نہیں رکھتا۔ لیکن قادرِ مطلق اور علیم و حکیم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وہ بادشاہ ہے، ایک مقدس ہستی ہے، امن قائم رکھنے والا ہے، وعدے کا پکا ہے، اپنے بندوں کا محافظ ہے، یتیموں کا ملجا ہے، محروموں کو دلاسا دینے والا ہے، مصیبت زدوں کا آسرا ہے۔ وہ نعمتوں کا مالک ہے، ایک آقائے کریم ہے، رحمٰن ہے، سمیع ہے، شہ رگ سے بھی قریب تر ہے، رحم کھانے والا ہے، انتہائی درجے کا درگزر کرنے والا ہے، جسے انسان کے ساتھ اس سے بھی زیادہ محبت ہے جتنی ایک مادہ پرندے کو اپنے بچوں سے ہوتی ہے۔

قادرِ مطلق کا رحم و کرم قرآن کے سب سے شاندار موضوعوں میں سے ایک موضوع ہے۔ وہ لقب یعنی الرحمٰن، جس سے ہر سورت شروع ہوتی ہے اور جس سے خدا بار بار پکارا جاتا ہے، بجائے خود اس امر کا مظہر ہے کہ اس رحمتِ ربی پر جس نے ساری موجودات کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے کیسا صمیمی ایمان قرآن کی روح میں جاری و ساری ہے۔

پہلے دو مذاہب کے پیروؤں کی اخلاقی پستی کو دیکھ کر معلم اسلام کے دل کو انتہائی رنج ہوتا ہے۔ چنانچہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے نبیوں کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جو توہم پرستانہ رسمیں اپنے یہاں رائج کی تھیں وہ سخت الفاظ میں ان کی مذمت کرتا ہے۔ مذہبی جوش کی وہ آگ اشعیاہ (Isaiah) اور یرمیاہ (Jeremiah) کے سینوں میں دہکتی تھی از سرنو ایک اور شخص کے سینے میں بھڑک اُٹھی جو اُن سے بھی بڑا انسان تھا۔ اس نے یہودیوں اور عیسائیوں کی زجر و توبیخ کی، لیکن انسانیت کے انحطاط کو

دیکھ کر جو دردناک آواز، جو صدائے شیون، اس کے منہ سے نکلی اس کے ساتھ ہی اس سے بھی بلند تر اُمید کی ایک صلائے عام تھی۔

قرآن یہودیوں کو چھوٹے خداؤں اور بتوں کی پوجا اور عزیر (عزرا) (Ezra) کی مبالغہ انگیز تعظیم پر اور عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی پرستش پر نہایت سختی کے ساتھ ملامت کرتا ہے۔

''کیا تم نے اُن لوگوں کا حال نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے تھوڑا سا حصہ دیا گیا ہے۔ وہ بتوں اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔''

(النساء ۵۱)

''یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے بنیاد باتیں ہیں جو یہ لوگ اگلے منکروں کی تقلید میں منہ سے نکالتے ہیں...... انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے...... یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو پھونکوں سے بجھا دیں......''

(التوبہ ۳۰ ۔ ۳۱ ۔ ۳۲)

''یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔''

(المائدہ ۱۸)

''ان اہلِ کتاب میں سے بہتیرے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنا دیں......نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور تم جو نیک کام بھی اپنی بھلائی کے واسطے اپنے آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے پاس پہنچ کر پاؤ گے۔''

(البقرہ ۱۰۹ ۔ ۱۱۰)

''وہ (یہود ونصاریٰ) کہتے ہیں کہ یہود ونصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا......اُن سے کہو کہ اگر وہ سچے ہیں تو اس پر اپنی دلیل لائیں۔ حق یہ ہے کہ جو شخص بھی خدا کی طرف دل سے متوجہ ہو اور نیکوکار بھی ہو اس کے رَبّ کے پاس اُس کا اجر ہے۔''

(البقرہ ۱۱۱ ۔ ۱۱۲)

''اے اہلِ کتاب، اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ اللہ کا رسول تھا اور اس کا کلام (یعنی حکم)...... لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تین (خدا) ہیں۔ باز آجاؤ اس بات سے...... مسیح نے کبھی اس بات کو ناگوار نہ سمجھا کہ اُسے اللہ کا ایک بندہ کہا جائے۔''

(النساء ۱۷۱ ۔ ۱۷۲)

''کسی انسان کی مقدرت نہیں کہ اللہ تو اُس کو کتاب اور حکمت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ تم کامل ربانی بن جاؤ جیسا کہ اس کتاب کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے ہو اور پڑھاتے ہو۔''

(آل عمران ۷۹)

ذیل کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا کہ اس قسم کے تصورات کے بارے میں قرآن کا کیا خیال تھا:۔

''وہ کہتے ہیں کہ خدا کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ یہ انتہائی بے ہودہ بات ہے جو تم لوگوں نے کہی ہے۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے، زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ گر جائیں، اس بات پر کہ لوگ رحمٰن سے اولاد منسوب کرتے ہیں، حالانکہ رحمٰن کے شایانِ شان نہیں کہ اس کے کوئی بیٹا ہو۔ زمین اور آسمانوں میں کوئی ایسا نہیں جو بندے کی حیثیت سے اس کے حضور پیش ہونے والا نہیں۔ وہ سب پر محیط ہے۔''

(مریم ۸۸ ۔ ۸۹ ۔ ۹۰ ۔ ۹۱ ۔ ۹۲ ۔ ۹۳ ۔ ۹۴)

لیکن یہ صاحب الہام مبلغ جو حق کی اشاعت کے لیے مبعوث ہوا اچھے اور برے لوگوں میں تمیز کرتا ہے۔

''لیکن سب اہلِ کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو [illegible] راست پر گامزن ہیں۔ وہ راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں، اس کے آگے سر بسجود [illegible] ہیں، اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور [illegible] سے

روکتے ہیں اور نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا شمار صالحین میں ہوتا ہے۔"

(آل عمران ۱۱۳ ۔ ۱۱۴)

یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی منافرتیں، نسطوریوں (Nestorians) اور مونوفیزیوں (Monophygites) کی وحشیانہ لڑائیاں، مختلف فرقوں کے مہمل مناقشے، بازنطینی پادریوں کے روح فرسا لفظی تنازعے یہ سب عبارتِ ذیل کی قسم کی ملامتوں کے مورد بنتے ہیں:۔

"عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم اور دوسرے رسولوں کو ہم نے روشن نشانیاں عطا کیں......
اگر اللہ چاہتا تو ممکن نہ تھا کہ ان کے بعد ان کی اُمت کے جو لوگ ہوئے وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے لیکن اللہ کو جو منظور ہوتا ہے وہ وہی کرتا ہے۔"

(البقرہ ۲۵۳)

"ایک زمانے میں سب انسان ایک ہی طریقے پر تھے۔ پھر اللہ نے اپنے پیغمبر بھیجے، جو خوشخبریاں بھی دیتے تھے اور ڈراتے بھی تھے اور ہر ایک کے ساتھ ایک کتابِ برحق نازل کی تاکہ لوگوں کے درمیان جو اختلافات ہوں اُن کا فیصلہ کر دے۔ لیکن اختلاف کئے تو صرف اُن لوگوں نے کئے جن کو وہ کتاب عطا کی گئی تھی۔ اور محض اس لیے کہ ان میں باہمی ضد اضدی تھی......"

(البقرہ ۲۱۳)

"اے اہلِ کتاب، تم ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو؟...... ایسی بات پر کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں کچھ علم نہیں؟"

(آل عمران ٦٤ ۔ ٦٥)

"نئے مذہب کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ نوعِ انسانی کے دل میں اس حقیقت و صداقت کا ایک جیتا جاگتا ادراک پیدا کرے یا از سرِ نو بروئے کار لائے جو زندگی کے عام علائق و روابط میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ایک مشہور مصنف کے الفاظ میں "اس نئے صحیفۂ آسمانی کا اخلاقی مقصدِ غائی عام انسانی فرائض اور باہمی شفقت و محبت کے جانے پہچانے طریقوں کی حدود کے اندر مقرر کیا گیا۔"

"وہ کچھ لوگ تھے جو گزر گئے۔ انہوں نے جو کچھ کمایا وہ ان کا حصہ ہے۔ جو تم کماؤ گے وہ تمہارا حصہ ہوگا۔ ان کے کیے کی پرسش تم سے نہ کی جائے گی۔"

(البقرہ ۱۳۴)

"اللہ کسی متنفس پر اس کی طاقتِ برداشت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا۔ جس نے جو نیکی کی اس کا پھل اسی کو ملتا ہے اور جس نے جو بدی کی اُس کی سزا اُسی کو دی جاتی ہے۔"

(البقرہ ۲۸۶)

"مبارک ہے وہ شخص جو اپنا مال اپنے آپ کو پاک کرنے کی خاطر (حق داروں کو) دے دیتا ہے اور جو کسی پر احسان کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کا بدلہ لے بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر۔"

(الضحیٰ ۱۷ ۔ ۱۸ ۔ ۱۹ ۔ ۲۰)

"نیک بخت ہیں وہ لوگ جو از راہِ شفقت مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، یہ کہہ کر کہ ہم جو تم کو کھانا کھلا رہے ہیں تو صرف اللہ کی خوشنودی کی خاطر۔ ہم تم سے نہ اس کا بدلہ چاہتے ہیں۔ نہ شکر گزاری۔"

(الدہر ۸ ۔ ۹)

"خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے مہربانی کا سلوک کرو، لوگوں سے راست بازانہ بات کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔"

(البقرہ ۸۳)

"اپنے والدین کے ساتھ عاجزی اور احترام کا سلوک کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ اس کے حق میں یہ دعا مانگا کرو کہ پروردگار، ان پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں پالا تھا، جب میں بالکل بے بس تھا۔"

(بنی اسرائیل ۲۴)

"اگر تم صدقات علانیہ طور پر دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر دو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

(البقرہ ۲۷۱)

''تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے اُس میں سے دوسروں کو دو اس سے پیشتر کہ وہ دن آئے جب نہ کوئی تجارت ہوگی، اور نہ کوئی دوستی کام آئے گی، نہ کوئی سفارش۔''

(البقرہ ۲۵۴)

''کیا تم جانتے ہو کہ گھاٹی کا کیا مطلب ہے؟ وہ کسی کی گردن کا غلامی سے چھڑا دینا ہے، یا کسی یتیم رشتہ دار کو یا کسی خاک نشین کو فاقے کی حالت میں پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہے' (جس نے ایسا کیا وہ) وہ اُن لوگوں میں شمار ہو جو ایمان والوں کو صبر اور رحم کی تلقین کرتے ہیں۔''

(البلد ۱۱ ۔ ۱۷)

''حیف ہے اُن لوگوں پر...... جو اتقا کا مظاہرہ کرتے ہیں اور محتاجوں کی مدد کرنے سے انکار کرتے ہیں۔''

''اے ایمان والو، اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دل دُکھا کر خاک میں نہ ملا دو......''

(البقرہ ۲۶۴)

''میٹھا بول اور چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد آزار پہنچایا جائے۔''

(البقرہ ۲۶۳)

''سودخوری ترک کردو......''

(البقرہ ۲۷۸)

''جو شخص اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسی ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی اُس پر جب زور سے مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنا مال محض اللہ کی خوشنودی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ٹیلے پر ایک باغ ہو، اُس پر زور کی بارش ہو جائے تو وہ

دونا چوگنا پھل لائے، اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو۔"

(البقرہ ۲۶۴ ۔ ۲۶۵)

"اے داؤد، ہم نے تجھے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ لوگوں پر عدل و انصاف سے حکومت کر اور اپنی ہوا و ہوس پر نہ چل تاکہ تو اللہ کی راہ سے بھٹک نہ جائے۔"

(ص ۲۶)

"جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی طمع نہ کرو......"

(النساء ۳۲)

"اچھائی اس میں نہیں کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ اس میں ہے کہ آدمی اللہ کو دل سے مانے......اور نیک کام کرے......"

(البقرہ ۱۷۷)

"حسنِ عفو کا طریقہ اختیار کرو اور نیک کاموں کی تلقین کئے جاؤ۔ جاہلوں سے کنارہ کرلو اور اگر کبھی شیطان تمہیں اُکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو......"

(الاعراف ۱۹۹ ۔ ۲۰۰)

"یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ......اپنا عہد پورا کرو......اور زمین پر اترا کر نہ چلو......"

(بنی اسرائیل ۳۴ ۔ ۳۷)

"جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے......"

(النحل ۵۸)

"مفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد کو ہلاک نہ کرو۔ تمہاری اولاد کو بھی اور تم کو بھی ہم روزی دینے والے ہیں۔ ان کا ہلاک کرنا ایک گناہِ کبیرہ ہے۔"

(بنی اسرائیل ۳۱)

"......اُس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تمہیں ان کی

بدولت آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی کا رشتہ ہو......"

(الروم ۲۱)

"قرابت داری کے رشتوں کو بگاڑنے سے پرہیز کرو......"

(النساء ۱)

"زنا کاری کے پاس بھی نہ پھٹکو، کیونکہ وہ بے حیائی اور بدکاری ہے۔"

(بنی اسرائیل ۳۲)

"مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں......اور مومن عورتوں سے کہو کہ محرموں کے سوا کسی کے سامنے اپنے بناؤ سنگار کی نمائش نہ کریں......"

(النور ۳۰ ـ ۳۱)

"خوب جان لو کہ آخرت کے مقابلے میں دنیوی زندگی محض لہو ولعب ہے......
مال اور اولاد کی بہتات کی کوشش کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے مینہ برسنے کے بعد کھیتی ہری بھری ہو کر کاشت کار کے دل کو خوش کرتی ہے اور پھر وہ خشک اور زرد ہو کر روندن سا بن جاتی ہے۔ آخرت کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں عذاب شدید ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضا مندی ہے......"

(الحدید ۲۰)

"تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی۔ جو لوگ گناہ کماتے ہیں وہ اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔"

(الانعام ۱۲۰)

"جو لغو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اپنی شہوتوں کو قابو میں رکھتے ہیں، اپنی امانتوں کو پورا کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں، یہ ہیں وہ لوگ جو (راحت ابدی کی) میراث پائیں گے۔"

(الحج ۳ تا ۹)

"اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر تمہارے پاس رہیں تو کبھی انہیں اُف تک نہ کہو اور اُن سے جھڑک کر بات نہ کرو۔ بلکہ اُن

سے باادب پیش آؤ اور نرمی اور شفقت کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو۔"

(بنی اسرائیل ۲۳ ـ ۲۴)

"اپنے قریبی رشتہ داروں کو اُن کا حق دو اور مسکینوں اور مسافروں کو اُن کا حق، لیکن فضول خرچی نہ کرو۔"

(بنی اسرائیل ۲۶)

"نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اُسے پوری طرح کھلا چھوڑ دو، تا کہ ایسا نہ ہو کہ حقیر اور نادار بن کر رہ جاؤ۔"

(بنی اسرائیل ۲۹)

"میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے ہمیشہ دل کو بھانے والی بات نکالا کریں۔"

(بنی اسرائیل ۵۴)

"بری بات کا ردایسی بات سے کرو جو اس سے بہتر ہو۔"

(المومنون ۹۶)

"قیامت کے دن ہم ٹھیک تولنے والی ترازوئیں رکھ دیں گے۔ پس کسی ذی روح پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ اگر کسی کا رائی کے دانے کے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا تو ہم وہ اس کے سامنے لا کر تولیں گے۔ اور ہم حساب لگانے کے لیے کافی ہیں۔"

(الانبیاء ۴۷)

"اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ کر آؤ۔ بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے۔"

(ہود ۹۰)

"تمہارا رب کہتا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری پکار سنوں گا۔"

(المومن ۶۰)

"کہہ دے اے میرے بندو، جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی، اللہ کی مہربانی کی آس نہ توڑو، وہ سب گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ وہ بے عفو کرنے والا اور مہربان۔"

(الزمر ۵۳)

''پاکیزہ کلام اس کی طرف صعود کرتا ہے اور وہ نیک کام کو بلندی بخشتا ہے۔''

(فاطر ۱۰)

''کہو کہ جو چیزیں اللہ نے حرام کی ہیں وہ یہ ہیں:۔ بے حیائی کے کام، خواہ کھلے ہوں یا چھپے، گناہ اور ناحق کی زیادتی۔''

(الاعراف ۳۳)

''اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے پکارو۔ یقیناً اسے حد سے تجاوز کرنے والے پسند نہیں۔ اب جب کہ اس زمین کی اصلاح ہو چکی ہے، اس پر فساد برپا نہ کرو اور خوف اور التجا کے ساتھ خدا کو پکارو۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک لوگوں کے قریب ہے۔''

(الاعراف ۵۵ ـ ۵۶)

''اور ہم نے انسان کو تاکید کی ہے کہ اپنے ماں باپ سے اچھا سلوک کرے۔ اس کی ماں نے تکلیفیں اُٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دُکھ سہہ کر اسے جنم دیا......وہ (بڑا ہو کر) کہتا ہے: 'اے میرے رَبّ مجھے توفیق دے کہ میں اُن احسانوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیئے اور میری قسمت میں کر کہ میں ایسے نیک کام کروں جن سے تُو خوش ہو۔ نیز مجھے نیک اولاد عطا فرما، کیونکہ میں توبہ کر کے تیری طرف رجوع ہوا ہوں اور تیرا حکم بردار بندہ ہوں۔''

(الاحقاف ۱۵)

''اُن کے لیے اُن کے رَبّ کے پاس ایک سلامتی کا گھر ہے، اور اس صحیح طرزِ عمل کی وجہ سے جو انہوں نے اختیار کیا وہ ان کا سرپرست ہے۔''

(الانعام ۱۲۸)

''یقیناً بدبخت ہیں وہ لوگ جنہوں نے نادانی اور کم فہمی سے اپنی اولاد کو ہلاک کر دیا اور اللہ نے انہیں جو رزق دیا تھا اُسے اللہ پر جھوٹ باندھ کر حرام ٹھہرایا۔ یہ لوگ بھک گئے اور سیدھے راستے پر نہ چلے۔''

(الانعام ۱۴۱)

''جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن کے خرچ کی مثال ایسی

ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس میں سے سات بالیں نکلیں، جن میں سے ہر ایک میں سو دانے ہوں...... جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے اور نہ کسی کو ستاتے ہیں، اُن کا اجر اُن کے رَبّ کے پاس ہے۔ اُن کے لیے خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔ میٹھا بول بولنا اور دوسروں کی خطاؤں سے درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد دُکھ پہنچایا جائے۔"

(البقرہ ۲۶۱ ۔ ۲۶۲ ۔ ۲۶۳)

"اللہ کسی متنفس پر اس کی طاقتِ برداشت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اُسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اُسی پر ہے۔"

(البقرہ ۲۸۶)

"اے رَبّ اگر ہم سے کوئی بھول چوک یا قصور ہو جائے تو اس پر گرفت نہ کر۔ اے مالک، ہم پر ایسا بارِ گراں نہ ڈال جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ ہم سے ایسا بوجھ نہ اٹھوا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں۔ ہم سے درگزر کر، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔"

(البقرہ ۲۸۶)

"وہ لوگ جو صابر ہیں، راست باز ہیں، فرماں بردار ہیں، کشادہ دل ہیں اور جو رات کے پچھلے پہر میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگتے ہیں۔"

(آل عمران ۱۷)

"جو لوگ، خواہ وہ خوش حال ہوں یا بد حال، اپنا مال خرچ کرتے ہیں، غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کی خطائیں معاف کر دیتے ہیں، ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔"

(آل عمران ۱۳۴)

"اے خدا، ہمارے گناہ بخش، ہماری برائیاں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔"

(آل عمران ۱۹۳)

''پھر ان کا خدا جواب میں فرماتا ہے۔ 'میں تم میں، سے کسی کا عمل رائیگاں نہیں جانے دیتا' چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔''

(آل عمران ۱۹۵)

''لوگو! اپنے رَبّ سے ڈرو، جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور قرابت داری کا خیال رکھو۔''

(النساء ۱)

''اور ایسی عورتوں سے نکاح نہ کرو جو تمہارے باپ کے نکاح میں رہ چکی ہوں۔ یہ بے حیائی ہے، ایک ناپسندیدہ حرکت ہے اور برا چلن ہے۔''

(النساء ۲۲)

''جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیا ہے اس کی ہوس نہ کرو۔''

(النساء ۳۲)

''ماں باپ سے، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں سے، قریبی ہمسایوں سے، اجنبی ہمسایوں سے، برابر کے رفیقوں سے، مسافروں سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضے میں ہوں، نیک برتاؤ کرو۔ یقین جانو کہ اللہ کو اترانے اور بڑے بول بولنے والے لوگ نہیں بھاتے۔''

(النساء ۳۶)

''جو شخص (انسانوں کے باہمی معاملوں میں) بھلائی کی سفارش کرے گا وہ بھلائی کا حصہ اور جو بُرائی کی سفارش کرے گا وہ بُرائی کا حصہ پائے گا۔ اللہ ہر چیز کا عادلانہ بانٹنے والا ہے۔''

(النساء ۸۵)

''اے ایمان والو، انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لیے سچی گواہی دو، خواہ اس سے خود تمہیں یا تمہارے ماں باپ کو اور رشتہ داروں کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچے۔ فریق معاملہ چاہے امیر ہو چاہے غریب، دونوں صورتوں میں اللہ تم سے زیادہ اس کا خیر خواہ

ہے۔اس لیے اپنے نفس کی بات مان کر انصاف کی راہ سے نہ بھٹک جاؤ۔"

(النساء ۱۳۵)

حضرت اشعیاہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اس بادیہ زاد نبی کا روئے سخن ایک زیادہ وسیع دنیا اور ایک زیادہ ترقی یافتہ نوعِ انسانی سے تھا۔ انصاف سے دیکھنے کی بات ہے کہ آیا اس کی پیش کردہ تعلیمات، جو انسانی محبت کے ایک رفیع جذبے اور راستی، نیکی اور پاکی کے حصول کی ایک بیتاب تمنا سے لبریز ہیں، حضرت اشعیاہ کی خوف دلانے والی تنبیہوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دل پگھلا دینے والی التجاؤں سے کیا کسی طرح کم تر درجہ رکھتی ہیں؟

غریب، یتیم اور مسکین، زمین کے اسفل نشین، وہ کم نصیب لوگ جو ابتدائے زندگی ہی میں ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے، یہ ہیں وہ لوگ جن کی حالت دیکھ کر اس کی رقتِ قلب خصوصاً جوش میں آتی ہے۔ وہ بار بار اعلان کرتا ہے کہ خدا کو پانے کا راستہ یہ ہے کہ یتیموں اور مسکینوں کی مدد کی جائے، غریبوں کی رفعِ حاجت کی جائے اور قیدیوں کا فدیہ دے کر انہیں رہائی دلائی جائے۔ اس کی دلسوزی اور محبت صرف اپنے ابنائے جنس تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ دوسرے جاندار بھی اس میں شریک تھے۔

"ایک مرتبہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک گٹھڑی اُٹھائے حاضر ہوا اور بولا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میں ایک جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے پرندوں کے بچوں کی آوازیں سنیں۔ چنانچہ میں نے انہیں پکڑ کر اس غالیچے میں لپیٹ لیا۔ ان کی ماں پر پھڑ پھڑاتی ہوئی میرا تعاقب کرنے لگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، بچوں کو گٹھڑی سے نکال کر زمین پر رکھ دو، جب اس نے ایسا کیا، تو اُن کی ماں اُن کے پاس آ گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا 'اس کی ماں کو اپنے بچوں سے جو محبت ہے کیا تمہیں اسے دیکھ کر تعجب ہو رہا ہے؟ میں اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس نے مجھے یہاں بھیجا ہے کہ جتنی محبت ایک مادہ پرندے کو اپنے بچوں سے ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ محبت خدا کو اپنے بندوں سے ہے۔ ان بچوں کو تم جہاں سے لائے ہو وہیں واپس پہنچا دو اور اُن کی ماں کو اُن کی دیکھ بھال کرنے دو۔'"

"جانوروں کے معاملے میں خدا کا خوف کرو، ان پر صرف اس وقت سواری کرو جب وہ سواری کے قابل ہوں۔ جب وہ تھک جائیں تو اُن کی پیٹھ پر سے اُتر جاؤ۔ یقین جانو کہ بے زبان جانوروں سے اچھا برتاؤ کرنے اور انہیں پانی پلانے کا ثواب ملتا ہے۔"

قرآن کے ارشاد کے مطابق خدا کی نگاہوں میں حیوانی زندگی کی بھی وہی قدر ہے جو انسانی زندگی کی ہے۔ قرآن کہتا ہے "زمین پر چلنے والے کوئی چوپائے اور ہوا میں اُڑنے والے کوئی پرندے ایسے نہیں جو تمہاری طرح ایک اُمت نہ ہوں، وہ سب اپنے خدا کی طرف لوٹیں گے۔"

(الانعام ۳۸)

عالمِ عیسائیت نے کہیں صدیوں میں جا کر حیوانی مخلوقات کے بارے میں احساس فرض اپنے اندر پیدا کیا اس سے بہت پہلے کہ عیسائی قوموں کے یہاں جانوروں سے نرمی اور انسانیت کے ساتھ پیش آنے کا خیال بھی پیدا ہوا ہوتا، رسول اللہ نے قرآن کے پُر اثر الفاظ میں اس فرض کا اعلان کیا جو انسان پر اپنے بے زبان اور بے بس خدمت گزاروں کے بارے میں عائد ہے۔ نرمی و ملائمت کی یہ ہدایات جو اسلام کے زبدۂ اخلاق میں مندرج ہیں، ان پر اسلامی دنیا کی آئے دن کی زندگی میں ایک فرض مذہبی کی طرح عمل کیا جاتا ہے۔

دوسرا باب

اِسلام کی مذہبی رُوح

قل لمن ما فی السمٰوٰت والارض قُل لِلہِ کتب علی نفسہ الرحمۃ

''کہو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہو اللہ کا ہے۔ اس نے رحمت اپنے اوپر لازم کر رکھی ہے۔'' (الانعام ۱۲)

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم الاتشرکوابہ شیاو بالوالدین احساناo والا تقتلو اولاد کم من املاق o نحن نرزقکم وایا ھم والا تقربو الفواحش ماظھر منھا و ما بطن والا تقتلو الفنس التی حرم اللہ الا بالحق ذالکم وصکم بھلعلکم تعقلون۔ لاتقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن۔ حتی یبلغ اشدہ واوفوالکیل و المیزان بالقسط۔ لاتکلف نفسٌ الا وسعھا۔ واذا قلتم فاعد لو اولو کان ذا قربی وبعھد اللہ اوفوا، ذالکم وصکم بہ لعلکم تذکرونo

مذہب کی سچی روح برقرار رکھنے کی خاطر قرآن حکیم کی تصریحات کی روشنی میں رسول اللہ نے چند بنیادی فرائض کی نشان دہی کی، جن میں سب سے اہم یہ ہیں: (۱) نماز (۲) روزہ (۳) زکوٰۃ اور (۴) حج۔

انسان کے اندر ایک ارفع اعلیٰ اور ہمہ گیر قوت کا جو شعور ہے، فطرت کے ساتھ دائمی جنگ لڑنے میں اُسے اپنی بے بسی کا جو احساس ہے، خدا کے احسانوں کا اس کے دل میں جو اعتراف ہے، ان سب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے سینے میں اُمنڈتے ہوئے

جذبات کو ایک ہمیشہ بیدار اور مہربان ہستی کے حضور شکر گزاری، محبت، پشیمانی اور التجا کے الفاظ کی صورت میں انڈیل دے۔ عبادت اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ وہ ان جذبات کا اظہار ہے جن سے انسان کا دل لبریز ہے لیکن یہ تمام جذبات انسانی ارتقاء کے ایک اعلیٰ مرحلے کی پیداوار ہیں۔ وحشیوں کا تو یہ عالم ہے کہ اگر منت وسماجت سے ان کی مقصد برآری نہ ہو تو وہ اپنے معبود بتوں کی نکوہش وسرزنش پر اتر آتے ہیں۔ بہر حال ہر اس مذہبی نظام نے جس میں ذرا سا بھی نامیاتی عنصر پایا جاتا ہے عبادت کی تاثیر اور رسائی کو کسی نہ کسی صورت میں تسلیم کیا ہے۔ لیکن زیادہ تر مذاہب میں اعجازی اوصاف اخلاقی اوصاف پر غالب ہیں، بلکہ بعض میں تو اخلاق کا خیال ہی سرے سے مفقود ہے۔

ہندوؤں کی ابتدائی پوجا دو قسم کی کارروائیوں پر مشتمل تھی۔ یعنی ایک تو نذر و نیاز اور قربانی اور دوسرے دعا واستمداد۔ فکرِ مذہبی کی طفولیت میں دیوتاؤں کے بارے میں یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ان میں وہی شہوات وجذبات ہوتے ہیں جو انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر ایک طرف انسان مادی منفعتوں کا محتاج ہوتا ہے تو دوسری طرف دیوتاؤں کو رضا جو یانہ صدقوں اور چڑھاوؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس عقیدہ کا اظہار بار بار رگ وید کے حمدیہ ترانوں اور بھجنوں میں کیا گیا ہے۔ جب مذہبی تصورات کی نشوونما ہوئی تو قیاس غالب ہے کہ کم از کم نسبتہً ترقی یافتہ اور صاحب فکر لوگوں کے نزدیک نذر و نیاز اور قربانیوں کے مفہوم میں بڑی حد تک ترمیم ہو گئی ہوگی۔ لیکن جیسے جیسے پروہتوں کا فرقہ جو اس کا مدعی تھا کہ اس میں چند مخفی اوصاف ہیں جو صرف وراثتہً منتقل ہو سکتے ہیں، عوام الناس کے دلوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتا چلا گیا، ویسے ویسے برہمیت ایک ایسے مسلک کی معین شکل اختیار کرتی گئی جس کا بنیادی رکن قربانی تھا۔ قربانی کے مجاز صرف پنڈت تھے اور اس کے لیے نہایت سخت گیر اور ناقابلِ تبدیل قاعدے مقرر کیے گئے تھے۔ ادھر پنڈت منتر پڑھتا جاتا تھا اور کسی قسم کے مذہبی احساس یا جذبے کے بغیر لگے بندھے طریقے سے مقررہ رسوم ادا کرتا چلا جاتا تھا اور اُدھر تپسیا کرنے والا ایک بے حس وحرکت بت کی طرح پاس کھڑا یا بیٹھا اس پوجا کا تماشا دیکھتا رہتا تھا جو اس کی طرف سے ایک اور شخص ادا کر رہا تھا۔ اگر کہیں پوجا پاٹ کے منتروں یا رتیوں میں ذرا سی بھی بھول چوک

ہوگئی تو ساری پوجا بیکار ہو جاتی تھی۔ بہر حال قیاس کہنا چاہتا ہے کہ مذہبی عقیدت سرے سے ناپید نہ تھی، ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ بھگوت گیتا وجود میں آتی حقیقت حال جو کچھ بھی ہو، عوام الناس کے لیے عبادت محض چڑھاووں اور بلیدانوں کا ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گئی تھی، جس کا انحصار اتنا عبادت کرنے والے کے انفرادی اخلاقی کردار پر نہ تھا جتنا پنڈت کے گیان دان پر تھا۔ عبادت کرنے والے کے لیے صرف اتنا ضروری تھا کہ ریتوں اور نیوں پر اعتماد رکھے اور دھرم کے نقطہ نگاہ سے پوتر ہو۔

مجوسی زرتشتی اور صابی عبادت گزاری کی فضا میں زندگی بسر کرتے تھے۔ زرتشتی چھینک آنے پر، ناخن یا بال کٹواتے وقت، کھانا پکاتے وقت، چراغ جلاتے وقت، غرض دن رات کے ہر موقع پر، کوئی نہ کوئی وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔ پہلے تو ہُرمزد سے مناجات کی جاتی تھی، اس کے بعد آسمان، زمین، عناصر اربعہ، ستارے بلکہ درخت (اور بالخصوص سوم[1] کا درخت) اور چرندے پرندے بھی دعاؤں کے مخاطب بنائے جاتے تھے بعض بعض وظیفے تو ایسے تھے کہ ان کا ورد بارہ بارہ سو مرتبہ کرنا پڑتا تھا[2]۔ اخلاق کا خیال، چاہے گنتی کے چند لوگوں کے یہاں کتنا ہی منزہ کیوں نہ ہو، عوام الناس کے ذہنوں سے بالکل خارج ہو گیا ہوگا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غیر معمولی نفوس کو بھی جو روحانی زندگی نصیب تھی وہ بھی مذہبی پیشواؤں کی بلاشرکتِ غیرے ملکیت تھی۔ خصوصی تقدس کی جو دیوار مذہبی منصب داروں کو عوام سے جدا کرتی تھی اس کی بدولت مؤخر الذکر اعلیٰ درجے کی تمام روحانی تمتعات سے محروم رہ جاتے تھے اوفیوں کی طرح مجوسیوں کے یہاں عبادت کے دو طریقے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ معبود ہستیوں کے فہم کے دو طریقے تھے: ایک مخفی، جو مذہبی منصب داروں کے لیے مخصوص تھا، دوسرا عوامی، جس میں عوام الناس بھی شریک ہو سکتے تھے۔

قانونِ موسوی میں دعا کے معاملے میں کوئی احکام نہ تھے۔ اگر مناجات اور حمد و ثنا کے کوئی قاعدے مقرر تھے تو صرف مذہبی منصب داروں کو کمائی کا ایک عشر دینے کے

---

[1] سنسکرت بولنے والی قوم میں اسے سوم کہتی تھیں اور ژند بولنے والی قوم میں ہم یا ہومہ۔

[2] ژند اور ستیا خود ایسی دعاؤں حمدیہ ترانوں، مناجاتوں وغیرہ کا ایک گنجینہ ہے جن کا روئے سخن متعدد خداؤں سے ہے جن میں ہُرمزد اول درجے پر ہے حقیقت تو یہ ہے کہ وہ دعاؤں کا ایک مجموعہ ہے۔

بارے میں اور پہلوٹھی کے بچے کی پیش گزاری کے متعلق جو باضابطہ اور مقطع خانگی رسوم مقرر تھیں ان کے بارے میں۔ مؤخر الذکر موقع پر باپ اپنے بچے کو قانون کے احکام کے مطابق پیش کرنے کے اجر کے طور یہواہ سے بنی اسرائیل کے حق میں اس رحمت و برکت کا طالب ہوتا تھا جس کا عہد یہواہ نے ان کے آباواجداد سے کیا تھا۔ لیکن جب رفتہ رفتہ عوام اور معلمین دونوں کے ذہنوں میں خدا کا نسبتہً زیادہ روحانی تصور پیدا ہوگیا اور جسمانی تشبیہیت (Anthropo Morphism) کی شدت میں کمی آ گئی تو لوگوں کی سمجھ میں آنے لگا کہ عبادت فی الحقیقت خدا اور انسان کے درمیان راہ و رسم کا ایک طریقہ ہے۔ قانونِ موسوی میں عبادت سے متعلق قواعد وضوابط کی جو کمی تھی وہ روایت اور رواج نے پوری کر دی۔ چنانچہ ڈولنگر کے قول کے مطابق یہودی ایک عبادت گزار قوم بن گئے۔ روزانہ تین گھنٹے (یعنی نواں، بارہواں اور تیسرا گھنٹہ) مذہبی اوراد و اعمال کے لیے وقف تھے، لیکن ایک طرف تو پروہتوں کی ضرورت اور دوسری طرف شارع کی کسی مثبت عملی مثال کی غیر موجودگی، ان دونوں نے یکجا ہو کر عبادت کو لوگوں کی اکثریت میں محض ایک میکانکی عمل بنا دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے یہاں چمڑے کے جزدان رکھنے کا طریقہ رائج تھا۔ جن میں توراۃ و زبور کی عبارتیں کاغذ کے پرزوں پر نقل کر کے رکھی جاتی تھیں اور جنہیں یہودی عبادت کے وقت ماتھے اور بائیں بازو پر باندھ لیا کرتے تھے۔ ان جزدانوں کی خرید و فروخت کی جاتی تھی۔ چنانچہ قرآن یہودیوں کو خدا کی آیات بیچنے پر سخت الفاظ میں لعن طعن کرتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات، جو انسان کی مذہبی نشوونما کے ایک بعد کے مرحلے کی نمائندگی کرتی ہیں، عبادت کا صحیح مفہوم پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے ذاتی مثال قائم کر کے عبادت اور شکر گزاری پر بہت زور دیا۔ لیکن عوام کی ہدایت کے لیے کسی متعین قاعدے کے نہ ہونے کے معنی یہ تھے کہ مذہبی اعمال و وظائف کے معاملے میں وہ بالکل آزاد چھوڑ دیئے گئے۔ چنانچہ وہ پادریوں کے تابع فرمان ہو گئے، جنہوں نے عبادات کی تعداد، طول اور اصطلاحات کے تقرر کو اپنا اجارہ مخصوص بنا رکھا تھا۔ مقررہ دعاؤں کے مجموعے، رسومِ عبادت کے ضابطے اور عقائد و ایمانیات کی تعیین کی خاطر متعدد کلیسائی کو

نسلیں اور مجالس مذاکرہ، یہ سب اسی صورت حال کا نتیجہ تھے، اسی کے مظہر ہیں وہ وظیفے جنہیں راہب ایک بھنبھناتی ہوئی آواز میں اور ایک میکانکی طور پر پڑھا کرتے ہیں اور ہفتے بھر میں ایک دن گرجاؤں میں وہ عبادتیں جو گویا ہفتے کے باقی دنوں کے روحانی فاقوں کی کسر نکالنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ نیز اسی کی پیداوار ہے وہ پریسبٹر (Presbyter) جو شروع شروع میں تو محض ایک خادم ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ کے ترکۂ رُوحانی کا مالک و وارث سمجھنے لگا۔

ساتویں صدی عیسوی میں، جب رسول عربی ﷺ نے ایک اصلاح یافتہ مذہب کی تبلیغ شروع کی، یہ خرابیاں اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ چکی تھیں۔ نماز کا قاعدہ رائج کر کے حضرت محمد ﷺ نے اس کا اعتراف کیا کہ انسان کے دل میں خدا کے حضور اپنی محبت اور ممنونیت کا اظہار کرنے کی بیتاب تمنا ہوتی ہے۔ نماز کے اوقات کے تعین کا اعلان کر کے آپ ﷺ نے عبادت کے عمل پر وہ نظم وضبط عائد کر دیا۔ جو انسان کے خیالات کو مادی دنیا میں ہرزہ گردی کرتے رہنے سے باز رکھتا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی سنت و مثال کے ذریعے جو قاعدے قائم کر دیئے انہوں نے ایک طرف تو اسلامی دنیا کو عبادت کے اعمال و وظائف کے بارے میں مباحثہ و مناظرہ کی خرابیوں سے بچایا اور دوسری طرف افراد کے لیے اس امر کی پوری پوری گنجائش چھوڑ دی کہ قادر مطلق کی بارگاہ میں خضوع وخشوع کے ساتھ سربسجود ہوں۔

تہذیب اخلاق اور تزکیہ قلوب کے ایک وسیلے کی حیثیت سے نماز جو قدر و قیمت رکھتی ہے وہ قرآن میں صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے:۔

"تلاوت کرو اس کتاب کی جو تم پر وحی کے ذریعے اتاری گئی ہے اور نماز قائم رکھو یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔"

(العنکبوت ۴۵)

جن مناجاتی اوراد و اذکار پر رسول اکرم ﷺ کی سنت نے مہر تقدس ثبت کر دی ہے ان کی خوبصورتی قرآنی تعلیمات کے اخلاقی عنصر کی خوبصورتی کی آئینہ دار ہے۔

رَبِّ اَعِنِّی علیٰ ذِکرِكَ و شُکرِكَ و شُکرِكَ وَحسنِ عِبَادِ تك

اے میرے رب اپنے ذکر، اپنے شکر اور اپنی بہترین عبادت میں میری مدد فرما،

اللّٰھمّ اِنّی ظَلَمتُ نفسی ظلماً کثیراً و الا یَغفِرُ الذُّنُوبَ اِلّا اَنتَ فَاغفِر لی مَغفِرَةً من عِندِك و ارحَمنی انّكَ انتَ الغَفُورُ الرَّحِیم۔

اے اللہ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، بڑا ظلم اور گناہوں کو سوائے تیرے کوئی نہیں بخشتا، تو مجھ کو بخش دے، خاص طور پر بخش دے اور مجھ پر رحم کر۔ تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

اَللّٰھمّ اِنّی اَسئَالُكَ الثّبَاتَ فِی الاَمرِ و العَزِیمَةَ علی الرُّشدِ و اسئَالُكَ شکر نعمَتِكَ و حسن عِبَادتِك و اَسئَالُكَ قلباً سَلیما وَ لِساناً صادقاً و اسئَالُكَ من خیرِ ماتَعلَمُ و اعُوذُ بِكَ من شرِّ ما تعلَمُ و استغفرك لِمَا تعلَمُ۔

اے اللہ میں تجھ سے دین میں ثابت قدمی چاہتا ہوں اور تجھ سے ہدایت پانے کا قصد رکھتا ہوں اور تجھ سے تیری نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق اور حسنِ عبادت طلب کرتا ہوں اور مانگتا ہوں تجھ سے قلب سلیم اور سچی زبان، اور چاہتا ہوں تجھ سے وہ بھلائی جس کو تو جانتا ہے اور پناہ مانگتا ہوں اس برائی سے جو تجھ کو معلوم ہے اور معافی چاہتا ہوں اُن گناہوں سے جن کو تو جانتا ہے۔

(مشکوٰۃ۔ کتاب نمبر ۴، باب ۱۸۔ فصل اوّل، دوم وسوم)

ایک اور دعائے ماثورہ، جو دعائے داؤدی کے نام سے مشہور ہے، حسب ذیل ہے:۔

"اے مولا، مجھے اس کی توفیق عطا کر کہ میں تجھ سے محبت کروں اور اُن سے محبت کروں جو تجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے اس کی توفیق عطا کر کہ میں ایسے کام کروں جو تجھے محبوب ہیں اور تیری محبت کو اپنی ذات، اہل وعیال اور مال و دولت کی محبت سے زیادہ بیش بہا سمجھوں۔"

ذیل کی دو مناجاتیں، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب ہیں[۱]، اعلیٰ ترین جذبہ

---

[۱] یہ دو مناجاتیں سید امیر علی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب کی ہیں لیکن "صحیفہ کاملہ" کا حوالہ دیا ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نہیں بلکہ حضرت علی حسین زین العابدین کی دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ ان کی عبادات سید امیر علی نے صحیفۂ کاملہ کے کسی مخصوص حصے سے نہیں لیں بلکہ مختلف مقامات سے اقتباسات لے کر انہیں دو عبارتوں کے رشتے میں پرو دیا ہے۔ میں نے اسی کی عبارتوں کا ترجمہ پیش کیا ہے۔

عبودیت کی مظہر ہیں:۔

"شکر ہے اللہ کا، جو قابل عبادت ہے اور جس کے سوا کوئی عبادت کے سزاوار نہیں۔ میرا مولیٰ ازلی، ابدی، پروردگار، حقیقی حاکم، جس کی رحمت و قدرت ساری موجودات کو محیط ہے دنیا کار ساز اور کائنات کی روشنی ہے۔ ہم اس کی عبادت کرتے ہیں۔ سب عبادت اسی کے لیے ہے۔ وہ سب چیزوں سے پہلے موجود تھا اور اس وقت بھی زندہ رہے گا جب سب چیزیں فنا ہو چکی ہوں گی۔ تو ہی معبود ہے میرے مولا، تو ہی آقا ہے، محبت کرنے والا اور بخشنے والا، تو جسے چاہتا ہے طاقت و قوت عطا فرماتا ہے۔ جسے تو بلندی بخشے اُسے کوئی گرا نہیں سکتا، جسے تو گرائے اسے کوئی اُٹھا نہیں سکتا۔ تو، میرے آقا، ازلی ہے، خالق کل ہے، دانائے کل، حاکم بزرگ ہے۔ تیرا علم ہر چیز کا عالم ہے، تیرا عطا و احسان ہر چیز کو حاوی ہے، تیرا عفو و رحم ہر کسی کے شامل ہے۔ اے میرے مولا تو مصیبت زدوں کا مددگار ہے، رنج و غم کا دور کرنے والا ہے، شکستہ دلوں کو تسکین دینے والا ہے، تو اپنے بندوں کی مدد کے لیے ہر جگہ موجود ہے۔ تو سب بھیدوں کا جاننے والا اور سب خیالوں کا بوجھنے والا ہے اور ہر انجمن میں حاضر ہے۔ تو ہماری سب حاجتوں کا پورا کرنے والا اور سب نعمتوں کا بخشنے والا ہے۔ تو سب غریبوں اور محروموں کا رفیق ہے۔ میرے مولا تو میرا حصار عافیت ہے۔ تو ان سب کا مددگار ہے جو تجھ سے مدد مانگتے ہیں......اے میرے مولیٰ، تو خالق ہے، میں تو محض مخلوق ہوں، تو میرا آقا ہے اور میں تو محض تیرا ایک بندہ ہوں، تو مدد دینے والا ہے، میں مدد مانگنے والا۔ تو اے میرے مولا، میرا ملجا و ماویٰ ہے، تو بخشنے والا ہے، میں گنہگار ہوں۔ تو میرے مولیٰ رحیم ہے، علیم ہے، محب ہے میں اندھیرے میں بھٹک رہا ہوں میں تیرے علم اور تیری محبت کا طلبگار ہوں۔ اے میرے مولیٰ، اپنا سارا علم، اپنی ساری محبت اور اپنی ساری رحمت مجھ پر ارزانی فرما، میرے گناہوں کو بخش دے اے میرے مولیٰ۔"

"اے میرے مولیٰ تو سبحان ہے، قدیم ہے، حاضر و ناظر ہے، حی و قیوم ہے، ہمیشہ قریب ہے، عالم کل ہے، تو ہر دل میں، ہر روح میں، جیتا جاگتا موجود ہے۔ تیرا علم ہر نفس میں سرایت کئے ہوئے ہے"......"اس سے کوئی مشابہ نہیں، اس کا کوئی ہمسر نہیں،

وہ واحد ہے قدیم ہے شکر اس مولیٰ کا جس کا رحم ہر گناہ گار کے شاملِ حال ہے، جو ان کو بھی روزی بہم پہنچاتا ہے جو اس کے منکر ہیں۔ اوّل بھی اسی کا ہے آخر بھی اسی کا، تمام علم اسی کو ہے اور وہ دلوں کے پوشیدہ ترین رازوں کو جانتا ہے۔ اسے کبھی نیند نہیں آتی، وہ ہمیشہ بیدار رہتا ہے اور ہمیشہ انصاف کرتا ہے۔ وہ اپنے رحم کی بدولت بڑے بڑے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، اسے اپنی ساری مخلوق سے محبت ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں اپنے آقا کی نیکی کی اس کے نبی کے پیغام کی صداقت پر صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ۔''

ایک انگریز مصنف کہتا ہے: ''اسلام کا ایک طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کی مقرر کی ہوئی عبادت صرف ہاتھوں سے بنائی ہوئی عمارتوں ہی میں نہیں، بلکہ خدا کی زمین پر اور اس کے آسمان کے نیچے کسی جگہ ادا کی جا سکتی ہے۔'' ہر وہ جگہ جہاں قادرِ مطلق کی باایمان پرستش کی جائے ایک سا تقدس رکھتی ہے۔ مسلمان چاہے کہیں بھی ہو، سفر میں یا حضر میں جب نماز کا وقت آتا ہے تو وہ چند مختصر لیکن ذوق وشوق سے بھرے ہوئے مناجاتی کلمات میں اپنی روح کو بے نقاب کر کے خدا کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اسکی نماز اتنی لمبی نہیں ہوتی کہ اس کی طبیعت اُکتا جائے، اور اس کی دعاؤں کا موضوع ہمیشہ انکسارِ نفس، خدائے منعم ومحسن کی حمد وثنا اور اس کے رحم وکرم پر اظہار اعتماد ہوتا ہے۔ دینِ محمدی ﷺ میں روحِ عبودیت کی جو تب وتاب پائی جاتی ہے اس کی شدت کا پورا پورا احساس عیسائی دنیا نے نہیں کیا۔ روائت، جو ماضی کی صداقت شعار وقائع نگار ہے اور جس کی تصدیق سینکڑوں تائیدی شہادتوں کے ذریعے ہوتی ہے، بیان کرتی ہے کہ کس طرح نبی ﷺ نماز کے دوران فرطِ جذبہ سے زار وقطار رویا کرتے تھے اور کس طرح آپ ﷺ کے شریف النفس چچیرے بھائی اور داماد عبادت میں اتنے منہمک ہو جایا کرتے تھے کہ ان کا بدن سن ہو جایا کرتا تھا۔

محمد ﷺ کا اسلام پیشہ ور مذہبی لوگوں کے کسی طبقے کو تسلیم نہیں کرتا اور عبد ومعبود کے درمیان روحانی علم یا خصوصی تقدس کی کسی قسم کی اجارہ داری کو حائل نہیں ہونے دیتا۔ ہر روح کسی کشیش، ربی، موبد، ملا، پادری، پنڈت، پروہت یا کسی اور مذہبی وکیل کی وساطت کے بغیر اپنے پیدا کرنے والے کی طرف صعود کرتی ہے۔ ایک مضطرب دل کو

اس تسکین دینے والی ہستی کے حضور میں جانے کے لیے ذاتی مفادات کے مدعیوں کی ایجاد کردہ قربانیوں اور رسموں کی کوئی ضرورت نہیں[1]۔ ہر انسان آپ اپنا وکیل و شفیع ہے۔ محمد ﷺ کے اسلام میں کوئی ایک شخص ایک انسان کی حیثیت سے کسی دوسرے شخص سے اونچا درجہ نہیں رکھتا۔

یورپ کے عقلی مفکرین نے اسلامی عبادات پر پیچیدہ اور مشکل ہونے کا الزام لگایا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا مقرر کیا ہوا ضابطۂ رسوم سادگی اور اعتدال کے اعتبار سے حیرت انگیز ہے۔ اس میں لازمی اعمالِ ایمانی شامل ہیں، یعنی کلماتِ ایمانی کا پڑھنا، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج۔ لیکن ان اعمال کے بارے میں اس نے کوئی لگے بندھے قاعدے مقرر نہیں کیے۔ "نماز قائم کرو، ظہر کی نماز بھی، اور خدا کے حضور توجہ قلب سے حاضر ہو۔" (البقرہ ۲۳۸) صبر اور تقویٰ سے مدد طلب کرو، یقیناً اللہ صابروں کا ساتھ دیتا ہے۔"

"جب تم روئے زمیں پر سفر کر رہے ہو، اگر تمہیں اس بات کا خدشہ ہو کہ کفار تم پر حملہ آور ہو جائیں گے تو تمہارے لیے نماز قضا کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔ خدا ہر چیز کو معاف کر دیتا ہے سوائے اس کے کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے۔"

بہر حال نبی اکرم ﷺ کی سنت نے ادائے نماز کے ساتھ چند آداب و قواعد کو وابستہ کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ صریح اور نا قابلِ اشتباہ الفاظ میں یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ روحوں کی ٹوہ رکھنے والا اصل میں جس چیز کو دیکھتا ہے وہ دل کی کیفیت عبودیت ہے۔ "نہ قربانی کے جانوروں کا گوشت، نہ ان کا خون اللہ کو پہنچتا ہے، بلکہ صرف تمہارا تقویٰ۔" (الحج ۳۷)

> "نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے منہ مشرق کی طرف موڑ لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ پر، روزِ آخرت پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتاب پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں محتاجوں، مسافروں اور مانگنے والوں کو دے اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ وہ لوگ جو کوئی عہد کرتے ہیں

---

[1] حج کے موقع پر جو قربانی دی جاتی ہے وہ محض ایک یادگاری رسم ہے۔

تو اُسے پورا کر دکھاتے ہیں اور جو سختی و مصیبت کے وقت اور جنگ و جدل کے زمانے میں صبر کرتے ہیں، یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں۔"

(البقرہ ۱۷۷)

قرآن نے علی الاعلان کہہ دیا کہ حضورِ قلب کے بغیر نماز بے سود ہے اور اس امر کی تاکید کی کہ اللہ کا کلام، جس کا روئے سخن صرف ایک قوم کی طرف نہیں بلکہ ساری نوعِ انسانی کی طرف تھا، ایسی کیفیت میں پڑھا جانا چاہئے کہ جس میں دل اور زبان کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ایسی نماز جو پڑھی جانے والی آیتوں کا مطلب سمجھے بغیر ادا کی جائے بے فائدہ ہوتی ہے اور ثواب کی مستحق نہیں ہوتی۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ کلامِ مقدس کی تلاوت میں دل اور دماغ کو باہمی تعاون کرنا چاہیے۔ ہونٹ صرف الفاظ کو ادا کرتے ہیں، دماغ اُن کے معانی سمجھنے میں مد ہوتا ہے اور دل احکامِ شریعت کی بجا آوری میں مدد دیتا ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ خدا کو کسی آدمی کی عبادت کا نہ چھٹا نہ دسواں حصہ قبول ہے، بلکہ اُتنا ہی حصہ جو وہ سمجھ بوجھ کے ساتھ اور صحیح بندگی و سپردگی کے ساتھ خدا کے حضور پیش کرے۔"

دینِ عیسوی میں بپتسمے کی جو رسم ہے اور مصریوں، یہودیوں اور مشرق و مغرب کے بے کتاب مذاہب کے مخفی رسوم کی صدارت کرنے والے پروہتوں کے یہاں مذہبی اور عبادتی اعمال و وظائف شروع کرنے سے پہلے ریاضت یا قربانی کے ذریعے تطہیر کا جو تقاضا کیا جاتا تھا اُن سے ظاہر ہے کہ ظاہری طہارت کے ساتھ کیسا خاص تقدس وابستہ کیا جاتا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتی مثال کے ذریعے اس قدیم اور مفید قاعدے کو وجوب بخشا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفائی و پاکیزگی کو عبادتِ الٰہی کی ایک لازمی تمہید قرار دیا[1]۔

---

[1] المائدہ ۵۔۶۔ قرآن ایک ہمہ گیر دستور کی حیثیت سے وضو کا تذکرہ کرتا ہے لیکن جہاں پانی دستیاب نہ ہو وہاں وہ صفائی کے کسی ایک وسیلے کی اجازت دیتا ہے۔ بہر حال وہ آدابِ وضو کی مکمل تفصیلات کہیں بھی بیان نہیں کرتا۔ چنانچہ سنتِ نبوی کی بنا پر وضو یا طہارت کا جو طریقہ ہے اس کے بارے میں علمائے دینیات کے درمیان اختلافِ رائے ہے اور اس موضوع پر بہت بحث و مباحثہ ہوا ہے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ ﷺ نے یہ بھی خاص طور پر واضح کر دیا کہ صحیح تقویٰ محض ظاہری یا جسمانی پاکیزگی میں مضمر نہیں بلکہ ضروری ہے کہ انسان خدا کی بارگاہ میں نفس کی پاکیزگی اور عاجزی کے ساتھ حاضر ہو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں کی تردید میں جو ظاہری صفائی و پاکی کا تو خیال رکھتے ہیں لیکن جن کے دلوں میں نخوت و ریا بھری ہوتی ہے، بالتخصیص کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے سب سے اہم پاکیزگی اس کو قرار دیا کہ دل کو تمام قابلِ تشنیع خواہشوں اور رغبتوں سے اور دماغ کو تمام فاسد افکار سے اور ایسے خیالات سے جو اللہ کی طرف سے توجہ کو ہٹاتے ہیں پاک کیا جائے۔

اسلامی دنیا میں اسلام کے مولد کی یاد زندہ رکھنے کی خاطر رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی روشنی میں یہ ہدایت کی کہ نماز ادا کرتے وقت مسلمانوں کو اپنا منہ مکے کی طرف کر لینا چاہیے، کیونکہ مکہ وہ مطلعِ انوار ہے جہاں سے حق کی نشاۃِ نو کی پہلی کرنیں پھوٹیں۔ انسانوں کی طبع شناسی کا جو ملکہ انہیں ایک پیغمبر کی حیثیت سے عطا ہوا تھا، اس کی بدولت آپ ﷺ نے اندازہ لگالیا کہ اگر ایک ایسا مرکزی مقام مقرر کر دیا جائے جو قرنہا بعد قرن آپ ﷺ کے پیروؤں کے مذہبی جذبات کا مرجع رہے تو یہ اُمت کا استحکام اور جمعیت پیدا کرنے کے معاملے میں کتنا موثر عامل ثابت ہوگا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ دنیائے اسلام میں ہر جگہ مسلمان قبلہ رو ہو کر نماز پڑھا کریں۔

"مکہ مسلمانوں کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو یہودیوں کے لیے یروشلم رکھتا ہے۔ مکے سے ان کے جو تعلقات صدیوں سے چلے آرہے ہیں، انہوں نے اُسے اُن پر ایک خاص اثر و نفوذ بخش دیا ہے۔ یہ مقام ان کے مذہب کو گہوارہ تھا، جہاں ان کے نبی نے اپنا بچپن گزارا۔ اس کا خیال آتے یہ مسلمان کے دل میں پرانے مذہبوں اور اس کے نئے مذہب کی باہمی جنگ، بتوں کی تختہ براندازی اور خدائے واحد کی پرستاری کے قیام کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ ان سب چیزوں سے بھی بڑی بات تو یہ ہے کہ ایک واحد قبلے کا ہونا مسلمانوں کو یہ امر یاد دلاتا ہے کہ ساری دنیا میں اس کے برادرانِ ملت ایک ہی مرکز کی طرف منہ کیے ہوئے مصروف عبادت ہیں اور وہ مومنوں کی ایک عظیم جماعت کا ایک فرد ہے جو ایک ہی مذہب کے رشتہ وحدت میں منسلک ہے، جس کے سینے میں ایک

ہی قسم کی اُمیدیں اور آرزوئیں ہیں، جو ایک ہی طرح کی چیزوں کا احترام کرتی ہے اور ایک ہی خدا کی عبادت گزار ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے حرمِ کعبہ کے تقدس کو برقرار رکھ کر اس امر کا ثبوت دیا کہ آپ انسان کے مذہبی جذبات کے کتنے بڑے نبض شناس تھے۔"
لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی قرآن کی ان عبارات سے، جن کے اقتباس ہم اوپر پیش کر آئے ہیں، ظاہر ہے کہ محض قبلے کی طرف منہ کرنا ہی عبادتِ الٰہی کے لوازمات میں سے نہیں ہے۔

روزہ داری کا رواج تقریباً تمام قوموں میں رہا ہے لیکن عمومی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیائے قدیم میں اس سے بلا استثنا، پرہیز گاری و تقویٰ کی بہ نسبت توبہ و استغفار کا خیال زیادہ متعلق تھا۔ یہاں تک کہ یہودیت میں بھی تعذیبِ نفس اور انکارِ نفس کی ایک ریاضت کے طور پر روزہ داری کا خیال قرونِ اُخریٰ کی پیداوار ہے۔ اسینیوں کو فیثا غورثیوں سے اور اُن کے ذریعے نسبتہً زیادہ مشرقی سمت میں واقع ممالک کی مرتاضیت و رہبانیت سے جو واسطہ پڑا، اس کی بدولت وہ یہودیوں میں پہلے لوگ تھے، جنہوں نے اصولِ روزہ داری کے اس اخلاقی پہلو کا ادراک کیا، اور قیاس غالب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بہت سے دوسرے تصورات کی طرح یہ تصور بھی انہی سے اخذ کیا ہوگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتی مثال نے کلیسا کی نظروں میں روزہ داری کی مشق کو تقدس بخش دیا۔ تاہم روزے کی عمومی حیثیت کے بارے میں جو خیال کلیسا میں زیادہ تر مسلم ہے وہ توبہ و کفارہ کا خیال ہے[1] اور صرف ایک جزئی حد تک اتباعِ سنت کا۔ بالارادہ جسمانی خود آزاری دوسرے مذاہب کی طرح عیسوی کلیسا میں بھی بہ کثرت رائج ہے، لیکن اس خود آزادی کا نتیجہ ہمیشہ قوائے ذہنی جسمانی کی تباہی اور ایک غیر صحت مند ترکِ دنیا ہوا ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں روزے کا جو مقصد ہے وہ یہ واجب مقصد ہے کہ روزانہ ایک معین و محدود مدت کے دوران حواس کی تسکین سے اجتناب کر کے جذبات و شہوات پر قابو پایا جائے اور فاضل حیوانی جوش کی طغیانی کو صحت مند طریقوں سے بہ نکلنے کا موقع دیا جائے۔ بے سود اور غیر ضروری جسمانی اذیت نہ صرف ممنوع بلکہ مذموم قرار دی گئی

---

[1] موشیم بالوضاحت کہتا ہے کہ روزے کے بارے میں ابتداء ہی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ارواحِ خبیثہ کی قوت کی روک تھام اور ان کی تدبیروں کی شکست کا اور خدا کے غیظ و غضب کو رفع کرنے کا موثر ترین وسیلہ ہے۔

ہے۔ تندرست اور تنومند لوگوں پر روزہ اس مقصد سے فرض کیا گیا ہے کہ وہ جسم پر پابندیاں عائد کر کے روح کی تربیت کریں۔ کمزوروں کو، بیماروں کو، مسافروں کو، طالب علموں کو (جو تحصیلِ علم میں مشغول ہوں، جسے جہادِ اکبر کہا گیا ہے) اُن سپاہیوں کو جو دشمنانِ دین سے برسرِ جہاد ہوں، اور اُن عورتوں کو جن پر نسوانی معذوریاں عائد ہوں۔ ان سب کو روزے کی ممانعت ہے۔ جن لوگوں کو یونانیوں، رومیوں، ایرانیوں اور زمانہ جاہلیت کے عربوں کی بسیار خوری اور لذائذ و مفاسد میں بے اعتدالیاں یاد ہیں، وہ اس تعدیلی ضابطہ بندی کی قدر و قیمت کا اعتراف کریں گے اور اس کی داد دیں گے کہ یہ انسان اور بالخصوص نیم مہذب انسان کے بہیمی میلانات کی روک تھام کے لیے کس حیرت انگیز طور پر مفید ہے۔

قرآن نے اس بارے میں جو حکم دیا ہے ذرا اس کی دانشمندی پر غور کیجئے۔ "اے ایمان والو، تم پر روزے فرض کئے گئے...... تاکہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ یہ چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنے ہی روزے رکھ کر کسر پوری کرلے۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (لیکن روزہ نہ رکھیں) وہ کسی مسکین کو کھانا کھلا کر اس کا فدیہ دیں...... لیکن اگر تم ٹھیک سے سمجھو تو تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ روزہ رکھو...... اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے۔

(البقرہ ۱۸۲ ـ ۱۸۳)

پرہیز کی مدت دن کے اوقات تک محدود ہے۔ رات کے وقت، یعنی عبادت و ریاضت کے وقفوں میں، مسلمان کو اجازت ہے، بلکہ حکم ہے، کہ اعتدال کے ساتھ کھا پی کر اپنے جسم کو قوت و تازگی بخشے اور دوسرے جائز طریقوں سے تفریحِ طبع کرے۔ شارع کے ارشادات کی حقیقی روح کو سمجھ کر ارباب فقہ نے بالاتفاق یہ حکم لگایا ہے کہ روزے کے دوران دل کے سفلی خیالات سے پرہیز اتنا ہی لازمی ہے جتنا جسم کا خورد و نوش سے پرہیز[1]

---

[1] میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ ضیافتیں عیسائیوں کے یہاں خیرات کا واحد طریقہ تھیں، بیواؤں، غریبوں اور یتیموں کی اعانت کی تاکید عیسائیت نے بھی اتنی ہی کی جتنی اسلام نے کی۔ لیکن یہ خیرات فی سبیل اللہ بھی جس کی تلقین حضرت عیسیٰ نے کی، اُن کے حواریوں کے ہاتھوں میں آکر خصوصیت کے رنگ میں رنگی گئی۔ کسی بیوہ کے لیے خیرات سے مستفید ہونے کی خاطر ضروری تھا کہ "ساٹھ سال کی ہو، صرف ایک آدمی کی بیوی رہ چکی ہو، بچوں کی تربیت کر چکی ہو" وغیرہ وغیرہ۔

اسلام سے پہلے دنیا کے کسی مذہب نے خیرات کو (یعنی بیواؤں اور یتیموں اور معذور ناداروں کی امداد کو، نظامِ دین کے مثبت ارکان میں شامل کر کے اُسے ایک مقدس فرض کی حیثیت نہ بخشی تھی۔

اگاپی یعنی دورِ اول کے عیسائیوں کے یہاں جو خیراتی ضیافتیں ہوا کرتی تھی، وہ افراد کی ذاتی مرضی پر منحصر ہوتی تھیں، چنانچہ ان کا اثر بے قاعدہ اور غیر مسلسل تھا۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ یہی بے قاعدگی کی تھی جس کے باعث یہ خیراتی ضیافتیں، یا ''محبت کی دعوتیں'' وجود میں آنے کے تھوڑی ہی مدت بعد ممنوع قرار دے دی گئیں۔

اسلام کے قوانین کے تحت ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک مقررہ حصہ اپنے غریب ہمسایوں کی امداد و اعانت کے لیے علیحدہ کر دے۔ یہ عموماً تمام اموال منقولہ اسباب، زرعی آمدنی، تجارتی اور کاروباری منافع وغیرہم کا چالیسواں حصہ، یعنی اڑھائی فیصد ہے لیکن زکوٰۃ صرف اس صورت میں واجب ہے کہ کسی شخص کے کل املاک کی قیمت ایک مقررہ حد تک پہنچ جائے[۱] اور وہ پورے ایک سال تک اس کی ملکیت میں رہ چکے ہوں۔ جن مویشیوں سے کھیتی باڑی میں کام لیا جا رہا ہو یا جن پر مال برداری کی جا رہی ہو ان پر کوئی زکوٰۃ واجب الادا نہیں۔ مذکورہ بالا زکوٰۃ کے علاوہ ماہِ رمضان کے اختتام پر، یعنی عید الفطر کے دن، جو مسلمانوں کے اس خصوصی، ریاضت کے لیے وقف مہینے (Lent) کا آخری دن ہوتا ہے، ہر صاحبِ خانہ کو اپنے لیے، اپنے خاندان کے ہر فرد کے لیے اور ہر اس مہمان کے لیے جس نے دورانِ رمضان اس کے گھر میں روزہ کھولا ہو یا جو وہاں سویا ہو، گیہوں، جو، کھجوروں، کشمش، چاولوں اور دوسرے غلوں کی ایک مقدار یا اس مقدار کی نقد قیمت فطرے یعنی خیرات کے طور پر دینی پڑتی ہے۔

حضرت محمد ﷺ کی ذاتی سنت یا ان کے صحابہ کی مثال کی روشنی میں زکوٰۃ کے مستحق حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ غریب و نادار لوگ۔

۲۔ وہ لوگ جو زکوٰۃ مطلوبہ کے جمع اور تقسیم کرنے کے سلسلے میں خدمات ادا کریں۔

۱۔ مثلاً اگر کسی شخص کے پاس کم از کم بیس اُونٹ نہ ہوں تو اُس پر زکوٰۃ لازم نہیں۔

۳۔ ایسے غلام جو فدیہ ادا کر کے آزادی خریدنا چاہتے ہیں، لیکن اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔

۴۔ ایسے مقروض جو قرض ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

۵۔ مسافر اجنبی۔

عام خیرات، یعنی انفاقِ اموال، کی تاکید قرآن نے انتہائی پرزور الفاظ میں کی ہے۔ لیکن اسلام کی اصلی عظمت وشان اس میں ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حسین وجمیل جذبات کو معین قوانین کی شکل میں مجسم کر دیا۔

اسلام کے ارکان میں مکے اور حرم کعبہ کی سالانہ زیارت یعنی حج کو شامل کرنے میں جو حکمت تھی اس نے دینِ اسلام میں فرقوں کے اختلافات کے باوجود اخوت و مودت کی روح پھونک دی ہے۔ ساری اسلامی دنیا کی نگاہیں اس مرکزی مقام پر مرکوز ہو کر ہر مسلمان کے سینے میں اس آسمانی نور کی شعاعیں زندہ رکھتی ہیں جس نے اس تاریک صدی میں دنیا کو روشن کر دیا تھا۔ اس موضوع پر بھی اس صاحب الہام شارح کی دانشمندی احکام کے ایجابی حصے میں، یعنی ان شرائط میں جن کا پورا ہونا حج کی فرضیت کے لیے لازم ہے، جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ شرائط یہ ہیں:۔

۱۔ ذہن وعقل کی پختگی

۲۔ مکمل آزادی

۳۔ خرچ سفر اور زادِ سفر کا مہیا ہونا۔

۴۔ عازم حج کی غیر حاضری میں اُس کے اہل وعیال کی کفالت کے وسائل

۵۔ سفر کا ممکن ہونا

کفارِ عرب کے یہاں کھانے کی مختلف چیزوں کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں بڑے تفصیلی قاعدے تھے، جو اتنے ہی سخت گیر تھے جتنے برہمنوں کے بنائے ہوئے قوانین۔ مسلمانوں کو ان قاعدوں کے پھندوں سے نکالنے کی خاطر مبلغ اسلام نے قرآن کی روشنی میں اکثر اپنے پیروؤں کو یہ ہدایت کی کہ چند چیزوں کو چھوڑ کر کھانے کی سب چیزیں حلال ہیں۔ ”جو کچھ حلال وطیب اللہ نے تمہیں دیا ہے اسے کھاؤ اور اس اللہ

کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔"

(المائدہ ۸۸)

"جو وحی مجھ پر آئی ہے اس میں کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں کی گئی الا یہ کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون ہو یا سؤر کا گوشت ہو، جو ناپاک ہے یا فسق ہو ان معنوں میں کہ وہ ایسا جانور ہو جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو"۔

(الانعام ۸۸)

اس کی تشریح پانچویں سورہ میں کی گئی ہے، جس کا مقصد بھی زمانہ جاہلیت کے عربوں کی مختلف وحشیانہ اور بت پرستانہ رسموں کی مذمت تھا۔

"تم پر یہ چیزیں حرام کی گئیں، مردار، خون، سؤر کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو[1] وہ جانور جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو[2] سوائے اس کے کہ تم نے اُسے زندہ پا کر خود ذبح کیا...... اور وہ جانور جو کسی آستانے یا استھان پر ذبح کیا گیا ہو[3] نیز یہ بھی تمہارے لیے ناجائز ہے کہ (تیروں کے ذریعے) پانسہ ڈال کر مذبوحہ کا گوشت بانٹا کرو۔"

(المائدہ ۳)

"جو پاک چیزیں ہیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو[4]۔

---

[1] کفار عرب جب کوئی جانور کھانے کے لیے ذبح کرتے تھے تو وہ اس پر اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کے نام لیا کرتے تھے۔

[2] بت پرست عربوں کے یہاں جانوروں کو ہلاک کرنے کے مختلف وحشیانہ طریقے تھے۔ اس ممانعت میں ان بے رحمانہ طریقوں کی طرف اشارہ ہے۔

[3] قرآن میں لفظ نصب استعمال کیا گیا ہے، اس سے مراد نذر و نیاز چڑھانے کے مقامات ہیں۔ حرم کعبہ کے ارد گرد اور کفار عرب کے گھروں کی دہلیزوں پر پتھر نصب کیے جاتے تھے اور ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔

[4] جو چیزیں انسان کے لیے طبعاً مکروہ ہیں۔ مثلاً گوشت خوار جانوروں کا گوشت، شکاری پرندے، سانپ وغیرہ ان کے لیے کسی صریحی ممانعت کی ضرورت نہ تھی۔ ہندوستان میں جو یہ عام خیال ہے اور جو ہندؤں سے مستعار لیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے عیسائیوں کے ساتھ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نشے اور جوئے کی جو عیسائی جماعتوں کی عام لعنتیں ہیں اور رکیک درج ذیل فطرتوں کی بڑی کمزوریاں، اور اسی طرح ہر قسم کی بے اعتدالیوں کی سخت ممانعت کی گئی۔

رسول عربی ﷺ کی تعلیمات سے بڑھ کر کوئی تعلیم سیدھی سادی اور ذہن انسانی کی ترقی سے ہم آہنگ نہیں۔ مذہبی رسوم کے بارے میں آپ ﷺ نے اسلام کی رو سے جو چند آداب وقواعد متعین کیے ان کا مقصد زیادہ تر نظم وضبط اور یک رنگی و یکسانی پیدا کرنا تھا، جو معاشرے کی نشوونما کے بعض مراحل میں بہت ضروری ہوتا ہے۔ لیکن یہ آداب وقواعد لوچ اور لچک سے خالی نہ تھے۔ چنانچہ بیماری کی حالت میں اور بعض اسباب کے تحت انہوں نے اُن سے انحراف کی اجازت دی۔

"خدا تمہارے لیے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان ضعیف پیدا کیا گیا۔"

(النساء ۲۸)

رسول اکرم ﷺ نے جو قانونی اصول وضع کیے وہ یا تو ایسے سوالات کے جوابوں کی صورت میں وضع ہوئے جو مدینہ کے مصنفِ اعلیٰ کی حیثیت سے آپ سے کیے جاتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۸) کھانا پینا جائز نہیں، وہ بالکل غلط اور قرآن کی عبارت ذیل میں دی ہوئی ہدایت کے بالکل منافی ہے: "آج تمہارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں، اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا اُن کے لیے۔" (المائدہ ۵)

شارح اسلام نے کھانے پینے اور رہنے سہنے سے متعلق اسراف کے بارے میں جو قاعدے اور اوامر ونواہی پہنچائے ان کے ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ان کے وقت اور ان کی قوم کے عارضی حالات کے تقاضوں کا نتیجہ تھے۔ جب وہ حالات معدوم ہو گئے تو ان قوانین کی ضرورت بھی ختم ہو گئی لہٰذا یہ فرض کر لینا کہ ہر اسلامی ہدایت ایسی ہے کہ اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں کیا جا سکتا تاریخ اور عقل انسانی کے ارتقا کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس ضمن میں ابن خلدون کے الفاظ سنجیدگی سے غور کیے جانے کے مستحق ہیں:

"ہم صرف دقیقہ نظر اور محنت وکاوش سے ماخذوں کا مطالعہ اور چھان بین کر کے صداقت کو دریافت کر سکتے ہیں اور غلطیوں سے بچ سکتے ہیں۔ اگر ہم محض اخبار وروایات کے نقل کر دینے پر اکتفا کریں اور تجربے کے مہیا کیے ہوئے قواعد، سیاست مدن کے اصولی قوانین، کسی زمانے کی مخصوص تہذیب اور انسانی معاشرے کے حالات پر نظر نہ ڈالیں، اگر ہم ازمنہ بعیدہ کے تقاضوں کا اندازہ اُن تقاضوں سے نہ لگائیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں یعنی اگر ہم ماضی کا مقابلہ حال سے نہ کریں تو ممکن نہیں کہ ہم غلطیوں کا شکار نہ ہو جائیں اور صداقت کے راستے سے بھٹک نہ جائیں"۔

تھے یا چند صریح خرابیوں کو دور کرنے کی خاطر۔ آپ ﷺ کے اسلام میں کوئی ایسی رسم نہ تھی جو انسان کو خدائے واحد کے خیال سے دور لے جاتی، کوئی ایسا قانون نہ تھا جو ترقی پذیر نوعِ انسانی کے ضمیر کو پابجولاں رکھتا۔

اسلام کے ضابطۂ اخلاق کا خلاصہ چھٹے سورے میں بالفاظِ ذیل دیا گیا ہے:۔

''آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، کیونکہ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہارے بچوں کو بھی دیں گے، بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ پھٹکو، خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی، کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو، الاحق کے ساتھ......؛ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ۔ الا ایسے طور پر کہ تم اُسے بہتر بنا سکو......اور جب بات کہو تو حق کی کہو، چاہے اہلِ معاملہ تمہارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ کا عہد پورا کرو۔ یہ ہیں وہ باتیں جن کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے۔ شاید تم ان کا دھیان رکھو گے......یہی ہے میرا سیدھا راستہ۔ لہٰذا تم اس پر چلو۔''

(الانعام ۱۵۳ ۔ ۱۵۲)

''بالتحقیق اُن مسلمانوں نے (آخرت میں) فلاح پائی جو اپنی نماز خشوع سے ادا کرتے ہیں، جو لغو باتوں سے، خواہ وہ قولی ہوں یا فعلی، دور رہتے ہیں، جو زکوٰۃ کے طریقے پر ثابت قدمی سے کاربند رہتے ہیں جو اپنی عصمت کا تحفظ کرتے ہیں...... جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا خیال رکھتے ہیں......''

(المؤمنون ۱ تا ۸)

''یقیناً اللہ تمہیں عدل و احسان اور رشتہ داروں کا حق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے اور بدی، بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے......''

(النحل ۹۰)

ایک عیسائی مورخ کا قول ہے: ''کسی اُمت کے ابتدائی مراحل نشوونما میں، جب اس کے عقاید کا رسوخ و وثوق درجہ کمال کو نہیں پہنچا ہوتا، ظاہری رسوم اور باقاعدہ

ادارے عوام الناس کے سینوں میں حس مذہبی کو زندہ رکھنے کی خاطر ضروری ہوتے ہیں اور یہ ایمان و احسان کے ساتھ کوئی تناقص نہیں رکھتے۔" چنانچہ انسانوں کی اکثریت کو ایک واضح اور سہل الفہم تصورِ دین کا ابلاغ کرنے کی خاطر حضرت محمد ﷺ نے اپنی تعلیمات سے چند آداب و رسوم کو وابستہ کر دیا۔ اور تو اور، خود حضرت عیسیٰؑ نے دو رسمیں جاری کی تھیں، یعنی بپتسمہ اور عشائے ربانی (Holy Supper) اور وہ کچھ اور مدت تک دنیا میں رہتے تو ممکن ہے کہ وہ چند اور رسوم کا اضافہ کرتے۔ بہر حال ایک چیز یقینی ہے۔ وہ یہ کہ اگر ان کو ایک طویل تر حیاتِ دنیوی نصیب ہوتی تو وہ اپنی تعلیمات کو زیادہ منظم بنیادوں پر استوار کر جاتے۔ عیسائیت میں جو یہ بنیادی نقص رہ گیا دراصل اسی کی بدولت کلیسائی مذاکرے اور جلسے ضروری ہوئے تا کہ ارکانِ دین اور مسلماتِ ایمان معین کئے جائیں۔ لیکن جب وہ معیّن ہوئے تو ایسے نکلے کہ عقل اور فکرِ آزاد کی ایک خفیف سی ضرب سے پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کام ادھورا رہ گیا۔ اخلاقی قوانین کی ضابطہ بندی کو ایک اور معلم کے حصے میں آنا تھا۔

اپنے خالق کے ساتھ ہمارے جو تعلقات ہیں وہ تو ہمارے ضمیر کے معاملے ہیں، لیکن اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کو مثبت قواعد کے تابع ہونا چاہیے اور انسانوں کے باہمی فرائض کی بجا آوری کے لیے مذہب کی تصدیق و توثیق، یعنی تکلیفِ شرعی، سے بڑھ کر کون سی ضمانت ہو سکتی ہے؟ مذہب کو صرف چیدہ چیدہ معلموں کی خطیبانہ چرب زبانی کا موضوع یا خواب و خیال کی دنیاؤں میں رہنے والی چند مخصوص طبائع کی تفریح کے لیے ایک عجیب و غریب نظریہ نہ ہونا چاہیے۔ مذہب کو آئین زندگی ہونا چاہئے، اس کا سب بڑا مقصد یہ ہونا چاہے کہ نوعِ انسانی کو اس اوجِ کمال تک پہنچائے جو ہماری ہستی کی منزلِ مقصود ہے۔ لہٰذا وہ مذہب سب سے زیادہ توجہ اور احترام کا مستحق ہے جو اجتماعی مطالبات اور انسانی فرائض کی ضابطہ بندی کر کے اخلاق کے بنیادی اصولوں کی تنظیم کرے، جو عقلِ انسانی کی انتہائی نشوونما کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی بدولت ہمیں مرحلہ بہ مرحلہ ہستی کامل سے قریب تر لیتا چلا جائے۔ حضرت محمد ﷺ نے جس اسلام کی تبلیغ کی اس کا امتیازی وصف یہ ہے کہ تمام مذاہب میں، خواہ وہ خاص خاص

قوموں کے لیے آئے ہوں یا ساری نوع انسانی کے لیے' جو عظیم ترین اور نمایاں ترین اوصاف ہیں، یعنی ایسے اوصاف جو انسان کی عقل اور وجدانِ اخلاقی سے موافقت رکھتے ہیں، وہ ان سب کا جامع ہے۔ وہ محض ایک ایسا نظام نہیں جو انسانی ترقی کے ایک صحیح تصور پر مبنی چند مثبت اخلاقی قواعد پر مشتمل ہے، بلکہ وہ چند بنیادی اصولوں کا قیام ہے، چند میلانات کا بروئے کار لانا ہے، ایک خاص افتادِ طبع ہے اور ان سب کا اطلاق انسانی ضمیر کو زمان و مکان کے ہمیشہ بدلتے ہوئے حالات پر کرنا پڑتا ہے۔'' معلم اسلام نے عالمگیر محبت و اخوت کو محبت الٰہی کے نشان کے طور پر پیش کر کے ہزاروں مختلف طریقوں سے اس کی تلقین کی۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب تم خدا کے حضور میں حاضر ہو گے تو وہ تمہیں کس نشانی سے پہچانے گا؟ وہ نشانی وہ محبت ہے جو تمہیں اپنے بچوں سے اپنے رشتہ داروں سے' اپنے ہمسایوں سے اور اپنے ہم جنسوں سے تھی۔

''کیا تم اپنے خالق سے محبت رکھتے ہو؟ تو پہلے اپنے ہم جنسوں سے محبت کرو۔''

''کیا تم خدا کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو؟ اگر چاہتے ہو تو اس کی مخلوق سے محبت کرو' دوسروں کے لیے وہی چیزیں پسند اور وہی چیزیں رد کرو جو تم اپنے لیے کرتے ہو، ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو جیسا تم اپنے ساتھ چاہتے ہو۔''

ناپاکی میں جو برائی ہوتی ہے، ریاکاری میں جو کمینہ پن ہوتا ہے اور خودفریبی میں جو خدا فریبی ہوتی ہے، مبلغ اسلام نے ان سب کی مذمت نہایت سخت الفاظ میں کی اور ناقابلِ اشتباہ الفاظ میں اس نے حق و صداقت، نیکی و احسان اور برادرانہ محبت کی گرانقدری کا اعلان کیا۔

اسلام کی ہدایات میں تمام زمانوں اور تمام قوموں کے حالات کے مطابق موڑے جانے کی جو صلاحیت ہے، عقل کی روشنی کے ساتھ ان میں جو کامل مطابقت ہے، اُن کی جو یہ خصوصیت ہے کہ اُن میں کوئی ایسے مخفی و پراسرار مسئلے نہیں جو انسان کے سینے کے اندر ودیعت کی ہوئی ازلی صداقتوں کو جذباتی وہم پرستی و جہالت کا گرہن لگادیں...... ان سے ثابت ہوتا ہے، کہ فطرتِ انسانی میں جو مذہبی استعداد ہے اسلام اس کی جدید ترین ترقیوں کا آئینہ دار ہے۔ جن لوگوں نے اسلام کی بعض ہدایات کے تاریخی مطلب و

مدعا سے دانستہ تجاہل کیا ہے ان کا خیال ہے کہ ان ہدایات کی ظاہری درشتی یا موجودہ اسالیب فکر سے اُن کی نامطابقت اسلام کے اس دعوے کو کہ وہ ایک عالمی مذہب ہے ناقابلِ قبول بنا دیتی ہے۔ لیکن اگر قوانین وہدایات کی تاریخی وقعت کی تھوڑی سی تحقیق کی جائے اور واقعات کا جائزہ لیتے وقت قدرے زیادہ انصاف سے کام لیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ ایسے اسلامی قوانین جو جدید زمانے کے مطالبات وتعصبات سے ہم آہنگ معلوم نہیں ہوتے محض ایک عارضی اور وقتی حیثیت رکھتے تھے۔ اسلام کی ہمہ گیری کو، اس کی وسیع المشربی کو اور تمام اخلاقی نظاموں سے اس کی فراخدلانہ رواداری کو اس کے حریف مذاہب کے تعصب نے یا تو صحیح طور پر سمجھا نہیں جانے دیا یا انہیں مسخ کر دیا ہے یا عمداً پوشیدہ رکھا ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔

"یقین جانو کہ مسلمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا عیسائی، جو لوگ بھی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے، اُن کے لیے نہ کسی خوف کا مقام ہے نہ رنج کا۔"

(المائدہ ۶۹)

اس مضمون کا اعادہ پانچویں سورہ میں جا بجا کیا گیا ہے۔ ان آیات کے علاوہ سینکڑوں آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نجاتِ اُخروی کو صرف پیروانِ رسول اللہ تک محدود نہیں رکھتا۔

"تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور راہِ عمل مقرر کی ہے اگر تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو (یعنی ساری نوعِ انسانی کو) ایک ہی اُمت بنا سکتا تھا۔ لیکن اس کے بجائے اس نے تمہیں مختلف احکام دے کر تمہاری آزمائش کی ہے۔ لہٰذا نیک کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اس وقت وہ تمہیں ان باتوں کی اصل حقیقت جتا دے گا جن کے بارے میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔"

(المائدہ ۴۸)

دنیا کے جن مذہبوں نے ضمیرِ انسانی پر حکومت کی ہے ان میں محمد ﷺ کا پیش کردہ

اسلام واحد مذہب ہے جس میں وہ دونوں تصورات مجتمع ہیں جو مختلف زمانوں میں انسانی کردار کے سب سے بڑے محرک رہے ہیں یعنی وقارِ انسانی کا احساس، جسے قدیم فلسفوں نے بڑی اہمیت دی ہے اور معصیتِ انسانی کا احساس، جو عیسائی متکلمین کو اس قدر عزیز ہیں۔ یہ عقیدہ کہ آخرت کے دن انسان کی قسمت کا فیصلہ محض اس کے اعمال کی بنا پر ہوگا مسلمان کو تقویٰ اور اپنے ہم جنسوں سے لطف و احسان کی طرف رغبت دلاتا ہے۔ مشیتِ ربی پر اعتماد، خدا کے رحم و کرم شفقت و محبت اور قدرتِ مطلقہ پر ایمان اسے خدا کے سامنے انکسار و عاجزی سکھاتا ہے اور ان غازیانہ محاسن پر آمادہ کرتا ہے جن کے طفیل اسلام پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ اسلام نے جن اوصافِ حسنہ کی تلقین کی ہے ان میں رواقیت پائی جاتی ہے۔ یعنی صبر و تحمل، تسلیم و رضا اور زندگی کے امتحانوں میں ثابت قدمی۔ یہ ایمان اُسے اس پر مجبور کرتا ہے کہ اپنے ضمیر سے تردد و اضطراب کے ساتھ باز پرس کرتا رہے، اپنے اعمال کے محرکات کا حزم و احتیاط کے ساتھ مطالعہ کرتا رہے۔ اپنی ذاتی قدرت پر مکمل بھروسہ نہ رکھے، بلکہ خیر و شر کی باہمی جنگ میں خدائے جلیل و کریم کی تائید پر اعتماد کرے۔

بعض مذاہب میں فرائض معین کرنے والے احکام ایسے ناقابلِ عمل، فطرت انسانی کے علم سے اس قدر خالی اور راندھادھند جوش رکھنے والوں کی سی پراگندہ دماغ خیال پرستی سے اس قدر مملو رہے ہیں کہ زندگی کے حقیقی محاربوں میں بالکل بے کار ثابت ہوئے ہیں۔ کسی مذہب کی عالمگیری کے بارے میں فیصلہ کرنے کے معیار یہ ہیں کہ وہ کہاں تک قابلِ عمل ہے، انسانوں کے عام تعلقات میں اور روزانہ زندگی کے معاملات میں وہ کتنا مستقل اثر و نفوذ رکھتا ہے اور عوام الناس کے دلوں پر اس کا سکہ کہاں تک جمتا ہے۔ کسی مذہب کے حقیقی اوصاف کا اندازہ اس سے نہیں لگایا جا سکتا کہ غیر معمولی طبائع پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ عام لوگوں کی ذہنیتیں اس سے جس طور پر متاثر ہوتی ہیں اس کا مطالعہ کیا جائے۔ کیا وہ ان پر اثر اندازی کی بڑی قوت رکھتا ہے؟ کیا وہ انہیں رفعت بخشتا ہے؟ کیا وہ اُن کے تصورِ حقوق و فرائض کو منضبط کرتا ہے؟ اگر جزائر بحر جنوبی یا کفرا ریا کے باشندوں میں اس کی تبلیغ کی جائے تو کیا وہ اُنہیں بہتر بنائے گا یا اور بھی بدتر کر کے رکھ دے گا؟...... یہ ہیں وہ سوال جو قدرتی طور پر ہمارے دل میں پیدا ہوتے

ہیں۔ اسلام میں ایک بلند نظر مقصدیت ایک انتہائی معقول عملیت کے ساتھ جمع کی گئی ہے۔ اس نے انسانی فطرت کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس نے کبھی اپنے آپ کو اُن پیچ در پیچ راستوں میں نہیں الجھایا جو واقفیت و حقیقت کی اقلیم سے باہر ہیں۔ دوسرے دینی نظاموں کی طرح اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ نوعِ انسانی کو کمالِ مطلق کی مثالی معراج کی طرف اٹھالے جائے، لیکن وہ اس مقصد کی تحصیل یا اس کی تحصیل کی کوشش اس حقیقت کے ادراک کے ذریعے کرتا ہے کہ اس مادی زندگی میں انسان کی فطرت ناقص ہے۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ "اگر تیرا بھائی تیرے ایک گال پر طمانچہ رسید کرے تو تُو دوسرا گال اُسے پیش کردے۔" لیکن اگر اس نے خبیث النفس غلط کاروں کو اُن کی برائی کی حد تک سزا دینے کی اجازت دی[1] تو ساتھ ہی ساتھ اس نے سوز و گداز سے بھرے ہوئے الفاظ میں اور مختلف لہجوں میں عفو و حلم اور بدی کا معاوضہ نیکی سے دینے کی تعلیم بھی دی۔ قرآن کا ارشاد ہے:۔

"اس سے بہتر بات کس کی ہو سکتی ہے جو دوسروں کو خدا کی طرف دعوت دیتا ہے اور خود بھی نیک کام کرتا ہے؟...... نیکی اور بدی برابر نہیں، بدی کا دفعیہ اس سے کرو جو اس سے بہتر ہے۔"

(حٰم، السجدہ ۳۲ ۔ ۳۳)

ایک اور جگہ جنت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے (وہ اُن کے لیے ہے) جو بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، غصے کو قابو میں رکھتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں۔"

(الشوریٰ ۴۲ ۔ ۳۷)

یہ خُلقِ عظیم سکھانے والی ہدایات ایسی نہیں کہ جعلی جذباتیت کے طاقِ نسیاں ہی پر دھری رہ جائیں، بلکہ یہ سچے مسلمان کی زندگی کے عملی اصول ہیں۔ دوسرے مذاہب

[1] قرآن۔ سورہ ۲۲۔ ۳۹، ۴۰۔ تومیسن Thonissen کا یہ قول یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے محمداً برائیاں کرنے والوں کو سزا دینے کی اجازت اس مقصد سے دی کہ ان سے زیادہ سنگین برائیوں کا انسداد ہو سکے۔

کے پیروؤں نے امتحان و ابتلا میں صبر و تحمل کی جو مثالیں پیش کیں، تاریخ نے انہیں محفوظ رکھا ہے تا کہ آئندہ نسلیں، انہیں خراجِ تحسین ادا کریں۔ لیکن اقبال و خوش حالی کی بہ نسبت عسرت و مصیبت میں، جب کہ انسان میں برائیوں کا بدلہ لینے کی طاقت نہیں ہوتی، عفو بردباری زیادہ آسان ہے۔ شہید کربلا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ کھانا کھا رہے تھے تو ایک غلام نے ایک اُبلتی ہوئی طشتری اُن کے جسم مبارک پر اُلٹ دی اور اُسی وقت دوزانو ہو کر قرآن کی یہ آیت پڑھی:۔

''جنت اُن کے لیے ہے جو اپنے غصے کو ضبط کرتے ہیں۔''

امام حسین رضی اللہ عنہ نے کہا۔'' مجھے تو غصہ نہیں آیا۔'' غلام نے یہ مزید عبارت پڑھی۔'' اور اُن کے لیے بھی جو انسانوں کی خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں۔'' امام حسین نے کہا:'' میں نے تجھے معاف کیا۔'' غلام نے آیت کی تکمیل کرتے ہوئے اضافہ کیا: '' کیونکہ خدا محسنوں سے محبت کرتا ہے۔'' امام حسین نے اسی وقت اعلان کیا'' جا میں نے تجھے آزاد کیا اور تجھے چاندی کے چار سو سکے بھی دیتا ہوں۔''

صاحب کشاف اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یوں پیش کرتا ہے:'' جو تمہیں دھتکار دے اُس کے پاس دوبارہ جاؤ، جو تم سے کچھ لے لے اس کو اور بھی دو۔ جو تمہارے ساتھ برائی کرے اُسے معاف کر دو۔ کیونکہ خدا کو یہ پسند ہے کہ تم اس کے کمالات کی جڑ اپنی روح کی گہرائیوں میں گاڑ دو۔''

کیا کوئی الفاظ جذبے کی رفعت و پاکیزگی میں ذیل کے قرآنی الفاظ سے زیادہ حسین و جمیل ہو سکتے ہیں؟:۔

''رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جب جاہل اُن کے منہ آئیں تو کہتے ہیں 'تم کو سلام' وہ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں'...... وہ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ ایسے کہ فضول خرچی ہو اور نہ ایسے کہ بخل ہو، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال سے، وہ جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے، اور زنا کے مرتکب نہیں ہوتے، ...... وہ جھوٹ کے حق میں گواہی نہیں دیتے، اور زنا کے مرتکب نہیں ہوتے، ...... اور اگر کسی لغو فعل سے اُن کا سامنا

ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح اُس کے پاس سے گزر جاتے ہیں، ...... وہ جو دعائیں مانگتے ہیں کہ 'اے ہمارے رب' ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے، ...... یہ ہیں وہ لوگ جنہیں اجرِ عظیم ملے گا، کیونکہ انہوں نے صبر سے کام لیا اور جنت میں اُن کا استقبال خوش آمدید اور دُعا و سلام سے کیا جائے گا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ خوب ہے وہ ٹھہرنے اور رہنے کی جگہ!" (الفرقان ۲۵ ۶۳ تا ۶۷)

یہ ہے محمد ﷺ کا پیش کردہ اسلام۔ یہ صرف ایک ضابطۂ عقائد ہی نہیں، بلکہ موجودہ زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ ہے، راست بازی، راست اندیشی، راست گوئی کا ایک مسلک ہے، جس کی بنیاد حبِ الٰہی پر، عالم گیر عطاء و احسان پر اور خدا کی نگاہوں میں تمام انسانوں کی مساوات پر ہے۔ اسلام کے موجودہ نام لیواؤں نے اس کی اصلی شان و شوکت کو چاہے کتنا ہی غبار آلودہ کیوں نہ کر دیا ہو (اور سچ پوچھیے تو اس زمانے میں جو اسلام رائج ہے اس کے نقائص و معائب پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے ......) پھر بھی وہ مذہب جس نے صلاح و تقویٰ اور اعمال کی بنا پر جزا و سزا کو ایک ضابطہ بند صورت میں مجسم کر دیا ہے نوعِ انسانی کے محبوں کے اعتراف کا مستحق ہے۔

می توانی ازرہِ آساں شدن بر آسمان

راست باش و راست رو کانجا نباشد کاستی

اسلام کے نزدیک موجودہ زندگی آئندہ کا مزرع ہے۔ کامل انکسارِ نفس کے ساتھ انسانوں کی بھلائی کی خاطر کام کرنا۔ جامع الکمالات سے کسبِ کمال کی خاطر پوری ہمت کے ساتھ کوشش، یہ ہے اسلام کا اصل الاصول۔ سچا مسلمان سچا عیسائی بھی ہوتا ہے، ان معنوں میں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا قائل ہے اور ان کی اخلاقی تعلیم کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کرتا ہے۔ پھر اس کا کیا جواز ہے کہ کوئی سچا عیسائی اس معلم کا احترام نہ کرے جس نے اپنے پیش رو معلموں کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچایا؟ کیا اس معلم نے دنیا کی آوارہ و ہرزہ گرد قوتوں کو یکجا کر کے ترقی کی راہ پر گامزن نہیں کیا؟

اس کے سوا کہ اسلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کو تسلیم نہیں کرتا، اسلام اور عیسائیت میں کوئی اساسی اختلاف نہیں۔ دونوں کا جوہر، دونوں کی روحِ رواں ایک ہی

ہے، دونوں نوعِ انسانی کے بطون میں کام کرنے والی ایک ہی قسم کی روحانی قوتوں کی پیداوار ہیں۔ عیسائیت یہودیوں اور رومیوں کی شقی القلب مادہ پرستی کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی، اسلام عربوں کی انسانیت سوز بت پرستی اور ان کے وحشیانہ و ظالمانہ رسوم و عادات کے برخلاف ایک اعلانِ جنگ تھا۔ عیسائیت کی تبلیغ ایک متمدن و مہذب قوم کو کی گئی جو ایک منظم حکومت کی تابع فرمان تھی۔ اس لیے اسے نسبتاً کم شورہ پشت خرابیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اسلام کی اشاعت ایسے قبیلوں اور فرقوں میں ہوئی جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ اس لیے اُسے ذاتی مفادات کے جبلی تقاضوں اور آبائی و جدی توہم پرستی کی قلعہ بندیوں کے خلاف لڑائی لڑنی پڑی عیسائیت مشرق کی طرف جو قدم بڑھا رہی تھی، انہیں ایک نفیس الدماغ، لیکن عجیب الفطرت شخص نے، جو نسلاً یہودی لیکن تعلیماً اسکندریہ کا ایک یونانی تھا، روک دیا۔ چنانچہ وہ یونان اور روما کی طرف چل دی۔ ان ملکوں میں پہنچ کر اس نے ان کی صدیوں پرانی مشرکانہ تہذیب کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور اُسے نئے افکار اور نئے نظریوں کی صورت میں منتقل کر دیا۔ عیسائیت نے جس لمحہ اپنے مولد سے نقلِ مکان کیا وہ عیسائیت نہ رہی بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی بجائے پال حواری کا مذہب بن گئی۔ قدیم شرک کے صنم کدے گرنے کے قریب تھے۔ یونان اور اسکندریہ کے فلسفے نے رومی دنیا کو ذہنی طور پر ایک مجسم خدا پر، یعنی ایک نیم خدا پر، ابدیتِ کبریٰ کے سینے میں ایک ابدیتِ صغریٰ پر ایمان لانے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ یہ تصور پال کی سکھائی ہوئی عیسائیت میں حلول کر گیا۔ جدید زمانے کی مثالیت پرست عیسائیت، جو ایک مثبت مذہب کے بجائے ایک نظامِ فلسفہ ہے، ماقبل عیسائیت اور مابعد عیسائیت تہذیب کی متعدد صدیوں کی پیداوار ہے۔ اسلام کا پیغام جن لوگوں کو اور جن اجتماعی و اخلاقی حالات میں دیا گیا وہ بالکل مختلف قسم کے تھے۔ اسلام کا پیغام جن لوگوں کو اور جن اجتماعی و اخلاقی حالات میں دیا گیا وہ بالکل مختلف قسم کے تھے۔ ایک انحطاط یافتہ عیسائیت نے اس کی اشاعت میں جو سدراہ حائل کر دی اگر وہ اس کو توڑنے میں کامیاب ہو جاتا اور کرۂ ارض کی اشرف قوموں میں رواج پا جاتا تو اس کی ہیئت و سیرت اور اس کی ترقی اس نقشے سے بالکل مختلف ہوتی جو اس وقت نسبتہً کم شائستہ مسلم

جماعتیں کسی مشاہدہ کرنے والے کی نگاہوں کو پیش کرتی ہیں۔ دو ایسے دریاؤں کی طرح جو دو مختلف علاقوں میں سے گزرتے ہیں، ان دو مذاہب نے اپنے اپنے علاقوں کی زمین کی طبعی خصوصیتوں کے مطابق مختلف نتائج رونما کیے ہیں۔ میکسکو کے وہ باشندے جو اپنے آپ کو ایک مذہبی ریاضت کے طور پر خاردار جھاڑیوں کی ٹہنیوں سے اذیت پہنچاتے ہیں، جنوبی امریکہ کے بت پرست، بلکہ تمام عیسائی قوموں کے نچلے طبقے کسی معنی میں بھی عیسائی کے لقب کے مستحق نہیں۔ ان کے اور جدید عیسائی فکر کے رہنماؤں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ اسلام نے جہاں کہیں بھی ثقافت پذیر اور ترقی پسند قوموں میں رواج پایا ہے، وہاں اس نے اپنے آپ کو ترقی پسند رجحانات سے کاملاً ہم آہنگ ثابت کیا ہے، تہذیب کے ارتقا میں مدد دی ہے اور مذہب کو ایک مثالی ہیئت بخشی ہے[1]۔

ایک مذہب اسی صورت میں جاہل اور غیر تربیت یافتہ لوگوں پر ایک مستقل صحت بخش اثر ڈال سکتا ہے کہ اسکے اوامر و نواہی نمایاں طور پر حتمی و قطعی ہوں۔ جہاں تک اعلیٰ اور روحانیت سے مملو طبائع کا تعلق ہے، وہ کبھی کبھی خارجی ہدایات کے بغیر بھی اپنے ہم جنسوں کے ساتھ راہ و رسم سے متعلق اپنے قلوب کے اہرنوں پر قاعدے وضع کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا کسی نہ کسی انداز سے اللہ کے ساتھ رشتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ خیر و شر اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی استعداد انہیں فطرتاً ودیعت ہوئی ہوتی ہے اور ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتی رہتی ہے۔ افلاطون اور ارسطو کو الہامی دینوں کا نور نصیب نہ ہوا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے اخلاق کے بعض بلند ترین اصول دنیا کو اُسی طرح وضاحت سے بتائے جیسے انبیا نے تلقین فرمائے تھے۔ ان کو بھی اپنے طور پر ہدایت الٰہی نصیب ہوئی تھی اور ان کی فکر نے انہیں بلندی بخش کر حق کے قریب پہنچا دیا تھا۔

لیکن نوع انسانی کی اکثریت کے لیے، جو جہالت یا بربریت میں مبتلا ہے،

---

[1] وہ مذہب جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غازیانہ وفاداری، امام جعفر صادق کے حلم و نرم مزاجی، امام موسیٰ علیہ السلام کے صبر و تقویٰ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی قدسی پاکدامنی، حضرت رابعہ بصری رضی اللہ عنہا کی پارسائی کو جنم دیا، وہ مذہب جس نے ابن سینا، البیرونی، ابن خلدون، سنائی، جلال الدین رومی، فرید الدین عطار، ابراہیم ادہم اور ایسے ہی کئی اکابر ابطال پیدا کیے، وہ مذہب یقیناً اپنے اندر ایسے اوصاف رکھتا ہے جن سے اُمید فلاح کی جا سکتی ہے۔

اور ایسے لوگوں کے لیے جو شائستگی سے معرا اور بری عادتوں کے شکار ہوں، اخلاقی ہدایات کوئی معنی نہیں رکھتیں، جب تک انہیں صریح الفاظ میں قانونوں کی سی قطعیت کے ساتھ اور سزا و جزا سے منسلک کر کے پیش نہ کیا جائے۔ نہ مذہب کا اخلاقی پہلو ایسے لوگوں کے احساسات و جذبات کو حرکت میں لاتا ہے، نہ فلسفیانہ تصورات اُن کے ذہنوں، اُن کے آئے دن کے کردار یا ان کے اسلوب زندگی پر کسی قسم کا اثر مرتب کرتے ہیں۔

مجرد اصولوں پر خطبوں کی بہ نسبت سند و نظیر کا سکہ ان کے دلوں پر بہ آسانی بیٹھتا ہے۔ انہیں اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ نہ صرف اپنے ہم جنسوں بلکہ اپنے خدا کے ساتھ بھی تعلقات کے بارے میں اُن کے لیے پکے قاعدے بنا دیئے جائیں، ورنہ انسان تو انسان، وہ خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔

اسلام کو ساتویں صدی عیسوی میں جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور جس حیرت انگیز سرعت سے وہ روئے زمین پر پھیلا اُس کا راز اسی میں مضمر تھا کہ اس نے انسانی فطرت کی اس بنیادی ضرورت کو ملحوظ رکھا۔ ایک ایسی دنیا سے جو مختلف مذہبوں اور فرقوں کے مناظروں اور مناقشوں کی معرکہ گاہ بنی ہوئی تھی اور جس کے لیے اعمال کی بہ نسبت الفاظ کہیں زیادہ اہمیت رکھتے تھے اس نے اختیار و اقتدار کے منبعِ مطلق سے آئے ہوئے حتمی احکام کی صورت میں خطاب کیا۔ اگرچہ اس نے اخلاقی و اجتماعی بربادی کے ماحول میں جنم لیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک ازلی ارادہ ذاتی کی پرستش کو منظم و منضبط کرے اور اس طرح نوعِ انسانی کی توجہ فرائض کی بجا آوری کی طرف مبذول کرائے جو روحانی نشو و نما کا واحد طریقہ ہے۔ نسبتہً اسفل قوموں کو اجتماعی اخلاق کی ایک بلند تر سطح پر اٹھا کر اس نے ایک مستقل نظام کی ضرورت دنیا پر ثابت کر دی۔ میانہ روی، پرہیز گاری، باہمی ہمدردی، انصاف پسندی اور مساوات کو خدا کے احکام کی حیثیت سے پیش کر کے اس نے انہیں ان اوصاف کی تعلیم دی۔ اس نے انسانی مساوات کا جو اصول قائم کیا اور اس میں جو اشتراکیت سے ملتا جلتا رجحان تھا وہ فکرِ انسانی کے اُسی پہلو کی نمائندگی کرتا ہے جس کا اظہار گلیلی کے ساحل پر ہوا تھا۔ لیکن اپنی رفیع ترین جذباتی کیفیت میں بھی مبلغ اسلام نے کبھی انفرادی صلاحیت کی اُن حدود کو فراموش نہیں کیا جو معاشی عدم مساوات کا باعث ہوتی ہیں۔

اسلام کے موجودہ نام لیواؤں کی حالت پر افسوس ہے! جس طرح کلیسائی "آبائیت" نے دینِ عیسوی کی اصلی صورت کو مسخ کر دیا تھا، اسی طرح علمائے ظاہر کی اندھادھند تقلید پرستی نے اسلام کی حقیقی روح کو جلوہ گر ہونے سے روک دیا ہے۔

ایک عیسائی خطیب نے دین اور دینیات کے باہمی اختلاف کو اور اُن خرابیوں کو جو ان دونوں کے التباس کی بدولت عیسوی کلیسا میں پیدا ہوگئی ہیں، بڑے پرزور الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جو کچھ عیسائیت میں ہو چکا ہے وہی اسلام میں ہو رہا ہے۔ عمل کی جگہ زبانی اقرار کے ڈھونگ نے لے لی ہے۔ نیک اور پرخلوص کاموں کو، یعنی ایسے کاموں کو جو خلق خدا کی بھلائی کے لیے، نیکی کرنے کی خاطر اور حب الٰہی کی وجہ سے کیے جائیں، خالی خولی رسم پرستی نے معطل کر دیا ہے۔ مذہبی جوش مردہ ہو چکا ہے اور خدا و رسول ﷺ کی محبت ایک مہمل ترکیب لفظی بن گئی ہے۔ وہ ذوق و شوق جس کے بغیر انسانی زندگی بہائم کی زندگی سے بہتر نہیں، یعنی راست روی و راست اندیشی کا ذوق و شوق رُخصت ہو چکا ہے۔ آج کل کے مسلمان الفاظ کی محبت میں مبتلا ہو کر معانی سے غافل ہو گئے ہیں۔ معلم اسلام نے جس مثالی نصب العین کی تلقین کی تھی اس کے حصول کی جدوجہد کرنے کی بجائے، نیکوکاری و اتقا میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں رہنے کے بجائے، خدا سے محبت کرنے اور اس کی خاطر انسانوں سے محبت کرنے کے بجائے، وہ موقع پرستی اور ظاہرداری کے غلام ہو گئے ہیں۔ پیغمبر خدا ﷺ کے متبعین اولین کے دلوں میں اپنے ہادی کا جو احترام تھا اس کا ایک قدرتی تقاضا تھا کہ وہ اپنے آپ کو پورے طور پر اس کے رنگ میں رنگ لیتے، اس کے آئے دن کے طور طریقوں کا کامل تتبع کرتے، اس کی حوادث سے مملو زندگی کے گزراں واقعات کو ایک مستقل حیثیت بخش دیتے اور ایسے احکام، قواعد اور ضوابط کو جو ایک نوزائیدہ معاشرے کے ہنگامی مسائل سے متعلق بنائے گئے تھے اپنے دلوں پر کالنقش فی الحجر کر لیتے۔ لیکن یہ خیال کرنا پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ ناانصافی ہے کہ دنیا کے اس عظیم ترین مصلح نے عقل کی حاکمیت کے اس سب سے بڑے حامی نے، اس شخص نے جس نے یہ اعلان کیا کہ اس کائنات پر ایک ضابطہ قوانین مسلط ہے اور دائمی ارتقا آئینِ فطرت کا بنیادی تقاضا ہے، کبھی یہ سوچا ہوگا کہ اور تو اور ایسی

ہدایات بھی جو ایک نیم مہذب قوم کی عارضی ضرورتیں پوری کرنے کی خاطر دی گئی تھیں، رہتی دنیا تک ناقابلِ تغیر سمجھی جائیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ سے بڑھ کر کسی شخص کو اس امر کا احساس نہ تھا کہ اس ترقی پذیر دنیا میں جس کے اجتماعی و اخلاقی مظاہر ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، نت نئی ضرورتیں پیدا ہوتی رہیں گی اور یہ ممکن ہے کہ اس پر جو آسمانی آیات نازل ہوئیں وہ تمام ممکن حالات پر منطبق نہ ہوسکیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو حاکمِ یمن مقرر کیا گیا تو آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ صوبے کے نظم ونسق میں وہ کس قانون کو اپنے لیے دلیلِ راہ بنائیں گے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''قرآن کے قانون کو۔'' آپ ﷺ نے پوچھا ''لیکن اگر تمہیں قرآن میں کسی معاملے کے بارے میں کوئی ہدایات نہ ملیں تو اس صورت میں کیا کرو گے''؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا۔ ''اس صورت میں میں سنتِ نبوی ﷺ پر عمل کروں گا۔'' آپ ﷺ نے پھر پوچھا۔ ''اور اگر وہ بھی ناکافی ثابت ہو؟'' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ ''تو پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ آنحضرت ﷺ نے اس جواب کو بہت پسند فرمایا اور اپنے دوسرے مندوبین کو بھی اسی کے مطابق عمل کرنے کی تلقین کی۔

یہ جلیل القدر معلم اپنے وقت کے مسائل سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جن لوگوں سے اسے سابقہ پڑتا تھا وہ کس طرح اجتماعی و اخلاقی مایوسی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اپنے خدا داد تعمق نظر اور وسعتِ فکر کی بدولت اُس نے اس امر کا ادراک کر لیا، بلکہ یہ کہنا چاہیے اس کی پیش گوئی کی کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب اتفاقی و عارضی ہدایات کو دائمی اور کلی ہدایات سے متمائز کرنا ضروری ہوگا۔ اس نے اپنے پیروؤں سے خطاب کر کے اعلان کیا: ''تم لوگ ایک ایسے دور سے گذر رہے ہو کہ اگر تم احکام کے دسویں حصے سے بھی تغافل برتو تو برباد ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت آئے گا کہ اس وقت جو احکام دیئے گئے ہیں اگر کوئی ان کے دسویں حصے پر بھی عمل کرے گا تو اسے نجات نصیب ہو جائے گی۔''

وعن ابی ھریرہ قال قال رسول اللہ ﷺ انکم فی زمان من ترک عشرما امربہ ھلک ثم یاتی زمان من عمل منھم عشر ماامر بہ نجا۔

جیسا کہ ہم اُوپر کہہ آئے ہیں، وہ لعنت جس میں مسلمان قوم اس وقت گرفتار ہیں معلم اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ نہیں۔ دنیا کے کسی بھی مذہب میں اسلام سے بڑھ کر نشوونما کا مادہ نہ تھا، کوئی بھی مذہب اس سے زیادہ خالص یا نوعِ انسانی کے روز افزوں تقاضوں سے ہم آہنگ نہ تھا۔

مسلم جماعتوں کے موجودہ جمود کا سب سے بڑا باعث یہ غلط خیال ہے جس نے مسلمانوں کی اکثریت پر قبضہ جمالیا ہے کہ اجتہادِ ذاتی کا حق فقہائے قدیم پر ختم ہوگیا اور اس زمانے میں اس کی مشق گناہ ہے۔ اسی کی ایک شق یہ خیال ہے کہ ایک مسلمان صرف اُس صورت میں صحیح العقیدہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ ائمۂ اربعہ میں سے کسی ایک کا مقلد ہو اور اپنی ذاتی رائے کو معطل کر کے ایسے علما کے احکام و اقوال پر اعتماد کرے جو نویں صدی عیسوی میں زندہ تھے اور بیسویں صدی کے تقاضوں کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ اہلِ سنت کا یہ عام عقیدہ ہے کہ چار اماموں کے بعد کوئی عالمِ دین ایسا پیدا نہیں ہوا جو شریعتِ محمدی کی تعبیر و تفسیر کی قابلیت رکھتا تھا مسلمان جن بدلے ہوئے حالات میں آج کل زندگی بسر کر رہے ہیں ان کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جن نتائج پر یہ علمائے دین آج سے صدیوں پہلے پہنچے تھے وہ آج بھی جوں کے توں قائم ہیں اور اُن کا اطلاق آج کے حالات پر بھی اُسی طرح ہوتا ہے۔ شیعوں میں اخباریوں کا فرقہ ذاتی رائے کو مفسرین شریعت سے ایک قدم آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے فکر کو ذہن انسانی کا سب سے اہم اور سب سے اشرف وظیفہ کہا تھا۔ ہمارے مکتبی اربابِ فقہ اور اُن کے غلامانہ ذہنیتوں والے مقلد اسے بروئے کار لانے کو گناہ اور جرم قرار دیتے ہیں۔

جو کچھ عیسائیوں کے یہاں ہوا تھا وہی مسلمانوں کے یہاں ہوا ہے۔ اس زمانے میں کثیر التعداد مسلمانوں کا طریقِ زندگی اور کردار اتنا معلمِ اسلام کے ارشادات و تعلیمات کے سانچے میں نہیں ڈھالا جاتا جتنا وہ مجتہدین اور ائمہ کے نظریات و آرا سے متاثر ہوتا ہے جنہوں نے اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے نظامِ فکر کے مطابق معلم اسلام پر نازل شدہ آیات ربی کی ترجمانی کی ہے۔ ان ترجمانوں کی تو یہ مثال تھی کہ گویا یہ ایک مجمع میں کھڑے ہو کر ایک مبلغ کا خطبہ سن رہے تھے، جو ایک جم غفیر سے خطاب کر رہا تھا

اور جو اپنے اونچے مقام پر سے ایک وسیع رقبے کو اپنے دائرہ نظر میں لیے ہوئے تھا، لیکن ان کی نظر صرف مجمع کے ان افراد تک محدود تھی جو بالکل ان کے قریب کھڑے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ مبلغ کے الفاظ کے وسیع تر معانی کو اور اس امر کو کہ اُس کے مخاطب کس قسم کے لوگ تھے سمجھ نہ سکے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اس کے الفاظ کا مطلب اپنے تنگ دائرہ نظر کے اندر، یعنی ان کے ذہنوں میں انسانی ضروریات اور انسانی ترقی کا جو محدود تصور تھا، اس کے مطابق استنباط کر لیا۔ نہ تو انہیں معلمِ اسلام کی تعلیمات کی ہمہ گیری کا کوئی ادراک تھا، نہ ان میں اس کا سا جوشِ روحانی تھا، نہ ان کو اس کا سا الہام میسر تھا۔ نتیجۃً انہوں نے یہ فراموش کر دیا کہ اس نے اپنی خداداد فطانت کی بلند چوٹی پر سے ساری نوعِ انسانی کو مخاطب کیا تھا۔ انہوں نے عارضی کو مستقل سے، اصولی کو فروعی سے اور جزئی کو کلی سے مخلوط کر دیا۔ عیسائی کلیسائیوں کی طرح اُن علمائے فقہ میں بہت سے ایسے تھے جو جابر اور مستبد بادشاہوں کے ملازم تھے، جن کے مطالبات معلم اسلام کے ارشادات سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ نئے نئے قانون ایجاد کیے گئے، نئے نئے نظریئے تراشے گئے، نئی نئی روایات ڈھونڈ نکالی گئیں، اور شارع کے الفاظ کو ایسے ایسے معانی پہنائے گئے جو ان کے اصلی مفاہیم کی ضد تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جو قواعد وضوابط آج کل مسلمانوں کے ضمیروں پر حکمران ہیں اُن میں اکثر و بیشتر ایسے ہیں جو نصوصِ قرآنی پر مبنی نہیں، بلکہ فقہ و دینیات کی اُن کتابوں سے ماخوذ ہیں جن کی طغیانی قرونِ اُخریٰ کے دوران دنیائے اسلام میں آئی تھی۔

''جس طرح عبرانیوں نے عہدِ عتیق کی کتابوں کو برطرف کر کے تلمود کو اختیار کیا۔'' ایک انگریز مصنف کہتا ہے: ''اُسی طرح مسلمانوں نے قرآن کو بالائے طاق رکھ کر روائتوں اور علمائے دین کے فتووں کو اپنا رہبر بنا رکھا ہے۔'''' ہمارا یہ مطلب نہیں'' وہ اس پر اضافہ کرتا ہے'' کہ اگر کسی مسلمان سے پوچھا جائے کہ اس کے مذہب کا نصاب کیا ہے تو وہ قرآن کے سوا کسی اور کتاب کا نام نہیں لے گا۔ پھر بھی ہمارا یہ مطلب ضرور ہے کہ فی الواقع قرآن اس کے اعمال یا عقائد کی رہنمائی نہیں کرتا۔ قرونِ وسطیٰ میں نیا عہد نامہ نہیں، بلکہ ٹامس ایکوئیناس کی سماتھیولوجیکا جامعِ دینیات' عیسوی عقائد کے صواب دخطا

کا معیار تھی، اور کیا موجودہ زمانے میں عیسائی گرجا کا کوئی رکن انجیلوں کی ذاتی چھان بین کر کے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے اپنے عقائد اخذ کرتا ہے؟ غالباً اگر وہ کسی تحریر سے رجوع کرتا بھی ہے تو صرف گرجا کے سوال و جواب نامہ ہی سے۔ یہی اس کے لیے کافی ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس کی طبیعت میں چیزوں کی ٹوہ لگانے کا مادہ ہو تو گرجا کے انتالیس ارکان سے اس کے تمام شبہات زائل ہو جاتے ہیں، لیکن اگر اس سے پوچھا جائے تو وہ یہی کہے گا کہ اس کا ضابطۂ عقائد انجیلوں سے ماخوذ ہے اور وہ یہ کبھی تسلیم نہیں کرے گا کہ اس نے انجیلوں کے مضمون کا اکتساب کن وسیلوں سے کیا۔ موجودہ زمانے کا اسلام بالکل اسی قسم کے طریقوں سے وضع کیا گیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ قرآن پر مبنی نہیں۔"

اس کے باوجود ہر مذہب خیال میں اصلاح کی استعداد ہے اور اگر اس کی نشوونما مسدود ہوگئی ہے تو اس میں ارباب فقہ کا کوئی قصور نہیں۔ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ لوگ معلم اصلی کے ارشادات کی روح رواں سے بیگانہ ہو گئے ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو علمائے سلف کے اقوال کو بھی سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔

مغربی دنیا میں دینی اصلاح کی تحریک کا پیش خیمہ ثقافت کی نشاۃ ثانیہ تھی۔ یورپ کی ترقی اس وقت شروع ہوئی جب اس نے کلیسائیت کی بیڑیاں اُتار پھینکیں۔ دنیائے اسلام میں بھی اصلاح روشن خیالی کے بعد ہی آئے گی۔ اس سے پیشتر کہ مذہبی زندگی کی تجدید ہو، ضروری ہے کہ لوگوں کے ذہن اس غلامی سے آزاد ہو جائیں جو اُن پر صدیوں کی لفظی تفسیروں نے اور تقلید کے نظریئے نے عائد کر رکھی ہے۔ وہ ظاہریت جو عبادت کرنے والے کے دل سے خطاب نہیں کرتی ترک کرنی پڑے گی۔ خارجی آداب کو باطنی جذبات کے تابع کرنا ہوگا، اور اخلاق کے سبق دلوں پر نقش کرنے ہوں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا تو صرف اس صورت میں اس کی اُمید کی جا سکتی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے سکھائے ہوئے فرائض کے بارے میں نئے سرے سے ذوق و شوق پیدا ہوگا۔ دنیائے اسلام میں اصلاح اس وقت شروع ہوگی جب اس امر کا اعتراف کیا جائے گا کہ کلامِ الٰہی چاہے کسی زبان میں ہو کلام الٰہی ہی رہتا ہے اور خدا کا ذکر چاہے کسی زبان میں کیا جائے خدا کو قبول ہوتا ہے۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے خود اپنے ایک متبع غیر ملکی کو اپنی مادری زبان میں نماز ادا کرنے کی اجازت دی تھی[1] یہی نہیں۔ اُس نے انہیں یہ اجازت بھی مرحمت فرمائی تھی کہ اپنی زبان میں قرآن کی تلاوت کیا کریں، بلکہ اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ قرآن سات قرآت میں نازل ہوا تھا۔

اسلام کے قرونِ اولیٰ میں اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ فہم کے بغیر عبادت بے کار ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک نماز اور خطبہ کا کسی بھی زبان میں پڑھنا جائز تھا[2]

امام ابو حنیفہ کے دو شاگردوں، یعنی ابو یوسف اور محمدؒ نے اپنے استاد کی رائے تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ قبول کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص عربی سے نابلد ہو تو وہ کسی زبان میں نماز پڑھ سکتا ہے[3] لیکن ایک نہایت معقول وجہ ہے جس کی بنا پر نماز کو عربی میں ادا کرنے کا قاعدہ، جہاں تک ممکن ہو، جاری رکھا جانا چاہیے۔ وہ وجہ یہ نہیں کہ عربی پیغمبرِ اسلام ﷺ کی زبان تھی، بلکہ یہ کہ وہ اسلام کی زبان بن گئی ہے اور ایک ایسا رشتہ ہے جو ساری اسلامی دنیا کو مربوط کئے ہوئے ہے۔ آخر وحدت سے بڑھ کر قوت کس چیز میں ہو سکتی ہے؟

نوٹ نمبر ۱

شارحِ اسلام نے اسراف کے بارے میں جو امتناعی احکام صادر کئے انہیں دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی کیفیتی۔ کھانے پینے میں بے اعتدالی کی ممانعت اور اسی طرح کی اور ممانعتیں موخر الذکر قسم کی ہیں۔ یہ کسی حد تک تو اس لیے ضروری سمجھی گئیں کہ زوال رسیدہ شامیوں اور رومیوں سے میل جول کے باعث عربوں میں ایک نیم مہذب قسم کی لذت پرستی پھیل گئی تھی اور کسی حد تک چند ایسے حالات کی بنا پر جن کی جھلکیاں مجمل

---

[1] حضرت سلمان فارسی، جن کی جان حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شیر ببر سے بچائی تھی، پہلے شخص تھے جنہیں یہ اجازت دی گئی۔

[2] جواہر الاخلاط، در المختار، باب الصلوٰۃ۔ یہی رائے تجنیس میں بھی ظاہر کی گئی ہے۔ تحتاوی کہتا ہے کہ امام کی رائے مستند اور واجب التقلید ہے۔ شارح در المختار بھی فارسی میں نماز ادا کرنے کو جائز خیال کرتا ہے۔

[3] علمائے حاضر اس کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ کسی اور زبان میں نماز پڑھنے کی اجازت صرف ایسے شخص کو ہے جو عربی الفاظ کا تلفظ ادا نہ کر سکتا ہو۔ اس تاویل کی کمزوری واضح ہے۔

طور پر ہمیں قرآن میں ملتی ہیں۔ جہاں تک سور کے گوشت کا تعلق ہے اس کی ممانعت، جو کیفیتی قسم کی تھی، صحت کے ملاحظات کی بنا پر کی گئی۔ ناچ کی ممانعت بالخصوص رندانہ و اوباشانہ رقصوں کے بر خلاف تھی جن کے ذریعے مشرکین عرب اپنے شامی و فینقی دیوتاؤں اور دیویوں (یعنی عشتورث Ashtrot) مولوخ(Molock)اور بعل(Boal) کی پوجا کیا کرتے تھے۔

تیسرا باب

اِسلام میں حیات بعد الممات کا تصور[۱]

یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۝ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۝ وَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۝

"اے نفسِ مطمئنہ، اپنے رب کی طرف لوٹ چل: تو اس سے اور وہ تجھ سے راضی۔ پھر میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

(الفجر ۲۷، ۲۸، ۲۹)

ایک آئندہ زندگی کا تصور، یعنی ایک ایسی زندگی کا تصور جو ہماری ترکیب فطری کے زندہ رہنے والے اور فنا ہو جانے والے اجزا کی علیحدگی کے بعد شروع ہوگی، دنیا کی بہت سی قوموں میں، جو اور باتوں کے لحاظ سے ایک دوسری سے بالکل مختلف ہیں، بڑی حد تک مشترک ہے۔ اس بنا پر یہ عقیدہ عام ہے کہ یہ تصور طبع انسانی کے اول اور بنیادی عناصر میں ہوگا۔ لیکن جب ہم مختلف نسلوں اور قبیلوں کے زمانہ طفولیت کا زیادہ غور

---

[۱] اس باب کو پڑھنے سے پہلے چند اشارات کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ مصنف نے موت کے بعد کے کوائف کی جس انداز میں تشریح کی ہے، وہ انداز ان کا اپنا ہے۔

۲۔ قرآن حکیم کا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اُس نے اخروی زندگی کے بارے میں جن حقائق کی نقاب کشائی کی ہے، وہ بالکل نئے اور اچھوتے ہیں یا اُن پر دنیا کے مختلف گوشوں میں غور و فکر نہیں ہوا ہے، اور انسانی فکر نے اس ضمن میں کوئی ارتقائی قدم نہیں اُٹھایا ہے قرآن کا منشا محض یہ ہے کہ جو لوگ اس دنیا میں اس کی مادی وحشی لذات کے لیے وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔ انہیں یقین دلائے کہ اگر تم یہاں رہ کر ایمان وعمل کے تقاضوں کو پورا کرتے ہو تو تمہیں آخرت میں اس سے کہیں بہتر اور مکمل زندگی عطا کی جائے گی۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

سے جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک زندگی و مستقبل کا تصور اگر جبلت انسانی میں مضمر ہے تو دوسری طرف وہ نفسِ انسانی کے قدرتی ارتقا کی پیداوار بھی ہے۔

غیر متمدن وحشی کو اس کا سان گمان بھی نہیں کہ جو زندگی وہ اس زمین پر بسر کر رہا ہے اُس کے علاوہ اور اس سے مختلف کوئی اور زندگی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ موت کو ہستی کا خاتمہ سمجھتا ہے۔ اس کے بعد ایک ایسا دور آتا ہے جب انسان اپنے ابتدائی دورِ وحشت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۸) ۳۔ جنت اور اس کی حسی کیفیات کے بارہ میں تاویل و تعبیر کے دو مسلمہ اصول۔ رائج ہیں۔ ایک گروہ نے ان لذات و احوال کو اس بنیاد پر حقیقی قرار دیا ہے اور ظاہر پر محمول کیا ہے کہ انسانی "انا" میں زندگی کے یہ دونو رُخ موجود ہیں اور حسی و معنوی دونو پہلو اس دانا، کے ایسے اجزائے ترکیبی ہیں کہ تجویہ کے کسی بھی مرحلہ میں ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محدثین اور سلف کا تصور ہے۔ عقلیت پسند گروہ نے ان کو ایسے معانی سے تعبیر کیا ہے جن کو محض سمجھانے کے لیے حسیات کی اصطلاحوں میں بیان کیا گیا ہے۔ دونوں گروہ اس بات پر متفق ہیں کہ اصل مقصود رضائے الٰہی کا حصول ہے اور یہی وہ سب سے بڑی نعمت ہے جس سے اہلِ ایمان جنت میں بہرہ مند ہوں گے۔

۴۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ جنت میں جن حسی لذات کا ذکر آیا ہے وہ صرف مکی سورتیں ہیں اور یہ سورتیں اس وقت نازل ہوئیں جب کہ شعور اُمت پختہ نہیں ہوا تھا۔ یہ درست ہے کہ قرآن حکیم میں اُمت کے شعوری ارتقا کا برابر خیال رکھا گیا ہے۔ جسے ہم تدریج و تسہیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کا تعلق احکام و شوریٰ کے نفاذ سے ہے۔ اصول و عقائد سے نہیں۔ عقائد و اصول اس کے بغیر واضح کر دیئے گئے ہیں اور ان میں اول سے آخر تک کہیں جھول یا اجمال پایا نہیں جاتا۔ چنانچہ جس طرح مکی سورتوں میں جنت کی نعمتوں کا تذکرہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح مدنی سورتوں میں بھی ان کا بیان ہے۔

۵۔ نبوت کے بارہ میں اس حقیقت کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اس کے معنی یہ نہیں کہ بعض حساس اور پاکباز ہستیاں اپنے وجدان تاثرات کو دیانتداری کے ساتھ وحی کے روپ میں دیکھتی ہیں اور اپنے دور میں پھیلی ہوئی اجتماعی سچائیوں کو اپنے دامن فکر میں سمیٹ اور جوڑ کر متعین دعوت کی شکل میں ڈھال دیتی ہیں۔ جیسا کہ ایک مدرسہ فکر کہتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے انبیا علیہم السلام کی بعثت اللہ تعالیٰ کے نظام ربوبیت کا کرشمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کو مخلوق کی اصلاح کے لیے چنتا ہے۔ وہی ان کے قلب و ذہن کی پرورش کا اہتمام کرتا ہے اور وہی رشد و ہدایت کی ارزانی بھی فرماتا ہے۔ ان کا دل وحی الٰہی کا مہبط قرار پاتا ہے اور زبان حق کی ترجمان۔ انہیں یہ اختیار قطعی نہیں ہوتا کہ اپنی طرف سے کوئی بات کہیں۔ یہ اپنے دور کی اجتماعی و فکری سچائیوں کے بارہ میں بلاشبہ ایک متعین موقف رکھتے ہیں لیکن اس میں ان کے ذاتی انتخاب کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ خود ربوبیت کا یہ تقاضا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنے عہد کی جملہ صداقتوں کی تصدیق کریں اور ان کو ایک بہترین امتزاج کی شکل میں پیش کریں۔

سے گزر چکتا ہے۔ اب اُس کی اُمیدیں اور آرزوئیں اس کی ارضی موت کے نقطے پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتیں، بلکہ اسے اپنی موجودہ زندگی کے مکمل ہو جانے کے بعد ایک اور زندگی کی توقع ہوتی ہے۔ لیکن اس دور میں بھی جس قسم کی بقائے دوام کا تخیل انسان کے ذہن میں ہوتا ہے وہ اس کی روزانہ زندگی کے لگے بندھے نقشے سے مختلف نہیں ہوتی بلکہ اسی زندگی کی ایک توسیع ہوتی ہے۔ قبر سے ماورا سلسلہ زندگی کے برقرار رہنے کا یہ خیال غالباً روحِ انسانی کی اس خواہش سے، جو ابھی تک غیر شعوری تھی پیدا ہوگا کہ کاش ایک ایسا وسیع تر عرصۂ وجود ہو جس میں اعزہ و اقربا سے جدائی، جو وحشی انسان اور متمدن انسان دونوں کے لیے المناک ہوتی ہے، اُن سے دوبارہ ملاقات میں تبدیل ہو جائے۔

اس کے بعد کا مرحلہ جلد ہی آجاتا ہے: انسان کے دل میں یہ عقیدہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی موجودہ خوشیوں اور غموں ہی پر ختم نہیں ہو سکتی، بلکہ موت کے بعد ایک اور زندگی بھی ہوگی بلکہ یقیناً ہے جس میں اس کو وہ خوشیاں اور وہ غم نصیب ہوں گے جن کا وہ مستحق ہے۔

یہاں پہنچ کر انسان نے ایک اصول یا قانون کا انکشاف کیا۔

لیکن ذہنِ انسانی ایک حیاتِ مستقبل کے تصور کی مزید نشوونما سے قاصر رہتا ہے۔ فلسفۂ عدمیت و انکاریت کوئی نیا انکشاف نہیں کرتا، کوئی نیا موقف اختیار نہیں کرتا۔ وہ محض ہمارے وحشی آبائے اولین کی لکیر کی فقیری کرتا ہے جن کا دائرہ نظر صرف موجودہ زندگی تک محدود تھا۔

بہر کیف یہ ایک مستند امر ہے کہ حیات بعد الممات سے متعلق مختلف خیالات، جو ایک معروضی نقطہ نگاہ سے انسانی ذہنیت کے ارتقاء کے مختلف مراحل کی نمائندگی کرتے ہیں، نہ صرف مختلف قوموں کے یہاں بلکہ ایک ہی قوم کے یہاں ہر قوم کی انفرادی نشوونما کے مطابق بیک وقت مختلف مجموعہ ہائے افکار کی صورت میں موجود نظر آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مصری پہلے لوگ تھے جنہوں نے حیات بعد الممات کا نظریہ تسلیم کیا، یا کم از کم کردار انسانی کے اصولوں کی بنیاد اس نظریئے پر رکھی۔ انہوں نے تناسخِ ارواح اور آئندہ زندگی میں جزا و سزا کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ

انسان قبر میں داخل ہوتے ہی پھر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ایک نئی زندگی شروع کر دیتا ہے جس میں اس کا رفیق و رہنما آفتاب ہوتا ہے جو تکوین کا اصل الاصول اور تمام موجودات کا قائم بالذات سبب ہے۔ان کے نزدیک آفتاب کی طرح انسان کی روح بھی غیر فانی تھی اور اسی کی سی منازلِ سفر طے کرتی تھی۔تمام اجسام عالمِ سفلی میں داخل ہو جاتے تھے، لیکن حشر یعنی دوبارہ اُٹھ کھڑا ہونا معدودے چند ہی کو نصیب ہوتا تھا۔مری ہوئی روحوں کی نیکی و بدی کا فیصلہ اوسائرس دیوتا اور اس کے بیالیس مشیروں کے ہاتھ میں تھا۔فنا کی سزا صرف اُن روحوں کو ملتی تھی جو گناہگار پائی جاتی تھیں۔جہاں تک نیک روحوں کا تعلق تھا وہ صغیرہ گناہوں سے پاک ہو کر کامل راحت کے عالم میں داخل ہو جاتی تھیں اور اوسائرس انہیں اپنے ہمرکابوں کی حیثیت سے لذیذ نعمتیں مہیا کرتا تھا۔

ہمیں قدرتی طور پر توقع ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل نے مصر میں ایک مدتِ مدید تک قیام کرنے کی بدولت مصریوں سے حیاتِ بعد الممات کا تصور اور اس کا تلازمہ یعنی جزا و سزا کا عقیدہ اکتساب کر لیا ہوگا۔لیکن خالص موسویت (یا یوں کہیے کہ وہ تعلیم جو اس لقب سے ملقب کی جاتی ہے) موجودہ زندگی سے مختلف کوئی زندگی تسلیم نہیں کرتی۔وہ محور جس پر شریعت موسوی کا سارا نظام گردش کرتا ہے محض ارضی جزا و سزا پر مشتمل ہے۔اس شریعت میں عنصر حیات بہت ہی کم ہے۔

حشر اجساد کا نظریہ اور اس سے پیدا ہونے والے افکار جن کا ظہور بعد کی یہودیت میں (اور بالخصوص حضرت دانیال اور حزقی ایل کی تصنیفات میں) ہوا بداہتہ ایک ثمر دیر رس ہے جو مذہب زرتشتی سے حاصل کیا گیا۔اور تو اور شئول یعنی وہ عالمِ برزخ جہاں دنیا سے کوچ کرنے والی روحیں، عام اس سے کہ وہ نیک ہوں یا بد، کچھ مدت تک رکھی جائیں گی، اگرچہ نسبتہً ابتدائی تحریروں میں مذکورہ ہے، لیکن اس کے جو نقشے ان تحریروں میں دے گئے ہیں وہ عبرانی الاصل معلوم نہیں ہوتے۔شئول میں انسان نہ خدا کی تسبیح کر سکتا ہے نہ اس کی محبت و شفقت اُسے یاد آسکتی ہے۔

شئول پرچھائیوں کی ایک دنیا ہے، یعنی غیر اہلِ کتاب کے عالمِ اسفل کا یہودی مثنیٰ، جس میں روحیں ایک ایسی کاہلانہ لیکن بے آرام زندگی بسر کرتی ہیں جس پر مردنی سی

چھائی ہوتی ہے۔ انہیں اُن لوگوں کا جو دنیا میں انہیں عزیز تھے کوئی علم نہیں ہوتا اور وہ دن رات اپنی ہی حالت پر نالہ وشیون کرتی رہتی ہیں۔

لیکن زمانہ مابعد کی یہودیت زندگی مستقبل کے بارے میں ایک نہایت قوی ایمان سے معمور ہے۔ روایت لطف لے لے کر روحانی مسرت کے مقامات کی کیفیتیں اور ملعون روحوں کے عذابوں کی روئیدادیں بیان کرتی ہے۔ چنانچہ زرتشتی مذہب نے عبرانی قوموں پر دو طریقوں سے عمل کیا۔ اس نے نہ صرف انہیں حیاتِ بعد الممات کے ایک زیادہ خالص اور زیادہ روحانی تصور سے روشناس کیا بلکہ مجوسی زرتشتیت نے جو خود کلدانیت کا ایک ماحصل تھی، یہودی ربانیوں کے عقائد پر عقبیٰ میں جزاؤں اور سزاؤں کے ایک مادی تصور کا گہرا رنگ چڑھا دیا۔ بہر حال یہ امتیاز مشرق کی آریائی قوموں کو حاصل ہے کہ انہوں نے موت کے بعد کی زندگی کا ایک واضح اور بین تصور پیش کیا۔ آریائی خاندان کی ایک شاخ کے یہاں اس نے یا تو ایک لامتناہی تناسخ یعنی موت اور پیدائش کے ایک کبھی نہ تھمنے والے چکر کی صورت، یا ایک طویل امتحان کے بعد ایک مطلق لامتناہیت میں یا ایک بے پایاں وبیکراں وسعتِ مکانی میں یا عدمِ محض میں جذب ہو جانے کی صورت اختیار کی[1]۔

دوسری شاخ نے اس تصور کو جزاؤں اور سزاؤں کے ایک سلسلۂ مدراج کی شکل بخشی، انہی معنوں میں جن میں جدید عیسائیت اور اسلام کے نزدیک جزا و سزا اس امر کا نتیجہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے۔ یہ ایک متنازعہ فیہ سوال ہے کہ مجوسی زرتشتی شروع ہی سے حشر اجساد پر ایمان رکھتے تھے یا نہیں۔ ڈولنگر برنوف اور متعدد محققین کا خیال ہے کہ یہ تصور اصل میں زرتشتی نہیں بلکہ یا تو عبرانیوں سے ماخوذ ہے یا زمانہ مابعد کی پیداوار ہے۔

حقیقتِ حال جو کچھ بھی ہو، رسولِ عربی کی بعثت کے وقت ایرانیوں کے یہاں

---

[1] برہمن پروہتوں نے دوزخ کے عذابوں اور جنت کی لذتوں کا نقشہ ایک بیمار تخیل کی محاکاتی وضاحت کے ساتھ کھینچا۔ شہرستانی نے بدھ کے عقائد کی (اتنی حیاتِ معاد کے بارے میں نہیں جتنی بالعموم) جو داد دی ہے عربی دان حضرات کو اُس کی دعوتِ مطالعہ دی جاتی ہے۔

آئندہ زندگی کا ایک قوی اور ارتقاء یافتہ تصور موجود تھا۔ ژنداوستا کے جو بقیۃ الدہر حصے ہم تک پہنچے ہیں، ان میں مستقبل کی جزاؤں اور سزاؤں کے بارے میں عقیدہ صاف طور پر پایا جاتا ہے۔ وندیداد اور بندہیش کے مذہب زردشتی میں، جو اوستا کے عقائد پر ایک اضافہ ہے، یہ خیال ملتا ہے کہ انسان کی موت کے بعد دیو اُس کے جسم پر قابض ہو جاتے ہیں لیکن تیسرے دن شعور عود کر آتا ہے وہ روحیں جو اپنی ارضی زندگی میں بدی کے دام تحریص میں گرفتار رہ چکی ہیں چنیواد کا وہ پل پار نہیں کر سکتیں جہاں انہیں موت کے تیسرے دن کے بعد لے جایا جاتا ہے۔ نیک روحیں، جن کی رہبری ''یزت'' یا جدید فارسی میں ایزد کرتا ہے اسے یاد کر لیتی ہیں اور اقلیم سعادت میں داخل ہو جاتی ہیں، جو ہرمزد اور امشسپندوں کا مسکن ہے وہاں وہ سونے کے تختوں پر بیٹھ کر حورانِ بہشتی کی صحبت سے اور طرح طرح کی اور نعمتوں سے لذت اندوز ہوتی ہیں۔ برے لوگ پل پر سے گر کر دوزخ کے دریا میں جا پڑتے ہیں، جہاں دیو اُن کو قسم قسم کی اذیتیں پہنچاتے ہیں۔ اس عذاب کی مدت ہرمزد کے حکم سے مقرر ہوتی ہے، لیکن بعض روحوں کو اپنے عزیزوں کی دعاؤں اور شفاعتوں کے طفیل نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ جب دنیا کا خاتمہ قریب ہوگا تو ایک پیغمبر آ کر دنیا کو ظلم و شر سے پاک کرے گا اور انسانوں کو راحت و مسرت کی ایک نئی زندگی بخشے گا۔ یہ ہے زردشتیوں کی بہشت اور ہرمزد کی آسمانی بادشاہت [1] اس کے بعد ایک عالمگیر حشر برپا ہوگا، جس کی بدولت بچھڑے ہوئے رشتہ دار اور عزیز پھر ایک دوسرے سے ملیں گے۔ لیکن اس ملاقات کی خوشی نہایت مختصر ہوگی، کیونکہ فوراً ہی نیکوں اور بدوں کی چھانٹ شروع ہو جائے گی اور وہ ایک دوسرے سے جدا کر دیئے جائیں گے۔ گناہگاروں کو جو عذاب دیا جائے گا وہ نہایت ہیبت ناک ہوگا۔ اہرمن اضطراب و پریشانی کے عالم میں چنیواد کے پل پر دوڑتا پھرے گا۔ ایک بھڑکتا ہوا دمدار ستارہ زمین پر گر کر اُسے آگ لگا دے گا۔ پہاڑ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح بہنے لگیں

---

[1] شہرستانی اس پیغمبر کو اُشیزریکا کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ دیکھئے کیورٹن کا ایڈیشن صفحہ ۱۸۸، لیکن مغربی مصنفین کے قول کے مطابق اس کا نام سوشیوش تھا اور اس سے پہلے دو اور پیغمبروں کو آنا تھا جن کے نام اُشیدربامی اور اُشیدرماہ تھے۔ (ڈولنگر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۰۱۔ وساسی اُسے لیشوتن کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

گے۔ سارے انسان بلاتمیز نیک و بد، اس آتشیں سیلاب میں سے گزر کر پاک ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ خود اہرمن ڈھل ڈھلا کر کچھ کا کچھ ہو جائے گا اور دوزخ کی بھی ایک نئی صورت نکل آئے گی۔ اُس وقت سے برائی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا اور ساری نوعِ انسانی ایک نا قابلِ بیان راحت و انبساط کی زندگی بسر کرے گی۔ یہ ہے خلاصہ ان آرا کا جنھوں نے سامی افکار و خیالات پر اثر ڈالا۔

یسوعِ ناصری کے ظہور کے وقت فینقی اور آشوری رخصت ہو چکے تھے اور دنیا پر یونان کے مقلد رومیوں کی حکومت تھی۔ البتہ مشرق میں مجوسی زردشتیت کے احیا و عروج نے اُسے پھیلنے سے روک رکھا تھا۔ یہودی ہمیشہ کے لیے اپنی آزادی و خود مختاری کھو بیٹھے تھے۔ داؤد کے تخت پر ایک ذلیل خوشامدی متمکن تھا۔ سلیو کی یونانیوں، سے ایک زیادہ بڑی قوت نے اس کی انتشار انگیزی کو مسخر کر رکھا تھا۔ جیسے جیسے یہودیوں پر تیرہ بختی کے بادل چھا گئے، ویسے ویسے ہر اس قوم کی طرح جسے اپنے ملک، اپنے مذہب اور اپنی شخصیت سے زبردست محبت ہوتی ہے وہ اس اُمید کو اپنے سینوں میں راسخ تر کرتے چلے گئے کہ گیدیون یا میکابیس کی قسم کا کوئی مبعوث من اللہ مردِ کامل ان کی عظمتِ رفتہ کو واپس لے آئے گا اور انہیں اس کی توفیق بخشے گا کہ وہ اپنے مختلف و متعدد ایذا رسانوں پر غالب آئیں[1]۔ ایک مسیحا کے ظہور کا جو نقشہ اُن کے تمام وطن پرست اہلِ نظر اور شعرا نے شوخ رنگوں میں کھینچا تھا اس کا پس منظر ایک مہتمم بالشان آرزو تھی، یعنی حکومت اسرائیل کا از سرِ نو قیام۔ مشرق میں مجوسی زردشتیوں اور کلدانیوں کے زیرِ اثر اور مغرب میں یونانی فلسفے کے دبستانوں کے زیرِ اثر بعض بعض طبقوں میں اثر (اور بالخصوص ان طبقوں میں جنہیں ہیرودوس کی یونانیت نوازی نے اسرائیل کے دامن سے علیحدہ کر دیا تھا) ایک شخصی مسیحا پر اعتقاد مبہم اور غیر واضح سا تھا، یا عوام الناس کے خیالات کی محض ایک صدائے باز گشت تھا۔ لیکن جیسا کہ مل من، نے نہایت عمدہ پیرائے میں کہا ہے، فلسطین کے یہودیوں نے اس زمانے کے لگ بھگ مختلف عناصر سے ظہورِ مسیحا کا تمام اشیاء کی نشاۃ ثانیہ کا،

[1] ہجر کا یہ مفروضہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ چونکہ یہودی اُن قومی مقاصد کی تکمیل کی خاطر ایلیاہ یا کسی اور نبی کے ظہور کے لیے چشم براہ تھے، اس سے ہمیں یہ نتیجہ اخذ کر لینا چاہیے کہ وہ تناسخ کے قائل تھے۔

مردوں کے زندہ ہو جانے کا اور مسیحا کی بادشاہی کے ساری دنیا پر تسلط کا ایک شاندار اگرچہ قدرے دھندلا تصور وضع کر لیا تھا۔ اُن کا اعتقاد تھا کہ یہ سارے واقعات بیک وقت یا فی الفور یکے بعد دیگر رونما ہوں گے۔ مسیحا نسلِ داؤد سے ہوگا۔ وہ سارے قبیلوں کے منتشر افراد کو جمع کرے گا اور ان کے سارے قابلِ نفرت غیر ملکی دشمنوں کو تباہ کر دے گا۔ مسیحا کے زیرِ سایہ ایک حشرِ نو برپا ہوگا، لیکن اس میں صرف بنی اسرائیل کے نیک افراد دوبارہ اُٹھائے جائیں گے[1]۔ بے چین اُمنگوں اور مبہم آرزوؤں کے اس ہنگامے میں حیاتِ جاودانی اور سعادتِ آئندہ کی اُمیدیں ایک عجیب و غریب طریقے سے خلط ملط ہو گئیں۔ مایوسی کی انتہا اور خارجی امداد کی پر جوش اُمیدیں عموماً لوگوں کے ذہنوں میں اسی قسم کی کیفیت پیدا کیا کرتی ہیں۔ ایک طبقہ ایک آسمانی بادشاہی کے خواب دیکھنے لگتا ہے جس میں خدائی اہتمام کے تحت امن و امان اور آئین و قانون کا دور دورہ ہوگا اور اس کے طفیل اُسے بےپناہ قوتوں کے پنجے سے رہائی نصیب ہوگی۔ دوسرے طبقے کے دل میں یہ اُمید ہوتی ہے کہ وہ غیر ملکیوں اور کافروں کے خون کی بھینٹ چڑھا کر ایک آسمانی بادشاہت حاصل کرے گا[2]۔

---

[1] زردشتیوں کے یہاں ایک آزادی دلانے والے اور روئے زمین پر مذہب اور امن و امان کو نئے سرے سے مسلط کرنے والے کے بارے میں جو تصور ہے اور یہودیوں کے یہاں جو تصورِ مسیحائی ہے ان دونوں کی باہمی مشابہت حیرت انگیز ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ یہودیوں نے یہ تصور زردشتیوں سے مستعار لیا اور اپنے مصائب و آلام کے دوران اس پر گہرے رنگوں سے حاشیہ آرائی کی، لیکن میرا قوی قیاس ہے کہ ایرانیوں کے یہاں سوسیوش کا جو خیال تھا، اس میں پیغمبری کا کوئی مفہوم مضمر ہو یا نہ ہو، وہ ان کے اندر اس زمانے میں پیدا ہوا جب ان کے کندھوں پر غلامی کا جوا تھا۔ اگرچہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ غلامی سامی النسل اسوریوں کی تھی یا یونانی مقدونیوں کی۔ وہ ملک جس میں سوشیوش کا ظہور ہوتا تھا، دساسی کے خیال میں خراسان کا علاقہ کنگودیز اور ڈولنگر کے خیال میں کنسویہ تھا۔ یہ دونوں علاقے ایران کے مشرق میں واقع ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اپنے ادبار و نکبت کے زمانے میں ایرانیوں کی نظریں مشرق اور بالخصوص شمس دیوتا پر جمی ہوئی تھیں، جہاں سے انہیں دستگیری و رستگاری کی اُمید تھی۔

[2] اس کی مثال عیسائیوں کا وہ جدید لیکن غیر معروف فرقہ ہے، جو کرسٹا ڈیلفین Christa Delphion کہلاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات کے بارے میں جو روایات ہیں ان پر تخریج و انتخاب کا عمل اس شدت سے ہوا ہے کہ یہ کہنا ناممکن ہے کہ ان میں سے کون کون سی ان کے اصلی الفاظ کو پیش کرتی ہیں اور کون کون سی نہیں کرتیں[1]۔ لیکن وہ بصورت موجودہ جیسی دوسری مذہبی تحریروں پر ڈالی جاتی ہے (یعنی ان کے اصلی منشاء کو نظر انداز نہ کریں، لیکن یہ بھی نہ کریں کہ اندھا دھند اعتقاد رکھنے والوں کی طرح اُن میں مخفی معانی ڈھونڈیں) تو ہم دیکھتے ہیں۔ روائتوں کے اس سارے دفتر میں ایک نئے نظامِ اشیاء یعنی ایک آسمانی بادشاہت کے فوری صدور کا تخیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذہن پر اس حد تک مستولی ہے کہ وہ باقی تمام خیالات کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ ابن آدم کا ظہور ہو چکا ہے۔ خدا کی بادشاہت قریب آ پہنچی ہے: یہ ہے ان تمام تحریروں میں ٹیپ کا بند۔ یہ بادشاہت اس معاشرے اور اس حکومت کا نعم البدل تھی جو نبیٔ ناصری کو اپنے سامنے موجود دکھائی دیتی تھی اور جسے وہ بے حد ناقص اور خراب پاتا تھا۔ کبھی کبھی اس نئے معلم کے الفاظ سے اس کے حواری یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ وہ صرف غریبوں اور بھوکے ننگوں کو شان و شوکت اور راحت و مسرت بخشنے کے لیے آیا ہے، یعنی جس خدائی سلطنت کی وہ اُمید دلاتا ہے اس کے زیرِ سایہ صرف یہی لوگ سعادت و برکت اور غلبہ و اقتدار کے مالک ہوں گے، کیونکہ

---

[1] مل مین اقرار کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے افعال و اقوال کے بارے میں جو روایات عیسائی جماعتوں میں رائج تھیں وہ کہیں دوسری صدی کے نصب اوّل کے اختتام پر جا کر اپنی موجودہ صورت کے سانچے میں ڈھالی گئیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ عیسوی انجیلوں کے قدیم جامعین و مؤلفین نے، یا مل مین کے الفاظ میں مبتدی اور سیدھے سادے مورخین نے، روایات کے رد و قبول میں اپنی ذاتی رائے سے کام لیا ہوگا۔ اُن کے فیصلے یقیناً انکل پچو اور من مانے ہوں گے۔

اگر انہوں نے کسی واقعے یا تحریر کو لب و لہجہ اور مضمون کے اعتبار سے اپنے خود ساختہ خیالات کے موافق پایا تو ناقص خارجی شہادت کو بھی کافی و وافی سمجھا۔ اور اگر نہ پایا تو مستند سے مستند شہادت کو بھی غلط فہمی پر مبنی کہہ کر رد کر دیا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال و افعال میں غیر شعوری طور پر ہی سہی، بہت سے اضافے ہو گئے اور اس موضوع پر سلیس کی یہ شہادت کہ عیسائی اپنی روائتوں میں ایجاد و ایزاد اور تصریف و تحریف کے عادی تھے، مبالغے کی پوری پوری گنجائش چھوڑ کر فیصلہ کن سمجھی جانی چاہیے اور یہ ان اصولوں پر مبنی ہے، جو سر ولیم میو نے اپنی کتاب سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں قائم کیے ہیں۔

وہ خوف انگیز الفاظ میں امیروں اور شکم سیروں کی بابت غم واندوہ کی پیشگوئیاں کرتا تھا۔ دوسرے مواقع پر خدا کی ولایت مسیحائے موعود کے ظہور کے بارے میں مکاشفوں کی لغوی تعبیر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ خدا کی بادشاہت روحوں کی ایک اقلیم ہے اور آنے والی نجات محض اس مادی زندگی کے بندھنوں سے روحانی آزادی کا نام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ایسا تھا جب سارے تصورات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذہن میں ایک ساتھ جمع تھے۔ بہرحال حکمران طبقے کی تندخوئی اور تعصب پرستی اور عقابِ رومی کی صولت وقوت کے پیشِ نظر کوئی معاشرتی تغیر خیال محال تھا۔ جیسے جیسے حالات کے فوراً بہتر ہو جانے کی اُمیدیں فوت ہوتی گئیں، ویسے ویسے ایک روشن تر مستقبل کی اُمیدیں اور آرزوئیں دلوں پر قبضہ جماتی گئیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عندیہ یہ تھا کہ موجودہ صورتِ حال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی اور انسان کی تخلیق نو کا وقت آپہنچا ہے[1]۔ جب وہ نفس نفیس لباس نورانی زیب تن کیے ہوئے، ایک تخت شاہانہ پر بیٹھے، فرشتوں اور چیدہ چیدہ حواریوں کے حلقوں میں گھرے ہوئے آسمانوں کے بادلوں میں جلوہ نما ہوں گے۔

---

[1] متی۔ ب ۱۹۔ ۱۸۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حشر اجساد اور حیاتِ اُخروی میں جزا اور سزا کے معتقد تھے وہ ''سعادت مند'' لوگوں کا تذکرہ اکثر یوں کیا کرتے تھے کہ وہ اُن کے خوانِ نعمت پر بیٹھے خورد و نوش میں مصروف ہیں۔ اگرچہ ابتدائی روایات میں، جو ان کے چار بڑے حواریوں سے منسوب ہیں، حیاتِ بعد الممات کے نقشے کاٹ چھانٹ کی بدولت بہت مختصر ہیں، لیکن بعد کے راویوں نے جنت و جہنم کے ان ابتدائی خاکوں میں خوب خوب رنگ بھرے اور لطف لے لے کر عجیب و غریب خیال آرائیاں کیں، جنہیں مکاشفوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جہاں تک زٹل ہانکنے کا تعلق ہے، عیسائی اہل روایت دوسرے مذاہب کے اہل روایت سے پیچھے نہیں رہے۔ ارینیوس نے ایک روایت میں حضرت یوحنا کی سند پر ذیل کے الفاظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیے ہیں: ''ایسے دن آئیں گے جب انگور کی بیلیں ہوں گی، جن میں سے ہر ایک کی دس ہزار شاخیں ہوں گی، اور ان شاخوں میں سے ہر شاخ کی دس ہزار مزید شاخیں ہوں گی اور ان شاخوں میں سے ہر ایک کے دس ہزار شاخچے ہوں گے اور ان شاخچوں میں سے ہر ایک میں انگوروں کے دس ہزار خوشے ہوں گے اور ہر خوشے میں دس ہزار انگور ہوں گے، اور ہر انگور میں سے دو سو پچھتر گیلن شراب نکلے گی اور جب کوئی شخص ان مقدس خوشوں میں سے ایک خوشہ چنے گا تو ایک دوسرا خوشہ پکار اُٹھے گا'' میں بہتر خوشہ ہوں مجھے چن اور میرے اوپر خدا کی حمد و ثنا کر۔'' وغیرہم۔

مُردے اُٹھ کر قبروں سے نکل آئیں گے۔ اور مسیحا کرسیٔ عدالت پر رونق افروز ہوگا۔ فرشتے اُن کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے پر مامور ہوں گے۔ وہ برگزیدہ لوگوں کو ایک نہایت عمدہ مسکن ہیں، جو ابتدائے آفرینش سے تیار کر کے رکھا گیا ہے بھیجے گا اور بدکار لوگوں کو دائمی آگ میں جھونک دے گا، جو شیطان اور اس کے ساتھیوں کے لیے جلا رکھی گئی ہے۔'' اور جس میں جھونکے جانے والے گریہ وزاری کیا کریں گے اور اپنے اوپر غصے کے مارے دانت پیسا کریں گے۔ برگزیدہ لوگ، جن کی تعداد بہت تھوڑی ہوگی، ایک ایسے محل میں رکھے جائیں گے جو روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا ہوگا۔ وہاں انہیں ضیافتیں دی جائیں گی، جن میں بنی اسرائیل کا جد امجد اور بزرگان و انبیاء اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام شریک ہوں گے۔

اس نئی سلطنت کا قیام، جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور ثانی اور نوعِ انسانی کی رستخیز کے ساتھ ہی ساتھ رونما ہونا تھا، زیادہ دور نہ تھا۔ یہ امر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس اعلان سے ظاہر ہے جو انہوں نے ایک مجمع کے سامنے کیا کہ خدا کی بادشاہت عنقریب قائم ہونے والی ہے، اور اس لیے موجودہ زندگی کی مصروفیتوں اور ضرورتوں کے لیے ساز و سامان مہیا کرنا بالکل بے کار ہے۔

اسی وقت کے حالات نے جو عام کیفیت دماغی پیدا کر رکھی تھی اس کی سان پر چڑھ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یہ الفاظ تیز نشتروں کی طرح اُن کے حواریوں اور شاگردوں کے دلوں میں کھب گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سلطنتِ مسیح کی بابت بشارتوں کی لفظ بہ لفظ تعبیر کا ایک ایسا واضح نقشہ مآل تیار کر رکھا تھا جس کی اس سے بہتر نظیر عقائدِ انسانی کی تاریخ میں نایاب ہے۔

''اگر اوّلین عیسائیوں کے دلوں میں کوئی عمیق اور مستقل عقیدہ تھا تو وہ یہ تھا کہ دنیا اپنے اختتام کے قریب پہنچ رہی تھی اور مسیح کا مکاشفہ بہت جلد واقع ہونے والا تھا۔'' جب عیسوی کلیسا کی باقاعدہ تنظیم ہوگئی تو اس وقت کہیں جا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے اپنے افکار و خیالات کو یہودی دنیا کے محدود اُفق کے باہر پھیلایا اور ایک سلطنت معہور کے خوابوں سے مخلی بالطبع ہو کر یونانی و رومی معاشرے میں جذب ہو گئے اور اپنے مذہب

کی قلمرو کو لاتعداد وحشیوں اور بربروں پر مسلط کیا، جو جنگلوں سے نئے نئے باہر آئے تھے اور جن کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی ماں دونوں ان کے اپنے دیوتا اوڈن اور اس کی ماں فریا کے مماثل وثنیٰ تھے، جن کی پرستش وہ اپنے قدیم مرزبوم میں کیا کرتے تھے۔

لیکن وقتاً فوقتاً، جب کبھی عیسائی دنیا میں کوئی ہیجان پیدا ہوا ہے یا اسے کوئی بڑی آفت پیش آتی ہے، ناصرہ کے عظیم پیغمبر کے معجزانہ ظہور ثانی کی اُمیدوں نے اس میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ لیکن خدا کی ولایت کا تصور مرورِ زمانہ اور فکرِ انسانی کی ترقی کے زیرِ اثر یا تو ایک روحانی سانچے میں ڈھل گیا ہے یا بالکل معدوم ہو گیا ہے۔ اگر کہیں وہ کسی حد تک باقی بھی ہے تو اس نے اپنے عقیدت مندوں کے ماحول کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ یہودی، مجوسی، زردشتی، عیسائی سب کے سب جسمانی رستخیز کے معتقد تھے۔ ابتدائی موسویت کے جو سیدھے سادے اور ناتراشیدہ خیالات تھے ان کی جگہ کلدانی زردشتیت سے اخذ کئے ہوئے زیادہ معین خیالات نے لے لی تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ ایرانیوں کے یہاں قدیم کوہستانی طرزِ پرستش اور ابتدائی معلموں کی سیدھی سادی تعلیم کیونکر جادوگران بابل کے کرشموں کی بدولت جزا و سزا کے ایک پیچیدہ نظام میں تبدیل ہو گئی، اور کلدانی فلسفہ کیونکر مجوسی زردشتیت کے بطون میں سرایت کر گیا۔ ابتدائی عیسائیت نے جو مسیح کی مادی بادشاہی کے فوری قیام پر مبنی تھی، کلدانی مجوسی زردشتی اور اسکندریائی منبعوں سے، جنہوں نے پرانے خیالات کو یکسر بدل ڈالا تھا، خیالات اخذ کیے۔ یہودی، عیسائی، زردشتی سب کے دلوں میں یہی توقع تھی کہ آئندہ زندگی میں اُنہیں مادی جزائیں اور سزائیں دی جائیں گی۔

عیسائیوں کے یہاں کلیسائیت کا پھیلایا ہوا یہ خیال کسی زمانے میں عام تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے نزدیک عورتیں روح سے معرا ہوتی ہیں، لیکن اب یہ خیال غالباً رفع دفع ہو چکا ہے۔ یہ ایک بہتان تھا جو اسلام سے نفرت پیدا کرنے کی خاطر باندھا گیا تھا۔ پھر بھی یہ خیال ابھی تک قائم ہے کہ رسولِ عربی ﷺ نے اپنے پیروؤں سے حسی لذات کی ایک جنت اور عیش و عشرت کے مختلف مدارج کا وعدہ کیا۔ یہ خیال بھی پہلے خیال کی طرح جہالت اور تعصب کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ درمیانی دور کی سورتوں میں، جب کہ

اس بات کی ضرورت تھی کہ عقبیٰ اور جزا و سزا کے تصورات کو ایسے الفاظ کا جامہ پہنایا جائے جو سیدھے سادے بادیہ نشینوں کی سمجھ میں آسکیں، جنت و جہنم کے واقعیت نما نقشے، جو زردشتیوں، صابیوں اور تلمودی یہودیوں کی پادر ہوا قیاس آرائیوں پر مبنی تھے، پڑھنے والے کی توجہ کی ضمنی حاشیہ آرائیوں کے طور پر اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ لیکن ان کے فوراً بعد قرآن کا جوہرِ خالص آتا ہے۔ یعنی کمالِ عجز و محبت سے خدا کی عبادت۔ حوریں زردشتی نژاد ہیں۔ اس طرح جنت بھی زردشتی الاصل ہے۔ البتہ جہنم عذاب الیم کے مقام کی حیثیت سے ایک تلمودی تخلیق ہے۔ ان کے جو منظر کھینچے گئے ہیں وہ مبنی بر واقعیت ہیں، بلکہ بعض بعض جگہ مبنی بر حسیت بھی ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ ان میں حس پرستی ہے یا یہ کہ حضرت محمد ﷺ یا ان کے متبعین میں سے ظاہر پسند نے بھی کبھی انہیں حس پرستی کے مظاہرے سمجھ کر قبول کیا ایک افترا ہے۔ وہ شراب "جو بدمست نہیں کرتی"۔ اور وہ حوریں جو "قریب نہیں آتیں" لذاتِ حسی کی علامتیں کیونکر ہو سکتی ہیں؟

اسلام میں آئندہ زندگی کا جو نمایاں ترین تصور ہے وہ اس عقیدے پر مبنی ہے کہ عقبیٰ میں ہر انسان کو ان اعمال کا حساب دینا ہوگا جو اس نے اپنی ارضی زندگی میں کیے اور اسے جو خوشی یا رنج نصیب ہوگا وہ اس پر منحصر ہوگا کہ اس سے اپنے خالق کے احکام کی بجا آوری کہاں تک کی۔ بہر کیف خدا کی رحمت و شفقت بے پایاں ہے اور اس کے ہر بندے کے شاملِ حال ہوگی، یہ ہے وہ محور جس پر اسلام کا نظریہ معاد گردش کرتا ہے اور یہی ایک عقیدہ ہے جس کا تقاضا اس سلسلے میں ہر مسلمان سے کیا جاتا ہے، باقی جتنی باتیں ہیں وہ ضمنی ہیں اور مختلف قوموں اور قبیلوں کی عام روایتوں سے مستعار لے کر اس عقیدے کے ساتھ جوڑ دی گئی ہیں۔ آئندہ کی جزا و سزا اور حیاتِ بعد الممات سے متعلق تمام خیالات میں جو داخلی عنصر ہوتا ہے اسے نظر انداز کر کے ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ خیالات وہ قوی ترین آلہ ہیں جسے دنیا کے تمام معلمین اخلاق نے افراد و اقوام کی سیرت و کردار کو متاثر کرنے کی خاطر استعمال کیا، لیکن اگرچہ ہر مذہب میں مواخذہ عقبیٰ کا اصول کسی نہ کسی حد تک ضرور پایا جاتا ہے۔ پھر بھی اسلام کے سوا تمام مذاہب اس امر کا ادراک کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ اس اصول کو عوام الناس کے تزکیہ اخلاق کے ایک

مستقل وسیلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایسی نیکی جو مقصود بالذات ہو، یعنی محض نیکی کرنے کی خاطر کی جائے، ایک ایسی چیز ہے جو صرف اعلیٰ طبائع کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ عام طبائع کے لیے اور خصوصاً ایسے لوگوں کے لیے جو تعلیم سے بے بہرہ ہیں، جزاؤں اور سزاؤں کا ایک مکمل ضابطہ یعنی تکلیفِ شرعی، لازمی ہے۔

آیئے اب ہم ان جزاؤں اور سزاؤں کی ماہیت پر غور کریں۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ انسانوں کی عام اکثریت کے ذہنوں تک روحانی مسرت یا روحانی اذیت کا خیال اس وقت تک منتقل نہیں کیا جا سکتا جب تک مسرت و اذیت کو جیتی جاگتی شخصیتوں کی طرف منسوب اور اشیائے محسوس کی صورت میں متشکل نہ کیا جائے۔ فلسفہ صدیوں سے ایسے مجرد الفاظ و تراکیب پر مباحثوں میں اُلجھا ہوا ہے جنہیں محسوسات کا جامہ نہیں پہنایا گیا۔ اس قسم کے مجرد الفاظ وقتاً فوقتاً رائج ہوئے ہیں اور مختلف مدتوں تک رائج رہ کر متروک ہو گئے ہیں۔ فلسفیانہ خیال آرائیوں کی مبہم دنیا میں رہنے والے چند لوگوں کے حلقے سے باہر اُن کا کوئی اثر محسوس نہیں کیا گیا اور ان کے غائب ہو جانے کے بعد ان کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

رسول اللہ ﷺ کا روئے سخن صرف چند عالی دماغ مفکرین کی طرف نہ تھا جو اس زمانے میں اتفاقاً موجود تھے، بلکہ اردگرد کی وسیع دنیا کی طرف، جو ہر طرح کے مادی مسائل و مشاغل میں منہمک تھی۔ انہیں اس کی ضرورت پیش آئی کہ ایسا اسلوبِ بیان اختیار کریں جو عام فہم ہو، بھوکے ننگے کندہ ناتراش عرب بدوی کے لیے پاک و صاف پانی یا دودھ یا شہد کی نہروں سے بڑھ کر کون سی چیز دل لبھانے والی یا اُس کے تصورِ جنت سے مطابقت رکھنے والی ہو سکتی تھی؟ پھلوں سے لدے ہوئے درختوں، ہرے بھرے سبزہ زاروں اور زرخیز زمینوں سے بڑھ کر اُسے کون سی چیز پسند آ سکتی تھی؟ ان حسی لذتوں کے بغیر راحت و مسرّت کا کوئی تصوّر مطلقاً اسکے ذہن میں نہ آ سکتا تھا۔ مسلم اہل الرائے کا ایک طبقہ، جس کے سرخیل سنائی اور غزالی ہیں۔ ان حسی علامتوں کا یہ جواز پیش کرتا ہے کہ مادی عیش و مسرت کو ایک قابل ادراک صورت میں مجسم کرنے کے لیے درختوں، نہروں اور پریزادوں سے بھرے ہوئے شاندار محلوں کے جو نقشے کھینچے گئے ہیں اُن کے پردے

میں عمیق تر معانی ہیں اور سب راحتوں سے بڑی راحت جو جنتیوں کو نصیب ہوگی وہ دیدارِ الٰہی کی سعادت ہوگی جب وہ پردہ جو انسان اور اس کے خالق کے درمیان حائل ہے چاک ہو جائے گا اور رُوح حواس خمسہ کی حدود سے باہر نکل کر جلوۂ باری کو اپنے روبرو پائے گی۔ اس استدلال کی تائید نصوصِ قرآنی سے بھی ہوتی ہے، اور ارشاداتِ نبوی سے بھی۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ خدا کا سب سے مقبول بندہ وہ ہوگا جو صبح و شام خدا کا چہرہ (یعنی اس کا جلوہ دیکھے گا۔ یہ ایک ایسی راحت ہوگی جو تمام لذات جسمانی سے اُسی طرح بڑی ہوگی جس طرح سمندر پسینے کی ایک بوند سے بڑا ہے۔"

ایک دن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صحابی سے گفتگو کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:...... "خدا نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی چیزیں تیار کر رکھی ہیں، جیسی نہ آنکھوں نے دیکھیں، نہ کانوں نے سُنیں نہ دلوں نے محسوس کیں۔" یہ فرما کر آپ ﷺ نے ذیل کی آیتِ قرآنی پڑھی:

"اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کے لیے آنکھوں کی کیسی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔ یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔" (السجدہ۔ ۱۷)

ایک اور روایت کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد کیا کہ نیک لوگوں کو دیدارِ حق نصیب ہوگا اور اس کی تائید میں ذیل کی آیتِ قرآنی کا حوالہ دیا:

"اللہ تمہیں دارالسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے...... جن لوگوں نے نیکی کا طریقہ اختیار کیا اُن کے لیے بھلائی ہے اور مزید برآں اور بھی۔" (یونس ۔ ۲۵۔۲۶)

جہاں تک الفاظ قرآنی کے تمثیلی ہونے کا تعلق ہے، اس مسلکِ خیال کے دعوے کی بنیاد قرآن کی یہ عبارت ہے۔ "وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب نازل کی ہے، جس میں دو طرح کی آیات ہیں، ایک محکمات، جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں، اور دوسری متشابہات۔" (آلِ عمران ۔ ۷)

ایک اور گروہ عقبٰی کی خوشیوں اور غموں کو کاملاً داخلی سمجھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جیسے انتہائی ذہنی تکلیف جسمانی تکلیف سے کہیں زیادہ عذاب دہ ہوتی ہے، اسی طرح اعلیٰ ترین قسم کی ذہنی مسرت ہر قسم کی حسی لذت سے زیادہ راحت بخش ہوتی ہے، چونکہ

جسمانی موت کے بعد انفرادی روح قرآن کے الفاظ میں روحِ کل کی طرف عود کر جاتی ہے، اس لیے معلم اسلام نے عوام الناس کو حقیقتِ حال سمجھانے کی خاطر جن خوشیوں اور غموں کے نقشے شوخ رنگوں میں پیش کیے ہیں وہ سب خوشیاں اور غم ذہنی و داخلی ہوں گے۔ اس گروہ میں اسلامی دنیا کے چند سب سے بڑے حکماء و صوفیا داخل ہیں۔

لیکن ایک اور جماعت، جو غالباً اس گروہ سے بڑی ہے، یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ قرآن نے جنت و جہنم کے جو کوائف بیان کئے ہیں وہ مجاز ا ہو بہو پیش آئیں گے۔

ہم ان مختلف مذاہبِ خیال کا محاکمہ کیے بغیر اسی پر اکتفا کریں گے کہ عقبیٰ کی جزا و سزا کے بارے میں ہمارا جو ذاتی عقیدہ ہے اُسے بیان کر دیں۔

قرآن کے غائر مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام شعورِ مذہبی کے جن مختلف ارتقائی مدارج سے گذرے رسول اللہ ﷺ کو بھی وہی مدارج پیش آئے۔ رسولِ اکرم ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا کے دو ایسے معلمین ہیں جو ایک خاص تاریخی اہمیت رکھتے ہیں لہٰذا ہم ان کا مطالعہ ایک ساتھ کریں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذہبی ارتقاء کے دوران اُن کے اندازِ فکر میں جو عظیم تغیر ہوا وہ نہ صرف آسمانی بادشاہت کے اس مثالی تصور سے ظاہر ہے جو انھوں نے اپنی ارضی زندگی کے اخیر میں پیش کیا بلکہ غیر اسرائیلیوں کی بابت ان کے لہجے میں جو تبدیلی ہوئی اس سے بھی اس تغیر کا پتہ چلتا ہے۔ ابتداءً اُن کی تبلیغ صرف اسرائیلیوں تک محدود تھی۔ لیکن جب اُن کے مذہبی شعور نے نشو و نما پائی تو اُن کی ہمدردیوں میں وسعت پیدا ہوگئی۔

یہی حضرت محمد ﷺ کے مذہبی ارتقاء کا حال ہے۔ قرآن کے جن مختلف سوروں میں جنت کے مرصّع نقشے کھینچے گئے ہیں، عام اس سے کہ وہ نقشے مجازی تھے یا معنوی، وہ سب سورے کلی یا جزئی طور پر مکے میں نازل ہوئے۔ اس موضوع پر جو روائتیں اس زمانے میں عام تھیں۔ ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ شعورِ مذہبی کے اوائل میں اُن میں سے چند ایک کو مانتے تھے لیکن جب اُن کی روح میں کامل بیداری آگئی اور خالقِ کائنات کے ساتھ اُن کا رابطہ زیادہ گہرا ہوگیا تو اُن کے وہ خیالات جو پہلے مادیت کا پہلو لیے ہوئے تھے سراسر رُوحانی ہوگئے۔ اُن کی ذہنی نشو و نما نہ صرف مرورِ زمانہ اور ان کے شعورِ مذہبی

کے ارتقاء کے دوش بدوش بلکہ اُن کے متبعین نے روحانی تصورات کے سمجھنے میں جو ترقی کی اس کے قدم بقدم بھی ہوئی۔ چنانچہ بعد کے سوروں میں روحانی پہلو مادی پر اور روح جسم پر غالب نظر آتی ہے۔ سرسبز و شاداب باغ جنہیں نہریں سیراب کرتی ہیں، دائمی چھاؤں، آسودہ حالی اور امن وامان، یہ سب چیزیں جو ایک بے آب وگیاہ اور بے سایہ ریگستان کے سدا بھوکے پیاسے رہنے والوں کے لیے جن کی زندگی اپنے ساتھ اور اپنے ماحول کے ساتھ ایک مسلسل جنگ تھی، غیر مترقبہ نعمتیں تھیں، اب بھی مرقع کے بنیادی نقش ونگار ہیں لیکن اہلِ جنت کو جو خوشی نصیب ہوگی وہ خدا کی بارگاہ میں سکون واطمینان اور باہمی اُلفت ومودت کی صورت میں دکھائی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔

''لیکن وہ لوگ جو متقی ہیں باغوں میں رہیں گے جہاں چشمے بہتے ہوں گے اُن سے کہا جائے گا، ان میں سلامتی کے ساتھ اور بے خوف وخطر داخل ہو جاؤ، اُن کے سینوں میں جو کدورتیں ہوں گی وہ سب نکال دی جائیں گی اور وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے کے روبرو تختوں پر بیٹھیں گے۔ نہ اُنہیں وہاں کسی قسم کی کلفت ہوگی، نہ کوئی اُنہیں وہاں سے نکالے گا۔'' (الحجر ۴۵ تا ۴۸)

ذیل کی آیات، جو حیاتِ دنیا اور حیاتِ عقبیٰ کے بارے میں رسولِ اکرم ﷺ پر آخری ایام میں نازل ہوئیں۔ اسلامی عقیدے کا بہترین خلاصہ ہیں اس موضوع پر تخیل اور محاکات میں اس سے بہتر کون سی عبارت ہوسکتی ہے؟

''وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ چنانچہ تم کشتیوں میں سوار ہوکر بادِ موافق کے آسرے خوش خوش سفر کرتے ہو یکایک بادِ مخالف کے جھونکے آتے ہیں اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگنے لگتے ہیں۔ مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ وہ طوفان میں گھر گئے۔ اُس وقت سب اپنی بندگی کو صرف اللہ کے لیے مخصوص کر کے اُس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ 'اگر تو ہمیں اس آفت سے بچالے تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے، لیکن جب اللہ اُن کو بچالیتا ہے تو اسی وقت وہ لوگ روئے زمین پر شرارتیں کرنے لگتے ہیں۔ لوگو! تمہاری شرارتیں تمہی پر پڑتی ہیں۔ یہ دنیا کے چندروزہ مزے ہیں، لُوٹ لو۔

آخر کار تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اس وقت ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ دنیا کی زندگی کی تو وہی مثال ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار، جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہوگئی۔ پھر عین اس وقت جب زمین بناؤ سنگار کر کے اپنی پوری بہار پر تھی اور اس کے مالک اپنے زعم میں یہ خیال کر رہے تھے کہ وہ اس پر قادر ہیں، یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آگیا اور ہم نے سب کچھ یوں کاٹ کر ڈھیر کر دیا، جیسے کل وہاں کوئی بستی یا کھیتی نہ تھی۔ یوں ہم کھلی نشانیاں دکھاتے ہیں اُن لوگوں کو جو سوچ سمجھ رکھتے ہیں۔ اللہ تمہیں دارالسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے اور وہ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ جو لوگ نیکی کرتے ہیں اُن کے لیے بھلائی ہے اور مزید برآں اور بھی۔ اُن کے چہروں پر سیاہی اور رسوائی نہ چھائے گی۔ یہ لوگ جنتی ہیں اور ہمیشہ جنت میں رہیں گے، لیکن جن لوگوں نے برائیاں کمائیں وہ اپنی برائیوں کے برابر بدلہ پائیں گے[۱] انہیں رُسوائی نصیب ہوگی، کیونکہ انہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ اُن کے چہروں پر ایسی سیاہی چھائی ہوگی کہ جیسے ہم نے رات کی تاریکی کا ایک ٹکڑا لے کر اُن کے منہ پر ڈال دیا ہو۔''

(یونس ۲۱ تا ۲۷)

ذیل کی آیات سے زیادہ ولولۂ ذوق وشوق کن الفاظ میں پایا جاسکتا ہے؟

''وہ لوگ جو اللہ کا اقرار پورا کرتے ہیں، اُس سے کیے ہوئے پیمان کو نہیں توڑتے، اُس کے مقرر کیے ہوئے رابطوں کو قائم رکھتے ہیں، وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں اُن سے بری طرح حساب نہ لیا جائے، وہ لوگ جو اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے کھلے طور پر اور چھپے طور پر بھی خرچ کرتے ہیں، برائی کا مقابلہ بھلائی سے کرتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے لیے عاقبت کا گھر

---

[۱] ملاحظہ طلب بات یہ ہے کہ نیکی کا اجر عمل کی مقدار تک محدود نہ ہوگا بلکہ اس سے زیادہ ہوگا۔ اس کے برخلاف بدی کا بدلہ صرف اُتنا ہی ملے گا جتنی بدی کی مقدار ہوگی۔

ہے، یعنی ایسے باغ جو اُن کی ابدی قیام گاہ ہوں گے وہ خود بھی اُن میں داخل ہوں گے اور اُن کے آباو اجداد اور اُن کے بیوی بچوں میں سے جو جو صالح ہیں وہ بھی اُن کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ فرشتے ہر دروازے سے اُن کے استقبال کو آئیں گے، یہ کہتے ہوئے کہ 'سلامتی ہو تم پر، تم نے دنیا میں جو صبر کیا یہ عقبیٰ کا گھر اُسی کا صلہ ہے۔''

(الرّعد ۲۰ تا ۲۴)

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا وہ اس نظریئے کے ابطال کے لیے کافی ہے کہ حضرت محمدﷺ نے حیاتِ معاد کے جو مرقعے پیش کیے وہ سرتا پا حسّی ہیں۔ ہم اس باب کو قرآن کی اسی آیت پر ختم کرتے ہیں جس سے اس کا آغاز کیا گیا۔ اس آیت سے اسلام کی عمیق روحانیت اور اُن اُمیدوں اور اُمنگوں کی پاکیزگی جن پر اُس نے اپنے اسوہ حیات کی بنا رکھی، ظاہر ہے:

''اے نفسِ مطمئنہ، اپنے رب کی طرف لوٹ چل: تُو اس سے اور وہ تجھ سے راضی پھر میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

چوتھا باب

اِسلام کا تبلیغی جہاد

لا اِکراہَ فی الدین......ان الذین آمنو والذین ھادوا والصّابون والنصاریٰ من آمن باللہ والیوم الآخر و عمل صالحاً فلا خوف علیھم ولاھم یحزنون۔

"یقین جانو کہ مسلمان ہو یا یہودی، صابی ہو یا عیسائی، جو لوگ بھی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف کا مقام ہے نہ غم کا۔

(المائدہ ۔ ۶۹)

جس غیر معمولی سرعت سے رسولِ عربی ﷺ کا دین روئے زمین پر پھیلا وہ مذاہب کی تاریخ کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہے۔ عیسائیت صدیوں تک گوشہ گمنامی میں اپنا سر چھپاتی رہی۔ جب تک اُس نے غیر اہلِ کتاب کے مذہب کو اپنے اندر جذب نہ کرلیا، جب تک ایک غیر اہل کتاب حکمران نے فرمانوں اور منشوروں کے ذریعے اُس کی مدد نہ کی، اُس وقت تک وہ مذاہب عالم کی محفل میں سر اُٹھانے کے قابل نہ ہوئی۔ اسلام اپنے معلم کی وفات کے تیس سال کے اندر اندر لاکھوں انسانوں کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔ ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ معتکف حرا کی آواز تین براعظم پار کر کے فضائے عالم میں گونج گئی۔ قیصر و کسریٰ کی فوجیں جنہوں نے عرب سے آشکار ہونے والی اس نئی جمہوریت کے ریلے کو روکنے کی کوشش کی، بادیہ نشینوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوگئیں۔ اسلام کی شاندار کامیابی اور لوگوں کے دلوں پر اس کی حیرت انگیز حکومت نے

اُسے اس الزام کا مورد بنایا ہے کہ وہ تلوار کا مذہب ہے جو تلوار کے ذریعے پھیلایا گیا اور تلوار ہی کے بل بوتے پر قائم رکھا گیا۔ لہٰذا ہم اس امر کی تحقیق کرنے کی خاطر کہ آیا یہ الزام حق بجانب ہے۔ اسلام کے ظہور سے متعلق حالات و واقعات کا بامعانِ نظر جائزہ لیتے ہیں۔

رسولِ اکرم ﷺ کے ورودِ مدینہ کے وقت اوس و خزرج کے قبیلوں کی برسوں پرانی تباہ کن جنگ ابھی ابھی ایک کھوکھلی صلح کی شکل میں تھمی تھی۔ قوی امکان تھا کہ وہ کسی لمحے آگے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ نئے سرے سے شروع ہو جائے گی۔ یہودیوں نے حملۂ جبلہ کے بعد اعرابِ مدینہ کی باجگزاری تو قبول کر لی تھی، لیکن بسرعت تمام نئے سرے سے زور پکڑ رہے تھے اور کھلم کھلا اپنے مشرک ہم وطنوں کو مسیحائے موعود کے غضب کی دھمکیاں دے رہے تھے، جس کے ظہور کی انہیں ہر لحہ توقع تھی۔ آس پاس کے قبیلے جن پر قریش کا اثر و نفوذ غالب تھا، اپنی پوری بدویانہ جنگجوئی کے ساتھ مدینے پر بل پڑنے کے لیے تلے کھڑے تھے۔ حضرت محمد ﷺ کے مدینے میں داخل ہوتے ہی وہ خطرات جو نئے دین کو درپیش تھے ظاہر ہو گئے۔ مکے کے صحابہؓ جنہوں نے اپنے آقا کی خاطر اور اس نور کی خاطر جس سے اس نے اُن کے سینوں کو روشن کر دیا تھا، پہلے موت کا مقابلہ کیا تھا اور اب غریب الوطنی میں ناداری و تنگدستی کا سامنا کر رہے تھے۔ گنتی کے چند لوگ تھے جن میں مقاومت کی زیادہ تاب نہ تھی۔ مدینے میں بھی آنحضرت ﷺ کے پیرو زیادہ تعداد میں نہ تھے اور جتنے تھے وہ بھی قبائلی خصومتوں کے باعث مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کا ایک اہم گروہ، جس کا سرخیل ایک بارسوخ سردار تھا جس کی نگاہیں مدینے کے تخت پر جمی ہوئی تھیں، کفار کی حمایت میں خفیہ طور پر کارروائیاں کر رہا تھا۔ یہودی، جو متحد اور مضبوط تھے، زہر اور دغا کے اوچھے ہتھیار لیے آنحضرت ﷺ کی ہلاکت کے درپے تھے اور ہر ممکن طریقے سے آپ ﷺ کی مخالفت کر رہے تھے۔ لیکن وہ دل جو قریش کی قاتلانہ دھمکیوں سے نہ ڈرا ایسی حالت میں کیونکر ڈر سکتا تھا، جب بہت سے دوسرے لوگوں کی زندگی اس کی زندگی سے وابستہ تھی، آپ ﷺ نے فوراً اُن متفرق لوگوں کو جو آپ ﷺ کے رایاتِ تبلیغ کے سائے میں جمع ہوئے تھے، ایک منظم جماعت میں متشکل

کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ قبائل کے قدیم طریقہ قصاص کی جگہ آپ ﷺ نے ان کے باہمی مناقشوں کو طے کرنے کی خاطر ثالث معین کیے۔ اوس و خزرج کا باہمی اختلاف مٹا دیا، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی چھوٹی سی دولتِ متحدہ میں شامل کیا اور سب مسلمانوں میں دوستی و برادری کے تعلقات قائم کیے۔ آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ جو شخص بھی، چاہے وہ یہودی ہو یا صابی یا عیسائی، خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اُس کے لیے کسی قسم کے خوف کا مقام نہیں۔ ایک ایسی قوم کو جو بدترین قسم کے کفر و شرک میں مبتلا تھی اور جس کے لیے خونریزی فطرتِ ثانیہ تھی آپ ﷺ نے پاکبازی، راستی، ضبطِ نفس، عطا و احسان اور ہمدردیٔ ابنائے جنس کا سبق سکھایا۔ قرآن کا ارشاد تھا کہ ''اگر کوئی شخص اپنے حق قصاص سے دست بردار ہو جائے گا تو یہ خدا کے نزدیک کفارہ شمار ہوگا۔'' ''جو شخص بھلائی کی سفارش کرے گا اُسے بھلا اجر ملے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اُس برائی میں سے حصہ پائے گا۔'' (النساء ۴ ۔ ۸۵)

اِدھر آپ ﷺ اپنی قوم میں انسانیت پیدا کرنے، اُسے قعرِ مذلت سے نکالنے، اور خبائث سے پاک کرنے کے مقدس کام میں مصروف تھے، اُدھر آپ ﷺ کے بے رحم دشمن انتقام کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ انہوں نے آپ ﷺ کو ہلاک اور آپ کے دین کو تباہ کرنے کا حلف اٹھا رکھا تھا قریش آپ کو آپ کے متبعین کو اپنے آبائی مذہب سے مرتد شمار کرتے تھے اور انہیں یہ امر بے حد کھٹکتا تھا کہ اُن مرتدوں نے مکہ کے حریف شہر میں پناہ لیے رکھی تھی تاکہ وہاں رہ کر اپنے انقلابی مذہب کی داغ بیل ڈالیں۔ ان کے نزدیک متحدہ عرب کا یہ فرض تھا کہ ان سرپھرے جوشیلوں کو نیست و نابود کر دیں، جنہوں نے گھر بار اور مال و دولت کو اس مقصد سے خیر باد کہی تھی کہ ایک ایسے اَن دیکھے خدا کا پیغام دنیا کو پہنچائیں، جو اپنی عبادت کے معاملے میں اتنا سخت گیر تھا اور محبت، صلۂ رحم، احسان پاک اندیشی اور نیکوکاری کے عام فرائض پر اتنا اصرار کرتا تھا۔ جس لمحہ رسول پاک ﷺ نے مدینے میں قدم رکھا، اُسی لمحہ آپ ﷺ کی قوم کی تقدیر، خصوصاً اُن لوگوں کی تقدیر جنہوں نے آپ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی تھی اور آپ ﷺ کا استقبال کیا تھا آپ ﷺ کی کامیابی و ناکامی، آپ ﷺ کی زندگی و موت کے ساتھ وابستہ ہوگئی۔ آپ ﷺ کی ہلاکت

کے معنی تھے ان تمام لوگوں کی ہلاکت جو آپ ﷺ کے پرچم کے نیچے جمع ہوئے تھے۔ اُن لوگوں کے ارد گرد دشمن اور غدار گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ سارا عرب قریش کے کوسِ جنگ کے لیے گوش بر آواز تھا، کیونکہ وہ قوم کے خداؤں کے قدیم خادم تھے اور ان خداؤں کے منکروں کو مٹانے کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے، ایسے میں اگر وہ اپنے تحفظ کے لیے تلوار ہاتھ میں نہ لیتے تو اُن کی تباہی ناگزیر تھی۔ پھر بھی جب تک ان کے دشمن پیش قدمی کر کے ان پر حملہ آور نہ ہوئے اس وقت تک یہ اعلان نہ ہوا کہ ''کفار مومنوں کے معاملے میں نہ خون کے رشتے کا، نہ عہد و پیان کا خیال رکھتے ہیں۔ جب وہ صلح کے عہدوں کو توڑیں اور تم پر حملہ آور ہوں تو اپنی حفاظت کرو۔''

''تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں لیکن زیادتی نہ کرو، کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (البقرہ۔۲ ۔ ۱۹۰)

مسلمانوں کے لیے مدافعانہ کارروائی اپنے تحفظ کا معاملہ بن گئی تھی۔ ان کے لیے دو ہی صورتیں تھیں: یا تو یہ کہ دشمنوں کے آگے اپنا سر رکھ دیں یا یہ کہ جب دشمن اُن پر حملہ آور ہوں تو ان کا مقابلہ کریں۔ انہوں نے مؤخر الذکر طریقہ اختیار کیا اور ایک طویل کش مکش کے بعد دشمنوں پر غلبہ پانے میں کامیاب ہوئے۔

یہودیوں کی جانی دشمنی، ان کی مکرر بد عہدیاں اور حلف شکنیاں، اُن کی مسلسل غداریاں اور ان کی متواتر کوششیں کہ مسلمانوں کو دغا بازی سے کفار کے حوالے کر دیں، ان سب حرکتوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں سخت سزائیں دینی پڑیں۔ یہ سزائیں بر سبیلِ انتقام نہ تھیں، بلکہ مسلمانوں کی قلیل اور کمزور جماعت کے تحفظ کے لیے انسدادی تنبیہیں تھیں۔

ہمیں یہ فرض کر لینے کا کوئی حق نہیں کہ چونکہ دنیا میں جو رہبر عہد بہ عہد آئے ان میں سے چند ایک نے مخالف حالات سے مادی طور پر شکست کھا کا جامِ شہادت نوش کیا۔ چونکہ چند ایک نے ناممکن الحصول مثالی دنیاؤں کے نقشے تیار کیے، چونکہ دور دراز خواب دیکھنے والے دنیا میں رہ چکے ہیں، چونکہ چند جوش و ولولہ رکھنے والوں نے تکلیفیں اُٹھائی ہیں، اس لیے رسولِ اکرم کا یہ فرض تھا کہ ان لوگوں کی مثال کی تقلید کرتے اور اپنا تبلیغی کام انجام دینے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ آپ ﷺ پر یہ کسی طرح

لازم نہ تھا کہ اپنے آپ ﷺ کو اور اس ساری جماعت کو جس کی سرداری انہوں نے قبول کی تھی ایک ایسی چیز کی بھینٹ چڑھا دیتے جسے ہم آج کل کے زمانے میں ایک ''آئیڈیا'' ایک اندازِ فکر کہیں گے۔

آیئے ہم مسلمانوں کے ان مدافعانہ غزووں کا جو اُنہوں نے اپنے تحفظ کے لیے لڑے اُن خونیں جنگوں سے مقابلہ کریں جو یہودیوں اور عیسائیوں نے، بلکہ اور تو اور نرم مزاج پارسیوں نے بھی، اپنے اپنے مذہب کی اشاعت کی خاطر کیں۔ یہودیوں کے معاملے میں تو زیادتی پیش قدمی اور ہلاکت مذہبی فریضے تھے۔ اگر وہ اپنے مخالف کی جان بخشی کرتے تو ملعون قرار دیے جاتے۔

جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے، عاجزی و فروتنی کا وہ نظریہ جس کی تعلیم نبیٔ ناصری نے دی تھی حکومت و اقتدار کے آتے ہی فراموش کر دیا گیا۔ جس وقت عیسائیت کو ایک مانی ہوئی قوت کی حیثیت حاصل ہوئی، یعنی وہ ایک جماعت کی اکثریت کا مذہب بنی، اُسی وقت اس میں جارحیت اور جبر و تشدد پیدا ہو گیا۔ مختلف مصنفین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کا موازنہ کیا ہے۔ اُن میں سے جن مصنفین کے دلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الٰہیت کا راسخ عقیدہ تھا، انہوں نے اُن ''ارضی'' وسائل کو جو رسولِ عربی ﷺ نے اپنی امت کے احیاء و اصلاح کے لیے اختیار کیے شیطان کی سُجھائی ہوئی تدبیریں کہا ہے اور اس امر کو نبیٔ ناصری نے ایسے وسائل استعمال نہیں کیے (غالباً اس لیے کہ انہیں اس کا موقع ہی نہیں ملا) اُن کی خدائی کا ثبوت خیال کیا ہے۔ ہم مدلل طور پر واضح کریں گے کہ اس قسم کے موازنے غیر منصفانہ ہیں، کیونکہ وہ ایسے مقدمات پر مبنی ہیں جو نہ صرف تاریخی اعتبار سے بلکہ انسانی فطرت کے نقطہ نگاہ سے بھی باطل ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کے حالاتِ زندگی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اثر و نفوذ اُن کی مختصر بعثت کے دوران پیروؤں کے ایک چھوٹے سے حلقے تک محدود رہا اور یہ لوگ زیادہ تر اسفل طبقوں کے اَن پڑھ لوگ تھے۔ اس سے پیشتر کہ یہ پیرو تعداد یا رسوخ میں اتنی ترقی کرتے کہ اُن کی ہدایت کے لیے عملی قاعدوں کی ضرورت محسوس ہوتی، اس سے پیشتر کو وہ روحانی تعلیم کی خاطر یا حکمرانوں

کے مذہبی تشدد سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو ایک منظم جماعت میں تبدیل کرتے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان خشمناک جذبات کا شکار ہو گئے جو انہوں نے پیشہ ور مذہبی لوگوں کی بے جان رسم پرستی کے خلاف صدائے لعنت و ملامت بلند کر کے اُکسائے تھے[۱]۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیرو ایک ایسی جماعت کے افراد تھے جو باضابطہ قوانین کے تحت تھی، جن کی بجا آوری کی ضامن اقتدارِ اعلیٰ رکھنے والی حکومت روما تھی، اس لیے انہیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ اپنے آپ کو ایک منظم جماعت بنائیں۔ علیٰ ہذا القیاس ان کے معلم نے بھی یہ ضروری نہ سمجھا کہ ان کی ہدایت کے لیے مثبت اخلاقی قوانین وضع کریں۔ یہ ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب عیسائیوں کی جماعت بڑی ہو گئی اور ایک ایسے عالم نے جو جدید افلاطونی علوم کا ماہر تھا، اُس انفرادیت اور سادگی کو تباہ کر دیا جو معلم اصلی کی تعلیمات کی خصوصیت تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنی تبلیغی و اصلاحی زندگی کے آغاز ہی سے اپنی قوم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن کے پیرو بھی ابتداء میں قلیل التعداد اور کمزور تھے، اُن کے پیش رو بھی ایسے لوگ تھے جنہوں نے بت پرستی کے بندھن توڑے تھے اور اپنے بطون میں چشمۂ حیات کی موسیقی سُنی تھی۔ اُنہوں نے بھی نرمی، صلہ رحمی اور محبت کی تعلیم دی۔

لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ایک ایسی قوم میں ہوا جو بربریت و جہالت میں ڈوبی ہوئی تھی، جس کے لیے جنگ و جدل مقصدِ زندگی تھا۔ وہ ایک ایسی قوم تھی، جو یونانیوں اور رومیوں کے مادیت آفریں اور انحطاط انگیز اثرات سے بھی اور اُن کے انسانیت آموز اثرات سے بھی دور تھی۔ شروع شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تحقیر و تضحیک کے ساتھ اور بعد میں انتقامی غیظ و غضب کے ساتھ سُنی گئی۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[۱] خوبی محققین اس بارے میں جو نظریہ عام طور پر تسلیم کرتے ہیں،، میں یہ اسی کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صلیب پر وفات نہیں پائی بلکہ معجزانہ طور پر غائب ہو گئے، اور اُن کے عہد میں جو روایات رائج تھیں، یہ عقیدہ ان سے مطابقت رکھتا تھا۔ اگر چہ اس نظریئے کو ایک مشکوک الاصل غناسطی روایت کہا جاتا ہے اور یہ عام عیسائی اور روایات سے مطابقت نہیں رکھتا، لیکن تاریخی اعتبار سے دونوں نظریوں کی صداقت کا مساوی امکان ہے۔

پیروؤں کی تعداد اور قوت بڑھتی چلی گئی۔ تا آنکہ اہل مدینہ کی دعوت نے آپ ﷺ کے عظیم الشان کارنامے کو تاج کامرانی پہنایا۔ جس لمحے آپ ﷺ نے اس مامن میں قدم رکھا جو آپ ﷺ کے شریف النفس میزبانوں نے آپ ﷺ کو پیش کیا تھا جس وقت آپ ﷺ نے مدینہ کا منصفِ اعلیٰ اور روحانی معلم بننا قبول کیا، اُسی لمحے سے آپ ﷺ کی کامیابی یا ناکامی اہل مدینہ کی کامیابی یا ناکامی سے وابستہ ہوگئی۔ اُسی لمحے سے بت پرستوں اور اُن کے معاونوں کی مخالفت اتنی بڑھ گئی کہ مسلمانوں کے لیے ہر وقت بیدار و ہوشیار رہنا ضروری ہوگیا۔ ایک اکیلے شہر کو عرب کے کثیر التعداد قبائل کی مجموعی یورشوں کا مقابلہ کرنا پڑا ان حالات میں اس چھوٹی سی خداداد مملکت کا وجود قائم رکھنے کی خاطر اکثر مستعدانہ اقدامات کی ضرورت پیش آتی تھی۔ جب امن و آشتی کی حجتیں تمام ہو جاتیں تھیں تو دباؤ سے کام لینا پڑتا تھا۔

تحفظ ذات کا وہ جبلی داعیہ جو نبی ناصری کے سینے کے اندر سے اُس وقت پکارا تھا جب انہوں نے اپنے حواریوں کو یہ تلقین کی تھی کہ اپنے آپ کو تحفظ کے آلات سے لیس کریں، اُسی داعیئے نے ستم رسیدہ مسلمانوں کو مجبور کیا کہ جب اُن کے بے رحم دشمن اُن پر حملہ آور ہوں تو ہتھیاروں سے اُن کا مقابلہ کریں۔

رفتہ رفتہ محبت و شفقت اور مستعدانہ محنت و ہمت کی بدولت بکھرے ہوئے عرب قبیلے پرستارانِ حق کی جماعت میں شامل ہوگئے اور ملک میں امن وامان کا دور دورہ ہوگیا۔ حضرت محمد ﷺ تھے تو ایک ایسی قوم کے فرزند جس کا شمار دنیا کی سب سے زیادہ مشتعل مزاج قوموں میں ہوتا ہے، جو جبلۃً اس وقت بھی اتنی ہی طوفانی و ہیجانی تھی، جتنی اب ہے اور جس کے جذبات اس کے صحرا کو تپانے والے سورج کی طرح بھڑ کیلے تھے، لیکن آپ ﷺ نے عربوں کو ضبطِ نفس اور انکارِ نفس کی ایسی عادتیں سکھائیں جن کی کوئی نظیر تاریخ نے اس سے پہلے پیش نہ کی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے ظہور کے وقت بین الاقوامی مروت کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ جب قومیں یا قبیلے ایک دوسرے سے جنگ کرتے تھے تو اس کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا تھا کہ جو لوگ لڑنے کے قابل ہوتے تھے وہ سب کے سب تہِ تیغ کر دیئے جاتے تھے۔ معصوم

عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا اور دشمنوں کے گھروں میں جو بت ہوتے تھے وہ اپنے ساز و سامان سمیت لوٹ لیے جاتے تھے۔

اگرچہ اہلِ روما نے تیرہ صدیوں کی مدت میں ایک ایسا ضابطہ قوانین مرتب کیا جو اُتنا ہی جامع تھا جتنا وہ بلند تھا۔ لیکن وہ بھی بین الاقوامی اخلاق یا انسانیت کے فرائض کا ادراک نہ کر سکے۔ وہ جنگ صرف اس مقصد سے کرتے تھے کہ آس پاس کی قوموں کو اپنا مطیع و منقاد بنائیں۔ جہاں جہاں اُنہیں کامیابی ہوئی اُنہوں نے مسخر قوموں پر اپنی مرضی علی الاطلاق عائد کر دی۔ معاہدوں کے تقدس کا کوئی احساس نہ تھا۔ معاہدے کیے جاتے تھے اور عند الضرورت توڑ دیئے جاتے تھے۔ اہلِ روما کی نظروں میں دوسری قوموں کی آزادی کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔

مذہب عیسوی کے آنے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ بین الاقوامی مراعات کے بارے میں اہلِ روما کا جو عندیہ پہلے تھا، اب بھی وہی رہا۔ لڑائیاں اُنہی انسانیت سوز اور ہلاکت آفریں طریقوں سے لڑی جاتی رہیں جو پہلے رائج تھے۔ فتح مند فوجیں اُسی طرح بے دریغانہ ہزیمت خوردہ لوگوں کو غلامی کی بیڑیاں پہناتی رہیں۔ میثاق اور معاہدے اُسی طرح ہوتے رہے اور اسی طرح کسی مقامی سردار کی سہولت کے پیشِ نظر توڑے جاتے رہے۔ عیسائیت کا یہ دعویٰ ہی نہ تھا اُسے بین الاقوامی اخلاق سے کوئی سروکار ہے۔ چنانچہ اُس نے اس بارے میں اپنے پیروؤں کی ہدایت کے لیے کوئی مشعل روشن نہ کی۔

جدید مفکرین نے یہ نہیں کیا کہ اس امر کو عیسوی نظام کا ایک حقیقی نقص تسلیم کریں جو اس قدرتی سبب سے رہ گیا کہ اس نظام کا بانی اپنا کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچا سکا۔ اس کے بجائے انہوں نے اس کی حمایت کی ہے اور اس کے جواز کی دلیلیں پیش کی ہیں۔ عقلِ انسانی بھی کبھی کبھی اپنے آپ کو کیسی کیسی بحثوں میں' الجھا لیتی ہے ایک ہی کام فرد سے سرزد ہو تو صحیح سمجھا جاتا ہے اور جماعت سے سرزد ہو تو غلط اسی طرح ایک ہی کام جماعت سے سرزد ہو تو صحیح سمجھا جاتا ہے اور فرد سے سرزد ہو تو غلط۔ مذہب اور اخلاق جو متبادل الفاظ ہیں، دونوں قانون کی اقلیم سے علیحدہ رکھے جاتے ہیں۔ مذہب جو افراد کے علائق کی ضابطہ بندی کا مدعی ہے، نوعِ انسانی کے مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات سے

اپنے آپ کو بری الذمہ کہتا ہے۔ چنانچہ یوں مذہب محض جذباتیت ہو کر رہ جاتا ہے، یعنی پرجوش جذبات کے اُنڈیلنے کی ایک ناند، یا مجالس مذاکرہ میں باہمی قصیدہ خوانی کا ایک موضوع، اگر چہ یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی وہ فلسفہ اخلاق کی رفعت بھی حاصل کر لیتا ہے۔

بین الاقوامی فرائضِ کی حقیقی بنیاد ہے کہ اقوام کو افراد کی سی حیثیت دی جائے اور یہ بات ملحوظِ خاطر رکھی جائے کہ اقوام اور افراد کے لیے علیحدہ علیحدہ معیار قائم نہیں کیے جاسکتے، کیونکہ جس طرح افراد کے مجموعوں کا نام اقوام ہے اسی طرح اقوام کے مجموعے کا نام ہے نوعِ انسانی، اور اقوام کے درمیان جو رابطۂ حقوق و فرائض ہے، وہ اس رابطۂ حقوق و فرائض سے جو افراد کے درمیان ہوتا ہے کسی طرح مختلف نہیں۔

یہ درست ہے کہ جب مغرب میں لاطینی کلیسا قائم ہو گیا اور روم کے اسقفوں کو مزید اختیاراتِ حاصل ہو گئے تو عیسائی دنیا کے لاطینی حصے میں کسی حد تک بین الاقوامی ذمہ شناسی پیدا ہو گئی۔ لیکن یہ ذمہ شناسی تمام و کمال کلیسائے روم کے تابعین تک محدود تھی۔ البتہ کبھی کبھی یونانی عیسائیت کو بھی اس سے مستفید کر دیا جاتا تھا۔ جہاں تک باقی دنیا کا تعلق تھا، وہ غیر مشروط طور پر اس کے استفادے سے محروم رکھی گئی۔ ''مذہب کے نام کو کمزور قوموں کے خلاف جارحانہ کارروائیوں کا عذر اور جواز سمجھا جاتا تھا اور اس کی خاطر اُن قوموں کو لوٹ مار اور غلام سازی کا مورد بنایا جاتا تھا۔'' ہر جابرانہ اور متشددانہ عمل پر کلیسا کی مہر تقدیس ثبت ہو جاتی تھی۔ انتہائی ظلم کی صورت میں کلیسا کا پروانہ بریت ظالم کی راہِ نجات کو ہموار کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ قتلِ عام کے اُن معرکوں سے شروع کر کے جو شارلمین نے کلیسا کی پوری پوری رضامندی کے ساتھ برپا کیے۔ امریکہ کے مرنجان مرنج اصلی باشندوں کے کشت و خون اور بردہ فروشی تک بین الاقوامی فرائض کی خلاف ورزی اور انسانی حقوق کی پامالی کا ایک غیر منقطع سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ جنسی ہمدردی کے اول اصول سے اس اعراض ہی کا نتیجہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جن تابعین نے کلیسا سے اختلافِ رائے کی جسارت کی اُن پر ستم توڑے گئے۔

پروٹسٹنٹ مسلک کے رونما ہونے سے کوئی فرق نہ پڑا۔ عیسائیت کے مختلف فرقوں کے درمیان جو مجادلے ہوئے اور انہوں نے ایک دوسرے پر جو مظالم روا رکھے، وہ

بجائے خود ایک مکمل تاریخ کا مواد بن سکتے ہیں۔ ہیلم کا قول ہے کہ:

''متعصبانہ تشدد اصلاح یافتہ کلیسا کا سب سے بڑا فطری گناہ ہے۔ یہ اس کی وہ خصوصیت ہے جس کے باعث ہر دیانت دار آدمی کے دل میں اس کی حمایت کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے، اسی حد تک جس حد تک اس کے مطالعے میں وسعت آتی جائے۔''

مختلف نوزائیدہ کلیسا ایمانیات و دینیات کے معاملے میں ایک دوسرے سے یا کلیسائے روم سے چاہے کتنے ہی مختلف الرائے ہوں، جہاں تک اُن قوموں کے ساتھ جو کلیسا کے دائرے سے باہر تھیں اشتراکِ حقوق و مفادات کا تعلق تھا وہ سب باتفاق رائے اس کے مخالف تھے۔

اس کے برعکس اسلام کی روح علیٰحدگی اور دوسری جماعتوں کے ساتھ بے تعلقی کو پسند نہیں کرتی۔ اگرچہ تہذیب و شائستگی نے ابھی بہت کم ترقی کی تھی اور دنیا معاشرتی و اخلاقی تاریکی میں بھٹک رہی تھی، لیکن رسولِ پاک نے مساوات کے اُن اصولوں کی تعلیم دی جن کا محض ایک ادھورا سا ادراک دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے اور ایسے قوانین نافذ کیے جو وسیع المشربی اور شریف النفسی کے اعتبار سے ہر دوسرے مذہب کے قوانین کے حریفِ مقابلہ ہو سکتے ہیں۔ ایک قابل مصنف کہتا ہے کہ ''اسلام اپنے عقائد کی تبلیغ کرتا تھا، لیکن انہیں کبھی جبراً تسلیم نہیں کراتا تھا، اور جو لوگ ان عقائد کو قبول کر لیتے تھے انہیں فاتحین کی جماعت کے برابر حقوق حاصل ہو جاتے تھے۔

اسلام نے مفتوحہ ملکوں کو اُن تمام پابندیوں اور شرطوں سے آزاد رکھا جو ابتدائے عالم سے لے کر ظہورِ اسلام تک ہر فاتح عائد کرتا چلا آیا تھا۔

اسلام کے قوانین تمام دوسرے مذاہب کے پیرووں کو جو اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ تھے نہ صرف آزادیِ ضمیر اور آزادیِ عبادت عطا کرتے تھے بلکہ اُن آزادیوں کے ضامن بھی ہوتے تھے۔ قرآن کا یہ ارشاد کہ لا اکراہ فی الدین (دین کے معاملے میں کوئی جبر نہ ہونا چاہیے) رواداری و احسان کے ان اصولوں پر شاہد ہے جن کی تعلیم اسلام نے دی۔ ''اگر تیرا خدا چاہتا تو تمام دنیا کے لوگ بہ یک وقت ایمان لے آتے، پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟ کوئی متنفس اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں

لاسکتا۔" (یونس ۔ ۹۹،۱۰۰)

یہ ہے اس معلم کو اللہ کا فرمان، جس پر مذہبی تشدد اور تعصب کا بہتان باندھا گیا۔ یہ کسی مذہبی دیوانے یا تخیل پرست فلسفی کے اقوال نہیں، بلکہ یہ اس ذاتِ اقدس پر اللہ کی طرف سے نازل شدہ آیاتِ قرآنی ہیں، جو اپنی قوت کے عروج پر تھا، جو ایک ایسی مقتدر اور بہمہ وجوہ منظم مملکت کا تاجدار تھا، جس میں اتنی طاقت تھی کہ بزورِ شمشیر اس کے احکام کا لوہا منوا سکتی تھی۔

کیا مذہب اور کیا سیاست، دونوں میں افراد اور گروہوں نے رواداری کی تلقین اور عملی تاکید صرف اس وقت تک کی ہے جب تک وہ کمزور اور بے بس تھے۔ جہاں اُن میں اتنی طاقت آئی کہ مخالف قوتوں سے جنگ آزما ہو سکیں، وہیں جبر وتشدد نے رواداری کی جگہ لے لی۔ جب قسطنطین قیصرانِ روم کے تخت پر متمکن ہوا تو عیسائیت آزاد رسانی سے مصئون ہو گئی۔ اسی وقت سے مذہبی ظلم وتعدی کا ایک منظم سلسلہ شروع ہو گیا جس کی نظیر صرف یہود کے یہاں ملتی ہے۔ لیکی کہتا ہے کہ: "جس لمحہ کلیسا کو قسطنطین کے زیرِ سایہ سیاسی اقتدار حاصل ہوا، اُسی لمحے استبداد کا عام اصول مسلم ہو گیا اور اس پر یہودیوں، ملحدوں اور مشرکوں کے خلاف عمل درآمد شروع ہو گیا۔ ان لوگوں کو بے رحمی کے نہایت لطیف طریقوں سے ایذائیں پہنچائی گئیں: انہیں دھیمے دھیمے جلنے والی آگ میں جلایا گیا تاکہ انہیں کلیسائے مسیحی کی رحمدلی اور انسان نوازی پر غور کرنے کا موقع ملے۔ آبائے کلیسا نے یکے بعد دیگرے مذہبی تشدد کے تقدس کے فتوے دیے۔ کلیسا کے اولیا میں سے ایک برگزیدہ ترین ولی نے، ایک ایسے ولی نے جو زہد و تقویٰ میں بے نظیر تھا" جبر واکراہ کے شقی ترین طریقوں کی حمایت میں دلائل پیش کیے۔ اُنیسویں صدی کے آغاز میں یورپ جن عظیم جنگوں کا معرکہ زار بنا اُن کو چھوڑ کر کوئی ایسا موقع نہیں آیا جب کلیسائے مسیحی نے، جو عیسوی رسولوں سے استناد اور کسبِ اختیار کا مدعی ہے، جنگ بازی کی حوصلہ افزائی میں تامل کا اظہار کیا ہو یا مذہب کے نام پر اور مسیح کی عظمت برقرار رکھنے کی خاطر بدعت یا انکار کے مرتکب لوگوں کو تہس نہس کرنے کی مہمیں منظور کرنے میں پس وپیش کیا ہو۔ عیسوی انسان نوازی یا آئینِ اقوام پر ان لوگوں کو کوئی حق نہ پہنچتا تھا اور نہ آج کل بے

جاری سیاہ فام قوموں کو پہنچتا ہے۔ پندرہویں صدی میں پاپائے روم نے ایک خصوصی منشورِ حقوق جاری کیا جس کی رُو سے غیر عیسائی دنیا پرتگیزوں اور ہسپانیوں میں برابر تقسیم ہوگئی اور انہیں مکمل اختیار اس رو سے دیا گیا کہ جن طریقوں سے بھی چاہیں اپنے اپنے حصے کے باشندوں کو عیسائی بنائیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ پرتگیزوں اور ہسپانیوں نے کس فراخدلی سے اس منشور کی تفسیر کی۔ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ جبر و تشدد اور غیر عیسائیوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں جتنے فتنہ انگیز مسائل ہیں وہ سب حضرت عیسیٰ کے سر منڈھ دیے جاتے ہیں مثلاً ان کے ان الفاظ کا مطلب ماؤف کر دیا جاتا ہے کہ انہیں "داخل ہونے پر مجبور کرو۔"

اپنی شاندار کامیابی کے عروج پر، جب رسولِ اکرم ﷺ نے حرمِ کعبہ میں داخل ہو کر وہاں کے بت توڑ ڈالے، اس وقت آپ ﷺ نے مذہبی غیظ و غضب میں نہیں، بلکہ از راہِ رحم و کرم ارشاد فرمایا کہ "حق آ پہنچا ہے، تاریکی رخصت ہوتی ہے۔" آپ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کیا، کمزوروں اور غریبوں پر ظلم کرنے کی ممانعت کی اور انصار میں جو لوگ غلام تھے اُنہیں آزادی بخشی۔

رسول اللہ ﷺ نے رواداری کی محض تلقین ہی نہیں کی، بلکہ اُسے قانون کی صورت میں متشکل کر دیا۔ تمام مفتوحہ قوموں کو مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی۔ اپنے طریقہ عبادت پر عمل کرنے کی اجازت کا معاوضہ انہیں صرف ایک برائے نام جزیے کی صورت میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ جس وقت کوئی غیر مسلم گروہ جزیہ دینے کا اقرار کرتا تھا، اسی وقت سے اس کے مذہب یا اس کی آزادیٔ ضمیر میں کسی قسم کی مزاحمت یا مداخلت شرعِ اسلامی کی خلاف ورزی سمجھی جاتی تھی۔ کیا یہ بات کسی دوسرے مذہب پر صادق آتی ہے؟ تلوار کے ذریعے اسلام کی اشاعت پیغمبرِ اسلام ﷺ و طبعاً ناگوار تھی اور آپ ﷺ کی طبیعت مذہبی مناقشوں سے نفور تھی۔ بار بار ارشاد ہوتا ہے: "جس بات کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے اس پر کیوں بحث کرتے ہو؟ نیکی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو جب تم اللہ کے حضور پلٹ کر جاؤ گے تو اس وقت وہ تمہیں اُن تمام باتوں کی حقیقت بتا دے گا جن کے بارے میں تمہارے باہمی اختلافات تھے۔"

آیئے اب ہم پیغمبر اسلام ﷺ کے غزوات کا جائزہ لیں۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے تابعین اور اطراف مدینہ کے قبیلوں میں جو چپقلشیں ہوئیں ان سب کا باعث بت پرستوں کی جارحانہ اور سفاکانہ عداوت تھی جس نے مسلمانوں کو مدافعانہ اقدامات پر مجبور کر دیا۔ جنگِ موتہ اور مہم تبوک، جو دونوں کسی غیر ملکی سلطنت کے خلاف سب سے پہلی کارروائیاں تھیں، اس لیے ضروری ہوئیں کہ رومیوں نے مسلمانوں کے ایک سفیر کو قتل کر دیا۔ اگر مسلمان مشرقی عیسائیوں کو اس جرم کی سزا نہ دیتے تو غالباً اسلام کے بزورِ شمشیر پھیلائے جانے کا الزام سُننے میں نہ آتا۔ غزوہ موتہ فیصلہ کن ثابت نہ ہوا، اور مہم تبوک جو محض ہرقل کی فوجوں کے اجتماع کو روکنے کے لیے شروع کی گئی، خالصتہً مدافعانہ تھی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں رومیوں کو اپنے جرم کی سزا نہ دی جا سکی، لیکن اُن کے جانشینوں نے اس جرم کو فراموش نہ کیا اور اس کا کماحقہ، معاوضہ وصول کیا۔

رومی سلطنت کے ڈانڈے مسلمانوں کی مملکت سے یوں ملے ہوئے تھے کہ مخاصمت کی بدولت مسلمان عیسائی دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کے ساتھ برسرِ جنگ ہو گئے۔ مزید بریں بازنطینی شہنشاہوں کے روبہ زوال اقتدار کے تحت صوبوں کے حاکم کچھ ایسے خودمختار ہو گئے تھے کہ اُن میں سے کسی ایک کے ساتھ معاہدہ کر کے مسلمان اس صورت حال کا اعلان نہ کر سکتے تھے۔ ابھی ایک کو شکست دے کر اُس سے معاہدہ نہ ہو چکا ہوتا تھا کہ کوئی دوسرا کسی مخاصمانہ کارروائی کا مرتکب ہو جاتا تھا اور مسلمانوں کے لیے ضروری ہو

---

۱ میرا منشا یہ دعویٰ کرنا نہیں کہ مسلمانوں نے کبھی جارحیت یا ہوسِ ملک گیری کے زیرِ اثر عمل نہیں کیا۔ اس قسم کا دعویٰ انسانی فطرت سے پرلے درجے کی جہالت کا اظہار ہوگا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنے دشمنوں اور حملہ آوروں کے مقابلے میں جو بے نظیر اور شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں اور اس طرح انہیں اپنے قرب و جوار کی قوموں کی کمزوری کا جو علم حاصل ہوا تھا اس کے باوجود وہ جادۂ اعتدال پر ثابت قدم اور قانونی حدود کے اندر محصور رہتے ہیں اس امر سے بھی تجاہل نہیں کرتا کہ آنحضرت ﷺ کے پیرووں نے آپس میں لڑائیاں لڑیں اور وہ لڑائیاں اتنی ہی بے رحمی سے لڑی گئیں جتنی عیسائیوں کی باہمی جنگیں۔ لیکن مسلمانوں کی یہ لڑائیاں خاندانی جنگیں تھیں مسلمانوں کے مختلف فرقوں نے ایک دوسرے پر جو تشدد کئے وہ بھی زیادہ تر انہی اسباب کا نتیجہ تھے۔ مثلاً اہل بیت نبوی، یعنی اولادِ علی و فاطمہ، پر جو ستم بنی اُمیہ نے روا رکھے اُن کا سرچشمہ (جیسا کہ میں آگے چل کر واضح کر دوں گا۔) قریش کی وہ پرانی دشمنی تھی جو اُنہیں حضرت محمد ﷺ اور بنی ہاشم سے تھی۔

جاتا تھا کہ اس کے خلاف تادیبی کارروائی کریں۔ چنانچہ جب رومیوں سے معاندت شروع ہوئی، تو مسلمان نتیجۃً ساری عیسائی دنیا سے ایک محاربہ عام میں مبتلا ہو گئے۔

جس طرح عیسائیوں کے یہاں اُسی طرح مسلمانوں کے یہاں بدنیت مقامی سرداروں نے اکثر مذہب کو اپنی حب جاہ کی تسکین کا وسیلہ اور بہانا بنایا ہے۔ جس طرح عیسائی فقہا اور علمائے دین نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی کفر کی دنیا اور عیسائیت کی دنیا، اسی طرح مسلم سوفسطائیوں نے بھی دارالحرب اور دارالاسلام میں فرق قائم کیا ہے لیکن اگر اُن اصولوں کا جن پر مسلم حکومتوں اور غیر مسلم مملکتوں کے باہمی تعلقات مبنی کئے گئے اور بین الاقوامی آئین کے موضوع پر عیسائی مصنفین کی تحریروں کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ اول الذکر میں مؤخر الذکر کی بہ نسبت کہیں زیادہ فراخ دلی اور عالی ظرفی ہے عیسائی حکومتوں نے تو ابھی حال ہی میں اور حالات کے دباؤ کے تحت غیر مسلم مملکتوں کو قوموں کی برادری میں داخل کیا ہے۔ اس کے برخلاف مسلم فقہاء نے حالتِ جنگ اور حالتِ امن کے درمیان تفریق کی چنانچہ دارالحرب میں صرف وہ ملک شامل ہیں جن سے مسلمان برسرِ جنگ ہوں جن ملکوں سے اُن کی صلح ہو وہ دارالامان کے حصے شمار کئے جاتے ہیں۔ ایک حربی یعنی دارالحرب کا باشندہ خالصۃً وکلیۃً ایک غیر ملکی تصور کیا جاتا ہے۔ اُسے اس کا حق نہیں ہوتا کہ صریح اجازت کے بغیر اسلامی مملکتوں میں قدم رکھے۔ لیکن اگر غریب سے غریب مسلمان بھی اُسے امان دے یعنی اس کی حفاظت کا ذمہ دار بنے، تو پورے ایک سال تک وہ ہر قسم کی مداخلت سے مصئون ہوتا ہے۔ ایک سال گزرنے کے بعد ضروری ہے کہ وہ اسلامی مملکت سے چلا جائے۔ دارالامان کا رہنے والا مستامن ہوتا ہے۔ اُسے جو امان دی جاتی ہے وہ ہمیشہ کے لیے ہو سکتی ہے یا ایک محدود مدت کے لیے، لیکن جب تک امان قائم رہے مستامن کے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا وہ اُس معاہدے کی شرائط کے عین مطابق ہو گا جو اسلامی مملکت اور اس ملک کے درمیان ہو۔ مستامن لوگوں کی شرائط کے عین مطابق ہو گا جو اسلامی مملکت اور اس ملک کے درمیان ہو۔ مستامن لوگوں پر اُن کے اپنے قوانین عائد کئے جاتے تھے، انہیں جزیے سے معاف رکھا جاتا تھا اور انہیں اور رعائتیں بھی دی جاتی تھیں۔

جس ضابطہ قوانین نے آئین بین الاقوامی کو احکام شرعی کا ایک جزو بنا لیا، اُس میں جارحیت کا شائبہ بھی کیونکر ہو سکتا تھا؟ آنحضرت ﷺ کے پیرو اپنے اقتدار کے عروج پر بھی ہمیشہ اپنے مخالفوں سے یوں خطاب کرنے کو تیار رہتے تھے۔ ''ہماری مخالفت ترک کر دو اور ہمارے حلیف بن جاؤ تو ہم تم سے اپنا حلف پورا کریں گے، یا ہمیں جزیہ ادا کرو اور ہم تمہارے تمام حقوق کا تحفظ کریں گے، یا ہمارا دین قبول کرو اور ہمارے سارے حقوق میں ہمارے برابر کے شریک بن جاؤ۔''

قرآن کی وہ بڑی بڑی ہدایات جن پر اسلامی قوانین رزم مبنی ہیں، اسلامی نظام کی دانشمندی اور انسان نوازی پر شاہد ہیں:۔

''اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، لیکن زیادتی نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اگر وہ تم پر حملہ کریں تو انہیں ہلاک کر دو۔ لیکن اگر وہ باز آئیں تو جان لو کہ ظالموں کے سوا کسی پر دست درازی روا نہیں۔''

(البقرہ۔ ۱۹۰ تا ۱۹۲)

مسلمانوں نے ایران پر جو لشکر کشی کی تو یہ حالات کا تقاضا تھا۔ نیم عرب بادشاہوں کا ایک خاندان یعنی خاندانِ بنو منذر، جو شہنشاہِ ایران کے زیرِ سایہ حکمران تھا، یوں تو سلطنتِ بازنطین کا سیاسی مخالف تھا، لیکن اس کے ساتھ مذہب اور مفادات کے رشتے میں منسلک تھا۔ رومیوں کے ساتھ مسلمانوں کی جو پہلی آویزش ہوئی اس کا ردعمل اہلِ حیرہ پر ہوا، جو بنو منذر کے باجگزار تھے۔ حیرہ کی قلمرو ایک وسیع قلمرو تھی، جو دریائے فرات کے کنارے سے مغرب کی طرف پھیلی ہوئی تھی اور دشتِ عراق کو پار کرتی ہوئی بازنطینی سلطنت کے باجگزار غسانی عربوں کی چراگاہوں تک جا پہنچتی تھی۔

حیرہ کی حیثیت ایرانیوں کے تحت تقریباً وہی تھی جو قیصرانِ روم آگسٹس، اور ٹائبیرس کے تحت یہودیہ کی تھی۔ مسلمانوں کی فتح کے وقت شہنشاہِ ایران کا مامور کیا ہوا ایک سردار حیرہ پر حکمران تھا لیکن کسریٰ نے ایک ایرانی مرزبان اس کی نگرانی پر مقرر کر رکھا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ کسریٰ دل ہی دل میں بنو منذر کے جانشینوں پر رشک کرتا تھا جن کی رعایا اُتنی ہی شوریدہ سر تھی جتنے اس کے اخلاف آج کل ہیں اور آئے دن ہمسایہ قبیلوں پر

چڑھائیاں کرتی رہتی تھی۔ انہی چڑھائیوں کے نتیجے میں اہلِ حیرہ نے مسلمانوں سے دشمنی مول لے رکھی تھی۔ اسلامی حکومت اُس وقت ایک واحد فرماں روا یعنی خلیفہ کے تحت مضبوط ہو چکی تھی اور آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بدوی قبائل کی سرکوبی کر کے ایک قومی حکومت بن چکی تھی۔ اس کے لیے ناممکن تھا کہ ایک لڑکھڑاتی ہوئی سلطنت کے ایک ادنیٰ سردار کی گستاخیاں برداشت کرتی چلی جاتی، چنانچہ ایک مسلم فوج حیرہ روانہ کی گئی۔ مرزبان بھاگ کر مدائن چلا گیا جو سلطنتِ ایران کا دارالحکومت تھا اور عرب سردار نے کسی قسم کی مزاحمت کیے بغیر مسلم سپہ سالار حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید رضی اللہ عنہ کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

فتح حیرہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ولایتِ کیانی کی دہلیز تک جا پہنچے، ایران کو خانہ جنگی کی ایک طویل مدت کے بعد، جس کے دوران لا تعداد وحشیانہ خونریزیاں اور سفاکیاں ہوئیں، بالآخر ایک قابل اور مستعد حکمران یعنی یزدگرد نصیب ہوا تھا۔ اس حکمران کے زیرِ ہدایت ایرانی سپہ سالار ایک لشکر جرار لے کر مسلمانوں کے مقابلے کو نکلا۔ فاروق اعظم نے جو اس وقت مسندِ خلافت پر جلوہ افروز تھے، ایرانیوں کی دعوتِ مبازرت قبول کرنے سے پہلے اپنے ایلچیوں کے ذریعے حسبِ معمول صلح و امن کی شرائط پیش کیں تاکہ جنگ کی نوبت نہ آئے۔ یہ شرائط حسبِ ذیل تھیں:۔

قبولِ اسلام، جس کے معنی تھے اُن سیاسی خرابیوں کی اصلاح جنہوں نے حکومتِ ساسانی کی حالت اتنی پست کر رکھی تھی۔ اُن تعدی آمیز محصولوں اور بالائی آمدنیوں میں تخفیف جو قوم کا خون چوس رہی تھیں اور آئین محمدی کے مطابق عدل و انصاف، جس کی نگاہوں میں رعایا کے تمام افراد بلا امتیاز رتبہ و منصب مساوی تھے۔ ان شرائط کی متبادل شرط یہ تھی کہ حفاظت کے معاوضے کے طور پر خراج ادا کیا جائے۔ ایرانی بادشاہ نے حقارت کے ساتھ یہ شرائط رد کر دیں جس کا منطقی نتیجہ تھا معرکہ قادسیہ۔ فتح مدائن کے بعد خلیفہ المومنین نے قطعی حکم دیا کہ مشرق کی سمت مسلمان کسی قسم کے حالات میں بھی دریائے دجلہ پار نہ کریں اور دریائے فرات کو ہمیشہ کے لیے عجمی اور مسلم مملکتوں کے درمیان حد فاصل سمجھا جائے۔ اُن کی شراط پر ایک عہد نامہ صلح پر دستخط کیے گئے۔ لیکن ایران کو سرزمین بین النہرین کے ہاتھ سے نکل جانے کا بہت رنج تھا۔ ایرانیوں نے

معاہدے کی جو خلاف ورزیاں یکے بعد دیگرے کیں اُن کا نتیجہ معرکۂ نہاوند کی صورت میں رونما ہوا۔ کسریٰ کی طاقت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ اُس کے سردار اور موبد، جن کا مفاد اس میں تھا کہ بدنظمی اور ظلم وستم کا دور دورہ قائم رہے، اس سے منقطع ہوگئے اور وُہ خود اپنے پیش رو داریوش کی طرح ایک غریب الوطن پناہ گزین بن گیا۔ ایرانیوں نے من حیث القوم مسلمانوں کا استقبال نجات دلانے والوں کے طور پر کیا۔ مسلمانوں نے دجلہ سے لے کر البرز تک اور البرز سے لے کر ماوراالنہر تک جو پیش قدمی کی وہ باعتبار نوعیت و حالات اُس پیش قدمی سے مختلف نہ تھی جو اہلِ برطانیہ نے ہندوستان میں کی۔

ایرانیوں کا مجموعی طور پر مسلمان ہو جانا بسا اوقات اسلام کے عدم رواداری کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن تعصب میں اتنی کورچشمی ہوتی ہے کہ اس کے زیرِ سایہ اہلِ علم بھی اُن حالات کو فراموش کر دیتے ہیں جن کے تحت مسلمان ایران میں داخل ہوئے۔ مذہبی زندگی کا ایک شمہ بھی ایرانیوں میں باقی نہ تھا۔ عوام الناس ایک ایسی خرابی کی چکی میں پسے جا رہے تھے جس سے بڑی خرابی کسی ملک کو لاحق نہیں ہو سکتی، یعنی مذہبی اجارہ داروں کی ایک رذائل میں مبتلا جماعت اور ایک فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی اقلیتی حکومت۔ مزدک ومانی کے پھیلائے ہوئے کفر نے معاشرے کے سارے جوڑ ڈھیلے کر دیئے تھے۔ کسریٰ نوشیروان نے قومی شیرازے کے بکھر جانے کو صرف تھوڑی مدت کے لیے ملتوی کیا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب مسلمان قاعدہ قانون اور امن وامان کے نقیب بن کر ایران میں داخل ہوئے تو اُن کے داخل ہوتے ہی سارے ایرانیوں نے اسلام قبول کر لیا، اور ایران ہمیشہ کے لیے دائرہ اسلام[1] میں آ گیا۔

جو شخص واقعات کا منصفانہ تجزیہ کرے وہ خود اس امر کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ میور کے قولِ ذیل میں کتنی صداقت ہے: ''اسلام کی بقائے دائمی کے لیے ضروری تھا کہ جو جارحانہ طریقہ اُس نے اختیار کیا تھا وہ مسلسل طور پر جاری رکھا جائے اور عالم گیر قبول یا کم

---

[1] مسلمانوں کے مقاصد کی بلندی کی شہادت میں ہم ذیل کی عبارت گبن سے پیش کرتے ہیں: ''ایران کے نظم ونسق کی بنیاد انسانوں، مویشیوں اور زمینوں کی پیداوار کے جائزے پر رکھی گئی۔ اس طرح جو شاندار انتظامی عمارت کھڑی کی گئی اور جو خلفا کی بیدار مغزی کی گواہی دیتی ہے وہ ہر زمانے کے فلسفیوں کے لیے ایک سبق بن سکتی تھی۔''

از کم عالم گیر فضیلت کے بارے میں اس کا جو ادعا تھا وہ بزورِ شمشیر تسلیم کرایا جائے۔'' ہر مذہب اپنے دورانِ حیات میں کسی نہ کسی مرحلے پر اپنے پیروؤں کے میلانات و رجحانات کے مطابق جارحیت پر کاربند رہا ہے۔ اس سے اسلام مستثنیٰ نہیں، لیکن ہم ماننے سے قطعاً انکار کرتے ہیں کہ اسلام نے کبھی بھی بالجبر تبلیغ کو پیش نظر رکھا یا دوسرے مذاہب سے زیادہ جارحیت کا ثبوت بہم پہنچایا۔

اسلام نے صرف اپنے تحفظ کی خاطر تلوار نیام سے نکالی اور اپنے تحفظ ہی کی خاطر اسے اپنے ہاتھ میں رکھا، اور وہ ہمیشہ ایسا کرے گا۔ لیکن اسلام نے کبھی کسی مبنی بر اخلاق مذہب کے اعتقادات و یقینیات میں دخل اندازی نہیں کی، اس نے کبھی تشدد سے کام نہیں لیا، اس نے کبھی کوئی مجلس مواخذہ قائم نہیں کی۔ اس نے اختلافِ رائے کو دبانے، انسانی ضمیر کا گلا گھونٹنے یا بدعت کا قلع قمع کرنے کے لیے کوئی تعذیبی شکنجہ ایجاد نہیں کیا، نہ اُس نے لوگوں کو کھونٹوں سے باندھ کر آگ میں زندہ جلایا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو تاریخ سے واقفیت رکھتا ہے اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ عیسوی کلیسا نے دعویٰ تو کیا مطلق معصومیت کا لیکن ''تاریخ انسانی کے کسی اور ادارے سے بڑھ کر خون معصوماں بہایا۔'' جس مرد یا عورت نے کلیسا سے انحراف کیا یا کسی اور مذہب کو عیسائیت پر ترجیح دی اُسے ایسی سزا ملی جو اگر موت نہ تھی تو موت سے بہتر بھی نہیں تھی۔ ۱۵۲۱ء میں چارلس پنجم نے تمام اہلِ بدعت کے لیے موت اور قرقی املاک کا فرمان جاری کیا۔ شرکت عشائے ربانی سے انکار کی عمومی سزا تھی، آگ میں زندہ جلانا، پھانسی پر لٹکانا، زبان کا گدی سے نکال دینا۔ جب انگلستان نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کیا تو یکے بعد دیگرے متعدد حکمرانوں کے عہد میں پربیسٹیرینوں کو قید کیا گیا، گرم لوہے سے داغا گیا، لولا لنگڑا بنا دیا گیا، اُن کے کوڑے لگائے گئے اور انہیں شکنجوں میں کس کر تشہیر کیا گیا۔ سکاٹ لینڈ میں وہ فراری مجرموں کی طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر پکڑے گئے، اُن کے کان جڑ سے کھینچ کر نکالے گئے، اُنہیں گرم لوہوں سے داغا گیا۔ انگلیاں مروڑنے کے آلے سے بھینچ کر اُن کی انگلیاں توڑ دی گئیں، کالبوتوں کے اندر جکڑ کر اُن کی ٹانگوں کی ہڈیاں چُور چُور کر دی گئیں۔ عورتوں کو سر بازار کوڑے لگائے جاتے تھے۔ کیتھولکوں کو اذیتیں پہنچائی گئیں اور

پھانسی پر لٹکایا گیا۔ ان بطیوں اور ایرینوں کو زندہ نذرِ آتش کیا گیا، یہ تو عیسائی فرقوں کے باہمی سلوک کا حال تھا۔ رہے غیر عیسائی، تو اُن کے معاملے میں کیا کیتھولک اور کیا پروٹسٹنٹ، کیا مقلد اور کیا غیر مقلد، سب میں مکمل اتفاق رائے تھا۔ مسلمان اور یہودی عیسائیت کے دائرے سے، نہیں انسانیت کے دائرے سے، خارج تھے۔ انگلستان میں یہودیوں کو عذاب کا تختہ مشق بنایا گیا اور پھانسیاں دی گئیں۔ ہسپانیہ میں مسلمان جلائے گئے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان، عیسائیوں اور ''کافروں'' کے درمیان، شادیاں قانوناً کالعدم شمار ہوتی تھیں، بلکہ ممنوع تھیں اور اُن کے لیے حد درجے کی گھناؤنی اور بھیانک سزائیں مقرر تھیں۔ آج بھی عیسائی امریکہ اُس عیسائی نیگرو کو جو کسی سفید فام عورت سے شادی کر لے زندہ جلا دیتا ہے! یہ ہیں عیسائیت کے اثرات ونتائج۔

آج تک، جہاں کہیں سائنسی تفکر نے ایک نئی روح نہیں پھونکی، جہاں کہیں صحیح تمدن نہیں پنپا، مسلمانوں کو خارجی سمجھنے اور اُن سے تعصب برتنے کی پرانی عادت، اسلام سے کلیسا کی قدیمی نفرت کتابوں میں، اخباروں میں، تقریروں میں عام گفتگو میں، غرض جلوت وخلوت میں اپنے آپ کو بے نقاب کرتی ہے۔ جبر وتشدد کا رجحان عیسائیت میں آج بھی باقی ہے۔ اُس کی آگ راکھ میں دبی ہوئی موجود ہے اور کسی متعصب کے چھوتے ہی بھڑک اُٹھنے کو تیار۔

آیئے اب ہم اس منظر سے منہ موڑ کر دنیائے اسلام کی طرف متوجہ ہوں۔ جہاں راسخ العقیدہ عیسائی یہودیوں اور نسطوریوں پر ظلم وستم کر رہے تھے، کیونکہ یہ اُن لوگوں کے اخلاف تھے جنہوں نے اُن کے خیال میں اُن کے مجسم خدا کو صلیب پر لٹکایا تھا اور اس کی ماں کی پرستش کرنے سے انکار کیا تھا۔ وہاں اسلام نے ان دونوں قوموں کو اپنی امان میں لے لیا۔ جہاں عیسوی یورپ جادوگرنیوں اور بدعت کے مجرموں کو زندہ جلا رہا تھا اور یہودیوں اور کافروں کے قتلِ عام میں مصروف تھا، وہاں مسلمان حکمران اپنی غیر مسلم رعایا سے رواداری ومراعات کا سلوک کر رہے تھے۔ غیر مسلم مملکت کے معتبر شہری تھے، مجالسِ شوریٰ کے ارکان تھے، مسلمانوں کے دوش بدوش ہر غیر مذہبی منصب کے مستحق شمار ہوتے تھے۔ خود معلم اسلام نے مسلمان مردوں کو عیسائی، یہودی اور زرتشتی عورتوں

سے شادی کرنے کی اجازت دی تھی۔ مسلمان عورتوں کو بدیہی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر غیر مسلم مردوں سے شادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مسلم ترکی اور ایران نے اپنے غیر ملکی مفادات اپنی عیسائی رعایا کو تفویض کیے۔ عیسائیت میں اختلاف مذہب ایک جرم ہے، اسلام میں وہ محض ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ اکرٹ کہتا ہے ''عیسائیوں کے لیے اختلاف مذہب فی الواقعہ جنگ کا جائز سبب تھا اور یہ صرف قرونِ مظلمہ ہی میں اور مذہبی دیوانوں کے یہاں ہی نہیں۔'' شارلمین نے سکینوں، فریزیوں اور دوسرے جرمن قبیلوں کا جس طرح قتلِ عام کیا، ہزاروں بے گناہ مرد اور عورتیں جس بیدردی سے زندہ نذرِ آتش کی گئیں۔ ایرین پالپیشین، آبی جنیز اور ہیوجناٹ جس سفاکی سے ہلاک کیے گئے، ماگڈ برگ اور روم کو جس ہیبت ناک طریقے سے تاخت و تاراج کیا گیا۔ اسی سالہ جنگ میں جو بھیانک خونریزیاں ہوئیں، ان سب سے شروع کر کے کیلون کے پیرو سکاٹ لینڈ اور لوتھر کے پیرو انگلستان کی تشدد آزمائیوں تک عدم رواداری، تعصب اور کٹرپن کے مظاہروں کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آتا ہے۔ امریکہ کے مرنجان ومرنج اصلی باشندوں کو جس طرح مسیح کے نام پر جس بے دریغی سے تباہ کیا گیا کیا اُس سے زیادہ روح فرسا کوئی داستان ہوسکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عربدہ جوئی کا ذوق عیسائیت نے اسلام کی جارحیت سے حاصل کیا۔ !العجب !ثم العجب!

عیسائیت کے نام پر جسٹینیں نے جو قتلِ عام کیے اور کلووس نے جو ہیبت ناک محاربے کیے وہ محمد عربی ﷺ کے ظہور سے بہت پہلے واقع ہوئے۔

آیئے ذرا ہم صلیبی رزم آراؤں اور مسلم مجاہدوں کے کردار کا بھی موازنہ کریں۔ ''جب خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ نے ۶۳۷ء میں، یروشلم فتح کیا تو وہ بطریق سوفرونیس کی ہمرکابی میں اور اس کے ساتھ شہر کے آثارِ قدیمہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے، داخلِ شہر ہوئے۔ نماز کا وقت آیا تو انہوں نے Church of the Resurrction میں، جہاں وہ اس وقت اتفاقاً تھے، نماز ادا کرنے سے انکار کر دیا اور اُس کے بجائے کلیسائے قسطنطین کی سیڑھیوں پر نماز ادا کی۔ اس کی توجیہ انہوں نے بطریق کو ان الفاظ میں بیان کی۔

"اگر میں گرجا کے اندر نماز پڑھتا تو احتمال تھا کہ میری مثال کا عذر پیش کر کے مسلمان آئندہ کسی وقت معاہدہ شکنی کے مرتکب ہوتے" لیکن جب صلیبی جنگجوؤں نے یروشلم فتح کیا تو انہوں نے بچوں کو سر کے بل دے پٹخا، شیر خوار بچوں کو قلعے کی فصیلوں پر سے باہر پھینک دیا، آدمیوں کو جلتی ہوئی آگ پر بھونا، لوگوں کے پیٹ یہ دریافت کرنے کے لیے چاک کر دیئے کہ انہوں نے سونا تو نہیں نگل رکھا۔ یہودی اپنے معبدوں میں بند کر کے جلا دیئے گئے تقریباً ستر ہزار آدمی تہہ تیغ کر دیئے گئے اور پاپائے روم کے ایلچی نے اس جشنِ قتلِ عام میں حصہ لیا"۔ جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے یروشلم دوسری بار فتح کیا تو اس نے تمام عیسائیوں کو رہائی بخشی، اُنہیں خوراک اور نقدی دی اور اُن کے بحفاظتِ تمام رخصت ہونے کا بندوبست کر دیا۔

اسلام نے اپنے تحفظ کی خاطر تلوار سنبھالی عیسائیت نے اس لیے سنبھالی کہ آزادی فکر اور آزادی عقیدہ کو کچل ڈالے جب قسطنطین نے دینِ عیسوی قبول کیا تو عیسائیت مغربی دنیا کا غالب مذہب بن گئی۔ اس کے بعد اُسے دشمنوں سے کوئی خطرہ نہ رہا۔ لیکن اقتدار حاصل کرتے ہی اُس کی طبعی سیرت، یعنی علیحدگی اور دوسروں سے نفرت، سطح پر آ گئی۔ جہاں کہیں عیسائیت کا غلبہ ہوا کسی اور مذہب کے پیرو ظلم و تعدی سے محفوظ نہ رہے۔ اس کے برعکس مسلمان دوسروں سے امن و آشتی کی ایک سیدھی سادی ضمانت طلب کرتے تھے، یعنی یا تو حفاظت کے عوض خراج یا قبولِ اسلام کی صورت میں مسلمانوں کے ساتھ تمام حقوق و رعایات میں مکمل مساوات۔

پانچواں باب

اِسلام میں عورتوں کی حیثیت

الجنّت تحت اقدام الا مہّات

جنت ماؤں کے قدموں میں ہے۔

معاشرتی نشوونما کے ایک مرحلے میں تعددِ ازواج ، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں تعداد ازواج یعنی ایک مرد کا بیک وقت ایک سے زیادہ عورتوں کا شوہر ہونا، ایک ناگزیر امر ہوتا ہے۔ قدیم زمانوں میں آئے دن کی قاتل جنگوں کے باعث مردوں کی آبادی میں جو کمی واقع ہو جایا کرتی تھی جس سے عورتوں کے عددی تناسب کا پلہ بھاری ہو جایا کرتا تھا، کچھ اس کی بدولت اور کچھ اس وجہ سے کہ قبائلی سرداروں کو جو مرد ہوتے تھے، مطلق اختیار حاصل تھا یہ دستور وجود میں آیا۔ جسے ہمارے ترقی یافتہ زمانے میں بجا طور پر ایک ناقابلِ برداشت خرابی سمجھا جاتا ہے۔

پرانے وقتوں کی تمام مشرقی اقوام کے یہاں تعداد ازدواج ایک مانا ہوا ادارہ تھا۔ چونکہ بادشاہ جو صفتِ الٰہیت سے متصف سمجھے جاتے تھے، اس پر عمل کرتے تھے، لہٰذا یہ رواج عام لوگوں کی نظروں میں مقدس ہوگیا۔ ہندوؤں کے یہاں تعداد ازدواج چند زنی اور چند شوئی دونوں صورتوں میں قدیم ترین زمانوں سے رائج تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مادیوں، بابلیوں، اسوریوں اور ایرانیوں کی طرح ہندوؤں میں بھی ایک مرد بہ یک وقت لاتعداد عورتوں کا شوہر ہوسکتا تھا۔ اونچی ذات کے برہمن کو آج کل کے زمانے میں

بھی جتنی بیویاں وہ چاہے اُتنی بیویوں کی اجازت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت سے پہلے بنی اسرائیل کے یہاں میں تعددِ ازواج کا دستور تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے قائم رہنے دیا یہاں تک کہ انہوں نے اس کی کوئی حد بھی مقرر نہ کی کہ ایک یہودی مرد بیک وقت کتنی عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھ سکتا تھا۔ بعد کے زمانے میں تلمود یروشلم نے یہ پابندی عائد کی کہ ایک مرد صرف اتنی عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے جتنی عورتوں کو نان ونفقہ مہیا کرنے کی اس میں استطاعت ہو۔ اگرچہ ربیوں کی یہ ہدایت تھی کہ کسی مرد کے چار سے زیادہ بیویاں نہ ہونی چاہئیں لیکن قرائین کو اُن سے اختلاف رائے تھا اور وہ تعیینِ حد کے قائل نہ تھے۔

ایرانیوں کے مذہب نے بیویوں کی کثرت کو قابلِ انعام قرار دیا۔

سوری فینیقی قوموں میں جنہیں بنی اسرائیل نے جلا وطن، مسخر یا تباہ کیا، تعددِ ازواج بہیمیت کی حد تک گر گیا تھا۔

تھریس اور پیلاسگیا کی قوموں کے یہاں، جو یورپ اور مغربی ایشیا کے مختلف حصوں میں آباد تھیں، تعددِ ازدواج حدِ اعتدال سے اس قدر متجاوز ہو گیا تھا کہ کوئی دوسری قوم اس امر میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اہلِ ایتھنز کے یہاں، جو ازمنہ قدیم کی تمام قوموں سے زیادہ مہذب اور شائستہ تھے، بیوی محض ایک اثاثہ تھی جسے خرید و فروخت کیا جا سکتا تھا، بلکہ وصیتہً منتقل بھی کیا جا سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک بری چیز سمجھی جاتی تھی، جو محض گھر بار چلانے اور بچے جننے کے لیے ضروری تھی۔ ایتھنز کے شہریوں کو بے حد و حساب بیویوں کی اجازت تھی، چنانچہ ڈیموسیتھنز فخریہ بیان کرتا ہے کہ اس کی قوم میں عورتوں کے تین طبقے تھے، جن میں سے دو طبقے نکاحی بیاہی اور نیم نکاحی بیاہی عورتیں مہیا کرتے تھے۔

اہلِ سپارٹا کے یہاں مردوں کو خاص حالات کے سوا ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہ تھی، لیکن عورتوں کو بہ یک وقت متعدد شوہروں کی اجازت تھی اور اس اجازت سے تقریباً ہمیشہ فائدہ اُٹھایا جاتا تھا۔

جن مخصوص حالات میں رومی مملکت قائم ہوئی انہوں نے غالباً اس امر کی

اجازت نہ دی کہ شروع شروع میں تعددِ ازواج کو قانوناً جائز قرار دیا جائے۔ صابی عورتوں کے استحصال بالجبر کے قصے کی تاریخی صداقت چاہے کچھ بھی ہو، اس قصے کا موجود ہونا ہی اُن اسباب کا شاہد ہے جن کی بنا پر رومیوں نے شادی سے متعلق اپنے غیر مہذب قوانین وضع کئے۔ آس پاس کی مملکتوں اور بالخصوص ایٹرسکنوں کے یہاں تعداد ازواج ایک ایسا رواج تھا جس کے ساتھ چند رعایات وابستہ تھیں۔ رومیوں کو اٹلی کی دوسری قوموں سے جو سابقہ پڑا اور جن جنگوں اور فتوحات میں وہ صدیوں تک مشغول رہے انہوں نے عیش وعشرت کی اُن عادتوں سے مل کر جو کامیابی اور خوشحالی نے پیدا کی تھیں بالآخر رومیوں کے یہاں شادی کے تقدس کو محض ایک کہاوت بنا دیا۔ تعدد ازواج قانوناً تو جائز نہ تھا، لیکن ''چونکہ جنگوں میں ظفرمندی کے بعد رومہ کی خواتین کے دلوں میں ایک آزاد اور خوشحال مملکت کی منفعتوں سے تمتع اندوز ہونے کی اُمنگیں پیدا ہوئیں، اور اُن کی اُمنگیں اُن کے خاوندوں اور عاشقوں کی نفس پرستیوں نے پوری کر دیں۔'' تھوڑی ہی مدت کے بعد شادی بے محابا داشتہ بازی کی ایک صورت بن گئی۔ قوانین مملکت کی تائید حاصل کر کے داشتہ بازی ایک ایسا ادارہ بن گئی جو مراعاتِ خاص کا مستحق تھا۔ عورتوں کی کھلم کھلا آزادی مردوں کے ساتھ اُن کا ڈھیلا ڈھالا رشتہ، بیویوں کے کثیر الوقوع تبادلے، یہ سب چیزیں تعددِ ازواج پر دلالت کرتی ہیں، البتہ انہیں یہ نام نہیں دیا گیا۔

دریں اثنا جس ابتدائی عیسائیت کی تبلیغ گلیلی کے ساحل پر ہوئی تھی اس نے سای رومی دنیا کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اسینیوں کے اثرات نے، جن کا واضح ثبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں ملتا ہے، اُن کی اس قوی اُمید سے مل کر کہ آسمانی بادشاہی قائم ہونے والی تھی، انہیں اس پر آمادہ کیا کہ ازدواجی زندگی کو مذموم قرار دیں، اگرچہ انہوں نے کبھی اسے صراحتہً منع نہیں کیا۔

جب تک جسٹینین کے قوانین نے تعدد ازدواج کو ممنوع قرار نہ دیا اس وقت تک وہ ایک نمایاں صورت میں رائج رہا۔ بلکہ قانونی ممانعت نے بھی لوگوں کے اخلاقی خیالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی۔ چنانچہ تعدد ازواج پر اُس وقت تک عمل ہوتا رہا جب تک کہ جدید معاشرے کی رائے نے اسے معیوب قرار نہ دیا۔ پہلی بیوی کے سوا کسی بیوی

کو کوئی قانونی حقوق حاصل نہ تھے۔ اُن حقوق اور مراعات سے محروم رہ کر جو پہلی بیوی کو حاصل تھے، دوسری بیویاں اپنے خاوندوں کی من کی موج کی غلام ہوتی تھیں، اُن کے بچوں پر حرامزدگی کا کلینک کا ٹیکہ لگا ہوتا تھا؛ وہ باپ کی جائیداد میں سے ایک حصے کے بھی حقدار نہ ہوتے تھے اور سماج میں ذات پات سے خارج شمار کئے جاتے تھے۔

اُونچے طبقے کے مردوں کی نچلے طبقے کی عورتوں سے شادیاں جن میں ایک شرط نکاح یہ ہوتی تھی کہ اولاد کو کوئی حقِ وراثت نہ پہنچے گا اور ایسی شادیاں جن میں اس امر کی علامت کے طور پر کہ بیوی کو اور اس کی اولاد کو کوئی حقوقِ وراثت نہیں، دولہا اپنا بایاں ہاتھ دُلہن کو تھما دیتا تھا، دونوں طرح کی شادیاں صرف اعلیٰ طبقے ہی تک محدود نہ تھیں بلکہ عام تھیں۔ اور تو اور، پادری لوگ بھی اپنے عہدِ تجرد کو بھول کر ایک سے زیادہ شرعی یا غیر شرعی شادیاں کیا کرتے تھے۔ تاریخ حتمی طور پر ثابت کرتی ہے کہ پچھلے چند سالوں سے پیشتر تعدد ازدواج کو اتنا معیوب نہ سمجھا جاتا تھا، جتنا اب سمجھا جاتا ہے۔ اوروں کا تو تذکرہ ہی کیا، خود سینٹ آگسٹین کو اس میں کوئی بنیادی خرابی اخلاقی یا معصیت نظر نہ آتی تھی، چنانچہ انہوں نے اعلان کیا کہ اگر وہ کسی ملک میں قانوناً جائز تھی تو اُسے شرعی نواہی میں شمار نہ کرنا چاہیے۔ ہیلم کے قول کے مطابق جرمن مصلحین نے ابھی سولہویں صدی میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ پہلی شادی سے کوئی اولاد نہ ہونے کی صورت میں یا اسی طرح کے اور اسباب کی بنا پر دوسری شادی بلکہ تیسری بھی جائز ہے۔

بعض محققین، اگرچہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ تعدد ازدواج میں کوئی بنیادی خرابی اخلاقی نہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے قطعاً یا صراحتہً اس کی ممانعت نہیں کی، تاہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ یک زوجگی کا جو دستور یورپ میں آج کل عام ہے وہ عیسائیت پر جرمن اور یونانی و رومی خیالات کا پیوند لگ جانے کا نتیجہ ہے۔ یہ رائے تاریخی واقعات کے منافی ہے اور قابلِ تسلیم نہیں۔ جہاں تک جرمنوں کا تعلق ہے، اس دعوے کی تائید کہ اُن کے یہاں ہمیشہ سے یک زوجگی کا دستور تھا صرف دو ایک رومیوں کی غیر مصدق شہادت سے ہوتی ہے، جس کا اعتبار اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ واقعات کے معاملے میں رومی بالکل غیر معتمد گواہ تھے اور اگر اخفائے حقیقت سے انہیں کوئی ذاتی فائدہ متوقع ہوتا تو کبھی اس سے گریز نہ کرتے تھے۔

علاوہ بریں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر ٹیسی ٹس نے اپنی کتاب ''جرمنوں کے طور طریقے'' لکھی وہ کیا تھا۔ یہ کتاب خود رومیوں کی شہوت پرستی پر ایک حملہ تھی ،جس کا مقصد یہ تھا کہ بربر قوموں کے فرضی محاسن سے رومیوں کے پست اخلاق کا موازنہ کر کے روم کے معاشرے کو بہتر خیالات سے روشناس کرایا جائے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ٹیسی ٹس کی رائے درست تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جرمنوں کے اعلیٰ طبقوں میں اُنیسویں صدی تک تعددِ ازدواج کا جو عام رواج تھا اُس کی توجیہہ کیونکر کی جا سکتی ہے؟

ابتدائی زمانے میں رومیوں کے یہاں جو رواج بھی رہا ہو یہ واضح ہے کہ جمہوری روما کے آخری ایام میں اور سلطنت روما کے آغاز میں تعدد ازواج یقیناً ایک تسلیم شدہ رواج تھا یا کم از کم خلافِ قانون نہ سمجھا جاتا تھا۔ جس فرمان نے اس رواج کی عمومیت کو محدود کیا اُس میں اس کا وجود اور اس کی مشق دونوں مفروض ہیں۔ یہ فرمان اس خرابی کو رفع کرنے میں رائے عامہ کی رو کا رُخ بدلنے میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ ایک طرف تو اس سے ظاہر ہے کہ شہنشاہ ہان اور نوریس اور آرکیڈیس، نے چوتھی صدی عیسوی کے اخیر میں سے از سرِ نو جاری کیا اور دوسری طرف اس سے کہ قسطنطین اور اس کے بیٹے دونوں کی متعدد بیویاں تھیں۔ شہنشاہ ویلینٹین ثانی (Valentine II) نے ایک نئے فرمان کے ذریعے سلطنت کے تمام مردوں کو متعدد بیویاں رکھنے کی عام اجازت دی۔ اُس زمانے کی تاریخ کلیسا سے اس امر کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی کہ بشپوں اور عیسائی گرجوں کے سربراہوں نے اس قانون پر کوئی اعتراض کیا۔ کلیسا کا اعتراض کرنا تو بجائے خود رہا ایک طرف ویلنٹین کے بعد جتنے شہنشاہ آئے سب نے تعددِ ازواج پر عمل کیا اور لوگوں نے ان کی مثال کی تقلید میں کوتاہی نہ کی۔

قانون کی یہ صورتِ حال شہنشاہ جسٹینین (Justinian) کے وقت تک برقرار رہی، جب اس دانشمندی اور تجربہ کاری نے جو ترقی اور نشو و نما کی تیرہ صدیوں کا جمع شدہ ماحصل تھی اپنے آپ کو اُن قوانین کی صورت میں ظاہر کیا جنھوں نے اس شہنشاہ کے بدنام دورِ حکومت پر ایک جھوٹا ملمع چڑھا دیا۔ لیکن یہ قوانین کم از کم براہِ راست عیسائیت کے مرہونِ منت نہ تھے۔ جسٹینین کا سب سے نمایاں مشیر ایک مُلحد تھا۔ جسٹینین نے تعددِ

ازدواج کو قانوناً منع کردیا، لیکن اس کی طرف لوگوں کا جو عام رجحان تھا اس کی روک تھام نہ کرسکا۔ قانون فکری تقرری کا آئینہ دار تھا۔ اس کا اثر چند ارباب فکر تک محدود رہا۔ جہاں تک عوام کا تعلق تھا اُن کے لیے وہ محض ایک تقویم پارینہ تھا۔

یورپ کے مغربی حصے میں بربریوں کے زبردست ہنگامے اور اُن کے اخلاقی خیالات کے مقامی لوگوں میں نفوذ کر جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات ناگفتہ بہ ہوگئے۔ بعض بربریوں کے قانونی ضابطوں میں تعددِ ازدواج سے متعلق پابندیاں تھیں۔ لیکن قول کی بہ نسبت عمل زیادہ مؤثر ثابت ہوا۔ چنانچہ اُن کے بادشاہوں نے بہت سی بیویاں کرنے کی جو مثال پیش کی عوام الناس نے فوراً تقلید کی۔ اور تو اور پادری لوگ بھی، اس کے باوجود کہ کلیسا انہیں تجرد کی تلقین کرتا تھا، متعدد نیم منکوحہ بیویوں کے رواج سے مستفید ہونے لگے۔ اس کے لیے مقامی بشپ یا مقامی Diocese کے سربراہ کی اجازت کافی ہوتی تھی۔

عیسائی مصنفین کو اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہوئی ہیں اُن میں سب سے زیادہ تشنیع طلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تعددِ ازدواج کی داغ بیل ڈالی یا اُسے قانونی حیثیت دی۔ یہ خیال کہ وہ اس کے مؤجد تھے، محض جہالت کا نتیجہ اور ثبوت تھا اور تحقیق نے اس کی دھجیاں اُڑا دی ہیں، لیکن یہ خیال اب بھی نہ صرف عیسائی دنیا کے عوام میں بلکہ بہت سے ارباب علم میں رائج ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس دستور کو اختیار کیا اور اُسے قانونی جواز بخشا۔ اس سے بڑھ کر باطل کوئی عقیدہ نہیں ہوسکتا۔

تعددِ ازدواج نہ صرف عربوں کے یہاں بلکہ ہمسایہ ملکوں کے لوگوں کے یہاں رائج تھا اور مؤخر الذکر کے یہاں تو اس نے نہایت کریہہ شکلیں اختیار کر رکھی تھیں۔ یہ بجا ہے کہ عیسائی مملکت کے قوانین نے اس خرابی کے رفع کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے تھے۔ تعددِ ازدواج کی رسم روک ٹوک کے بغیر جاری رہی۔ پہلی بیوی کے سوا، جسے محض تقدمِ زمانی کے طفیل ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوتی تھی، باقی سب بیویوں کو عدم حقوق کی سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں۔

آنحضرت ﷺ کے ظہور کے وقت ایران میں خرابی اخلاق نہایت افسوسناک

صورت اختیار کر چکی تھی۔ ازدواج کے بارے میں کوئی مسلم قانون نہ تھا اور اگر تھا بھی تو اُس پر مطلق عمل نہ کیا جاتا تھا۔ چونکہ ژند اوستا میں بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ کی گئی تھی لہٰذا ایرانیوں کی نہ صرف بہ یک وقت متعدد بیویاں ہوتی تھیں بلکہ اُن کے علاوہ لاتعداد داشتہ عورتیں بھی۔

قدیم عربوں اور یہودیوں کے یہاں متعدد بیویوں کے علاوہ مشروط اور عارضی عقد بھی ہوتے تھے۔ عائلی اخلاق کے بارے میں اس ڈھیل نے معاشرے کے نظام پر نہایت مضر اثر ڈالا۔

آنحضرت ﷺ نے جو اصلاحات کیں اُن سے عورتوں کی حیثیت بدرجہا بہتر ہوگئی۔ کیا یہودی اور کیا بدوی عرب دونوں کے یہاں عورتوں کی حالت نہایت خستہ و خراب تھی۔ ایک یہودی بدوی لڑکی اپنے والد کے گھر میں بھی ایک نوکرانی کی حیثیت رکھتی۔ سن بلوغ سے پہلے اس کے والد کو اختیار ہوتا تھا کہ جی چاہے تو اُسے بیچ ڈالے۔ باپ کی وفات کی صورت میں بھائیوں کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا تھا۔ بیٹی کو ورثے میں ایک حبہ نہ جڑتا تھا، الا اس صورت کے کہ کوئی مرد وارث ہی نہ ہو۔ شہری عرب کفار کے یہاں، جن پر اردگرد کی مملکتوں کے فاسد اور انحطاط یافتہ تمدّن کا اثر ہو چکا تھا، عورت محض ایک چیز بست سمجھی جاتی تھی۔ اور اپنے خاوند یا باپ کی جائداد کا ایک حصہ شمار کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک متوفی مرد کی بیوائیں دوسری املاک کی طرح اُس کے بیٹوں کو ورثے میں ملتی تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھیں وہ سوتیلے بیٹوں اور سوتیلی ماؤں کی آپس میں شادیاں جنہیں اسلام نے نکاح لامقت (شرمناک یا مکروہ نکاح) کے نام سے مطعون کر کے منع کر دیا۔ یمن کے نیم یہودی اور نیم صابی قبیلوں کے یہاں تو ایک عورت کے بیک وقت بہت سے مردوں کی بیوی ہونے کا دستور بھی تھا۔

اعرابِ جاہلیت کو عورتوں سے اس درجہ نفرت تھی کہ وہ اکثر اپنی بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ یہ خوفناک دستور قریش اور کندہ کے قبیلوں میں سب سے بڑھ کر رائج تھا۔ حضرت محمد ﷺ نے غضب آمیز الفاظ میں اس کی مذمت کی اور سخت سزائیں مقرر کر کے اس کا اُسی طرح انسداد کیا جس طرح انہوں نے بچوں کو بتوں کی بھینٹ چڑھانے کی رسم کا قلع قمع کیا، جس پر قریش و کندہ کے قبیلے قدیم زمانے کی اکثر قوموں کی طرح عمل کرتے تھے۔

ایرانی اور بازنطینی مملکتوں میں عورتوں کا معاشرتی درجہ بے حد پست تھا۔ بہت سے مذہبی دیوانے، جنہیں بعد کے زمانوں میں کلیسا نے ولایت کا رتبہ بخشا، ان کے خلاف وعظ کرتے تھے اور ان کی خباثتیں بیان کرتے تھے۔ وہ یہ بھول جایا کرتے تھے کہ انہیں عورتوں میں جو برائیاں دکھائی دیتی تھیں، وہ اُن کے متعصب دماغوں کی پیداوار تھیں۔ ایسے وقت میں، جب معاشرے کا شیرازہ درہم برہم ہو رہا تھا، جب وہ تمام رشتے جنہوں نے معاشرے کو اُستواری بخش رکھی تھی ٹوٹ رہے تھے، جب ہر طرف سے یہ شور اُٹھ رہا تھا کہ تمام پرانے نظاموں کو تجربے کی ترازو میں تول کر دیکھا گیا اور سب کے سب ناقص پائے گئے...... ایسے وقت میں پیغمبر اسلام ﷺ کی اصلاحات عورتوں کے حق میں ایک آیہ رحمت بن کر آئیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی مذہبی تعلیمات کا ایک بنیادی عنصر عورتوں کا احترام تھا۔ آپ ﷺ کے متبعین کے دلوں میں آپ ﷺ کی دُختر نیک اختر کی جو عزت تھی اُس کی بنا پر اُنہوں نے اُسے ''خاتونِ جنت'' کا لقب دیا، جو صنفِ اناث کی خدمت میں ایک خراج عقیدت تھا۔ 'فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا'' اُن تمام قدسی صفات کا مجسمہ تھیں جو خدا نے عورت کی ذات میں ودیعت کی ہیں، یعنی خلوص، صداقت اور پاکیزگی اور تمام وہ صفاتِ محمودہ جو انسان کے مثالی کمال کی آئینہ دار ہیں...... اُن سے ایسی خواتین کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جن کے محاسن و فضائل نے صنفِ اناث کو چار چاند لگا دیئے...... کون ہوگا جس نے ولیہ رابعہ اور اُن کی قبیل کی ہزاروں نیک بی بیوں کا نام نہ سُنا ہو؟

جو قوانین رسولِ عربی نے نافذ کیے اُن میں آپ ﷺ نے مشروط نکاحوں کا قاعدہ قطعاً ممنوع قرار دیا۔ جہاں تک عارضی نکاحوں کا تعلق تھا، اگرچہ شروع شروع میں علانیہ ممانعت نہ کی گئی، لیکن تیسرے سنہ ہجری میں یہ بھی حرام کر دی گئیں[1]۔ رسولِ اکرم ﷺ نے

---

[1] شیعوں کا ایک گروہ عارضی نکاحوں کو اب بھی مباح قرار دیتا ہے، لیکن جن مجتہدین نے اس رائے کا اظہار کیا ہے، اگرچہ میں اُن کا احترام کرتا ہوں، تاہم میں یہ خیال کرنے پر مجبور ہوں کہ یہ رائے وقتی مذاق کی تسکین یا سلاطینِ وقت کو خوش کرنے کی خاطر ظاہر کی گئی تھی۔ ان مجتہدین کی آرا میں جابجا ذاتی میلانات کے آثار پائے جاتے ہیں۔

اپنے آئینی نظام میں عورتوں کو ایسے حقوق عطا کئے جو اسے سے پہلے اُنہیں کبھی نصیب نہ ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں ایسی ایسی خصوصی مراعات بخشیں جن کی قدر شناسی زمانہ کچھ اور ترقی کرنے کے بعد کرے گا۔ آپ ﷺ نے تمام قانونی اختیارات و وظائف میں عورتوں کو مردوں کے برابر مرتبہ بخشا۔ انہوں نے بیویوں کی تعداد کی شرعی حد مقرر کر کے اور سب بیویوں سے مساوی سلوک کی شرط شوہروں پر عائد کر کے تعدّد ازواج پر پابندیاں لگا دیں۔ یہ قابلِ ملاحظہ ہے کہ قرآن کی جو آیت بیک وقت چار بیویوں کی اجازت دیتی ہے، اس کے بعد فوراً بعد ایک ایسا جملہ جو اس آیت کے دائرہ اطلاق کو مناسب طور پر محدود کر دیتا ہے۔ آیت یہ ہے: ''اور عورتوں میں سے جو تمہیں بھائیں دو، تین یا چار بیویاں کر سکتے ہو،'' اس کے بعد کا جملہ یہ ہے: ''لیکن اگر تم سب کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک نہیں کر سکتے تو تمہیں صرف ایک ہی عورت پر اکتفا کرنا چاہیے۔'' دنیائے اسلام کے اکابر مفکرین نے بالخصوص اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ لفظ ''عدل'' کے معنی محاورۂ قرآن میں کیا ہیں، اس جملہ شرطیہ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ ''عدل'' سے عبارت صرف مکان، لباس اور دوسری خانگی ضروریات کے معاملے ہی میں مساوات سلوک نہیں، بلکہ محبت، شفقت اور عزت کے معاملے میں بھی مکمل مساوات۔ چونکہ جذبات کے معاملے میں کامل عدل و انصاف ناممکن ہے لہٰذا قرآن کا یہ حکم فی نفسہٖ ایک ممانعت ہے۔ یہ تفسیر زمانۂ حال کی نہیں، بلکہ تیسری صدی ہجری میں کی گئی[1]۔ خلیفہ المامون کے عہد میں اولین حکمائے معتزلہ نے یہ رائے ظاہر کی کہ تکمیل یافتہ شریعتِ قرآنی وحدتِ ازواج کا تقاضا کرتی ہے۔ اگرچہ خلیفہ متوکل کے مجنونانہ تعصب نے اس سے جو مظالم کروائے انہوں نے اس تعلیم کی اشاعت کو روک دیا۔ تاہم تمام ترقی یافتہ مسلم جماعتوں میں یہ یقین رفتہ رفتہ پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ تعدّد ازواج تعلیماتِ محمدی کے اسی قدر منافی ہے جس قدر وہ تہذیب و تمدن کی عمومی ترقی کے منافی ہے۔

---

[1] ردالمختار میں صراحتاً لکھا ہے: ''بعض حکما (معتزلہ) یہ رائے رکھتے ہیں کہ عدل میں محبت و شفقت کی مساوات شامل ہے، لیکن ہمارے ائمہ اس رائے سے اختلاف رکھتے ہیں اور عدل کو نفقہ کے معاملے میں مساوی سلوک تک محدود خیال کرتے ہیں جس سے قانون کی زبان میں کھانا، کپڑا اور مکان مراد ہے۔''

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعدد ازدواج کا وجود حالات پر منحصر ہے بعض بعض اوقات اور بعض بعض حالات میں یہ عورتوں کو بھوک ننگ اور ناداری سے بچانے کی خاطر بالکل ناگزیر ہوتا ہے۔ اگر اخبار واطلاعات اور اعداد وشمار واقعات کی سچی آئینہ داری کرتے ہیں تو مغرب کے تہذیبی مرکزوں میں جو فسق وفجور پایا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ انتہائی، افلاس وناداری کا نتیجہ ہے ایپ ہک اور لیڈی ڈف گورڈن دونوں کا کہنا ہے کہ مشرق میں محض حالات کا دباؤ لوگوں کو تعدد ازدواج کی مشق پر مجبور کر دیتا ہے۔

فکر کی ترقی کے ساتھ ساتھ اور حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ، تعدد ازدواج کی ضرورت ناپید ہوتی جاتی ہے اور اس کی مشق یا خود بخود متروک ہو جاتی ہے یا علی الاعلان ممنوع قرار پاتی ہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اُن مسلم ممالک میں جہاں وہ حالات جنہوں نے اس کے وجود کو لازمی بنایا تھا معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ تعدد ازدواج کو مذموم اور تعلیمات قرآنی کے نقیض سمجھا جانے لگا ہے، لیکن جن ممالک میں معاشرے کے حالات مختلف ہیں اور جہاں عورتوں کو وہ وسائل مہیا نہیں جو ترقی یافتہ جماعتوں میں انہیں اپنی مدد آپ کرنے کی قابلیت بخشتے ہیں، وہاں ناگزیر ہے کہ تعدد ازدواج کا وجود برقرار رہے۔ ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ چونکہ یہ آزادی تاویل سوفسطائی دقیقہ سنجیوں کی گنجائش چھوڑتی ہے، اس لیے تعدد ازدواج کی مطلق ممانعت ایک مشکل کام ثابت ہوگی۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ ایک زوردار اعتراض ہے، جو اُن تمام مسلمانوں کی توجہ کا مستحق ہے جو اسلامی تعلیمات کو اس الزام سے بری کرنا چاہتے ہیں جو اُن پر کیا گیا ہے اور ترقی تہذیب کے دوش بدوش قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قوانین میں لوچ اور لچک کا ہونا اُن کی منفعت وافادیت کا سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ حکم متمدن سے متمدن معاشرے کے لیے بھی اور کم سے کم متمدن معاشرے کے لیے بھی موزوں ہے۔ یہ نہ ترقی پذیر جماعتوں کی ضروریات کو نظر انداز کرتا ہے نہ اس امر کو فراموش کر دیتا ہے کہ دنیا میں ایسی جماعتیں بھی موجود ہیں جن کے لیے یک زوجگی ایک بہت بڑی خرابی ثابت ہو سکتی ہے۔ بہر حال تعدد ازدواج کا استیصال اتنا مشکل نہیں جتنا تصور کیا جاتا ہے۔ مسلمان جس لعنت میں گرفتار ہو گئے ہیں وہ محض اس قدامت پرستی کا نتیجہ

ہے جس نے اجتہاد کو مسدود کر دیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب معلمِ اسلام کے اپنے ارشادات سے رجوع اس مسئلے کا فیصلہ کر دے گا کہ آیا مسلمان ارشاداتِ نبوی ﷺ پر عمل کریں گے یا متقدمین فقہا کی تفسیروں پر، جنہوں نے اپنے من مانے خیالات منوانے کی خاطر یا جن خلفا و سلاطین کے وہ بندگانِ فرمان تھے، اُن کی خودسرانہ آرا کی تائید کے لیے شارع کے الفاظ کا مطلب عمداً ماؤف کیا ہے۔ یورپ اس عمل میں سے گزر چکا ہے۔ اُسے چاہیے کہ دینِ محمدی ﷺ کو تبراؤں کا تختہ مشق بنانے کی بجائے تجدید یافتہ اسلام کی ان کوششوں کا تحمل و ہمدردی سے مشاہدہ کرے جو وہ قدما پرستی کے بندھنوں سے چھٹکارا پانے کے لیے کر رہا ہے۔ جب پرانے خیالات کی غلامی سے آزادی حاصل ہوگئی تو ہر مسلم مملکت کے اربابِ فقہ کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ ایک مستند فتوے کے ذریعہ اپنی اپنی مملکت میں تعدد ازواج کو ممنوع قرار دے دیں۔ لیکن یہ اس وقت ممکن ہوگا جب حالات و واقعات اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کے سمجھنے میں عام ترقی ہوگی۔ جس نئی روشنی میں آپ ﷺ کے ارشادات کا مطالعہ کیا جا رہا ہے وہ تعددِ ازواج کو تاریکی کی طرح دور کر رہی ہے۔

جیسا کہ ہم اُوپر کہہ آئے ہیں، یہ امر کہ تعلیماتِ محمدی ترقی کے ہر مرحلے سے مطابقت رکھتی ہیں اُن کے معلم کی حکمتِ بالغہ پر دلالت کرتا ہے۔ غیر ترقی یافتہ جماعتوں میں تعدد ازواج، بشرطیکہ اُن پابندیوں کو ملحوظ رکھا جائے جو پیغمبر اسلام ﷺ نے عائد کی ہیں، کسی طرح بھی ایک تاسف انگیز خرابی نہیں۔ بہرکیف وہ چند شوہری کے رواج پر، جو ہر طرح کے اخلاقی ضبطِ نفس کو ترک کر دینے کی نشانی ہے، قابلِ توجہ ہے۔ جیسے جیسے تمدن میں ترقی ہوتی جاتی ہے تعدد ازواج میں جو قباحتیں ہیں اُن کی حقیقت اور اس کی ممانعت کی حکمت زیادہ واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم یہ کہنے کو کسی طرح تیار نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے برہمنی قوموں کے ساتھ جن کے یہاں قحبہ پیشگی عام تھی، اختلاط کر کے کوئی اچھا سبق سیکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس اختلاط کی بدولت اُن کے اخلاقی خیالات میں رکاکت آگئی ہے۔ ان کے یہاں انسانی وقار اور روحانی پاکیزگی کا جو تصور تھا، وہ پست ہوگیا ہے اور طوائفوں کا طبقہ اُن کے یہاں اتنا ہی مقبول ہوگیا ہے جتنا وہ ان کے غیر مسلم ہمسایوں کے یہاں تھا۔ اس کے باوجود ایسے آثار نمایاں ہیں جن سے اُمید ہوتی ہے کہ

جس نورِ حق نے ساتویں صدی عیسوی میں عرب کو منور کیا تھا، وہ ایک دن اُن کے دلوں پر بھی جلوہ افگن ہوگا اور جس تاریکی میں وہ گھرے ہوئے ہیں اُس سے اُنہیں نجات بخشے گا۔ معتزلہ عقیدتاً یک زوجگی کے حامی تھے۔ اُن کے خیال کے مطابق ایک عورت کے ساتھ عقد برقرار ہونے کی صورت میں کسی دوسری عورت کے ساتھ عقد شرعاً ناجائز تھا۔ دوسرے الفاظ میں جو عقد معتزلہ کے قوانین کے مطابق کیا جائے وہ بہمہ وجوہ ایک مرد کا ایک عورت کے ساتھ عقد ہے، تاحینِ حیات اور باخراجِ ہمہ دیگراں۔

اور تو اور، قدامت پرست فرقوں کے یہاں بھی ایک کثیر التعداد اور صاحب اثر طبقہ ایسا ہے جو تعدّد ازواج کو منافی شرع خیال کرتا ہے، کیونکہ جن حالات نے اُسے اگلے زمانے میں جواز بخشا تھا وہ اب بدل گئے ہیں یا یکسر ناپید ہو گئے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ تعدّد ازدواج کی مخالفت ایک زبردست اخلاقی جذبہ نہیں بنی تو کم از کم ایک قوی اجتماعی جذبہ ضرور بن گئی ہے اور یہی جذبہ بہت سے خارجی حالات سے مل کر ہندوستان کے مسلمانوں میں سے اس رواج کا ازالہ کر رہا ہے۔ مسلمانوں کے تمام طبقوں میں یہ دستور ہو چلا ہے کہ نکاح نامے میں ایک شرط شامل کی جاتی ہے جس کے مطابق خاوند اپنے اس مفروضہ حق سے کہ وہ اپنی پہلی شادی کے قیام کے دوران دوسری شادی کر سکتا ہے، دست بردار ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں اس وقت پچانوے فی صد مرد، خواہ از روئے عقیدہ یا بتقاضائے مجبوری، ایک ہی بیوی کے شوہر ہیں۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں جو اپنے اسلاف کی تاریخ سے واقف ہیں، اور دوسری ملتوں کی تاریخ سے اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں، تعدّد ازواج کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ایران میں آبادی کا محض ایک چھوٹا سا حصہ متعدد بیویوں کی مشتبہ عشرت سے متمتع ہوتا ہے۔ اُمیدِ واثق ہے کہ بہت جلد علمائے اسلام کی ایک مجلسِ اقتدار اس امر کا اعلان کر دے گی کہ غلامی کی طرح تعدّد ازواج بھی شریعتِ اسلامیہ میں مکروہ ہے۔

آیئے اب ہم رسولِ اکرم ﷺ کی شادیوں پر ایک نظر ڈالیں، جنہیں بہت سے ایسے لوگوں نے جو یا تو حقیقت حال سے ناواقف تھے یا واقعات کا دیانت دارنہ جائزہ لینے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے پیغمبرِ اسلام ﷺ کے خلاف وجہِ الزام ٹھہرایا ہے۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ

کے عیسائی مخالفین کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ذاتی طور پر ایسی خصوصی مراعات سے فائدہ اٹھایا جو شرعاً مباح نہ تھیں، اور یوں ایک ایسی کمزوری کا ثبوت دیا جو منصب نبوت کے شایانِ شان نہ تھی، لیکن اگر تاریخ کا صحیح مطالعہ کیا جائے اور واقعات کا بے تعصبانہ جائزہ لیا جائے تو حتمی طور پر ثابت ہو جائے گا کہ عیش پرست ہونا تو کجا، آپ ﷺ نے غریبی اور بے مائیگی کی حالت میں ایک قدیم آبائی رواج کے مطابق بے آسرا عورتوں سے شادی کر کے اور اپنے آپ کو اُن کے نان ونفقہ کا کفیل بنا کر ایک ایثارِ عظیم کا ثبوت دیا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر انسانی نقطۂ نگاہ سے اغراض ومحرکات کا تجزیہ کیا جائے تو اس 'عظیم الشان عرب'' پر جو الزام لگائے گئے ہیں ان کی بے بنیادی اور بدنیتی ظاہر ہو جائے گی۔ جب محمد ﷺ پچیس سال کے جوان تھے تو آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی جو آپ ﷺ سے عمر میں بہت بڑی تھیں۔ پچیس سال تک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی مہر ووفا اور راحت ومسرت کا ایک سلسلہ شبانہ روز تھی۔ کفار نے آپ ﷺ کی شان میں جو گستاخیاں کیں اور آپ ﷺ پر جو مظالم توڑے اُن کے دوران حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی واحد غمگسار ومددگار تھیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے وقت نبی کریم ﷺ کی عمر اکاون برس کی تھی۔ آپ ﷺ کے دشمن اس سے انکار نہیں کر سکتے بلکہ اس کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں کہ اس طویل مدت میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس سے آپ ﷺ کے اخلاق پر معاذ اللہ کوئی دھبہ لگتا ہو۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں آنحضرت ﷺ نے کوئی دوسری شادی نہیں کی، اس امر کے باوجود کہ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو رائے جمہور اسے جائز قرار دیتی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے چند ماہ بعد آپ ﷺ بیکسی ومظلومی کے عالم میں طائف سے واپس آئے تو آپ ﷺ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو اپنی زوجیت میں قبول کیا۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سکران کی بیوہ تھیں، جو قبول اسلام کے بعد کفّار کے ظلم وستم سے بچنے کی خاطر ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے اور وہاں اپنی بیوی کو بے وسیلہ دنا وار چھوڑ کر غریب الوطنی کی حالت میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ ملک کے رواج کے مطابق شادی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے آنحضرت ﷺ اپنے وفا شعار صحابی کی بیوہ کو اپنی پناہ میں لے سکتے تھے۔ عطا واحسان اور انسانیت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ انہیں اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ

دیں۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند نے دین حق کی خاطر ترکِ وطن کیا تھا اور اس پر اپنی جان نثار کر دی تھی۔ اُن کی بیوی مصائب غریب الوطنی میں اُن کی شریک رہی تھیں اور اب بے کس و بے نوا اپنے وطن واپس آئی تھیں۔ محض انہیں آسرا دینے کی خاطر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی زوجیت میں لے لیا، اگرچہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود نانِ شبینہ کو محتاج تھے۔

عبداللہ بن ابو قحافہ، جو بعدہٗ تاریخ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اسمِ مبارک سے مشہور ہوئے، عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے سب سے پہلے داعی اسلام کو لبیک کہا۔ انہیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مخلصانہ عقیدت اور جاں نثارانہ محبت تھی اس میں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حریف مساوی شمار کئے جا سکتے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک نوعمر بیٹی تھی، جس کا نام عائشہ رضی اللہ عنہا تھا اور اُن کی دلی تمنا تھی کہ انہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے جنہوں نے انہیں کفر کی تاریکی سے نکالا تھا، جو محبت عقیدت تھی اپنی بیٹی کو پیغمبر کی زوجیت میں دے کر اُس کا رشتہ اور بھی استوار کریں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر اس وقت صرف سات سال کی تھی لیکن ملک کا رواج اس نوعمری میں شادی کی اجازت دیتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اصرار پر آنحضرت نے اس کمسن لڑکی کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔

مہاجرین کے ورودِ مدینہ کے کچھ عرصہ بعد ایک واقعہ رونما ہوا جس سے عربوں کے اس وقت کے حالاتِ زندگی پر بہت سی روشنی پڑتی ہے۔ جو لوگ عربوں کے خصائل و عادات سے واقف ہیں (غرور، عربدہ جوئی، حمیتِ جاہلیت اور انتقام لینے میں انتہا درجے کی غضب ناکی بھی اور صبر بھی۔'') وہ لوگ اس واقعے کے معنی پوری طرح سمجھ سکیں گے۔ برٹن عربوں کے بارے میں کہتا ہے کہ: 'اب بھی ذرا سی بات پر بدوی قبیلوں کے درمیان پشتینی عداوتیں شروع ہو جاتی ہیں۔'' حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ، جو بعد میں خلیفۂ ثانی ہوئے کی ایک بیٹی تھی، حفصہ رضی اللہ عنہا نام۔ اس نیک بی بی کا خاوند غزوہ بدر میں شہید ہو گیا تھا اور چونکہ وہ اپنے باپ کی طرح شعلہ مزاج تھی، اس لیے کسی کو اس سے شادی کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ یہ امر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے بہت رنج کا باعث تھا۔ چنانچہ انہوں نے

پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پیغام دیا۔ دونوں میں سے کسی نے رضا مندی ظاہر نہ کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ ناگوار گزرا۔ چنانچہ وہ غم وغصہ کے عالم میں آستانہ نبوی پر نالش لے کر پہنچے، کیونکہ اس میں اُن کی عزت کا سوال تھا، لیکن نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اور نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہامی بھری۔ یہ قضیہ ہمیں چاہے کتنا ہی مضحکہ خیز دکھائی دیتا ہو، لیکن مومنین کی چھوٹی سی جماعت میں ہل چل پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان حالات میں سردارِ مومنین نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو اپنے نکاح میں لا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ فرو کیا اور رائے عامہ نے نہ صرف اس کو سراہا بلکہ اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین اور بیویاں یعنی حضرت ہند اُم سلمہ رضی اللہ عنہا، حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زینب اُم المساکین رضی اللہ عنہا بھی کفار کے ہاتھوں بیوہ ہوئی تھیں اور اُن کے اقربا اُن کا بار کفالت قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام زید رضی اللہ عنہ کی شادی ایک عالی نسب خاتون، زینب رضی اللہ عنہا نامی سے کی تھی، جو قریش کے دو ممتاز ترین خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ فخرِ نسب کی وجہ سے اور غالباً غرورِ حسن کی وجہ سے بھی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ایک آزاد کردہ غلام کی زوجیت میں ناخوش تھیں۔ میاں بیوی کے تعلقات بگڑتے بگڑتے باہمی نفرت کی حد تک پہنچ گئے۔ ممکن ہے کہ جہاں تک حضرت زید رضی اللہ عنہ کا تعلق تھا، انہیں حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے جو رنجیدگی تھی اس میں اس امر نے اضافہ کر دیا ہو کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ازراہ فخر چند ایسے الفاظ کو جو ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے انہیں دیکھ کر نکلے تھے، آئے دن دہرایا کرتی تھیں۔ ہوا یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن زید رضی اللہ عنہ کے گھر گئے تھے اور وہاں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو بے نقاب دیکھ کر آپ نے فرمایا تھا: ''سبحان اللہ مقلِب القلوب'' یہ الفاظ ایسے ہی تھے جیسے کوئی خوبصورت تصویر یا مجسمہ دیکھ کر آج کل کے کسی مسلمان کے منہ سے نکلیں گے۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا ان الفاظ کو، جو بطریق استحسان قدرتی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نکلے تھے، بار بار یہ جتانے کی خاطر کہ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حسن و جمال کی تعریف کی تھی، دہرایا کرتی تھیں، جس سے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو مزید رنج ہوتا تھا۔

بالآخر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اُن سے علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں طلاق کی اجازت لینے کے لیے حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''کیوں کیا تمہیں اس میں کوئی نقص دکھائی دیا ہے؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔نہیں مجھے اس میں کوئی نقص دکھائی نہیں دیا، پھر بھی میں اس کے ساتھ رہنے پر راضی نہیں ہوں۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ارشاد کیا۔ ''جاؤ اور اپنی بیوی کی حفاظت کرو، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور خدا سے ڈرو، کیونکہ خدا نے فرمایا ہے: ''اپنی بیویوں کی دیکھ بھال کرو اور خدا سے ڈرو۔'' لیکن زید رضی اللہ عنہ اپنے ارادے سے باز نہ آئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کے باوجود انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بہت ملال ہوا، خصوصاً اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس ان دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ داماں کیا تھا۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے طلاق لینے کے بعد متعدد مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کی التجا کی تا آنکہ اُن کی آرزو پوری ہوگئی[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور بیوی کا نام جویریہ رضی اللہ عنہا تھا وہ بنی مصطلق کے سردار حارث کی بیٹی تھیں، اور ایک لڑائی میں جو بنی مصطلق کی بغاوت فرو کرنے کی خاطر لڑی گئی تھی گرفتار ہوئی تھی، لیکن انہوں نے اپنے گرفتار کرنے والے سے ہی عہد لے لیا تھا کہ وہ ایک مقررہ فدیہ لے کر انہیں رہا کر دے گا۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا فدیہ ادا کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً فدیہ ادا کر دیا۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے اس احسان کا معاوضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کی صورت میں ادا کیا۔

---

[1] طبری (زوٹن برگ کا ترجمہ، جلد سوم صفحہ ۵۸) اس شادی پر بُت پرستوں نے بہت لے دے کی۔ وہ لوگ اپنی سوتیلی ماؤں اور ساسوں سے تو شادی کر لیتے تھے، لیکن متبنیٰ کی مطلقہ بیوی سے شادی کو ناجائز سمجھتے تھے (زید رضی اللہ عنہ ایک وقت رسولِ اکرم کا متبنیٰ تھا) لوگوں کے دلوں میں اس خیال کو دور کرنے کی خاطر کہ تبنیت سے خون کے رشتے کی طرح کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔، سورۂ الاحزاب کی چند آیات نازل ہوئیں، جس کی رو سے کسی کو منہ بولی بہن یا ماں یا منہ بولا بھائی یا باپ بنا کر اس سے تعلقاتِ زناشوئی کو ہمیشہ کے لیے حرام کر دینے کا جو جاہلانہ دستور تھا وہ ختم کر دیا گیا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر میں جس پاکیزگی سیرت کا ثبوت دیا اُس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت و عقیدت تھی اس میں سرمو فرق نہ آیا۔

مسلمانوں نے جب اس شادی کی خبر سنی تو سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ بنو مصطلق اب رسولِ خدا ﷺ کے قرابت دار ہیں اور اب ہمیں اُن سے اس کے مطابق سلوک کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہر فتح مند مسلمان نے اُن لوگوں کو رہا کر دیا جنھیں انہوں نے لڑائی میں گرفتار کیا تھا، اس طرح ایک سو خاندانوں نے آزادی پا کر اس نئے عقد کے حق میں دعائے خیر کی۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بھی جو یہودی النسل تھیں، جنگِ خیبر میں ایک مسلمان کے ہاتھوں گرفتار ہوئی تھیں۔ انہیں بھی رسولِ خدا ﷺ نے فدیہ دے کر آزادی دلائی اور اُن کی درخواست پر انہیں اپنی ازواجِ مطہرات کے زمرے میں شامل کر لیا۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا، جن سے آنحضرت ﷺ نے مکہ میں شادی کی، آپ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھیں اور جب اُن کی شادی آپ ﷺ سے ہوئی تو اُن کی عمر پچاس برس سے اُوپر تھی۔ اس شادی سے صرف یہی نہیں ہوا کہ رسولِ خدا ﷺ نے اپنی ایک غریب رشتہ دار کی گزر معاش مہیا کرنے کا ذمہ اپنے سر لے لیا، بلکہ دو مشہور معروف ہستیاں دائرۂ اسلام میں آ گئیں۔ یعنی حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید۔ موٴخر الذکر جنگِ اُحد میں قریش کی سوار فوج کے امیرِ لشکر تھے اور بعد میں روم کے فاتح بنے۔

یہ تھی آنحضرت ﷺ کے نکاحوں کی نوعیت۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کی محرک اولادِ نرینہ کی آرزو ہو اور کیوں نہ ہوتی؟ آخر آپ ﷺ ایک بشر بھی تو تھے اور ایک بیٹے کو اپنا نام لیوا چھوڑنے کی خواہش ایک تقاضائے بشری ہی تو تھی۔ اس پر یہ بھی ممکن ہے کہ کہ آپ ﷺ اس توہین آمیز لقب سے مبرا ہونے کے خواہش مند تھے، جو آپ ﷺ کے بدترین دشمنوں نے آپ ﷺ کو دیا تھا[1] بہر کیف، واقعات کو سطحی نظر سے بھی دیکھا

---

[1] آنحضرت ﷺ کے فرزند کی وفات پر آپ ﷺ کے دشمن آپ ﷺ کی شان میں ''الابتر'' کا گستاخانہ لفظ استعمال کرتے تھے۔ ''الابتر'' کے لفظی معنی ہیں ''دُم کٹا'' یعنی ''وہ جس کا پیچھا یا نام لیوا کوئی نہ ہو۔'' ہندوؤں کی طرح قدیم عربوں میں بھی بیٹے کے متعلق یہ تصور تھا کہ اُس کی بدولت دیوتاؤں کی برکتیں جاری رہیں گی۔ اور جو شخص کوئی بیٹا نہ چھوڑ جاتا تھا، اُسے انتہا درجے کا بدنصیب سمجھا جاتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ کی شان میں جو ناموزوں کلمہ کفار استعمال کرتے تھے اُس کا یہی مفہوم تھا۔ ملاحظہ کیجیے قرآن۔ سورہ الکوثر (نیز کشاف)۔ یہی وجہ تھی کہ بُت پرست عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیا کرتے تھے، جس کی مذمت قرآن نے سخت الفاظ میں کی۔ دیکھیے قرآن۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۳۱ وغیرہ۔

جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ان شادیوں نے ایسے قبیلوں کو جو ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے، باہم شیر و شکر اور ملت کے شیرازے کو مربوط کر دیا۔

ثار یعنی انتقام کا رواج کفار عرب میں عام تھا۔ خاندانی دشمنیوں کے ہاتھوں اکثر قبیلے کے قبیلے تباہ ہو جایا کرتے تھے۔ کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کا کسی اور خاندان سے دشمنی عناد نہ تھا۔ خانہ جنگیوں میں اکثر مرد قتل اور عورتیں اور بچے غلامی کے پھندے میں گرفتار ہو جایا کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل اس لعنت میں مبتلا تھے (جیسا کہ تمام قومیں اپنے ارتقا کے بعض مراحل میں ہوا کرتی ہیں) لیکن وہ اس کا قلع قمع نہ کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے پناہ گاہوں (حرم المقدس) کا قاعدہ رائج کر کے اسے ایک قانونی شکل دے دی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس مرض کا ایک بہتر نسخہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالف خاندانوں اور قبیلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اور اپنی ذات کے ساتھ نکاح کے رشتے میں منسلک کر دیا۔ اپنی دعوتِ حق کے اخیر میں، کوہِ عرفات پہ کھڑے ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ اس وقت کے بعد تمام دشمنیاں ختم ہو جانی چاہییں۔

غبی منصف اور بد طینت دشمنوں نے اُن محرکات کو مسخ کر دیا ہے جنہوں نے ایک قدیم الاصل آبائی رواج کی پیروی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر آمادہ کیا کہ بے کس اور بے آسرا بیواؤں کو وسائل معاش مہیا کرنے کی خاطر اپنی زوجیت میں داخل کریں۔ ان بیواؤں کو اپنے خاندان کے رکن بنا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے نان و نفقہ کا انتظام اس واحد طریقے سے کیا جس کی اجازت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم اور زمانے کا دستور دیتا تھا۔

اہلِ مغرب طبعاً تعدّد ازواج کو بنیادی طور پر معیوب اور نہ صرف خلاف قانون بلکہ شہوت پرستی اور اخلاقی رکاکت کا نتیجہ تصور کرتے ہیں۔ وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ اس قسم کے تمام دستور حالات و ضروریاتِ وقت کی پیداوار ہوتے ہیں۔ وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ نسلِ عبرانی کے آباؤ اجداد، جنہیں تمام سامی مذاہب کے پیرو اخلاقی عظمت کے قابلِ تقلید نمونے خیال کرتے ہیں، تعدّد ازواج پر اس حد تک کاربند تھے جو ہمارے جدید اندازِ فکر کو قانوناً جائز بدکاری کی انتہا معلوم ہوتی ہے۔ غالباً اس تقدس کے باوجود جس کا پردہ قدامت اور قصص و روایات نے اُن پر ڈال رکھا ہے، ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم

ان بزرگوں کی سیرت و کردار پر اُنگلی رکھیں، لیکن رسولِ عربی ﷺ کے معاملے میں ضروری ہے کہ ہم آپ ﷺ کے عمل کی تاریخی قدر و قیمت اور معنویت کو ملحوظِ خاطر رکھیں۔

غالباً کہا جائے گا کہ چاہے کیسی بھی ضرورت یا مجبوری تھی، آنحضرت ﷺ کو واجب نہ تھا کہ تعدّدِ ازواج جیسے معیوب رواج پر خود عمل کرتے یا دوسروں کو اس پر عمل کرنے کی اجازت دیتے، بالخصوص چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس اصلاح کو نظرانداز کر دیا تھا۔ لیکن امرِ واقع یہ ہے کہ یہ رواج اور بہت سے رواجوں کی طرح شرِ محض نہیں۔ شر ایک اضافی نام ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی عمل یا دستور ابتداً اقوام و افراد کے اخلاقی تصورات سے مطابقت رکھتا ہو۔ لیکن افکار کی ترقی اور جماعت کے حالات میں تبدیلیاں اس کو رُجحاناً باعثِ فساد بنادیں اور ایک وقت ایسا آئے کہ حکومت اُسے خلافِ قانون قرار دے دے۔ یہ ایک پیش پا اُفتادہ بات ہے کہ افکار و خیالات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن سطحی سوچ بچار کرنے والے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ رواجوں اور دستوروں کا دارو مدار ترقئ افکار پر ہوتا ہے اور وہ حالاتِ زمانہ کے مطابق یا اس معیار کے مطابق کہ انہیں لوگوں کا ضمیر قبول کرتا ہے یا نہیں، (جسے روحِ عصر" کہتے ہیں) برے یا بھلے ہوتے ہیں۔

عیسائیت کی ابتدائی تاریخ میں ایک سب سے نمایاں بات یہ نظر آتی ہے کہ اُس نے تاہل کو مذموم قرار دیا۔ شادی کو ایک اسفل طریقِ زندگی اور بچوں کی پیدائش کو ایک خرابی سمجھا جاتا تھا۔ رہبانیت نے بہترین نفوس کو دنیا سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ کلیسا کے منصب داروں کا تو ذکر ہی کیا، اُن مذہبی مبلغین کو بھی جو کلیسا کے منصب دار نہ تھے یا تو شادی کی ممانعت تھی یا اگر اجازت تھی بھی تو صرف ایک شادی کرنے کی۔ یہ غیر صحت مند قدغن کسی حد تک تو معلمِ دین کی ذاتی مثال پر مبنی تھی اور کسی حد تک چند ایسے حالات کا نتیجہ تھا جنہوں نے ابتدائی ملتِ عیسوی پر دباؤ ڈال رکھا تھا۔

نبیٔ ناصری کو اپنی راہبوں سے جو گہرا تعلق تھا، اُن کی یہ قوی توقع کہ خدا کی بادشاہی جس میں تمام معاشرتی علائق ختم ہو جائیں گے بہت جلد قائم ہونے والی تھی اور اُن کا اپنے تبلیغی کام کی تکمیل سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جانا...... یہ ہیں وہ اسباب جن سے اس امر کی توجیہہ ہوتی ہے کہ وہ تاہل کے مخالف تھے اور غالباً انہی اسباب کی بنا پر

انہوں نے تاہل کی زندگی اختیار نہیں کی۔ اسطہا غی کے ساتھ، جو خود ا سینی تھے، ان کا تعلق ان کی مختصر لیکن المناک داستانِ حیات پر روشنی ڈالتا۔ پال کو صنف اناث سے جو زبردست اور ناقابلِ توجیہ نفرت تھی اُس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات سے مل کر کلیسا میں اس اسینی عقیدے کو راسخ کر دیا کہ کہ مرد اور عورت کا یہ مقدس ترین رشتہ ایک گناہ ہے اور ایک ایسی خرابی ہے جس سے حتی الامکان حذر کرنا چاہے۔ شادی کا واحد مقصد بچے پیدا کرنا اور مرد کی شہوات نفسانی کا پورا کرنا سمجھا گیا۔ چنانچہ اکثر عیسائی کلیساؤں میں نکاح کی رسم آج تک جن عبارات کی تلاوت سے ادا کی جاتی ہے اُن پر اس جاہلانہ تصور کا ٹھپا لگا ہوا ہے۔ انہیں اثرات کی بدولت عیسائیت پر اس خیال کا پیوند لگ گیا ہے کہ جس شخص نے کبھی شادی نہیں کی وہ اُس شخص پر فائق ہے جس نے شادی کر کے اپنے آپ کو کلنک کا ٹیکہ لگا لیا ہے اور جہاں جہاں انسان نواز علوم نے اس خیال کا ازالہ نہیں کیا وہاں وہاں یہ خیال اب تک مضبوطی سے قائم ہے۔ ہندوستان کے بھبوت ملنے والے جوگی، مشرقی ملکوں کے جٹا دھاری بیراگی اور بدھ مت کے سنیاسی سب غیر متاہل ہوتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ "گھر بار اور اہل وعیال کے رشتے توڑے بغیر معرفت حاصل نہیں ہو سکتی، اور تجرد کی زندگی بسر کیے بغیر ابدیت کا نصیب ہونا ممکن نہیں" تجرد مشرقی عرفانیت اور مرتاضیت سے شروع ہوا، اور مختلف وسائل سے آ کر عیسائیت میں داخل ہو گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی "معصومیت" کو بہت سے لوگوں نے اُن کی الٰہیت کا ثبوت اور بہت سے لوگوں نے دنیا کے دوسرے معلمین پر اُن کے تفوق کی دلیل سمجھا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دوسرے سے جو موازنہ ومقابلہ کیا جاتا ہے وہ کلیتہً باطل اور اخلاقی معیاروں کے غلط تصور پر مبنی ہے۔ اگر شادی نہ کرنا کسی شخص کو ایک مثالی انسان بنا دیتا ہے تو سارے جوگی، بیراگی، سنیاسی اور درویش کامل انسان ہوتے ہیں۔ اُس صورت میں ایک کامل زندگی وہ ہوگی، جو تمام خانگی رشتوں سے مبرا ہو۔ ایسا خیال یقیناً منافی فطرت اور نوع انسانی کے لیے حد درجہ مضرت رساں ہوگا، لیکن اگر حقیقت الامر یہ نہیں، تو تعجب ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو، جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ادھورے چھوڑے ہوئے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، کیوں مطعون کیا جاتا ہے؟ کیا ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سے زیادہ

عورتوں سے شادی کی؟ ہم اوپر واضح کر آئے ہیں کہ ان شادیوں کی نوعیت کیا تھی۔ ہم نے اور کچھ نہیں تو اتنا ضرور ثابت کر دیا ہے کہ یہ شادیاں جن کے لیے اُنہیں مورد الزام بنایا جاتا ہے حقیقت میں خدا ترسی اور ایثارِ نفس کے کام تھیں۔

بہر کیف، آیئے ہم پیغمبر اسلام ﷺ کی متعدد شادیوں کا جائزہ ایک مجرد نقطہ نگاہ سے لیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے متعدد شادیاں کیوں کیں؟ کیا وہ نیک سیرت تھے یا شہوت پرست؟ حضرت داؤد علیہ السلام نے جنہیں انجیل قدیم ''محبوب خدا'' کہتی ہے، تعدّدِ ازواج کی حد کیوں کر دی؟ جواب بالکل بدیہی ہے۔ ہر زمانے کے معیار مختلف ہوتے ہیں۔ جو چیز ایک زمانے کے لیے موزوں ہوتی ہے وہ کسی دوسرے زمانے کے لیے موزوں نہیں ہوتی۔ اس لیے ہمیں ماضی کے اعمال کو حال کے معیاروں سے نہ جانچنا چاہیے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ان محترم اور بزرگ ہستیوں نے صداقت و دیانت سے اپنے وقت کے معیاروں پر عمل کیا تو اس سے اُن کے عظمت و تقدس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ کیا یہ بجا ہوگا کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک برخود غلط، خود پرست اور عقلِ عملی سے بے بہرہ تخیل پرست یا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کو ایک شقی القلب شہوت پرست کہیں۔ محض اس بنا پر کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی متوقع خدائی بادشاہی کے خواب دیکھنے میں مگن تے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کی نجی زندگی بیسویں صدی کے معیاروں کے مطابق اتنی قابلِ اعتراض تھی؟ اگر ہم ایسا کریں تو دونوں صورتوں میں ہم ناانصافی کے مرتکب ہوں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمیدیں اور آرزوئیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے کارنامے دونوں تاریخی حادثے تھے، جو اپنے وقت کی پیداوار تھے۔ نبی کی صداقت کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ مترفع کیفیتوں میں بھی وہ جو کچھ ابھی پیدا نہیں ہوا، اس کا تصور کرتے وقت اُسے نہیں بھول جاتا جو موجود ہے۔ وہ اپنی ذات میں نوعِ انسانی کی نشو و نما اور ترقی کا نمائندہ ہے۔ نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نہ حضرت محمد ﷺ اس معاشرے کو جو اپنے زمانے میں موجود تھا، فی الفور یک قلم محو اور اپنے زمانے کے قومی و سیاسی اداروں کو برطرف کر سکتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح رسولِ اکرم ﷺ نے بھی اس پر اکتفا کیا کہ ''اپنے تابعین کے دلوں پر وہ اصول نقش کر دیں جو وقتِ مناسب کے آنے

پر ان اداروں کو خود بخود برطرف کر دیں گے۔'' البتہ جہاں جہاں وقتی ضروریات پوری کرنے کے لیے قواعد ضروری تھے وہاں انہوں نے قواعد وضع کر دیے۔

جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے ذاتی معاملے میں ایسی مراعات روا رکھیں جن سے اُن کے تابعین محروم تھے، اس کے بارے میں اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ یہ ایک ایسی غلط فہمی پر مبنی ہے جو واقعات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ تعدد ازواج کی تحدید کا حکم ہجرت کے چند سال بعد مدینے میں صادر ہوا، اور اس حکم نے آپ ﷺ پر جو عمل لازم کر دیا وہ ایک نفس پرست کی مراعات طلبی نہ تھا، بلکہ ایک بار ذمہ داری تھا، جو ایک خود شناس و خود نگر انسان نے بطیب خاطر قبول کیا۔ آپ ﷺ کی تمام شادیاں تعدد ازواج کی تحدید کرنے والی آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہوئیں جس نے آپ ﷺ کی ذاتی مراعات کا خاتمہ کر دیا۔ آپ ﷺ کے تابعین کو تو اجازت تھی کہ (شرعی قیود کے اندر) بیک وقت چار بیویاں رکھیں اور طلاق کا اختیار استعمال کر کے جسے وہ نبی کی تنبیہ کے باوجود استعمال کرتے تھے، نئی شادیاں کریں، لیکن آپ ﷺ خود نہ تو کسی بیوی کو جس کے نان ونفقہ کا ذمہ آپ نے لے رکھا تھا علیحدہ کر سکتے تھے، نہ کوئی نئی شادی کر سکتے تھے۔ کیا اسے مراعات طلبی کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ حکم اُن عورتوں کے حق میں جو آپ ﷺ کے عقد میں تھیں ایک مخیّرانہ حکم اور آپ ﷺ کے لیے ذاتی طور پر پیغمبرانہ انکارِ نفس کا حکم نہ تھا؟

طلاق کا موضوع بہت سی غلط فہمیوں اور بحث آرائیوں کا منبع رہا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مطلقہ عورتوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں جو قرآنی احکام ہیں'' ان میں کسی بھی اور کتاب آسمانی کے احکام سے زیادہ انسانیت اور انصاف ہے۔''

تمام قدیم اقوام میں طلاق کا اختیار شادی کے قانون کا ایک لازمی ضمیمہ سمجھا گیا ہے، لیکن چند استثنائی صورتوں کے سوا یہ اختیار صرف مردوں کے لیے مخصوص تھا۔ بیوی کو کسی حالت میں بھی طلاق لینے کا حق نہ تھا۔

تہذیب کی ترقی اور افکار کی نشوونما عورتوں کی حالت میں ایک جزئی بہتری کا باعث بنی۔ عورتوں کو بھی طلاق لینے کا مشروط حق عطا کیا گیا اور انہوں نے جی کھول کر اس سے فائدہ اٹھایا، یہاں تک کہ قیصرانِ روم کے عہدِ حکومت میں شادیاں جس آسانی سے

کی اور توڑی جاتی تھیں وہ ضرب المثل بن گئی تھی۔

قدیم عبرانی شریعت کے تحت خاوند کو یہ اختیار تھا کہ اگر اس کی بیوی کسی وجہ سے اس کی نگاہوں میں ناپسندیدہ ہو جائے تو وہ اُسے طلاق دے دے، اور اس اختیار کے من مانے اور بیجا استعمال پر کوئی پابندیاں عائد نہ تھیں۔ بیویوں کو کسی حالت میں بھی طلاق لینے کا حق نہ تھا۔

بعد کے زمانوں میں شمائیوں نے طلاق کے دستور میں قدرے ترمیم کی اور اس پر کچھ پابندیاں لگائیں۔ لیکن ہلیل کے مذہب نے ابتدائی قانون کو سختی سے برقرار رکھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے ظہور کے وقت عرب کے قبیلوں میں ہلیلی عقیدے ہی زیادہ تر رائج تھے اور ان کے یہاں بیویوں سے قطعِ تعلق اتنا ہی عام تھا جتنا کفارِ عرب میں تھا۔

رومیوں کے یہاں طلاق کو ابتدائی زمانوں سے مطابق قانون سمجھا جاتا تھا۔ ''بارہ تختیوں کے قوانین (The Laws of the Twelve Tables) نے طلاق کو جائز قرار دیا۔ اگر رومیوں نے، جیسا کہ اُن کے مداح کہتے ہیں، اس قانون سے اپنے شہر کی بنیاد پڑنے کے پانچ سو سال بعد تک فائدہ نہ اُٹھایا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اُن کے شمائل و خصائل دوسری قوموں کے شمائل و خصائل سے بہتر تھے، بلکہ یہ تھی کہ اگر کسی عورت پر زہر دینے یا شراب پینے یا کسی کا بچہ مانگ کر گود ڈال لینے کا الزام لگتا تو اس کے خاوند کو اختیار تھا کہ چھان بین کئے بغیر اُسے قتل کر ڈالے۔ لیکن بیوی کو طلاق لینے کا کوئی حق نہ تھا۔ اگر وہ طلاق مانگنے کی جسارت کر گزرتی تو وہ سزاوارِ موت خیال کی جاتی تھی۔ زمانۂ مابعد کی جمہوری حکومت کے زمانے میں طلاقوں کی جو کثرت تھی وہ بہ یک وقت اخلاق کے سریع فساد کی نشانی بھی، سبب بھی اور نتیجہ بھی تھی۔

ہم نے قرونِ قدیمہ کی دو نمایاں ترین قوموں کا تذکرہ کیا ہے جن کے اسالیب فکر نے جدید زمانے کے فکر، زندگی اور رسم و رواج پر ایک قوی اثر ڈالا ہے۔ رومیوں نے طلاق کے بارے میں جو قوانین وضع کئے وہ ترقی پسندی کی صفت سے متصف تھے اور اُن کا رُجحان عورتوں کی حیثیت کے بہتر بنانے اور اُنہیں مردوں کے مساوی درجہ عطا کرنے کی طرف تھا۔ یہ اُتنا ہی افکار انسانی کی ترقی کا نتیجہ تھا جتنا کسی خارجی سبب کا۔

''جن مبہم الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہدایت مندرج ہے وہ ہر اس تفسیر کو قبول کرتے ہیں جس کا تقاضا قانون سازوں کی دانشمندی کرے۔'' ہم بجا طور پر فرض کر سکتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد کیا کہ ''جو عقد خدا نے باندھا ہے اُسے کوئی انسان نہ توڑے۔'' تو اُن کے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ فسادِ اخلاق کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کو روکیں اور انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اُن کے الفاظ کو بالآخر کیا معنی پہنائے جائیں گے بعد میں جو یہ قانون وضع کیا گیا کہ زنا کاری طلاق کی واحد وجہ جواز ہے اس سے اس بات کا وافر ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسی صورت حال کے امکان کا احساس تھا[1]۔ لیکن بعد کے قانون سازوں کی دانشمندی نے اپنے آپ کو اسی حد کے اندر مقید نہیں رکھا کہ ایک ایسے قانون کا اندھا دھند اتباع کریں جو ایک تشکیل پاتی ہوئی جماعت کے حسب حال بنایا گیا تھا اور جس کا اعلان محض زبانی کیا گیا تھا۔ یہ قانون بے شک ایک اشرف جذبے کی تلقین کرتا ہے لیکن عیسائی ملکوں نے بعد میں طلاق کے جو کثیر التعداد اور متنوع قانون بنائے، ان کے پیش نظر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ طلاق کے بارے میں دینِ عیسوی کا امتیازی اور بنیادی قانون ہے۔

عربوں کے یہاں طلاق دینے کا جو اختیار مردوں کو دیا گیا تھا وہ غیر محدود تھا۔ عرب اپنی بیویوں سے سلوک کے معاملے میں انسانیت یا انصاف کے کسی قاعدے قانون کو نہ مانتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ طلاق کے رواج کو بے حد ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُسے قوم کی شیرازہ بندی کے حق میں نہایت مُضر خیال کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے بار بار اعلان کیا کہ غلاموں کو آزادی دینے سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ کے نزدیک مقبول اور طلاق سے بڑھ کر غیر مقبول نہیں۔ لیکن معاشرے کے حالات جو اس وقت تھے اُن کے

---

[1] اناجیل میں سے دو اس امر کی کوئی وضاحت نہیں کرتیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کس سبب کی بنا پر اپنے پیروؤں کو اس کی اجازت دی کہ وہ اپنی بیویوں کو علیحدہ کر دیں۔ (مرقس ب ۱۰۱۱۱ اور لوقا ب ۱۸۱۶) اگر ان روایات کو جو ان انجیلوں میں قلمبند ہیں، اُن روایتوں سے زیادہ مستند سمجھا جائے جو متی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں تو اس صورت میں ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اشرف جذبات کی تعلیم دی اور ارفع اصولوں کی تلقین کی، تاہم اُن کا منشا یہ نہ تھا کہ اُن کے اقوال کو ایک ناقابلِ تغیر اور مثبت قانون خیال کیا جائے۔ سیلڈن کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو مبہم جواب دیا اُس کا مقصد یہ تھا کہ وہ شائیلوں یا ہلیلوں کو برگشتہ نہ کرنا چاہتے تھے۔

ہوتے ہوئے اس رواج کا مکمل استیصال ناممکن تھا۔ آپ ﷺ کو جو کام درپیش تھا کہ ایک نیم مہذب جماعت کو شائستگی کے ایک بہتر سانچے میں ڈھالیں تا کہ جو روحانی سبق آپ ﷺ نے سکھائے ہوئے تھے وہ رفتہ رفتہ پھل لائیں۔ طلاق کا رواج شرِ محض نہ تھا، اس لیے آپ ﷺ نے چند شرائط کے تحت مردوں کو اجازت دی کہ طلاق کے اختیار کو استعمال کریں۔ آپ ﷺ نے طلاق دینے والے مرد اور مطلقہ بیوی کو تین جدا جدا مہلتیں دیں تا کہ اگر ممکن ہو تو وہ صلح و صفائی کر کے نئے سرے سے تعلقات مباشرت شروع کر لیں۔ لیکن اگر مصالحت کی تمام کوششیں رائیگاں ثابت ہوں تو تیسری مہلت میں اُن کا جو باہمی فیصلہ ہوتا تھا وہ راسخ ہو جاتا تھا۔ میاں بیوی کے جھگڑوں کے بارے میں آپ ﷺ نے ہدایت کی کہ اُن کا فیصلہ ثالثوں کی وساطت سے کرایا جائے۔

موسیو سیدیو نے، جن سے بہتر کسی مصنف نے آئینِ محمدی کا تجزیہ نہیں کیا، اس موضوع پر ذیل کی عبارت لکھی ہے:۔

''طلاق کی اجازت تو تھی، لیکن ایسی باضابطہ شرطوں کے تحت جو اس امر کی اجازت دیتی تھی (بلکہ کہنا چاہیے اس امر کی سفارش کرتی تھیں) کہ اگر کوئی فیصلہ عجلت میں اور پورے تفکر و تامل کے بغیر کیا گیا ہو تو وہ منسوخ کیا جا سکے۔ ایک ایک مہینے کے وقفے کے بعد تین طلاقوں کا مکرر اعلان طلاق کو ناقابلِ تنسیخ بنانے کے لیے لازمی تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی اصلاحات نے مشرقی قانون سازی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح کیا۔ آپ ﷺ نے عورتوں کو معقول اسباب کی بنا پر خلع کا حق عطا کیا اور اپنی زندگی کے آخری دور میں تو آپ ﷺ نے ثالثوں اور قاضی کی وساطت کے بغیر مردوں کے لیے حق طلاق کا استعمال عملاً ممنوع کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ'' خدا کے نزدیک یہ تمام مباح اعمال کی صحیح تربیت کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن نے طلاق کی جو اجازت دی ہے، اگرچہ اُس نے قدیم رواج کی کسی حد تک تائید کی، تاہم ضروری ہے کہ اس کی تفسیر شارع کے اعلانات و ارشادات کی روشنی میں کی جائے۔ اگر ہم یہ ملحوظ خاطر رکھیں کہ نظامِ اسلامی میں دین اور شریعت کا کتنا گہرا تعلق ہے تو ہمیں یہ سمجھنے میں آسانی ہو گی کہ نبی کے ارشادات و اعلانات طلاق کے دستور کے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔

قدرتی طور پر مختلف مذاہب فقہ میں اس موضوع پر بہت سا اختلاف ہے کہ مرد کو قاضی کی وساطت کے بغیر طلاق دینے کا کہاں تک حق پہنچتا ہے۔ ارباب فقہ کی ایک کثیر اور معتبر جماعت کے نزدیک جب تک مجبوری کی حالت نہ ہو، مثلاً یہ کہ عورت زنا کی مرتکب ہوئی ہو، اُس وقت تک طلاق دینا مرد کے لیے فی الحقیقت ممنوع ہے۔ ایک اور جماعت، جس میں معتزلہ کی اکثریت ہے، حاکم الشرع کی منظوری کے بغیر طلاق کو غیر مجاز اور غیر متشرع خیال کرتی ہے۔ اس جماعت کی رائے ہے کہ جب تک ایک غیر جانب دار ثالث یا قاضی اس کی تصدیق نہ کرے ایک منکوحہ جوڑے کے درمیان علیحدگی جائز اور طلاق نواہی کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتی۔ اس رائے کی تائید میں وہ شارعِ اسلام ﷺ کے اُن الفاظ کا حوالہ دیتے ہیں جنھیں ہم اُوپر پیش کر آئے ہیں اور آپ ﷺ کی اس ہدایت سے استناد کرتے ہیں کہ زوجین کے درمیان اختلاف و نزاع کی صورت میں مفاہمت کی خاطر ثالث مقرر کیے جانے چاہیں۔ حنفی، شافعی، مالکی اور زیادہ تر اہلِ تشیع طلاق کو مباح خیال کرتے ہیں، اگرچہ وہ اس اختیار کے بلاوجہ استعمال کو خلافِ شرع قرار دیتے ہیں۔

ردالمختار میں طلاق کے منافیٔ شرع ہونے کے خلاف دلائل بیان کرنے کے بعد ذیل کی عبارت آتی ہے: ''اس میں شک نہیں کہ طلاق ممنوع ہے، لیکن وہ بعض خارجی اسباب کی بنا پر مباح ہو جاتی ہے۔ اور جو ارباب فقہ اسے ممنوع کہتے ہیں اُن کا یہی مطلب ہے۔''

اگرچہ ائمۂ دین نے عارضی اجازت کو ایک مثبت قاعدہ تصور کر لیا ہے اور معلم اسلام نے عدل کے جو اصول وضع کیے تھے اُن میں سے اکثر کو نظر انداز کر دیا ہے، پھر بھی ارباب فقہ نے جو قاعدے مرتب کیے ہیں وہ اُن رومن قوانین کے مقابلے میں، جن کی تشکیل عیسوی کلیسا کی سرپرستی میں ہوئی، بدر جہا زیادہ کریمانہ ہیں۔ فقہا کے نزدیک بیوی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ بدسلوکی، نان و نفقہ مہیا نہ کرنے یا اسی قسم کے کسی اور سبب کی بنا پر تنسیخ عقد کا مطالبہ کرے، لیکن اگر وہ اس مطالبے کے حق میں ٹھوس اور تسلی بخش اسباب پیش نہیں کر سکتی تو وہ جہیز کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ جب کبھی مرد اپنی مرضی سے طلاق دے تو وہ شادی کے وقت بیوی کو جو کچھ ہبہ کر چکا ہو اس میں سے کچھ

واپس نہیں لے سکتا[1]۔

قرآن میں زوجین کی علیحدگی کے خلاف جو تنبیہیں کی گئی ہیں اور مصالحت سے تمام تنازعوں کا فیصلہ کرنے کے بارے میں جو متواتر تاکیدیں کی گئی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کے نقطہ نظر سے رشتہ نکاح کی کتنی حرمت تھی۔

"جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رُخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ آپس میں مصالحت کر لیں کیونکہ مصالت بہتر ہے۔ انسان کے نفس حرص کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں، لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس عمل سے بے خبر نہیں ہوگا۔ بیویوں سے برابر کا

---

[1] سُنی فقہ میں جو یہ شرط ہے کہ قطعی انقطاع کی صورت میں میاں بیوی کی از سرِ نو مباشرت سے پہلے لازمی ہے کہ بیوی کسی اور مرد سے نکاح کرے اور اس سے طلاق لے، موسیو سید یو اس شرط کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے ایک نہایت دانشمندانہ قاعدہ کہتا ہے جس کی بدولت طلاق پر ایک کڑی پابندی عائد ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف میور شارع اسلام کو ایک ایسی کڑی شرط لگانے کے لیے موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ عربوں جیسے مغرور، رشک کرنے والے اور حساس لوگوں کے لیے اس قسم کی شرط بیجا طلاقوں کے سدباب کی بہترین ضمانت تھی۔ میور نے جو ضرب المثل بیان کی ہے خود اس سے اس پر واضح ہو جانا چاہیے تھا کہ جو شخص اپنی بیوی کو ایک ایسے کراہت انگیز امتحان میں ڈال سکتا تھا، وہ کتنی ذلت برداشت کرتا تھا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ سرولیم میور کو پیغمبر اسلام ﷺ سے جو خدا واسطے کی دشمنی تھی اس کے باعث وہ یہ بھول گیا کہ اس شرط کا منشا ایک اور انسانیت سوز رواج کا روکنا تھا جو یہودیوں اور کافر عربوں اور تقلیداً عیسائیوں میں بھی عام تھا، یعنی یہ رواج کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر یا شہوانی جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی بیویوں سے قطع تعلق کر لیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جو شرط عائد کی اس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کی قوموں میں سے ایک حساس ترین قوم کی طبیعت پر یوں قابو پایا جائے کہ اس کی فطرت کے ایک قوی ترین جذبے کو بروئے کار لایا جائے۔ یعنی اس کی حمیت کو (مقابلتہً دیکھئے۔ میور نے یہ بھی فراموش کر دیا ہے کہ بہت سے شیعہ اہلِ فقہ اس امر کو واجب یا جائز نہیں سمجھتے کہ مطلقہ عورت میاں کے گھر آنے سے پہلے کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس سے طلاق لے (ملاحظہ کیجئے میلکم۔ تاریخ ایران اور مبسوط) جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اس امر کا قائل ہوں کہ یہ آیت کہ "جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آ جائے تو یا بھلے طریقے سے انہیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو محض ستانے کی خاطر نہ روک رکھو، کیونکہ یہ زیادتی ہوگی (البقرہ، ۲۳) آیات ماسبق کو منسوخ کر دیتی ہے۔ جس کی رُو سے دوسرے مرد سے نکاح لازم آتا ہے۔

سلوک کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے، تم چاہو بھی تو ایسا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اور کچھ نہیں تو ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ایک طرف لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرزِ عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔"

(النساء ۱۲۸)

اس سے پہلے کی ایک آیت میں ذیل کا اعلان کیا گیا ہے:۔

"اگر تمہیں میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک منصف مرد کے رشتہ داروں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو۔ اگر یہ دونوں مصالحت چاہیں گے تو اللہ مصالحت کی صورت نکال دے گا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

(النساء ۳۵)

نظام اسلامی میں رشتہ نکاح کو جو تقدس حاصل ہے اُسے غیر مسلم یا تو سمجھ نہیں سکے یا اس کی پوری طرح داد نہیں دے سکے۔ الاشباہ والنظائر میں ہے: 'شادی ایک ایسا ادارہ ہے جو نوعِ انسانی کے تحفظ کے لیے اور اس مقصد سے کہ انسان اپنے آپ کو بد کرداری اور آلودہ دامنی سے بچائیں لازم کیا گیا ہے۔' نکاح ایک متبرک رسم ہے، ان معنوں میں کہ وہ اس دنیا میں ایک عملِ عبادت ہے کیونکہ وہ انسان کو ناپاکی ونجاست سے بچاتا ہے۔' وہ نوعِ بشر کے افراد کے درمیان حکم ربی سے مقرر کیا گیا ہے۔'' نکاح کو اگر ایک معاہدہ سمجھا جائے تو وہ ایک ایسے مرد اور ایک ایسی عورت کے درمیان، ان کی باہمی رضامندی پر مبنی، ایک دائمی علاقہ ہے جن کے درمیان عقد کی شرعاً ممانعت نہ ہو۔"

اکثر کہا گیا ہے کہ رسول اللہ نے اپنے متبعین کو اس کی اجازت دی کہ چار شرعی بیویوں کے علاوہ لونڈیوں سے بھی علاقہ رکھیں۔ اس موضوع پر جو حکم ہے وہ بجائے خود یہ واضح کر دینے کے لیے کافی ہے کہ یہ خیال کس حد تک آئین اسلامی کے حقیقی منشا کے خلاف ہے:۔

"جو شخص تم میں سے اس کی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے شادی کر سکے اُسے اجازت ہے کہ تمہاری اُن لونڈیوں میں سے جو تمہارے قبضے میں ہوں

اور مومنہ ہوں کسی کے ساتھ نکاح کرے...... یہ اجازت اُن لوگوں کو دی گئی ہے جنہیں شادی نہ کرنے کی صورت میں پاکبازی سے منحرف ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

(النساء ۲۵)

اس کمزور بنیاد پر اور غالباً مملکتِ اسلامی کے ابتدائی دور کے بعض عارضی اور اتفاقی حالات پر ہمارے ارباب فقہ نے لونڈیوں سے تعلقات رکھنے کے رواج کو قائم کیا ہے۔ اگر چہ یہ رواج معلمِ اسلام کی حقیقی ہدایات کے نقیض ہے، لیکن اس کے باوجود یہ غیر مسلموں کی شدید ترین نکتہ چینیوں کا موضوع بن گیا ہے۔

جاریہ بازی، یعنی آقا اور لونڈی کی نکاح کے بغیر ایک دوسرے سے مباشرت، عربوں، یہودیوں، عیسائیوں اور اُن کی تمام ہمسایہ قوموں میں رائج تھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ابتداءً اس کی مذمت نہیں کی۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسے صریحاً منع کر دیا۔ قرآن میں ہے:۔

''اور محفوظ عورتیں بھی تمہارے لیے حلال ہیں، خواہ وہ اہلِ ایمان میں سے ہوں یا اُن قوموں میں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے، اس شرط پر کہ تم ان کے مہر ادا کر کے انہیں قیدِ نکاح میں لاؤ، نہ یہ کہ تم اُن سے آزادانہ شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو۔''

(المائدہ ۵)

اس آیت کے پہلے حصے کا جو منشا ہے ذرا اُس کا مقابلہ عیسوی کلیسائیت سے کیجئے جس نے کبھی عیسائی کے غیر عیسائی سے عقد کو قانوناً جائز تسلیم نہیں کیا۔ اگر کبھی کسی ''کافر'' نے کسی عیسائی سے شادی کی جسارت کی تو اسے نذرِ آتش کر دیا جاتا تھا۔ شارحِ اسلام وضع کیا ہوا قاعدہ صریحاً انسانیت کے نقطہ نگاہ سے عیسوی قانون کا نعم البدل ہے۔

مسلمان عورتوں کے غیر مسلموں سے شادی کرنے کی ممانعت، جس نے اسلام کے مخالفین کو نکتہ چینی کا بہت سا مواد مہیا کیا ہے، سیاسی مصلحتوں اور اسلامی مملکت کی ابتدائی ضرورتوں پر مبنی تھی۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے رواج جو مسلمانوں نے اعراب

جاہلیت سے ورثے میں پائے اور جواب تک ایک کہنہ نظام کی باقیات کے طور پر جاری ہیں، مسلمان قوموں کی ترقی میں سد راہ ثابت ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک رواج عورتوں کے مردوں سے علیٰحدہ رہنے کا رواج ہے۔ یہ رواج ابتدائے ایام سے اکثر قدیم اقوام میں متداول تھا۔ ''جائنے کو نائٹس'' یعنی حرم سرا اہل ایتھنز کے یہاں ایک معروف ادارہ تھی اور ایک ایتھنی حرم کی رہنے والیوں کو اُسی طرح نگاہِ عام سے چھپایا جاتا تھا، جس طرح اس زمانے میں ایرانی گھرانے کی عورتوں کو چھپایا جاتا تھا، یا آج کل ہندوستانی گھرانوں کی عورتوں کو چھپایا جاتا ہے۔ اپنے ہم پیشہ مشرقی خواجہ سراؤں کی طرح ''جائنے کونوموئے'' عورتوں کی پردہ دارانہ زندگی کے معتبر محافظ تھے اور وہ ایتھنز کی خواتین کی بڑی مستعدی سے نگہبانی کرتے تھے۔ عورتوں کے الگ تھلگ رہنے کی بدولت قدرتی طور پر ''ہیٹر ائی'' یعنی پڑھی لکھی رنڈیوں کا طبقہ وجود میں آ گیا، جس کے بہت سے افراد نے ایتھنز کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ بازنطینی سلطنت میں جو غیر معمولی اور ناقابلِ توجیہہ منظر دکھائی دیتا تھا اور جواب جدید یورپ وامریکہ میں دکھائی دیتا ہے، اگر وہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہ ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ کسی ایسے معاشرے میں جس نے فنونِ تہذیب میں ذراسی بھی ترقی کی ہے، ان بدنصیب عورتوں کا وجود جو انسانیت کے چہرے پر ایک شرمناک داغ اور تہذیب کے لیے سرمایہ ننگ و عار ہیں، اس امر کا نتیجہ ہے کہ عورتیں مردوں کی زندگی سے الگ تھلگ رہنے کے باعث مردوں کے نفوس پر وہ شرافت آفریں، پاکیزہ گن اور انسانیت آموز اثر مرتب نہیں کر پائیں جو کچھ اُنہی کا خاصہ ہے۔ جب پاکیزہ چیزیں نفسِ انسانی کے سامنے نہیں ہوتیں تو وہ ناپاک چیزیں تلاش کرتا ہے۔ اہلِ بابل، اہل ایٹروریا اہلِ ایتھنز اور اعرابِ جاہلیت قدیم زمانوں میں اس حقیقت کی نمایاں ترین مثالیں پیش کرتے ہیں، لیکن وہ معاشرتی ناسور جو جدید زمانے میں قوموں کو اندر ہی اندر سے کھائے جارہا ہے اور اُن کے خونِ زندگی میں زہر پھیلا رہا ہے۔ ایک منکرِ خدا مادہ پرستی کا نتیجہ ہے، جس کے اوپر مذہب کا، چاہے وہ عیسائیت ہو، چاہے اسلام اور چاہے کوئی اور مذہب، ایک ملمع چڑھا ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اوائل زندگی میں اہل مکہ کی اخلاقی خرابیوں کو دیکھ دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان خرابیوں کو

دور کرنے کا وہ طریقہ اختیار کیا جو اس زمانے اور اُن لوگوں کے حالات کے پیش نظر موثر ترین تھا۔ مسٹر بوز ورتھ سمتھ کے پر معنی الفاظ میں 'اول اول اپنے سخت قوانین کی بدولت اور بعد میں اُن قوانین نے جو قوی اخلاقی جذبہ پیدا کیا، اس کی بدولت آپ ﷺ آج تک مسلم ممالک کو' (یعنی اُن ممالک کو جن میں غیر ملکی اثرات کی وبا نہیں پھیلی) ''اُن مطعونِ خلائق اور بدنصیب عورتوں سے پاک رکھنے میں کامیاب رہے ہیں، جن کا مدارِ زندگی ایک ذلیل پیشہ ہوتا ہے اور جن کا ایک علیحدہ اور جانے پہچانے طبقے کی حیثیت سے موجود ہونا اس معاشرے کے ہر فرد کے لیے جس کی وہ رکن ہوتی ہیں باعثِ ننگ و عار ہوتا ہے۔ اس کامیابی کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔''

عورتوں کو علیحدہ رکھنے کا دستور بیشک غیر متمدن جماعتوں کی فلاح و بہبود کے حق میں بہت سے فائدوں کا حامل ہے۔ ایسے ملکوں میں بھی جہاں ثقافت اور اخلاقی خیالات کا بہت تنوع پایا جاتا ہے عورتوں کو علیحدگی کی کوئی ترمیم یافتہ صورت فائدے سے خالی نہیں ہوتی۔ فی زمانہ یہ دستور کم و بیش سختی کے ساتھ بعض ایسی قوموں میں رائج ہے، جو مسلم اثرات سے بہت دور ہیں، جن کی طرف اسے ہندوستان اور دوسرے مشرقی ملکوں میں منسوب کیا جاتا ہے۔ کوریا میں عورتوں کی علیحدگی حماقت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ چین میں اور جنوبی امریکہ کی ہسپانوی نوآبادیوں میں، جو براہِ راست یورپی تہذیب کے حلقہ اثر میں نہیں ہیں، پردے کا رواج ابھی تک قائم ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اسے ایرانیوں اور دوسری مشرقی قوموں میں متداول پایا۔ آپ ﷺ نے اس کے فائدوں کو محسوس کیا اور ممکن ہے کہ عربوں کے تمام طبقوں میں جو اخلاقی ابتری پھیلی ہوئی تھی اس کے پیشِ نظر آپ ﷺ نے عورتوں کو اس کی تلقین کی، لیکن یہ خیال کرنا کہ آپ ﷺ کا مقصد اُسی سختی کے ساتھ اس کی ہدایت کرنا تھا یا یہ کہ آپ ﷺ نے عورتوں کی مکمل علیحدگی کی تلقین کی۔ خود قرآن سے اس دعوے کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ عورتوں کی علیحدگی دینِ اسلام کا ایک جزو ہے۔

''اے محمد ﷺ، اپنی عورتوں، اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی چادریں اپنے اوپر قدرے نیچی لٹکائیں۔ اسے وہ بہ آسانی پہچانی جائیں گی اور کوئی اُن کی توہین نہ کرے گا۔ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔'' (الاحزاب ۵۹)

''اور اے نبی، مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگار نہ دکھائیں، سوا اُس کے جو خود بخود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔'' (النور ۳۱)

اس معاشرتی اور اخلاقی ابتری کے پیشِ نظر جس کے اندر سے آپ ﷺ کے زیرِ ہدایت ایک نظام پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ہدایات آسانی میں سمجھ آجاتی ہیں۔ یہ دانشمندانہ اور کارآمد ہدایات تھیں جن کا مقصد عورتوں میں شرم وحیا کو فروغ دینا، اُن کے لباس اور اُن کے طور طریقوں کی اصلاح اور اُنہیں توہین سے محفوظ رکھنا تھا۔[1]

لہٰذا یہ تصور کرنا ایک غلطی ہے کہ شریعت میں کوئی ایسا حکم ہے جو پردے کے رواج کو دوام بخشنے کا رجحان رکھتا ہے۔ شارع نے عورتوں کے حجاب کے بارے میں جو ہدایات صادر کیں ان کے حقیقی مفہوم کی بڑی حد تک اس امر سے وضاحت ہوتی ہے کہ خود آپ کے خاندان کی عورتوں پر نقل وحرکت کی کوئی سخت پابندیاں عائد نہیں کی گئیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بنت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے، جن سے آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد شادی کی، بنفسِ نفیس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف تحریک بغاوت کی قیادت کی۔ جنگ جمل کی مشہور لڑائی میں وہ خود اپنی فوجوں کی سپہ سالار تھیں۔ آنحضرت ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خلافت کی جانشینی سے متعلق مذاکروں میں شرکت کی۔ آنحضرت ﷺ کی نواسی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے معرکہ کربلا کے بعد اپنے نوجوان بھتیجے کی حمایت میں علمِ جہاد بلند کیا۔ اُن کی ہمت وجرأت سے خون آشام عبید اللہ

---

[1] ''ہدایہ'' کا مترجم ہملٹن اپنے مقدمے میں، جس میں وہ Book of Nominations سے بحث کرتا ہے، یوں رقمطراز ہے: ''یہ ایک ایسا موضوع ہے جس میں بہت سے رکیک مباحث شامل ہیں اور جس پر زیادہ تر ایک ایسے مقالے کی روشنی میں غور کرنا ضروری ہے جس کا تعلق حسنِ اخلاق اور شائستگی سے ہو۔ اس میں جو چیز خاص طور پر نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ نسوانی حیا پر بڑی احتیاط سے توجہ مبذول کی گئی ہے اور اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کوئی ایسا عمل نہ ہونے پائے جس سے خیال میں بھی اس کی بے حرمتی ہو، لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس سے عبارت عورتوں کی وہ مکمل علیحدگی نہیں جو مصنفین نے تصور کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عورتوں کی علیحدگی رشک اور غرور کا نتیجہ ہے، نہ کسی شرعی حکم امتناعی کا جیسا کہ ہدایہ کے اس حصے اور بہت سے دوسرے حصوں سے واضح ہے۔ علاوہ بریں یہ قاعدہ تمام مسلم ممالک میں رائج بھی نہیں۔

بن زیاد اور شقی القلب زید دونوں خائف ہو گئے۔

وہ فساد اخلاقی جس نے اعرابِ جاہلیت اور یہودیوں اور عیسائیوں کے معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں، فوری اصلاح کا متقاضی تھا پیغمبر اسلام ﷺ نے عورتوں کے حجاب کے بارے میں جو ہدایات دیں، انہوں نے بلا شک وشبہ بداخلاقی کے سیلاب کی روک تھام کی اور کفارِ عرب میں جو یہ دستور تھا کہ ایک عورت کے متعدد خاوند ہوتے تھے اسے اپنے متبعین میں مخفی طور پر رائج نہ ہونے دیا۔

فان ہمیر کے نزدیک حرم ایک مامن ہے، اس میں غیر مردوں کو آنے کی جو ممانعت ہوتی ہے وہ اس لیے نہیں ہوتی کہ عورتوں کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جاتا، بلکہ رسم و رواج نے انہیں جو حرمت بخش رکھی ہے اس کی وجہ سے۔ کیا ایشیا اور کیا یورپ دونوں کے مسلمانوں میں عورت کا جو احترام ہے اُس کی بین شہادت ہر جگہ بہ آسانی مل سکتی ہے۔''

عورتوں کے بارے میں ایک بلند تصور رکھنا افضل ترین طبائع کا ایک قدرتی خاصہ ہے، لیکن جہاں تک عورتوں کو معاشرے میں ایک بلند درجہ دینے کا تعلق ہے، اس موضوع پر قومی غرور اور مذہبی تعصب نے جدید عیسائیت کے تمام شائستہ و متمدن طبقوں میں دو متبائن نظریے ایجاد کیے ہیں۔ ایک نظریے کی رو سے عورتوں کی تعظیم مریم پرستی کا نتیجہ ہے۔ دوسرے نظریے کی رو سے وہ قرونِ وسطیٰ کے اس دستور کا نتیجہ ہے کہ عورتوں کی حمایت و حفاظت کرنا جزو شجاعت سمجھا جاتا تھا، جو ٹیوٹونک اداروں میں ایک ادارہ تھا۔ عورتوں کے بارے میں عیسائیت کا جو نقطہ نظر ہے اُس کی بابت جتنا کم کہا جائے اُتنا ہی بہتر ہے۔ ابتدائی زمانوں میں، جب اشرف و اسفل، عالم و جاہل، سب کا مذہب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں کی پرستش پر مشتمل تھا، عیسوی کلیسا نے عورت ذات کو راندۂ درگاہ قرار دے رکھا تھا۔ آبائے کلیسا نے یکے بعد دیگرے عورتوں کی خباثتوں، فتنہ پردازیوں اور شرانگیزیوں پر دادِ فصاحت دی۔ ٹرٹلین نے جب عورت کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا کہ ''وہ شیطان کا دروازہ، آدمؑ کو شجرِ ممنوعہ کھلانے والی، قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والی اور خدا کی شبیہ یعنی انسان کی بگاڑنے والی ہے'' تو وہ رائے عامہ کی نمائندگی کر رہا تھا۔ ایک اور صاحب رائے نے ایک نفرت انگیز انسان دشمنی کے ساتھ اعلان کیا کہ 'میں نے عورتوں

میں عصمت تلاش کی لیکن نہ پائی۔'' لیکی کہتا ہے کہ کریسوسٹم نے، جسے ایک بلند مرتبت ولی تصور کیا جاتا ہے، جب عورت کے بارے میں یہ کہا کہ وہ ایک ناگزیر شر، ایک قدرتی دامِ تحریص، ایک فتنۂ دلفریب، ایک برقِ نشیمن، ایک سرِ مہلک، ایک بنی ٹھنی آفت ہوتی ہے'' تو وہ آبائے کلیسا کے اجماع کی ترجمانی کر رہا تھا۔ راسخ العقیدہ کلیسا نے عورتوں کو ادنیٰ ترین رسوم کے سوا تمام مذہبی رسوم سے خارج کر دیا۔ معاشرے سے بھی وہ مطلقاً خارج تھیں: نہ وہ کھلے بندوں باہر جا سکتی تھیں، نہ دعوتوں اور ضیافتوں میں شریک ہو سکتی تھیں۔ انہیں تاکید تھی کہ گھر کے گوشۂ عزلت میں بسر کریں، خاموش رہیں، اپنے میاں کی اطاعت کریں اور اپنا وقت سوت کاتنے، کپڑا بننے اور کھانے پکانے میں صرف کریں۔ اگر وہ کبھی باہر جاتیں تو ضروری تھا کہ وہ اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک لپیٹ لیں۔ یہ تھی عورتوں کی حالت دنیائے عیسوی میں، ایک ایسے وقت جب ہر طبقے میں حضرت مریم علیہا السلام کی پرستش رائج تھی۔ بعد کے زمانوں میں اور بالخصوص اس وقفے میں جو مغربی سلطنت کی بربادی اور یورپ میں جدید معاشرت کے ظہور کے درمیان گزرا، یعنی اُن صدیوں میں جنہیں ''قتل و غارت دروغ گوئی جبر و تعدی، حرص و ہوس اور تشدد کی صدیاں'' کہا گیا ہے، عیسائیت نے راہب خانے قائم کر کے عورتوں کی حالت کو چند امور کے لحاظ سے بہتر بنا دیا، لیکن یہ مشتبہ اصلاح حال صرف ایک ایسے دور کے لیے موزوں تھی جب عورتوں کا اغوا آئے دن کا واقعہ تھا اور اخلاق کی ابتری ناقابلِ بیان تھی۔ علاوہ بریں تمام راہب خانے نیکو کاری اور پرہیزگاری کے مقامات نہ تھے اور تجرد کی تاکید عصمت و عفت کی یقینی ضمانت ثابت نہ ہوئی تھی۔ رجسٹرم وزی تیسیونم'' (The Registrum visitationem) یعنی آرچ بشپ ریگو، کا اسقفی روزنامہ زمانۂ عقیدت کے سب سے شاندار حصے میں اخلاق کی جو حالت اور عورتوں کی جو حیثیت تھی اس پر ایک عجیب روشنی ڈالتا ہے۔ پروٹسٹنٹ مذہب کے ظہور نے بھی عورتوں کی حالت میں اور قانون دانوں کے نزدیک اُن کی جو حیثیت تھی اس میں کوئی فرق نہ ڈالا۔ جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عورتوں کے ساتھ انسانیت کا سلوک کیا تھا وہاں اُن کے تابعین نے انہیں انصاف کے دائرے سے بھی خارج کر دیا۔

دوسرا نظریہ جس کی طرف ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے یورپ کے رومان نویسوں

میں مقبول ہے۔ اُنھوں نے قرونِ وسطیٰ کے ہر تاریخی شخص کو یوں پیش کیا ہے جیسے وہ کوئی بایار (Bayard)[1] یا کرائٹن (Crichton)[2] تھا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ''شولری'' (Chivalry) یعنی نیکو کارانہ جوان مردی کا زمانہ آٹھویں صدی کے آغاز سے لے کر چودھویں صدی کے اختتام تک تھا۔ قابلِ ملاحظہ ہے کہ مسلمانوں کے ہسپانیہ میں اقتدار کا بھی قریب قریب یہی زمانہ تھا، لیکن اس زمانے میں بھی اس سنہرے ہالے کے باوجود جو شاعری اور رومان نگاری نے اس کی معاشرتی حالت کے گرد ڈال رکھا تھا، عورتیں اکثر جبر و تشدد کا تختۂ مشق بنتی تھیں۔ زور زبردستی فریب دغا عیسائی ''شولری'' کے عہدِ زریں کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ جب تک مغرب کو مشرق کی تہذیب و شائستگی سے واسطہ نہیں پڑا اُس وقت تک رولینڈ اور آرتھر محض فرضی شخصیتیں تھے۔ ''شولری'' سیکنڈی نیویا کے برف زاروں یا جرمنی کے اندھیرے اور گھنے جنگلوں کی پیداوار نہ تھی: نبوت کی طرح ''شولری'' کا مرز بوم بھی ریگستان ہی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ نما ہوئے اور ریگستان ہی سے حضرت عنترہ رضی اللہ عنہ، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ظہور ہوا۔

جو عرب شہروں اور گاؤں میں رہتے تھے اور جنھوں نے شامیوں، ایرانیوں اور رومیوں کے رکیک اخلاقی خیالات اپنا لیے تھے، اُن کے یہاں، جیسا کہ ہم اُوپر کہہ آئے ہیں، عورتوں کی حالت نہایت خستہ و خراب تھی۔ البتہ بعض بدوی قبیلوں میں عورتوں کو بڑی آزادی حاصل تھی اور وہ اپنے قبیلوں میں بڑا اثر و نفوذ رکھتی تھیں۔ پیرن کے قول کے مطابق ''وہ یونانیوں کی عورتوں کی طرح بدنصیب ہستیاں نہ تھیں۔'' وہ اپنے مردوں کے ہمراہ لڑائی کے میدانوں میں جاتی تھیں اور اُن کی ہمت بڑھاتی تھیں۔ جوانمرد اپنی بہنوں ماؤں اور معشوقاؤں کے گیت گاتے ہوئے دادِ تہور دیتے تھے۔ اُن کی سرفروشی کا سب سے بڑا انعام ان عورتوں کی محبت ہوتی تھی۔ مردوں کے لیے سب سے بڑی خوبیاں بہادری اور فیاضی ہوتی تھیں اور عورتوں کا سب سے قیمتی زیور عصمت ہوتا تھا۔ اگر کسی

---

[1] فرانس کے حماسہ ''شانساں در رولاں'' (رولاں کا گیت) کا ہیرو جو قوت، شجاعت اور نیکی میں مشہور تھا۔

[2] انگلستان کا ایک تاریخی یا افسانوی بادشاہ جو اپنی گول میز (یعنی بہادراں) کے سات بہادری اور نیکی کے کارناموں کے لیے مشہور ہے۔

قبیلے کی ایک عورت کی توہین کی جاتی تو اس سے جزیرہ نمائے عرب کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک غصے کی آگ بھڑک اُٹھتی تھی۔ حرب الفجار، جو چالیس برس تک جاری رہی اور جسے پیغمبرِ اسلام ﷺ نے بند کرایا، یوں شروع ہوئی کہ عکاظ کے میلے میں کسی ایک جوان لڑکی کی اہانت کی گئی۔

حضرت محمد ﷺ نے متلون الطبع بدوؤں کے ایک جذباتی دستور کو لے کر اُسے ایک مستقل شعار کی صورت بخشی اور عورتوں کے احترام کو اسوۂ اسلامیہ میں شامل کیا۔ بہت سی ایسی ہدایات کے ساتھ ساتھ جو اس زمانے کی سیدھی سادی اور ناتراشیدہ معاشرت کی آئینہ داری کرتی ہیں، آپ ﷺ کے ارشادات میں کسی اور معلم کی تعلیمات سے کہیں زیادہ عورتوں سے جواں مردانہ سلوک کسی اور مذہب یا معاشرتی نظام کی بہ نسبت حقیقی اسلام سے زیادہ گہرا تعلق رکھتا ہے۔

اسلام کا سورما، حلف الفضول کے بانی کا سچا شاگرد، کمزوروں اور مظلوموں کی دادرسی کرنے کے لیے بھی ہر وقت اُتنا ہی تیار رہتا تھا جتنا دُشمنانِ خدا کے خلاف تیغ وسنان سے جہاد کرنے کے لیے۔ عراق کے میدانوں میں ہو یا عرب کی سرزمین پر، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بیکسوں اور دکھیوں کی فریاد سُن کر زرہ پوش غازی اُن کی مدد کے لیے آگے نہ بڑھا ہو۔ آپس کے کارناموں نے داستانوں کی صورت میں مجسم ہو کر اور لشکر گاہ سے قصرِ شاہی تک پہنچ کر بعد میں آنے والی نسلوں کو بہادری کا سبق سکھایا ہے۔ خلیفہ ایوانِ ضیافت میں دستر خوان پر بیٹھا ہوا ہے کہ اس کے کانوں میں ایک عرب لڑکی کی آواز پڑتی ہے، جسے رومی سپاہیوں نے اسیر کر رکھا ہے: ''عبدالمالک میری مدد کو کیوں نہیں آتا؟'' اور وہ وہیں کھانے کی رکابی اپنے سامنے سے ہٹا دیتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ جب تک لڑکی کو آزاد نہ کرا لے گا اُس وقت تک پانی کا ایک قطرہ بھی اپنے لبوں کو نہ چھوائے گا۔ اُسی وقت وہ اپنا لشکر لے کر رومی اوباشوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور لڑکی کو آزادی دلا کر خود اپنے عہد سے آزادی حاصل کرتا ہے۔ ایک مغل شہنشاہ[1] بے دریغ دشمنوں سے جان بچا کر کسی مامن کی تلاش میں اپنی سلطنت کی سرحد کی طرف چلا جا رہا ہے کہ ایک غیر مذہب کی رانی کا بھیجا ہوا ایک کنگن اُسے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ اس بات کی نشانی ہے کہ وہ اس کا منہ بولا بھائی ہے جس سے وہ

مدد کی التجا کر رہی ہے۔ وہ اپنی مصیبت اور ضرورت کو بھول کر الٹے قدم پلٹتا ہے، رانی کے دشمنوں کو شکست سے دیتا ہے اور از سرِ نو اپنے سفر غریب الوطنی پر روانہ ہو جاتا ہے۔

اولسنر (Oelsner) عنترہ کو ''شِولری'' کا باپ کہتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ''شِولری'' کا منتہائے کمال تھے، یعنی شجاعت جرأت اور فیاضی کا ایک مجسمہ، پاکباز، شریف النفس، صاحب علم و دانش، بے خوف و بے داغ۔ انہوں نے غازیانہ خلقِ عظیم کی بہترین مثال دنیا کو پیش کی۔ آپ کی پاکیزہ سریت، جو سیرتِ نبوی کی ہو بہو شبیہ تھی، دنیائے اسلام پر چھا گئی اور آنے والے ادوار کی روحِ زندگی بنی۔ صلیبی محاربوں کی بدولت وحشی یورپ کو مشرقِ اسلامیہ کے تمدن سے مس حاصل ہوا اور مسلمانو کی شان و شوکت اور نفاست کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ لیکن جس چیز نے بالخصوص یورپ کو ''شِولری'' سے آشنا کیا وہ اسلامی اندلوسیہ کے وہ اثرات تھے جو اُس کے ہمسایہ عیسائی صوبوں پر پڑے۔ ''ٹروڈور جنوبی فرانس کے ''تردور'' اور جرمنی کے منی سنگر'' جنہوں نے جنگ میں شجاعت و غیرت کے گیت گائے، قرطبہ غرناطہ اور ملقا کے رومان نویس شاعروں کے بلاواسطہ اخلاف تھے پیٹرارک اور بوکیچو بلکہ ٹیسو اور چاسر بھی اسلام کے سرچشمے سے سیراب ہوئے۔ لیکن یورپ کے وحشیوں کی اُجڈ عادتوں اور فحش خیالوں نے خالص ''شولری'' کو لے کر کثافت و غلاظت سے آلودہ کر دیا۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں، مشرقی اسلامی حکومت کے اختتام تک، عورتوں کو قریب قریب ویسا ہی بلند درجہ حاصل تھا جیسا جدید معاشرے میں ہے۔ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ نے اپنے زمانے کی تاریخ میں ایک نمایاں کردار ادا کیا اور اپنے محاسن و فضائل کی بدولت ایسا نام چھوڑا جس کی آئندہ نسلوں نے عزت کی۔ فردخ مدنی کی بیوی حمیدہ نے اپنے میاں کی غیر حاضری میں، چوبیس سال تک جنگی مہموں میں مصروف تھا، تنِ تنہا اپنے نوعمر لڑکے کی سرپرستی اور تربیت کی اور اسے تعلیم دے کر اپنے وقت کے برگزیدہ

---

[1] شہنشاہ ہمایوں جب اپنے افغان دشمنوں سے جان بچا کر کابل کی طرف کوچ کر رہا تھا تو اسے رانی جو دھپور کا کنگن امداد کی نشانی کے طور پر پیش کیا گیا۔ وہ اپنی مصیبت کو بھول کر فوراً اس کی مدد کو پہنچا۔ میں نے مسلمانوں کی جوان مردی کی صرف دو مثالیں بیان کی ہیں، لیکن سینکڑوں پیش کی جا سکتی ہیں۔

علمائے فقہ کے زُمرے میں داخل کر دیا[1]۔ حضرت امام[2] حسین رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پوتی سکینہ اپنے وقت کی عورتوں میں سب سے زیادہ طباع و ذہین، باکمال اور پاکباز تھیں۔ پیران اُن کی شان میں یہ الفاظ استعمال کرتا ہے: 'اپنے زمانے کی خاتونِ خواتین، سب سے جمیل، سب سے لطیف الطبع، سب سے بڑھ کر ستودہ صفات'' وہ نہ صرف خود اعلیٰ درجے کی فضیلت سے آراستہ تھیں، بلکہ انہیں علما واتقیا کی مجلسوں میں شرکت بہت مرغوب تھی۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور خانوادہ نبوی کی دوسری خواتین علم و فضل اور زُہد و تقویٰ میں برگزیدہ تھیں۔ خلیفہٗ مامون الرشید کی بیوی بوران، اُن کی بہن اُم الفضل جو آٹھویں علوی امام کی بیوی تھیں اور مامون کی بیٹی اُمّ الحبب سب کی سب علم و فضل میں مشہور تھیں۔ پانچویں صدی ہجری میں شیخہ شہدہ جن کا لقب فخر النساء تھا، بغداد کی جامع مسجد میں ادب، بیان و بلاغت اور شاعری پر بڑے بڑے مجمعوں سے خطاب کیا کرتی تھیں۔ اسلام کی تاریخ میں اُنہیں ممتاز ترین علماء کے برابر رُتبہ حاصل ہے۔ اگر یہ خاتون سینٹ سرِل (Sain Cyril) کے ہم مذہبوں میں ہوتیں تو اُن کا کیا حال ہوتا اس کا اندازہ ہائی پیشیا (Hypatia) کی سرگزشت سے لگایا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ جوشیلے عیسائی اُن کی تکا بوٹی نہ کر دیتے، لیکن یہ تو یقین ہے کہ انہیں ایک جادوگرنی کی طرح جیتے جی آگ میں جلا دیا جاتا۔ ذات الہمہ (شیر کے دل والی) جن کے نام کو بگاڑ کر زمہ (Zemma) کہا جاتا ہے کئی جنگوں میں شریک اور مردوں کے دوش بدوش تیغ آزما ہوئیں۔

رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے قوانین و ہدایات کی بدولت عورتوں کی حیثیت میں جو بہتری ہوئی اُس کا اعتراف تمام غیر متعصب مصنفین نے کیا ہے، لیکن متعصب کج بحث اب بھی کہتے ہیں کہ اسلامی نظام نے عورتوں کی حیثیت کو پست کر دیا۔ اس سے جھوٹا الزام اسلام کے عظیم بانی پر نہیں لگایا گیا۔ اُنیس صدیوں کی مسلسل ترقی نے ایک قدیم تر تہذیب کے ورثے کے ساتھ مل کر اور انتہا درجے کے موافق نسلی حالات اور آب و ہوا سے فائدہ اٹھا کر بیشتر عیسائی ملکوں میں عورتوں کو مردوں سے بلند تر معاشرتی درجہ عطا کر

---

[1] عمر فروخ ۲۷ سال تک خراسان میں معروف جنگ تھا۔ اس کے بیٹے کا نام ربیعہ الرائی تھا۔

[2] حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شادی آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

دیا ہے اور آداب و مراسم کا ایک ایسا ضابطہ قائم کر دیا ہے جو کم از کم بظاہر عورتوں کو یہ حق بخشتا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں اُن کا زیادہ احترام کیا جائے، لیکن عیسائی دنیا کی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ قوموں میں بھی عورتوں کی قانونی حیثیت کیا ہے؟ ماضی قریب تک اور تو اور انگلستان میں بھی ایک شادی شدہ عورت کو اپنے خاوند سے علیحدہ کوئی حقوق حاصل نہ تھے۔ اگر مسلمان عورت نے آئندہ سو برس میں اپنی یورپین بہن کے برابر معاشرتی درجہ حاصل نہ کر لیا تو نظامِ اسلامی کے خلاف جوشیلی تقریریں حق بجانب ہوں گی۔ لیکن جس معلم نے ایک ایسے زمانے میں جب کوئی ملک کوئی نظام، کوئی جماعت عورت کو، چاہے وہ کنواری ہو یا بیاہی ہوئی، ماں ہو یا بیوی، کسی قسم کے حقوق نہ بخشتی تھی، اور ایک ایسے ملک میں جہاں بیٹی کی پیدائش کو ایک بلائے آسمانی سمجھا جاتا تھا، عورتوں کو ایسے حقوق عطا کئے جو بیسویں صدی میں بھی مہذب قومیں اُنہیں طوعاً و کرہاً اور بامرِ مجبوری دے رہی ہیں، وہ معلم نوعِ انسانی کے شکریے کا مستحق ہے۔ اگر پیغمبر اسلام ﷺ اور کچھ بھی نہ کرتے تو پھر بھی اُنہیں محسن انسانیت کہلائے جانے کا غیر متنازعہ فیہ حق پہنچتا تھا۔ فقہ کی کتابوں میں جس طرح قوانین اسلامی مندرج ہیں اگر اُنہیں اُس طرح بھی قبول کر لیا جائے تو اس صورت میں بھی مسلمان عورتوں کی قانونی حیثیت یورپی عورتوں کی قانونی حیثیت سے بہت بہتر ہے، ہم اس موضوع پہ ایک اور جگہ تفصیلی بحث کر آئے ہیں۔ یہاں ہم صرف اتنا کریں گے کہ ضابطۂ اسلامی میں عورتوں سے متعلق جو قوانین ہیں اُن پر ایک اجمالی نگاہ ڈالیں۔ جب تک عورت ناکتخدا رہتی ہے وہ اپنے ماں باپ کے زیرِ سایہ بسر کرتی ہے، اور جب تک وہ سنِ بلوغ کو نہیں پہنچتی وہ کسی نہ کسی حد تک باپ یا اُس کے نمائندے کے قبضۂ اختیار میں ہوتی ہے، لیکن جس دن وہ سنِ بلوغ کو پہنچے اُسی دن قانون اُس کو وہ تمام حقوق بخش دیتا ہے جو ایک خود مختار فردِ انسانی کی حیثیت سے اُس کا پیدائشی ورثہ ہیں۔ وہ اپنے بھائیوں کے دوش بدوش اپنے ماں باپ کی جائیداد کی وارث ہوتی ہے۔ یہ بجا ہے کہ اس کا حصہ نسبتہً کم ہوتا ہے، لیکن یہ امتیاز بھائی اور بہن کی اضافی حیثیت پر مبنی ہے۔ اگر کوئی عورت بالغ و عاقل ہو تو کسی قسم کے حالات میں بھی اُس کی

شادی اُس کی علانیہ رضا مندی کے بغیر ''کسی بادشاہ سے بھی[1]'' نہیں کی جا سکتی۔ شادی کے بعد وہ اپنی انفرادیت سے محروم نہیں ہو جاتی بلکہ معاشر کا ایک خود مختار فرد رہتی ہے۔ شادی سے پہلے خاوند کا بیوی کو مہر دینا ایک لازمی شرط ہے، اور اگر وہ اپنی خوشی سے مہر نہ دے تو قانون اُس کی رقم عورت کی حیثیت کے مطابق مقرر کر دیتا ہے۔ مسلمانی طریقے کا نکاح ایک قانونی معاہدہ ہوتا ہے، جس کے لیے نہ کسی قاضی کا التزام ہے نہ کسی رسم کا۔ معاہدہ عقد مرد کو عورت کے وجودِ جسمانی پر کوئی اختیار نہیں بخشتا، سوائے اس اختیار کے جس کی تخصیص قانون کرتا ہے۔ اور نہ وہ اُسے عورت کے اموال و املاک پر کوئی اختیار بخشتا ہے۔ ایک ماں کی حیثیت سے اُس کے جو حقوق ہیں وہ انفرادی قاضیوں کی من مانی رایوں پر مبنی نہیں ہوتے۔ نہ کسی مسرف خاوند کو یہ اختیار ہے کہ وہ بیوی کی ذاتی محنت کی کمائی کو ضائع کرے، نہ کسی ظالم خاوند کو یہ قدرت ہے کہ بے خوف پاداش بیوی سے بدسلوکی کرے۔ اگر وہ بالغ و عاقل ہو تو اپنی ذات اور جائداد سے متعلق ہر معاملے میں وہ خاوند یا باپ کی مداخلت کے بغیر عمل کی مختار ہوتی ہے۔ وہ کھلی عدالت میں اپنے قرض داروں پر کسی رشتہ دار کو شامل کیے بغیر یا اپنے خاوند کے نام کی آڑ لیے بغیر بذاتِ خود دعویٰ دائر کر سکتی ہے۔ جب وہ اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہو کر میاں کے گھر جاتی ہے تو اُسے جو خصوصی رعایت حاصل ہیں اُن کے ضامن محض معاشرے کے آداب و رسوم نہیں جن میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، بلکہ کتابِ قانون کی عبارت۔ بحیثیت مجموعی اُس کی حیثیت اکثر یورپین عورتوں سے کمتر نہیں، بلکہ بہت سی باتوں میں یقیناً بہتر ہے۔ اس کی نسبتہً پس ماندہ حالت اسلامی جماعتوں میں تمدن و شائستگی کے عام فقدان کا نتیجہ ہے۔ نہ کہ قوانین اسلامی کی کسی خصوصیت کا۔

---

[1] مسلم فقہا کے یہ قانون وضع کرنے کے صدیوں بعد عیسائی دنیا کے بادشاہ و امرا اکثر اپنی رعایا عورتوں کی شادی اُن کی مرضی کے خلاف کر دیا کرتے تھے۔

چھٹا باب

بندگی (غلامی)

جہاں تک تمہارے غلاموں کا تعلق ہے، انہیں وہی کھانا دو جو تم خود کھاتے ہو اور ویسے ہی کپڑے پہناؤ جیسے تم خود پہنتے ہو۔" (قولِ رسولِ مقبول ﷺ)

غلامی کو بعض خصوصیتوں کے اعتبار سے بجا طور پر تعدّد ازواج سے مشابہ کہا گیا ہے۔ تعدّد ازواج کی طرح وہ بھی ہر قوم میں رائج رہی ہے اور فکر انسانی کی ترقی اور اس کی حس عدل کی نشو ونما کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتی گئی ہے۔ تعدّد ازواج کی طرح وہ بھی اس نفس پرستی اور رعونت کا نتیجہ تھی جو اجتماعی وانفرادی ارتقا کے بعض مرحلوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے لیکن جہاں تعدّد ازواج میں کوئی بنیادی بے انصافی نہ تھی وہاں غلامی ابتدا ہی سے اس لعنت میں مبتلا تھی۔

ابتدائی مراحل میں جب نوعِ انسانی کے باہمی حقوق وفرائض کا پورا پورا فہم نہیں ہوتا، جب قوانین محض ایک شخص یا چند اشخاص کے احکام ہوتے ہیں جن کی اطاعت باقی سب لوگوں پر لازم ہوتی ہے، جب زبردستوں کی مرضی سب کے لیے اصولِ زندگی اور دلیل راہ ہوتی ہے، اس وقت وہ عدم مساوات، خواہ وہ معاشرتی ہو یا جسمانی یا دماغی، جو فطرت نے نوعِ انسانی میں مقدر کی ہے، ہمیشہ غلامی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور نتیجۃً ایک ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے جو اعلیٰ کو ادنیٰ پر مطلق اختیار بخش دیتا ہے۔ کمزوروں کے یوں زبردستوں کے حلقہ بگوش ہونے نے مؤخر الذکر کو یہ توفیق عطا کی ہے کہ انسان پر انجیل کے بیان کے مطابق جو لعنت عائد کی گئی تھی، یعنی یہ کہ "جب تک تو مٹی میں مل کر

مٹی نہیں ہوتا اس وقت تک تو اپنے ماتھے کا پسینہ بہا کر روٹی کھائے گا" وہ اس لعنت سے اپنے آپ کو مبرا کر لیں اور اس طرح جو فرصت انہیں حاصل ہوئے مرغوب مشغلوں میں صرف کریں۔ 'قدیم آئین' (Ancient Law) کا مصنف کہتا ہے کہ "کسی اور کی جسمانی طاقت کو اپنے آرام و آسائش یا راحت و مسرت کے لیے استعمال کرنے کی خواہش ہی بلا شک وشبہ غلامی کی بنیاد ہے اور یہ خواہش اتنی ہی قدیم ہے جتنی فطرت انسانی۔"

غلامی کا دستور نوعِ انسانی کا ہم عمر ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس کے آثار ہر زمانے اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا بیج اس وقت پڑا جب انسانی معاشرہ وحشت کے مرحلے میں تھا اور وہ اُس وقت بھی پھلتا پھولتا رہا جب مادی تہذیب کی ترقی نے اس کی ضرورت کو رفع کر دیا تھا۔

یہودی، یونانی، رومی اور قدیم المانی قوموں میں، جن کے قانونی و معاشرتی اداروں نے جدید زمانے کے رسم و رواج اور شعائر پر سب سے زیدہ اثر ڈالا ہے، دونوں طرح کی غلامی، یعنی زرعی کمین پن بھی اور خانگی خدمت گزاری بھی، قانوناً جائز اور عملاً رائج تھی۔

جب سے عبرانی ایک ملت کی حیثیت سے وجود میں آئے اُسی وقت سے اُن کے یہاں دو قسم کی غلامی مروج تھی۔ ایسے اسرائیلیوں کو جو پاداش جرم میں غلام بنتے تھے غیر نسل کے غلاموں سے اونچا درجہ دیا جاتا تھا۔ اسرائیلی غلام چھ سال کی خدمت کے بعد قانوناً آزاد ہو جاتا تھا البتہ اس کو اختیار تھا کہ اس قانونی حق سے فائدہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے لیکن غیر ملکی غلام، چاہے اور اُن قوموں سے تعلق رکھتے ہوں جنہیں بنی اسرائیل نے بیرحمانہ جنگوں کے ایک باقاعدہ سلسلے کے ذریعے زرعی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، یا دغا بازانہ حملوں میں گرفتار کیے گئے ہوں یا خریدے گئے ہوں، بہرصورت آزادی حاصل کرنے کے اس حق سے محروم تھے۔ یہ امتیاز قطعاً قومی جانبداری اور یہودیوں کی خصوصی علیحدگی پسندی پر مبنی تھا۔ ان غلاموں اور لونڈیوں کو سخت سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں۔ چاہے وہ زمیوں کے کمیرے ہوں، چاہے گھروں کے خدمت گزار، اُن سے نفرت کی جاتی تھی، اُنہیں ذلیل سمجھا جاتا تھا اور وہ اپنے بے رحم آقاؤں کی خدمت میں دائمی محنت و

مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

عیسائیت نے نہ تو ایک معاشرتی اور نہ ایک مذہبی نظام کی حیثیت سے غلامی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس نے اس فتنے کو کم کرنے کے لیے نہ کوئی قاعدہ نافذ کیا نہ کوئی اصول وضع کیا۔ غلاموں کی نافرماں برداری کے بارے میں چند جملوں اور آقاؤں کو غلاموں کا معاوضہ ادا کرنے کی نصیحت کے سوا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں، جیسے کہ وہ عیسوی روایات میں پیش کی گئی ہیں، غلامی کی مذمت میں ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس عیسائیت نے غلام اور لونڈی کو آقا کی مکمل اطاعت کی تلقین کی۔ اُس نے غلامی کو رومی سلطنت کا ایک مسلمہ ادارہ پایا اور اس کے مضر اوصاف کو کم کرنے یا اسے تدریجاً ختم کرنے یا غلاموں کی حالت بہتر بنانے کی ذرہ برابر کوشش کیے بغیر اُس نے اس نظام کو اپنا لیا۔ ملکی قانون کی رو سے غلام محض چیز بست کی حیثیت رکھتے تھے۔ عیسائی اقتدار کے تحت بھی اُن کی یہی حیثیت رہی۔ رومیوں کے یہاں اولین ایام سے غلامی چلی آ رہی تھی۔ غلام، خواہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، جنگ میں ہاتھ آئے ہوں یا خریدے گئے ہوں، خالی خولی مال اسباب سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے آقاؤں کو اُن پر زندگی و موت کا اختیار تھا۔ بہر حال اُس تدریجی اصلاح کی بدولت جس نے بارہ تختیوں (The Tweleve Tables) کے فرسودہ قوانین کو ہیڈرین کے جامع ضابطۂ قوانین میں تبدیل کیا۔ غلاموں کی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔ لیکن اُن تبدیلیوں کے باوجود جو رومی شہنشاہوں کی انسان نوازی یا دانشمندی نے پرانے قوانین میں کیں، غلام کا وجودِ جسمانی کلیتہً مالک کی مرضی کے تابع تھا۔ سلطنت کے ہر ذی اقتدار شخص کے یہاں ہزاروں غلام تھے، جنہیں ذرا ذرا سے قصور پر اذیت پہنچائی جاتی تھی اور کوڑے لگائے جاتے تھے۔

یورپ میں انسانوں کو محض چیز بست کی سی جو حیثیت حاصل تھی، عیسائیت کی آمد سے اس میں اگر کوئی تبدیلی ہوئی تو وہ صرف کلیسائی منصب داری کے دائرے کے اندر ہوئی۔ ایک غلام راہبیت کا مسلک اختیار کر کے آزادی حاصل کر سکتا تھا، بشرطیکہ تین سال کے اندر کوئی شخص اس کی ملکیت کا دعویٰ نہ کرے۔ لیکن اور باتوں کے لحاظ سے غلامی کا دور دورہ اسی طرح برقرار رہا جیسا عہدِ مشرکیت میں تھا۔ ایک عیسائی شہنشاہ کے زیر

حکومت قوانین کا جو خلاصہ مرتب ہوا اُس نے اعلان کیا کہ غلامی قانونِ فطرت ہے اور ضابطۂ رومی نے غلاموں کی زیادہ سے زیادہ قیمت اُن پیشوں کے مطابق مقرر کی جن کے لیے وہ مطلوب ہوتے تھے غلام اور لونڈی کی باہمی شادی قانوناً تسلیم نہ کی جاتی تھی۔ غلام مرد کی شادی آزاد عورت سے اور غلام عورت کی شادی آزاد مرد سے قطعاً ممنوع تھی اور شدید سزاؤں کی مستوجب سمجھی جاتی تھی[1]۔ اس کا نتیجہ تھا غیر محدود جاریہ بازی جس پر کلیسائی منصب دار بھی کاربند تھے۔

یہ تھی صورتِ حال غلامی کی اُس نظامِ قوانین کے تحت جو دنیائے قدیم کا سب سے ترقی یافتہ نظام تھا۔ یہ قوانین تیرہ صدیوں کی دانشمندی کے آئینہ دار تھے اور اُن کے ارتقاء کے آخری دور میں دنیا کے بزرگ ترین معلمانِ اخلاق میں سے ایک معلم کی تعلیمات کا تھوڑا سا پیوند اُن پر لگ چکا تھا۔

جب رومی سلطنت کے کھنڈروں پر مغربی اور شمالی وحشیوں کی حکومت کی بناء رکھی گئی تو انفرادی غلامی کے ساتھ علاقائی غلامی بھی، جس سے رومی نا آشنا تھے، نو آباد ملکوں میں عام ہوگئی۔ آقاؤں کو اپنی رعایا اور اپنے زرعی غلاموں پر جو مختلف اختیارات تھے، وہ اخلاقی زبونی اور پستی کا ایک کراہت انگیز نقشہ پیش کرتے تھے۔ رومی ضابطے کی طرح بربری ضابطے بھی غلامی کو نوعِ انسانی کی ایک معمولی حالت تصور کرتے تھے اور اگر غلام کو کسی طرح کی امان و حفاظت میسر تھی تو محض اپنے آقا کے مملوک کی حیثیت سے، جو حکومت کے علاوہ اُس کی زندگی و موت کا واحد مختار ہوتا تھا۔

عیسائیت غلامی کو محو کرنے یا اُس کی خرابیوں کی اصلاح کرنے میں یکسر ناکام رہی تھی۔ اور تو اور، خود کلیسا کے قبضے میں غلام تھے اور وہ صریح الفاظ میں اس مُضر دستور کو مطابقِ قانون تسلیم کرتا تھا۔ کلیسا کے زیرِ اثر یورپ کے عظیم ترین مفکّروں نے غلامی کی حمایت کی تھی اور اس پر اصرار کیا تھا کہ وہ ناداری اور چوری کے انسداد کا ایک مفید وسیلہ

---

[1] اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے شادی کر لیتی تو اس کے لیے سزاؤں میں ایک سزا یہ تھی کہ وہ قتل کر دی جاتی اور غلام کو زندہ جلا دیا جاتا Millman نے Latin Christianity میں اس موضوع پر جو شاندار باب لکھا ہے وہ اپنے مدافعانہ انداز کے باوجود قابلِ ملاحظہ ہے۔

ہے اور کلیسا کے زیر اثر ہی امریکہ کی جنوبی ریاستوں کے اعلیٰ تمدن سے آراستہ عیسائیوں نے اُن بدقسمت انسانوں کو جو غلامی کی حیثیت سے ان کے قبضہ اختیار میں تھے (اور جن میں بہت سے ان کے ہم نسل تھے) انسانیت سوز سلوک کا تختہ مشق بنایا اور غلامی کی لعنت کو برقرار رکھنے کی خاطر لہو کی ندیاں بہائی ہیں۔ اگر کسی شخص میں کسی ادنیٰ نسل کے خون کا شائبہ بھی ہوتا تو چاہے اس کے کوئی آثار بھی نمایاں نہ ہوں وہ اُسے غلاموں کی گمنام عقوبتوں کا مرد بنانے کے لیے کافی تھا۔ نیگرو لونڈیوں کے ساتھ سفید رنگ مردوں کے ناجائز تعلقات سے جو بچے پیدا ہوتے اُن کے باپ اُنہیں کبھی قانوناً اپنی اولاد تسلیم نہ کرا سکتے تھے۔ کوئی سفید رنگ مرد اپنی نیگرو لونڈی سے عقد نہ کر سکتا تھا۔ اُس کے ناجائز بچوں کی ماں کو بھی اور خود بچوں کو بھی اُس کی سفید رنگ بیوی جب چاہتی بیچ سکتی تھی۔ خدا کی نگاہوں میں انسانوں کی مساوات سے متعلق داعی عیسائیت کی جو تعلیمات تھیں، عیسائیت اُن کی روح رواں کو سمجھنے سے قاصر رہی۔

اسلام رنگ و نسل کے کسی امتیاز کو تسلیم نہیں کرتا۔ سفید و سیاہ شہری و فوجی، حاکم و رعایا، سب اس کے نزدیک نہ صرف نظری طور پر بلکہ عملی طور پر بھی کاملاً مساوی ہیں۔ میدانِ کارزار ہو کہ مہمان خانہ، خیمہ ہو کہ شاہی محل، مسجد ہو کہ بازار، ہر جگہ مسلمان بلا تکلف و بلا اکراہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اسلام کا پہلا موذن، پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک باوفا رفیق اور معزز صحابی، ایک حبشی غلام تھا۔ سفید فام عیسائی کے لیے اس کا سیاہ فام ہم مذہب آسمانی بادشاہی میں اس کا ہمسر ہو تو ہو، اس دنیا کی بادشاہی میں ہرگز نہیں۔ مسیح کی حکومت میں ہو تو ہو مسیحیت کی حکومت میں مطلقاً نہیں۔ ممکن ہے قانون اسے مجبور کرے اور خون کی ندیوں میں بہ کر آیا ہوا، ایک وسیع تر تصورِ انسانیت اس سے تقاضا کرے کہ اپنے سیاہ فام بھائی کو شہری حقوق عطا کرے، لیکن نسل و رنگ کا غرور مساوات کا اعتراف نہیں کرتا۔ چنانچہ خدا کے گھر میں بھی سفید فام اور سیاہ فام ایک دوسرے سے علیحدہ اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات نے غلامی کے رواج کو ایک ضرب شدید لگائی، اور اگر ہمسایہ قوموں میں اُس کی جڑیں اتنی گہری نہ ہوتیں اور انسانی فطرت میں کج روی نہ ہوتی تو اُس وقت جو لوگ اس رواج پر کاربند تھے اُن کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی وہ خود بخود

معدوم ہو جاتا۔

بجا طور پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ چونکہ اسلام کے قوانین، احکام اور تعلیمات کی اشاعت کو بیس سال لگے، اس لیے قدرتی طور پر زمانہ ماقبلِ اسلام کے بہت سے دستور جو بعد میں فسوخ ہو گئے شروع شروع میں یا تو خاموشی سے جاری رہنے دیئے گئے یا علانیہ قانوناً تسلیم کر لیے گئے۔ انہی میں ایک غلامی کا دستور تھا۔ یہ ایک برائی تھی جو عربوں کے گہرے سے گہرے باہمی تعلقات کے تار و پود سے گندھی ہوئی تھی۔ اسے محو کرنے کا طریقہ یہ نہ تھا کہ جتنے غلام اُس وقت موجود تھے اُن سب کو فی الفور آزادی دے دی جاتی (جو کہ اخلاقی اور معاشی نقطہ نگاہ سے ناممکن تھا) بلکہ یہ کہ باحکمت اور انسانیت نواز قوانین کے ذریعے اُسے آہستہ آہستہ زائل کیا جاتا۔ چنانچہ بہت سے قوانین، سلبی بھی اور ایجابی بھی، غلاموں کی آزادی کو رفتہ رفتہ وجود میں لانے کی خاطر وضع کیے گئے۔ اگر اس کے مخالف کوئی طریقِ عمل اختیار کیا جاتا تو نوزائیدہ جمہوریہ کی عمارت زمیں بوس ہو جاتی۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے بار بار خدا کے نام پر اپنے تابعین کو تلقین کی کہ وہ غلاموں کو رہائی بخشیں "جس سے بڑھ کر کوئی عمل اللہ کو قبول نہیں۔" آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام سے متعلق بعض فرائض ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو اُس کی سزا یہ ہو کہ غلام کو آزاد کر دیا جائے۔ آپ ﷺ نے یہ حکم بھی دیا کہ غلاموں کو خدمت کی اُجرت کے طور پر آزادی حاصل کرنے کا حق ہونا چاہیے اور اگر کوئی غلام جس کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لیے کافی رقم نہ ہو اور اس کی جگہ کام کر کے فدیے کی رقم ادا کرنا چاہے تو آقا کو چاہیے کہ اس کے ساتھ معاہدہ کر کے اسے اس کی اجازت دے دے۔ آپ ﷺ نے یہ مزید ہدایت کی کہ غلاموں کو فدیہ ادا کرنے کے لیے بیت المال سے قرض دیا جائے۔ بعض بعض صورتوں میں حکم دیا گیا کہ آقا کی مداخلت کے بغیر بلکہ ضرورت ہو تو اُس کی مرضی کے خلاف غلام کو آزاد کر دیا جائے۔ اگر کسی معاہدے یا پیمان میں ذرا سے شک و شبہ کی بھی گنجائش ہوتی تو اس کی تعبیر غلام کے حق میں کی جاتی اور اگر آقا کی طرف سے آزادی کا تھوڑا سا وعدہ بھی ہوتا تو غلام کو آزادی دلانے کی خاطر اس پر عمل کرایا جاتا۔ نبی کریم ﷺ نے غلاموں سے مہربانی کو وہی درجہ دیا جو آپ ﷺ نے 'رشتہ داروں' ہمسایوں،

ہم سفروں اور مسافروں" کے حقوق ادا کرنے کو دیا۔ آپ ﷺ نے آزادی غلامان کی تاحد امکان ہمت افزائی کی اور یہ ہدایت بھی کہ آزادی کے علاوہ 'اس دولت کا جو تمہیں خدا نے مرحمت فرمائی ہے ایک حصہ اُنہیں دو۔' علاوہ بریں آپ ﷺ نے آقاؤں کو اس کی ممانعت کی کہ وہ غلاموں اور لونڈیوں پر اپنے اقتدار کو شہوت رانی کی خاطر استعمال کریں اور وعدہ فرمایا کہ جن غلاموں اور لونڈیوں سے یہ زیادتی کی جائے گی خدا اُن پر رحم کرے گا اور زیادتی کرنے والوں کو سزا دے گا۔ کسی مومن کے لاعلمی میں قتل کرنے کا یا بعض قسم کی دروغ گوئیوں کا کفارہ ایک غلام کو آزاد کرنا تھا۔ تعلیمات محمدی کا سارا مطلب ومنشاء ہی یہ تھا کہ غلاموں کو محض چیز بست سمجھنے کو اور ذات پات کی تفریق کو ناممکن بنا دیا جائے۔"

"غلامی کا لفظ جس معنیٰ میں انگریزی میں Slavery استعمال ہوتا ہے، اس معنی میں اسلامی قانون کے تحت اس کا اطلاق کسی شخص کی حیثیت پر نہیں ہوسکتا۔

شارع اسلام نے حکم دیا کہ اگر کوئی پناہ گیر اسلامی مملکت میں پناہ لے تو اُس میں قدم رکھتے ہی آزاد ہو جائے، لونڈی کی اولاد کو اپنے باپ کی حیثیت عطا کی جائے اور باپ کی موت پر لونڈی کو آزادی حاصل ہو جائے، غلام اپنی آزادی کے لیے آقا سے عہدہ پیان کر سکے اور زکوٰۃ کے محاصل کا ایک حصہ غلاموں کا فدیہ ادا کرنے کی خاطر استعمال کیا جائے۔ آقاؤں کو اپنے غلاموں سے اُتنا ہی کام لینے کی اجازت تھی جتنا ازروئے انصاف اُن سے لیا جانا چاہیے تھا اور جتنا اُن کی حد مقدور کے اندر تھا۔ اُنہیں تاکید کی گئی تھی کہ غلاموں سے غلام کہہ کر خطاب نہ کریں، بلکہ 'میرا بچہ' اور 'میری بچی' کے شفقت آمیز الفاظ سے پکاریں، اور اُنہیں اسی طرح کا لباس پہننے کو دیں جیسا وہ خود پہنتے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ کسی حالت میں ماں کو بچے سے، بھائی کو بھائی سے، باپ کو بیٹے سے، میاں کو بیوی سے اور ایک رشتے دار کو دوسرے رشتے دار سے جدا کرنے کی اجازت نہ تھی۔

معلم عربی ﷺ نے غلاموں سے سلوک کے بارے میں جو اخلاقی قوانین بنائے

---

[1] میں ان مطالب پر اسناد پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، کیوں کہ یہ مسلمہ امور ہیں۔ بہر حال مشاقانِ علم اُن احادیث سے جو مشکوٰۃ، صحیح بخاری اور بحار الانوار میں جمع کی گئی ہیں اپنی تشنہ کامی کی تسکین کر سکتے ہیں۔ مؤخر الذکر میں اہل بیت النبی ﷺ کی فیاضی اور جود وسخا کی بے شمار مثالیں جمع کی گئی ہیں۔

اُن میں آقا و غلام کے باہمی فرائض اُس یک طرفہ طریقے پر مقرر نہ کیے گئے تھے جو اکثر دوسرے مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ انسانی فطرت کے ایک نسبۃً زیادہ عمیق اور زیادہ درست علم کی مدد سے آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ طاقت وروں سے متعلق جو فرائض کمزوروں پر عائد ہوتے ہیں اُن کی تعیین اتنی ضروری نہیں جتنی اُن فرائض کی جو طاقت وروں پر کمزوروں کے بارے میں واجب ہیں۔ اسلام کے نزدیک غلام ہونے میں کوئی عار نہیں، غلام ہونا محض ایک اتفاقی حادثہ ہے، نہ کہ فطرت کا ایک انتظام، جیسا کہ ملکی قوانین اور آبائے کلیسا تصور کرتے ہیں۔ رسولِ خدا ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اکثر فوجوں کی قیادت پر مامور کیا جاتا تھا اور بڑے بڑے اشراف بطیب خاطر اُن کے تابع فرمان ہوتے تھے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اس لشکر کے سپہ سالار تھے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رومیوں کے خلاف مہم پر بھیجا۔ قطب الدین ایبک، دہلی کا پہلا مسلمان بادشاہ اور اس اعتبار سے ہندوستان میں اسلامی حکومت کا اصلی بانی، ایک غلام تھا۔ اسلام میں جس غلامی کی اجازت تھی وہ اس غلامی سے کوئی مشابہت نہ رکھتی تھی، جو کل تک دنیائے عیسائیت میں رائج تھی یا جو امریکہ میں ۱۸۶۵ء تک رائج تھی جب کہ ایک مذہبی جنگ نے اُس لعنت کا خاتمہ کر دیا۔

اسلام میں آج کا غلام، کل کا وزیر اعظم ہوتا ہے۔ وہ کسی کی چہ میگوئیوں کے بغیر اپنے آقا کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے اور خاندان کا سربراہ بن سکتا ہے۔ غلاموں نے سلطنتوں پر حکومت کی ہے اور شاہی خاندانوں کی بناء ڈالی ہے۔ محمود غزنوی غلام زادہ تھا۔ کیا عیسائیت اس کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟ کیا عیسائیت اپنی تاریخ کے اوراق میں غلاموں کے ساتھ اس قسم کے انسانیت نواز سلوک کی کوئی روداد دکھائی سکتی ہے؟

ہم نے جو کچھ اُوپر بیان کیا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ شارعِ اسلام نے غلامی کو ایک عارضی رواج تصور کیا اور آپ ﷺ کو یقین تھا کہ ترقی افکار اور تغیر حالات کی بدولت اس کا ایک دن خاتمہ ہو جائے گا۔ قرآن غلاموں کا تذکرہ ہمیشہ ان الفاظ میں کرتا ہے کہ غلام وہ ہیں ''جنہیں تم نے اپنے دائیں ہاتھ سے حاصل کیا ہے۔'' قرآن کے نزدیک غلام یا لونڈیاں حاصل کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اس کے نزدیک صرف ایک

قسم کی غلامی جائز تھی، یعنی جہادِ شرعی میں اسیر کیے ہوئے لوگوں سے خدمت وصول کرنا۔ تمام وحشی اقوام میں اسیرانِ جنگ کی جاں بخشی محض خودغرضانہ مقاصد سے کی جاتی ہے۔ یعنی ان کے زرفروخت یا اُن کی محنت کے ذریعے انفرادی یا قومی دولت میں اضافہ کرنے کی خاطر۔ دوسری قدیم قوموں کی طرح اعراب جاہلیت بھی اپنے قیدیوں کی جاں بخشی صرف نفع اندوزی کے مقصد سے کرتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ نے اس رواج کو عربوں میں متداول پایا۔ اس موضوع نظریہ بازی یا حکمت فروشی کرنے کے بجائے آپ ﷺ نے عربوں کی ہدایت کے لیے سخت قاعدے وضع کیے اور حکم دیا کہ صرف ایسے لوگ غلام بنائے جاسکتے ہیں جو ایک جائز جنگ یعنی جہادِ شرعی میں گرفتار کیے گئے ہیں اور وہ بھی اس وقت تک جب تک اُن کا فدیہ ادا نہ کیا جائے یا وہ خود خدمت کی اُجرت کی شکل میں اپنی آزادی عطا کر دیتے تھے۔ بردہ اندوزی اور بردہ فروشی کو، جس کی سرپرستی عیسائیت کرتی تھی[1]، اور جس کی اجازت یہودیت نے دی تھی، مطلقاً مردود و نامحمود قرار دیا گیا۔ غلاموں کی تجارت کرنے والے کو مطعون حلائق کہا گیا۔ غلاموں کو آزادی دینے کو ایک افضل کارِ ثواب بیان کیا گیا۔ کسی مسلمان کو غلام بنانے کی قطعی ممانعت کی گئی، لیکن یہ شرمناک حقیقت ہے کہ بہت سے مدعیانِ اسلام نے اسلامی قوانین کی ظاہری تعمیل تو کی مگر معلم اسلام ﷺ کی ہدایات کی روح سے کامل تغافل برتا اور ان ہدایات کے علی الرغم غلامی کی گرم بازاری کو خرید و فروخت اور دوسرے ذرائع سے برقرار رکھا۔ قرآنی آئین کے تحت کسی غلام کو قبضے میں لانے کی بنیادی شرط یہ تھی کہ وہ کسی ایسی لڑائی میں ہاتھ آیا ہو جو خلوصِ نیت سے دفاعِ ذات کی خاطر کافرو مشرک جارحین سے لڑی گئی ہو اور اس کی اجازت اس مقصد سے دی گئی تھی کہ وہ جنگی قیدیوں کی حفاظت و سلامتی کی ضمانت بنے، آس پاس کی قوموں اور قبیلوں کی دشمنی کی بدولت اُمت مسلمہ ابتدا جس حالتِ جنگ و جدل میں مبتلا تھی، اُس حالت کی تبدیلی خود بخود غلامی کا خاتمہ کر دیتی، کیونکہ نئے غلام قبضے

---

[1] کرامویل کے ہاتھوں ڈرد ہیڈا کے قتلِ عام اور آئرلینڈ کی بغاوت کے فرو کئے جانے کے بعد انگلستان کے پروٹسٹنٹوں نے آئرلینڈ کے مردوں اور عورتوں کو ورجینیا، پینسلوانیا اور دوسرے مقامات کے نوآباد کاروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا Monmouth کی بغاوت کے بعد پھر یہی ہوا۔

میں لائے جاتے اور جو موجود تھے وہ رفتہ رفتہ آزاد ہو جاتے، لیکن یا تو مشرق و مغرب کی اخلاقاً زوال یافتہ قوموں اور شمال کی وحشی نسلوں سے مس کے باعث یا اس وجہ سے کہ لعنت غلامی کی جڑیں معاشرے کے ہر طبقے میں گہری گڑی ہوئی تھیں، بہت سے مسلمانوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح غلامی کی رسم کو جائز سمجھا اور اب بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن وحشی ترکمان یا افریقی عرب، جو غلام اندوزی کی فخریہ مشق کرتے ہیں، اُسی قدر اسلام کے نمائندے ہیں جس قدر جنوبی امریکہ کے گیاہستانوں کی بادیہ نوردی کرنے والے گواچو (Guacho) عیسائیت کے نمائندے ہیں[1]۔ تعددازواج کی طرح غلامی کی رسم بھی، جو نوعِ انسانی کی نشو و نما کے کسی نہ کسی مرحلے میں ہر قوم میں رائج تھی، اب کم از کم ان قوموں میں جو تہذیب یافتہ ہونے کی مدعی ہیں غیر ضروری ہوگئی ہے، کیونکہ جن مقاصد کے لیے وہ وجود میں آئی تھی وہ اب معدوم ہو چکے ہیں اور یقینی ہے کہ جلد یا بدیر وہ غائب ہو جائے گی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اسلام نے جیسا کہ ازروئے مخاصمت دعویٰ کیا جاتا ہے، غلامی کو "تقدس" نہیں بخشا، بلکہ غلاموں کی ملکیت کو تنگ ترین دائرے کے اندر محصور کر کے اس رسم کے نیست و نابود کرنے کا ہر ممکن اہتمام کیا ہے۔ اسلام نے کسی من مانے حل سے اس اہم مسئلے کو سلجھانے کی کوشش نہیں کی۔ جب اس نے تمام افرادِ انسانی کی فطری مساوات کا شد و مد سے اعلان کیا تو اس نے یہ نہیں کیا کہ اُسی وقت، نتائج سے بے نیاز ہو کر، تمام

---

[1] ترکمان (جو تشدد سنی تھے) شارعِ اسلام کے حکم کی لفظی خلاف ورزی سے بچنے کی خاطر اپنے قیدیوں کو (چاہے وہ سنی ہوں یا شیعہ) اپنے آپ کو کافر کہنے پر مجبور کرتے تھے۔ اسی طرح افریقی عرب کافر حبشیوں کی بستیوں پر جو چھاپے مارتے ہیں، انہیں وہ جہاد کا نام دیتے ہیں۔ مشہور افریقی سیاح Mr.Joseph Thompson لنڈن ٹائمز کے شمارہ مورخہ ۱۴۔ نومبر ۱۸۸۷ء میں ایک خط میں مشرقی افریقہ میں غلامی کے موضوع پر یوں رقمطراز ہیں: "میں کسی پس و پیش کے بغیر کہتا ہوں اور آپ کے تمام نامہ نگاروں کے مقابلے میں مشرقی مرکزی افریقہ کے زیادہ تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ اگر ان علاقوں میں غلاموں کی تجارت جاری ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اسلام کی اشاعت نہیں ہوئی: اسلام کی اشاعت کے معنی یہ ہوتے کہ غلاموں کی تجارت بالکل بند ہو جاتی۔" جن پُرامن طریقوں سے اسلام مغربی افریقہ اور مرکزی سوڈان میں پھیلا ہے انکی جو کیفیت مسٹر تھامپسن نے بیان کی ہے وہ ہر قاری کی توجہ کی مستحق ہے۔ وہ کہتے ہیں۔" یہاں اسلام ایک زندہ اور فاعل قوت ہے، جس میں وہی ابتدائی ایام کی توانائی اور تب و تاب ہے اور اسے اپنی تبلیغ میں اسی طرح کی کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔"

غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کا علان بھی کر دے۔ ابھی دنیا انسان کی اخلاقی و ذہنی آزادی کے اس درجے کے لیے تیار نہ تھی۔ چنانچہ اس قسم کا اعلان بڑی خرابیوں کا باعث ہوتا۔

انسانی جسم کے قطعِ اعضا کی بھی حضرت محمد ﷺ نے صریح الفاظ میں ممانعت کی اور اس دستور کی، جو ایرانی اور بازنطینی دونوں سلطنتوں میں رائج تھا، سخت الفاظ میں مذمت کی۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں غلاموں کی خرید وفروخت کا دستور نہ تھا۔ کم از کم اس امر کی کوئی مستند تحریری شہادت موجود نہیں کہ اُن کے عہد میں کسی شخص کو خرید کر غلام بنایا گیا ہو، لیکن بنو اُمیہ کے برسرِ اقتدار آتے ہی اسلام کی روح میں ایک تغیر واقع ہو گیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے لوگوں کو خرید کو غلام بنانے کے دستور سے دنیائے اسلام کو روشناس کرایا۔ اسی طرح وہ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے حرمِ شاہی کی حفاظت پر خواجہ سرا مامور کیے ابتدائی خلفائے عباسی کے عہد میں امام جعفر صادق نے غلامی کے خلاف تبلیغ شروع کی۔

اب وقت آ گیا ہے جب نوعِ انسانی کو بحیثیت مجموعی چاہیے کہ غلامی کے خلاف، چاہے وہ کسی شکل یا نام کے بھیس میں ہو، صدائے احتجاج بلند کرے۔ بالخصوص مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے عظیم پیغمبر کی عزت کی خاطر اپنی تاریخ سے اس سیاہ صفحے کو محو کر دیں۔ یہ صفحہ دوسرے مذاہب کے مدعیوں کے خوفناک نامۂ اعمال کے مقابلے میں کتنا ہی روشن کیوں نہ دکھائی دیتا ہو، پھر بھی ایک سیاہ صفحہ ہے اور اگر مسلمان اسلامی قوانین کی روح کی خلاف ورزی نہ کرتے تو یہ کبھی نہ لکھا جاتا۔ وہ دن آ گیا ہے جب وہ آواز جس نے ساری نوعِ انسانی کی حریت، مساوات اور اخوت کا علان کیا تھا چودہ صدیوں کی روحانی زندگی اور روحانی امور سے حاصل کی ہوئی قوت کے ساتھ دوبارہ سنی جائے۔ یہ مسلمانوں کے کرنے کا کام ہے کہ صریح الفاظ میں یہ اعلان کریں کہ غلامی کو اُن کے مذہب نے مطعون اور اُن کے ضابطۂ قانونی نے ممنوع قرار دیا ہے اور اس طرح اُن الزامات کو رد کریں جو جو اُن کے عظیم اور خیر البشر نبی پر لگائے گئے ہیں۔

ساتواں باب

اسلام کی سیاسی رُوح

''ذمی کا خون اور مسلمان کا خون دونوں ایک جیسے ہیں۔'' حضرت علیؑ

اب تک ہم نے رسولِ عربیؐ کی تعلیمات کا امتحان صرف ایک نقطۂ نگاہ سے کیا ہے، یعنی اس نقطۂ نگاہ سے کہ وہ انسانی کردار کے لیے کہاں تک قواعد اور انسان کے جو فرائض اپنے خالق اور اپنے ہم جنسوں کی نسبت ہیں، اُن کے بارے میں کہاں تک ہدایت مہیا کرتی ہیں۔ اب ہم اس امر کا جائزہ لیں گے کہ اسلام نے انسانیت پر من حیث المجموع کیا اثر مرتب کیا، یعنی صرف افراد ہی پر نہیں، بلکہ قوموں پر اور من حیث الکل نوعِ انسانی کی تقدیر پر۔

اس بات کو سات صدیاں گزر چکی تھیں کہ پیغمبر ناصری غریبوں اور زیردستوں کے لیے آسمانی بادشاہی کا پیغام لے کر آیا۔ دعوتِ نبوت ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک حسین وجمیل زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ اب کرۂ ارض کی سلطنتوں اور بادشاہیوں پر مکمل مایوسی چھائی ہوئی تھی اور خدا کے بندے، رنج وتعصب میں ڈوبے ہوئے، اس نجاتِ معہود کا بیتابی سے انتظار کررہے تھے جو آنے میں اتنی دیر لگا رہی تھی۔

کیا مشرق اور کیا مغرب، دونوں میں عوام الناس کی حالت اتنی خستہ وخراب تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ اُنہیں نہ کوئی ملکی حقوق حاصل تھے، نہ کوئی سیاسی رعایات دونوں یا تو دولت مندوں اور طاقت وروں کی بلاشرکتِ غیرے ملکیت تھے یا مذہبی تقدس رکھنے والے طبقوں کی۔ امیر وغریب، قوی وضعیف، اعلیٰ وادنیٰ کے لیے ایک ہی قانون نہ تھا۔

ساسانی ایران میں کشیش اور زمینوں کے مالک جنہیں دہقان کا لقب دیا جاتا تھا، تمام اقتدار و اختیار پر قابض تھے اور ملک کے ساری دولت اُن کی مٹھی میں تھی۔ کسان اور غریب لوگ ایک لاقانون آمریت کی چکی میں پسے جاتے تھے۔ بازنطینی سلطنت میں کلیسا کے منصب دار، اکابر و اعاظم، ارباب نشاط اور قیصر و حکام کی عیش پرستیوں کی حاجب برآری کرنے والے دولت، قوت اور نفوذ کے مالک تھے۔ عام لوگ انتہائی خستہ حالی میں بسر کرتے تھے۔ بربری مملکتوں میں، سچ تو یہ ہے کہ جہاں جہاں بھی نظامِ جاگیرداری رائج تھا، آبادی کا بیشتر حصہ زرعی اور خانگی غلاموں پر مشتمل تھا۔

کسانوں کی عام حیثیت غلاموں کی سی تھی۔ شروع شروع میں زرعی اور خانگی غلامی میں بہت کم فرق تھا۔ دونوں قسم کے غلام اپنے بیوی بچوں اور ساز و سامان سمیت مالک زمین کی ملکیت ہوتی تھے، اور وہ جیسا سلوک چاہتا اُن کے ساتھ کرتا[1]۔ بعد میں زرعی غلام تو جاگیردار کی جاگیر سے متعلق ہو گئے اور جس حصہ جاگیر سے وہ متعلق ہوتے تھے اُسی کے ساتھ خرید و فروخت ہونے لگے یا جاگیردار کے ذاتی ملازم بن گئے اور ایک جاگیر سے دوسری جاگیر کو منتقل ہونے لگے۔ وہ آقا کی اجازت کے بغیر اس کی ملازمت سے علیحدہ نہ ہو سکتے تھے، اور اگر وہ اس کی ملازمت چھوڑ کر بھاگ جاتے یا اغوا کر لیے جاتے تو ڈھور ڈنگر اور مال مست کی طرح قانون کی مدد سے واپس لائے جا سکتے تھے۔ یہ درست ہے کہ انہیں اپنے اور اپنے بال بچوں کے گزارے کے لیے تھوڑی سی زمین ملتی تھی، لیکن یہ زمین آقا کی مرضی پر منحصر ہوتی تھی اور وہ جب چاہتا غلام کو اس سے نکال سکتا تھا۔ زرعی غلام نہ زمین نہ اشیاءِ منقولہ کی ملکیت حاصل کر سکتا تھا اور اگر وہ زمین یا اشیائے منقولہ خریدتا بھی تو آقا اُسے بے دخل کر کے خود قبضہ لینے کا حق رکھتا تھا۔

زرعی اور خانگی دونوں طرح کے غلاموں کا امتیازی نشان لوہے کا طوق تھا۔ غلام جتھوں کی صورت میں مویشیوں کے ریوڑوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ ہانکے جاتے تھے، اُنہیں جانوروں کی طرح کھانا کھلایا جاتا تھا، رہنے سہنے کے لیے ایسی جگہیں

---

[1] کلیسا اپنے غلاموں کو سب سے زیادہ مدت تک اپنے قبضے میں رکھتا تھا، Sir Thomas Smith نے اپنی کتاب Commonwealth میں بڑے تلخ الفاظ میں ادریوں کی ریاکاری کا تذکرہ کیا ہے۔

دی جاتی تھیں جو جانوروں کے لیے بھی موزوں نہ ہوتی تھیں، اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں اور گلے میں طوق ڈال کر انہیں ایک زنجیر سے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا۔

انسانی گوشت و پوست کا تاجر ایک موٹا سا گٹھیلا کوڑا ہاتھ میں لیے گھوڑے پر سوار غلاموں کی قطار کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور کوڑے کی ضربوں سے تھکے ماندے غلاموں کو چلتے رہنے پر آمادہ کرتا تھا۔ جب بھی یہ کوڑا لگتا اور جس کے لگتا اُس کی کھال کی ایک بوٹی اڑا دیتا۔ مرد، عورتیں اور بچے اس طرح لٹکتے ہوئے چیتھڑے پہنے لہولہان ٹخنے اور آبلوں سے چھلنی ننگے پاؤں گھسیٹتے ہوئے، ایک جگہ سے دوسری جگہ ہنکا کر لے جائے جاتے تھے۔ اگر کوئی بدقسمت تھک کر گر پڑتا تو اسے زمین پر لٹا کر اتنے کوڑے رسید کیے جاتے کہ اُس کی کھال اُدھڑ جاتی اور وہ ادھ موا ہو جاتا۔ مڈل پیج (The Middle Passage) کے ہولناک واقعات، جنگ آزادی سے پہلے امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں غریب نیگروؤں نے جو سختیاں جھیلیں، سوڈانی بردہ فروشوں نے جو مظالم توڑے، ان سب سے ہم ان مصائب کا قدرے اندازہ لگا سکتے ہیں جو غلاموں کو عیسائی اقتدار کے تحت بعثتِ اسلام سے لے کر پندرہویں صدی کے اخیر تک برداشت کرنے پڑے، اب بھی جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بادشاہی کو تقریباً دو ہزار سال گزر چکے ہیں، مہذب دنیا کی قوی ترین سلطنتوں میں سے ایک سلطنت میں عیسائی بیکس عورتوں کو کوڑے مار کر ہلاک کرتے ہیں اور واقعی یا فرضی سیاسی جرائم کی بناء پر قید میں ڈالتے ہیں۔

نام نہاد آزاد کردہ غلاموں کی حالت کسی طرح بھی عام زرعی غلاموں کی حالت سے بہتر نہ تھی۔ اگر وہ اپنی زمینیں بیچنا چاہتے تو انہیں پہلے جاگیر کے مالک کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح اگر وہ زمیں خریدنا چاہتے تو اُس صورت میں بھی اُنہیں مالک کو حصہ دینا پڑتا تھا۔ وہ اپنی فصلیں بھی نہ کاٹ سکتے تھے جب تک گرجا کو دسواں بادشاہ کو بیسواں اور بادشاہ کے درباریوں کو اس سے چھوٹا حصہ نہ دے چکتے۔ آقا کی اجازت کے بغیر وہ گھر بھی نہ بنا سکتے تھے اور آقا کو اختیار تھا کہ جب چاہے اُنہیں بیگار میں جوت دے۔ آقا کے بیٹے بیٹی کی شادی پر اُنہیں نذرانے دینے پڑتے تھے۔ لیکن جب کسی آزاد کردہ غلام کی

بیٹی کی شادی ہوتی تھی تو اُسے انتہا درجے کی شرمناک بے حرمتی کا تختہ مشق بننا پڑتا تھا اور اگر خود بشپ یا کوئی اور کلیسائی منصب دار جاگیر کا مالک ہوتا تو وہ بھی اس وحشیانہ حق سے دست کش نہ ہوتا تھا۔ وحشی رسموں کے ان ستم کشوں کا موت بھی مداوا نہ بن سکتی تھی۔ جیتے جی تو وہ انسانوں کی انسانیت سوزی کے مورد بنتے ہی تھے، مر کر بھی اُن کے نصیبوں میں ابدی عذاب ہوتا تھا، کیونکہ جس شخص نے خودکشی کی ہو وہ ملعون ترین گناہگاروں میں شمار کیا جاتا تھا اور اُسے گز بھر زمین کا حق بھی نہ پہنچتا تھا۔ اتنا بھی بہت تھا کہ آدھی رات کے اندھیرے میں اُس کی لاش چوری چھپے کسی ناپاک زمین میں داب دی جاتی تھی اور اس کے سینے میں ایک کھونٹا گاڑ دیا جاتا تھا، تاکہ دوسروں کو تنبیہ ہو۔

یہ تھی اس زمانے میں عام لوگوں کی زبوں و خوار حالت۔ لیکن جاگیردار کو اپنے ایوان میں، بشپ کو اپنے محل میں اور راہب کو اپنے حجرے میں عوام کے آلام و مصائب کی کیا پروا تھی؟ یورپ اور افریقہ کے حسین ترین خطوں پر تاریکی کی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں۔ ہر جگہ زبردستوں کی مرضی ملک کا قانون اور حق کا معیار تھی۔ کلیسا روندے ہوؤں اور کچلے ہوؤں کی کوئی مدد نہ کرتا تھا۔ اس کی تعلیمات ہی نسلِ انسانی کو بہیمانہ طاقت کے پنجے سے نجات دلانے کے منافی تھیں۔ متقدمین آبائے کلیسا نے اولوالامر کی مخالفت کو ایک گناہِ کبیرہ قرار دیا تھا۔ ان کے نزدیک کوئی تشدد، کوئی جبر، کوئی انسانیت سوز زیادتی اس امر کا جواز مہیا نہ کرتی تھی کہ رعایا حاکموں کی ناانصافیوں سے اپنے آپ کو بچانے کی خاطر طاقت کا استعمال کرے۔ مسیح کے خادموں نے ان لوگوں سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا جن کی اس معلم انسانیت نے مذمت کی تھی، یعنی دولت مند اور طاقت ور جابروں سے۔ انہوں نے جاگیرداری کو اپنا لیا تھا اور زمینوں کے مالکوں، جاگیرداروں اور شہزادوں کی حیثیت میں اس کی عطا کردہ رعایاتِ خصوصی سے متمتع ہوتے تھے۔

غیر عیسائی، یعنی یہودی، مشرکین اور کفار، عیسائی اقتدار کے تحت تذبذب و تشویش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا ہلاک کیا جانا یا نہ کیا جانا، غلام بنایا جانا یا نہ بنایا جانا محض اتفاق پر منحصر تھا، انہیں کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے۔ زندہ رہنے کی اجازت ہی اُن کے لیے بہت تھی۔ اگر کوئی عیسائی کسی غیر عیسائی سے ناجائز طور پر عقد کرتا (جائز

عقد کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا) تو اُسے زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ یہودیوں کو اجازت نہ تھی کہ عیسائیوں کے ساتھ اُٹھیں بیٹھیں یا ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھائیں یا ان کا سا لباس پہنیں۔ ہر وقت ممکن تھا کہ جاگیردار یا بشپ یا ایک مشتعل ہجوم کی مرضی سے اُن کے بچے ان سے چھین لیے جائیں اور ان کا مال متاع لوٹ لیا جائے۔ یہ حالات سترہویں صدی کے اخیر تک قائم رہے۔

جب تک معتکف حراﷺ نے بانگِ حریت بلند نہ کی، جب تک اس نے نوعِ انسانی کی عملی مساوات کا اعلان نہ کیا، جب تک اس نے اُونچی ذات کی تمام خصوصی مراعات کو نہ مٹایا اور محبت کاروں کو آزادی نہ دی، اُس وقت تک اُس زنجیر کے حلقے درہم برہم نہ ہوئے جس نے اقوامِ عالم کو اسیر کر رکھا تھا۔ وہ وہی پیغام لے کر آیا جو اس کے پیش رو لائے تھے اور اُس نے اُس پیغام کو عملی جامہ پہنایا۔

اسلام کے سیاسی فلسفے کا جوہر اُس منشور حقوق میں پایا جاتا ہے جو پیغمبرِ اسلامﷺ نے اپنے ورودِ مدینہ کے بعد یہودیوں کو عطا کیا اور اُن قابلِ یادگار پیغاموں میں جو نجران اور اُس کے نواحی علاقوں کے عیسائیوں کے نام اس وقت بھیجے گئے جب اسلام جزیرہ نمائے عرب پر اپنا تسلط قائم کر چکا تھا۔ مؤخر الذکر دستاویز تمام مسلم فرمانراؤں کے لیے غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک کے بارے میں ایک ہدایت نامہ رہی ہے اور اگر کسی فرمانروا نے اُس سے انحراف کیا ہے تو اس کا سبب اُس فرمانروا کی شخصی سیرت میں پایا جاتا ہے۔ اگر ہم اس سیاسی ضرورت سے قطع نظر کر لیں جس نے اکثر اپنے آپ کو مذہب کے لباس میں پیش کیا ہے تو اسلام سے بڑھ کر کوئی مذہب دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے رواداری نہیں برتتا۔ گاہے گاہے ایسا ہوا ہے کہ ملی تقاضوں نے کسی مسلم حکمران کو قدرے ناروا داری کا اظہار کرنے یا دین کے معاملے میں وحدت کا مطالبہ کرنے پر مجبور کیا ہے لیکن اسلامی نظام نے فی نفسہٖ ہمیشہ پوری پوری رواداری کو قائم رکھا ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں سے اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے کے بارے میں کبھی مزاحمت نہیں کی گئی اور انہیں کبھی تبدیلی مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا۔ اگر اُن سے جزیہ لیا جاتا ہے تو وہ عسکری خدمت سے بریت کے معاوضے کے طور پر لیا جاتا ہے، اور یہ ہے بھی واجب کہ جو لوگ

مملکت کی امان سے مستفید ہوتے ہیں وہ مملکت کا مالی بار اُٹھانے میں کسی حد تک شریک ہوں۔ بت پرستوں کے بارے میں نظریاتی طور پر ذرا زیادہ سختی مطلوب تھی، لیکن عملی طور پر قانون اُن کے ساتھ اتنی ہی فیاضی برتتا تھا جتنی دوسرے غیر مسلموں یعنی اہل کتاب کے ساتھ۔ اگر کبھی ایسا ہوا ہے کہ اُن کے ساتھ سختی کا سلوک کیا گیا ہے تو اس کا سبب تلاش کرنے پر حکمران کے ذاتی جذبات یا جمہور مسلمین کے وقتی جذبات میں پایا جائے گا۔ مذہب کی آڑ تو محض ایک بہانے کے طور پر لی گئی تھی۔

اس فرسودہ دعوے کی تائید میں کہ اسلامی مملکتوں کی غیر مسلم رعایا شدید قانونی محرومیوں سے دوچار ہوتی ہے نہ صرف متاخرینِ علما وفقہا کی تنگ نظرانہ آرا کا حوالہ دیا جاتا ہے، بلکہ قرآن کی چند آئتیں بھی پیش کی جاتی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ شارع اسلام ﷺ غیر مسلموں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے اور آپ کو یہ منظور نہ تھا کہ آپ کے متبعین اُن کے ساتھ دوستانہ مراسم رکھیں۔ اس موضوع پر بحث کرتے وقت ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ وہ آئتیں جب نازل ہوئیں تو اسلام کس زندگی و موت کی کش مکش میں مبتلا تھا اور یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ کیا کفار اور کیا یہودی و عیسائی مسلمانوں کو ورغلانے اور دین حق سے منحرف کرنے کی خاطر کیسے کیسے دغا بازانہ طریقے استعمال کرتے تھے۔ ایسے میں معلم دین کے لیے لازمی تھا کہ آپ اپنے تابعین کو مخالفوں کی چالبازیوں اور مکاریوں سے آگاہ کردیں۔ تقابلی تاریخ کا کوئی متعلم آپ ﷺ کو اپنی چھوٹی سی مملکت کے تحفظ کے لیے قابلِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ بہر حال جب ہم آپ ﷺ کے اس سلوک کو دیکھتے ہیں جو آپ ﷺ نے اپنی غیر مسلم رعایا سے بحثیت عموی روا رکھا تو ہمیں اس میں ایک وسیع المشرب رواداری اور ہمدردی کی وافر شہادت ملتی ہے۔

کیا کسی فاتح قوم یا مذہب نے محکوم قوموں کو حسن سلوک کی اس سے بہتر ضمانت دی ہے جو رسولِ عربی ﷺ کے مندرجہ ذیل الفاظ میں پائی جاتی ہے؟ ''نجران اور اس کے نواحی علاقوں کے عیسائیوں کو اُن کی زندگی، اُن کے دین اور اُن کی املاک کے بارے میں خدا کی امان اور رسول کی ضمانت دی جاتی ہے، اُن کو بھی جو آنے والے ہیں۔ نہ اُن کے فرائض مذہبی کی بجا آوری میں کسی قسم کی مزاحمت اور اُن کے حقوق و مراعات

میں کسی قسم کی تبدیلی کی جائے گی۔ کوئی اسقف اپنے منصب سے برطرف نہ کیا جائے گا، کوئی راہب اپنے راہب خانے سے نہ نکالا جائے گا، اور کوئی پادری اپنے عہدے سے علیحدہ نہ کیا جائے گا۔ یہ لوگ ہر بڑی اور چھوٹی چیز سے اُسی طرح متمتع رہیں گے جس طرح اب ہیں۔ کسی مجسمے یا صلیب کو تباہ نہ کیا جائے گا۔ نہ اُنھیں کسی پر ظلم کرنے دیا جائے گا اور نہ کوئی اُن پر ظلم کرے گا۔ اُن کے لیے ممنوع ہے کہ زمانہ جاہلیت کی طرح قصاص خون کی رسم پر عمل کریں، اُن سے کوئی محصول وصول نہ کیا جائے گا اور نہ اُن سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ اسلامی سپاہ کے لیے رسد مہیا کریں[۱]۔"

تسخیر حیرہ کے بعد جب وہاں کے باشندے بیعت کا حلف اٹھا چکے تو حضرت خالد ؓ بن ولید نے ایک اعلان شائع کیا جس کی رو سے اُنھوں نے مسلمانوں کو عیسائیوں کی جان و مال اور آزادی کا کفیل ٹھہرایا اور یہ حکم دیا کہ "اُنھیں ناقوس بجانے سے نہ روکا جائے گا" اور اس امر کی اجازت دی جائے گی کہ مذہبی تقریبوں پر صلیبوں کو اُٹھا کر جلوس نکالیں۔ امام ابویوسف ؒ کا ارشاد ہے کہ "اس اعلان کو خلیفہ اور اُن کی مجلسِ شوریٰ کی منظوری دی گئی۔"

غیر مسلموں کو نئے گرجا اور معبد بنانے سے نہ روکا گیا۔ صرف ایسے علاقوں میں جہاں صرف مسلمان آباد تھے ذرا سی نظریاتی پابندی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ "کسی ایسے شہر میں جہاں صرف مسلمان بستے ہیں، کوئی نیا گرجا یا معبد نہیں بنایا جاسکتا، لیکن عملاً یہ ممانعت مطلقاً نظر انداز کر دی گئی۔ خلفیہ المامون کے عہد میں مملکت اسلامیہ میں عیسائیوں کے گیارہ سو کلیساؤں کے علاوہ یہودیوں کے سینکڑوں صومعے اور زردشتیوں کے بے شمار آتشکدے تھے۔ اس روشن خیال حکمران نے، جسے عیسائیوں کا دشمنِ جانی کہا گیا ہے، اپنی مجلس شوریٰ میں اپنی تمام محکوم جماعتوں کے نمائندے شامل کیے تھے مسلمان، یہودی، عیسائی، زردشتی اور صابی...... اور اس نے عیسوی کلیسا کے منصب داروں کے تمام حقوق و مراعات کا باحتیاط تمام تحفظ کیا۔

---

[۱] اور نہ فوجیوں کو اُن کے گھروں یا بستیوں میں مقیم کیا جائے گا (فتوح البلدان از بلاذری صفحہ ۶۵۔ کتاب الخراج از امام ابویوسف) میور (Muir) آنحضرت ﷺ اس ضمانت کا اجمال پیش کرتا ہے۔ جلد دوم صفحہ ۲۹۹

یہ ایک قابلِ ملاحظہ امر ہے جس کی نظیر جدید تاریخ میں بھی نہیں ملتی، کہ فتح مصر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عیسائی کلیسا کے اوقاف کی حفاظت ایک امانت کے طور پر کی اور سابقہ حکومت کی طرف سے پادریوں کے لیے جو وظیفے مقرر تھے وہ جاری رکھے۔

ابتدائی مسلم حکومتوں نے جس رواداری کا ثبوت دیا اُس کی بہترین شہادت خود عیسائیوں نے مہیا کی ہے۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں میری (Mery) کے عیسائی بطریق نے فارس کے اسقف شمعون نامی کے نام ایک خط میں ذیل کی عبارت لکھی: عرب جنہیں خدا نے دنیا کی حکومت عطا کی ہے دین عیسوی پر حملہ نہیں کرتے، اس کے برعکس وہ ہمارے مدد ہوتے ہیں: وہ ہمارے خدا اور ہمارے اولیاء کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور راہب خانوں کو مالی عطیے دیتے ہیں۔'' مبادا زور زبردستی کا شائبہ تک بھی دکھائی دے، کسی مسلمان کو اجازت نہ تھی کہ وہ کسی ذمی کی زمین، قیمت ادا کر کے بھی حاصل کر سکے۔ 'نہ امام، نہ سلطان کو اختیار تھا کہ کسی ذمی کی املاک پر قابض ہوں۔''

قانون کی نگاہوں میں مسلمان اور ذمی برابر کا درجہ رکھتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: ''اُن کا خون بھی ہمارے ہی خون جیسا ہے۔'' مسلمانوں کا نظم ونسق بہت سی جدید حکومتوں کے لیے، جن سے بعض مہذب ترین حکومتیں بھی مستثنیٰ نہیں، ایک قابلِ تقلید نمونہ تھا۔ جرائم کی سزا کے معاملے میں حاکم ومحکوم کے درمیان کوئی تمیز نہ کی جاتی تھی۔ اسلام کا قانون یہ ہے کہ اگر ایک ذمی ایک مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے تو موخر الذکر کو بھی وہی سزا ملے گی جو صورتِ معکوس میں مقدم الذکر کو دی جاتی۔[1]

خلفائے بغداد کو، اپنے حریف خلفائے قرطبہ کی طرح، غیر مسلموں کی فلاح کا اتنا خیال تھا کہ انہوں نے ذمیوں کی سلامتی اور اُن کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کیا۔ اس شعبے کے سربراہ کا لقب بغداد میں کاتب الجہبذہ اور ہسپانیہ میں

---

1. زیلعی تخریج الھدایہ میں ایک مقدمہ کا ذکر کرتا ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں پیش ہوا۔ بکر بن وائل نامی ایک مسلمان نے حیروت نامی ایک عیسائی کو قتل کر دیا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے وارثین کے حوالے کیا جائے، چنانچہ ملزم حیروت کے وارث حنین کے حوالے کر دیا گیا۔ حنین نے اسے قتل کر دیا (دہلی ایڈیشن صفحہ ۳۳۸) اسی طرح کا ایک مقدمہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت سے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے۔

کاتب الذمام تھا۔

خلیفہ متوکل نے، جس نے امام الشہدا حضرت امام حسین ؓ کے روضہ مبارک کو مسمار کیا اور اُس کی زیارت کی ممانعت کر دی، مسلم معتزلہ کی طرح غیر مسلموں کو بھی سرکاری ملازمتوں سے خارج اور بہت سے حقوق سے محروم کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ متاخرین کی کتب فقہ میں، جو ایک ایسے زمانے میں لکھی گئیں جب مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان' ایک طرف تو بقائے محض کی خاطر اور دوسری طرف اقتدارِ محض کی خاطر، جنگ و جدل جاری تھی، ایسی عبارتیں نظر آتی ہیں جن سے سطحی طور پر اس الزام کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام نے ذمیوں سے ذلت کا سلوک کیا۔ لیکن شارع اسلام یا خلفائے راشدین کے وضع کردہ قوانین میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جس سے الزام کی توثیق ہو۔ اس پر یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ متاخرین فقہا کی تعصب آمیز آرا پر کبھی عمل نہیں کیا گیا۔ رواداری و فیاضی کا جو سلوک غیر مسلموں سے کیا گیا، اُس کی شہادت اس امر سے ملتی ہے کہ ذمی اکثر مسلمانوں کے وصی مقرر ہوتے تھے اور اسلامی جامعوں اور تعلیمی اداروں کے شیخ اور مسلمانوں کے اوقاف کے مہتمم بنائے جاتے تھے۔ صرف ایک شرط پر کہ انہیں کوئی مذہبی فرائض تفویض نہ کئے جائیں۔ جب کبھی کوئی قابلِ وقعت اور ممتاز غیر مسلم وفات پاتا تو مسلمان انبوہ در انبوہ اس کے جنازے میں شریک ہوتے تھے۔

شروع شروع میں، بدیہی اسباب کی بناء پر فوج کی قیادت غیر مسلموں کو نہ سونپی جاتی تھی، لیکن باقی تمام مشاہرہ دار اور ذمہ دار مناصب پر وہ مسلمانوں کی طرح مامور ہو سکتے تھے۔ یہ مساوات محض نظریاتی نہ تھی۔ پہلی صدی ہجری ہی سے عیسائی، یہودی اور مجوسی اہم سرکاری عہدوں پر فائز دکھائی دیتے ہیں۔ عباسی خلفاء باستثنائے معدودے چند، مذہب کی بنا پر اپنے محکوموں میں کوئی امتیاز نہ کرتے تھے اور اُن کے بعد جو خاندان برسر اقتدار آئے انہوں نے دیانت داری سے ان کی مثال کی تقلید کی۔

غیر مسلموں سے اسلامی ممالک میں جو سلوک کیا جاتا ہے اگر اس کا مقابلہ اُس سلوک سے کیا جائے جو یورپی حکومتوں کے تحت مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے تو انسان دوستی اور فیاضی کے معاملے میں اس کا پلہ بحیثیت عمومی بھاری پایا جائے گا۔ دہلی

کے مغل شہنشاؤں کی حکومت میں ہندو فوجوں کے کماندار، صوبوں کے حاکم اور شہنشاہ کی مجلس شوریٰ کے رُکن بنتے تھے۔ اگلے وقتوں سے قطعِ نظر، کیا موجودہ دور میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی یورپی سلطنت میں، جس کی رعایا مختلف نسلوں اور مختلف مذہبوں کے لوگوں پر مشتمل ہے، مذہب، رنگ اور نسل کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا؟

اسلام کا واحد مقصد یہ تھا کہ اس کے بانی نے وحدت اللہ اور انسانی مساوات کے جس اصول کی تعلیم دی تھی اُسے نوعِ انسانی ضمیر کو پوری آزادی دیتا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس سرزمین میں بھی اسلام کے مبلغ و مجاہد نے قدم رکھا پامال عوام اور تکفیر کے فتووں کے ستم رسیدہ لوگوں نے اُسے آزادی اور غلامی سے نجات کا نقیب سمجھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ اسلام ان کے لیے قانونی مساوات اور با اصول ٹیکسوں کی نوید لے کر آیا۔

جس طرح یرموک اور اجنا دین کے غزوات سے شامیوں، رومیوں اور مصریوں کے لیے نجات کا پیغام تھے۔ اسی طرح قادسیہ کی لڑائی، جس سے مسلمان ایران پر قابض ہوئے، ایرانیوں کے لیے ایک مبارک واقعہ تھی۔ یہودیوں نے جنہیں زردشتیوں نے وقتاً فوقتاً تہہِ تیغ کیا تھا، اور عیسائیوں نے، جنہیں وہ دربدر پھراتے تھے، اس پیغمبر کے زیرِ سایہ اطمینان کا سانس لیا جس کے دین کا اصل الاصول اخوتِ انسانی تھا۔ ہر ملک میں لوگوں نے مسلمانوں کو اپنے نجات دہندہ سمجھ کر اُن کا استقبال کیا۔ اگر کہیں مزاحمت ہوئی تو وہ صرف مذہب پیشہ لوگوں اور طبقہ اُمرا کی طرف سے ہوئی۔ عوام اور محنت پیشہ لوگوں نے جنہیں زردشتی مذہب نے راندۂ درگاہ گردانا تھا، مسلم فاتحین کی حمایت کی۔ محض کلمہ حق کا زبان پر لانا اُنہیں اپنے فاتحین سے برابری بخشنے کے لیے کافی تھا۔

جاگیردارانہ نظام کے تحت قبیلوں اور گاؤں کے جو سردار تھے اُن کے حقوق، اعزازات اور مقامی اثر کو برقرار رکھا گیا۔ گوبینو (Gobineau) کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے ظلم و تعدی کے بارے میں مبالغہ آمیز باتیں کہی گئی ہیں۔"

افریقہ اور ہسپانیہ کی فتح کے بعد بھی یہی ہوا، ایرین (Arian)، بلاجی (Belagians) اور دوسرے بدعت پسند طبقے، جو اب تک تقلید پسندوں کے موردِ غضب تھے، اور عوام الناس، جنہیں لاقانون فوجیوں اور اُن سے بھی بڑھ کر لاقانون مذہبی

منصب داروں نے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنا رکھا تھا، اسلام کے زیرِ سایہ امن و امان کی زندگی بسر کرنے لگے۔ حالات کی بوالعجبی دیکھیے (اور یہ بوالعجبی ایسی ہے کہ اسے دیکھ کر قدیم یونانیوں کے نظریۂ مکافات (Nemesis) پر یقین آنے لگتا ہے) کہ مسلمان یہودیوں کے بہترین محافظ ثابت ہوئے، حالانکہ یہودیوں نے پیغمبر اسلام ﷺ سے کینے کی بنا پر اسلامی مملکت کی تباہی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔

اسلام نے لوگوں کو ایک ضابطۂ قوانین عطا کیا جس کی ظاہری سادگی پر قدامت پسندی کا دھوکا ہوتا تھا، لیکن جس میں یہ صلاحیت تھی کہ مادی تہذیب کی ترقی کے پہلو بہ پہلو پوری پوری نشوونما پاتا رہے۔ اُس نے مملکت کو ایک ایسا لچک دار دستور بخشا جو انسانی حقوق اور انسانی فرائض کی صحیح پرکھ پر مبنی تھا۔ اس نے سرکاری محصولوں کو واجب حدود کے اندر رکھا، افراد کو قانون کی نگاہوں میں مساوات کی حیثیت دی اور خود اختیاری حکومت کے اصولوں کو پروان چڑھایا۔ اس نے انتظامیہ کو قانون کا تابع بنا کر سلطانی اختیارات پر پابندیاں عائد کیں اور یہ قانون بھی ایسا قانون تھا جس کی اساس احکامِ دین اور اخلاقی فرائض پر قائم تھی۔ ارکرٹ (Urquhart) کے قول کے مطابق ”یہ دونوں اصول ایسے تھے کہ اُن میں سے ہر ایک بجائے خود اپنے بانی کو شہرت دوام دینے کے لیے کافی تھا۔ ان کی عمدگی اور مؤثریت نے باقی قوانین کو توقیر بخشی اور سب قوانین نے مل کر اس نظام کو جو اُن پر مشتمل تھا ایک ایسی قوت اور توانائی سے مال مال کر دیا جو کسی اور سیاسی نظام میں نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ یہ قانون ایسے لوگوں میں رائج کیا گیا جو وحشی، جاہل اور ہیچ و پوچ تھے، لیکن ایک ہی شخص کی میعادِ حیات کے اندر وہ قلمرو روم سے بھی وسیع تر علاقے میں پھیل گیا۔ جب تک اس کی ابتدائی خصوصیات قائم رہیں وہ ایک ناقابلِ مدافعت قوت سے مملو رہا۔“

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مختصر دورِ خلافت ریگستانی قبیلوں میں امن و امان قائم کرنے ہی میں صرف ہو گیا۔ چنانچہ انہیں صوبوں کی باقاعدہ تنظیم کی مہلت نہ ملی، لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ، جو صحیح معنوں میں ایک عظیم انسان تھے مسندِ خلافت پر بیٹھے تو اس وقت محکوم قوموں کی فلاح و بہبود کے بارے میں ان تھک کوششوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو ابتدائی مسلم حکومتوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں مسلمانوں کی جو سیاسی حالت تھی اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو جو منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے وہ ایک عوامی حکومت کا ہے جس کا سربراہ ایک منتخب شدہ امیر تھا جو محدود اقتدار کا مالک تھا۔ رئیس مملکت کے خصوصی اختیارات انتظامی اور اہتمامی امور کے دائرے کے اندر محصور تھے۔ مثلاً محکمۂ احداث یعنی پولیس کی نگرانی، فوج کا نظم و نسق، امورِ خارجہ کا انصرام، مالیات کی تقسیم وغیرہم۔ لیکن وہ کسی حالت میں بھی اس کا مجاز نہ تھا کہ مسلمہ قوانین سے سرِ موانحراف کرے۔

عدالتیں حکومت کی مطیع نہ تھیں۔ حکومت اُن کے فیصلوں میں دخل اندازی نہ کر سکتی تھی: یہاں تک کہ ابتدائی خلیفوں کے ہاتھ میں اتنا اختیار بھی نہ تھا کہ ایسے لوگوں کو جنہیں عدالتوں نے مستوجب سزا قرار دیا ہو معافی بخش سکیں۔ قانون سب کے لیے ایک تھا، امیر کے لیے بھی اور غریب کے لیے بھی، صاحب اقتدار کے لیے بھی اور کھیت میں محنت و مشقت کرنے والے کے لیے بھی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس نظام کی سختی میں ڈھیل آتی گئی۔ پھر بھی اس کا ہیئتی ڈھانچہ برقرار رہا۔ یہاں تک کہ جن غاصبوں نے، کسی حق کے بغیر، دغابازی اور کشت و خون کی مدد سے زمامِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی، اور جو ایام کُفر کے اُس عدیدی اقتدار کے نمائندے تھے جسے اسلامی تعلیمات نے برطرف کیا تھا، انہوں نے بھی ایک نمائندہ حکومت کے تابع سربراہانِ انتظامیہ کی ظاہری صورت قائم رکھی۔ جب بعد میں آنے والے خاندانوں کے حکمرانوں نے من مانے اختیارات کی حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش کی تو اجماع فقہا کے اُن فیصلوں نے جو تمام مسلم مملکتوں میں حکمرانوں کی منہ زوری پر ایک قانونی لگام کا کام کرتے ہیں، اُنہیں اس سے روک دیا۔ بہر کیف ابتدائی دور میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت گویا پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسِ شوریٰ تھی۔ کیا لشکر گاہ میں اور کیا شہر میں، ''صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' کے لقب کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جو اثر و نفوذ حاصل تھا، وہ اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ صحابی رضی اللہ عنہ ہونے کے معنی تھے صاحب تقدس اور صاحب فضیلت سمجھا جانا۔ جس شخص کو یہ لقب نصیب ہوتا تھا وہ اگر کوئی کام شروع کرتا تو عامتہ المسلمین جوق در جوق آکر اُس کے مقتدی بن جاتے۔ سب سے

اُونچا رتبہ اُن صحابیوں کا تھا جنہوں نے پیغمبرِاسلام ﷺ کے ہمراہ مکہ سے ہجرت کی تھی، یعنی مہاجرین کا، پھر اُن انصار کا جنہوں نے بصد عقیدت آپ ﷺ کا خیر مقدم کیا تھا اور بدر و اُحد کے میدانوں میں جہاد فی سبیل اللہ کیا تھا، پھر اُن کا جنہیں آپ ﷺ کوئی کام تفویض کرتے تھے اور ان کا جنہوں نے آپ ﷺ کی زیارت کی تھی، جو آپ ﷺ سے ہم کلام ہوئے تھے، جنہوں نے آپ ﷺ کے ارشادات سُنے تھے۔ سب سے آخری رُتبہ کا تھا جنہوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی متابعت کی تھی اور یوں بالواسطہ حلقۂ نبوی ﷺ کے حاشیہ نشین رہے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک واقعہ پیش آیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک انسانوں میں کس قسم کی مطلق مساوات تھی۔ غسانی بادشاہ جبلہ (Jabala) جو مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا، خلیفۃ المسلمین کے دربار میں حاضری خاطر مدینے آیا۔ وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، اور ہر طرح کی تکریم کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ جب وہ کعبے کا طواف کر رہا تھا تو معمولی حیثیت کے کسی اور حاجی کے احرام کا ایک گوشہ اُس کے شانوں پر گر پڑا۔ جبلہ نے فرطِ غضب سے مُڑ کر حاجی کے منہ پر اس زور سے طمانچہ رسید کیا کہ بیچارے کے دانت ٹوٹ کر منہ سے نکل گئے۔ واقعے کا باقی ماندہ حصہ ہم اُن قابلِ یادگار الفاظ میں بیان کرتے ہیں جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی روئداد حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو، جو شام میں عساکر اسلامی کے سپہ سالار تھے، لکھی۔

"غریب حاجی میرے پاس آکر داد خواہ ہوا۔ میں نے جبلہ کو بلا بھیجا اور جب وہ آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے ایک مسلمان بھائی کے ساتھ ایسی بدسلوکی کیوں کی تھی۔ اُس نے جواب دیا اُس آدمی نے میری توہین کی ہے اور اگر کعبے کا احترام ملحوظ نہ ہوتا تو میں اُسے وہیں ڈھیر کر دیتا۔' میں نے کہا تمہارے ان الفاظ نے تمہارے جرم کو اور بھی سنگین بنا دیا ہے اور اگر تم نے اس آدمی سے معافی نہ مانگی اور اُس نے تمہیں معاف نہ کیا تو تمہیں قانونی سزا بھگتنی پڑے گی۔ جبلہ نے جواب دیا' میں ایک بادشاہ ہوں اور وہ ایک معمولی آدمی ہے۔' میں نے کہا' تم بادشاہ ہو یا نہیں ہو، تم دونوں مسلمان ہو اور قانون کی نگاہوں میں تم دونوں کی ایک ہی حیثیت ہے۔ اُس نے درخواست کی کہ سزا کو کل تک

ملتوی رکھا جائے۔ چنانچہ مظلوم کی مرضی دریافت کر کے میں نے سزا کا ملتوی رکھنا منظور کر لیا۔ جبلہ راتوں رات بھاگ کھڑا ہوا، اور اب سگِ نصرانی سے جا ملا ہے[1]۔ لیکن اللہ تعالیٰ تمہیں اُس پر اور اس جیسے مردوں پر فتح عطا فرمائے گا۔"

یہ خط ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے لشکر میں پڑھ کر سُنایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی خلیفوں کے زمانے میں اس قسم کے مراسلے اکثر بھیجے جاتے تھے۔ کیا لشکر گاہ میں اور کیا شہر میں، کوئی شخص امورِ مملکت سے ناواقف نہ رکھا جاتا تھا۔ ہر جمعہ کو نماز کے بعد امیر المومنین جماعت کو روزمرہ کے اہم واقعات سے آگاہ کرتا تھا۔ صوبوں کے حاکم اپنے اپنے علاقوں میں اس کی مثال کی تقلید کرتے تھے۔ ان عام مجمعوں میں ہر مسلمان شامل ہونے کا مجاز تھا۔ جمہوریت اپنی بہترین صورت میں حکمراں تھی۔ خلیفہ اسلام امیر المومنین الوہیت کے ہالے میں گھرا ہوا نہ تھا۔ وہ اپنی مملکت کے نظم و نسق کے معاملے میں اپنی رعایا کے سامنے جواب دہ تھا۔ خلفاء راشدین نے جس سخت گیری سے اپنے آپ کو عوام کی بہبود کے لیے وقف کر رکھا تھا اور جس انتہائی سادگی سے وہ زندگی بسر کرتے تھے وہ ہادیٔ اسلام کی مثال کی پوری پوری تقلید تھی۔ وہ اپنے آقا کی طرح مسجد میں جا کر شریک نماز ہوتے تھے اور جماعت سے خطاب کرتے تھے، اپنے مکان پر غریبوں اور مظلوموں سے ملتے تھے اور ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کی فریاد پر کان دھرتے تھے۔ اُنہوں نے خدم و حشم اور ظاہری شان و شوکت کے بغیر محض اپنے حُسنِ کردار و سیرت کی مدد سے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس کی اطاعت قبول کرنے کے لیے شام کا سفر کیا تو اُن کے ہمراہ صرف ایک غلام تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ورثے میں کپڑوں کا ایک جوڑا، ایک اُونٹ اور ایک غلام چھوڑا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بیت المال سے جو وظیفہ ملتا تھا وہ ہر جمعے اُسے غریبوں اور دُکھیاروں میں تقسیم کر دیتے تھے اور قاضیوں کے فیصلوں کا پورا پورا احترام کر کے اُنہوں نے لوگوں کو ایک اعلیٰ مثال پیش کی۔ جب تک اسلامی جمہوریت قائم رہی، کسی خلیفہ کو مجال نہ ہوئی کہ معینہ عدالتوں کے فیصلوں میں تصرف یا اُن کی خلاف ورزی کرے[1]۔

---

[1] ابتدائی مسلمان بازنطینی شہنشاہ کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے۔

کسی نئی حکومت کے لیے، جس نے بزورِ شمشیر اقتدار حاصل کیا ہو، یہ قدرتی طور پر مشکل ہوتا ہے کہ محکوموں کو فوراً اپنا گرویدہ بنالے۔ لیکن ابتدائی مسلمانوں نے مفتوحہ قوموں کو انتہائی اعتماد اور وابستگی کے محرکات مہیا کیے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جیسے معتدل مزاج اور نرم طبع حاکموں کی سرداری میں، جنہوں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے سپاہیوں کی سختی و درشتی کو حدود کے اندر رکھا، انہوں نے اپنے محکوموں کے شہری حقوق کا مکمل تحفظ کیا۔ اُنہوں نے تمام مفتوحہ قوموں کو پوری پوری مذہبی آزادی دی۔ اس معاملے میں اُن کا کردار موجودہ زمانے کی بہت سی مہذب حکومتوں کے لیے قانونی اور مذہبی رواداری کی افضل ترین مثال ہے۔ نہ تو اُنہوں نے کوڑے مار کر عورتوں کو ہلاک کیا، اور نہ انہیں جلاوطن کر کے سائبریا بھیجا، تاکہ وہاں کانوں میں محنت شاقہ کریں اور اپنے محافظوں کی زیادتیاں اور دست و درازیاں سہیں۔ اُن میں اتنی دانشمندی تھی کہ انہوں نے کسی مفید خلائق معاشرتی ادارے میں دخل اندازی نہیں کی جو کسی مفتوحہ ملک میں موجود تھا اور جو ان کے دین کے منافی نہ تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زرعی خوشحالی کو فروغ دینے کی خاطر جو اقدامات کیے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہیں لوگوں کی فلاح اور اُن کے مفادات کو ترقی دینے کا کتنا خیال تھا۔ زمین پر جو لگان لگایا گیا وہ ایک معتدل اور منصفانہ بناء پر مقرر کیا گیا۔ مملکت کے ہر حصے میں نہریں کھدوائی گئیں۔ جاگیرداری کے زمانے سے جو محاصل اور خراج کاشت کاروں کے لیے عذاب جان بنے ہوئے تھے وہ سب کے سب منسوخ کر دیے گئے۔ چنانچہ صدیوں کا بوجھ ان کے سر پر سے اُتر گیا۔ ایک قاتل کے ہاتھوں اس عادل اور بیدار مغز حکمران کی شہادت اسلامی مملکت کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ تھی۔ اُن کی سیرت، جس میں سختی کے ساتھ عدل کا عنصر بھی تھا، اُن کی عملی دانشمندی اور اُن کی مردم شناسی، ان صفات کی بدولت وہ اس کام کے لیے خاص طور پر موزوں تھے کہ بنو اُمیہ کے

---

۱ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں پہلی بار ہوا کہ ایک عدالت کے فیصلے کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ وہ یوں ہوا کہ انہوں نے ایک شخص کو جسے قاضی نے مجرم قرار دیا تھا اتنی سی بات پر معاف کر دیا کہ اس نے خلیفہ کی شان میں ایک قصیدہ پڑھ کر سنایا۔

اقتدار اندوزانہ منصوبوں کی روک تھام کر سکیں۔ اُنہوں نے اپنے بسترِ مرگ پر چھ ممتاز افراد کو یہ فرض سونپا کہ اُن کے جانشین کا انتخاب کریں۔ ان حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابو طالب کو انتخاب کر کے انہیں منصب خلافت پیش کیا، لیکن بنو اُمیہ کی سازشوں کے باعث اس کے ساتھ ایک ایسی شرط لگا دی گئی جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے قبول نہ کریں گے۔ وہ شرط یہ تھی کہ وہ امورِ مملکت میں صرف شریعتِ الٰہی اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی عمل نہ کریں گے، بلکہ اپنے دو پیشرووں کے احکام و اعمال کا بھی اتباع کریں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آزادہ رو اور غیور طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ وہ یہ پابندی اپنے اُوپر عائد کر لیں چنانچہ جیسا بنو اُمیہ کو توقع تھی، منصب خلافت اُن کے قرابت دار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پیش کیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جسے اولادِ ہاشم کے ساتھ پرانی اور دلی دشمنی تھی، اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جسے اولادِ ہاشم کے ساتھ پرانی اور دلی دشمنی تھی اس خاندان کے لوگوں نے ہادیٔ اسلام کو اس حد تک اپنے بغض و کینہ کا موردِ ستم بنایا تھا کہ آپ ہجرت پر مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے دینِ حق کو ابتدائے طفولیت ہی میں تباہ کرنے کے لیے سب جتن کیے تھے اور آخری وقت تک اُس کی بربادی پر تُلے رہے تھے۔ ان کا آپس میں زبردست گٹھ جوڑ تھا اور قبائل مُضر پر، جن میں وہ ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے، ان کا بہت اثر و نفوذ تھا۔ قوت و اقتدار کو اپنے ہاتھوں سے جاتے دیکھ کر اُن کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ فتحِ مکہ کے بعد اُنہیں ناگزیر حالات کے سامنے پر انداز ہونا پڑا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی نے جس طرح اُن کی سطوت کے طلسم کو توڑا تھا اس کے لیے انہوں نے خاندانِ ہاشم کو معاف نہ کیا تھا۔ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے یہ غدار آپ کی عظیم شخصیت سے مرعوب ہو کر دبکے بیٹھے رہے۔ اُن میں سے بہت سوں نے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھ کر اور مسلم فتوحات کی بدولت جو مالِ غنیمت ملک میں آ رہا تھا اس میں شریک ہونے کی غرض سے اسلام کا اقرار باللسان تو کر لیا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جمہوریت کا اعلان کیا اس سے انہوں نے نفرت کرنا ترک نہ کیا تھا۔ پہلے دو خلفاء راشدین نے اُن کی حبّ جاہ کو حدود کے اندر محدود رکھا تھا اور ان کی ریشہ دوانیوں اور مکارانہ سازشوں کو سر اٹھانے کا

موقعہ نہ دیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مسند نشین ہوتے ہی وہ سب کے سب مدینے میں آ کر جمع ہو گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں شیخین کے تمام کیے ہوئے نظامِ حکومت کا رُخ بدل گیا۔ سب پرانے والیانِ صوبہ جات اور فوجی سردار جو مقربین رسول ﷺ میں سے انتخاب کئے گئے تھے، معزول کر دیئے گئے۔ یہی نہیں بلکہ وفادارانہ خدمت کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا۔ اختیار اور منفعت والے تمام عہدے بنو اُمیہ نے سنبھال لیے۔ صوبوں کی ولایت ایسے ایسے لوگوں کو عطا کی گئی جو اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دے چکے تھے اور انہیں بیت المال سے بے اندازہ فائدے پہنچائے گئے۔ اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے ہم انہیں قدرے تفصیل کے ساتھ دینِ محمدی ﷺ کے فرقوں سے بحث کے ضمن میں بیان کریں گے۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حکام کی بدعنوانیاں، روایات ماسبق سے بے اعتنائی، پیرانہ سال خلیفہ کی اقرباء پروری اور شکائتوں سے لاپروائی، یہ سب چیزیں مل کر صحابہ نبی اور جمہورِ مسلمین کے دلوں میں رنجیدگی اور برگشتگی پیدا کرنے کا باعث ہوئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغاوت ہوئی اور اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر اجماع اُمت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا۔ اس کے بعد جو فتنہ بغاوت برپا ہوا وہ اسلامی تاریخ کی المناک داستانوں میں ہے۔ اولسر کہتا ہے کہ ’’اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امن و اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع دیا جاتا تو ان کے محاسنِ ذاتی، ان کی ثابت قدمی اور ان کی اخلاقی فضیلت کی بدولت پرانی جمہوریت کو اور اس کے سیدھے سادے طریقوں کو دوام حاصل ہو جاتا۔‘‘ ایک قاتل کے خنجر نے اسلام کی اُمیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ میجر اوزبرن کا قول ہے کہ ’’حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موت ایک ایسے شخص کی موت تھی جو ان تمام افراد میں جن کی یاد تاریخ اسلام نے محفوظ رکھی ہے۔ سب سے صادق القلب اور افضل ترین مسلمان تھا۔‘‘ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ سات صدیاں پہلے دنیا میں آئے ہوتے تو انہیں عیسوی کلیسا کی طرف سے ولایت کا درجہ عطا ہوتا اور اگر تیرہ صدیاں بعد آئے ہوتے تو ان کی فطنت و قابلیت، ان کی نیک سیرتی و شجاعت مہذب دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کرتی۔ ایک حکمران کی حیثیت سے وہ اپنے وقت سے پہلے پیدا

ہوئے۔ ان میں صداقت پسندی، حلم و تواضع اور رحم دلی کی جو صفات تھیں اُن کے ہوتے ہوئے بنو اُمیہ کی غداریوں اور دروغ بافیوں سے نبٹنا اُن کے بس کا کام نہ تھا۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے آمرانہ نظام کے قائم ہوتے ہی اسلام کی سیاست میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اب پہلے کی طرح حکمران ایک جمہوریہ کا سربراہ نہ تھا، جو عوام کی مرضی سے منتخب ہوتا تھا اور جو محض رعایا کی فلاح و بہبود اور دین کی عظمت و شوکت کی خاطر حکومت کرتا تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد سے یہ دستور ہو گیا کہ خلیفۂ وقت اپنا جانشین خود نامزد کرتا تھا اور خواص و عوام خلیفہ کے حضور میں یا اُس کے نمائندے کے سامنے وفاداری کا حلف اُٹھا کر اُس نامزدگی پر مہرِ توثیق ثبت کر دیتے تھے۔ اس نظام میں جمہوریت اور آمریت دونوں کی خرابیاں تھیں، لیکن ان میں سے کسی ایک کی بھی خوبیاں نہ تھیں۔ جمہوریت کے زمانے میں نہ صرف خلیفہ کی معاونت کے لیے صحابۂ کرام پر مشتمل ایک مجلسِ شوریٰ تھی، بلکہ اس قسم کی مجلسِ شوریٰ ہر والیٔ صوبہ کی بھی رہنمائی کرتی تھی۔ خلافتِ اموی کے دور میں حکومت محض شخصی حکومت تھی جس پر اعتدال عائد کرنے والی صرف ایک قوت تھی، یعنی بادیہ نشین عربوں اور علما و اتقیا کی آزادیٔ گفتار، جس کی بدولت وہ اکثر قرآن کے کلمات یا شعرا کے اشعار پڑھ کر خلیفہ کی کیفیتِ مزاج کو بدل دیتے تھے۔ پہلے پانچ خلفائے عباسی کے زمانے میں بھی حکومت شخصی سلطنت رہی ہے، اگرچہ محکموں کے وزرا اور اکابرِ بنو عباس مشیروں کی ایک غیر رسمی جماعت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ایک ایسی باقاعدہ مجلسِ شوریٰ جو ان تمام جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل تھی جنھوں نے خلیفہ کی وفاداری کا حلف اُٹھایا تھا، پہلی بار مامونِ اعظم کے عہد میں قائم ہوئی۔ بویدوں، سامانیوں، سلجوقیوں اور ایوبیوں کے زمانے میں بھی ایسی مجلسیں تھیں جو عوام کی کم و بیش نمائندگی کرتی تھیں۔

لیکن ابتدائی عباسیوں کے عہد میں مطلق العنان حکومت مسلمان قوموں کی ذہنی نشو و نما اور مادی ترقی میں ممد ہوئی۔ اُن کے اسلوبِ حکمرانی میں جو توانائی تھی اور جس مضبوطی سے انہوں نے عنانِ اقتدار کو تھامے رکھا اُس کے اعتبار سے وہ انگلستان کے ٹیوڈر خاندان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ خلافتِ عباسیہ کا سیاسی اور انتظامی ساز و سامان، جو بعد

میں آنے والے خاندان نے اُن سے مستعار لیا، بانیٔ بغداد خلیفہ منصور کی اختراعی ذہانت کی تخلیق تھا۔ تقسیم کار کی مؤثریت اور جزئیات پر نگرانی کے اعتبار سے وہ جدید زمانے کے کامل ترین نظاموں کا ہم پلہ تھا۔

عباسیوں نے اپنی خلافت کے آغاز ہی میں، جو چند صدیوں تک رہی، ایک بیت المال اور ایک دیوان الخاتم قائم کیا۔ اوّل الذکر کا کام تھا محاصل کا وصول کرنا اور انہیں اخراجات مملکت کے لیے تقسیم کرنا، اور ثانی الذکر کا کام تھا فرامین شاہی کو مستند قانونی حیثیت دینا۔ امورِ سلطنت کے بہتر تفصیلی انصرام کی خاطر مزید سرکاری محکمے جنہیں دیوان کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا قائم کیے گئے۔ ان میں بڑے بڑے یہ تھے:۔ دیوان الخراج (یعنی محاصل کا مرکزی دفتر یا مالیات کا محکمہ) دیوان الضیاع السلطانیہ (یعنی املاکِ سرکاری محکمہ) دیوان الزمام (یعنی تنقیح اور حساب داری کا محکمہ) دیوان الجند (یعنی دفترِ جنگ) دیوان الموالی و الغلمان (یعنی مملوکوں اور غلاموں کا محکمہ) جہاں خلیفہ کے غلاموں اور آزاد کردہ غلاموں کا ایک رجسٹر رکھا جاتا تھا اور ان کے نان ونفقہ کا انتظام کیا جاتا تھا۔ دیوان البرید۔ دیوان الزمام و النفقات (یعنی محلسرائے شاہی کے اخراجات کا دفتر) دیوان الرسائل (یعنی دفتر خط وکتابت) دیوان التوقیع (یعنی درخواستوں کا دفتر) دیوان النظر فی المظالم (یعنی شکائتوں کا تفتیش کا دفتر) دیوان الاحداث والشرطہ (یعنی رضا کار فوج اور پولیس کا محکمہ) اور دیوانِ العطاء (جس کا کام تھا فوجیوں کی تنخواہیں تقسیم کرنا) غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ ایک خاص دفتر کو سونپا گیا تھا، جس کے سربراہ کا لقب کاتب الجہذہ تھا۔

ہر سرکاری دفتر کے انتظام پر ایک صدر یا رئیس مامور تھا اور اس کی نگرانی کے لیے مُشرف یا ناظر مقرر تھے۔

اس کے علاوہ ایک اور عہدیدار تھا جس کا لقب حاجب تھا اور جس کا کام تھا دوسرے ممالک کے سفیروں کا تعارف اور قاضیوں کے فیصلوں کے خلاف مرافعے کی درخواستیں کی شنوائی۔ عباسیوں نے ایک وزیر (یعنی وزیر اعظم) بھی مقرر کیا، جس کے ذمے یہ کام تفویض تھا کہ جن امورِ مملکت میں خلیفہ کی توثیق لازمی ہو اُنہیں خلیفہ کے سامنے پیش کرے۔ انہوں نے صوبائی نظم ونسق میں باقاعدگی پیدا کی اور صوبوں سے جو

خراج لیا جاتا تھا اس کی پکی رقوم مقرر کیں۔ انہوں نے کاروانوں کے لیے سرائیں تعمیر کیں، بغداد سے لے کر مکہ تک سڑک کے کنارے حوض اور نہریں کھدوائیں، دو رویہ درخت لگائے اور ہر جگہ مسافروں اور حاجیوں کے لیے سرراہ آرام گاہیں بنوائیں۔ انہوں نے مکہ اور مدینہ کے درمیان سڑک تیار کرائی اور حجاز و یمن کے درمیان آمد و رفت میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر گھوڑوں اور اُونٹوں کی ڈاک چوکیاں بٹھائیں۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کو ڈاک لے جانے کے لیے اُنہوں نے ڈاکئے مقرر کئے۔ دارالخلافہ میں انہوں نے ایک مرکزی دفتر قائم کیا جس میں مملکت کی قدیم دستاویزات محفوظ رکھی جاتی تھیں اور اپنی قلمرو کے ہر حصے میں پولیس کا عمدہ انتظام کیا۔ تجارتی کاروبار کی نگرانی، تاجروں کے درمیان تنازعوں کے تصفیے اور دھوکے بازی کی روک تھام کی خاطر اُنہوں نے ایک شرکتِ تجار قائم کی۔ نہ صرف ہر تجارتی مرکز میں سوداگروں کی ایک باقاعدہ انجمن تھی، بلکہ ہر اہم شہر اور قصبہ میں ایک مجلس بلدیہ بھی تھی۔ اُنہوں نے ایک محتسب بھی مقرر کیا جو ہر روز بازار کا دورہ کرتا تھا اور تاجر پیشہ لوگوں اور دکانداروں کے آلاتِ وزن و پیمائش کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ اُنہوں نے مقامی خود اختیاری حکومت کو فروغ دیا اور شہری اداروں کی حوصلہ افزائی کی۔ کاشتکاروں کو قرضے دے کر زراعت کو ترقی دی گئی۔ عوام کی خوشحالی اور ملک کی حالت کے بارے میں صوبائی عمال سے میعادی کیفیت نامے طلب کئے جاتے تھے۔ اگرچہ تمام عباسی خلفا کو شان و شوکت پسند تھی، لیکن اس کے باوجود اُن میں سے بہت سوں نے جمہوریت کے ظاہری محاسن کو برقرار رکھا۔ اُن کی لکھی ہوئی کتابیں اور اُن کے ہاتھوں کی بنی ہوئی ٹوکریاں بازاروں میں بکتی تھیں اور اُن کے جو دام وصول ہوتے تھے اُن سے خلیفے اپنی ذاتی احتیاجات پوری کرتے تھے۔ اُنہوں نے رعایا کی فلاح و بہبود کے معاملے میں جو سرگرمی دکھائی اُس سے اُن مظالم کی جو اُنہوں نے خانوادہ علوی پر توڑے کسی حد تک تلافی ہو جاتی ہے۔ مامون اور اُس کے پہلے دو جانشینوں کے عہد میں مملکت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔

اسلام کا سیاسی مزاج کتنا وسیع المشرب ہے اور وہ کس طرح اپنے آپ کو ہر نوعیت اور ہر ہیئت کے معاشرے سے ہم آہنگ بنا سکتا ہے، اس کی بہترین مثال خلافت

ہسپانیہ ہے۔ وحشی لشکروں نے اس ملک پر بڑی شدید مصیبتیں نازل کی تھیں۔ ملک کے طول و عرض میں اُنہیں جہاں کہیں کوئی ادارہ نظر آیا، اُنہوں نے اُسے ملیا میٹ کر دیا تھا۔ اُنہوں نے رومی حکومت کے کھنڈروں پر جو بادشاہتیں قائم کی تھیں وہ کچھ ایسے کینڈے کی تھیں کہ سیاسی نشوونما کے تمام امکانات اُن کی بدولت ختم ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے رعایا پر جاگیردارانہ مطالبات کا اتنا بھاری بھرکم بوجھ لاد دیا تھا کہ رعایا اس کے نیچے پس کر رہ گئی تھی۔ بہت سے بڑے بڑے علاقے آبادی سے خالی ہو گئے تھے۔ ضابطۂ اسلامی کے نفاذ نے لوگوں کو بھی اور زمینوں کو بھی جاگیردارانہ نظام کی جکڑ بند سے رہائی بخشی۔ صحرا لہلہاتے کھیت بن گئے، ہر طرف مرفہ الحال شہر آباد ہو گئے اور نظم و ضبط نے بے آئنی کی جگہ لے لی۔ ہسپانیہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی عربوں نے ایک منشور جاری کیا جس میں اُنہوں نے محکوم قوموں کو، نسل و مذہب کے امتیاز کے بغیر، وافر آزادی کا یقین دلایا۔ سوئیوی (Suevi) گوتھ (Goth) ونڈال (Vandal) رومی، یہودی غرض سب کو مسلمانوں کے برابر حیثیت بخشی گئی۔ عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی، اپنی عبادت گاہوں کو آزادانہ استعمال کرنے کی اجازت اور جان و مال کی امان کی مکمل ضمانت دی گئی۔ یہ تو یہ، اُنہیں اس کی اجازت بھی دی گئی کہ مقررہ حدود کے اندر اپنے قوانین پر عمل درآمد کریں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اُنہیں نہ صرف دیوانی مناسب بلکہ فوجی عہدوں پر بھی فائز کیا گیا۔ اُن کی عورتوں کو فاتحوں کے ساتھ شادی کرنے کی دعوت دی گئی۔ عربوں کا ہسپانیہ میں جو رویہ رہا، اگر اس کا مقابلہ اس سلوک سے کیا جائے جو اکثر یورپین قوموں نے، قدیم زمانے میں نہیں بلکہ جدید زمانے میں، محکوم قوموں سے روا رکھا، تو کیا ایک حیرت انگیز اختلاف دکھائی نہیں دیتا؟ جہاں تک قدیم زمانوں کا تعلق ہے، جس طرح نارمنوں نے انگلستان پر یا عیسائیوں نے صلیبی محاربوں کے دوران شام پر حکومت کی، اس کا مقابلہ عربوں کی حکومت سے کرنا عقل سلیم اور انسانیت کی توہین ہے۔ عربوں نے ایفائے عہد میں جو اُستواری دکھائی اور ہر طبقے سے، کسی قسم کے امتیاز کے بغیر، جو مساویانہ انصاف کیا، اُس کی بدولت لوگوں کو اُن پر اعتماد ہو گیا۔ انہی باتوں میں نہیں، بلکہ فراخدلی میں، حسن اخلاق میں اور مہمان نوازی میں بھی، عرب اُس زمانے کی

تمام دوسری قوموں پر فضیلت رکھتے تھے یہودیوں نے وحشیوں کی حکومت میں عیسائی پادریوں کے اثر و رسوخ کی بدولت بڑے ستم اُٹھائے تھے۔ عربوں کا آنا اُن کے لیے سب سے زیادہ سود مند ثابت ہوا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ طبقوں کی ہسپانوی خواتین نے جن میں پلا جیس (Pelagius) کی بہن اور روڈرک (Roderick) کی بیٹی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ''ملحدوں'' کے ساتھ (جس لقب سے جان ماریانا (Jean Mariana) مسلمانوں کو مُلقب کرتا ہے) شادیاں کیں۔ اُن کے مرتبے سے جو حقوق و مراعات متعلق تھے وہ اُنہیں پوری طرح حاصل تھے، ساتھ ہی ساتھ اُنہیں پوری آزادی ضمیر بھی نصیب تھی۔ جن جاگیرداروں نے روڈرک کی چیرہ دستیوں سے بچنے کے لیے پہاڑیوں میں پناہ لے رکھی تھی مسلمانوں نے ان سب کو واپس آنے کی دعوت دی۔ بد قسمتی سے ان کے علاقوں سے اتنے زیادہ لوگ فرار ہو گئے تھے کہ وہ انہیں دوبارہ آباد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ایسے غیر ملکی کاشتکاروں کو جو جزیرہ نمائے ہسپانیہ میں آباد ہونے کو تیار تھے، نہایت فراخدالانہ ترغیبیں دیں ان ترغیبوں کی بدولت افریقہ اور ایشیا سے محنت پیشہ آباد کار بڑی تعداد میں ہسپانیہ آ گئے۔ پچاس ہزار یہودی بہ یک وقت اپنے بیوی بچوں سمیت اُندلس آ کر آباد ہو گئے۔

ہسپانیہ سات صدیوں تک مسلمانوں کے زیرِ نگیں رہا۔ اندرونی جھگڑوں اور خاندانی لڑائیوں کے باوجود ان کے دشمن بھی اس امر کے شاہد ہیں کہ ان کی حکومت ہسپانیہ کے لیے ایک رحمت تھی۔ ہسپانوی عرب ثقافت کی جس بلند سطح پر جا پہنچے تھے اُسے کبھی کبھی مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی شادیوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان شادیوں نے ہسپانوی مسلمانوں کی نشو و نما بہت سا اثر ڈالا اور ان کی وہ حیرت انگیز تہذیب جس سے جدید یورپ نے علوم و فنون کی ترقی میں کسب فیض کیا بڑی حد تک اس کی مرہونِ منت تھی۔ جو کچھ ہسپانیہ میں ہوا وہی اور ملکوں میں بھی ہوا۔ جس جس ملک میں مسلمان گئے اُس اُس ملک کی حالت بدل گئی، نظم و ضبط نے بے آئینی کی جگہ لے لی اور امن و امان اور خوشحالی کی چہل پہل ہر طرف نظر آنے لگی۔ جس طرح سپاہگری کسی ایک طبقے کا مخصوص پیشہ نہ تھی، اسی طرح حرفت و دستکاری میں کسی قسم کی

ذلت تصور نہ کی جاتی تھی۔ کاشت کاری ہر طبقے میں اتنی ہی مقبول تھی جتنی جنگ آزمائی۔

بادشاہوں پر رعایا سے متعلق جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُنہیں اسلام کتنی اہمیت دیتا ہے اور وہ کس طرح رعایا کی آزادی و مساوات کو فروغ دیتا ہے اور اُسے کس طرح حاکموں کے ظلم وستم سے امان بخشتا ہے، اس کی کیفیت حاکم ومحکوم کے باہمی حقوق کے موضوع پر ایک نمایاں تصنیف میں بیان کی گئی ہے جس کا مصنف صفی الدین محمد بن علی بن طباطبائی (المعروف بہ ابن الطقطقی) ہے۔ یہ کتاب ۷۰۱ ہجری میں تالیف ہوئی اور فخر الدین عیسیٰ بن ابراہیم امیر موصل سے معنون ہے۔

پہلے حصے میں اس سے بحث کی گئی ہے کہ رعایا کے معاملے میں بادشاہوں کے کیا کیا فرائض ہیں اور امورِ عامہ کے انصرام اور معاشی مسائل کے حل کے کیا کیا اصول و قواعد ہیں۔ مصنف کے نزدیک بادشاہ میں یہ اوصاف ہونے چاہئیں: دانشمندی، عدل، رعایا کی ضرورتوں اور خواہشوں کا علم اور خوفِ خدا۔ خوفِ خدا کے بارے میں وہ نہایت شدومد سے کہتا ہے کہ یہ تمام اوصافِ حمیدہ کی بیخ وبُن اور تمام برکات کی کلیدِ باب ہے۔ "وھذہ الخصلۃُ ھی اصلُ کُلِ خیرٍ و مفتاحُ کُلِّ برکۃٍ ان الملک من خاف اللہ آمنہُ عبادُ اللہ۔" "جب بادشاہ کو خدا کے حاضر وناظر ہونے کا شعور ہوگا تو اُس کے ملازموں کو امن وامان کی برکتیں نصیب ہوں گی۔" بادشاہ میں رحم (العفو عن الذنوب) کی صفت بھی ہونی چاہیے، جو خصائل حسنہ میں سے احسن خصلت ہے۔" اس کے دل میں اپنی رعایا کی بہتری کی ایک خواہش ہمیشہ موجود ہونی چاہیے اور اسے چاہیے کہ رعایا سے اس کی خواہش دریافت کرتا رہے کیونکہ رسولِ اکرم ﷺ ہمیشہ صحابہ کرام سے مشورہ کیا کرتے تھے اور خدا نے ارشاد فرمایا ہے۔" ہر معاملے میں اُن سے مشورہ کرو۔" امورِ مملکت کے انتظام میں بادشاہ کا فرض ہے کہ سرکاری آمدنی پر نگاہ رکھے، رعیت کے جان و مال کی حفاظت کرے، امن وامان قائم رکھے، جرائم کی روک تھام کرے اور رعایا کو ہر طرح کے گزند سے بچائے۔ اُسے ہمیشہ اپنا وعدہ پورا کرنا چاہئے۔ اس پر مصنف نہایت معنی خیز الفاظ میں اضافہ کرتا ہے کہ 'رعایا کا فرض فرمانبرداری ہے، لیکن ظالم حاکم کی فرمانبرداری رعایا کا فرض نہیں۔ ابن رُشد کا قول ہے کہ

"آمر جابر وہ ہے جو رعایا کی خاطر نہیں بلکہ اپنی خاطر حکومت کرتا ہے۔"

مسلمانوں کے قوانین، جو انصاف کے اصولوں پر مبنی ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیت سادگی اور وضاحت ہے، کسی ایسی قسم کی فرمانبرداری کا تقاضا نہ کرتے تھے جو دشوار اور دوبھر تھی یا انسانی فہم و ذکاء کے منافی تھی جن جن ملکوں میں مسلمانوں نے اپنی حکومت قائم کی وہ جاگیردار نظام اور جاگیردارانہ ضابطہ قوانین کے تباہ کن نتائج سے مصئون رہے[۱]۔" ان کے قوانین نے، جو خصوصی مراعات اور ذات پات کو تسلیم نہ کرتے تھے، دو شاندار نتائج پیدا کئے......ایک تو یہ کہ وحشیانہ قوانین نے زمینوں پر جعلی مطالبات کا بوجھ لاد دیا تھا وہ اُن سے رہا ہوگئیں، دوسرا یہ کہ افراد کو کامل مساوات کے حقوق حاصل ہوگئے۔"

۱؎ کورسیکا، سارڈینیا، صقلیہ اور جنوبی اٹلی میں جاگیردارانہ نظام عربوں کے اخراج کے بعد رائج ہوا۔

آٹھواں باب

سیاسی فرقہ بندیاں

اس باب میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان کے متعلق عالمِ اسلام میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ فاضل مصنف نے بعض مقامات پر بیشتر ایک ہی مکتب فکر کی ترجمانی کی ہے۔ اس ضمن میں چند مختصر تعلیقات کے لیے ملاحظہ ہو،

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ راعذر بنہ

چوں ندید ند حقیقت رہِ افسانہ زوند

حافظ

تاریخ مذاہب کا فلسفیانہ مطالعہ کرنے والے ہر شخص کو اس باب کا عنوان پڑھ کر تعجب ہوگا اور ہر اُس مسلمان کو جسے اپنے مذہب کے رہنما سے محبت ہے کرب و ندامت کا احساس ہوگا۔ مقام افسوس ہے کہ انسانیت اور عالمگیر اخوت کا مذہب بھی اندرونی نزاع و اختلاف کی لعنت سے مبرا نہ رہ سکا اور وہ دین جسے ایک سراسیمہ دنیا کو امن و امان اور جمعیت خاطر کی دولت بخشی تھی خود غضب ناک جذبات اور ہوس اقتدار کے ہاتھوں فتنۂ تفریق کا شکار ہوگیا۔ ہم نے عیسائیت کا ذکر کرتے وقت جن خرابیوں پر اظہار افسوس کیا تھا اُن کا سرچشمہ نظامِ عیسوی کا نامکمل اور حوائج انسانی سے ناموافق ہونا تھا۔ اسلام میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں اور جن کا ذکر ہمیں کرنا ہوگا، وہ ایک طرف تو جاہ دنیوی کی حرص کا نتیجہ تھیں اور دوسری طرف ایسے افراد اور طبقوں کی انقلاب انگیزیوں کا جنہیں اخلاقی نظم و ضبط راس نہ آتا تھا۔

معلم عربی ﷺ کی غیر معمولی فطانت، اس کی حیرت انگیز شخصیت اور اس نے مذہبی اتحاد اور عالمگیر شہریت کی جو دعوت دی اُس دعوت کی دل نشینی کا بین ترین ثبوت وہ عالمی تحریک ہے جس کا وہ پیش کرنے والا تھا اور جس نے خاندانوں کی خانہ جنگیوں کے باوجود اُس کی ملت کو فتح و نصرت کی ایک سیلابی موج پر سوار کر کے کرۂ ارض کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پہنچا دیا۔ عرب، جو اب تک مختلف قبیلوں اور خاندانوں کا میدان کارزار تھا جن میں صدیوں پرانی باہمی عداوتیں تھیں۔ اس میں ایک مشترک مقصد نے یکا یک ایک نئی روح پھونک دی۔ اب تک عربوں کی باہمی جنگ و جدل اور ان کے باہمی معاہدے، اُن کی خوبیاں اور برائیاں، اُن کی حریت پسندی اور جرگہ بندیاں اتحاد عمل کی راہ میں حائل رہی تھیں۔ یکا یک گلہ بانوں کی ایک جماعت ایک حکمران قوم اور نیم خانہ بدوشوں کی ایک نسل ایک عالمی مذہب کی پیشوا اور ایک ہمہ گیر قانون کی امین بن گئی۔ تین براعظموں کے درمیان رہنے والے بادیہ گرد قبیلوں کے اس متفرق مجموعے نے عدیم النظیر تن دہی اور نفس کشانہ جاں نثاری سے کام لے کر دینِ حق کا جھنڈا اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے اقصائے عالم میں سربلند کر دیا۔ ''تم اس امر پر مبعوث ہوئے ہو کہ ساری نوعِ انسانی کو رحمتِ ربی اور وحدت اللہ کا پیغام پہنچاؤ۔'' یہ تھی وہ صلائے عام جو اُنہیں سنائی گئی۔ اور انہوں نے ایک ایسے راسخ ارادے سے جو کسی سدِ راہ کو خاطر میں نہ لاتا تھا اس پر لبیک کہا۔ عقیدے کی وہ شدت جس کی بدولت وہ مخالف مذہبوں اور نسلوں کی صفیں چیرتے ہوئے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچے اُس پراسرار انقلاب کی کلید ہے جو اُنہوں نے برپا کر دیا۔

حقیقت ازلی و ابدی ہے۔ پیغام محمدی ﷺ کوئی نیا پیغام نہ تھا۔ یہ پیغام پہلے بھی دیا گیا تھا، لیکن اس نے انسان کے دل میں گھر نہ کیا تھا۔ محمد مصطفےٰ ﷺ کی آواز ایک صُور تھی جس نے مرے ہوؤں کو زندہ کر دیا اور جو مر رہے تھے اُنہیں مزید زندگی بخشی۔ انسانیت کی نبض صدیوں کی جمع شدہ قوت کے ساتھ چلنے لگی۔ عربوں کا اس زبردست محرک کے زیر اثر اپنے وطن سے خروج جس وسیع پیمانے پر وہ ظہور میں آیا اور وہ دوررس اثرات جو اس نے مرتب کئے...... یہ عصر جدید کی تاریخ کے سب سے حیرت انگیز مظاہر

ہیں۔ عرب نوعِ انسانی کے معلم بن کر اپنے صحرائی نہاں خانوں سے نکلے۔ تیس سالوں کے اندر (جو خلافتِ راشدہ کی مدتِ موعود تھی) وہ ہندوکش سے لے کر بحرِ اوقیانوس کے ساحل تک ہر قوم کے دروازے پر دستک دے رہے تھے تاکہ اُسے وہ پیغام دیں جو انہیں تفویض کیا تھا۔ وصالِ نبوی ﷺ سے لے کر جمہوریت راشدہ کے اختتام تک جو قلیل مدت گذری اُس مدت میں اُنہوں نے ایک ایسی سلطنت بنا کر رکھ دی جو وسعت میں اُس سلطنت پر سبقت لے گئی جسے رومیوں نے تیرہ صدیوں کی مسلسل توسیع کے بعد قائم کیا تھا ابن الاثیر، طبری یا ابوالفداء کی تاریخوں کی ورق گردانی کیجئے تو آپ کو اس کی ایک سلسلہ وار روداد ملے گی کہ فتوحاتِ اسلامی کا سیلاب کس طرح تمام ان منفعت بخش عناصر کو جو اُسے رستے میں ملے اپنے اندر حل کرتا ہوا اور اس سرزمین کو جس پر سے وہ گزرا زرخیزی عطا کرتا ہوا پھیلتا چلا گیا۔

لیکن وہی اسباب جنھوں نے عربوں کو ظہورِ محمدی ﷺ سے پہلے ایک واحد قوم بننے سے روک رکھا تھا، یعنی وہی قبائلی رقابتیں اور مخالفتیں جن کے بدنما داغ آج بھی دنیائے اسلام کے چہرے پر دکھائی دیتے ہیں، بالآخر نہ صرف جمہوریت راشدہ کی تباہی بلکہ سلطنت اسلامیہ کی بربادی کا باعث بنے۔ دوسوں کا کہنا ہے کہ ''اگر محمد ﷺ کے پیرو اپنے ہادی کی دکھائی ہوئی راہ پر چلتے اور خلفائے راشدین کی مثال کی تقلید کرتے تو اُن کی سلطنت رومی سلطنت سے وسیع تر اور محکم تر ہوتی۔'' لیکن بنی اُمیہ کی حرص نے اور عربوں کی شورہ پشتی نے اور ان کی اس انفرادیت پرستی نے جو ایک مشترک دشمن کے خلاف صف آرائی کے دوران بھی اپنے آپ کو ظاہر کئے بغیر نہ رہتی تھی اس عظیم الشان عمارت کو مسمار کر دیا جو ابتدائی مسلمانوں کی شجاعت اور عقیدت نے کھڑی کی تھی۔ یہ اس کا نتیجہ تھا کہ جب فرانس کا شہر تور (Tours) اُن کے قبضے میں آنے ہی والا تھا تو اُن کی فتح یکایک شکست میں تبدیل ہوگئی۔ ہسپانیہ سے بھی وہ اسی لیے نکالے گئے کہ وہ اپنی قدیم صحرائی رقابتوں کو فراموش کر کے مشترک طور پر دشمن کا مقابلہ نہ کر سکے۔

بہرحال، اگرچہ جمہوریت ختم ہوگئی اور عصائے سُلطانی عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا، تاہم دینِ اسلام زندہ رہا۔ وہ صدیوں کے ارتقاء کا نتیجہ اور انسان کی مذہبی نشوونما کا

آخری مرحلہ تھا۔ اس لیے اس کی ہستی یا اس کی ترقی سلطنتوں کے قیام یا انسانوں کی بقا پر منحصر نہ تھی۔ چنانچہ جیسے جیسے وہ پھلتا پھولتا اور بڑھتا پھیلتا گیا ہر قوم اور ہر عہد اپنی اپنی روحانی ضروریات اور اپنی اپنی ذہنی استعداد کے مطابق اس کی تعلیمات سے استفادہ کرتا رہا۔

تفرقوں اور تنازعوں نے کلیسائے عیسوی کی طرح ملّتِ محمدی ﷺ کے بھی ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ جو امور انسان کے دائرہ وقوف کے اندر ہیں اُن پر اختلاف آراء نے کبھی اتنی تلخی اور دشمنی پیدا نہیں کی جتنی ایسے مجرد موضوعات پر اختلاف آراء نے کی ہے جن کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ ممکن ہی نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سرشت کے بارے میں مناظروں نے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا۔ اس سوال نے کہ انسان مختار ہے یا مجبور، اگر دنیائے اسلام میں اُتنا خون نہیں بہایا تو اُتنے ہنگامے ضرور برپا کئے ہیں۔ پاپائے روم کے دعویٰ معصومیت نے دنیائے عیسائیت کی بنیادیں ہلا دیں۔ اجماعِ اُمت اور اکابر ائمہ کے بری از خطا ہونے کا نظریہ متعدد قیمتی زندگیوں کی تباہی کا باعث بنا۔

دینِ محمدی ﷺ میں جو فرقے ہیں اُن کے اصلی اسباب سیاسی اور خاندانی اختلافات ہیں، یعنی پرانی قبائلی عداوتیں اور بالخصوص آل ہاشم سے دوسرے حریف کا حسد و رشک۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اسلام کی روحانی اور دنیاوی پیشوائی کے لیے صریح طور پر کسی کو اپنا جانشین نامزد نہیں کیا۔ لیکن یہ خیال واقعات کے بارے میں ایک غلط فہمی پر مبنی ہے، کیونکہ اس امر کی وافر شہادت ملتی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے ہمراہیوں کو جمع کیا[1] اور ان سے خطاب کرتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کئے جو اس باب میں شک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے کہ اپنے جانشین کے بارے میں آپ ﷺ کا کیا عندیہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''علی رضی اللہ عنہ کا مجھ سے وہی رشتہ ہے جو ہارون کا موسیٰ علیہ السلام سے تھا۔ الٰہ العٰلمین، تو

---

1. ابن خلکان۔ جلد اول۔ صفحہ ۳۸۳۔ ابن خلکان کہتا ہے: الحازمی کے قول کے مطابق خم ایک وادی کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان اور الجحفہ کے قرب و جوار میں واقع ہے اس میں ایک تالاب (غدیر) ہے، جس کے نزدیک رسولِ اکرم نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:۔ یہ ۱۸/ ذوالحجہ کا واقعہ ہے، کیونکہ ابنؒ خلکان کے کہنے کے مطابق یہ غدیر کی تاریخ ہے اور غدیر کو غدیر خُم ھی کہتے ہیں

اس کے دوستوں کا دوست رہیو اور اس کے دشمنوں کا دشمن۔ جو لوگ اس کی مدد کریں ان کی مدد کیجیو، اور جو لوگ اس سے غداری کریں اُن کی اُمیدوں کو خاک میں ملا دیجیو۔''

دوسری طرف رسولِ پاک کی بیماری کے ایام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا امامت نماز کے فرائض پر مامور ہونا ایک مختلف انتخاب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پیغمبر کی وفات پر جب اُمت مسلمہ کا امیر منتخب کرنا ضروری ہوا تو یہ سوال زیرِ بحث آیا۔ بنو ہاشم کا اصرار تھا کہ وراثت کے علاوہ تقرر کے ذریعے یہ منصب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھا۔ دوسرے قریش رائے دہندگی کے ذریعے انتخاب پر اڑے ہوئے تھے۔ جب اہلِ بیت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے، تو اسی دوران میں بعض قریش اور انصار مدینہ کی رائے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلافت کے لیے انتخاب کیے گئے۔ اس عجلت کی توجیہہ یوں کی جاسکتی ہے کہ حکومت کی صدارت پر کسی کا فوراً مامور کیا جانا لازمی تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی طبعی فیاضی اور حبِ دین سے کام لے کر اور اس خوف سے کہ مبادا متبعین نبی میں کسی قسم کا رخنہ پڑ جائے، فوراً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ تین مرتبہ انہیں خلیفہ کا تقرر کرتے وقت نظر انداز کیا گیا اور تینوں مرتبہ انہوں نے انتخاب کرنے والوں کا فیصلہ بطیب خاطر منظور کیا۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی اپنے آپ کو ایک اُمیدوار کی حیثیت سے پیش نہ کیا، عام اس سے کہ اُن کے حامیوں اور طرف داروں کے جذبات اس معاملے میں کیا تھے۔ انہوں نے پہلے دو خلفاء کو معاملات مملکت میں رائے اور مشورہ دینے سے کبھی دریغ نہ کیا۔ پہلے دو خلفاء نے بھی اُن کے مشوروں اور تعلیمات نبوی کی تشریح و تفسیر کا ہمیشہ احترام کیا۔ جن حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے ہم اُن کا ذکر اُوپر کر آئے ہیں۔ یہاں ہم اس کے بعد کے واقعات کو بیان کریں گے تاکہ اس امر کی صراحت کر سکیں کہ وہ افسوسناک رخنہ جس نے ملت اسلامیہ کو دو فرقوں میں تقسیم کر رکھا ہے کیونکہ پیدا ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں نہ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سی زیرکی تھی، نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سی ذہنی استعداد اور عزم و جزم، اُن کی نیک طینتی اور سادہ دلی نے انہیں اپنے اعزہ و اقرباء کے ہاتھوں میں بے بس کر دیا۔ ایک طرف یہ فرشتہ خصال بزرگ اپنے مطلب پرست رشتہ داروں کے حلقے میں گھرا ہوا، دوسری طرف صوبے اپنے مسائل کے حل طلب کرتے

ہوئے اور تیسری طرف جمہور مسلمین ایک پر ملال خاموشی کے ساتھ صدر مملکت کا منہ تکتے ہوئے ...... یہ ہے عہد کا ایک عبرت آموز اور غمناک مرقع۔ ڈوزی نے نہایت برجستہ الفاظ میں اس شریف النفس خلیفہ کی تصویر کھینچی ہے۔ ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ وہ خلافت کے لیے انتخاب کئے جاتے۔ یہ بجا ہے کہ وہ غنی اور سخی تھے۔ انہوں نے مالی قربانیوں کے ذریعے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی مدد کی تھی۔ وہ صائم الدہر اور قائم الصلوٰۃ اور خلیق وحلیم تھے۔ لیکن وہ طبیعت کے کڑے نہ تھے۔ علاوہ بریں پیرانہ سالی نے انہیں بڑی حد تک ضعیف کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ جب انہیں منبر پر بٹھا دیا جاتا تو بڑی دیر تک خطبہ شروع نہ کر سکتے۔ اس پر آفت یہ ہوئی کہ انہیں اپنے رشتہ داروں سے حد درجہ محبت تھی جو مکہ کے اکابر داعیان تھے اور جنہوں نے بیس سالوں تک پیغمبر کی توہین کی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستایا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائیاں لڑی تھیں۔ بہت جلد یہ عالم ہو گیا کہ ان رشتہ داروں نے خلیفہ کو شیشے میں اُتار لیا۔ اُن کا چچا ہشام اور ہشام کا لڑکا مروان فی الحقیقت ملک کے حکمران تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صرف برائے نام خلیفہ تھے اور اس لقب کی بدولت ایسے ایسے مشتبہ امور کے ذمہ دار ٹھہرائے جاتے تھے جن کی انہیں اکثر خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ ان دونوں اشخاص کی پختگی ایمان موضوع شک تھی۔ ہشام نے تسخیر مکہ کے بعد اسلام قبول کیا تھا اور رموز سلطنت کے افشا کی پاداش میں جلاوطن کیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں نے اس حکم کو جو خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے صادر کیا تھا، برقرار رکھا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہ صرف ہشام کو واپس بلوا لیا بلکہ سرکاری بیت المال سے ایک لاکھ نقرئی سکے عطا کئے اور املاکِ سرکاری میں سے زمین کا ایک قطعہ بھی دیا۔ انہوں نے مروان کو اپنا منشی اور وزیر مقرر کیا۔ اس سے اپنی ایک لڑکی کی شادی کی۔ ہند نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اُحد کی خوں ریز لڑائی لڑی تھی، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہ صرف اُن کے بیٹے معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام کی گورنری سے سبکدوش نہ کیا، بلکہ اُن کے سوتیلے بھائی عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ بن سُرح کو مصر کا حاکم مقرر کر دیا۔ یہ وہی عبداللہ ہے جو ایک زمانے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشی تھا اور جس کی بات کہا جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے آیاتِ قرآنی پڑھ کر سناتے تھے تو وہ اُن کے الفاظ میں ردو بدل اور اُن کے معانی کو مسخ کر دیا کرتا تھا۔ جب اس کی اس

نازیبا حرکت کا پردہ فاش ہو گیا تو وہ فرار ہو کر از سرِ نو بت پرست بن گیا۔ حضرت عثمانؓ کا ایک اور سوتیلا بھائی ولید کوفہ کا گورنر مقرر ہوا۔ اگرچہ اس کے باپ نے آنحضرتﷺ کے ساتھ بدسلوکی کی تھی، یہاں تک کہ ایک موقع پر گلا گھونٹ کر آپﷺ کو مار ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ ایک ایسا گیا گزرا عیاش و اوباش اور رندو مے پرست تھا جس کی زندگی مسلمانوں کے لیے باعثِ عار تھی۔ ایک دن وہ نمازِ فجر کے وقت مسجد میں آیا تو ایسی بری طرح نشے میں چور تھا کہ اس میں فرائض امامت ادا کرنے کے لیے کھڑا ہونے کی سکت بھی نہ تھی۔ جب آس پاس کے لوگوں نے سہارا دے کر اسے کھڑا کر دیا تو اس نے ہکلائی ہوئی آواز میں مزید شراب کا مطالبہ کیا۔ یہ تھے وہ لوگ جو خلیفہ کے دست راست تھے انہوں نے جونکوں کی طرح رعایا کا خون چوس لیا اور بے دریغانہ استحصال سے کام لے کر دولت بٹورنے لگے۔ مملکت کے گوشے گوشے سے مدینے میں شکائتیں آنے لگیں۔ لیکن سخت وسُست الفاظ کے سوا شکائیتوں کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔ بالآخر بارہ ہزار افراد کا ایک وفد جس کے سربراہ محمد بن ابوبکرؓ تھے، حضرت عثمانؓ کی خدمت میں لوگوں کی شکایت پیش کرنے اور اُن کے تدارک کی درخواست گزارنے کی خاطر دارالخلافہ میں آیا۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ سے وساطت کی فرمائش کی۔ حضرت علیؓ نے شکایات کے ازالے کا وعدہ کر کے لوگوں کو رخصت کیا۔ ابھی وفد کے افراد نے مدینے اسے ایک دن کی مسافت ہی طے کی تھی کہ حضرت عثمانؓ کے کاتب کا لکھا ہوا ایک خط اُن کے ہاتھ لگا جس پر مہر خلافت ثبت تھی اور جس میں حضرت معاویہؓ کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ان سب لوگوں کے سر قلم کر دیں۔ اس بدعہدی پر برافروختہ ہو کر وہ لوگ مدینے واپس آئے اور انہوں نے کاشانۂ خلافت میں داخل ہو کر حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ اُن کے پاس اسلام کے خلاف، اس کی جمہورت کے خلاف، اس کی مساواتِ حقوق کے خلاف اور اس کے سخت گیر اخلاقی ضوابط کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کا بہانہ تھا۔ اہل مکہ کو اس شہادت نے اس کا عذر بہم پہنچا دیا کہ اہلِ مدینہ کے خلاف، جن سے انہیں سخت نفرت تھی، سازش کا بازار گرم کریں۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی جان بچانے کی مقدور بھر کوشش کی تھی، اوّل اوّل تو انہیں یہ مصلحت اندیشانہ مشورہ دے کر کہ وہ اپنے بے اصولے

رشتہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہ بنیں اور آخری مرتبہ مغلوب الغضب سپاہیوں کا سامنا کر کے اور انہیں اس کی تلقین کر کے کہ ضعیف العمر جانشین نبی کا لحاظ کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کی خاطر انہوں نے اپنے بیٹوں کی جانوں کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات پر وہ جمہور مسلمین کی متفقہ رائے سے منصب خلافت پر سرفراز ہوئے۔ وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے اس وقت تک اگر چہ انہوں نے کبھی مملکت کی مشاورتی مجلسوں میں حاضر ہونے میں ناغہ نہ کیا تھا، لیکن ہمیشہ ایک پروقار خاموشی اور ایک عالی ظرفانہ آزاد طبعی قائم رکھی تھی۔ ایک گوشہ عزلت میں بیٹھ کر انہوں نے اپنا وقت زیادہ تر مطالعۂ کتب اور خانگی زندگی کے پر امن مشاغل میں گزارا تھا۔ جب انہیں عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کی دعوت دی گئی تو انہوں نے حسب عادت انتہائی سادگی سے بیعت قبول کی اور ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ اگر کوئی شخص منصب خلافت کا اُن سے زیادہ اہل ہو تو وہ بطیب خاطر اس کے حق میں سبکدوش ہو جائیں گے۔

سید یو (Sedillot) لکھتا ہے کہ ”اگر موروثی جانشینی کا اصول (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں) ابتدا ہی سے تسلیم کر لیا جاتا تو وہ مناقشہ انگیز دعوے جنہوں نے اسلام کی تاریخ کو مسلمانوں کے خون سے رنگین کر دیا پیدا نہ ہوتے...... فاطمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر کو وارثِ نبی کی حیثیت سے بھی اور انتخاب کی بناء پر بھی جانشین کا حق پہنچتا تھا۔ توقع کی جاسکتی تھی کہ ان کی عظمت و منزلت کے سامنے ہر کوئی سر تسلیم خم کر دے گا لیکن ایسا ہونا مقدر نہ تھا۔

”سب سے پہلے تو زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ انہیں امید تھی کہ انتخاب جمہور کا قرعہ اُن کے نام پڑے گا۔ اس میں انہیں جو ناکامی ہوئی اُس پر تازیانہ یہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں بصرہ اور کوفہ کا حاکم بنانے سے انکار کر دیا۔ اُن کی اعانت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بنت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کی، جنہوں نے سابق انتخابات میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ وہ بغاوت کی روحِ رواں تھیں اور خود اُونٹ پر سوار ہو کر لشکر کے ہمراہ میدانِ جنگ میں آئیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے چچیرے بھائی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عباس کو باغیوں کے پاس بھیجا تاکہ وہ اُنہیں ان کے فرائض دینی یاد دلا کر اُنہیں جنگ کے ذریعے فیصلہ کرانے سے باز رکھیں۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ زبیر رضی اللہ عنہ اور طلحہ رضی اللہ عنہ نے خریبہ کے

مقام پر خلیفہ کی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ اُنہیں شکست ہوئی اور وہ ایام جنگ میں مارے گئے[1]۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گرفتار ہوئیں، ان کے ساتھ مروت وعزت کا سلوک کیا گیا اور انہیں کمالِ احترام کے ساتھ مدینہ پہنچا دیا گیا۔ ابھی یہ بغاوت فرو ہی ہوئی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شام میں بغاوت کی خبر ملی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دوسرے رشتہ داروں کی طرح جنہیں انہوں نے صوبوں کے عمال مقرر کیا تھا، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس زر و مال کی مدد سے جو خلیفۂ سوم نے انہیں عطا کیا تھا اور جو انہوں نے شام کی حکومت کے دوران حاصل کیا تھا، پیشہ ور سپاہیوں کی ایک متعدبہ تعداد اپنے گرد جمع کر لی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اُن کے مشیروں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ جب تک وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے کے لیے کافی مضبوط نہ ہو جائیں اس وقت تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مامور کیے ہوئے حاکمانِ صوبجات کو برطرف نہ کریں۔ لیکن ''اسلام کے بایار (Bayard) 'بے خوف و بے عیب شجاع'' کو کسی قسم کی منافقت اور بے انصافی کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت گوارا نہ تھی۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جن جن لوگوں کو برسر اقتدار کیا تھا اور جو اس کے اہل ثابت نہ ہوئے تھے، اُن سب کی معزولی کے حکم جاری ہو گئے، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فی الفور کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ انہیں متعدد لڑائیوں میں جو صفین کے میدان میں لڑی گئیں شکست ہوئی۔ لڑائی کے آخری دن، جب ان کے سپاہی مالک الاشتر کے حملوں کی تاب نہ لا کر تتر بتر ہو رہے تھے، اُنہیں اپنے سپاہیوں کو تباہی سے بچانے کی ایک نئی ترکیب سوجھی۔ اُنہوں نے اپنے چند سپاہیوں کے نیزوں پر قرآن پاک بندھوا دیا اور وہ سپاہی نیزے بلند کر کے آگے بڑھے، بہ آواز بلند یہ کہتے ہوئے کہ ''مسلمانوں کے خون کو بہنے سے روک لو، اگر شام کی فوج تباہ ہو گئی تو مملکت کی سرحدوں کو رومیوں سے کون بچائے گا؟ اگر عراق کی فوج تباہ ہو گئی تو ترکوں اور ایرانیوں سے مملکت کی سرحدوں کو کون محفوظ رکھے گا؟ کلامِ الٰہی کو ہمارے درمیان فیصلہ کرنے دو۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ جو باغیوں کے سرغنے اور اس کے شریک سازش عمرو بن العاص کی سیرت سے خوب واقف تھے، اس چال کو سمجھ گئے اور

[1] اس مناسبت سے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس لڑائی میں اُونٹ پر سوار ہو کر شریک ہوئیں اس کا نام جنگ جمل رکھا گیا۔ جس مقام پر لڑی ہوئی اور جہاں زبیر وطلحہ مارے گئے اس کا نام وادی السبع ہے۔

انہوں نے اپنے ساتھیوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس دامِ تزویر سے بچنا چاہئے، لیکن اس کے باوجود سپاہیوں کی ایک کثیر جماعت نے لڑائی جاری رکھنے سے انکار کر دیا اور یہ مطالبہ کیا کہ تنازعے کا فیصلہ ثالثی کے ذریعے کرایا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُنہیں یقین دلانا چاہا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ محض اپنی جان بچانے کی خاطر قرآن پاک کو ایک حیلے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں لیکن ان لوگوں نے ایک نہ مانی، بلکہ رفاقت سے منحرف ہو جانے کی دھمکی دی۔ چنانچہ مالک الاشتر میدان سے واپس بلا لیے گئے، لڑائی بند کر دی گئی اور اس وقت تک کی فتح یابی سے جو کچھ حاصل ہوا تھا وہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے جاتا رہا[1]۔

ثالثی کا اہتمام کیا گیا۔ جن متعصب لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مجبور کیا تھا کہ عین اس وقت جب فتح قریب تھی تلواریں میان میں رکھ لیں اُنہی لوگوں نے انہیں اس پر مجبور کیا کہ اپنی رائے اور مرضی کے برخلاف حضرت ابوموسیٰ اشعری کو خانوادہ نبوی کا نمائندہ مقرر کریں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری اپنی سادگی کی وجہ سے اس قابل نہ تھے کہ عمرو بن العاص کی چالاکی و ہوشیاری کا مقابلہ کر سکتے، جو کہ خاندانِ معاویہ کے نمائندہ مقرر ہوئے۔ چنانچہ وہ عمرو بن العاص کی چال کا شکار ہو گئے۔ عمرو بن العاص نے اُن کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منصب خلافت سے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حاکمیتِ شام سے برطرفی اور کسی اور شخص کی خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے مسند نشینی ہی میں مسلمانوں کی بہتری تھی۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے منبر پر چڑھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سبکدوشی کا اعلان کر دیا۔ وہ یہ اعلان کر کے دل ہی دل میں اس احساس سے خوش کہ اُنہوں نے ایک بڑا نیک کام کیا ہے منبر پر سے اُترے۔ اُن کا اُترنا تھا کہ عمرو بن العاص مُسکراتے ہوئے منبر پر چڑھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی برطرفی کا فیصلہ قبول کر کے معاً امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے منصب خلافت پر تقرر کا اعلان کر دیا۔ بیچارے ابوموسیٰ اشعری ششدر رہ گئے۔ بہر حال، چونکہ جو چالبازی کی گئی تھی وہ بدیہی تھی فاطمیوں نے فیصلے کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ

---

[1] جن لوگوں نے خلیفہ کو ثالثی کے ذریعے فیصلہ کرانے پر مجبور کیا انہی لوگوں نے بعد میں اس فیصلے کو رد کر دیا اور ان کے خلاف اس بات پر بغاوت کر دی کہ انہوں نے کیوں اُن کا مطالبہ مانا تھا۔ یہ لوگ اولین خوارج تھے جنہوں نے آگے چل کر دنیائے اسلام میں بے انتہا فتنہ وفساد برپا کیا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

واقعہ دومتہ الجندل کے مقام پر ظہور میں آیا۔ بنو اُمیہ کی فریب کاری سے بنی فاطمہ بے حد برافروختہ ہوئے، چنانچہ دونوں فریق ایک دوسرے سے ہمیشہ کی نفرت کا عہد کر کے علیحدہ ہو گئے۔ تھوڑی ہی مدت بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کی ایک مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے شہید ہو گئے[1]۔ اُن کی شہادت سے فائدہ اٹھا کر امیر معاویہ نے شام اور حجاز دونوں میں اپنے آپ کو مضبوط کر لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات پر ان کے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو امن وسکون پسند تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خاندان کے دشمن سے صلح کر لی اور اور دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین ہو گئے، لیکن بنو اُمیہ کے بغض نے انہیں وہاں بھی چین سے نہ جینے نہ دیا۔ چنانچہ چند مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ اُنہیں زہر پلا کر شہید کر دیا گیا۔ اب ہند کے بیٹے کا ستارہ بلندی پر تھا اور ابوسفیان کے دل میں مکہ کا بادشاہ بننے کی جو تمنا تھی وہ اس کے بیٹے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس سے بھی شاندار پیمانے پر پوری کر دی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دو سب سے بڑے دشمنوں کا بیٹا یوں مسند خلافت پر متمکن ہوا۔ تقدیر کی اس سے بڑی بوالعجبی دنیا کی تاریخ میں درج نہیں۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے برسر اقتدار آتے ہی زمانہ جاہلیت کے عدیدی نظام نے اسلام کے جمہوری نظام حکومت کی جگہ لے لی۔ بے دینی اپنی تمام برائیاں لیے ہوئے عود کر آئی۔ اُموی حاکم اور شامی سپاہی جہاں کہیں جاتے تھے فسق و فجور کو اپنے جلو میں لے جاتے تھے۔ حجاز اور عراق غاصب کے پنجے میں کراہ رہے تھے، لیکن اس نے اسلام کا ٹینٹوا ایسی مضبوطی سے دبا رکھا تھا کہ اُس کا چھڑانا آسان نہ تھا۔ جو زر و مال وہ بے دردی کے ساتھ رعایا سے وصول کرتا تھا وہ سب اپنے بھاڑے کے سپاہیوں پر خرچ کر دیتا تھا، چنانچہ سپاہی شکایات کا گلا گھونٹ دیتے تھے۔ اپنی وفات سے پہلے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فوج کے عمائد کو جمع کیا اور ان سے اپنے بیٹے یزید کے حق میں حلفِ وفاداری اُٹھوایا، جسے

---

[1] اپنی امتیازی عالی ظرفی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے غدار دشمنوں کے خلاف جنگ میں بھی اپنے سپاہیوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ حملہ کرنے میں کبھی پہل نہ کریں، پناہ مانگنے والوں کو پناہ دیں، قیدیوں سے عزت کا سلوک کریں اور عورتوں کی بے حرمتی نہ کریں۔ اپنے دمِ واپسیں سے انہوں نے اپنے بیٹوں کو یہ وصیت کی کہ قاتل کو ایک ہی وار سے قتل کریں، اور اُسے کسی قسم کی غیر ضروری ایذا نہ پہنچائیں۔

انہوں نے اپنا جانشین نامزد کیا۔ یہ تھا لے دے کر یزید کا حق منصب خلافت پر!
یزید طبعاً جابر و ظالم تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ اپنی ستمرانیوں کو ملکی مصلحتوں کے بھیس میں چھپا سکے۔ اُس کی خبیث فطرت رحم و انصاف کے نام سے بھی آشنا نہ تھی۔ انسانوں کو قتل کرنا اور ایذا پہنچانا اس کے لیے محض ایک مشغلہ تفریح تھا۔ جیسا وہ خود بدترین عیوب کا پُتلا تھا، ویسے ہی اس کے ہم پیالہ و ہم نوالہ دونوں اصناف کے رذیل ترین افراد تھے۔ یہ تھا وہ شخص جو اپنے وقت کا خلیفہ اور امیر المومنین تھا!
حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دوسرے بیٹے امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کی ساری شجاعت اور نیکو کاری ورثے میں پائی تھی۔ محاصرۂ قسطنطنیہ میں انہوں نے بہادری اور جنگی مہارت کے جوہر دکھائے تھے۔ اُن کی ذات میں فرزندِ علی رضی اللہ عنہ کا حقِ وراثت اور نبیرۂ نبی کی مقدس شخصیت دونوں مجتمع تھیں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور امام حسن رضی اللہ عنہ کے درمیان جو معاہدہ صلح ہوا تھا اُس میں مسندِ خلافت پر اُن کا حق صراحتہً محفوظ رکھا گیا تھا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کے دعویٔ خلافت کو قبول نہ کیا تھا۔ چنانچہ جب مسلمین کوفہ نے اُن سے درخواست کی اُنہیں بنی اُمیہ کے قبضہ سے نجات دلائیں تو اُنہوں نے ان کی مدد کو اپنا فرض سمجھا۔ اہلِ کوفہ نے انہیں یقین دلایا کہ اُن کے آتے ہی سارا عراق غاصب کو تخت پر سے اُتارنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوگا۔ اس پر اعتماد کر کے وہ اہل و عیال کے ہمراہ عازم کوفہ ہوئے۔ اپنے بھائی عباس رضی اللہ عنہ، مٹھی بھر تابعین اور عورتوں اور بچوں کے ایک نہتے قافلے کو ساتھ لیے ہوئے وہ صحرائے عرب کو تو عبور کر گئے لیکن جب وہ سرحدِ عراق کے قریب پہنچے تو جس عام بغاوت کا وعدہ اُن سے اہلِ کوفہ نے کیا تھا اُنہیں اس کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے۔ اُن کے دل میں اندیشہ پیدا ہوا کہ بنو اُمیہ پھر ایک بار اپنے مرغوب حربے یعنی غداری سے کام لے رہے ہیں، چنانچہ انہوں نے دریائے فرات کے مغربی کنارے کے قریب مقام کربلا پر پڑاؤ ڈالا۔ اس مقام پر جو واقعات ظہور میں آئے تاریخ کا کوئی واقعہ دردناکی میں اُن کی سبقت نہیں لے جاتا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کے دل میں غداری کا جو اندیشہ تھا وہ صحیح ثابت ہوا۔ ایک اُموی لشکر نے، جس کی کمان شقی اور خونخوار عبید اللہ ابن زیاد کے ہاتھ میں تھی، اُنہیں گھیرے میں لے لیا، کئی دنوں تک اُن کے خیمے گھرے رہے۔ ان کمینے کتوں میں اتنی

جرات تو نہ تھی کہ میدان میں آ کر فرزندِ حیدر کی تلوار کا مقابلہ کرتے۔ انہوں نے بس اتنا کیا کہ لشکرِ حسین رضی اللہ عنہ پر دریا تک جانے کا راستہ بند کر دیا۔ اس بندش کی وجہ سے شہیدوں کے اس گروہ پر جو مصیبتیں گزریں وہ بیان سے باہر ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فوجِ یزیدی کے سردار کے سامنے تین باعزت شرائط پیش کیں۔ پہلی یہ کہ اُنہیں مدینے واپس جانے دیا جائے۔ دوسری یہ کہ ترکوں کے خلاف لڑنے کے لیے سرحد کی کسی چوکی پر بھیج دیا جائے۔ تیسری یہ کہ انہیں صحیح سالم یزید کے سامنے پیش کیا جائے۔ لیکن اُموی غاصب نے اپنے سپہ سالار کو کڑا اور اٹل حکم دے رکھا تھا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں پر کسی قسم کا رحم نہ کرے، بلکہ اُنہیں مجرموں کی حیثیت سے دربارِ خلافت میں حاضر کرے تا کہ اُموی عدل اُن سے جو سلوک روا رکھے وہ سلوک ان سے کیا جائے۔ آخر میں امام حسین رضی اللہ عنہ نے ظالم دشمنوں سے یہ درخواست کی کہ وہ بے بس عورتوں اور بچوں کو گزند نہ پہنچائیں بلکہ اُن کی جان لے کر جنگ کا خاتمہ کریں۔ لیکن ان ظالموں کو رحم چھو کر بھی نہ گیا تھا۔ جب وہ اس پر بھی راضی نہ ہوئے تو امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے رفیقوں کو تاکید کی کہ وقت کو غنیمت جان کر، بھاگ جائیں اور اپنی جان بچائیں لیکن اُن سب نے بہ یک آواز اپنے محبوب آقا کو چھوڑ کر چلے جانے یا اُن کے بعد زندہ رہنے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر دشمن کے ایک سردار کے دل میں نبیرہ نبی سے جنگ کرنے کے خیال سے خدا کا خوف آیا اور وہ اُن کی شہادت میں شریک ہونے کا تہیہ کر کے اپنے تیس آدمیوں کے ساتھ آ کر اُن سے مل گیا۔ جتنے دست بہ دست یا دو بدو مقابلے ہوئے اُن میں دشمنوں کے پاس اولادِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دلاوری کا کوئی جواب نہ تھا۔ چنانچہ دشمن کے تیراندازوں نے دُور ہی سے اُن پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی اور ایک ایک کر کے اُنہیں جامِ شہادت پلا

---

۱ صاحب روضۃ الصفا یہ شرائط بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ خدامِ حسین رضی اللہ عنہ میں سے ایک شخص نے جو مقتل کربلا سے اتفاقاً بچ نکلا، اس دعوے کو غلط بتایا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے اُموی سردار کے سامنے کسی قسم کی شرائط صلح پیش کیں۔ ممکن ہے کہ اس خادم نے یہ انکار یہ ظاہر کرنے کی خاطر کیا ہو کہ امام حسین رضی اللہ عنہ نے کوئی تجویز پیش کر کے اپنے آپ کو دشمن کے سامنے سبک سر نہیں کیا۔ لیکن میرے نزدیک صلح کی تجویز سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سیرتِ عالیہ کی کسی طرح کسرِ شان نہیں ہوتی۔

دیا۔ تا آں کہ رسولِ خدا ﷺ کا نواسا تنِ تنہا رہ گیا۔ زخموں سے چور اور جاں بلب، امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے چھلنی جسم کو گھسیٹتے ہوئے پانی کے ایک آخری گھونٹ کی خاطر دریا پر پہنچے۔ لیکن دشمنوں نے تیروں کی بارش کر کے انہیں وہاں سے پیاسا لوٹا دیا۔ اپنے خیمے میں داخل ہو کر انہوں نے اپنے شیر خوار بچے کو گود میں لیا۔ معاً ایک تیر بچے کے آ کر لگا اور وہ وہیں شہید ہو گیا۔ سید الشہداء نے رضائے الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا۔ اپنے بے رحم دشمنوں کے مقابلے کی مزید تاب اپنے میں نہ پا کر، بے یار و مددگار اور تھکے ماندے، وہ آ کر خیمے کے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک عورت نے ان کی پیاس بجھانے کے لیے انہیں پانی کا ایک پیالہ دیا۔ وہ پیالہ اٹھا کر ہونٹوں تک لے جانے نہ پائے تھے کہ ایک تیر آ کر ان کے منہ پر لگا۔ اُن کے فرزند اور بھتیجے اُن کی گود میں جنت کو سدھارے۔ اس وقت انہوں نے اپنے لہولہان ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور تمام لوگوں کے لیے دعائے مغفرت کی۔ اُس کے بعد وہ سر بکف ہو کر اُٹھے اور لشکرِ اُموی پر ٹوٹ پڑے۔ وہ جدھر جاتے دشمن پیچھے ہٹ جاتے لیکن خون کے بہہ جانے سے اُن پر اتنی نقاہت طاری ہو گئی تھی کہ وہ زمین پر گر پڑے۔ پھر کیا تھا؟ قاتلوں کی ایک ٹولی اُن پر ٹوٹ پڑی۔ ملعونوں نے سید الشہدا کا سر تن سے جدا کر دیا، اُن کے جسم کو پاؤں تلے لتاڑا اور ہند کی تقلید میں ہر ممکن طریقے سے اُس کی بے حرمتی کی۔ سر مبارک کو اُٹھا کر وہ کوفے کے قلعے میں لے گئے، جہاں انسانیت سے گرے ہوئے عبیداللہ بن زیاد نے اس مردہ سر کے منہ پر ایک بید مارا۔ ایک بوڑھا مسلمان چلا اُٹھا: "میں نے اپنی آنکھوں سے ان ہونٹوں پر رسولِ خدا ﷺ کے ہونٹ دیکھے ہیں"۔ گبن لکھتا ہے: "ایک بعید زمانے اور ملک میں حسینؓ کی شہادت کا جگر خراش واقعہ سرد مہر سے سرد مہر شخص کے دل میں بھی جذبۂ ہمدردی پیدا کرے گا" شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کی یاد میں ہر سال حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کی اولاد کے پیرو جو ماتم و شیون اور اظہارِ غم و غصہ کرتے ہیں، ہم اُس سے متفق ہوں یا نہ ہوں اس شہادت کی کیفیت سننے کے بعد اس کا سمجھنا ہمارے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

یوں رخصت ہوا اس دنیا سے اپنے زمانے کا ایک اشرف الشرفاء اور اس کے ساتھ اس کے خاندان کے سب افراد کیا بوڑھے اور کیا جوان، چل بسے، سوائے ایک

نحیف و نزار بچے کے، جسے امام حسین رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے قتل عام سے بچالیا۔ اس بچے کا نام دادا کے نام پر علی تھا اور وہ آگے چل کر زین العابدین کے لقب سے مشہور ہوا۔ امام زین العابدین ایران کے آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کی بیٹی کے بطن سے امام حسین رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے۔ اس طرح ان کی ذات خانوادہ محمدی کی آخری یادگار تھی۔ دوسری طرف وہ ماں کے وسیلے سے تختِ ساسانی کے آخری دعویدار تھے۔

امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد پر جو قیامت ٹوٹی اس سے عالمِ اسلام میں کہرام مچ گیا۔ اس کی بدولت عوام کے احساسات و جذبات میں جو انقلاب آیا اور وہ اسلام کے حق میں ایک آیۂ رحمت ثابت ہوا۔ بنی اُمیہ کے دربارِ دمشق سے فسق و فجور کا جو دھارا بہہ رہا تھا وہ بند ہوگیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عامتہ المسلمین کی خاطر جو کچھ کیا تھا اس کی یاد ان کے دلوں میں تازہ ہوگئی اور انہیں اس کا احساس ہوگیا کہ دشمنانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد اسلام کو کیسے کیسے نقصان پہنچا رہی تھی۔ بہر حال بنو اُمیہ نے تلوار اور زہر کی مدد سے ایک صدی تک حکومت کی۔ انہوں نے مدینے کو تاخت تاراج کر دیا اور انصار کی اولاد کو شہر بدر کر کے دور دراز ملکوں میں بھیج دیا۔ جس شہر نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو بت پرستوں کے مظالم سے پناہ دی تھی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبت تھی۔ جس کی خاک کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی کا شرف نصیب ہوا تھا، جس کے چپے چپے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق نے مہر تصدیق ثبت کی تھی، اس کی ہر مذموم طریقے سے بے حرمتی کی گئی۔ جن لوگوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر مصائب کا مقابلہ کیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کی عمارت کھڑی کرنے میں مدد دی تھی ان پر ایسے ایسے دہشت ناک اور انسانیت سوز مظالم توڑے گئے جن کی مثال یا تو فرانس کے کنسٹبل کے سپاہیوں یا روم کی تباہی کے موقع پر جارج فرنڈز برگ کے ماتحت لوتھر کے پیروؤں کی خون آشامیوں کے سوا کہیں نہیں ملتی۔ مرد چُن چُن کر تہِ تیغ کئے گئے، عورتوں کی عصمت دری کی گئی اور بچوں کو طوق غلامی پہنچا دیا گیا۔ جامع مسجد اصطبل بنا دی گئی۔ مقدس عمارتیں ڈھا دی گئیں اور ان کا ساز و سامان لوٹ لیا گیا خلافتِ اُموی کے زمانے میں شروع سے لے کر آخر تک مدینہ منورہ جنگلی جانوروں کا مسکن بنا رہا۔ مکہ میں کفر و شرک کو ازسرِ نو غلبہ حاصل ہوگیا۔ ڈوزی کا کہنا ہے کہ اس نے اسلام سے نہایت

دہشت انگیز اور گھناؤنا انتقام لیا۔ اسلام نے اپنی فتح و نصرت کی گھڑی میں اہل مکہ اور بنی اُمیہ سے جو رحم و عفو کا سلوک کیا تھا اس کا معاوضہ انہوں نے یہ دیا! بنی اُمیہ میں ایسے متعدد لوگ ہوئے ہیں جنہوں نے زہدہ تقویٰ میں امتیاز حاصل کیا۔ اُن کے سرفہرست حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام ہے، جنہیں عربوں کا مارکس آریلیس (Morcus Aurelius) کہنا چاہیے۔ وہ ایک مردِ متقی، ایک حاکمِ عادل اور ایک خدا ترس مسلمان تھے، جنہوں نے اپنی زندگی کو اپنے عظیم ہم نام کی زندگی کے سانچے میں ڈھالا۔ لیکن ان برگزیدہ لوگوں کو چھوڑ کر اُموی خلیفے کھلم کھلا، بلکہ بڑے فخر سے احکامِ دین کی خلاف ورزی کرتے تھے۔

اگر اُمویوں کی مفسدہ پردازی نہ ہوتی تو جو لوگ اہل بیت کے پیرو اور مسندِ خلافت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حقِ جانشینی کے حامی تھے اور جن لوگوں کو نظریہ یہ تھا کہ دینی قیادت اور دنیوی ریاست دونوں کے لیے عامتہ المسلمین کو انتخاب کا حق ہے اُن کے باہمی اختلافات اس حد تک نہ بڑھتے کہ تفرقے کی صورت اختیار کر لیتے بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مسند نشینی کے بعد خود بخود کوئی مصالحت یا مفاہمت ہو جاتی۔ اولادِ اُمیہ کے تشدد اور غداری نے ان اختلافات کے رفع ہونے کا امکان ہی مٹا دیا۔ چونکہ بنی اُمیہ خون کے دریا کی شناوری کر کے تختِ سلطنت تک پہنچے تھے، اس لیے اُن کے لیے ضروری تھا کہ اپنے منصب کو قانونی جواز کا لباس پہنائیں۔ چنانچہ وہ حقِ انتخاب کی بناء پر امیر المومنین کے لقب کے مدعی تھے، اگرچہ انتخاب خود اُن کے بھاڑے کے حامی اور اُن کے بے دین طرفدار ہی کرتے تھے۔ مدینے کی بربادی اور خانوادہ نبوی اور مہاجرین و انصار کے مارے جانے یا اطرافِ ملک میں بکھر جانے کے بعد خلافت راشدہ سے نظیریں سند میں پیش کرنا یا اگر ایسی نظیریں نہ ملیں تو انہیں تراش لینا آسان تھا۔ امیر المومنین کا لقب اختیار کر لینا بھی مشکل نہ تھا، جسے خلفائے راشدین چاہتے تو اختیار کر سکتے تھے لیکن جس سے انہوں نے احتراز کیا، اس لیے کہ وہ عامتہ المسلمین کے حقِ انتخاب کے مؤید تھے۔ جن عظیم الشان لوگوں نے جمہوریت کی بنیاد رکھی تھی وہ یا تو مر چکے تے یا مارے جا چکے تھے، اُن کے بچے یا تو دور دراز گوشوں میں پناہ گزیں تھے یا غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس لقب کے بارے میں، جو اتنی ہوشیاری سے اپنا لیا گیا تھا، سوال اٹھانے

والا اب کون تھا؟ بنو اُمیہ کے بعد جو خاندان برسرِ اقتدار آیا، اُس نے اُنھی کے مسلک کی تقلید کی۔ جس شدید حسد سے کام لے کر بنی اُمیہ اولادِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ستانے اور مٹانے کے درپے رہے وہی حسد آلِ نبی کے بارے میں بنی عباس کے رویے کا محرک تھا۔ خود بنی عباس کو خلافت پر کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ چنانچہ عوام کو اولادِ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے جو محبت تھی اُنہوں نے اُسے تختِ سلطنت پر متمکن ہونے کا وسیلہ بنایا اور جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے واس کا معاوضہ اُنہوں نے بنی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو انتہائی ظلم وستم کی صورت میں دیا۔ اُن کا قانونی حق بھی ایک قسم کے نام نہاد انتخاب پر مبنی تھا، اس لیے قدرتی طور پر انہوں نے بھی بنی اُمیہ کی طرح تمام ایسے لوگوں کو چُن چُن کر مارا جو اُن کے دعوے پر معترض تھے یا اس نظریے کے حامی تھے کہ منصب امامت سلسلۂ نبوی کا موروثی حق ہے۔ ہر قسم کے اختلافِ رائے کو جبراً دبا دیا گیا۔ یہاں تک کہ فقہائے عصر بھی اگر کوئی ایسی رائے ظاہر کرنے کی جرأت کرتے جو خلیفہ وقت کے نزدیک مقبول نہ تھی تو اُنہیں سزا دی جاتی۔ جن حالات میں بنی عباس کو غیر متوقع اور ناگہانی طور پر اقتدار حاصل ہوا اگر ہم اُن حالات کو نظر انداز کر دیں تو ہمیں اُن کا برسرِ اقتدار آنا ایک حیرت انگیز واقعہ معلوم ہوگا۔ بنی اُمیہ نے اولادِ فاطمہ رضی اللہ عنہا پر جو جگر خراش مظالم توڑے اُنہوں نے اور جس عالی ہمتی سے اولادِ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے مصائب کو برداشت کیا اس نے اس غاصبوں کے خلاف ایک عام جذبہ نفرت پیدا کر دیا تھا اور مظلوموں کو اپنے پیروؤں اور معتقدوں کی نگاہوں میں عظمت کے ایک نورانی ہالے سے مجلّی کر دیا تھا۔ جفا شعاری چاہے کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو ہمیشہ اپنے مقصد میں ناکام رہی ہے۔ وہ جس فرقے یا جماعت کے خلاف بھی عمل میں لائی گئی اُس کے ایمان یا عقیدے کو ختم نہیں کر سکی بلکہ اُسے اظہار کے نئے طریقے سکھاتی اور اُسے تقویت بخشتی رہی ہے۔ عیسائیت کی طرح اسلام میں بھی میدانِ جنگ کے خطرات کا سامنا کیا گیا اور یہ درد وکرب سہا گیا جس نے ایک مافوق العادۃ شان وشوکت عطا کر دی۔ چنانچہ بنی فاطمہ رضی اللہ عنہا، جو انسانوں کی بے انصافی کا تختہ مشق بن کر دنیا سے کنارہ کش اور علمی و دینی مشاغل میں منہمک ہو گئے تھے، ہتھیاروں خزانوں اور حشم وخدم کے بغیر لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے اور لشکروں کے سردار اور قصرِ سُلطانی کے

مکین خلیفہ کی بہ نسبت انہیں عوام کی بدر جہا زیادہ عزت حاصل تھی۔ اُمویوں کی ستم رانیاں حد سے تجاوز کر چکی تھیں اور لوگ اُن کے ہاتھوں سے نجات کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ ملک کے گوشے گوشے میں جعلی خلیفوں کی بدعنوانیوں اور بدنظمیوں نے یہ ولولہ انگیز تمنا پیدا کر دی تھی کہ آلِ رسول ﷺ کو اس کا حق مل جائے۔ لوگ بے تابی سے ائمہ اہل بیت کے اشارے کے منتظر تھے، لیکن یہ اہل اللہ دنیا سے رشتہ منقطع کر چکے تھے اور اُس کے کاموں سے اُنہیں کچھ سروکار نہ تھا۔ اُن کی مظلومیوں کا انتقام لینے کے لیے کئی جانباز اُٹھے تھے، لیکن اپنے شامی دشمنوں کی صف بستہ فوجوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئے تھے۔ لوگوں کو اس کا انتظار تھا کہ خدا کی طرف سے اُن کے جو رہبر مقرر ہوئے ہیں وہ اُنہیں بغاوت کا حکم دیں۔ لیکن ان ہادیانِ دین نے تشدد کی ممانعت کر دی تھی۔ ایسے میں کیا کیا جا سکتا تھا؟ اہل بیت میں سے چند افراد نے بزرگان خاندان کے مشورے کے برخلاف اور اُن کی رضامندی کے بغیر بنی اُمیہ کے خلاف ہتھیار اُٹھائے تھے، لیکن وہ سب اپنی اولوالعزمی اور اپنے دینی جوش کی قربان گاہ پر قربان ہو گئے تھے۔ اضطراب و بے اطمینانی کے اس لمحے میں، جب لوگ خاندانِ نبوی کی طرف سے کسی اشارے کے لیے چشم براہ تھے، بنو عباس منظر عام پر آئے۔ بنو عباس رسولِ خدا ﷺ چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد تھے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے دلی شغف سے اسلام کی خدمت کی تھی اور جب اہل مدینہ نے وہ حلف اُٹھایا جو ''بیعت النسا''[1] کے نام سے مشہور ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے، لیکن کسی مصلحت کی بناء پر انہوں نے فتح مکہ سے پہلے علانیہ طور پر اسلام قبول نہ کیا۔ پھر بھی رسول اللہ ﷺ اُن سے بڑی محبت اور مروّت کا سلوک کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس بارے میں آپ کی تقلید کرتے تھے۔ اگر عمِ رسول ﷺ کبھی اُنہیں راستہ میں پیادہ پا چلتے ہوئے مل جاتے تو وہ گھوڑے پر سے اُتر پڑتے اور اکثر اوقات اُن کے ساتھ چل کر اُنہیں گھر پہنچا آتے۔ ان کی وفات بعض روایات کے مطابق ۳۲ سنہ ہجری میں ہوئی اور بعض روایات کے مطابق ۲۴ سنہ ہجری میں۔ ان کے چار بیٹے تھے: عبداللہ

[1] بیعت النساء کو بیعتِ عقبہ اولیٰ بھی کہتے ہیں۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت عباس اس بیعت کے وقت نہیں بلکہ دوسری بیعتِ عقبہ (یعنی بیعت الحرب) کے وقت موجود تھے۔ (مترجم)

(ابو العباس عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ)، فضل، عبداللہ اور قثم حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ، جو تاریخ اور روایات میں ابن عباس کے نام سے مشہور ہیں، ۶۱۹ میں مکہ میں پیدا ہوئے، یعنی ہجرت سے تین سال پہلے۔ قرآن اور فقہ میں اُنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شاگردگی کا فخر حاصل ہوا۔ قرآن اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے فیصلوں کے علم اور تفسیر میں انہیں اتنی شہرت سے حاصل تھی کہ اُن کے خطبے سننے کے لیے اطراف مملکت سے لوگ جوق در جوق آتے۔ وہ ہفتے میں ایک دن تفسیر قرآن کا، دوسرے دن فقہ کا، تیسرے دن صرف ونحو کا، چوتھے دن تاریخِ اعراب کا اور پانچویں دن شعروشاعری کا درس دیتے۔ قرآن کی مشکل الفہم عبارتوں کی تشریح وہ اکثر قدیم شعرائے عرب کے کلام سے مثالیں پیش کر کے کیا کرتے تھے۔ اس کی بدولت ادب جاہلیت کے مطالعے اور تحفظ کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ وہ اکثر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ، جب کبھی تمہیں قرآن کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آئے تو اس کا حل شعرائے عرب کے کلام میں ڈھونڈو، کیونکہ وہ عرب قوم کا صحیفہ ہے[1]۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور اُن کے بھائیوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو عقیدت تھی وہ ضرب المثل تھی چاروں بھائی جنگِ جمل میں شریک ہوئے اور جنگِ صفین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جو ایک عالم متبحر ہونے کے علاوہ فن حرب کے بھی ماہر تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سوار فوج کی قیادت کی۔ متعدد موقعوں پر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سفیر بنا کر بھیجے گئے۔ جب سرکش سپاہیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس پر مجبور کر دیا کہ ان کے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جو تنازعہ تھا اس کا فیصلہ تحکیم سے کرائیں تو اُن کی یہ خواہش تھی کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خانوادہ محمدی کا نمائندہ مقرر کریں۔ عباس رضی اللہ عنہ نے امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اُن کے غم میں گھل کر ۶۷ سنہ ہجری میں، جب کہ اُن کی عمر ستر سال کی تھی، طائف کے مقام پر وفات پائی۔ اُن کے بیٹے علی کو بھی باپ کی طرح اولادِ فاطمہ سے والہانہ محبت تھی۔ اُن کی وفات ۱۱۷ ہجری میں ہوئی اور اُن کے بیٹے اُن کی جگہ خاندان کے سربراہ بنے۔

بنی اُمیہ کے مظالم سب سے زیادہ ایران، عراق اور حجاز نے سہے تھے۔ چنانچہ

---

[1] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ انہوں نے اتنا وسیع علم کیونکر حاصل کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ 'پوچھنے والی زبان اور سمجھنے والے دل کی مدد سے۔''

اس وقت اُن ملکوں میں بہت سی خفیہ جماعتیں اُن کا تختہ اُلٹنے کی تدبیریں کرنے میں مصروف تھیں۔ ان جماعتوں میں سب سے زیادہ سرگرم بنی عباس تھے، اوّل اوّل تو غالباً اس لیے کہ وہ خلوصِ دل سے بنی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اُن کا حق دلوانے کے خواہش مند تھے، لیکن بعد میں اپنے ذاتی مفادات کی خاطر۔ محمد ابن علی ابن عبداللہ پہلے شخص تھے جن کے دل میں خود خلیفہ بننے کا خیال پیدا ہوا۔ وہ بڑے قابل اور دور کی سوچنے والے آدمی تھے۔ بظاہر تو وہ فاطمیوں کی خاطر سرگرم کار رہے، لیکن در پردہ انہوں نے ایک نیا نظریہ ایجاد کیا۔ وہ یہ تھا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اسلام کی روحانی قیادت اُن کے پسماندہ بیٹے علی رضی اللہ عنہ (زین العابدین) کے حصے میں نہیں بلکہ محمد ابن الحنفیہ کے حصے میں آئی، جو قبیلۂ حنفیہ کی ایک خاتون کے بطن سے تھیں (جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں آئیں) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور محمد ابن الحنفیہ کی وفات کے بعد یہ میراث اُن کے بیٹے ہاشم کو ملی، جنہوں نے اُسے باقاعدہ طور پر محمد عباسی کو بخش دیا۔ اس دعوے پر بعض لوگوں کو اعتماد تھا، لیکن عوام کو، جنہیں اہل بیت سے پختہ عقیدت تھی عباسیوں کے داعیوں نے اسی خیال میں رکھا کہ وہ اہلِ بیت کی خاطر مصروف کار تھے۔ اب تک عباسیوں نے اہلِ بیت سے محبت کا دم بھرا تھا اور اپنی تمام کارروائیوں اور منصوبوں کو یوں لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا کہ جیسے ان کا مقصد اولادِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اس کا حق دلانا ہے۔ ان دعووں کے پردوں میں جو غداری چھپی ہوئی تھی۔ اہلِ بیت کے نمائندوں اور حامیوں کو ان کا سان گمان بھی نہ تھا، چنانچہ انہوں نے محمد بن علی اور اُن کے رفیقوں کی کارروائیوں کی تائید کر کے انہیں وہ سندِ اعتبار بخش دی جس کی اُنہیں بے حد ضرورت تھی۔ ایرانیوں کی فاطمیوں کی کامیابی سے جو وابستگی تھی اس کے اسباب تاریخی اور قومی روابط تھے۔ فاطمی یزدگرد کی بیٹی کی وساطت سے تختِ ایران کے وارث تھے۔ تبلیغ اسلام کے آغاز ہی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان ایرانیوں کے ساتھ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا انتہائی مروت اور دوست داری کا سلوک کیا تھا۔ حضرت سلمان فارسی، جن کا شمار ممتاز ترین صحابۂ نبی میں ہوتا ہے۔ مدتوں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ندیم و رفیق رہے۔ جنگ قادسیہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دستور تھا کہ مالِ غنیمت کا جو حصہ اُنہیں ملتا ہوا سے قیدیوں

کو رہائی دلوانے پر خرچ کرتے، بلکہ اُنہوں نے حضرت عمر کو بھی ہمیشہ یہی مشورہ دیا کہ رعایا پر محاصل کے بوجھ ہلکے کریں۔ ان احسانوں کے بدلے میں ایرانیوں کے لیے حب اہل بیت ایک قدرتی بات تھی۔ محمد بن علی نے اس سے فائدہ اُٹھایا اور ایرانیوں کو یہ یقین دلا کر کہ اُنہیں عربوں کے ظلم وستم سے رہائی ملنے ہی والی تھی، اپنا گرویدہ بنالیا۔ خراسان، فارس اور ایران کے دوسرے صوبوں میں جو یمنی آباد تھے اُنہیں بھی اہل بیت سے اُتنی ہی محبت تھی اور ان کے سینوں میں نئے مظالم نے اپنے قدیم دشمنوں یعنی بنی مضر کے خلاف نفرت کی آگ اور بھی بھڑکا دی تھی۔ محمد بن علی نے اُنہیں یہ بتایا کہ وہ جو کچھ کر رہے تھے آلِ رسول ﷺ کی خاطر کر رہے تھے۔ وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے فوجی قائد ابو مسلم کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے، جو اب تک اولادِ علی کے پرجوش طرف داروں میں تھا۔ محمد بن علی نے اپنی وفات سے پہلے، جو ۱۲۵ سنہ ہجری میں واقع ہوئی، اپنے دو بیٹوں، یعنی ابراہیم عبداللہ ابو العباس (ملقب بہ سفاح) اور عبداللہ ابو جعفر (ملقب بہ المنصور) کو یکے بعد دیگرے اپنا جانشین نامزد کیا۔

آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں یمنیوں اور مضریوں کے درمیان خراسان میں جو شدید جنگ چھڑی اُس سے فائدہ اٹھا کر عباسیوں نے اس بارود بھری سرنگ کو جو وہ ایک مدت سے تیار کر رہے تھے آگ لگا دی۔ ابو مسلم نے خراسان کے ہر شہر اور گاؤں میں اپنے طرف داروں کو علم بغاوت بلند کرنے کا حکم دے دیا، جس مقصد کا اعلان کیا گیا وہ یہ تھا کہ اہل بیت کو غاصب بنی اُمیہ سے اپنا حق واپس دلوایا جائے۔ تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ امام علی زین العابدینؒ کے پوتے یحییٰ نے بغاوت کی تھی۔ وہ شہید ہوگئے تھے اور ان کی لاش اُموی خلیفہ مروان کے حکم سے پھانسی پر لٹکا دی گئی تھی۔ ابو مسلم نے حکم دیا کہ جواں مرگ علوی سردار کی لاش کو پھانسی پر سے اُتار لیا جائے اور عزت اور احترام کے ساتھ اس کی تجہیز وتکفین کی جائے۔ ابو مسلم کے متبعین امام یحییٰ کے سوگ میں اور اپنے عزمِ انتقام کی علامت کے طور پر سیاہ پوش ہوگئے۔ چنانچہ اُس دن سے سیاہ لباس عباسیوں کے حامیوں کا امتیازی نشان بن گیا اور جب غاصبوں کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کی عام دعوت دی گئی تو مقررہ مقام پر سیاہ پوشوں کا جو جم غفیر جمع ہوا اور اُس کا عینی ثبوت

تھا کہ بغاوت کس زور و شور سے اور کتنی دور تک پھیل گئی تھی۔ اجتماع ۱۲۷ ہجری میں رمضان کی پچیسویں تاریخ کو ہونا قرار پایا تھا اور لوگوں کو بلانے کی نشانی یہ تھی کہ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر بڑے بڑے الاؤ جلا دیئے جائیں گے۔ چنانچہ صوبے کے گوشے گوشے سے خلقت کے ہجوم آ کر مرو پر ٹوٹ پڑے، جہاں اُس وقت ابو مسلم کا قیام تھا۔ خلیفہ مروان نے ابراہیم کو جو محمد بن علی کی موت کے بعد عباسیوں کے سربراہ تھے، گرفتار کروا کر مروا ڈالا۔ لیکن محمد بن علی نے مرنے سے پہلے اپنے چھوٹے بھائی ابو العباس کو ایک تحریر بھجوا دی جس میں انہوں نے اپنے باپ کی وصیت کے مطابق خاندان کی سربراہی انہیں سونپ دی۔ ابو مسلم نے تھوڑے ہی عرصے میں سارے خراسان پر قبضہ کر لیا اور اپنی فتح مند فوج کے ہمراہ عراق کی طرف کوچ کر دیا۔ اس تحریک کا جو اصلی مقصد تھا وہ ابھی تک لوگوں پر واضح نہ کیا گیا تھا۔ سیاہ جھنڈے کے نیچے مختلف طبقوں کے جو لوگ جمع ہوئے وہ سب اہل بیت کے نام پر میدان میں آئے تھے۔ کوفہ نے فوراً اطاعت قبول کر لی۔ ابو مسلم کا نائب حسن ابن قحطبہ اپنی فوج لیے شہر میں داخل ہوا۔ ابو سلمہ جعفر ابن سلیمان الخلال بھی، جو صاحب روضۃ الصفاء کے قول کے مطابق آلِ محمد کا وزیر نامزد کیا گیا تھا، فوراً آ پہنچا۔ بظاہر یہ شخص خانوادہ نبوی کے سربراہ کا نمائندہ تھا۔ عباسی قائدِ لشکر نے اُس کی بڑی آؤ بھگت کی، اُس کے ہاتھ چوم کر اُسے عزت کی جگہ بٹھایا اور اُسے بتایا کہ ابو مسلم نے ہر معاملے میں اُس کی اطاعت کی تاکید کی تھی۔ ابو سلمہ اس خوشامد سے پھولا نہ سمایا۔ لیکن وہ اب تک عباسیوں کے اصلی منصوبے سے قطعاً ناواقف تھا۔ ابو سلمہ اور حسن ابن قحطبہ کے مشترک ناموں پر ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں باشندگانِ کوفہ کو دوسرے دن جامع مسجد میں جمع ہونے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ لوگ کسی اہم اعلان کی توقع دل میں لیے جامع مسجد میں جوق در جوق جمع ہوئے۔ بہرحال منصوبہ ابھی پختہ نہ ہوا تھا، اس لیے حسن اور دوسرے عباسیوں نے اس وقت اپنے اصلی مقصد کا افشا مناسب نہ سمجھا۔ دریں اثناء ابو العباس اور اس کا بھائی ابو جعفر دونوں اُموی پہرہ داروں کی نظر بچا کر کوفہ میں وارد ہو چکے تھے۔ وہاں وہ مزید واقعات کے انتظار میں چھپے بیٹھے رہے، ابو سلمہ ابھی تک اپنے اصلی آقاؤں کا خیر خواہ تھا۔ چنانچہ اس نے امام جعفر صادق کو خفیہ پیغام بھیجا کہ

وہ آ کر اپنا حق وصول کریں۔ امام جعفر صادق عراقیوں کے نامہ و پیام کی حقیقت سے خوب واقف تھے۔ اُنہوں نے لفافہ کھولے بغیر خط کو جلا دیا۔ لیکن ابو سلمہ اُن کے جواب کا انتظار کیے بغیر ابو العباس کو خلیفہ قبول کر چکا تھا۔ اُس نے اہل بیت کے نام پر لوگوں کو اگلے دن، جو جمعہ کا دن تھا، خلیفہ کے انتخاب کے لیے جمع ہونے کی دعوتِ عام دی۔ اُس دن کوفہ ایک عجیب و غریب منظر پیش کر رہا تھا۔ لوگوں کے انبوہ بنی عباس کا سیاہ لباس پہنے ہوئے وہ اعلان سننے کی خاطر جس کا اُنہیں مدتوں سے انتظار تھا، ہر طرف سے جامع مسجد کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ابو سلمہ سیاہ ماتمی لباس پہنے ہوئے لوگوں کے سامنے آیا۔ اُس کے رفقائے کار کے سوا کسی کو اس کا علم نہ تھا کہ اس نے کیونکر اپنے ایمان کو عباسیوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ اُسے اپنے آقا کے مفاد کے مقابلے میں اپنی جان عزیز تھی۔ نماز کی امامت کرنے کے بعد اُس نے لوگوں کو وہ مقصد بتایا جس کی خاطر اس نے انہیں جمع ہونے کی دعوت دی تھی۔ اُس نے کہا: ''لوگو، ابو مسلم دین کا محافظ اور اہل بیت کا مؤید ہے۔ اُس نے ظالم بنی اُمیہ کا قلع قمع کر دیا ہے۔ اب ضروری ہے کہ امام اور خلیفہ کا انتخاب کیا جائے۔ زُہد و تقویٰ، قابلیت اور دوسرے تمام اوصاف کے لحاظ سے جو اس منصب کے لیے لازمی ہیں، ابو العباس سے بڑھ کر کوئی اس کے لیے موزوں نہیں۔ میں آپ کو اُسکے انتخاب کی دعوت دیتا ہوں۔'' اس وقت تک ابو سلمہ اور عباسیوں کو بالیقین معلوم نہ تھا کہ اس اعلان کا لوگوں پر کیا اثر ہوگا۔ اُنہیں خوف تھا کہ اُنہوں نے خاندان علوی سے جو غداری کی تھی اور تو اور کہیں اہلِ کوفہ بھی اُسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھیں لیکن عراقیوں نے اپنی ضرب المثل متلون المزاجی کا مزید ثبوت بہم پہنچا دیا۔ انہوں نے بار بار بنی فاطمہ کی حمایت میں ہتھیار اُٹھائے تھے اور ہر بار اُن لوگوں سے دغا کی تھی جن کی مدد کا انہوں نے وعدہ کیا تھا یا جن سے انہوں نے مدد مانگی تھی۔ وقتی جذبات کی رو میں بہہ کر اُنہوں نے بسا اوقات حامیانِ حق کی حیثیت سے غداری کی تھی۔ واقعہ کربلا کے بعد اُنہیں اتنی پشیمانی ہوئی تھی کہ ان میں سے بیس ہزار لوگ رات بھر امام حسین رضی اللہ عنہ کے روضے پر مغفرت کی دعائیں مانگنے کے بعد یزید کی صف در صف فوجوں پر پل پڑے تھے۔ لیکن ان کی پشیمانی دیر تک قائم نہ رہی۔ وہ ایسے متلون الطبع، شورہ پشت، بیوفا اور ناقابل اعتبار

تھے کہ صرف تازیانہ الٰہی حجاج بن یوسف ہی انہیں قابو میں رکھ سکا۔ اس موقعہ پر ابوسلمہ کے منہ سے ابوالعباس کے انتخاب کے بارے میں الفاظ نکلے ہی تھے کہ سب نے نعرہ تکبیر بلند کر کے انتخاب کو قبول کر لیا۔ ابوالعباس جہاں روپوش تھا وہاں سے اُسے لانے کے لیے ایک ہرکارہ جلدی جلدی بھیجا گیا۔ ابوالعباس کا مسجد میں داخل ہونا تھا کہ لوگ اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے دیوانہ وار ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے چنانچہ انتخاب مکمل ہوگیا۔ ابوالعباس نے منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا اور مسلمانوں کا امام و خلیفہ بن گیا۔ یوں بنی فاطمہ کی ہردلعزیزی کے کندھے پر سوار ہو کر بنی عباس تخت خلافت پر متمکن ہوئے۔ اس کا معاوضہ انہوں نے بنی فاطمہ کو اُلٹا دیا۔ دنیوی اقتدار کی ہوس بڑائی حاصل کرنے کی خواہشوں میں سب سے بڑی خواہش ہے۔ انسان کے جذباتی تقاضوں کے کسی اور مظاہرے نے نوع انسانی پر اتنے مصائب نازل نہیں کئے جتنے اس نے کئے ہیں۔ یہ ہوس اپنے مقصود کے حاصل کرنے میں اچھے اور بے وسائل کے درمیان تمیز نہیں کرتی وہ اپنے منصوبوں کو چھپانے کے لیے جرائم سے کام لیتی ہے اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے اُنہیں نیکی کے بھیس میں پیش کرتی ہے اور تو اور اس نے مذہب کا بھیس بدل کر دنیا کو بڑی دہشت ناک مصیبتوں کا مورد بنایا ہے۔ روم کے پاپاؤں نے اپنے دنیوی اقتدار کو قائم رکھنے کی ان تھک کوششوں کی بدولت مہذب دنیا کو انسانی خون کے سیلاب میں غرق کر دیا۔ اسلام کے پیشواؤں، یعنی عباسیوں، مصری فاطمیوں اور اُمویوں نے دینی و دنیوی اختیار اعلیٰ کے اُن ابلہ فریبانہ دعووں کو جو اُن کے خوشامدیوں نے تراشے، بڑے ذوق شوق سے اپنا لیا اور رعایا کی مکمل اطاعت حاصل کرنے کی آرزو میں عالم اسلام کو خونیں کش مکشوں کا ہنگامہ زار بنا دیا۔

اوّلین عباسی خلفاء بڑی قابلیت، دور اندیشی اور سیاسی تدبر والے لوگ تھے

جس وقت اہل کوفہ کے آوازہ قبولیت نے اُنہیں مسندِ خلافت پر بٹھایا اُسی وقت سے اُنہوں نے اپنی تمام قوتیں اس پر مرکوز کر دیں کہ تمام روحانی اور سیاسی اختیارات پر مضبوطی سے قابض ہو جائیں اور اس نظریئے کو کہ انتخاب عام کا قاعدہ عین حکم الٰہی کے مطابق ہے، ایک منطقی معقولیت اور ٹھوس پن بخشیں۔ حق وراثت کی بنا پر خلافت کی جانشینی

کے اصول کا انعقاد اور انتخاب جمہور کو یوں پیش کرنا جیسے وہ ایک مقدس فریضہ ہو، اب ایک نہایت ضروری کام بن گیا۔

یوں بظاہر[1] تو سفاح کے عہدِ حکومت میں ابومسلم سے لحاظ و مدارات کا سلوک کیا گیا، لیکن چونکہ اُس کا میلانِ طبع اعلانیہ فاطمیوں کے حق میں تھا اس لیے اُس سے در پردہ نفرت کی جاتی تھی اور اُسے شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ سفاح کے جانشین کے زمانے میں اس پر الحاد کا الزام لگایا گیا اور اُسے زندیق کا لقب دے کر قتل کر دیا گیا۔ خاندانِ نبوی کے ممتاز افراد کو، جو نیک و پاک زندگیاں بسر کرتے تھے، جمہور مسلمین کے دلوں میں جو انتہائی احترام حاصل تھا اُس کی بناء پر عباسی اُن سے حسد کرتے تھے۔ اس حسد کی وجہ سے انہوں نے وقتاً فوقتاً اولادِ فاطمہ کو سخت تکلیفیں پہنچائیں۔ ہارون نے برامکہ کو جو اس کی سلطنت کے رُکن رکین تھے اور جن کی بدولت اُس نے شہرت پائی، صرف اس لیے تباہ کر دیا کہ اُسے اُن پر فاطمیوں سے مل کر سازش کرنے کا شبہ تھا۔ یہ صورتِ حالات عبداللہ المامون کے دورِ حکومت تک برقرار رہی۔ مامون نے، جو عباسی خلفاء میں سب سے شریف النفس خلیفہ تھا، تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی فاطمیوں کو اُن کے واجب حقوق دینے کا عہد کر لیا۔ چنانچہ اُس نے علی ابن موسیٰ رضا کو، جو فاطمیوں کے آٹھویں امام تھے، اپنا ولی عہد نامزد کیا اور اُن سے اپنی بیٹی اُم الفضل کی شادی کر دی۔ اس نے عباسیوں کا سیاہ لباس ترک کر کے سبز رنگ کا لباس اختیار کیا، جو فاطمیوں کے جھنڈے کا رنگ تھا[2]۔ مامون نے بنی فاطمہ سے جو مروت کا سلوک کیا وہ اس کے بعد کے دو خلفاء معتصم اور واثق نے جاری رکھا۔ لیکن متوکل کی تخت نشینی کے ساتھ ہی فاطمیوں پر ستم طرازی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور جب تک اُس کی پانزدہ سالہ مدتِ حکومت، جو بدترین سیاہ کاری، اور جفا شعاری کی مدت تھی، ختم نہ ہوئی اُس وقت تک قائم رہا جب متوکل کا بیٹا منتصر گدی پر بیٹھا

---

[1] "سفاح" کے معنی ہیں خونخوار۔ ابو العباس عبداللہ کو یہ لقب اس لیے ملا کہ وہ اپنے مخالفوں کو تہ تیغ کرنے سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ اس کے اخلاف میں سے ایک کو (یعنی معتضد باللہ کو) سفاح ثانی کا خطاب دیا گیا۔ یہی خطاب عثمانی شہنشاہ سلیم اوّل کو ملا۔

[2] فاطمیوں نے آنحضرت ﷺ کے مرغوب سبز رنگ کو اختیار کیا، بنی اُمیہ نے سفید رنگ کو اور بنی عباس نے سیاہ رنگ کو۔

تو اس نے پہلا کام کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امام حسین رضی اللہ عنہ کے مزاروں کی مرمت کرائی جنہیں متوکل نے مسمار کرادیا تھا اور اس کے باپ نے ان کے مقدس ناموں کو جو بے حرمتی کی تھی اس کی ہر طرح تلافی کی۔ اس خلیفہ کے تدبر کی تقلید اُس کے بعد کے خلفاء نے کی۔ چنانچہ اُس کے بعد شیعانِ علی سے کسی نہ کسی حد تک رواداری کا سلوک کیا جانے لگا۔ ۳۳۴ سنہ ہجری (۹۴۵) میں آل بویہ کا بادشاہ معزالدولہ دیلمی بغداد میں قصرِ خلافت کا مہتمم مقرر ہوا۔ وہ آل فاطمہ کا والہ وشیدا تھا۔ چنانچہ اُس نے عباسی خلیفہ مطیع اللہ کو معزول کر کے اہل بیت میں سے کسی کو اس کی جگہ تخت پر بٹھانے کا منصوبہ سوچا، لیکن اُسے مصلحت وقت کے خلاف پا کر اُسے عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ معزالدولہ نے امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل بیت کی شہادت کی یاد میں یومِ عاشورہ منانے کا قاعدہ بھی رائج کیا ۶۴۵ سن ہجری (۱۲۴۷) میں، جب کہ مستعصم باللہ خلیفہ تھا، شیعوں پر ایک نئی قیامت ٹوٹی، جس کے عواقب اسلامی تہذیب کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے اور جس نے سارے مغربی ایشیا میں بربادی پھیلا دی۔ اپنے متعصب حواریوں کے فتنہ پردازانہ مشوروں پر عمل کر کے اس ضعیف العقل خلیفہ نے تمام شیعہ مردوں کے قتل عام کا فرمان جاری کر دیا۔ اس فرمان میں اس نے سُنیوں کو اس کی اجازت بھی دے دی کہ وہ شیعوں کے مال و اسباب کو لوٹ لیں، اُن کے گھروں کو منہدم کر دیں، اُن کے کھیتوں کو جلا دیں اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیں۔ اس ظلم کی پاداش میں چنگیز کا پوتا ہلاکو قہر الٰہی بن کر بغداد پر نازل ہوا۔ مسلسل تین دنوں تک تاتاری سردار نے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ تیسرے دن بنی عباس کا سینتیسواں خلیفہ انتہائی ذلت کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارا گیا اور یوں خاندانِ عباسی کا خاتمہ ہوا[1]

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد تک اہل بیت[2] نے کوئی امتیازی لقب اختیار نہ کیا۔ وہ

---

[1] بنی عباس میں سے ایک شخص فرار ہو کر مصر چلا گیا۔ چنانچہ عباسیوں کی خلافت برائے نام وہاں قائم رہی تا آں کہ عثمانی سلطان سلیم نے آخری عباسی خلیفہ کو اپنے حق میں دست بردار ہونے پر مجبور کیا۔

[2] اہلِ بیت (اہل بیت النبی) اس نام سے عموماً حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کی اولاد اخلاف کو یاد کیا جاتا ہے۔ ابن خلدون نے ہر جگہ اُنہیں اور اُن کے متبعین و معتقدین یعنی شیعوں کا ذکر اسی نام سے کیا ہے۔ آلِ محمد ﷺ کی لوگوں کے دلوں میں جو قدر و منزلت ہے، سنائی نے اُس کا اظہار ذیل کے شعر میں کیا ہے:

جز کتاب اللہ و عترت ز احمدِ مُرسل نماند　　یادگاری کو تواں تا روزِ محشر داشتن

صرف بنو ہاشم کہلاتے تھے۔ بنی فاطمہ اور بنو عباس ایک دوسرے سے متمائز نہ تھے۔ اُن کے درمیان خون کے قریبی رشتے تھے۔ امیر معاویہ کے حصول اقتدار کے بعد خاندانِ محمدی کے پیروؤں نے اپنے آپ کو شیعہ (پیرو) اور اپنے دشمنوں کو نواصب (باغی) اور خوارج[1] (باہر جانے والے) کہنا شروع کر دیا۔ بنی اُمیہ اپنے آپ کو اموی کہتے تھے۔ اس وقت تک اہل السنّت والجماعت کا نام ایجاد نہ ہوا تھا۔ یہ منصور اور ہارون کے زمانے میں وجود میں آیا۔ دسویں عیسوی میں علوی خاندان کے ایک رُکن نے عباسیوں سے مصر کی حکومت چھینی اور ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی جس نے سلطان صلاح الدین کے خروج تک مصر اور شام پر حکومت کی۔ وہ تبرے جو بغداد اور قاہرہ کے خلیفے ایک دوسرے پر بھیجتے تھے، وہ طومار در طومار روائتیں جو ان دونوں خاندانوں کے متضاد دعووں کی تکذیب کے لیے کرید کرید کر نکالی گئیں اور وہ فتوے جو ان دونوں کے علماء نے صادر کئے ان سب نے مل کر ان حریف خاندانوں کے حامیوں اور طرف داروں کی باہمی کش مکش کو اور بھی بڑھا دیا۔ سلطان صلاح الدین نے مصر میں فاطمی خاندان کی حکومت کا تختہ اُلٹا اور مشرقی افریقہ میں سُنی مذہب کو از سرِ نو غلبہ بخشا۔ لیکن بنی فاطمہ کی متعدد شاخیں دونوں براعظموں کے مختلف حصوں میں اپنے خاندان کا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوئیں[2] صرف اثناعشریہ، جو تارک الدنیا اور ولی صفت اماموں کے متبعین ہیں جنہوں نے طاقت کے استعمال کی ممانعت کی اور صرف روحانی امامت کا دعویٰ کیا، دنیاوی معاملات سے بالکل کنارہ کش رہے۔ اُن کا یہ رویہ اس وقت بدلا جب شاہ عباس صفوی نے مذہب اثناعشری کو اپنی مملکت کا سرکاری مذہب بنایا[3]۔ اس فلسفی مزاج اور صوفی منش بادشاہ نے' جو خاندان نبوی سے تعلق رکھتا تھا، یہ محسوس کیا کہ

---

[1] خوارج کا نام خاص طور پر اُن لشکریوں کو دیا گیا جنہوں نے دومتہ الجندل کے میدان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ دیا اور اسلام کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا۔ بعد میں یہ نام اُن لوگوں کو دیا جانے لگا جنہوں نے اصلی خوارج کے فاسد عقیدے اختیار کئے (اس اجمال کی تفصیل آگے چل کر دی جائے گی۔)

[2] فاطمیان مصر کے علاوہ بنی فاطمہ کی دوسری شاخوں نے امیر، امام، شریف، خلیفہ وغیرہ کے لقب سے اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں حکومت کی ہے، مثلاً مکہ میں اُخیضر، بنی موسیٰ اور بنی قتادہ شمالی یمن میں بنی طبا طبا، جنوبی یمن میں بنی زیاد اور مراکش میں بنی ادریس۔

لوگوں کو اس خاندان سے جو محبت و عقیدت تھی اسے قومی بیداری اور استحکام کا ایک وسیلہ بنانا چاہئے۔ چنانچہ اثنا عشریت آج تک ایران کا سرکاری مذہب ہے۔

جنوبی ہند کے بہمنی اور عادل شاہی خاندان، جنہیں اورنگ زیب نے ملیامیٹ کیا اور اس طرح اُن مرہٹہ لٹیروں کا راستہ ہموار کیا جنہیں بہمنی بادشاہوں نے سر نہ اُٹھانے دیا تھا، ائمہ اہلِ بیت کے متبعین تھے۔ یہ ہے فاطمی خاندان کی سیاسی سرگزشت جس کے جلی نقوش اس کے مذہبی نظریات پر مرتسم دکھائی دیتے ہیں۔

اسلام کی دینی و دنیوی پیشوائی بنی عباس کا جو دعویٰ تھا اس کی اساس تھی بیعت، جو ایک قسم کا نام نہاد انتخاب تھی۔ سفاح کی تخت نشینی سے شروع کر کے عباسی خلفا نے ہمیشہ یہ احتیاط برتی تھی کہ اپنی زندگی ہی میں اپنے جانشینوں کے حق میں اکابر ملت سے حلف اطاعت اُٹھالیا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ لازمی ہوگیا کہ انتخاب کے نظریے کو متقدمین کی مثالوں کی سند عطا کی جائے۔ اُدھر مصر میں فاطمیوں کے خروج نے اور خلفائے بغداد سے مشرقی علاقوں کی حکومت چھیننے کی جو مستقبل کوششیں وہ کررہے تھے انہوں نے یہ اور بھی ضروری بنا دیا کہ آلِ فاطمہ کے دعووں کی تکذیب کی جائے اور ان نظریوں کو جن کے مطابق عباسی خلفاء اسلام کی روحانی پیشوائی کے حق دار تھے ایک مربوط و منظم شکل دی جائے[1]۔

عباسیوں کے حق خلافت کی تائید کرنے والی روایات عراق و حجاز کے گوشے گوشے میں تلاش کی گئیں۔ علمائے فقہ کو حکم دیا گیا کہ صحت عقیدہ کے اصول باضابطہ طور پر

---

[1] ارسلان البساسیری نے، جو عباسی فوج کا ایک اعلیٰ عہدیدار لیکن مصری فاطمیوں کا حامی تھا۔ بغداد کے خلیفہ قائم بامر اللہ کو شہر سے نکال دیا اور اسے اس پر مجبور کیا کہ امیر العرب (یہ ایران کے ایل خانی کے مماثل ایک خطاب تھا) کے یہاں جا کر پناہ گزین ہو۔ بالآخر الپ ارسلان کے باپ طغرل نے، جو سلجوقی خاندان کا بانی تھا، خلیفہ کو واپس لا کر دوبارہ تخت پر بٹھایا۔ خلیفہ کی غیر حاضری کے دوران بغداد میں فاطمی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔ خطبہ وہ وعظ ہے۔ جو مسلم ملکوں کی جامع مسجدوں میں جمعہ کے دن منبر پر سے دیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز اسمائے الٰہی کے ذکر، وحدت اللہ کے اقرار اور رسولِ خدا ﷺ، آلِ رسول ﷺ اور جانشینانِ رسول ﷺ کے حق میں درود سے ہوتا ہے۔ اُس کے بعد خلیفہ وقت اور سربراہ مملکت کے حق میں دُعا کی جاتی ہے۔ خطبے میں مذکور ہونا اور اپنے نام کا سکہ جاری کرنا۔ یہ ہیں وہ سب سے بڑے حقوق جو بادشاہِ وقت کو حاصل ہوتے ہیں اور جن کی بدولت اس کی حکمرانی قانوناً مسلم ہوتی ہے۔

اور صریح الفاظ میں وضع کریں۔ چنانچہ اس طرح سنی مذہب کا مہتم بالشان ڈھانچا کھڑا کرنے میں دیگر عوامل کے علاوہ عباسیوں کے ذاتی مفادات بھی کسی حد تک بروئے کار آئے جن علماء وفقہاء نے سُنی مذہب کی نشوونما میں مدد دی۔ ان کی کامیابی میں مصری فاطمیوں کے بعض افکار کو بھی دخل تھا۔ ایک تو یہ امر کہ مصری فاطمیوں کے عقائد شیعہ اماموں اور سنی فقیہوں دونوں کی تعلیمات سے متبائن تھے، دوسرے حسن بن صباح (شیخ الجبال) کے حکم سے بہترین اشخاص کے جو قتل واقع ہوئے تیسرے وہ ملحدانہ خیالات جو قدیم کلدانی مجوسیت (Chaldaeo Magism) کے زیرِ اثر مختلف طبقوں میں رائج ہو گئے، اور جو مخربِ اسلام تھے...... ان سب نے مل کر اس نظامِ عقائد کو تقویت دی جو عامۃ المسلمین کی نگاہوں میں دشمنانِ اسلام کی یورشوں کے خلاف ایک سدِ سکندری تھا۔ شیعہ اماموں نے مانی و مزدک کے مضرِ دین اور اشتراکیت پرور خیالات کی پرزور تردید کی، لیکن ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ لادینیت کا سر کچل سکتے یا وحدتِ فکر نافذ کر سکتے۔ سُنی مذہب کو عباسی خلفاء کی دنیاوی طاقت کے بل بوتے پر اس کی توفیق تھی اور اس نے اس سے کام لیا۔ نتیجۃً اُسے ایسے تمام لوگوں کی نگاہوں میں مقبولیت حاصل ہوئی جو توارث خلافت کے مجرد مسئلے کے بارے میں اپنا سر نہ کھپاتے تھے۔

جو لوگ اہلِ بیت کے موروثی حق خلافت کے حامی تھے اور جو لوگ اس خیال کے تھے کہ جمہور کو اپنے دینی و دنیوی پیشواؤں کے انتخاب کا حق ہے، ان دونوں میں بنی عباس کے خروج تک اتنا کم فرق تھا کہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ حجاز کے لوگ اور بالخصوص انصارِ مدینہ، جنہیں اُمویوں نے اس بے دردی سے تباہ کیا، یوں تو انتخاب کے اصول پر مُصر تھے، لیکن اُنہیں وہ ناانصافی بہت شاق گزری تھی جو آلِ فاطمہ سے کی گئی تھی۔ شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد اسلام کے سینے سے واویلے کی صدا اٹھی تھی۔ چنانچہ دونوں مقدس شہروں کے لوگ اسلحہ بند ہو کر غاصب کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، جس کی اُنہوں نے بڑی سخت سزا بھگتی تھی۔ اہل بیت کے طرف داروں نے بھی اور پہلے خلفائے ثلاثہ کے پیروؤں نے بھی دین کے تحفظ کی بڑی شدید اذیتیں سہی تھیں۔ لیکن جب خاندانی مفادات کی خاطر دونوں جماعتوں کے درمیان ایک خلیج حائل کرنا ضروری ہو گیا تو

دونوں طرف تفریق کے عناصر آسانی سے مہیا ہو گئے۔ ان میں جو نظریاتی اور قانونی اختلافات تھے، انہوں نے اس وقت وہ صورت اور وہ شدت اختیار کرنی شروع کر دی جو زمانۂ حال میں پائی جاتی ہے۔

مامون کے عہد میں اور اس کے فوراً بعد جو دو خلفاء آئے اُن کے عہد میں، جب کہ انسانیت نواز علوم اور فلسفے نے ہر طبقے کے افکار کو متاثر کر دیا تھا، سُنی مذہب کی نشو و نما میں رخنہ پڑ گیا۔ ان عہدوں کو چھوڑ کر خلافتِ عباسیہ کی ساری مدت سُنی مذہب کے عقائد کی تقویت و استحکام پر صرف ہوئی۔ دین و دنیا کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا گیا: خلیفہ امام بھی تھا، یعنی دنیوی سربراہ بھی اور دینی پیشوا بھی، قانون و فقہ کے علماء سب اس کے ملازم تھے۔ وہ اُن کے مباحثوں کی صدارت اور اُن کے فیصلوں کی ہدایت کرتا تھا۔ یہ ہے راز سُنی مذہب کی سالمیت کا۔ جن فرقوں میں وہ ابتداء منقسم تھا اُن میں سے اکثر رفتہ رفتہ معدوم ہو گئے ہیں، لیکن اب بھی اس کے چار بڑے بڑے فرقے ہیں جو عقائد اور رسومِ عبادت کے بہت سے معاملوں میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اُن میں جو اختلاف ہیں اُنہیں اُن اختلافات سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو رومن کیتھولک کلیسا اور مقلد یونانی، آرمینائی اور شامی کلیساؤں میں پائے جاتے ہیں۔

اس کے برخلاف شیعیت میں دین اور مملکت ایک دوسرے سے منقطع ہو گئے ہیں اور شارحینِ قانون نے، کم از کم ایک طبقے میں، وہی اقتدار و اختیار حاصل کر لیا ہے جو عیسائیت میں کلیسائی منصب داروں کو حاصل ہے، چنانچہ جس طرح پروٹسٹنٹ مذہب میں آزادیٔ رائے نے ایک سو اسی فرقے پیدا کر دیئے ہیں، اُسی طرح اس نے شیعوں کو لاتعداد فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ شیعہ مذہب میں نظریات عقائد کا جو تنوع پایا جاتا ہے وہ اس امر کا نتیجہ ہے کہ کوئی مختارِ کل سیاسی طاقت ایسی نہ تھی جو بزورِ شمشیر وحدت و یکسانی عائد کرتی۔

امامت[1]، یعنی اُمت مسلمہ کی دینی قیادت، کا مسئلہ اس عہد کے بعد جس کا اہم

---

[1] ڈاکٹر پرسی بیجر (Dr. Percy Badger) نے لفظ ''امامت'' کی بڑی عمدہ تعریف کی ہے۔ لفظِ امام ایک عربی مادّے سے ماخوذ ہے جس سے عبارت ہے مقصود بنانا، تقلید کرنا۔ اس مادّے کے جتنے مشتقات ہیں اُن میں سے اکثر میں یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ''امام'' کا بنیادی مطلب ہے مثال پیش کرنے والا، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

نے ابھی ابھی ذکر کیا سُنّیوں اور شیعوں کے درمیان سب سے بڑا مابہ النزاع[ا] بن گیا۔"
شیعوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی روحانی وراثت کو اُن کی اولاد کو ملی۔ چنانچہ وہ اس نظریے کی تردید کرتے ہیں کہ جماعت کو اہل بیت النبی کے جائز حقوق نظر انداز کر خلیفہ منتخب کرنے کا حق ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کہ شیعوں کے نزدیک امامت کا سلسلہ پشت بہ پشت خاندانِ نبوی میں چلتا ہے۔ آلِ نبی سے ہونے کے علاوہ امام کے لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۲) وہ جس کی مثال کی تقلید کی جانی چاہیے ان معنوں میں اس کا اطلاق حضرت محمد ﷺ پر ہوتا ہے، اس اعتبار سے کہ وہ سیاسی اور دینی معاملات میں مسلمانوں کے ہادی و رہنما تھے۔ اسی طرح اس کا اطلاق خلفاء پر بھی ہتا ہے۔ اس حیثیت سے کہ وہ دین و دنیا دونوں میں پیغمبر اسلام ﷺ کے جائز جانشین اور قائم مقام تھے۔ خاصۃً مذہبی معنوں میں یہ لفظ مسلمانوں کے چار مقلد طبقوں، یعنی حنفیوں، شافعیوں، مالکیوں اور حنبلیوں کے مجتہدوں کے بارے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ محدود معنوں میں یہ لفظ اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو مسجد میں نماز پڑھاتا ہے۔ یہ منصب عموماً ایسے لوگوں کو دیا جاتا ہے جو اتقاء کی شہرت رکھتے ہوں۔ یہ لوگ ناظر کے حکم سے برطرف کیے جا سکتے ہیں اور اس صورت میں نہ صرف اپنے منصب اور مشاہرے سے البتہ لقب "امام" سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔"

امام کی اصطلاح قرآن میں کسی قوم کی کتاب یا صحیفے کے معنوں میں بھی استعمال کی گئی ہے اور کسی معلم دین کے بارے میں بھی۔ قیاس چاہتا ہے کہ مسلمانوں نے اسے موخر الذکر معنوں میں قرآن ہی سے اخذ کیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے چند کلمات کہہ کر ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا اور ابراہیمؑ اس آزمائش میں پورا اُترا تو اللہ نے فرمایا: "میں نے تجھے قوم کا امام بنا دیا۔" ایک اور جگہ ابراہیم علیہ السلام، اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کے ذکر کے ضمن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ہم نے اُنہیں امام بنایا تاکہ وہ ہمارے حکم کے مطابق دوسروں کی ہدایت کریں۔" مزید "ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی۔ پس اس بارے میں شک نہ کرو کہ اسے کتاب ملی، اور ہم نے حکم دیا کہ یہ کتاب بنی اسرائیل کے لیے صحیفۂ ہدایت ہو اور ہم نے اُن میں سے بعضوں کو امام مقرر کیا، تاکہ وہ ہمارے ارشاد کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کریں......" ٹیجر کی کتاب "عمان کے ائمہ وسادات"

ا مسعودی لکھتا ہے: "امامت کا مسئلہ مختلف فرقوں کے درمیان بحث و تکرار کا موضوع ہے بالخصوص القائلون بالنص (تقرر کے معتقدین) اور اصحاب الاختیار (نظریہ انتخاب کے حامیوں) کے درمیان نظریہ تقرر کے حامی امامیہ یا اہل الامامۃ کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ علی ابن ابی طالب اور فاطمہ کے بطن سے اُن کے جو بچے ہوئے اُن کے شیعیان (تابعین) کا ایک طبقہ ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں ایک ایسا شخص مبعوث کیا ہے جو دینِ حق کی حفاظت اور ملت کی امامت کرتا ہے۔ ایسے اشخاص یا نبی ہوتے ہیں یا نبیوں کے وصی۔ نظریہ انتخاب کے حامی ہیں خوارج کا ایک فرقہ، مرجیہ، اہل السنۃ والجماعۃ، بعض معتزلہ اور زیدیوں کا ایک فرقہ۔ ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق اللہ اور رسول کا منشا یہ ہے کہ قوم خود اپنے میں سے ایک آدمی کو چنے اور اُسے اپنا امام بنائے، کیونکہ ایسے زمانے بھی ہوتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کوئی وصی نہیں بھیجتا۔ شیعوں کے نزدیک اس طرح مقرر کیے ہوئے اشخاص منصب امامت کے غاصب ہوتے ہیں۔" مروج الذہب

ضروری ہے کہ وہ چند اوصاف کا مالک ہو۔ وہ اوصاف یہ ہیں کہ وہ معصوم یعنی بعید از گناہ ہو۔ اس کی سیرت بالکل بے داغ ہو اور وہ صدق و صفا میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز ہو۔ اُن کے خیال میں نہ یہ مناسب ہے اور نہ منشائے ربی ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا شخص جس کی سیرت الزام سے بالاتر نہیں لوگوں کے ضمیر کا رہنما بنے۔ انسانی انتخاب غلط ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے، لوگوں نے بسا اوقات بدترین افراد کی سربراہی قبول کی ہے۔ انسان کی مذہبی ضروریات کے معاملے میں ناممکن ہے کہ خدا نے اسے اس کی ناقص عقل کے رحم پر چھوڑ دیا ہو۔ اگر امام کی ضرورت ہو تو وہ کوئی ایسا شخص ہونا چاہئے جسے انسانی ضمیر قبول کرتا ہے۔ ان دلائل کی بناء پر اہل تشیع کہتے ہیں کہ اگر امام کا انتخاب عوام کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے تو ملت کے اخلاق کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ لہٰذا نوع انسانی کی روحانی ہدایت مبعوث من اللہ اشخاص کو سونپی گئی ہے[1]

سُنیوں کا عقیدہ ہے کہ امامتِ آل نبی تک محدود نہیں۔ نیز یہ لازمی نہیں کہ امام عادل، متقی اور معصوم ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ افضل الناس، یعنی اپنے وقت کا بہترین شخص ہو۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ وہ آزاد، بالغ اور صحیح الحواس ہو اور مملکت کے معمولی امور کے انصرام کی قابلیت رکھتا ہو۔ جس شخص میں بھی یہ صفات موجود ہوں وہ

---

[1] اس ضمن میں ہم ابن خلدون سے جس میں اُتنی ہی ژرف نگاہی تھی جتنی ہمہ دانی تھی، چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ ''نہ بادشاہ کی ذاتی وجاہت، نہ اُس کی علمی فضیلت، نہ اس کی ذکاوت و فراست، اور نہ اس کے کوئی اور ذاتی کمالات رعایا کے حق میں مفید ثابت ہوتے ہیں...... بادشاہ کا وظیفۂ منصبی محض اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کو ترقی دینا ہے۔'''' ایک حکمران کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ انسانوں کے لیے ایک جگہ مل جل کر رہنا ضروری ہے۔ اگر معاشرے کے نظام کو قائم رکھنے والا کوئی نہ ہو تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ ایک دنیاوی حاکم صرف انسان کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل درآمد کراتا ہے۔ لیکن ایک ملہم من اللہ شارع کے بنائے ہوئے قوانین دو قسم کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہیں، یعنی نوع انسانی کی اخلاقی و معاشرتی صلاح و فلاح۔ خلیفہ نبی کا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے۔ وہ محض ایک دنیاوی حاکم ہی نہیں ہوتا، بلکہ روحانی قائد بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا خلیفہ کو امام کا لقب دیا جاتا ہے۔ ملت کے نقطۂ نگاہ سے اس کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو نمازیوں کی ایک جماعت کے نقطۂ نگاہ سے امام نماز کی ہوتی ہے''...... ''امام کا تقرر ایک فریضہ ہے۔ وہ قانون جس کی رو سے لازمی قرار پایا یا صحابۂ نبی کے اجماع پر مبنی ہے۔ امام رُوحانی پیشوا اور خلیفہ یا سُلطان دنیاوی طاقت کا نمائندہ ہوتا ہے۔''

منصب خلافت کے لیے منتخب ہونے کا اہل ہے۔ اُن کا ایک اور نظریہ، جس میں وہ کلیسائے روم سے متفق الرائے ہیں، اسلامی دنیا کے لیے بڑے اہم نتائج کا سرچشمہ ثابت ہوا۔ وہ نظریہ یہ ہے کہ نہ امام کی بدکرداری اور نہ اس کی ستم شعاری اس کی معزولی کا جواز مہیا کرتی ہے[1]، جس طرح کہ امام نماز کی بدی یا کج روی مقتدی مومنوں کی نماز کو باطل نہیں کر دیتی[2]۔ سنیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ امامت ناقابلِ تقسیم ہے اور بیک وقت دو اماموں کا ہونا قانوناً ناممکن ہے۔ جس طرح عیسائیت میں ایک ہی پوپ کی اطاعت جائز ہے۔ اسی طرح اسلام میں صرف ایک خلیفہ کی بیعت ہو سکتی ہے۔ لیکن جس طرح بسا اوقات تین تین پوپ بہ یک وقت کلاہ پاپائی کے مدعی رہے ہیں، اسی طرح تین تین امراء المسلمین نے بھی بہ یک وقت حاکمیت اعلیٰ کا دعویٰ کیا ہے۔ جب ایشیا میں بنو اُمیہ کو زوال آ گیا تو اُس خاندان کے ایک فرد نے ہسپانیہ میں ایک خود مختار حکومت قائم کی اور اُسی زمانے میں بنو عباس دجلہ کے کناروں پر اور بنی فاطمہ نیل کے کناروں پر حکمران تھے۔ اس امر کی بناء پر کہ مختلف زمانوں میں دو یا تین حکمرانوں نے بہ یک وقت خلیفۃ المسلمین کا لقب اختیار کیا ہے یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ خلافت کے لاتجزیٰ ہونے کے اصول کا اطلاق صرف ایک ملک پر یا دو متصل ملکوں پر ہوتا ہے۔ لیکن جب دو ملک ایک دوسرے سے اس قدر دور ہوں کہ ایک ملک کے امام کا اختیار دوسرے ملک پر عائد نہیں ہو سکتا تو دوسرے امام کا انتخاب بھی جائز قرار دیا جاتا ہے۔ امام تمام مسلمانوں کا مربی و ناظم اور

---

[1] اس نظریے کے باوجود، جو اُن جابر خلیفوں کے حکم پر ایجاد کیا گیا جو اپنے ظلم وستم کی مکافات سے محفوظ رہنا چاہتے تھے، لوگوں نے اسے بالکلیہ منظور نہیں کیا۔ اُموی خلیفہ ولید کے عہد میں (جسے سیاہ کاریوں کی بناء پر فاسق کا خطاب دیا گیا۔) رعایا نے بغاوت کر دی اور اُسے تخت سے برطرف کر دیا۔ اسی طرح جب عباسی خلیفہ متوکل کی زیادتیاں حدِ برداشت سے تجاوز کر گئیں تو خود اس کے بیٹے منتصر نے اُسے معزول کر ڈالا۔ عثمانی ترکوں کی تاریخ میں بھی اُس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے کسی ظالم یا نااہل سلطان کے خلاف بغاوت کی۔ اس قسم کا آخری واقعہ ناشاد و نامراد عبدالعزیز کے زمانے میں ہوا۔

[2] اس نظریے کے خلاف اس وقت اہل سنت والجماعت میں بغاوت پھیلی ہوئی ہے۔ غیر مقلدین (جن سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے) یہ رائے رکھتے ہیں کہ اگر امام متقی اور پاکباز نہ ہو تو جماعت کی نماز فسخ ہو جاتی ہے۔

دنیا و عقبیٰ میں اُن کی فلاح کا محافظ ہوتا ہے۔ اُسے یہ اختیار ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی رضا مندی سے اپنا جانشین نامزد کرے۔ مسلمانوں کی رضا مندی اس لیے ضروری سمجھی جاتی ہے کہ خلیفہ کا منصب اُن کی دینی و دنیوی بھلائی کے لیے ہے۔

توقع کی جا سکتی تھی کہ شیعوں پر جو مشکلیں پڑیں وہ اُنہیں متحد رکھیں گی۔ لیکن اگرچہ سب شیعوں کا اس پر اتفاق تھا کہ منصب خلافت سلسلۂ نبوی تک محدود ہے، اُن میں سے بعض خاندانِ نبوی کے مسلم بزرگوں سے روگرداں ہو کر عمداً یا میلاناً اس خاندان کے دوسرے افراد سے وابستہ ہو گئے۔ مسلم امام اور اُن کے متبعین تو گوشہ اعتکاف میں جاگزیں رہے، اور اہل بیت ایک طرف تو دشمنوں سے برسر پیکار رہے اور دوسری طرف خانہ جنگیوں میں مشغول رہے۔ وہ وعظ بھی دیتے رہے، مباحثے اور مناظرے بھی کرتے رہے اور تکلیفیں بھی سہتے رہے۔

شہرستانی نے شیعوں کو پانچ قوتوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی زیدیہ، اسمٰعیلیہ' اثنا عشریہ یا امامیہ، کیسانیہ اور غالیہ یا غلاۃ۔ لیکن فی الواقعہ، جیسا کہ ہم بعد میں واضح کریں گے، ان فرقوں میں اور بالخصوص اُن شاخوں میں جن میں وہ منقسم ہو گئے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک مبالغہ آمیز محبت کے سوا خالص تشیع کی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ اس کے برعکس وہ فی الاصل غیر اسلامی ہیں۔

زیدیوں کی بابت شہرستانی کہتا ہے کہ وہ زید بن علی زین العابدین ابن حسین کے پیرو ہیں۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ امامت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے شروع ہو کر پہلے امام حسن رضی اللہ عنہ کو، پھر امام حسین رضی اللہ عنہ کو، پھر علی ثانی امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کو ملی۔ زین العابدین رضی اللہ عنہ کے بعد ہو محمد الباقر کو نہیں ملی، جیسا کہ اثنا عشریہ بلکہ مسلمانوں کی اکثریت کا عقیدہ ہے، بلکہ زید کو۔ خلافت کے بارے میں زیدی بڑی حد تک اہلِ سنت سے مشابہ ہیں۔ اُن کے خیال میں عوام کو یہ حق ہے کہ وہ خانوادۂ نبوی میں سے کسی کو اپنا روحانی پیشوا انتخاب کریں۔ چنانچہ اُنہوں نے انتخاب کے اصول کو اور اس اصول کو کہ امامت اہلِ بیت نبوی تک محدود ہے۔ جمع کر دیا ہے۔ اُن کا یہ خیال بھی ہے کہ افضل کی موجودگی میں مفضول کا انتخاب جائز ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں

سب سے برگزیدہ تھے اور حق وراثت کی بناء پر بھی اور اپنے ذاتی اوصاف کی بنا پر بھی امامت کے مستحق تھے، لیکن ملکی مصلحتوں کے پیشِ نظر اور اُن شورشوں کو فرو کرنے کی خاطر جو پیغمبرﷺ کے وصال پر برپا ہوئیں ایک زیادہ پختہ عمر کے آدمی کا منصب خلافت پر مامور ہونا ضروری تھا تاکہ وہ لوگوں کو اطمینان دلا سکے اور ان کے اختلافات کو رفع کر سکے۔ علاوہ بریں حضرت علی رضی اللہ عنہ حفاظتِ دین کی خاطر جس جہاد میں مشغول رہے تھے اُس کی وجہ سے اُن لوگوں کے سینے میں جنہوں نے مسلمانوں سے لڑائیاں لڑی تھیں اور جنہیں مسخر ہوئے زیادہ مدت نہ گزری تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف شدید جذبہ انتقام تھا۔ اس امر کا احتمال تھا کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صولت کے آگے بھی آسانی سے نہ جھکتے۔ یہی دلیل وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے جواز میں پیش کرتے ہیں۔ پہلے دو خلیفوں کی امامت کو تسلیم کرنے کی بناء پر زیدیوں کو دوسرے شیعوں نے روافض کا لقب دیا، جس کے معنی ہیں اختلافات کرنے والے۔ زیدیوں کا ایک اور عقیدہ اتنا اہم ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ پرہیزگاری، صداقت، علمی فضیلت اور معصومیت کے جن اوصاف کا خالص شیعوں کے نزدیک امام میں موجود ہونا ضروری ہے اُن کے علاوہ اس میں شجاعت اور اپنا حق بزورِ شمشیر منوانے کی صلاحیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ امام محمد الباقر نے، جو اپنے باپ حضرت علی ثانی کے جانشین بنے، قوت کے استعمال کو مذموم قرار دیا۔ امام زید اس معاملے میں اُن سے مختلف الرائے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے ہشام ابن عبدالمالک اموی کے خلاف بغاوت کی اور ناکام رہ کر جوار کوفہ میں شہید ہوئے۔ اُن کے جانشین اُن کے بیٹے یحییٰ بنے۔ جنہوں نے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر امام جعفر صادق کے مشورے کے خلاف اپنا دعویٰ اسلحہ بندانہ طاقت سے منوانے کی کوشش اور خراسان میں ایک لشکر جمع کر لیا، لیکن اُنہیں شکست ہوئی اور وہ ہشام کے ایک سردار فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

امام یحییٰ کی وفات پر زیدیوں کے عقیدے کے مطابق، امامت اُن کے خاندان کے ایک اور فرد کو ملی، یعنی محمد بن عبداللہ النفس الذکیہ) کو، جنہوں نے مہدی کا لقب اختیار کیا اور خلیفۂ عباسی منصور کے خلاف حجاز میں علم بغاوت بلند کیا۔ انہوں نے مدینے

میں منصور کے بھتیجے عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں زک اُٹھائی اور شہادت پائی۔ اُن کے بعد اُن کے بھائی ابراہیم امام بنے۔ انہوں نے بھی عباسیوں سے جنگ آزمائی کر کے جام شہادت پیا۔ اُن کے تیسرے بھائی عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنا دعویٰ بزورِ شمشیر منوانا چاہا، لیکن گرفتار ہوئے اور منصور کے حکم سے عمر بھر کی قید میں ڈال دیئے گئے۔ یہ واقعات بیان کرنے کے بعد شہرستانی لکھتا ہے۔ ''ان پر جو اُفتادی پڑی اُس کی پیش گوئی جعفر صادق نے کی تھی، جنہوں نے یہ کہا تھا کہ دنیوی اقتدار اُن کے خاندان کا حصہ نہ تھا، بلکہ امامت کا عباسیوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بننا مقدر تھا۔''

زیدیہ کی ایک شاخ کا یہ عقیدہ ہے کہ امامت ابراہیم سے ادریس کو ملی، جنہوں نے مغرب الاقصیٰ اور شہر فس کے خاندانِ ادریسی کی بنیاد رکھی۔ ادریسیوں کے زوال کے بعد زیدیوں کا شیرازہ بکھ گیا لیکن اب بھی اس فرقے کے نام لیوا ایشیا اور افریقہ کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ زیدیوں کی ایک شاخ نے ایک طویل مدت تک طبرستان میں حکومت کی اور شمالی یمن میں اب بھی ایک زیدی امام ہے۔ شہرستانی کے کہنے کے مطابق زیدیہ کے چار ذیلی فرقے تھے، یعنی جارودیہ، سلیمانیہ، طبریہ اور صالحیہ۔ اُن میں جو اختلاف ہے وہ اس بارے میں ہے کہ حضرت زید کے بعد امامت کس کو ملی۔ جارودیہ، جو عیسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں محمد نفس الذکیہ کے حامی تھے۔ منصور کے عہد میں سخت تکلیفیں اُٹھائیں۔ سلیمانیہ اپنے بانی سلیمان ابن جوہر کے نام سے موسوم ہیں، جنہوں نے یہ اعلان کیا کہ امامت کا دارومدار جماع ملت پر ہے۔ ''امامت سے یہ مقصود نہیں کہ دین کی تنظیم کی جائے خدا، خدا کی وحدت اور جو قوانین خدا نے دنیوی حکومت کے لیے بنائے ہیں اُن کا علم حاصل کیا جائے، کیونکہ یہ چیزیں تو عقل کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ امامت کا مقصد ہے روئے زمین پر حکومت کرنا مجرموں کو سزائیں دینا، عدل کرنا اور مملکت کا تحفظ کرنا۔ امام کے لیے افضل ہونا لازمی نہیں۔'''' اہل سُنت کے ایک فرقے کی رائے اس سے مماثل ہے۔ اس فرقے کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ امام عالم مجتہد ہو، صرف اتنا ضروری ہے کہ وہ صاحب فہم ہو اور اُس کا کوئی ایسا مشیر ہو جو قوانین شریعت کی تشریح کرنے کا اہل ہو۔'' سلیمانیہ اور صالحیہ پہلے دو

خلیفوں کے تسلیم کرنے کے بارے میں ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ موخر الذکر کی رائے ہے کہ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں اپنے فائق دعوے سے دستبردار ہو گئے اس لیے لوگوں کو یہ حق نہیں کہ اُن کی امامت کے بارے میں سوال اُٹھائیں۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں اُنہیں شک ہے۔ وہ کہتے ہیں "جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح بنی اُمیہ کی مدد حاصل کرنے کے لیے جتن کئے، تو ہم اُنہیں دوسرے صحابہ سے مختلف پاتے ہیں۔"

اسمٰعیلیہ، جنہیں کبھی کبھی سابعون[1] بھی کہا جاتا ہے امام جعفر صادق کے بیٹے امام اسمٰعیل سے منسوب ہیں، جنہوں نے اپنے باپ کی زندگی ہی میں وفات پائی۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ کہ امام جعفر صادق کی وفات پر امامت اسمٰعیل کے بیٹے محمد المکتوم[2] کے حصے میں آئی، نہ کہ جعفر کے بیٹے موسیٰ الکاظم کے حصے میں، جیسا کہ اثنا عشریہ اور عموماً دوسرے مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ اسماعیلیوں کے خیال کے مطابق محمد المکتوم کے جانشین جعفر المصدق تھے، جن کے بیٹے محمد الحبیب آخری امام مکتوم تھے۔

امام محمد الحبیب کے بیٹے ابو محمد عبداللہ نے فاطمی خاندان کی بنا ڈالی، جس نے تین صدیوں تک شمالی افریقہ پر حکومت کی۔ اُنہیں عباسی خلیفہ معتضد باللہ سفاح ثانی نے قید میں ڈال دیا تھا، لیکن اُنہوں نے سجلماسہ کے زیرز میں زندان سے نکل کر بربری میں خروج کیا۔ جہاں اُنہوں نے عبیداللہ اور مہدی (یعنی ہادیٔ موعود) کے القاب اختیار کئے۔ تبعین

---

[1] یہ اس لیے کہ یہ لوگ صرف سات اماموں کو تسلیم کرتے ہیں، یعنی (۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ (۲) حضرت حسن رضی اللہ عنہ (۳) حضرت حسین رضی اللہ عنہ (۴) حضرت علی رضی اللہ عنہ ثانی (۵) حضرت محمد الباقر (۶) حضرت محمد جعفر الصادق اور (۷) حضرت اسمٰعیل رضی اللہ عنہ۔

[2] مقریزی کے بیان کے مطابق یہ لقب انہیں اس لیے دیا گیا کہ اُنہیں عباسیوں کے پنجہ ستم سے بچانے کی خاطر اُن کے پیروؤں نے اُنہیں چھپائے رکھا۔ امام اسمٰعیل امام جعفر صادق کے سب سے بڑے لڑکے تھے، نہایت نرم خو اور دلآویز طور طریقوں کے آدمی۔ مقریزی کہتا ہے کہ یمن قطامہ اور افریقی صوبوں میں اُن کے معتقد بڑی تعداد میں تھے۔ شہرستانی سے روایت ہے کہ امام اسمٰعیل کی والدہ کی زندگی میں امام جعفر نے دوسری شادی نہیں کی، جیسے کہ رسول خدا نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں نہیں کی۔"

چاروں طرف سے آ کر اُن کے گرد جمع ہو گئے اور اُنہوں نے ایک صوفی کی مدد سے تھوڑی ہی مدت میں اغلبیوں کو، جو خلیفۂ بغداد کے نام پر افریقی صوبوں پر حکومت کر رہے تھے، حکومت سے برطرف کر دیا اور ایک نئی سلطنت قائم کی جو مغرب الاقصیٰ سے لے کر سرحدِ مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُن کے ایک جانشین معد ابوتمیم (المعز الدین اللہ) نے عباسیوں سے مصر اور شام کا ایک حصہ فتح کر لیا۔ دشمنان اہل بیت پر اپنی اس فتح کی یادگار کے طور پر اُنہوں نے قاہرہ کی بُنیاد رکھی اور اپنا دارالخلافہ مہدیہ سے، جو قیروان کے نزدیک عبیداللہ المہدی نے قائم کیا تھا، اس نئے شہر میں منتقل کر لیا۔ اُس وقت ان کی قلمرو میں سارے شمالی افریقہ کے علاوہ اور سارڈینیا اور صقلیہ کے جزیرے بھی تھے۔ قاہرہ میں انہوں نے مسجد الازہر بنائی، ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا اور متعدد دارالعلوم کھولے، جنہیں انہوں نے رقوم خطیر عطا کیں۔ ان میں صرف ونحو، ادب، تفسیر قرآن، اصولِ فقہ، طب ریاضی اور تاریخ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک معتبر مورخ کہتا ہے: "ان کی حکومت کا امتیازی وصف عدل و انصاف تھا۔"

مصری فاطمیوں کے جتنے وقائع ہمارے پاس موجود ہیں وہ سب کے سب اُن کے مخالفوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ جب سے معز کے سپہ سالار جوہر نے مصر اور شام کو خلفائے بغداد سے فتح کیا اُسی وقت سے دونوں خلافتوں میں حق خلافت کے مسئلے پر جنگ و جدل کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ فاطمیوں کے منجملہ اہل بیت ہونے کے دعوے کی بدولت اُنہیں لوگوں کو جو عقیدت حاصل تھی اُس نے عباسیوں کے دلوں میں یہ بیتاب خواہش پیدا کی کہ جس طرح بھی ہو سکے اپنے حریفوں کے سلسلہ نسب کی تغلیط کریں اور دُنیا پر اُن کے نقیض اسلام عقائد کا پول کھولیں۔ قادر باللہ کے عہدِ حکومت میں خوفزدہ خلیفہ کے حکم سے علمائے فقہ کا ایک خفیہ اجتماع اس مقصد سے ہوا کہ فاطمیوں کے بارے میں یہ فتویٰ صادر کیا جائے کہ وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حقیقی اخلاف نہیں ہیں۔ فاطمیوں نے اس کا جواب ایک فتویٰ تکفیہ کی صورت میں دیا، جس پر قاہرہ کے سربرآوردہ علماء کے دستخط تھے، جن میں مالکی اور شافعی عقیدے کے علماء بھی شامل تھے۔ بہر حال فاطمیوں کی صحت نسب کے بارے میں عباسی علماء نے جو شُبہات پیدا کر دیئے ہیں اُن کے باوجود مقریزی، ابن خلدون اور ابوالفداء جیسے موقر مؤرخین نے ان کے دعاوی کو صحیح

مانا ہے۔

مقریزی اس موضوع پر بڑی صاف گوئی سے کام لیتا ہے اور صراحتہً بنی عباس کے طرف داروں پر کذب بیانی اور جعل سازی کا الزام لگاتا ہے۔ عباسیوں کے اس بیان سے کہ عبیداللہ المہدی آل رسول سے نہ تھا بحث کرتے ہوئے وہ کہتا ہے: ''واقعات کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ محض دروغ بافی ہے۔ اُس زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کے متعدد اخلاف موجود تھے اور شیعہ لوگ اُن سب کا احترام کرتے تھے۔ پھر ایسی کون سی چیز تھی جو ان اہل بیت النبی کے طرف داروں کو اس پر آمادہ کرسکتی تھی کہ وہ انہیں چھوڑ کر ایک ایسے شخص کو خلیفہ تسلیم کریں جو مجوسی الاصل اور یہودی النسل تھا؟ کوئی شخص جس کی عقل ٹھکانے تھی ایسی حرکت نہ کرسکتا تھا۔ یہ روایت کہ عبیداللہ المہدی اصل ونسل کے اعتبار سے یہودی یا مجوسی تھا کم ہمت عباسی بادشاہوں کی ایجاد ہے، جن کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ فاطمیوں سے کیونکہ اپنی گلو خلاصی کرائیں۔ فاطمیوں کی حکومت لگاتار ۲۷۰ برس تک قائم رہی اور انہوں نے عباسیوں کو افریقہ، مصر، شام، دیار بکر، مکہ طیبہ اور مدینہ منورہ اور یمن سے محروم کر دیا۔ اور تو اور، خود بغداد میں چالیس ہفتوں تک اُن کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ عباسی فوجیں اُن کے سامنے بے دست و پا تھیں۔ اس لیے لوگوں کے دلوں میں فاطمیوں سے برگشتگی پیدا کرنے کی خاطر عباسیوں نے فاطمیوں پر اُن کے حسب ونسب کے بارے میں بہتان باندھے۔ جو عباسی حکام اور اُمراء فاطمیوں کے مقابلے سے عاجز آ گئے تھے، اُنہوں نے بخوشی ان جھوٹی کہانیوں کو آلہ انتقام بنایا۔ جن قاضیوں نے قادر باللہ کے بلائے ہوئے علماء کے فتوے کی تصدیق کی انہوں نے یہ محض خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں اور سُنی سنائی باتوں کی بنا پر کیا۔ چنانچہ اس وقت سے اب تک مؤرخین اندھا دُھند اور بے سوچے سمجھے عباسیوں کے ایجاد کیے ہوئے افترا کو دہراتے چلے آئے ہیں۔'' مقریزی ایک ایسا عمیق النظر مورخ اور ممتاز عالم قانون ہے جو تمام علمائے مشرق میں اونچا پایہ شہرت رکھتا ہے۔ اس کے اس بیان سے صریح تر اور کیا ہوسکتا ہے؟

فاطمیوں کے عقائد کو بھی اسی طرح مسخ کیا گیا ہوگا۔ پھر بھی اس میں کچھ شک نہیں کہ اُنہوں نے عبداللہ ابن میمون المعروف بہ قداح کے سری عقائد بڑی حد تک اپنا لیے

تھے اور اس نے خفیہ داعیوں کا جو طریقہ رائج کیا تھا اُسے سیاسی تبلیغ کے لیے استعمال کیا۔

دنیوی اقتدار کی ہوس سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں اس کا کچھ اندازہ ہمیں تاریخ عیسائیت کے چند واقعات سے ہوتا ہے۔ مثلاً عالمِ عیسائیت کی سربراہی کے لیے پوپ اور شہنشاہ کی طویل کش مکش، سی سالہ جنگ جس نے انسانوں پر جگرخراش مصیبتیں نازل کیں اور فرانس کے پروٹسٹنٹ ہیوگناٹوں (Huguenots) پر جو مظالم توڑے گئے، محض مذہبی تعصب کی بناء پر ہی نہیں بلکہ خاندانی اقتدار طلبی کی وجہ سے بھی۔ یہی تاریخ اسلام میں ہوا۔ عباسیوں نے پہلے اُمویوں سے اور بعد میں مصری فاطمیوں سے جو جنگ آزمائی برسوں تک جاری رکھی اُس سے بڑے آفت انگیز نتائج رونما ہوئے۔

جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت عجمی سلطنت کے مشرقی صوبوں میں گوناگوں یارانِ طریقت جمع تھے۔ وہاں نہ صرف زردشتی مجوسی تھے، جو اسلام کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کے آگے دوڑ رہے تھے' بلکہ ہندوستان کے بہت سے دھرموں کے نمائندے بھی تھے، جو اپنے ساتھ آواگون، وشنو کے اوتار، کرشن کے آکاش سے اُتر کر آنے اور اپنی گوپیوں کے ساتھ پریم کی لیلا سے جی بہلانے کے عقیدے اور قصے بھی لے کر آئے تھے۔ وہ انقلابی خیالات اور بدعتیں جنہوں نے آخری ساسانی بادشاہوں کے عہد میں معبدوں اور شاہی محلوں کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور جن کی بیخ کنی کی کسریٰ نوشیروان نے نوکِ شمشیر سے کوشش کی تھی ابھی تک موجود تھیں۔ کم از کم اُن میں اتنا دم خم باقی تھا کہ روپ بدل کر نئے سرے سے اسلامی بھیس میں نمودار ہو جائیں۔

راوندی، ہندی مجوسیوں کا ایک فرقہ جو تناسخِ ارواح کا معتقد تھا، اور سفید جامگان[1] جن کی بُنیاد حکام بن ہاشم مقنع[2] نے رکھی، ان دونوں فرقوں نے خراسان میں شورش

---

[1] یہ نام انہیں اس لیے دیا گیا کہ یورپ کے ٹیبوریوں (Taborides) کی طرح وہ سفید لباس پہنتے تھے۔

[2] یہ وہی جعلساز ہے جسے مور (Moore) نے خراسان کے نقاب پوش پیغمبر کے نام سے شہرت دی ہے۔ اُسے مقنع اس لیے کہا جاتا تھا کہ یا تو اپنی بدصورتی کو چھپانے یا اپنے پیروؤں کو مرعوب کرنے کی خاطر وہ ہر وقت منہ پر نقاب ڈالے رہتا تھا۔ اُسے ''سازندۂ ماہ'' بھی کہتے تھے، کیونکہ ایک مرتبہ اُس نے نخشب میں جادو کے زور سے ایک ایسی چیز بنا کر لوگوں کو دکھائی تھی، جو چاند کی سی معلوم ہوتی تھی۔

برپا کردی۔ مقنع یہ تعلیم دیتا تھا کہ خدا نے انسان کی شکل اختیار کر لی تھی، کیونکہ اس نے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کی پرستش کا حکم دیا تھا، چنانچہ اس وقت سے فطرتِ الٰہی یکے بعد دیگرے نبیوں میں حلول کرتی رہی تھی اور اس وقت اس کی شخصیت میں مجسم تھی۔

اسی زمانے میں مزدکیت نے، جس نے اڑھائی صدیاں پہلے قلمروِ خسرواں میں آگ لگا دی تھی اور جسے نوشیروانِ اعظم نے پاؤں تلے روند دیا تھا، خلیفوں کے ماتحت دوبارہ سر اُٹھایا۔ اس سانپ کا سر نہیں کُچلا گیا تھا بابک خرمی اپنے پیش رو مزدک کی طرح عدمیت وانکاریت کی تبلیغ کرتا تھا، مثلاً یہ کہ عورتیں اور مال و جائیداد سب سماج کی مشترکہ ملکیت ہیں، اور یہ کہ انسانی اعمال میں نہ کوئی خیر کا پہلو ہے اور نہ کوئی شر کا پہلو۔ بیس سالوں تک اس نے خلافت کے سارے علاقے میں بربادی و غارت گری پھیلائے رکھی۔ بالآخر معتصم باللہ کے زمانے میں وہ شکست کھا کر گرفتار ہوا اور خلیفہ کی موجودگی میں قتل کر دیا گیا۔ یہ اُسی پرانی داستان کی تکرار تھی۔ اسلام کو اُنہی آزمائشوں میں سے گزرنا تھا جن میں سے عیسائیت گزر چکی تھی۔ پہلی صدی کے آغاز سے لے کر نویں صدی کے اختتام تک عیسائیت پرانے مذہبوں سے برسرِ پیکار رہی، جو نئے نئے روپ دھار کر اُن تمام ملکوں میں رونما ہو رہے تھے جنہوں نے عیسائیت کو قبول کر لیا تھا۔ اس جنگ و جدل کے بعد عیسائیت پر افسردگی چھا گئی۔ تقلید پرستی نے نہ صرف انقلاب پسند موزنتانیوں (Montanists) اور مانوی پالیوں (Manichaean Paulicians) کو بلکہ عقلیت پسند ایرانیوں کو بھی پامال کر ڈالا تھا۔ چنانچہ ریفارمیشن (Reformation) کے زمانے تک کلیسائیت اور تقلید پرستی نے ذہنِ انسانی کو غلامی کے بندھنوں میں جکڑے رکھا۔ اسلام کو بھی ایسے ہی امتحانوں میں سے گزرنا پڑتا۔ لیکن اس کی ریفارمیشن کا آغاز حال ہی میں ہوا ہے۔

اسلام نے اپنے متبعین سے صرف یہ تقاضا کیا کہ وہ ایک ابدی صداقت کا زبانی اقرار کریں اور چند اخلاقی فرائض پورے کریں۔ باقی سب معاملات میں اس نے پوری آزادی فیصلہ دی۔ اُس نے وحدت اللہ کے نام پر تمام مذہبوں اور فرقوں کو جمہوری مساوات کی پیشکش کی۔ نتیجتہً ہر مذہب کے ستم رسیدہ بدعتی علم محمدی ﷺ کے نیچے آ کر جمع ہو گئے، جو ان کے لیے پروہتوں کی غلامی سے چھٹکارے کا ضامن تھا۔ اوستائی اہل

کتاب، آزاد خیال زردشتیوں، مانویوں، عیسائیوں، یہودیوں، مجوسیوں سب نے اس نئے نظام کا خیر مقدم کیا، جو اُن کے مذہبی وحدت کے خواب کی تعبیر تھا۔ غناسطی فرقوں کے وہ غول جنہوں نے دوسری صدی سے لے کر تیسری صدی تک عیسوی کلیسا کو پریشان کر رکھا تھا یا تو دینِ محمدی ﷺ میں مدغم ہو گئے تھے یا خلفاء کی رواداری کے سایہ عافیت میں تقلید پسند یونانیوں اور کیتھولکوں کی دخل اندازیوں سے مصئون، امن و امان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اول الذکر نے دینِ محمدی ﷺ کو قبول تو کر لیا تھا، لیکن اپنے قدیم عقائد کو بھی برقرار رکھا تھا۔ اسی امتزاج نے اسلام کے اُن رُوح پرست (Docetic)[1] فرقوں کو جنم دیا جن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

کسی قوم کی جبلی خصوصیات، جس آب و ہوا میں وہ زندگی بسر کرتی ہے۔ اُس کے ماحول کے طبعی نقش و نگار، قدیم تر مذاہب کے اثرات، یہ سب چیزیں مل ملا کر اس کے مذہب اور عقائد کو رنگ روپ بخشتی ہیں۔ کیا عیسائیت اور کیا اسلام، دونوں میں یہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ایران نے غناسطیت کو جنم دیا۔ ایران ہی سے وہ روح پرستانہ تصورات اُٹھے جو رومی دنیا میں سرایت کر گئے اور جنہوں نے یہودی الاصل عیسائیوں کے ابتدائی عقائد پر ایک ایسے خدا کے تصور کا رنگ چڑھا دیا جو دنیا کے لوگوں سے آئے دن کا میل جول رکھتا تھا۔ توہمات اور فلسفے کا وہ عجیب و غریب مرکب جسے مانویت کہتے ہیں اور جس سے عیسائیت نے کسی اعتراف کے بغیر اتنا کچھ مستعار لیا ہے زردشتیوں اور عیسائیوں کے جبر و تشدد کے باوجود ابھی جوں کا توں قائم تھا۔ ایک عجیب الخلقت صاحب فطانت کی یہ تخلیق، ایک قوم کی فطری خصوصیات کی یہ پیداوار غالباً کبھی کبھی فنا نہ ہوگی۔ علمائے دینیات اس کے قلع قمع کی لاکھ کوشش کریں وہ اسے کبھی نیست و نابود نہ کر سکیں گے۔ سُنی مذہب کی افسردہ طبعی ایران کی آب و ہوا کے زیرِ اثر ایک رنگین خیال فلسفے میں تبدیل ہو گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت نے مانویت کے تخیل کو اُکسا دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کی طرح وہ بھی لوگوں کے تصور میں ایک سماوی جوہر بن گئی۔ انسان کو خدا بنانے کا

---

[1] عیسائیوں کا ایک فرقہ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسم انسانی نہیں تھا بلکہ کسی آسمانی جوہر کا تھا، یعنی خلاصۂ روح تھا۔

یہ عمل حضرت علی رضی اللہ عنہ تک ہی محدود نہ تھا۔ اُن کے جانشینوں کو بھی خدائی کا رُتبہ دے دیا گیا۔ چنانچہ سُنی مسلک کی طرح شیعہ مسلک کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک تو وہ سیدھا سادہ اور خالص تشیع ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی جانشینوں کا مسلک تھا اور جس سے ہم تھوڑی دیر بعد بحث کریں گے۔ دوسرا وہ روح پرستانہ تشیع ہے جو توہمات کا ایک مجموعہ ہے اور جن لوگوں میں وہ پھیلا اُن کے قدیم عقائد کے زیر اثر اصلی تشیع کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ پھر انتہا پسندانہ تشیع روح پرستانہ تشیع سے اُتنا ہی مختلف ہے جتنا انتہا پسندانہ سُنی مسلک یا نواصبیت روح پرستانہ سُنی مسلک سے۔ تنگ نظرانہ خود پسندی کسی ایک دین یا مذہب ہی کی خصوصیت نہیں، آتھینیسیس کا مسلک (The Athanasian Creed) دوسرے مسلکوں کو جو خوف دلاتا ہے کہ اُن پر خدا کی برقِ غضب گرے گی وہ عیسائیت تک ہی محدود نہیں۔ اسلام کے فرقے بھی باستثنائے معدودے چند) ایک دوسرے کو قہرِ الٰہی کے سپرد کرتے ہیں، ہمیشہ کے لیے تو نہیں (جیسا کہ کٹر عیسائی کرتے ہیں)، لیکن پھر بھی اتنی مدت کے لیے ضرور کہ اُن پر اختلاف عقیدہ کی خرابیاں پوری طرح واضح ہو جائیں۔ بہر حال نارِ جہنم کی اُن دھمکیوں کے باوجود جو مختلف فرقے ایک دوسرے کو دیتے ہیں، کسی فلسفی مزاج طالب علم کی نظر سے اسلام کی رعالمگیر وسیع المشربی مخفی نہیں رہ سکتی۔

ساتویں صدی کے وسط کے لگ بھگ کونسٹینٹین سلوانس (Constantine Sylyanus) نے تابعین پال کے مانوی فرقے کی داغ بیل ڈالی تابعین پال مانوی کے لقب کو رد کرتے ہیں، لیکن اُن کے عقائد سے جن کی تعلیم مانی نے دی قریب کی مشابہت رکھتے ہیں اور ملنر (Milner) کے سوا سب عیسائی مصنفین یہی کہتے ہیں کہ وہ مانویت سے ماخوذ ہیں۔ تابعین پال یورپ کے اصلاح یافتہ کلیساؤں کے حقیقی موجد تھے۔ انہیں بت پرستی اور تبرک پرستی سے جو نفرت تھی وہ غالباً اسلامی اثرات کا نتیجہ تھی۔ مریم پرستی، اولیاء پرستی اور مرئی چیزوں کو معبود بنانے سے وہ جو پرہیز کرتے تھے اس میں وہ مسلمانوں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ لیکن مانی کی طرح ان کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک روحِ محض تھے جو اپنی زندگی میں صرف ظاہری طور پر جسم سے مشابہ تھی اور اُن کی صلیب کشی محض ایک فریب نظر تھی۔ اُن کے نزدیک مادہ قدیم اور ابدی ہے اور ایک ایسے وجودِ فاعل کا مبداء

ہے جس نے یہ مرئی دنیا پیدا کی اور جو اُس وقت تک اپنی دنیوی حکومت کو قائم رکھے گا جب تک بدی اور موت کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ عیسوی اناجیل کی تفسیر کے بارے میں وہ کنایہ و مجاز سے کام لیتے ہیں اور مانی کی طرح الفاظ کے مخفی معانی سے واقف ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں...... وہ اس کو جائز قرار دیتے ہیں کہ مصلحتہً کسی دوسرے مذہب کا ظاہری اقرار کیا جائے، جو جدید ایران میں کتمان یا تقیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یونانی کلیسا اور بازنطینی دربار نے متبعین پال پر سخت جبر کیا اور تقریباً دو صدیوں تک وہ شمالی آرمینیا اور کیپڈوشیا میں بازنطین کے مذہبی دیوانوں اور مستبد حاکموں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے، جس میں طرفین نے ایک دوسرے پر ہیبت ناک مظالم کئے[1]۔ بالآخر انہیں اپنے سے زبردست قوت کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے لیکن اگرچہ اس فرقے کے قلعے اور شہر مسمار کر دیئے گئے، پھر بھی وہ زندہ رہا۔ اس نے اپنے عقائد بلغاریوں کو منتقل کر دیئے جنہیں تقلید پسند کلیساؤں نے ہمیشہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ایشیا میں ختم ہو جانے کے بعد متبعین پال تیرہویں صدی میں از سر نو جنوبی پرووانس اور سیوائے میں نمودار ہوئے۔ یورپی تاریخ کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ ان ملکوں میں اُن کا کیا حشر ہوا۔ اُنہیں تلوار اور آگ کے ذریعے تباہ کر دیا گیا، یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کی بھی جاں بخشی نہ کی گئی۔ جو عورتیں اور بچے زندہ بچ گئے اُنہیں غلام بنا لیا گیا۔ اس کے باوجود پالیت کا خاتمہ نہ ہوا۔ اس نے انگلستان میں خروج کیا، جہاں اس کے پیروؤں نے جنہیں مولرڈ (Mollards) کہتے تھے، وہی مصیبتیں سہیں جو ان کے پیشروؤں نے ایشیاء سیلوائے اور پرووانس میں سہی تھیں۔ پھر وہ ہس (Huss) کے ماتحت بوہیمیا میں نمودار ہوئی، اور بالآخر لوتھر (Luther) اور کیلون (Calvin) کے علم کے نیچے اپنے متعصب مخالفوں پر ظفریاب ہوئی۔ ہم نے اب تک اس فرقے کی سرگزشت اس لیے بیان کی ہے کہ اُسی زمانے میں عالم اسلام کے اندر جو مذہبی و سیاسی تحریکیں بروئے کار تھیں اُن پر اس نے اپنے اصلی وطن میں بہت نمایاں اثر مرتب کیا۔

---

[1] کہا جاتا ہے کہ مینوئل (Manuel) کی ماں تھیوڈورا (Theodoral) کے حکم سے ایک لاکھ متبعین پال تلوار، سولی اور آگ کی نذر کر دیئے گئے۔

اُس طوفانی دور میں، جب کائرو سیر پالی (Chyroseir the Paulician) نے بازنطینی قلمرو کے مشرقی حصوں میں تباہی مچا رکھی اور ایشیائے کوچک کے شہروں میں بربادی غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا، فارس کے شہر اہواز میں ایک ایسا شخص رہتا تھا جو اپنی ہمہ دانی، اپنے کمالات کی ہمہ گیری اور اپنے تبحر علمی کے اعتبار سے مانی کا ہم رتبہ تھا اور جسے دینی تاریخ میں مانی کے برابر کا کردار ادا کرنا تھا۔ عبداللہ ابن میمون القداح کو اس کے دشمن مجوسی النسب کہتے ہیں اور اس کے معتقد اُسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اخلاف میں شمار کرتے ہیں۔ حقیقت الامر چاہے کچھ بھی ہو، یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ محبان اہل بیت میں تھا۔ اس کی تعلیمات سے جو فتنہ انگیز نتائج بلاواسطہ یا بالواسطہ برآمد ہوئے ہیں اُن کو ملحوظ رکھتے ہوئے ابن خلدون جیسے مورخوں کے لیے بھی اس شخص کو اور اُس کے عقائد کو بری از تعصب نگاہوں سے دیکھنا ناممکن تھا۔ اُن کا خیال ہے کہ عبداللہ ابن میمون اُنہی غدارانہ طریقوں سے جو اُس کے پیشروؤں نے عیسائیت کے خلاف استعمال کیے تھے قلمرو اسلام کو زیروزبر کرنے کا خواہش مند تھا۔ اُسے اس امر کا احساس تھا کہ جب تک لوگوں کا ضمیر اور سیاسی طاقت اسلام کی پشت پناہ ہیں اس وقت تک اُس سے کھلم کھلا جنگ ایک خطرناک مہم ہے۔ اس لیے اس نے مانی کی طرح خفیہ کارروائیوں کا تہیہ کیا۔ اس نے اپنے نظام کو رموز واسرار کے پردے میں چھپا لیا اور مذہب کے مثبت اقتدار کو ختم کرنے کی خاطر فیثا غورسیوں (Phythagorens) کی طرح اپنے پیروؤں کو سات درجوں میں تقسیم کیا۔ آخر درجے میں وہ لوگ تھے جو مذہب کو سرے سے ناکارہ کہتے تھے اور انسانی اعمال کو خیر وشر سے بری سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک نہ دنیا میں اور نہ عقبیٰ میں اعمال کی کوئی جزا یا سزا تھی۔ اُس نے اپنے داعی مقرر کیے اور اُنہیں اطراف ملک میں بھیجا تاکہ مریدوں کو اس کے حلقے میں داخل کریں اور ہر ایک کی قابلیت کے مطابق اُسے کسی نہ کسی درجے کی تربیت دیں۔ ابن اسمٰعیل کے دعوؤں کو ان لوگوں نے سیاسی عذر کے طور پر استعمال کیا۔ وہ ظاہر میں تو اس کی خاطر کام کر رہے تھے، لیکن دراصل وہ خفیہ طور پر بے عقیدتی کے مبلغ تھے۔

شہرستانی نے اس فرقے کے ارکانِ عقیدہ کو زیادہ فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے برعکس محسن فانی نے دبستان میں اس کی ایک قدرے خوش آئند تصویر پیش

کی ہے جس کے نقش و نگار اُس نے فرقے کے افراد سے اخذ کیے ہیں۔ لیکن اگر دونوں کا بامعانِ نظر مطالعہ کیا جائے تو حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبداللہ ابن میمون مادہ پرست بھی تھا اور خدا پرست بھی اور مانی کی طرح اُس کی یہ دلی آرزو تھی کہ ایک ایسا طبیعی مذہب ایجاد کرے جس میں مختلف مذہبوں کی اچھی باتیں جمع ہوں اور جو فلسفے اور اثباتی دین کے باہمی تضاد کو مٹا دے۔ اس کے پیروؤں کے جو مدارج تھے وہ صوفیوں کے مقامات سے مماثل تھے۔ میر خوانداس کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصری فاطمیوں نے اپنے صوفیانہ عقائد زیادہ تر عبداللہ ابن میمون سے اخذ کیے[1]۔

عبداللہ اہواز سے بصرہ گیا اور وہاں سے ملکِ شام میں، جہاں اُس نے سالمیہ کے مقام پر سکونت اختیار کر لی۔ سیر و سفر کے دوران میں اُسے تابعین پال سے واسطہ پڑا اور اُن سے اُس نے بہت سے عقائد اکتساب کیے۔ تابعین پال نے بازنطینیوں سے جو مبادلہ مدتوں تک جاری رکھا اور اُنہیں اپنی تبلیغی کوششوں میں آخر الامر جو کامیابی ہوئی اسی کی بنا پر اُس نے اپنا مذہبی منصوبہ تیار کیا۔ اس نے اپنے نظریوں کو کسی حد تک مانی اور کسی حد تک مسلم صوفیوں کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالا۔ مانویت خود بنیادی طور پر ہمہ اوست کی ایک شکل تھی، جس کے نقوش فیثا غورسی فلسفے، زردشتیت اور عیسائیت سے مستعار لیے گئے تھے۔ عبداللہ کے پیروؤں کو اس بناء پر کہ وہ اثباتی دین کے احکام کے اندرونی معانی سے آگاہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں باطنیہ کا نام دیا گیا ہے۔ یہی دعویٰ مانویوں اور پالیوں نے کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ ابن میمون نے مادے کو غیر فانی کہا۔ مزید بریں اس نے یہ اعلان کیا کہ "خدا اپنے شہود سے علیحدہ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس کے بارے میں وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ موجود ہے یا غیر موجود۔ عالم کُل ہے یا نہیں، کیونکہ اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کہنا یہ کہنے کے مترادف ہے کہ وہ اپنی مخلوقات سے مشابہت

---

[1] مصری فاطمی عام اسمٰعیلیوں سے ایک بات میں مختلف تھے۔ عام اسمٰعیلیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اُن کے آخری امام حضرت اسمٰعیلؑ پردہ غیب میں چھپ گئے تھے اور اُن کا ظہور دوبارہ اس وقت ہوگا۔ جب آسمانی بادشاہت جلوہ نما ہوگی۔ اس کے برخلاف مصری فاطمی یہ کہتے تھے کہ امام اسمٰعیل عبیداللہ المھدی اور اُن کے جانشینوں کی شکل میں ظاہر ہو چکے تھے۔

کی ہے جس کے نقش ونگار اُس نے فرقے کے افراد سے اخذ کیے ہیں۔ لیکن اگر دونوں کا بامعانِ نظر مطالعہ کیا جائے تو حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبداللہ ابن میمون مادہ پرست بھی تھا اور خدا پرست بھی اور مانی کی طرح اُس کی یہ دلی آرزو تھی کہ ایک ایسا طبیعی مذہب ایجاد کرے جس میں مختلف مذہبوں کی اچھی باتیں جمع ہوں اور جو فلسفے اور اثباتی دین کے باہمی تضاد کو مٹا دے۔ اس کے پیروؤں کے جو مدارج تھے وہ صوفیوں کے مقامات سے مماثل تھے۔ میر خواند اس کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصری فاطمیوں نے اپنے صوفیانہ عقائد زیادہ تر عبداللہ ابن میمون سے اخذ کیے[1]۔

عبداللہ اہواز سے بصرہ گیا اور وہاں سے ملکِ شام میں، جہاں اُس نے سالیہ کے مقام پر سکونت اختیار کر لی۔ سیر و سفر کے دوران میں اُسے تابعین پال سے واسطہ پڑا اور اُن سے اُس نے بہت سے عقائد اکتساب کئے۔ تابعین پال نے بازنطینیوں سے جو مبادلہ مدتوں تک جاری رکھا اور اُنہیں اپنی تبلیغی کوششوں میں آخر الامر جو کامیابی ہوئی اسی کی بنا پر اُس نے اپنا مذہبی منصوبہ تیار کیا۔ اس نے اپنے نظریوں کو کسی حد تک مانی اور کسی حد تک مسلم صوفیوں کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالا۔ مانویت خود بنیادی طور پر ہمہ اوست کی ایک شکل تھی، جس کے نقوش فیثا غورسی فلسفے، زردشتیت اور عیسائیت سے مستعار لیے گئے تھے۔ عبداللہ کے پیروؤں کو اس بناء پر کہ وہ اثباتی دین کے احکام کے اندرونی معانی سے آگاہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں باطنیہ کا نام دیا گیا ہے۔ یہی دعویٰ مانویوں اور پالیوں نے کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ ابن میمون نے مادے کو غیر فانی کہا۔ مزید بریں اس نے یہ اعلان کیا کہ "خدا اپنے شہود سے علیحدہ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس کے بارے میں وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ موجود ہے یا غیر موجود۔ عالم کُل ہے یا نہیں، کیونکہ اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کہنا یہ کہنے کے مترادف ہے کہ وہ اپنی مخلوقات سے مشابہت

---

[1] مصری فاطمی عام اسمٰعیلیوں سے ایک بات میں مختلف تھے۔ عام اسمٰعیلیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اُن کے آخری امام حضرت اسمٰعیلؑ پردہ غیب میں چھپ گئے تھے اور اُن کا ظہور دوبارہ اس وقت ہوگا۔ جب آسمانی بادشاہت جلوہ نما ہوگی۔ اس کے برخلاف مصری فاطمی یہ کہتے تھے کہ امام اسمٰعیل عبیداللہ المہدی اور اُن کے جانشینوں کی شکل میں ظاہر ہو چکے تھے۔

رکھتا ہے۔ علت العلل نے ایک امر واحد سے یعنی محض ایک عمل ارادی سے ایک ایسا اصول اول پیدا کیا جو ازل سے بطون میں مضمر تھا اور جس کا نام عقل ہے، اور اس اصول اول نے ایک اصول ثانوی پیدا کیا جسے نفس کہتے ہیں اور جو پہلے اصول سے وہی رشتہ رکھتا ہے جو بیٹے کا باپ سے ہوتا ہے۔ اس اصول کی لازمی صفت زندگی ہے اُسی طرح کہ جس طرح عقل کی لازمی صفت علم ہے۔ دوسرے اصول نے پہلے تو قدیم الوجود مادے کو شکل بخشی جس کی لازمی صفت انفعالیت ہے اور اس کے بعد زمان و مکان، عناصر اربعہ ثوابت و سیار اور تمام اشیائے کائنات کو پیدا کیا۔ چونکہ اصولِ ثانی کے اندر اس بات کی ایک لامتناہی خواہش ہے کہ پہلے مکون اصول کی سطح پر پہنچے، اس لیے اُس نے اپنے آپ کو انسان کی شکل میں ہویدا کیا۔ تمام انسانی نفوس یا رُوحوں کا مقصد یہی ہے کہ اصول خلاق یعنی عقل کی طرح صعود کریں۔ انبیاء اس اصولِ خلاق کے مجسمے یا مظاہر ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو مادے سے مجاہدہ کرنے میں مدد دیں۔ اس لیے انبیاء کو ناطق کہا جاتا ہے۔ انبیاء سیاروں کی طرح تعداد میں سات ہیں۔ دنیا ایک سلسلہ ادوار میں سے گزر رہی ہے اور آخری دور میں قیامت کبریٰ واقع ہوگی، جب اثباتی دین اور قانون کے احکام منسوخ ہو جائیں گے، کیونکہ گردش افلاک اور احکام دین کی تعمیل محض اس لیے ہے کہ روح کو کمال حاصل ہو، اور روح کا کمال اس میں ہے کہ عقل کا درجہ حاصل کرے اور واقعتہً اس میں ضم یا مدغم ہو جائے قیامت کبریٰ میں سب چیزیں، کیا آسمان، کیا عناصر، کیا ذی حیات مخلوقات، تحلیل ہو کر رہ جائیں گی، زمین بدل جائے گی، آسمانوں کے طبق ایک کتاب کے اوراق کی طرح بند ہو جائیں گے، نیکی بدی سے علیحدہ ہو جائے گی فرمانبردار بندے نافرمانبرداروں سے جدا ہو جائیں گے حق نفس کل میں اور باطل اپنے منبع یعنی شیطان میں ضم ہو جائے گا۔" چنانچہ یوں (عبداللہ ابن میمون کے عقیدے کے مطابق) حرکت کے آغاز سے لے کر اُس کے اختتام تک پہلا مرحلہ (یعنی مبدا) ہے اور حرکت یا عمل کے اختتام سے لے کر کمال کا درجہ ہے۔ اور تمام احکام دین و قانون کے لیے پیمانے ہیں جن سے وہ ناپے جا سکتے ہیں" ...... "ہر حرف اور لفظ کے دو معانی ہوتے ہیں۔ کیونکہ تنزیل کی تاویل ہوتی ہے اور ہر مرئی چیز کا ایک مثنیٰ عالم غیب میں ہوتا ہے۔ حق کا علم عقل

سے نہیں بلکہ رشد و ہدایت سے حاصل ہوتا ہے۔'' عبداللہ ابن میمون کے شاگردوں نے اس کے نظریوں پر یہ اضافہ کیا کہ قیامت کے معنی ہیں امام کا ظہور اور ایک آسمانی سلطنت کا قیام جس میں تمام شرعی تکالیف رفع ہو جائیں گی۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ مذہب میں ریا کاری مباح ہے، تمام احکام قرآنی کے ایک مخفی معنی ہیں۔ تدین سنون ظاہری کی پابندی پر نہیں بلکہ باطنی جذبات واحساسات پر مشتمل ہے۔ ہر وہ چیز جو مضر نہیں جائز ہے، روزہ داری امام کے راز کو محفوظ رکھنے کے سوا کچھ نہیں زنا کاری کی جو ممانعت ہے اس میں یہ معنی مضمر ہیں کہ مرید کو اپنے مذہب کے اسرار فاش نہ کرنے چاہئیں۔ زکوٰۃ کا مطلب ہے امام معصوم کو اپنی آمدنی کا عشر دینا۔ یہ نظام عقائد بہت سے مذاہب اور فلسفوں کی عجیب وغریب معجون ہے اور اس کے اثرات قانون اور اخلاق کے نقیض ہیں۔

عبداللہ ابن میمون نے شام میں مستقل سکونت اختیار کی جو عیسوی غناسطیت کا مرز بوم تھا۔ وہاں اس نے اپنے نظریوں کے خاکے میں اور رنگ بھرے اور حمدان کو اپنا ہم عقیدہ بنایا، جو قرمط کے نام سے اسلام کی تاریخ میں رسوا ہے۔

لوگوں کو مرید بنانے کا جو طریقہ عبداللہ ابن میمون کے شاگردوں نے اختیار کیا وہ وہی پرانا مانوی طریقہ تھا، یعنی مبتدی کو شرانگیز سوالوں اور مبہم جوابوں سے شک و تذبذب کے سمندر میں غوطے دینا۔ محسن فانی کو جس داعی نے مطلع کیا اس کے کہنے کے مطابق اس عمل کا مقصد برا نہ ہوتا تھا، بلکہ صرف یہ کہ جویائے حق وحکمت کو منزل کمال تک پہنچایا جائے مختلف اشخاص کے مذہبی نقطہ نگاہ کے مطابق اس عمل میں جزئی تبدیلیاں کی جاتی تھیں۔ داعی شروع شروع میں تو مرید کے عقائد کو کسی اعتراض کے بغیر تسلیم کر لیتا تھا، لیکن اس کے بعد اس کے دل میں شکوک وشبہات ڈال کر رفتہ رفتہ اس کے دماغ کو مذبذب کر دیتا تھا اور بالآخر اُسے تمام مسائل کا حل باطنی عقائد کی صورت میں سمجھاتا تھا۔ مثلاً اگر داعی کو کسی شیعہ کا مرید بنانا منظور ہوتا تو وہ اپنے آپ کو اہل بیت کے ایک شیدائی کے روپ میں پیش کرتا۔ اُن پر جو مظالم توڑے گئے، اُن سے جو ناانصافیاں کی گئیں، امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت مقتل کربلا کے واقعات، وہ اُن سب کی داستان دہراتا۔ اس طرح زمین تیار کر کے وہ اپنے متعلم کے ذہن میں باطنیہ کے مخفی عقائد کا بیج بو دیتا۔ اگر داعی کو

کسی یہودی سے سابقہ پڑتا، تو وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کی مذمت کرتا اور اپنے معلم سے مسیحائے موعود کے مسئلے پر اتفاق کر کے بتدریج اُسے اس بات کا یقین دلاتا کہ یہ مسیحائے موعود امام اسمٰعیل کے سوا اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ اگر اس کا مقصد کسی عیسائی کو اپنے فرقے میں داخل کرنا ہوتا تو وہ یہودیوں کی ہٹ دھرمی اور مسلمانوں کی جہالت پر لمبی چوڑی تقریریں کرتا اور دین عیسوی کے تمام ایمانیات کو تسلیم کرنے کا اعلان کرتا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ اشارہ کرتا کہ وہ محض مجازی ہیں اور اُن کے عمیق تر معانی تک رسائی صرف باطنی نظام کے وسیلے سے ممکن ہے۔ مبتدی کو اس طرح شیشے میں اتارنے کے بعد وہ اُسے یہ سمجھاتا کہ عیسائیوں نے فارقلیط کے نظریے کا مطلب سمجھا ہے اور حقیقی فارقلیط اسمٰعیلی امام ہے۔ عبداللہ ابن میمون نے تقیہ کا مطلب بھی متعین کیا، یعنی کسی غیر مذہب کے عقائد و سُنن کی ظاہری پابندی۔ یہ نظریہ تمام مانوی فرقوں میں رائج رہا تھا اور تابعین پال بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ عبداللہ ابن میمون نے اسے دو مقاصد کو پیش نظر رکھ کر از سر نو رائج کیا: ایک تو مذہبی تشدد سے بچنے کی خاطر اور دوسرے لوگوں کو باطنیہ فرقے میں داخل کرنے کے کام کو آسان بنانے کی خاطر۔ تقیہ زبردستوں کے خلاف کمزوروں کا قدرتی دفاعی حربہ ہے۔ ہر شخص میں شہید بننے کی ہمت نہیں ہوتی، چنانچہ اکثر لوگ جب مقابلے سے عاجز آ جاتے ہیں تو اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔ ابتدائی عیسائیوں کو تقیہ پر کاربند ہونا پڑا۔ جہاں تک باطنیوں کا تعلق ہے اُن کے لیے تو خاص طور پر ضروری تھا کہ عباسی خلافت کے زیرنگیں تمام ملکوں میں اپنے اصلی عقائد کو چھپائیں۔ چنانچہ یہ پرانی عادت ہوتے ہوتے فطرت ثانیہ بن گئی۔ ان سے شیعوں نے تقیہ کا قاعدہ سیکھا۔ جب تک ایران اور ترکی میں دوستانہ تعلقات قائم نہیں ہوئے کوئی شیعہ سنی رسوم کی پابندی کے بغیر حج کرنے کا مجاز نہ تھا۔ چنانچہ جو شیعہ مقدس مقامات کی زیارت کا خواہش مند ہوتا اس کے لیے تقیہ ایک امر مجبوری تھا۔ لیکن تقیہ، جو جبر و تشدد اور خوف کی قدرتی پیداوار ہے، ایرانیوں کی طبیعت میں اس طرح رچ گیا ہے کہ وہ ایسے حالات میں بھی اس پر عمل کرتے ہیں جن میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عموماً وہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے احساسات و جذبات کو صدمہ نہ پہنچانے کی خاطر اس پر عمل کرتے ہیں، بالکل اُسی طرح جس طرح آج کل کے

پروٹسنٹ کیتھولک ملکوں میں رومی رسوم کا ظاہری احترام کرتے ہیں۔

حمدان نے (جس کا دوسرا نام، جیسا کہ ہم اوپر کہ آئے ہیں، قرمط تھا) اپنے پیرو مرشد سے علٰیحدہ ہو کر اپنا ایک نیا فرقہ قائم کیا۔ عبداللہ ابن میمون نے تبلیغی کام میں جبر اور قوت کے استعمال کو پسند نہ کیا تھا۔ قرمط نے اُسے اپنے فرقے کا بنیادی رُکن بنایا۔ ممکن ہے کہ کائروسیر کی طرح وہ بھی متعصب لوگوں کی زیادتیوں کے ہاتھوں ایسا کرنے پر مجبور ہوا اس نے الغشا اور البحرین میں بغاوت کھڑی کی۔ خلیفہ کی فوجوں کی کمزوری کی بدولت اُسے فتح نصیب ہوئی۔ اس پر وہ اپنے بہروؤں کی ایک کثیر تعداد جمع کر کے البحرین سے نکل کھڑا ہوا اور کائروسیر کی طرح قتل و غارت کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ قرمطیوں کے البحرین اور العشا میں جو قلعے تھے اُن میں قلعہ بند ہو کر اُنہوں نے ایک صدی تک خلفائے بغداد کے ساتھ ایک خونین جنگ جاری رکھی۔ اور مقامات کا تو ذکر ہی کیا، اُنہوں نے مکہ کو بھی تاخت و تاراج کیا اور عہد ابراہیمی کی یادگار سنگ اسود کو بھی اُٹھا کر لے گئے۔ یہ بے ادبی اُنہوں نے اپنے ہم مشرب پالیوں (Paulicians) کی تقلید میں کی جنہوں نے ایسفنس میں لوٹ مار مچائی تھی، یوحناولی کے مزار کو مسمار کر دیا تھا اور اُن کے گرجا کو گھوڑوں اور گدھوں کا اصطبل بنا دیا تھا۔ آخر کار خلیفہ معتضد باللہ نے قرامط کا قلع قمع کیا۔

قرامطہ کی بیخ کنی کے بعد اسماعیلیت حکماً ممنوع ہوگئی اور اسماعیلیت کے نام لیوا چن چن کر مارے گئے۔ جب تک عبداللہ المہدی نے (افریقہ کو عباسیوں سے فتح نہ کیا اُس وقت تک اسمٰعیل فرقہ جہاں جہاں بھی تھا روپوش رہا۔

فاطمیان مصر علم و ادب اور سائنس کے بڑے سرپرست تھے لیکن اپنی رعایا میں اشاعتِ علم کے ساتھ ساتھ وہ اُن سیاسی فوائد سے بھی غافل نہ رہے جو اُنہیں عبداللہ ابن میمون کی شروع کی ہوئی تبلیغ سے پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے مقاصد کی خاطر اس کے باطنی اور مانوی عقائد کو کسی حد تک اپنا لیا۔ اُنہوں نے کالج، کتب خانے اور دارِ الحکمت (سائنس کے دار العلوم) قائم کئے، اُنہیں فیاضانہ پیمانے پر کتابیں اور آلاتِ ریاضی مہیا کئے اور کثیر التعداد معلم اُن میں درس دینے کے لیے مقرر کیے۔ کتب خانوں میں جو نادر علمی و ادبی کتابیں تھیں اُن تک ہر خاص و عام کی رسائی تھی اور ہر کوئی کاغذ قلم و

دوات مفت استعمال کر سکتا تھا' خلیفہ آئے دن مجالسِ مباحثہ منعقد کرتا تھا، جن میں اُن درس گاہوں کے مختلف شعبوں کے معلم، منطقی، ریاضیات دان، مقنن، طبیب، خلعتیں پہنے ہوئے شامل ہوتے تھے۔ انگلستان کی یونیورسٹیوں میں آج تک گاؤن پہنے جاتے ہیں اُن میں عربی خلعت یا کفتان کی وضع قطع باقی ہے۔

معلموں اور دوسرے منصب داروں کی تنخواہ کے لیے درس و تدریس کے لوازم کے لیے اور سائنسی تعلیم کے آلات و نمونوں کے لیے ان اداروں کو دو لاکھ ستاون ہزار طلائی سکے سالانہ عطا ہوتے تھے، جو نہایت احتیاط سے لگائے ہوئے حاصل کے ذریعے جمع کئے جاتے تھے۔ ان اداروں میں علم انسانی کے تمام شعبوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مرکزی دارالحکومت کے ساتھ ایک بہت بڑی جلسہ گاہ ملحق تھی، جس میں اسمٰعیلی مسلک کے باطنی نظریوں کے طالبان علم کو ارکان عقیدہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہفتے میں دو بار، یعنی پیر اور بدھ کے دن داعی الادعاۃ مجلسیں منعقد کرتا تھا، جن میں مرد اور عورتیں سفید لباس پہنے ہوئے اور علیحدہ علیحدہ بیٹھے ہوئے شرکت کرتے تھے۔ ان مجلسوں کو مجالس' الحکمۃ کہتے تھے۔ رسمِ داخلہ سے پہلے داعی الداعوۃ خلیفہ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر اُسے وہ خطبہ سناتا تھا جو اس نے مبتدیوں کے سامنے پڑھنے کے لیے لکھا ہوتا۔ خلیفہ خطبہ سُننے کے بعد مسودے کے لفافے پر اپنے دستخط کرتا۔ خطبے کے بعد شاگرد داعی الداعوۃ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے اور دستخط شاہی کو پیشانی سے لگاتے۔ اس جلسہ گاہ میں محرمی کے مختلف مدارج کی جو کیفیت مقریزی نے بیان کی ہے وہ فری میسنری کی ایک بیش بہا روداد ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ قاہرہ کی جلسہ گاہ اُن تمام لوجوں (Lodges) کا نمونہ بنی جو بعد میں عیسائی ممالک میں قائم کی گئیں۔ عبداللہ ابن میمون نے محرمی کے ساتھ درجے مقرر کئے تھے، وہ اس لیے کہ سات ایک مقدس عدد تھا؛ سیارے سات تھے، ہفتے میں سات دن تھے اور اماموں کی تعداد سات تھی۔ قاہرہ میں یہ ہوا کہ مصر قدیم میں جو قاعدہ تھا کہ مندر کا سب سے بڑا پجاری لوگوں کو مذہب کے اسرار بتاتا تھا وہ مانوی رسوم پر عائد ہوگیا۔ چنانچہ وہاں درجوں کی تعداد نو ہوگئی[1]۔ سب سے مشکل درجہ پہلا درجہ تھا اور اس میں مبتدی کے ذہن کو سانچے

---

[1] محرمی کے مختلف مرحلوں کی ایک نہایت عمدہ روداد ڈ ساسی (De Sacy) نے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں ڈھالنے اور اُسے باطنی نظریئے پر اندھا دھند ایمان اور اس کی غیر مشروط اطاعت کی قسم اُٹھانے پر آمادہ کرنے کے لیے بڑی مدت درکار ہوتی تھی۔ اس کے بعد معاملہ سیدھا سادہ ہو جاتا تھا: نو مرید سے رفتہ رفتہ سارے نظریئے تسلیم کرا لیے جاتے تھے اور اُسے فرقے کا بول بالا کرنے کے عزم کا آلہ کار بننے پر آمادہ کر لیا جاتا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۳) Journal Asiatique (جلد اول، صفحہ ۲۹۸) میں دی ہے۔ مبتدی کو پہلے درجے کا حلف اُٹھانے کی ترغیب دلانے کی خاطر اس کے دماغ کو شکوک و شبہات سے مذبذب کر دیا جاتا تھا۔ اثباتی مذہب اور عقل کے درمیان جو تضادات تھے انہیں بیان کیا جاتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جتایا جاتا تھا کہ ظاہری ولغوی مفہوم کے پس پردہ ایک زیادہ گہرا مطلب تھا۔ الفاظ محض چھلکے تھے اور مخفی مطلب اصل مغز تھا۔ لیکن جب تک مبتدی ایک غیر مشروط قسم نہ کھاتا اس وقت تک اس کی یہ خواہش کہ اسے مخفی مطلب سمجھایا جائے پوری نہ کی جاتی تھی۔ جب وہ غیر مشروط قسم کھا لیتا تھا تو اُسے دوسرے درجے میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ اس درجے میں اُسے یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے اماموں پر ایمان لائے، جو ہر قسم کے علم کا منبع تھے۔ جب اُس کا ایمان اُن اماموں پر پختہ ہو جاتا تو تیسرے درجے کی تعلیم شروع ہو جاتی۔ اُس میں اُسے یہ بتایا جاتا تھا کہ اماموں کی تعداد سات سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ جس طرح خدا نے سات آسمان، سات زمینیں، سات سمندر، سات سیارے، سات رنگ، سات سر، سات دھاتیں بنائی ہیں، اسی طرح اُس نے اپنے سات برگزیدہ ترین بندوں کو اپنے مکشوف امام بنا کر بھیجا ہے، یہ ہیں علی رضی اللہ عنہ، حسن رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ، علی ثانی (زین العابدین)، محمد الباقر، جعفر الصادق اور اُن کے بیٹے اسمٰعیل جو ساتویں اور آخری امام ہیں۔ چوتھے درج میں یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ ابتداء آفرینش سے سات ناطق آئے ہیں۔ جن میں کلامِ الٰہی مجسم تھا اور جن میں سے ہر ایک نے حکم ربی سے اپنے پیش رو کے نظریوں کو منسوخ کیا۔ ہر ناطق کے ساتھ نائب تھے، جو ایک ناطق اور دوسرے ناطق کے درمیان یکے بعد دیگرے آئے۔ چونکہ انہوں نے اپنے آپ کو ظاہر نہ کیا اس لیے اُنہیں صامت کہا جاتا ہے سات ناطق یہ تھے: آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اسمٰعیل علیہ السلام ابن جعفر الصادق (یا امام فرمان) اُن کے سات نائب حسب ذیل تھے۔ شیث شیم، اسمٰعیل ابن ابراہیم، ہارون، شمعون، علی رضی اللہ عنہ اور محمد ابن اسمٰعیل۔ ہر ناطق کے ساتھ ایک صامت کو وابستہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہادیوں اور نبیوں کو اس امر کی آزادی ہو کر وہ جسے چاہیں اپنے وقت کا صامت نامزد کریں۔ پانچویں درجے کی تعلیم اس پر مشتمل تھی کہ دینِ حق کی اشاعت کے لیے ہر صامت کے ساتھ بارہ نقیب وابستہ تھے، کیونکہ سات کے بعد بارہ سب سے متبرک عدد ہے، چنانچہ بارہ برج ہیں بارہ مہینے ہیں اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے ہیں۔ چھٹے درجے میں مانویت کے اصول مبتدی کے دل میں جاگزیں کیے جاتے تھے اور جب تک وہ اُن کی حکمت کو پوری طرح تسلیم نہ کرتا تھا اُس وقت تک اسے ساتویں درجے میں داخل نہ کیا جاتا تھا، جہاں وہ فلسفے سے تجاوز کر کے تصوف کی اقلیم میں قدم رکھتا تھا۔ ساتویں درجے سے گزرنے کے بعد وہ عارفین کے زمرے میں شامل ہو جاتا تھا۔ آٹھویں درجے میں وہ اثباتی دین کی تکالیف شرعی کی بیڑیاں اپنے پاؤں پر سے اُتار پھینکتا تھا۔ پردہ اس کی آنکھوں کے آگے سے اُٹھ جاتا تھا اور اس کے بعد وہ چونکہ خود پاک و صاف ہوتا تھا اس لیے ہر چیز اُس کے لیے پاک و صاف ہوتی تھی۔ ان نظریوں میں جو رجحان مضمر ہے وہ بیان کی بہ نسبت تصور کی مدد سے بہتر سمجھا جا سکتا تھا۔

مہدیہ اور اس کے بعد قاہرہ کی مجلس گاہیں اس طرح ایک وسیع اور دور رس سیاسی پروپیگنڈا کے مرکز بن گئیں۔ لیکن جن نظریوں پر وہ کاربند تھیں اُن کا علم صرف معدودے چند لوگوں کو ہوتا تھا، الیوس[1] (Eleusis) کی پراسرار رسوم اور ٹمپلروں[2] (The Templers)، الیومیناتی[3] (The Iluminati) اور فرانس کے انقلابیوں کے مخفی نظریوں کی طرح باطنی نظریے صرف چیدہ چیدہ اور آزمودہ افراد کو کلی یا جزئی طور پر بتائے جاتے تھے: کلی طور پر صرف ایسے لوگوں کو جنہیں دشمنوں کی طاقت کو کمزور کرنے کی خاطر استعمال کرنا منظور ہوتا تھا۔ عوام اور نامحرموں کے لیے سرکاری مذہب اسلام تھا، اور اسلام کے اخلاقی احکام اور شرعی حدود کی نہایت سخت گیری سے پابندی کروائی جاتی تھی۔ بیشتر خلفاء جن میں معز خاص طور پر ممتاز تھا، بڑے متدین و متقی اور پابندِ شریعت تھے[4]۔

میں نے ایک اور جگہ مختلف سنی فرقوں کے قانونی اختلافات تفصیلاً بیان کئے ہیں۔ اُن کے نظری اختلافات میں آدابِ عبادت کی جزئیات بھی شامل ہیں جن سے تفصیلی بحث اس کتاب میں، جو عام طلباء کے لیے ہے ضروری نہیں۔ بہر حال اتنا بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ حنبلی نہایت بین طور پر تشبیہی تھے۔ اُن کے نزدیک خدا ایک انسان نما ہستی تھا جو آسمان پر تخت نشین تھا۔ دوسرے فرقوں کے یہاں یہ تصور اقتضائے زمانہ اور قومی طبیعت کے مطابق متنوع شکلوں میں پایا جاتا تھا لیکن سب میں عنصر تشبیہیت تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان فرقوں میں سب سے زیادہ وسیع الخیال فرقہ حنفیہ تھا۔ اس کے برخلاف شافعیت اور مالکیت دونوں اپنی ہمدردیوں اور خیالات میں تنگ اور محدود تھیں۔

---

[1] قدیم یونان کا ایک مقام جہاں دیمیتر دیوتا اور پرسیفونی دیوی کے اعزاز میں مخفی مذہبی رسوم ہر سال ادا کی جاتی تھیں۔

[2] فری میسوں کی ایک جماعت۔

[3] عیسائیوں کا ایک فرقہ جو خاص دماغی اور روحانی قوتوں کا مدعی ہے۔

[4] محسن فانی لکھتا ہے: ''ائمۂ اسمٰعیلیۂ مغرب ہمہ مقید بامور شروع بودند'' کہا جاتا ہے کہ قاہرہ کا چھٹا فاطمی خلیفہ حاکم بامراللہ، جسے آج کل بھی دورزی (اسمٰعیلیوں کی ایک شاخ) خدا کا اوتار تصور کرتے ہیں، شقاوت کا مجسمہ تھا۔ اس کی سیرت ایک عجیب وغریب اجتماعِ ضدین تھی۔

مرورِ زمانہ کے ساتھ جیسے جیسے آمریت لوگوں کی عادات و رسوم پر مسلط ہوتی گئی اور خلیفہ یا سلطان مقنن یا فقیہ کی مداخلت کے بغیر ان کی قسمتوں کا مختار بنتا گیا، ملایانہ آبائیت تمام طبقوں کے دلوں پر قبضہ جماتی چلی گئی۔ آبائے کلیسا کے اعلانوں کی طرح آبائے فقر اسلامی کے احکام نے قوانین کی حیثیت اختیار کر لی۔ حنفی اپنے آپ کو اہل الرائے و القیاس کہتے تھے اور اُن کے حریف فرقوں نے بھی انہیں یہی خطاب دیا۔ اس کے مقابلے میں دوسرے فرقے اہل الحدیث کہلاتے تھے لیکن مدت ہوئی کہ حنفی بھی امورِ شرعی یا نظری میں ذاتی رائے سے کام لینا ترک کر بیٹھے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ آبائے دین جو فیصلے کر گئے ان میں تصرف یا اُن پر بحث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام اسکیموؤں کے ملک میں جاتا ہے تو جائے لیکن اُسے اپنے ساتھ وہ سارے قاعدے قانون لے جانے ہوں گے جو عراقیوں کے لیے بنائے گئے تھے۔

آبا پرستی نے یوں سنی حلقے کے اندر ترقی کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے لیکن سنی مذہب نے وحدتِ عقیدہ و عمل کو قائم رکھنے کی خاطر جو کوششیں کی ہیں وہ گزشتہ سو سالوں میں دو اندرونی بغاوتوں کا باعث ہوئی ہیں۔ وہابیت جس نے اُنیسویں صدی کے آغاز میں خروج کیا، صحرائے عرب سے اٹھی۔ غیر مقلدیت، جو برسرِ اقتدار مذہب کی سخت گیر فریسیت سے راہ فرار ڈھونڈتی ہے، دل انسان کے اندرونی سرچشموں سے نکلی غیر مقلدوں کو وہابیوں کے ساتھ خلط کر کے اُن سے ناانصافی کی گئی ہے۔ وہ بلا شک وشبہ تمام دوسرے سنی مسلکوں کے پیروؤں کے مقابلے میں زیادہ فلسفی مزاج اور عقلیت پسند ہوتے ہیں۔ غیر مقلدیت تنگ نظر اور محدود ضرور ہے لیکن پھر بھی وہ سنی مذہب کی واحد تحریک ہے جس کے مستقبل سے اُمیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

وہ مباحثہ جو یورپ میں ریفارمیشن (The Reformation) کا پیشہ خیمہ بنا حنفیوں میں شروع ہو گیا ہے اور یقینی ہے کہ بہت جلد مسلمانوں کے دوسرے فرقوں اور مسلکوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ کیا قرآن کے ترجمے عربی زبان کے قرآن کے مساوی رُتبہ رکھتے ہیں؟ اگر کوئی شخص جو عربی سے نابلد ہے۔ اپنی زبان میں نماز ادا کرے تو کیا اس کی نماز اُتنی ہی مستحق ثواب ہوگی جتنی حجاز کی زبان میں ادا کی ہوئی نماز؟ یہ

ہے نوعیت اُن سوالوں کی جنہوں نے اس وقت ہندی مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کر رکھا ہے۔ یہ مباحثہ کافی باہمی رنجشوں اور تلخ کلامیوں کا باعث ہوا ہے، یہاں تک کہ اس نے راسخ العقیدہ علماء سے تکفیر کے فتوے بھی صادر کرائے ہیں۔ موجودہ مفادات کے محافظین ہر جدت پر جو اعتراض ہمیشہ کرتے چلے آئے ہیں اُس کا جواب اصلاحی تحریک کے رہنما ذیل کے سوالوں کی صورت میں دیتے ہیں: کیا عربی واحد زبان ہے جسے اللہ تعالیٰ سمجھتا ہے؟ اگر اُس کا مقصد عبادت گزار کو خدا کے قریب لانا اور اس میں صفائے قلب پیدا کرنا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ عبادت گزار ایسے الفاظ کو جن کا مطلب وہ بالکل نہیں سمجھتا اناپ شناپ منمنا کر اپنی طبیعت میں وہ بلندی محسوس کرے جو عبادت سے پیدا ہونی چاہیے؟ استدلال سے آگے بڑھ کر وہ رسول خدا کی مثال پیش کرتے ہیں جنہوں نے ایرانی نومسلموں کو اپنی زبان میں نماز ادا کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ تحریک، جس سے یورپ کے لوگ بھی نا آشنا ہیں، اپنے اندر نشوونما کے بڑے امکانات رکھتی ہے۔ یہ اسلام میں ریفارمیشن کی ابتداء ہے۔ اب تک قرونِ وسطیٰ کے پادریوں کی طرح اسلام کے علمائے دین ایک ایسی زبان کا علم رکھنے کی بدولت جس سے جمہور اور حکام دونوں نابلد ہیں چھائے رہے ہیں۔ جس دن وہ اصول جس کی خاطر مصلحین سرگرم کار ہیں تسلیم ہو گیا اُسی دن یہ ضروری ہو جائے گا کہ جو قوانین نویں اور دسویں صدی عیسوی میں ایسے لوگوں کے لیے بنائے گئے تھے جنہیں آج کل کی تہذیب و تمدن سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا وہ ایک ہزار سالوں کی روشنی میں سمجھے اور سمجھائے جائیں۔

خارجیت کو کبھی کبھی سُنی مذہب کی ایک شاخ سمجھا گیا ہے۔ اگرچہ درحقیقت وہ سُنی مذہب کے قیام سے بہت پہلے وجود میں آئی۔ جن سرکش لشکریوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فتح صفین کے جان جوکھوں سے کمائے ہوئے ثمر سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا اور بعد میں نہروان کے مقام پر اُن کے خلاف بغاوت کر دی، خارجی کا نام پہلے پہل اُن کو دیا گیا (خارجی کے معنی ہیں مغرور یا باغی) شہرستانی نے اس شورش کی سرگزشت بڑی صراحت سے بیان کی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس پر مُصر تھے کہ خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابو موسیٰ علیہ السلام اشعری کو محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمائندہ مقرر کریں، اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دل گواہی نہ دیتا

تھا کہ ابو موسیٰ علیہ السلام اس کے لیے موزوں ہیں۔ تحکیم کی شرائط طے ہوئی ہی تھیں کہ یہ سپاہی پیشہ ور ماہرین دینیات۔ اسلام کے یہ متعبدین ایک دوسرے کے ساتھ اس بحث میں الجھ گئے کہ آیا کسی امر دینی کو انسانی فیصلے کا موضوع بنانا جائز ہے یا نہیں۔ مسلمانوں کو دشمنوں کی آنکھوں کے سامنے ایک دوسرے کا کشت و خون کرنے سے روکنے کی خاطر حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی فوج کے بیشتر حصے کو ساتھ لے کر عازم کوفہ ہو گئے اور تحکیم کے نتیجے کا انتظار کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا دستہ دومتہ الجندل میں چھوڑ گئے۔ باغیوں نے کوفہ پہنچتے ہی بارہ ہزار کی تعداد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ دیا اور نہروان جا کر عساکر مملکت کے خلاف ایک خطرناک مورچہ قائم کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طبیعت چونکہ خونریزی سے نفور تھی، اس لیے انہوں نے ان لوگوں کو بار بار تاکید کی کہ جادہ اطاعت پر لوٹ آئیں۔ اس کا جواب انہوں نے اُن کے قتل کی دھمکی سے دیا۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پیمانہ تحمل لبریز ہو گیا۔ چنانچہ اُن پر حملہ کر دیا گیا اور اُنہیں دو لڑائیوں میں شکست دی گئی۔ شہرستانی کہتا ہے کہ چند باغی بچ کر بھاگ گئے اور بحرین جا کر، جو اسلام کے تمام شتر ان بے مہار کی جائے پناہ تھا، اُنہوں نے اس خطے کے غیر متمدن باشندوں میں اپنے فتنہ انگیز نظریئے پھیلائے۔ عبدالملک کے زمانے میں اُنہوں نے دوبارہ سر اٹھایا لیکن منہ کی کھا کر واپس چلے گئے اور احساء اور بحرین میں ان کے جو قلعے تھے۔ اُن میں گھس کر چھپ گئے۔ مروان ثانی کے عہد میں وہ پھر نکلے اور یمن، حجاز اور عراق میں پھیل گئے۔ اُن پر حملے کئے گئے اور اُنہیں شکست دے کر عمان میں پناہ لینے پر مجبور کیا گیا جہاں وہ آج تک آباد ہیں۔ عباسیوں کے دورِ خلافت میں انہوں نے افریقہ کے بربروں میں اپنے نظریوں کی اشاعت کی اور بربروں سے خلفائے بغداد کے خلاف مکرر بغاوتیں کرائیں۔ خوارج کو اسلام کے کیلونسٹ (Calvinists) کہنا چاہیے۔ اُن کے نظریئے تاریک درشت، مسرت سے عاری اور تعصب سے مملو ہیں۔ وہ کٹر قسم کے جبریہ ہیں۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد کسی خلیفہ کی امامت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اپنے سرداروں کو ائمہ برحق تصور کرتے ہیں۔ جہاں دوسرے سنی امام کے لیے یہ لازمی قرار دیتے ہیں کہ وہ قریشی اور آزاد ہو وہاں خارجی اسے ضروری نہیں سمجھتے۔ اُن کے نزدیک غیر قریشیوں اور غلاموں کو بھی خلیفہ منتخب ہونے کا حق ہے۔ شہرستانی

خارجیوں کو چھ گروہوں میں تقسیم کرتا ہے جن میں سب سے اہم یہ ہیں: ازارقہ (ابو رشید نافع ابن ازرق کے پیرو) اباضیہ (عبداللہ ابن اباض کے پیرو جس کا خروج آخری اموی خلیفہ مروان کے عہد میں ہوا) نجد العازدیہ (نجدۃ ابن عام کے پیرو) عجاردہ (عبدالکریم بن عجرد کے پیرو) اور سفیریتہ الزیادیہ۔

ان فرقوں میں ازارقہ سب سے بڑھ کر کٹر، اکل کھرے اور تنگ نظر ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ ان کے سوا سب فرقے واصل بجہنم ہوں گے۔ اس لیے انہیں یا تو جبراً راہ راست پر لانا چاہیے یا نیست و نابود کر دینا چاہیے کسی مشرک کو زندہ نہ رہنے دینا چاہیے مشرک کی اصطلاح کو وہ بڑے وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور اس میں مسلمانوں عیسائیوں اور یہودیوں سب کو شامل کر لیتے ہیں) تمام گناہوں کا اُن کے نزدیک ایک ہی درجہ ہے۔ قتل، زنا، خمر، تمباکو نوشی سب اُن کے مذہب میں مستوجب عذاب ہیں۔ جہاں دوسرے مسلمانوں کا، عام اس سے کہ وہ سنی ہوں یا شیعہ، یہ عقیدہ ہے کہ ہر بچہ مسلمان بن کر دنیا میں آتا ہے اور جب تک تعلیم اُسے بگاڑ نہیں دیتی مسلمان ہی رہتا ہے وہاں ازرقی یہ کہتے ہیں کہ کافر کا بچہ کافر ہوتا ہے۔ جس طرح راسخ العقیدہ عیسائیوں کا یہ ایمان ہے کہ جس بچے کو بپتسمہ نہ دیا گیا ہو وہ دوزخ میں جائے گا اسی طرح خارجی یہ رائے رکھتے ہیں کہ جس بچے کو کلمہ نہ پڑھایا گیا ہو اس کی نجات نہیں ہو سکتی۔ حجاج بن یوسف نے ازرقیوں کا قلع قمع تو کر دیا لیکن اُن کے سنگدلانہ نظریوں نے صدیوں کے بعد وہابیت کی صورت میں عود کیا۔

اباضیہ ازارقہ سے یقیناً کم متعصب ہیں۔ وہ زیادہ تر عمان میں آباد ہوئے اور ابھی تک مسقط میں پائے جاتے ہیں۔ ازارقہ اور اُن کے بعد وہابی اباضیہ کے ساتھ برسر جدال رہے۔

اباضیہ کے نزدیک عامتہ مسلمین مُلحد تو ہیں لیکن مشرک نہیں۔ اس لیے اُن کے بیٹے بیٹیوں کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ اس امر میں اور بہت سے دوسرے امور میں وہ ازارقہ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ اپنے فرقے کے لوگوں کے خلاف دوسرے مسلمانوں کی گواہی قبول کرتے ہیں اور حالت، جنگ کے سوا دوسرے مسلمانوں کے مال پر قبضہ کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ جہاں تک کافروں کے بچوں کے کافر ہونے کا سوال ہے شہر

ستانی کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کرتے لیکن اصحاب کبار پر تبرا بھیجنے کے معاملے میں وہ ازارقہ سے متفق ہیں۔

اباضیہ اب تک عمان پر قابض رہے ہیں۔ وہابیوں نے اُن پر جوز بردست دباؤ ڈالا اُس کے باوجود وہ مشرقی عرب کے ساحل پر اپنا اقتدار قائم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں، لیکن وہ بڑی سرعت سے مسلمانوں کی عام جماع میں مدغم ہوتے جارہے ہیں۔

مسٹر پیلگریو (Mr. Palgrave) نے اپنی کتاب (Travels in Central Arabia) میں وہابیوں کا نقشہ قدرے خوش آئند رنگوں میں کھینچا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ بلاواسطہ اُن ازرقیوں کے جانشین ہیں جنہوں نے حجاج بن یوسف کے ہاتھوں شکست کھا کر وسطی عرب میں پناہ لی۔ محمد بن عبدالوہاب کے عقائد ونظریات نافع بن ازرق کے پیروؤں کے عقائد ونظریات سے نہایت قریب کی مشابہت رکھتے ہیں۔ ازرقیوں کی طرح وہابی بھی تمام دوسرے مسلمانوں کو مشرک کہتے ہیں اور اُن کا مال لوٹنے اور انہیں غلام بنا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ آج کل کے مسلمانوں میں جو تشبیہ پرستانہ رسوم رائج ہیں اُن کے خلاف وہابیوں کی بغاوت چاہے کتنی ہی قابل تحسین ہو، حقیقت یہ ہے کہ نجد کے اخوان کی طرح دین اور خدا کی حاکمیت کے بارے میں وہ جو عقائد رکھتے ہیں اُن میں کیلون (Calvin) کے پیروؤں کے خیالات کی سی سختی ہے اور وہ ترقی اور نشوونما سے متصادم ہیں۔

بابیت انیسویں صدی کے اوائل میں ایران میں نمودار ہوئی اُسے بہت خوشگوار رنگوں میں بھی اور بہت ناخوشگوار رنگوں میں بھی پیش کیا گیا ہے مسلم اہل الرائے کے نزدیک وہ مزدکیت یعنی ایک قسم کی مشرقی اجتماعیت واشترائیت کے سوا کچھ نہیں۔ بابیوں کے یہاں مردوں اور عورتوں کی جو ملی جلی مجلسیں ہوتی ہیں انہیں اُنہی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے جن نگاہوں سے ابتدائی عیسائیوں کی عشقیہ ضیافتوں (Agapae) کو پرانے مذہبوں کے لوگ دیکھتے تھے۔ دوسری طرف ایک یورپی عالم جو تحقیق اور فضیلت میں اونچا پایہ رکھتا ہے اور جس نے بابیوں کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور اُن کے ساتھ دوستانہ میل جول رکھا ہے بابیت کے بارے میں کہتا ہے کہ ایرانیوں کی سرشت میں جو وحدالوجودی میلانات مضمر ہیں اُن کے اندر سے خذ ما صفا ودع ما کدر کا جو انقلاب اُبھر رہا ہے یہ اس

کے تازہ ترین مظاہر میں سے ہے۔

یہی مصنف کہتا ہے کہ محمد شاہ کے زمانہ حکومت میں ملاؤں اور مذہبی عمال کی ریائی پارسائی اور بدکرداری اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ تغیر ناگزیر ہو گیا تھا۔ لوگوں کی سیاسی اور معاشرتی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان حالات میں شیراز کے ایک ملا، مرزا علی محمد نے جو فاطمی خیال کیا جاتا ہے اور جو بہت سا مطالعہ اور بہت سی سیر و سیاحت کر چکا تھا، حج سے بھی مشرف ہو چکا تھا اور کافی مدت تک عرب اور شام میں بود و باش بھی کر چکا تھا، ایران میں معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کی ایک تحریک شروع کی۔ اس نے عام ملاؤں کے نمائشی زہد کی مذمت کی اور انہیں اس پر زجر و توبیخ کی کہ وہ نواہی و مکروہات کو مباح بنانے کی خاطر مشتبہ حدیثوں کو قبول کرتے ہیں۔ اُس کی باتیں لوگوں کے دل کو لگیں اور انہوں نے جوش و خروش سے اُس کے خیالات کا خیر مقدم کیا۔ بہت سے لوگ آ کر اس کے مرید ہو گئے جن میں قزوین کی ایک نوجوان عورت بھی تھی جس کی علمیت اور فصاحت و بلاغت اس کی تحریک کے حق میں ایک قوی پشت پناہ ثابت ہوئی۔ اس نوجوان عورت کا نام قرۃ العین تھا۔ نہ جانے مریدوں کی خوشامد نے مرزا علی محمد کا دماغ خراب کر دیا یا خود بخود اس کے دل میں تکبر پیدا ہو گیا۔ بہر حال ہوا یہ کہ اس پر ہمہ اوست کی دیوانگی کا دورہ پڑا اور اس نے اپنے آپ کو باب حضرت اعلیٰ کے لقب سے ملقب کر کے جزوِ خدائی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کے پیرووں نے دینی اور ملکی اولی الامر کے خلاف مسلح بغاوت کر دی لیکن شکست کھائی۔ ملاؤں کے تعصب اور سیاسی مصلحتوں نے مل کر بیخ کنی اور تشدد کی ایک ایسی مہم شروع کی جس کے لیے اور تو اور گوبینو بھی خود بابیوں کو قابل الزام ٹھہراتا ہے۔ باب اپنے بیشتر ممتاز مریدوں کے ہمراہ قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس کی تعلیمات زندہ رہیں۔ اس کے معاشرتی احکام گوبینو کی رائے میں اُس وقت کے مسلمہ نظریوں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ وہ نکاح کے رشتے کو بہت اہم سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب تک پہلا نکاح قائم رہے اس وقت تک دوسری بیوی کی اجازت صرف چند شرائط کے ماتحت دیتا تھا۔ جاریہ بازی کو اس نے یک قلم حرام قرار دیا، طلاق کی ممانعت کی اور عورتوں کو بے پردہ سر عام آنے جانے کی اجازت دی۔ پردے کی رسم، جیسا کہ گوبینو منصفانہ طور پر کہتا ہے، بڑی

خرابیاں پیدا کرتی ہیں اور بچوں کی ابتدائی تعلیم پر بہت مضر اثر ڈالتی ہے یہ رسم کسی حکم دینی پر مبنی نہیں، بلکہ محض بغرض سہولت وجود میں آ گئی ہے۔ ایران پاستان کے بادشاہ اسے رعب داب کی ایک نشانی سمجھ کر اس پر عمل کرتے تھے۔ مسلمان بادشاہوں اور امیروں نے اُسے اُن کی تقلید میں اختیار کیا۔ عربوں کے یہاں قبائلی عورتیں پوری آزادی سے اندر باہر آتی جاتی ہیں۔ بیت نبوی ﷺ کی خواتین مطہرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہم کلام ہوتی تھی اور اُن سے گھر پر ملاقات کرتی تھیں، بلکہ بسا اوقات مردوں کے ساتھ کھانا کھاتی تھیں۔ لہٰذا گوبینو کی رائے میں مرزا علی محمد نے عورتوں کو اس نقصان دہ دستور کے بندھنوں سے آزاد کرنے کی جو کوشش کی اس میں کوئی بدعت نہ تھی۔ اس کے مذہبی نظریئے اساسی طور پر وحدت الوجودی ہیں۔

جہاں تک اس کے اخلاقی ضابطے کا تعلق ہے، وہ ڈھیلا نہیں بلکہ بے حد خراب ہے۔[1]

بعض مسلم مصنفین نے اسلامی فرقوں کو دو جامع گروہوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی اہل باطن، جو احکامِ شریعت کے معنی کو دیکھتے ہیں اور اہلِ ظاہر، جو محض اُن کے لغوی معنوں پر انحصار کرتے ہیں۔ لیکن اہل باطن کو باطنیہ کے ساتھ خلط نہیں کرنا چاہئے اہل باطن کے گروہ میں صوفیہ، متکلمین اور اربابِ فکر شامل ہیں، یعنی زمخشری کے الفاظ میں 'ایسے تمام لوگ جو کمالِ الٰہی کی جڑوں کو اپنے دل کے اندر نصیب کرتے ہیں۔'' وہ لوگ جو انسانی محاسن کے بلند ترین درجے حاصل کرنے کے لیے جدو جہد کرتے ہیں، وہ لوگ جو احکام شریعت پر کار بند رہتے ہوئے اُن کے اندر یہ منشائے ربی دیکھتے ہیں کہ دنیا کی قوموں میں اتفاق، ہم آہنگی، امن و آشتی اور باہمی خیر خواہی کو فروغ دیا جائے۔

---

[1] اس قابلِ ملاحظہ مذہبی تحریک سے تازہ ترین بحث، بابی نقطہ نگاہ سے، پروفیسر ای، جی براؤن (Professo r E.G. Browne) نے اپنی کتاب بابی تصنیف ''تاریخ جدید'' کا ترجمہ ہے۔ پروفیسر براؤن نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہایت دلچسپ ہے۔ ''تاریخ جدید' میں قرۃ العین کی دلفریب شخصیت کا نہایت عمدہ نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس عظیم مستشرق نے اپنی نئی کتاب Materials of the Study of The Babi / Religion میں بابی مذہب کی نشو و نما اور اشاعت کے بارے میں بہت سا مزید مواد مہیا کیا ہے۔ بہائیت، جو اس کی تازہ ترین صورت ہے، زیادہ تر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں رائج ہے۔ اس نے بڑی حد تک کرسچن سائنس (Christian Science) کے نظریوں کو اپنا لیا ہے۔

(تعلیقات زیرنظر بات کے آغاز سے متعلقہ)

والئی مصر کا نام عبداللہ سعد بن ابی سرح تھا (ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ مؤلفہ ابن کثیر جلد ۷، صفحہ ۱۷۰ طبع مصر) یہ خط اسی والی مصر کی طرف لکھا گیا تھا (ایضاً ۱۷۵) نہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف مروان بن حکم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علم و اطلاع کے بغیر اس پر مہر خلافت ثبت کردی تھی (ایضاً ۱۸۶ تفصیلات کے لیے دیکھئے ص ۱۶۶ تا ۲۲۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل کے موقع پر میدانِ جنگ میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے الگ الگ گفتگو کی، جس سے متاثر ہو کر یہ دونوں حضرات جنگ سے کنارہ کش ہو گئے، لیکن اتنے میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو تیر مارا گیا جس کے نتیجے میں ان کی موت واقع ہوئی (ایضاً ۲۴۶، ۲۴۷) حضرت زبیر رضی اللہ عنہ جنگ سے دستبردار ہو کر واپس جا رہے تھے کہ ایک شخص نے نماز کی حالت میں ان پر تلوار کا اس قدر شدید وار کیا کہ ان کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سانحہ پر سخت افسوس اور خفگی کا اظہار فرمایا۔ (ایضاً ۲۴۸، ۲۴۹)

نواں باب

اِسلام ادبی و سائنسی رُوح

رسولِ عربی ﷺ کو علم اور سائنس سے جو محبت تھی اور جو آپ ﷺ کو تمام دوسرے معلمین دین سے امتیاز بخشتی اور جدید دنیائے فکر سے آپ ﷺ کو ایک نہایت قریبی رشتہ موانست میں منسلک کرتی ہے ہم اس کا تذکرہ اوپر کر آئے ہیں۔ مکہ پر کفار کا قبضہ ہو جانے کے بعد اسلام کی جمہوری حکومت الٰہیہ کا مستقر، مدینہ مرجع خلائق بن گیا جہاں نہ صرف عرب کے مختلف حصوں سے بلکہ دور و دراز ملکوں سے بھی طالبان حق جوق در جوق آنے لگے۔ مدینے کی شہرت ایرانیوں، شامیوں، عراقیوں، افریقیوں، غرض مختلف رنگوں اور نسلوں کے لوگوں کو دیار شمال و مغرب سے کھینچ کھینچ کر لانے لگی۔ بعض لوگ تو غالباً محض یہ دریافت کرنے کے لیے آئے کہ مدینے میں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن بیشتر لوگ تحصیل علم اور پیغمبر اسلام ﷺ کی باتیں سننے کے لیے عازم مدینہ ہوئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک محبوب موضوع علم کی قدر و منزلت تھا۔ ''علم حاصل کرو، کیونکہ جو شخص راہِ حق میں علم حاصل کرتا ہے وہ ایک کارِ تقویٰ انجام دیتا ہے، جو شخص اس کا ذکر کرتا ہے وہ خدا کی حمد و ثنا کرتا ہے جو شخص اس کی جستجو کرتا ہے وہ خدا کی عبادت کرتا ہے۔ جو شخص علم کو دوسروں تک پہنچاتا ہے وہ خیرات تقسیم کرتا ہے جو شخص ایسے لوگوں کو جو علم کے اہل ہیں علم بخشتا ہے وہ ایک عمل صالح کرتا ہے۔ علم جس کے پاس ہو اُس کو اس امر کی استعداد عطا کرتا ہے کہ ممنوعہ اور غیر ممنوعہ چیزوں میں امتیاز کر سکے۔ وہ ہمارے لیے آسمان کی شمع راہ ہے، وہ صحرا میں ہمارا رہبر، خلوت میں ہمارا انیس اور بے یاری کے عالم میں ہمارا یار ہے۔ وہ خوشی میں ہمیں راہِ

راست پر رکھتا ہے اور غم میں ہماری ڈھارس بندھاتا ہے، وہ دوستوں کی بزم میں ہماری زینت ہے اور عرصہ رزم میں ہمارا حربہ دفاع۔ علم کی مدد سے خدا کا بندہ نیکی کی بلندیوں کو پالیتا ہے، شرف کے مدارج حاصل کرتا ہے، اس دنیا میں بادشاہوں کا ہم صحبت بنتا ہے اور دوسری دنیا میں سعادت ابدی سے بہرہ ور ہوتا ہے۔"

آنحضرت ﷺ اکثر فرمایا کرتے تھے:۔

"عالم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے۔" اور آپ ﷺ اکثر اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تاکید کیا کرتے تھے کہ "علم چین میں ہو تو وہاں سے بھی اُسے حاصل کرو۔" "وہ شخص جو علم کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے خدا کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔" "جو شخص علم کی جستجو میں سفر کرتا ہے اُسے خدا جنت کا راستہ دکھاتا ہے۔"

قرآن خود علم اور سائنس کی فضیلت پر شاہد ہے۔ زمخشری سورۂ العلق کی تفسیر میں قرآن کے الفاظ کا منشاء یوں واضح کرتا ہے۔ "خدا نے انسانوں کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہ جانتے تھے اور یہ اس کی رحمت کی ایک بڑی نشانی ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو اُن چیزوں کا علم بخشا جن سے وہ ناواقف تھے۔ اس نے انہیں جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی عطا کی اور انہیں فن تحریر کی بیش بہا برکات سے آگاہ کیا کیونکہ اس کی بدولت ایسے بڑے بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں جن کا حال صرف خدا کو معلوم ہے۔ تحریر کے علم کے بغیر نہ دوسرے علوم پر عبور حاصل ہوسکتا، نہ سائنس کے مختلف شعبے احاطہ علم میں لائے جاسکتے، نہ قدماء کی تاریخ سے واقفیت بہم پہنچائی جاسکتی، نہ اُن کے اقوال محفوظ رکھے جاسکتے، نہ کتب آسمانی قلمبند کی جاسکتیں۔ اگر یہ سارے علوم موجود نہ ہوتے تو امورِ دین و دنیا کا انتظام ممکن نہ ہوتا۔"

ظہورِ اسلام کے وقت تک اس خطے میں جو صحیح معنوں میں دنیائے عرب کہلاتا ہے یعنی جزیرہ نمائے عرب اور اُس کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں چند علاقے علم و دانش کی نشوونما کے کوئی آثار ہویدا نہ ہوئے تھے۔ شاعری، خطابت اور نجوم (محض عدالتی فیصلوں کے لیے) ماقبل اسلام کے عربوں کے مرغوب مشغلے تھے لیکن سائنس اور ادب کے دلدادہ مفقود تھے۔ ہادیٔ اسلام کی تلقین نے عرب قوم کی سوئی ہوئی قوتوں کو جگا کر اُن

میں ایک نئی حرکت پیدا کر دی۔ آپ کی مدت حیات کے اندر ہی ایک تعلیمی ادارے کی داغ بیل پڑ گئی جس کی بنیاد پر آئندہ سالوں میں بغداد، سالرنو، قاہرہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ یہاں معلم اسلام بنفس نفیس صفائے قلب اور پاکیزگی روح پیدا کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ ''صانع حقیقی کے کاموں پر ایک گھنٹے کا غور و تامل سو سالوں کی عبادت سے بہتر ہے۔ علم و حکمت کا سبق سننے میں ہزار شہیدوں کی نمازِ جنازہ پڑھنے یا ہزار راتیں قائم الصلٰوۃ رہنے سے زیادہ ثواب ہے۔'' ''جو طالب علم تلاش علم میں نکلے گا، خدا اُسے جنت الماویٰ میں اونچا مقام دے گا۔ اُس کا ہر قدم مبارک ہے اور اس کے ہر سبق کا اُسے ثواب ملے گا۔'' ''فرشتے جنت کے دروازے پر جویائے علم کا خیر مقدم کریں گے۔'' ''اہل علم کی باتوں کا سُننا اور سائنس کے سبقوں کا دل پر نقش کرنا مذہبی ریاضتوں سے بہتر ہے...... ایک سو غلاموں کے آزاد کرنے سے بھی بہتر ہے۔'' ''جو شخص علم اور عالموں کی حمایت کرے گا خدا اس پر عقبیٰ میں مہربان ہوگا۔'' ''جو شخص عالموں کی عزت کرتا ہے وہ میری عزت کرتا ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ علم کے ایسے شعبوں کا درس دیتے تھے جو اس نوخیز جمہوریہ کی ضرورتوں کے لیے سب سے موزوں تھے۔ اُن کے منقول ارشادات میں ذیل کے ارشادات ہیں۔ ''علم و حکمت میں ناموری سب سے بڑی عزت ہے۔'' ''جو شخص علم کو زندگی بخشتا ہے وہ کبھی نہیں مرتا۔'' ''کسی آدمی کا سب سے اچھا زیور علم ہے۔''

ہادیٔ اسلام اور اُن کے رئیس التلامذہ کی زبان سے اس قبیل کے خیالات کے اظہار کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وسیع مشرب قائم ہوگیا اور مسلمانوں کے تمام طبقوں میں علم کا ذوق و شوق پیدا ہوگیا۔ کوفی فنِ خطاطی نے، جو ایک صحابی نے حیرہ میں سیکھا، مسلمانوں کی ابتدائی نشو و نما کو اور بھی پروان چڑھایا۔ لیکن وہ زمانہ بدرجہ افضل سنجیدہ اور ترقی ایمان کا زمانہ تھا، جب کہ روح انسانی بے مقصد، مردہ اور جامد فلسفے کے خلاف بغاوت کر رہی تھی۔ مذہب پر کاربندی ایمان و تقویٰ کی روح کو برقرار رکھنا اور علم کے ایسے شعبوں کی ترقی جو زندگی کے جہادِ شبانہ روز میں عملی طور مفید تھے...... یہ تھے وہ معاملات جن پر اس وقت مسلمانوں کی توجہ اور سب چیزوں سے بڑھ چڑھ کر مرکوز تھی۔

فلسفیانہ قیاس کا دور شروع ہونے ہی والا تھا۔ اس کا ہیولیٰ معلم اسلام کے مثبت

ارشادات نے مہیا کر دیا تھا۔ ادھر آپ معروف کار تھے، اُدھر آپ کا شاگردِ رشید موفر تھا۔ آنحضرت ﷺ نے خود اعلان کیا تھا کہ جو شخص آپ کی تعلیمات کو سمجھنا چاہتا ہو اُسے علی مرتضیٰ سے رجوع کرنا چاہیے۔ آپ ﷺ کے ارشادات کا مطلب آپ ﷺ کے رفیق شفیق، آپ ﷺ کے شاگردِ معتمد، آپ ﷺ کے جاں نثار چچیرے بھائی سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا؟ وہ تعلیم جو نرمی اور آہستگی سے بچپن میں دی گئی تھی بالآخر بار آور ہوئی۔

خلفائے متقدمین کے تحت عرب قوم میں جو شورش و بدامنی رہی اُس کے باوجود ابتدائی اسلام کے دارالخلافہ میں ادب و فن سے تغافل نہیں برتا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے چچیرے بھائی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ شعر و شاعری، صرف و نحو، تاریخ اور ریاضی کا درس دیتے تھے۔ دوسرے صحابہ شعر خوانی اور خطابت سکھاتے تھے اور چند اور صحابہ رضی اللہ عنہم فن کتاب کی ترویج کرتے تھے جو زمانہ سلف میں ایک بے بہا شعبہ علم تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی المناک وفات پر، جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر آئے ہیں، آوازہ خلق نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کی ذمہ داری سونپی۔ اپنی گوشہ نشینی کے دوران وہ عقل کی روشنی میں ارشاداتِ نبوی کا مطالعہ کرنے میں مصروف رہے تھے۔ ایک فرانسیسی مؤرخ ان کے بارے میں لکھتا ہے: ''اگر وہ قتل نہ کر دیئے جاتے تو دنیائے اسلام پیغمبر کی تعلیمات کو عقل اور شریعت کے وصال کی صورت میں اور حقیقی فلسفے کے بنیادی اصولوں کو مثبت عمل کی صورت میں مجسم دیکھ پاتی۔'' علم و حکمت سے جو والہانہ محبت آنحضرت ﷺ کی امتیازی صفت تھی وہ محبت آپ ﷺ کے شاگرد کے ہر لفظ سے ٹپکتی ہے۔ اُن میں جہاں ایک ایسی وسیع المشربی تھی جو اپنے وقت سے بہت آگے بڑھی ہوئی تھی وہاں ایک پرخلوص جذبہ دینداری اور رسوخِ ایمان بھی تھا۔ اُن کے مواعظ و خطبات جو اُن کے ایک جانشین نے پوری امانت داری کے ساتھ قلمبند کئے اور اُن کی دعائیں منبع خیر کل سے جیتی جاگتی التجائیں اور انسان کی خیر کوشی اور سعادت طلبی پر ایک بے پایاں ایمان کے اعلان ہیں۔ بنی اُمیہ کا تخت سلطنت پر متمکن ہونا دنیائے اسلام کی ترقی علم اور آزادی فکر کے حق میں ایک صدمہ تھا۔ اُن کے طوفانی ادوار حکومت نے قوم کو سائنس کے درس و تدریس جیسے پُرامن مشاغل کی مہلت ہی نہ دی۔ اس پر آفت یہ ہوئی کہ اموی حکمران سب ماضی کے پرستار

تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں جنگ اور سیاست کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ ایک صدی کی طویل مدت حکومت میں خاندان اموی نے صرف ایسا شخص پیدا کیا جسے علم وادب سے شغف تھا۔ یہ شخص ابو ہاشم خالد بن یزید حکم بن مروان'' تھا۔ جسے اس کی علمیت وفضیلت کے باعث جانشینی کے معاملے میں نظر انداز کر دیا گیا۔

اولادِ ابوسفیان و ہند کے رشک و حسد اور انتھک دشمنی نے اہل بیت نبوی کو مسکینی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے جد امجد کے ارشادات پر خلوص اور دیانت داری سے عمل کیا اور ذہنی مشاغل کو اپنے لیے ذریعہ تسکین بنایا۔ انہیں علم سے جو عاشقانہ لگاؤ تھا اور حب انسانیت کا جو شدید جذبہ اُن کے اندر کارفرما تھا (کیونکہ ان کی نگاہیں شریعت کی لغوی تفسیروں سے بلند تر حقائق پر جمی ہوئی تھیں) اس سے اسلام کی روحانیت اور وسعت قلب آشکار ہوتی ہے۔ امام جعفر صادق نے علم کی جو تعریف کی ہے اُس سے کسی حد تک پتہ چلتا ہے کہ حکمائے اہل بیت کو انسان کی ترقی پر کتنا گہرا ایمان تھا۔ ''قلب کی تنویر اُس کا جوہر ہے، حق اس کا سب سے بڑا مقصد، الہام اُس کا رہبر، عقل اُس کی قائل، خدا اس کا مصدرِ الہام اور نطقِ انسانی اُس کا متکلم۔''

ابتدائی اہلِ بیت کے گرد جن لوگوں کو محبت، عقیدت اور ہمدردی نے جمع کر رکھا تھا قدرتی بات تھی کہ وہ اُن لوگوں کے گوناگوں خیالات سے اثر پذیر ہوتے۔ اس کے باوجود اُن کا فلسفہ کبھی وہ زندگی اور ذوق وشوق سے معرا لفظی مجادلہ بن کر نہیں رہ جاتا جو ایتھنز اور خاندانِ بطلیموسی کے تحت اسکندریہ کے مکاتب فلسفہ بن کر رہ گئے تھے۔

اگرچہ حکمران ادب اور فلسفے سے غافل بلکہ اُن کے مخالف تھے پھر بھی ائمہ اہل بیت نے جو مثال قائم کی اس نے عربوں اور محکوم قوموں کی دماغی سرگرمیوں کو بڑی حد تک متاثر کیا جہاں بنی امیہ نے پرامن ذہنی مشاغل کی ہمت شکنی وہاں بنی فاطمہ نے نمایاں فراخدلی سے علم وفضل کی سرپرستی کی۔ وہ ماضی کے غلام نہ تھے: سلف اُن کا واحد رہنما نہ تھا۔ ارشادات نبوی کو مشعلِ راہ بنا کر انہوں نے انسانی ارتقاء کو پیش نظر رکھا اور اپنے آپ کو سائنس اور علم وادب کے تمام شعبوں کی ترقی کے لیے وقف کر دیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ اور خلفائے راشدین کی طرح انہوں نے اُن ارباب علم وفضل کا خیر مقدم کیا جنہیں قیصر

جسٹینین (Justinian) کے جانشینوں کے متعصبانہ جبر و تشدد نے غیر ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ فلسفے اور طب کے جو دارالعلوم نسطوریوں نے اڈیسہ اور نسیبس میں قائم کئے تھے وہ ٹوٹ چکے تھے اور ان کے مدرس اور طلبا ایران اور عرب میں پناہ گزین تھے۔ ان میں سے بہت سوں نے، جیسا کہ رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اُن کے پیش رووں نے کیا تھا، مدینے کا رُخ کیا جو امویوں کی تاخت و تاراج کے بعد از سرِ نو علم کا مرکز بن گیا تھا اور جسے امام جعفر صادق اور اُن کے حاشیہ نشین علماء و فضلاء کے مجمع النجوم نے منور کر رکھا تھا۔ مدینۃ النبی میں مختلف اور متنوع علوم و فنون کے اربابِ کمال کے جمع ہونے نے مسلمانوں میں سائنس اور ادب کی فروغ دیا۔ مدینے سے غیر معمولی ذہنی سرگرمیوں کا ایک دریا دمشق کی طرف بہنے لگا۔ دمشق، جو صحرائے عرب کی شمالی حدود پر اور مکہ و مدینہ سے شام جانے والے تجارتی راستے کے کنارے واقع ہے، قدیم زمانے سے امویوں کے ساتھ وابستہ رہا ہے اور شام کے عرب اس خاندان کے ساتھ جسے اُن کی مدد نے تختِ خلافت پر متمکن کیا تھا مفادات اور قرابت داری کے رشتوں میں مربوط تھے چنانچہ بنی اُمیہ نے قدرتی طور پر دمشق ہی کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس حیثیت سے یہ شہر اُن مختلف قوموں کے نمائندوں کا مرکز بن گیا جو اسلام کے دائرۂ حکومت میں آ چکی تھیں۔ یونانیوں اور عربوں میں جو مذہبی مناظرے ہونے لگے وہ منطق اور فلسفہ یونان کے مطالعے کا ایک زبردست محرک ثابت ہوئے اور اعراب کی ایجاد نے صرف و نحو اور لسانیات کو ترقی دی۔ اس زمانے میں دو سر بر آوردہ عیسائی مصنف تھے جنہوں نے اپنے ہم مذہبوں کے تشدد سے نجات پانے کی خاطر دمشق کو اپنا مامن بنا لیا تھا۔ ان کے نام تھے جوہینز دمیسینس (Johannes Damascenus) اور تھیوڈورس ابوکرہ (Theodorus Abucara) ان مصنفین نے مسلمانوں کے خلاف جو مناظراتی کتابیں لکھیں اور اپنے قدامت پرست ہم مذہبوں کے ساتھ جو عقلیاتی اور فلسفیانہ مباحثے کئے انہوں نے مدنی دبستان کے اثرات کے ساتھ مل کر جو اس وقت امام محمد الباقر اور امام جعفر صادق کے زیر سرپرستی عروج پر تھا، بہت جلد عربوں، کے یہاں فلسفیانہ رجحانات پیدا کر دیئے۔ صدیوں سے ایرانی یونانی فلسفے سے واقف چلے آ رہے تھے۔ نسطوریوں نے جسٹینین کی

حکومت کے آغاز ہی سے کشور خسرواں میں پھیلنا شروع کر دیا تھا لیکن جب تک اسلام نے متفرق اجزا کو ملا کر ایک نامیاتی کلیت پیدا نہ کی اس وقت تک یونانی سائنس اور ثقافت نے مغربی ایشیا کی ذہنی نشو ونما پر کوئی حقیقی اثر مرتب نہ کیا بہر حال اموی خلافت کے اختتام کے قریب چند مسلم مفکرین منظر عام پر آئے جنہوں نے ایسے مسائل کو موضوع بحث بنایا جو اس وقت لوگوں کے ذہنوں کو دعوتِ حل دے رہے تھے۔ ان مفکرین کے افکار و تصورات نے آنے والی نسلوں کے خیالات پر بڑا گہرا اثر کیا۔

لیکن مسلمانوں کی ادبی اور سائنسی سرگرمیاں صحیح معنوں میں دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئیں۔ ان کا سب سے بڑا محرک عربوں کا شہروں میں آباد ہونا تھا۔ اُس وقت تک وہ چھاؤنیوں میں رہتے چلے آئے تھے، جو محکوم قوموں کی بستیوں سے علیحدہ ہوتی تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عربوں کو مفتوحہ ملکوں میں زمینیں حاصل کرنے یا محکوم قوموں کے ساتھ شادی بیاہ کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔ اس ممانعت کا مقصد ظاہر تھا: کیا قدیم زمانوں میں اور کیا جدید زمانوں میں فاتح قوم نے یہی وتیرہ اختیار کیا تھا۔ برطانوی ہندوستان اور فرانسیسی الجزائر میں اسی پر عمل ہوتا رہا۔ بنی اُمیہ کی ساری مدت حکومت کے دوران عرب لوگ معاشرے کا مقتدر طبقہ رہے تھے یعنی محکوم قوموں کے درمیان فوجی اعیان واشراف کا ایک گروہ۔ اُن کی اکثریت فنونِ حرب میں مشغول تھی۔ علم وادب اور سائنس کے پر امن مشاغل ہاشمیوں اور انصار کی اولاد پر چھوڑ دیئے گئے تھے، یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اخلاف پر عربوں کے یہاں رومیوں کی طرح متعلقین کا جو قاعدہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا تھا عرب اُسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اس قاعدے میں یہ فائدہ تھا کہ محکوموں کو حفاظت اور رعایات مل جاتی تھیں اور فاتحوں کو زراعت میں مدد کے لیے مزید آدمی مل جاتے تھے۔ چنانچہ مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی سربرآوردہ مقامی خاندانوں نے چیدہ چیدہ صحرائی قبیلوں سے تعلق قائم کیا اور اس طرح فاتحوں کے ''مولا'' یا متعلقین (نہ کہ اُن کے آزاد کردہ غلام، جیسا کہ بعض لوگوں نے سہواً خیال کیا ہے) بن گئے۔ ہاشمیوں میں سے اور انصار و مہاجرین کی اولاد میں سے جو لوگ مدینے کی تاخت و تاراج کے بعد بچ گئے تھے اُن کے علاوہ اُن متعلقین کے حصے

میں اُموی حکومت کے دوران فضل وکمال اور علم وفنون آئے۔ عباسیوں کے برسرِ اقتدار آتے ہی ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ عباسیوں نے ایرانیوں کی مدد سے اقتدار حاصل کیا تھا۔ اس لیے وہ اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے عرب سے آئے ہوئے فوجی نو آبادکاروں کی ناقابلِ اعتبار دوستی کی بہ نسبت جمہور رعایا کی وفاداری اور خیر خواہی پر زیادہ بھروسا کرتے تھے۔ ابوالعباس سفاح کے ہاتھوں میں صرف دو سال عنانِ حکومت رہی۔ اُس کے بھائی اور جانشین المنصور نے اگرچہ فاطمیوں پر بڑے ستم ڈھائے، لیکن وہ ایک اونچے پائے کا سیاسی مدبر تھا۔ اُس نے مملکت کی باقاعدہ تنظیم کی، ایک مستقل فوج اور پولیس قائم کی اور نظم ونسق میں مضبوطی اور باضابطگی پیدا کی۔ عرب اب تک پیشہ سپاہگری میں ہمہ تن منہمک رہے تھے۔ المنصور نے جو اسلوب حکومت اختیار کیا اُس نے عربوں کے طبعی جوہر کو ایک نیا رجحان بخشا۔ اُنہوں نے شہروں میں سکونت اختیار کی، جاگیریں خریدیں اور جس ذوق وشوق سے وہ پہلے جنگی سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتے تھے اسی ذوق شوق سے وہ علم وادب کو فروغ دینے میں مصروف ہوگئے۔

فرات کی زرخیز وادی، جسے مغربی ایشیا کے دو بڑے دریا سیراب کرتے ہیں قدیم ترین زمانوں سے سامراجی حکومتوں کا مرکز اور تہذیب کا گہوارہ رہی ہے یہی وہ اقلیم ہے جہاں بابل، طیسفون (Ctesiphon) اور سیلوشیہ (Seleucia) کی تہذیبیں منصۂ شہود پر آئیں جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس زمانے میں یہاں بصرہ اور کوفہ کے شہر تھے جن کے باشندے شورش پسند اور تیز طبع تھے۔ اسلامی فتوحات کی ابتداء ہی سے یہ شہر تجارتی کاروبار کے اہم مرکز تھے۔ کوفہ کچھ مدت تک دارالخلافہ بھی رہ چکا تھا۔ بصرہ اور کوفہ میں بلادِ مشرق کے تمام منچلے آکر جمع ہوگئے تھے جو بنی اُمیہ کے دارالخلافے میں یا تو جانہ سکتے تھے یا جانا نہ چاہتے تھے۔ عباسیوں کے لیے دمشق نہ صرف کشش سے خالی بلکہ خطروں سے پر تھا۔ رہے بصرہ اور کوفہ، سو وہ اپنے سیماب فطرت اور ناقابلِ اعتبار باشندوں کی بدولت دارالخلافہ بننے کے قابل نہ تھے۔ المنصور نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بالآخر اس نے وہ مقام انتخاب کیا جہاں آج کل بغداد ہے۔ یہ مقام بصرے سے چھ دن کی مسافت پر تھا۔

کہتے ہیں کہ بغداد ایران کے مشہور بادشاہ کسریٰ انوشیروان کی زمستانی آرام گاہ تھا اور اس کا نام ''باغ داذ'' (انصاف کا باغ) اُسی عادل فرمانروا کے نام نیک کی یادگار ہے۔ ایرانی بادشاہی کے خاتمے کے ساتھ ہی اُس باغ کا بھی خاتمہ ہوگیا جہاں ایشیا کا شہنشاہ اپنی کثیر التعداد رعایا کی دادرسی کیا کرتا تھا۔ پھر بھی روایت نے اس کے نام کو زندہ رکھا ہے۔ یہ خوبصورت مقام جو مرکزی بھی تھا اور صحت بخش بھی، منصور کو بھا گیا، چنانچہ اپنے وقت کے بہترین ماہر تعمیرات کے عصائے جادو کی ایک جنبش سے خلیفوں کا شاندار شہر اس طرح نمودار ہوا جس طرح سمندر کی دیوی وینس جوپٹر دیوتا کے حکم سے یکایک سمندر کی لہروں کے اندر سے جلوہ گر ہوگئی تھی۔

منصور کے بغداد کی بنیاد ۱۴۵ ہجری میں دریائے دجلہ کے کنارے پر رکھی گئی۔ تھوڑی ہی مدت میں ایک اور شہر (ایک نیا بغداد) ولی عہد خلافت کی نگرانی میں، جس نے خلیفہ بن کر المھدی کا لقب اختیار کیا، دریا کے مشرقی کنارے پر پیدا ہوگیا۔ یہ نیا شہر اپنی عمارتوں کی شان و شوکت کے اعتبار سے منصوریہ کی خوبصورتی اور عظمت کا جواب تھا۔ بغداد جس کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ چنگیزی لشکروں کا وہ سیلاب جس نے مغربی ایشیا میں عربی تہذیب کے تمام آثار ملیامیٹ کر دیئے اسے بھی اُن کے ساتھ برباد کر دے، اپنے عروج کے زمانے میں ایک نظر فریب اور پر شکوہ شہر اور خلفائے اسلام کے شایانِ شان پایۂ تخت تھا۔

مغلوں کی تاخت و تاراج سے پہلے بغداد کی جو خوبصورتی اور شان و شوکت تھی اُسے انوری نے، جو شوکتِ الفاظ کے اعتبار سے فارسی قصیدہ گویوں کا بادشاہ ہے' ذیل کے اشعار میں زندہ جاوید کر دیا ہے:-

خوشا نواحیٔ بغداد جائے فضل و ہنر ۔۔۔ کہ کس نشان ندہد در جہان چنان کشور

سوادِ او بمثل چوں سپر مینا رنگ ۔۔۔ ہوای او بصفت چون نسیم جان پرور

بخاصیت ہمہ سنگش عقیق، لُولُو بار ۔۔۔ بمنفعت ہمہ خاکش عبیر خالیہ بر

سبا سرشتہ نجاکش طراوت طوبیٰ ۔۔۔ ہوا نہفتہ درآبش حلاوت کوثر

کنارِ دجلہ زتر کانِ سیمتن خلخ ۔۔۔ میانِ رحبہ زخوبان ماہرخ کشمر

ہزار زورقِ خورشید شکل برسرِ آب ۔۔۔ بداں صفت کہ پراگندہ بر سپہر شرر

بغداد کو دارالسلام کا جو نام دیا گیا وہ منجم شاہی نو بخت کی ایک پیشگوئی پر مبنی تھا کہ اس شہر کی چار دیواری کے اندر کسی خلیفہ کی وفات نہ ہوگی جو حیرت انگیز طور پر سینتیس خلیفوں کے بارے میں ٹھیک نکلی۔ اس کی چار دیواری کے اندر یا اس کے ارد گرد اولیاء اصفیاء کے اتنے مزار ہیں جن کا سب مسلمان احترام کرتے ہیں کہ اُسے Bulwark of the Holy حسن الاولیاء کا لقب مل گیا ہے۔ یہاں بہت سے اکابر ائمہ اور مشائخ اصفیا کے روضے ہیں۔ یہاں امام موسیٰ کاظم کی ابدی آرامگاہ ہے۔ یہاں امام ابوحنیفہ، شیخ جُنید، شیخ شبلی اور شیخ عبدالقادر گیلانی جیسے کاملین و عارفین کے مرقد ہیں۔

ائمہ اور مشائخ کے مزاروں کے درمیان خلفاء اور ان کی بیویوں کے مقبرے تھے۔ شہر میں جو بے شمار مکتب، مدرسے اور دارالعلوم تھے اُن میں دو اپنے طلبہ کی تعداد اور درجہ علمیت کے اعتبار سے سب سے اہم تھے۔ یہ تھے مدرسہ نظامیہ اور مدرسۂ مستنصریہ اول الذکر پانچویں صدی ہجری کے نصف اول میں سلطان ملک شاہ سلجوقی کے مشہور وزیر نظام الملک نے قائم کیا تھا اور موخر الذکر دو صدیاں بعد خلیفہ مستنصر باللہ نے۔

خلفاء کے زمانے میں ترقی تمدن کا ایک مورخ لکھتا ہے: ''یہ ایک ملاحظہ طلب بات ہے کہ جس حکمران کے اخلاقی اور دماغی اوصاف نے اس کی فطرت کے تاریک پہلو پر پردہ ڈال دیا اُسی نے اس علمی وفکری تحریک میں جان ڈالی جس کا آغاز اس وقت دنیائے اسلام میں ہوا۔''

منصور ایک موقر عالم اور ماہر ریاضی بھی تھا اور علم وادب کا مربی بھی تھا۔ اس کے حکم سے غیر ملکیوں کی ادبی اور سائنسی تصنیفوں کے ترجمے عربی زبان میں کیے گئے۔ ہندوستانی کہانیوں کا مشہور مجموعہ ''بنت اُپدیش'' فلکیات پر ہندوستان کی مشہور تصنیف ''سدھانت'' ارسطو کی بہت سی کتابیں، کلاڈیس بطلیموس کی ''المجسطی'' (The Almagest) اقلیدس (Euclid) کی تصنیفات اور متعدد یونانی، بازنطینی، ایرانی اور شامی کتابیں عربوں کی زبان میں منتقل کی گئیں۔ مسعودی کہتا ہے کہ ان ترجموں کے شائع ہوتے ہی لوگوں نے انہیں ذوق شوق سے پڑھنا شروع کر دیا۔ منصور کے جانشین نہ صرف علماء وفضلاء کے سرپرست تھے، جنہوں نے ہجوم در ہجوم ملک کے گوشے گوشے سے دارالخلافہ کا رُخ کیا

بلکہ خود بھی ہر شعبہ علم میں کسب کمال کے ساعی تھے چنانچہ ان کے زیر سایہ مسلمانوں نے یا دوسرے الفاظ میں مختلف قوموں نے جو خلافت کی وسیع قلمرو میں آباد تھیں، حیرت انگیز سرعت سے علم وفکر میں ترقی کی۔

ہر بڑی قوم کی تاریخ میں ایک عہد زریں ہو گزرا ہے۔ ایتھنز کی تاریخ میں وہ پیریکلیز (Pericles) کا زمانہ تھا اور روم کی تاریخ میں آگسٹس (Augustus) کا۔ دنیائے اسلام کا بھی ایک دور عظمت تھا۔ لیکن ہم عادلانہ طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جو زمانہ منصور کی تخت نشینی سے لے کر معتضد باللہ کی وفات تک گزرا وہ متوکل کی خلافت کے مختصر سے وقفے کو نظر انداز کر کے، اُس پہلے دور عظمت کا مثنیٰ تھا بلکہ شوکت و سطوت میں اُس سے بھی آگے نکل گیا۔ پہلے چھ عباسی خلفاء اور بالخصوص مامون کے عہدِ حکومت میں مسلمان تہذیب کا مقدمتہ الجیش تھے۔ ایک تو عرب قوم کی سرشت میں مادہ قبول تھا جس کی بدولت وہ اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بدل سکتی تھی۔ دوسرے اُسے ایک مرکزی جغرافیائی حیثیت حاصل تھی۔ ایک طرف قریب مرگ یونان اور روم کا بیش بہا ورثہ تھا، دوسری طرف ایران کا گنج شائیگاں اور تیسری طرف صدیوں کی نیند کے ماتے چین اور ہندوستان تھے۔ چنانچہ عرب قوم معلم انسانیت بننے کے لیے بدرجہ اتم موزوں تھی۔ اس کے پیغمبر کی الہامی ہدایت نے اسے ایک ضابطہ اخلاقی اور ایک ضابطہ ملی تو عطا کر ہی رکھا تھا۔ اس پر جب اس کے حکمرانوں کی سرپرستی کا اضافہ ہوا تو اس نے مشرق و مغرب کی دولت سمیٹ لی اور اُسے اپنے پیغمبر کی تعلیمات کے ساتھ شامل کر کے سپاہیوں کی ایک قوم سے عالموں کی ایک قوم بن گئی۔ ہمبولٹ (Humboldt) کہتا ہے: "عربوں کو ایک ایسا مقام حاصل تھا کہ اُن کا مشرق و مغرب کے درمیان توسط کا ذریعہ بننا اور فرات سے لے کر وادیٔ الکبیر اور وسطِ افریقہ تک تمام قوموں پر اثر انداز ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اُن کی عدیم النظیر ذہنی سرگرمیوں نے دنیا کی تاریخ میں ایک مستقل باب کا اضافہ کیا۔"

اُموی خلافت کا زمانہ مسلمانوں کے لیے آموزش و آزمائش کا دور تھا، جس میں وہ اُس عظیم کام کے لیے جو انہیں تفویض ہوا تھا اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے۔ عباسیوں کے زمانے میں وہ ساری دنیا کے علم و فضل کے خزانہ دار بن گئے۔ خلیفوں کے عالموں

نے سلف کی جمع شدہ دولت حاصل کرنے کی خاطر کرہ ارض کا چپہ چپہ چھان ڈالا جو کچھ جہاں بھی ملا وہ اُسے اُٹھالائے اور لاکر مشتاقان علم کے سامنے بکھیر دیا۔ ہر طرف مدرسے اور دارالعلوم بن گئے، ہر شہر میں کتب خانے قائم ہو گئے جن تک ہر کس و ناکس کی رسائی تھی۔ قرآن کے ساتھ ساتھ قدیم دنیا کے اکابر فلاسفہ کی کتابوں کا مطالعہ ہونے لگا۔ جالینوس (Galen) دیوسکورائیڈیز (Dioscorides) تمستیس (Themistius)، ارسطو، افلاطون، گوکلڈ، بطلیموس، اپولونیس (Appollonius) سب کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا۔ خلیفے خود ادبی محفلوں اور فلسفیانہ مباحثوں میں شریک ہوتے تھے۔ تاریخ انسانیت میں پہلی مرتبہ ایک ذہنی اور آمرانہ حکومت فلسفے کی موئید و حامی بنی اور اس کا بول بالا کرنے میں کوشاں ہوئی۔

سلطنت کے تمام شہر علم و فن کی ترقی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ صوبوں کے عمال و حکام بادشاہ کی مثال کی تقلید کرتے تھے۔ علم کی تلاش میں سفر کرنا ہادی اسلام کی تعلیم کے مطابق ایک مقدس فریضہ تھا۔ چنانچہ چار وانگ عالم سے طلبہ قرطبہ، بغداد اور قاہرہ جاتے تھے تاکہ دانشورانِ اسلام کے وعظ سُن سکیں۔ اور تو اور، یورپ کے دُور افتادہ گوشوں سے عیسائی طلبہ بھی مسلمانوں کی درسگاہوں میں آکر زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے ایسے لوگ جو بعد میں عیسوی کلیسا کے سربراہ بنے مسلم اساتذہ کے شاگرد تھے۔ جب المعزالدین اللہ کے عہد میں قاہرہ کو عروج نصیب ہوا تو عباسی اور فاطمی خلفاء کی سرپرستی علم میں رقابت کی روح پیدا ہوگئی۔ المعز گویا مغرب کا مامون تھا یا یوں کہئے کہ مسلم افریقہ کا میسناس (Maecenas) تھا۔ مسلم افریقہ اس وقت مصر کی مشرقی حدود سے لے کر بحر اوقیانوس کے ساحل اور صحرا کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا۔ المعز اور اس کے پہلے تین جانشینوں کے زمانے میں علوم و فنون نے بادشاہِ وقت کی خاص سرپرستی کے طفیل خوب ترقی کی۔ معز نے جو دارالحکومت قاہرہ میں سائنسی ادارہ قائم کیا وہ ایک ایسا ادارہ تھا جس کا تصور بھی یورپ کے ذہن میں اس وقت تک پیدا نہ ہوا جب تک بیکن نے کئی صدیاں بعد ایک مثالی یونیورسٹی کا خاکہ پیش نہ کیا۔ افریقہ کے ادریسی اور ہسپانیہ کے موری حکمران ادب و فن کی

سرپرستی میں ایک دوسرے کے حریف تھے: بحر اوقیانوس کے ساحل سے لے کر بحر الہند تک، بلکہ اور بھی مشرق کی طرف بحر الکاہل تک مسلمانوں کی حمایت اور ہدایت کے طفیل فلسفہ و حکمت کا آوازہ بلند تھا۔ جب مشرقی سلطنت بنی عباس کے ہاتھوں سے نکل گئی تو اس کے مختلف خطوں میں جن سرداروں نے حکومتیں قائم کیں انہوں نے بھی خلفائے عباسی کی طرح جن کی نیابت کے وہ مدعی تھے، علم و ادب کی پاسبانی کی۔ ملائیت کے اقتدار اور اس کی علم دشمنی اور حکمت آزادی کے باوجود یہ شاندار دور تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تاخت و تاراج تک جاری رہا لطف کی بات تو یہ ہے کہ جن وحشیوں نے خلافت کا تختہ اُلٹا اور اسلامی تہذیب کا شیرازہ بکھیر دیا وہ جب دائرہ اسلام میں آئے تو خود علم و حکمت کے پر جوش حامی و مربی بن گئے!

اس وقت عیسائی دنیا میں علم اور سائنس کی کیا حالت تھی؟ قسطنطین اور اس کے راسخ العقیدہ جانشینوں کے ماتحت طب و حکمت کے ادارے ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے گئے غیر اہل کتاب شاہنشاہوں کی فیاضی نے جو کتب خانے قائم کیے تھے وہ منتشر یا تباہ کر دیئے گئے۔ علم و حکمت کو جادو کی طرح حرام اور بغاوت کی طرح گردن زدنی" قرار دیا گیا، فلسفہ اور سائنس کا قلع قمع کر دیا گیا۔ کلیسا کو علوم دنیوی سے جو نفرت تھی اس کا اظہار اس ضرب المثل میں ہوا کہ " جہالت عقیدت کی ماں ہے۔" اور پوپ گریگوری اعظم (Pope Gregory the Great) نے جو کلیسا کے اعلیٰ اقتدار کا بانی مبانی تھا اس رجعت پرستانہ ضرب المثل کو یوں عملی جامہ پہنایا کہ اس نے سائنسی تحقیق و تدقیق کو روم سے شہر بدر کر دیا اور آگسٹس سیزر (Augustus Caesar) کے قائم کئے ہوئے کتب خانہ شاہی کو نذرِ آتش کر دیا۔ اُس نے قدمائے یونان و روم کی کتابوں کے مطالعے کو ممنوع قرار دیا۔ اُن کی جگہ اس نے وہ صنمیاتی عیسائیت رائج کی جس کا رکنِ رکین مقدس شخصیتوں کے واقعات اور تبرکات کی پرستش تھا اور جو صدیوں تک یورپ کا متداول مذہب رہی۔ سائنس اور ادب کو کلیسائی عیسائیت نے قانوناً ناجائز ٹھہرایا اور انہیں کہیں جا کر اس وقت آزادی ملی جب فکر آزاد نے وہ بند توڑ کر رکھ دیئے جو دقیانوسیت نے نفسِ انسانی کی ترقی کی راہ میں حائل کر رکھے تھے۔

عبداللہ المامون کو بجا طور پر عربوں کے آگسٹس کا خطاب دیا گیا ہے۔" وہ اس امر سے ناواقف نہ تھا کہ جو لوگ اپنی زندگیاں اپنے قوائے عقلی کی تہذیب کے لیے وقف کر دیتے ہیں وہ خدا کے برگزیدہ بندے اور اس کے بہترین و مفید ترین خادم ہوتے ہیں...... وہ معلمین حکمت کو دنیا کے حقیقی نیر اور مقنن سمجھتا تھا۔"

مامون کے بعد متعدد طباع خلیفے آئے جنھوں نے اس کے کام کو جاری رکھا۔ مامون کے عہد میں بھی اور اُس کے جانشینوں کے عہد میں بھی بغدادی دبستان کا سب سے نمایاں وصف اس کا قرار واقعی سائنسی مزاج تھا، جو اُس کی تمام کارگزاریوں پر ثبت نظر آتا ہے۔ منطق کے استنباطی قاعدے سے جسے اہل یورپ بڑے فخر و مباہات سے جدید یورپ کی ایجاد اور غیر مشترک ملکیت کہتے ہیں، مسلمان پوری طرح واقف تھے۔ 'معروف سے مجہول کی طرف قدم بڑھا کر بغدادی دبستان نے معلول سے علت کا پتہ چلانے کی خاطر مظاہر کی صحیح صحیح توجیہ کی اور صرف ایسی چیزوں کو تسلیم کیا جن کا ثبوت تجربے سے بہم پہنچتا ہے۔ یہ تھے وہ اصول جن کی تعلیم مسلم اساتذہ دیتے تھے' جس مصنف کی رائے سے ہم یہ اقتباس پیش کر رہے ہیں وہ آگے چل کر کہتا ہے: "نویں صدی ہجری کے عرب اس نتیجہ خیز اسلوب سے بدرجہ اتم آشنا تھے جو کئی صدیوں کے بعد عصر جدید کے محققوں کے قبضے میں آکر اُن کے جمیل ترین انکشافات کا وسیلہ بنا۔"

سائنس اور علم کے جو ماہر اس زمانے میں گزرے اور جنھوں نے کسی نہ کسی طریقے سے انسانی ترقی کی تاریخ پر اپنے نشان چھوڑے، اگر اُن کی فہرست تیار کی جائے تو وہ بہت سی جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ ماشاء اللہ اور احمد ابن محمد النہاوندی، عربوں میں سب سے پہلے ماہرین فلکیات (ہیئت) منصور کے عہد میں ہوئے۔ مقدم الذکر نے جسے ابو الفرج اپنے زمانے کا "ققنس" (Phonix) کہتا ہے' اصطرلاب اور کرۂ مشبک (ذات الحلق) اور اجرام فلکی کی ماہیت اور حرکت پر متعدد رسالے لکھے جن کی آج بھی سائنس دان تعریف کرتے ہیں۔ احمد نہاوندی نے اپنے مشاہدات کی بناء پر ایک زیج (Astrononical Table) تیار کی جس کا نام المستعمل تھا اور جو یونانیوں اور ہندوؤں دونوں کے خیالات پر ایک حتمی اضافہ تھی۔ مامون کے عہد حکومت میں بطلیموس کی المجسطی

(Almagest) کا دوبارہ ترجمہ کیا گیا اور سندا ابن علی، یحییٰ بن ابی منصور اور خالد ابن عبد الملک جیسے مشہور ہیئت دانوں نے ازیاج مصدقہ تیار کیں۔ انہوں نے اعتدالین (Equinoxes) کسوف خسوف، دُمدار تاروں کے ظہور اور دوسرے سماوی مظاہر کے بارے میں جو مشاہدات کئے وہ نہایت قابل قدر اور علم انسانی میں متعد بہ اضافے تھے۔

محمد ابن موسیٰ الخوارزمی نے مامون کی فرمائش پر ''سدھانت'' (سند ہند) یعنی زیج ہندی کا ازسرِ نو ترجمہ کیا اور اس پر حاشیے بھی لکھے۔ الکندی نے مختلف مضامین مثلاً حساب، ہندسہ، فلسفہ، کائنات الجو، مناظر و مرایا اور طب پر دوسو رسالے لکھے۔ وہ یونانی زبان پر قدرتِ تامہ رکھتا تھا، چنانچہ اس نے اپنے بیش بہار سالوں میں جو معلومات قلمبند کیں اُن کا کچھ حصہ اس نے ایتھنز اور اسکندریہ کے مکاتب سے اخذ کیا۔ سدیو (Sedillot) کہتا ہے کہ '' اس کی تصنیفات عجیب و غریب اور دلچسپ واقعات سے مملو ہیں۔'' ابو معشر نے (جس کے نام کو قرونِ وسطیٰ کے اہل یورپ نے بگاڑ کر البومزر (Albumazar) بنا دیا مظاہر فلکی کو اپنا خصوصی موضوعِ تحقیق بنایا۔ چنانچہ اُس کی ''زیج ابی معشر'' آج تک فلکیاتی معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ موسیٰ ابن شاکر کے تین بیٹوں محمد، احمد اور حسن نے جو مامون اور اس کے پہلے دو جانشینوں کے زمانے میں ہوئے، آفتاب اور دوسرے اجرام فلکی کی اوسط حرکت کے بارے میں اور اس کے علاوہ دوسرے موضوعوں پر جو انکشافات کئے وہ تقریباً اتنے ہی صحیح ہیں جتنے یورپ کے جدید ترین انکشافات۔ اُنہیں جو ناقص آلات میسر تھے انہیں ملحوظ رکھا جائے تو جس صحت سے انہوں نے خط کسوف و خسوف کی کجی دریافت کی اس پر تعجب ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں سب سے پہلے لوگ تھے جنہوں نے قمری ارتفاعون کی تبدیلیوں کا نقشہ بنایا۔ علاوہ بریں انہوں نے کمال درستی سے اعتدالین کے سلسلے اور اوج آفتاب کی حرکتوں کا مشاہدہ کیا اور ان کی تعیین کی (یونانی ان سے قطعاً ناواقف تھے) انہوں نے بحیرہ احمر کے ساحل پر ایک درجے کی پیمائش کر کے زمین کے حجم کا اندازہ لگایا...... یہ ایک ایسے زمانے میں جب عیسوی یورپ شد و مد سے یہ دعویٰ کر رہا تھا کہ زمین سپاٹ ہے۔ ابوالحسن نے دوربین ایجاد کی، جس کی توصیف وہ ان الفاظ میں کرتا ہے: 'ایک نلکی جس کے دونوں سروں پر موید

بینائی شیشے لگے ہوئے ہیں۔'' ان ''نلکیوں'' کی بعد میں اصلاح ہوئی اور انہیں بڑی کامیابی کے ساتھ مراغہ اور قاہرہ کی رصد گاہوں میں استعمال کیا گیا۔ النایزی اور محمد ابن عیسیٰ ابو عبداللہ نے شاکر کے بیٹوں[1] کا عظیم الشان کام جاری رکھا۔ التبانی کے آنے سے پہلے ہی مسلمان قدماء کی اٹکل پچو فلکیات کو ایک باقاعدہ اور مربوط سائنس میں تبدیل کر چکے تھے۔ اگرچہ بعد میں آنے والے ماہرین فلکیات التبانی[2] سے آگے نکل گئے، پھر بھی وہ اس علم کے استادوں میں بڑا اونچا درجہ رکھتا ہے۔ ایک قابلِ وقعت مصنف کی رائے ہے کہ اس نے عربوں میں وہی کردار ادا کیا جو بطلیموس نے یونانیوں میں ادا کیا تھا اُس زیج جس کا ترجمہ لاطینی میں کیا گیا، کئی صدیوں تک یورپ میں فلکیات کی اساس رہی لیکن اُسے سب سے زیادہ شہرت ریاضیات کی تاریخ میں حاصل ہے، اور وہ اس لیے کہ اس نے ہیئت اور مثلثات میں وتر کی جگہ جیب اور جیب تمام کو متعارف کرایا۔

دسویں صدی عیسوی کے اختتام پر بغداد میں جو لاتعداد ماہرین فلکیات تھے ان میں دو شخص سب سے نمایاں ہیں، یعنی علی ابن اماجور اور ابوالحسن علی ابن ماجور، جنہیں عموماً یکجا کر کے بنواناجور کہا جائے۔ وہ چاند کی حرکتوں کا حساب لگانے کے لیے مشہور ہیں۔

مرکزی حکومت کی کمزوری کے باعث دور افتادہ علاقوں میں دربارِ خلافت کے اقتدار کا قائم رکھنا سال بسال مشکل ہوتا چلا رہا تھا۔ چنانچہ دسویں صدی عیسوی کے اختتام کے قریب سلطنت کے سرحدی خطوں میں بہت سی نیم خود مختار ریاستیں وجود میں آگئیں۔ ہسپانیہ تو عباسیوں کی خلافت کے آغاز ہی میں اُن کے ہاتھوں سے جا چکا تھا۔ اسی زمانے کے لگ بھگ بنی ادریس نے فاس میں، بنی رستم نے تاہرت میں اور بنی اغلب نے قیروان میں اپنی اپنی سلطنتیں قائم کر لیں۔ یہ سب سلطنتیں شمالی افریقہ میں تھیں۔ لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد بنی فاطمہ نے سارے شمالی افریقہ کو مسخر کر لیا۔ اُن کے آتے ہی شمالی افریقہ میں فن و ادب کا ایک اور زریں دور شروع ہوگیا۔ فاس، مکناسہ، سجلماسہ، تاہرت، تلمسان، قیروان اور اُن سب سے بڑھ چڑھ کر قاہرہ تمدن، ثقافت اور علم کے مرکز

---

[1] ان کے نام اوپر بیان کئے جا چکے ہیں۔ محمد ابن موسیٰ ابن شاکر کی وفات ۲۵۹ ہجری (مطابق ۸۷۳ء) میں ہوئی۔

[2] ابوعبداللہ محمد ابن جابر ابن سنان التبانی حران کا باشندہ تھا۔ اس کی وفات ۳۱۷ ہجری (مطابق ۹۲۹-۳۰ء) میں ہوئی۔

بن گئے۔ خراسان میں طاہریوں نے، ماوراء النہر میں سامانیوں نے، اور بویدوں نے پہلے طبرستان میں اور پھر ایران و بغداد میں قصرِ خلافت کے مہتموں کی حیثیت سے سائنس کے ماہروں اور عالموں کی فیاضانہ سرپرستی کی۔ عبدالرحمان صوفی، جو اپنے زمانے کے قابل ترین طبیعات دانوں میں شمار ہوتا ہے، بویدا میر عضدالدولہ کا انیس وجلیس تھا، جسے بجا طور پر عربوں کا آگسٹس ثانی کہا جاتا ہے۔ عبدالرحمن نے ستاروں کی روشن سنجی میں اصلاح کی۔ عضدالدولہ خود بھی ایک عالم اور ماہر ریاضیات تھا اور علم وفضل کا مربی اقصائے عالم سے جو عالم بغداد آتے وہ اپنے محل میں معزز مہمانوں کی طرح اُن کا خیر مقدم کرتا اور ان کے علمی مباحثوں میں شریک ہوتا۔ خلیفہ مکتفی باللہ کے بیٹے جعفر نے دُمدار ستاروں کی بے قاعدہ گردش کے بارے میں چند اہم مشاہدات کئے اور اُن پر ایک رسالہ لکھا۔ دوسرے شہزادے بھی علوم طبیعی کے مطالعے اور تحقیق میں مصروف رہتے تھے۔

آلِ بویہ کے ماتحت ہیئت 'طبیعیات اور ریاضیات کے بیشمار ماہر ہوئے جن میں سے صرف دو کا ذکر کافی ہوگا۔ وہ الکوہی اور ابوالوفاء تھے۔ الکوہی نے سیاروں کی گردش کا مطالعہ کیا اور اس پر رسالے لکھے۔ راس السرطان اور موسم خزاں کے اعتدال شب و روز کے بارے میں اس نے جو انکشافات کئے انہوں نے علم انسانی کے ذخیرے میں معتدبہ اضافہ کیا ابوالوفا ۹۳۹ء میں خراسان کے شہر بزجان میں پیدا ہوا۔ ۹۵۹ء میں اس نے عراق میں سکونت اختیار کی اور وہاں رہ کر ریاضیات اور فلکیات کی تحقیق میں مصروف رہا۔ اُس کی ''زیج الشامل'' تجسس وتفحص اور صحتِ مشاہدہ کے اعتبار سے معرکے کی تصنیف ہے۔ اس نے مثلثات اور فلکیاتی مشاہدوں میں قاطع اور ماس کو متعارف کرایا۔ سدیو کہتا ہے: ''اسی پر بس نہیں بطلیموس کے نظریہ قمری کے نقائص کو محسوس کر کے اس نے قدیم مشاہدات کی جانچ کی اور مرکز واخراج کی مساوات سے قطع نظر کر کے ایک تیسری عدم مساوات دریافت کی۔ یہ وہی انحراف ہے جو چھ سو سال بعد ٹیکو براہے (Tycho Brahe) نے متعین کیا۔''

فاطمیان مصر کے دورِ خلافت میں قاہرہ علم وادب اور سائنس کا ایک نیا مرکز بن گیا تھا، یہاں عزیز باللہ اور حاکم بامراللہ کے زمانے میں ایک فخرِ روزگار محقق تھا، ابن

یونس، جس نے آونگ (رقاصہ ساعت) (Pendulum) کو ایجاد کیا اور اُس کے جھولنے سے وقت کی پیمائش کی۔ لیکن اس کی وجہ شہرت اس کی عظیم تصنیف "زیج الاکبر الحاکمی" ہے، جس کا عنوان اُس نے اپنے مربی اور سلطان کے نام پر رکھا۔ اس تصنیف نے بہت جلد کلاڈیس بطلیموس کی تصنیف کو ایک تقویم پارینہ بنا دیا۔ اُسے ایرانیوں میں ہیئت دان شاعر عمر خیام (۱۰۷۹ء) نے روشناس کرایا۔ یونان میں اس کا ترجمہ کریسو کووکا (Chrysococca) کی کتاب سنٹیکس (Syntex) میں اتارا گیا۔ منگولوں کو اس سے ناصر الدین طوسی نے اپنی "زیج الخانی" کے ذریعے متعارف کرایا، چین میں اس کا تتبع کو چیون کنگ (Co. Cheon King) کی فلکیات کی صورت میں ہوا۔ چنانچہ وہ علم جو چین کی قدیم تہذیب سے منسوب کیا جاتا ہے' مسلمانوں سے لی ہوئی ایک شمع مستعار ہے۔

ابن یونس نے ۱۰۰۹ء میں وفات پائی۔ اُس کے انکشافات کو ابن الہندی نے، جو ۱۰۴۰ء کے لگ بھگ قاہرہ میں مقیم تھا، اور حسن ابن الہیثم نے، جو یورپ میں "الہزن" کے نام سے معروف ہے اور فضائی انعطاف کے انکشاف کے لیے مشہور ہے جاری رکھا۔ اُس کا زمانہ گیارہویں صدی کے اختتام کے قریب تھا اور وہ ایک ممتاز ہیئت دان اور ماہرِ مناظر ومرایا تھا۔ وہ ہسپانیہ میں پیدا ہوا، لیکن زیادہ تر مصر میں رہا، مناظر ومرایا پر اُس کی جو تصنیفات ہیں وہ زیادہ تر اُن کی بدولت یورپ میں مشہور ہے۔ اُن میں ایک تصنیف کا ترجمہ رزنر (Risner) نے لاطینی میں کیا۔ بصارت کے بارے میں یونانیوں کا جو غلط خیال تھا اُس نے اُس کی تصحیح کی اور وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ ثابت کیا کہ روشنی کی شعاعیں آنکھ سے نکل کر باہر کی چیزوں پر نہیں پڑتیں، بلکہ باہر کی چیزوں سے آنکھ کے اندر آتی ہیں۔ اُس نے ہی دریافت کیا کہ بینائی کا مقام آنکھ کا پردہ شبکی ہے اور یہ ثابت کیا کہ اس پردے پر جو نقوش مرتسم ہوتے ہیں وہ عصب بصری کے ذریعے دماغ کو منتقل ہو جاتے ہیں۔ بصارت کے ایک ہونے کی توجیہ اس نے یوں کہ کہ بصری تصویریں دونوں پردہ ہائے شبکی کے متناسب حصوں میں بنتی ہیں۔ اُس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ روشنی کا انکسار کرہ ہوائی کے درجہ کثافت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور کرہ ہوائی کی کثافت کا دارومدار بلندی پر ہوتا ہے۔ اُس نے بڑی صحت اور وضاحت کے ساتھ یہ بتایا کہ کیونکہ

اس انکسارِ نور کے باعث اجرامِ فلکی طلوع سے پہلے ہی دکھائی دینے لگتے ہیں اور غروب کے بعد بھی دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جھٹ پٹے کا خوشنما منظر یوں ظہور میں آتا ہے کہ فضائی انکسارِ نور ہوا کے اُس انعکاسی عمل کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے جو وہ روشنی کی شعاعوں کی روش پر کرتی ہے۔ اپنی کتاب ''میزان الحکمت'' میں وہ حرکی اصولوں پر بحث کرتا ہے جنہیں عام طور پر جدید سائنس کی خصوصی اختراع سمجھا جاتا ہے وہ بڑی تفصیل کے ساتھ کرہ ہوائی کے وزن اور اس کی کثافت کے باہمی تعلق کو بیان کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کیونکر اجسام مادی کا وزن لطیف فضا میں کچھ اور ہوتا ہے اور کثیف فضا میں کچھ اور۔ وہ پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے اجسام کے ڈوبنے سے بحث کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کیونکر اجسام مادی کا وزن لطیف فضا میں کچھ اور ہوتا ہے اور کثیف فضا میں کچھ اور۔ وہ پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے اجسام کے ڈوبنے سے بحث کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اُنہیں کسی ہلکی یا کسی بھاری مائع میں ڈبویا جائے تو کس زور سے سطح پر اُبھرتی ہیں۔ وہ گرتے ہوئے اجسام کی رفتاروں، فاصلوں اور مدتوں کے باہمی تعلق سے بخوبی واقف ہے اور جذب شعری کا بھی ایک واضح تصور رکھتا ہے۔

ہسپانیہ میں بھی جبل البرقات (برینیز) سے لے کر آبنائے جبل الطارق تک اسی طرح کی ذہنی سرگرمی بروئے کار تھی۔ اشبیلیہ، قرطبہ، غرناطہ، مرسیہ، طلیطلہ اور دوسرے شہروں میں سرکاری کتب خانے اور دارالعلوم تھے، جہاں سائنس اور ادب کی تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ قرطبہ کے بارے میں ایک انگریز مصنف لکھتا ہے:۔''یہی نہ تھا کہ قرطبہ کے محل اور باغ خوبصورت تھے، بلکہ زیادہ دقیع امور میں بھی یہ شہر قابلِ تعریف تھا۔ اس کا باطن اُتنا ہی حسین تھا جتنا اُس کا ظاہر۔ اس کے پروفیسروں اور اُستادوں نے اُسے یورپی تہذیب کا مرکز بنا دیا تھا۔ یورپ کے تمام حصوں سے طالب علم اس کے مشہور علماء کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کے لیے آتے تھے۔ اوروں کا تو کیا ذکر، راہبہ روز دیدار (Hroswitna) نے بھی جب سیکسنی کے دور و دراز شہر گودرز ہائم (Gauderoheim) کے راہب خانے میں بیٹھ کر یولوجیس (Eulogius) کی شہادت کی داستان بیان کی تو قرطبہ کی تعریفوں کے گیت گائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ اُسے دنیا کے شاندار مظاہر میں سب

سے شاندار کہتی ہے۔ سائنس کی ہر شاخ کا وہاں سنجیدگی سے مطالعہ کیا جاتا تھا۔ خصوصاً جہاں تک طب کا تعلق ہے صدیوں کی اس طویل مدت میں جو جالینوس کے زمانے کے بعد گزری تھی اس میں جتنے اضافے ہوئے تھے ان سے بدرجہا زیادہ اضافے اندلوسیہ کے طبیبوں اور جراحوں نے کئے ...... ہیئت، جغرافیہ، کیمیائیات، طبعی تاریخ، ان سب کا مطالعہ قرطبہ میں ذوق وشوق سے ہوتا تھا۔ رہیں ادب کی رعنائیاں، تو یورپ میں کبھی کوئی ایسا زمانہ نہ گزرا تھا جب شاعری اس طرح لوگوں کی روزمرہ کی زبان بن گئی ہوگی۔ ہر طبقے کے لوگ عربی میں شعر کہتے تھے۔ ہسپانیہ کے "منسٹرلوں" (Minstrels) اور پرووانس اور اٹلی کے تروبدوں" (Troubadours) کے "جو بیلڈ" (Ballads) اور "کینسونیٹ" (Canzonettes) ہیں۔ غالباً انہی عربی اشعار کے نمونے پر کہے گئے۔ ہر تحریر اور شاعروں کے اشعار ہوتے تھے جنہیں لوگ تزئین کلام کے لیے از بر کر لیا کرتے تھے۔" اس پر ہم رینان (Renan) سے ایک اقتباس کا اضافہ کرتے ہیں۔

"بیسویں صدی کے آتے آتے دنیا کے اس قابلِ رشک خطے میں سائنس اور ادب کے ذوق نے ایک ایسی رواداری قائم کر دی تھی جس کی مثال جدید زمانوں میں بمشکل ملے گی۔ عیسائی، یہودی اور مسلمان ایک ہی بولی بولتے تھے، سب کے گیت ایک تھے اور سب مل جل کر ادبی اور سائنسی درس و تدریس میں شرکت کرتے تھے۔ مختلف قوموں کے درمیان کوئی دیواریں، حائل نہ تھیں۔ سب ایک مشترکہ تہذیب کو ترقی دینے میں ایک دوسرے کے دوش بدوش مصروف کار تھیں۔ قرطبہ کی مسجدیں، جہاں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ تعلیم پاتے تھے، فلسفیانہ اور سائنسی مطالعوں کے مرکز بن گئیں۔"

یورپ میں پہلی رصد گاہ عربوں نے بنائی۔ اشبیلیہ کا مینار جیرالدہ (The Giralda) عظیم ریاضیات دان جابر ابن افلح کے زیرِ نگرانی فلکی مشاہدات کے لیے ۱۱۹۰ء میں تعمیر ہوا۔ اس کا جو حشر ہوا اور وہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔ مسلمانوں کے اخراج کے بعد اُسے ایک گرجا کا گھنٹہ گھر بنا دیا گیا، کیونکہ ہسپانیوں کو اس کا کوئی اور مصرف ہی نہ سوجھا!

ماہرین طبیعیات میں ہم صرف چار کے تذکرے پر اکتفا کرتے ہیں، یعنی عمر ابن خلدون، یعقوب ابن طارق، مسلمہ المغربی اور شہرہ آفاق ابوالولید محمد ابن

رُشد (Averroes) مغربی افریقہ بھی اس زمانے میں علمی سرگرمیوں سے خالی نہ تھا۔ سِلوط اور طنجہ، فاس اور مراقس سب کے سب قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ کے حریف تھے۔ انہوں نے بھی بڑے بڑے اساتذہ پیدا کیے، جن کی لاتعداد عالمانہ تصنیفات نے اس امر کی مزید شہادت بہم پہنچائی کہ مسلمانوں کو ہر شعبہ علم سے کتنا شغف تھا۔

گیارہویں صدی عیسوی کا آغاز ایشیائے وسطیٰ کے سیاسی حالات میں ایک بہت بڑے تغیر کا ہراول تھا۔ عظیم غزنوی فاتح، یمین الدولہ، امین الملت محمود، کے برسرِاقتدار آنے کی بدولت ماوراء النہر، افغانستان اور ایران غزنی کے قبضہ تسلط میں آ گئے محمود نے اپنے گرد ایسے ایسے عالم اور ادیب جمع کیے جنہوں نے اس کے درخشاں عہدِ حکومت کو چار چاند لگا دیے۔ یہ بجا ہے کہ وہ اشعری کی تجدید یافتہ صحیح العقیدگی کا دلدادہ اور اس لیے عقلیت پسند دبستانِ فکر کا مخالف تھا۔ یہ بھی بجا ہے کہ جن شاعروں نے اس کے نام کو دنیا کی تاریخ میں مشہور کر دیا، اُس نے اُن سے فیاضی کا حق ادا نہ کیا۔ پھر بھی اس میں اتنی ذکاوت تھی کہ اس نے فلسفی، ماہر ریاضیات اور جغرافیہ دان ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی، ملک الشعرا، فردوسی اور اساتذہ سخن دقیقی اور عنصری جیسے لوگوں کی قدر دانی کی۔ البیرونی جامع العلوم تھا۔ فلکیات پر اس کی تصنیف، جسے اس نے اپنے مربی سلطان مسعود کے نام پر ''القانون المسعودی'' کا نام دیا، ایک معرکے کی تصنیف ہے۔ اُس نے ہندوستان کی سیاحت کی، ہندوؤں کی زبان، علوم، فلسفہ اور ادب کا مطالعہ کیا اور اپنے مشاہدات کو ایک کتاب کی صورت میں مجسم کیا جسے حال ہی میں انگریزی زبان کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ وہ جس فلسفیانہ ژرف نگاہی، سائنسی صداقت پسندی اور وسیع ہمدردی کے ساتھ اپنے موضوع سے بحث کرتا ہے وہ اس اسلوب سے جو آج تک مغربی مصنفین غیر ممالک کے حالات بیان کرتے وقت اختیار کرتے ہیں بہت مختلف ہے اور اسلام کی ذہنی صداقت شعاری پر شاہد ہے۔ البیرونی کی تاریخ الہند سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان کس حد تک یونان کے علمی گنجیوں کو اپنے تصرف میں لے آئے تھے اور انہوں نے ان گنجیوں کو کیسے مفید طریقوں سے استعمال کیا۔ ان دو عظیم تصانیف کے علاوہ البیرونی نے ریاضیات، علم ترتیب التواریخ، ریاضیاتی جغرافیہ، طبیعیات اور علم کیمیا پر متعدد رسالے لکھے۔

البیرونی نے ہندوؤں سے جو خیالات اخذ کئے اور جو معلومات حاصل کیں اُن کے بدلے میں اُس نے انہیں بغدادی دبستان کے علوم سے واقف کیا۔ اُسے ہندوؤں کے یہاں یونانی سائنس کی باقیات ملیں۔ یونانی سائنس یا تو زمانہ عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں ہندوستان آئی تھی یا غالباً اس سے بھی پہلے یونانی باختری خاندانوں کے دورِ حکومت میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے یہاں اپنے کوئی ترقی یافتہ فلکیاتی علوم نہ تھے، ورنہ جیسا کہ سیدیو بجا طور پر کہتا ہے، اسکندریا سلیوکی خاندان کے زمانے کے یونانی مصنفین ضرور اُن کا تذکرہ کرتے۔ چینیوں کی طرح انہوں نے بھی اپنے سائنسی خیالات زیادہ تر غیر ملکی ماخذ سے حاصل کئے اور اپنی قومی خصوصیات کے مطابق اُن میں ردو بدل کر لیا۔

محمود کے جانشینوں کے زمانے میں علوم وفنون کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ سلجوقیوں نے علم وفضل اور سائنس سے جو شاندار فیاضی برتی وہ عباسیوں کے دورِ زریں کی علم پروری کا مقابلہ کرتی تھی۔ طغرل، الپ ارسلان، ملک شاہ اور سنجر نہ صرف عظمت و اقتدار کے لحاظ سے اور رعایا کی فلاح و بہبود کا ایک واضح تصور رکھنے کے معاملے میں ممتاز تھے، بلکہ وہبی کمالات اور علم سے پر جوش محبت میں بھی سر برآوردہ تھے۔ جلال الدین ملک شاہ اور اس کے وزیر خواجہ حسن نظام الملک نے اپنے گرد چوٹی کے ہیئت دان، شاعر، عالم اور مورخ جمع کئے۔ اس کے عہدِ حکومت میں ماہرین ہیئت کے ایک گروہ نے جس کے مقتدا عمر خیام اور عبدالرحمٰن الخازنی تھے، جو فلکیاتی مشاہدے کئے اُن کی بدولت ایک اصلاح شدہ تقویم مرتب ہوئی جو گریگوری کے کیلنڈر سے چھ سو سال پہلے وجود میں آئی اور جسے ایک صاحب رائے نے موخرالذکر سے بھی زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔ ان مشاہدات کی بناء پر جلالی نظام سنوات (Era) کیا گیا، جس کا نام ملک شاہ کے لقب پر رکھا گیا۔

اُن عیسائی غارت گروں نے جو اپنے آپ کو صلیبی مجاہد کہتے تھے مغربی ایشیاء اور شمالی افریقہ پر جو تباہ کن حملے کئے، ان کے اثرات علم اور سائنس کے حق میں نہایت مُضر ثابت ہوئے۔ یہ لوگ نرے وحشی تھے جنہیں سر پھرے پادریوں نے بھڑکا کر قتل و غارت کی مہموں پر بھیج دیا تھا۔ چنانچہ نہ ان میں اتنی انسانیت تھی کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا لحاظ کرتے اور نہ اتنی عقل کہ علم وفن کی قدر کرتے۔ انہوں نے نہایت بے دریغی

سے طرابلس کے شاندار کتب خانے کو تباہ کر دیا اور اسلامی ثقافت وفن کے کئی عظیم مرکزوں کو راکھ کے ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ مسیحی یورپ نے کتب خانہ اسکندریہ کی تباہی کو تو موضوع طعن بنایا ہے، حالانکہ وہ جولیس سیزر (Julius Caesar) کے زمانے میں پہلے ہی جل چکا تھا اور اس کے مسلمانوں کے ہاتھوں برباد کئے جانے کی کہانی سراسر مشکوک الاصل روائتوں پر مبنی ہے لیکن اس کے اپنے صلیبی جنگجوؤں نے صدیاں بعد جو جرائم کیے اُن کے بارے میں وہ خاموش ہے۔ صلیبی جنگجوؤں نے جو آفتیں ڈھائیں اُن کے اثرات بہت دیر پا ثابت ہوئے۔ چنانچہ صلاح الدین ایوبی اور اس کے بیٹوں نے شام کی علمی وادبی زندگی بحال کرنے کی جو کوششیں کیں اُن کے باوجود وہ آج تک بحال نہیں ہو سکی۔

محمود کے عروج اور بغداد کے زوال کے درمیان جو وقفہ گزرا اُس میں بہت سے فلسفی اور سائنس داں ہوئے، جن میں سب سے درخشاں نام ابوعلی حسین ابن سینا، فاتح بن نابغہ خاقانی (متوفی ۱۰۸۲) مبشر ابن احمد اور اس کے بیٹے محمد (متوفی ۱۱۳۵ء) کے ہیں۔

منگولوں کا جو فتنہ اسلامی دُنیا میں اُٹھا وہ روم پر شمالی وحشیوں کے حملے سے مماثل نہ تھا۔ روم پر جو وحشی حملہ آور ہوئے وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے تھے۔ چنانچہ سلطنت کی حدود کے اندر داخل ہونے کے بعد اُس کے مرکز کی طرف قدم بڑھانے کے عمل میں اُن کی اصلی وحشت کسی حد تک زائل ہو چکی تھی اور اُن کی طبیعتوں میں قدرے نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ غارتگر چنگیز کے لشکر کا معاملہ جدا تھا۔ وہ ایک پہاڑی ندی کی طرح طوفان برپا کرتا ہوا مغربی ایشیا پر چڑھ آیا۔ جدھر سے وہ گزرا اُدھر تباہی و بربادی اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ اس کی وحشیانہ تاخت و تاراج اور سفاکانہ کشت وخون نے ایشیا کے ذہنی ارتقاء کو کچھ مدت کے لیے بند کر دیا۔ لیکن ان وحشیوں کا اسلام قبول کرنا تھا کہ ان میں ایک تبدیلی واقع ہو گئی۔ یہی علم وفن کے مرکزوں کی اینٹ سے اینٹ بجانے والے مدرسوں اور جامعوں کے بانی اور ارباب علم کے سرپرست بن گئے۔ سلطان خدابندہ (الیاتو خان) جو چھٹی پشت میں چنگیز کا وارث تھا، صاحب کمال بھی تھا اور اہل کمال کا مربی بھی۔ لیکن چنگیز کے لشکر نے شہریوں کے جو قتلِ عام کئے تھے اُن میں علم پیشہ طبقے کے بیشتر لوگ تہ تیغ ہو گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ سمرقند اور بخارا جیسے شہروں نے از سرنو عروج پایا، لیکن

وہاں جو علمی اور ثقافتی روایات قائم ہوئیں وہ کچھ محدود قسم کی تھیں اور ان میں دینیاتی مسائل اور فسطائی بحث و تکرار کا عنصر غالب تھا۔ اس کے باوجود منگولوں نے ناصر الدین طوسی، مؤید الدین العرضی، دمشقی، فخر الدین المراغی، محی الدین المغربی، علی شاہ بخاری اور اسی قبیل کے اور فلسفیوں کی پشت پناہی کی۔ اس طرح ہلاکو کے جانشینوں نے اسلام کو وہ چیزیں واپس دلانے کی کوشش کی جو اُن کے اسلاف نے برباد کر دی تھیں۔ ادھر منگول ایران میں تہذیب کی خدمت کر کے تلافی مافات کر رہے تھے، ادھر قبلائی خان عربوں کے علوم کو چھین لے گیا۔

کوچیوکنگ نے ۱۲۸۰ء میں جمال الدین سے ابن یونس کی زیج وصول کی اور اسے چینیوں کے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ابن شاطر نے، جو مصر کے مملوک سلطان محمد ابن قلاؤن کے عہدِ حکومت میں ہوا ہے۔ ریاضیات و فلکیات کو مزید ترقی دی۔ ایسے میں مشرق کے اُفق پر وہ شہاب ثاقب طلوع ہوا جو تاریخ میں تیمور کے نام سے مشہور ہے۔ ''چودھویں صدی کی اس عظیم شخصیت نے سمرقند سے اُٹھ کر ایک ایسی سلطنت قائم کی جس کی سی وسعت اس سے پہلے ایشیا کی کسی سلطنت کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ ایران و توران کی قدیم دشمنی اس کے قابل مزاحمت ارادے کے سامنے یک قلم مٹ گئی۔'' وہ سائنس اور شاعری کا مربی ارباب علم و فن کی صحبت کا دلدادہ اور اعلیٰ پائے کا مصنف و مقنن تھا۔ اس محیر العقول انسان نے جو شاندار دار العلوم، پرسطوت مسجدیں اور وسیع کتب خانے قائم کیے وہ اس کے ذوقِ علم کے شاہد ہیں۔ اُس نے آبادیوں کا ایک نظام نافذ کر کے مشرقی ایشیا کے شہروں اور بالخصوص سمرقند کو مغرب کے تمام علوم و فنونِ متعارفہ کے گنجینوں سے مالا مال کر دیا۔ ''بنی اُمیہ نے اندلس میں اور شروع کے عباسی خلفاء نے عربستان میں جو سلطنتیں قائم کیں اُن کے بعد تاریخ اسلام کی سب سے بڑی سلطنت وہ تھی جس کا بانی تیمور تھا۔'' زبدہ علوم جامی Pilpay کا مترجم سہیلی اور علی شیر امیر اُن بی بی خانم نے جس دار العلوم کی بنیاد رکھی اور جو اُسی کے نام سے موسوم ہوا، اس کی عمارت اسلامی فن تعمیر کی سب سے جاذب نظر اور مرعوب کن تخلیقوں میں شمار ہوتی ہے۔ تیمور کے بیٹے شاہرخ مرزا نے فن و ادب کے اکتساب اور سرپرستی میں اپنے باپ کی تقلید

کی۔ اس کا پرامن عہد حکومت، جسے تقریباً نصف صدی کی طویل مدت نصیب ہوئی، اعلیٰ ادبی کارناموں اور سائنسی مطالعوں کی بدولت شہرت رکھتا ہے۔ جب اس نے اپنا پایہ تخت سمرقند سے ہرات منتقل کر لیا تو اس کے بعد بھی سمرقند کی شان وشوکت میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اس کے بیٹے الغ بیگ نے، جسے ماوراالنہر کا نظم ونسق سپرد کیا گیا، سمرقند کے علمی وادبی مرتبے کو برقرار رکھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا ہیئت دان تھا اور جن فلکیاتی مشاہدوں نے اس کے نام کو زندہ جاوید کر دیا ہے اُن کی نگرانی خود کیا کرتا تھا۔ جن زیجوں میں ان مشاہدوں کو مجسم کیا گیا وہ فکرِ عربی کے تتمے اور تکملے ہیں۔ الغ بیگ اور جدید فلکیات کے بانی کپلر (Kepler) کے درمیان صرف ڈیڑھ صدی کا فاصلہ تھا۔

مسلمانوں نے صرف فلکیات ہی کی تہذیب واصلاح نہیں کی، بلکہ ریاضیاتِ عالیہ کے ہر شعبے پر بھی اُن کے اختراعی وتحقیقی بنوغ کی مہر ثبت نظر آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یونانی جبرو مقابلہ کے موجد تھے لیکن جیسا کہ اولسنر (Oelsner) نے عادلانہ کہا ہے' انہوں نے اس سے صرف گردشِ جام کی پیمائشوں میں تفریحاً کام لیا، مسلمانوں نے اسے اعلیٰ مقاصد کے لیے استعمال کیا اور اُسے ایک نئی قدر وقیمت بخش دی۔ دوسرے درجے کی مساوات وہ مامون کے عہد میں دریافت کر چکے تھے۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد انہوں نے دودرجی مساوات کا نظریہ اور دوعددی مسئلہ بھی اختراع کر لیا۔ صرف جبرو مقابلہ، ہندسہ اور حساب ہی نے نہیں بلکہ مناظر ومرایا اور علم جرثقیل نے بھی مسلمانوں کی بدولت ترقی پائی۔ اُنہوں نے کروی مثلثات ایجاد کی، وہ پہلے لوگ تھے جنہوں نے جبرو مقابلہ کا اطلاق ہندسہ پر کیا، مماس کو متعارف کرایا اور مثلثاتی حسابوں میں قوس کی جگہ جیب کو داخل کیا۔ اُنہوں نے ریاضیاتی جغرافیہ میں جو ترقی کی وہ بھی کچھ کم نمایاں نہ تھی۔ حوقل، مقریزی، لاصطخری مسعودی البیرونی، الکومی، لادریسی، قزوینی، ابن الوردی اور ابوالفدا ء کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے اس شعبہ علم میں، جسے انہوں نے رسم الارض کا نام دیا، کیسے کیسے معرکے کے کام کئے۔ ایک ایسے زمانے میں جب یورپ کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ زمین سپاٹ ہے وہ اس عقیدے کے مخالفوں کو زندہ جلا دینے سے دریغ نہ کرتا تھا عرب جغرافیے کی تعلیم کروں کے ذریعے دیتے تھے۔

طبیعی سائنسوں کی نشو و نما بھی ایسی ہی تن دہی سے کی گئی۔ نظریوں کی جگہ تجربوں سے کام لیا گیا اور اس طرح قدماء کے ناتراشیدہ علوم کو مثبت علوم کی شکل دی گئی۔ کیمیائیات، نباتیات، ارضیات (علم طبقات الارض) طبیعی تاریخ اور اُن کے متجانس علوم قابل ترین لوگوں کی توجہ کے مرکز اور اُن کی دماغی کاوشوں کے موضع رہے۔

کیمیائیات ایک مدون علم کی حیثیت سے قطعی طور پر مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ ابو موسیٰ جابر (جسے عیسائی مصنفین Geber کہتے ہیں[1]) جدید کیمیائیات کا حقیقی بانی مبانی ہے۔ "اس کا نام علم کیمیا کی تاریخ میں یادگار ہے، کیونکہ اُس سے اس علم کے ارتقاء کا ایک ایسا دور منسوب ہے جو پریسٹلے (Priestley) اور لاووازیے (Lavoisier) کے ادوار کے برابر اہمیت رکھتا ہے۔" اس کے بعد چند دوسرے عالم آئے جن کی جدت طبع، محنت و کاوش، تبحر علمی اور ذکاوت مشاہدہ سے پڑھنے والا محوِ حیرت ہو جاتا ہے اور دورِ حاضر کے مسلمانوں کے ذہنی جمود پر افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

علمِ طب اور فن جراحی کو بھی، جو کسی قوم کی فطری استعداد کی بہترین کسوٹی اور کسی مذہب کے عقلیت پسندانہ مزاج کا ایک کڑا امتحان ہیں، درجہ کمال تک ترقی دی گئی۔ یہ درست ہے کہ یونانیوں نے طب میں اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل کر لی تھی لیکن انہوں نے طب کو جس مرحلے تک پہنچایا تھا عرب اسے اس مرحلے سے بہت آگے بڑھا کر جدید زمانے کے معیاروں کے قریب لے آئے۔ عربوں نے کئی صدیوں تک علمِ انسانی کے اس شعبے کی جو خدمت کی اور طبیعی سائنس کی ترقی کے سلسلے میں جو کارنامے کئے ہم یہاں اُن کا محض اجمالی تذکرہ کر سکتے ہیں۔

دواؤں کی خاصیتوں کا مطالعہ، جس کا خیال دبستان اسکندریہ کے حکیم دیوسکورائڈیز (Dioscorides) کے ذہن میں پیدا ہوا، اپنی سائنسی شکل میں عربوں کی تخلیق ہے۔ وہ کیمیائی دوا سازی کے موجد اور ان اداروں کے پہلے بانی تھے جنہیں ہم آج کل

---

[1] ابو موسیٰ جابر ابن حیان۔ طرطوس کا باشندہ تھا۔ ابن خلکان اس کی بابت لکھتا ہے: "جابر نے دو ہزار صفحوں کی ایک کتاب تالیف کی جس میں اس نے اپنے استاد امام جعفر صادق کے مسائل یکجا کئے جو پانچ سو رسالوں پر مشتمل تھے۔"

ڈسپنسریاں یعنی دواخانے کہتے ہیں[۱]۔ انہوں نے ہر شہر میں دارالشفایا ''مارستان'' (''بیمارستان'' کا مخفف) قائم کیے جن کے خرچ کی سرکار متحمل ہوتی تھی۔

ابواصیلبلیہ کی ''طبقات الاطبا'' کی پوری ایک جلد عرب طبیبوں کے ناموں پر مشتمل ہے۔ ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی جو قرون وسطیٰ کے یورپ میں (Rhates) کے نام سے معروف تھا اور جو دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہوا[۲] علی ابن عباس[۳]، ابوعلی حسین۔ ابن سینا، ابو القاسم خلف، ابن عباس، ابومروان، ابن عبدالمالک ابن زہر[۴]، ابو الولید محمد ابن رُشد اور عبداللہ ابن احمدی ابن علی البیطار[۵]، یہ ہیں چند صاحب کمال اور نامور طبیب جنہوں

---

۱ جولوگ، دواخانوں میں دوائیں تیار کر کے مریضوں کو دیتے تھے ان پر حکومت کی طرف سے نگرانی ہوتی تھی۔ دواؤں کی مقداریں اور قیمتیں باضابطہ طور پر مقرر کی جاتی تھیں۔ بہت سے سرکاری دواخانے بھی تھے۔ طبیبوں اور دوا سازوں کے باقاعدہ امتحان ہوتے تھے اور جو امیدوار اُن میں کامیاب ہوتے تھے انہیں سندیں دی جاتی تھیں۔ صرف سند یافتہ لوگوں کو طبابت کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت تھی۔ اس ضمن میں کریمر (Cremer) اور سیدیو (Sedillot) کی تصنیفات ملاحظہ کیجئے۔

۲ عظیم طبیب، جو ایران کے شہر رے میں پیدا ہوا، یکے بعد دیگر رے، جُند شاپورا اور بغداد کے شفاخانوں کا سربراہ تھا۔ اُس کی تصنیف ''حاوی'' کو سیدیو ''طبی معلومات کا ایک نہایت موقر ذخیرہ کہتا ہے۔ اس نے چیچک اور خسرے پر جو رسالے لکھے اُن سے تمام ملکوں کے طبیب استفادہ کرتے رہے ہیں۔ اُس نے Minor Atioes کے استعمال کی ابتدا کی۔ زخم کشا ذورا ایجاد کیا اور عصب تجزہ دریافت کیا۔ اس نے دو سو طبی رسالے لکھے جن میں سے بعض کی اشاعت۔ ۱۵۱۰ء میں وینس میں ہوئی۔ الرازی نے ۳۱۱ ہجری مطابق ۹۲۳،۲۴ء) وفات پائی۔

۳ علی ابن عباس کا زمانہ رازی کے زمانے کے نصف صدی بعد کا ہے۔ اس نے طب کے نظری و عملی پہلوؤں پر ایک کتاب لکھی جو بیس جلدوں میں تھی اور جسے اُس نے بویہ امیر عضدالدولہ کے نام پر معنون کیا۔ اس کتاب کا لاطینی ترجمہ ۱۲۲۷ء میں ہوا اور اسے لیون (Lyons) میں مشل کپیلا (Michel Capella) نے ۱۵۲۳ء میں شائع کیا۔ علی ابن عباس نے بقراط اور جالینوس کی بہت سی غلطیوں کی اصلاح کی۔

۴ ابن زہر (جو یورپ میں Aven Zoar کے نام سے معروف تھا) اپنے زمانے کے ممتاز ترین اطبا میں تھا۔ اس کی پیدائش پینافلور Penaflor میں ہوئی۔ طبی اور سائنسی علوم سے فارغ التحصیل ہو کر وہ افریقہ کے مشہور المرابطی سلطان یوسف ابن تاشقین کی ملازمت میں داخل ہوا۔ ابن تاشقین نے اس کی بہت عزت و توقیر کی۔ ابوالقاسم کی طرح ابن زُہر نے بھی طبابت اور جراحی دونوں پیشے بہ یک وقت اختیار کئے۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے زخرے کو چیرا اور اس عمل میں جو ہڈیاں اتر گئیں یا ٹوٹیں اُن کا صحیح صحیح نقشہ ذہن میں رکھا۔ اس عمل کے ذریعے اس نے بہت سی اہم بیماریاں اور اُن کے علاج دریافت کئے۔ اُس کا بیٹا اس کے نقشِ قدم پر چلا اور یوسف ابن تاشقین کی فوج کا اعلیٰ جراح اور طبیب بنا۔

۵ ابن رشد Averroes مغرب کا ابن سینا تھا۔ اس کی سیرت اور تصنیفات کو رینان Renan نے دنیا کے آگے پیش کیا۔ وہ ابن زُہر، ابن باجہ اور ابن طفیل کا ہمعصر تھا۔ ابن رشد اور اس کے معاصرین کا مزید تذکرہ ہم آئندہ باب میں کریں گے۔ ان کے علاوہ چند اور نام قابل ذکر ہیں۔ یعنی ابوالحسن ابن تلمیذ مصنف ''الامانی'' ابوجعفر احمد ابن محمد الطالب جس نے ذات الجنب پر رسالے لکھے۔ ۔ ہبت اللہ

نے جریدہ علم و فکر پر ایک نقش دائم چھوڑا۔ ابو القاسم نہ صرف صف، اوّل کا طبیب بلکہ صفِ اوّل کا جراح بھی تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے شعبہ طب میں بلکہ دایہ گری کے شعبے میں بھی بہت سے عمل جراحی کیے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ چونکہ عورتوں کی جراحی میں شرم و حیا کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا اس لیے باقاعدہ طور پر تربیت یافتہ عورتیں اس کی معاون ہوتی تھیں۔ اس کے زمانے میں جو آلاتِ جراحت استعمال ہوتے تھے، انہیں اس نے تفصیلاً بیان کیا ہے۔ اُن سے اس امر کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ فن جراحی نے عربوں کے یہاں کتنی ترقی کر لی تھی۔[1] ابن سینا بلا شک و شبہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا صاحب کمال تھا۔ وہ خود بھی جامع العلوم تھا اور اس کی تصنیفات بھی ایک قاموس المعارف ہیں، وہ فلسفی بھی تھا، ریاضیات دان بھی، ماہر فلکیات بھی، شاعر بھی طبیب بھی۔ اس کے اثرات دو براعظموں کی تاریخ پر مرتسم ہیں اور وہ مشرق کا ارسطو کہلائے جانے کا بہمہ وجود مستحق ہے۔ قدماء پرستوں کے رشک و رقابت کے باوجود اس کے فلسفیانہ خیالات کئی صدیوں تک مشرق و مغرب دونوں کے دبستانوں پر مستولی رہے۔ ابن سینا مشرق میں شیخ الرئیس کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کا باپ ماوراء النہر کا گورنر تھا اور وہ اس صوبے کے ایک گاؤں میں جس کا نام افشانہ تھا ۹۱۰ء میں پیدا ہوا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ہی تعلیم سے فارغ التحصیل ہو کر اس نے اپنی غیر معمولی سیاسی اور فلسفیانہ زندگی شروع کر دی۔ محمود فاتح کی ملازمت قبول کرنے سے متواتر انکار کی بدولت اُسے غزنوی قلمرو سے دیس نکالا ملا۔ لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد شمس الدولہ امیر ہمدان نے اُسے اپنی وزارت پر مامور کیا۔ اس کے بعد علاؤ الدولہ امیر اصفہان کا وزیر بنا۔ اصفہان میں اس نے اپنے سائنسی او فلسفیانہ کارنامے انجام دیئے اور اپنی معرکتہ الآراء تصانیف ''قانون'' اور ''ارجوزہ'' لکھیں جو آگے چل کر علم طب کی اساس بنیں۔

یونانیوں کو تشریح الاعضاء سے بہت کم واقفیت تھی اور انہیں دواسازی کا جو علم تھا وہ بھی بہت محدود تھا۔ مسلمانوں نے تشریح الاعضاء کو بھی اور دواسازی کو بھی ترقی دے کر مستقل علوم کی حیثیت بخش دی۔ اسلامی سلطنت کی وسعت کی بدولت مسلمانوں کو کرہ

---

[1] مثانے کی پتھری نکالنے کے عمل جراحی میں وہ آج کل کے بہترین سرجنوں کا ہم پایہ تھا۔

ارض کے ہر گوشے میں تحقیق و تجسس کرنے کا موقعہ ملا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے وقت کے ذخیرہ ادویہ کو بے شمار گراں قدر اضافوں سے مالا مال کر دیا۔ نباتیات کو دیو سکوریڈیز (Dioscorides) نے جہاں پہنچایا تھا اُسے وہ اس سے بہت آگے لے گئے اور یونانیوں کو جو جڑی بوٹیاں معلوم تھیں اُن کی تعداد میں اُنہوں نے دو ہزار کا اضافہ کیا۔ طالب علموں کی تعلیم کے لیے قرطبہ اور بغداد، قاہرہ اور فاس میں باقاعدہ باغات تھے۔ جہاں نباتات اور دوا سازی کے ماہر درس دیتے تھے۔

محمد الدمیری نے جانوروں کی جو تاریخ لکھی اس کی بدولت وہ سارے عالم اسلامی میں مشہور ہے۔ اس تصنیف کو بُفان (Buffon) کی تصنیفات پر سات صدیوں کا تقدم حاصل ہے۔

ارضیاتِ کو عرب علم تشریح الارض کہتے تھے۔ اُسے بھی اُنہوں نے پروان چڑھایا۔

فن تعمیر میں مسلمانوں کو جو تفوق حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، کیونکہ مشرق و مغرب میں جو مسلم عمارات یا اُن کی باقیات ہیں وہ آج بھی دنیائے جدید سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہیں۔ مصوری اور مجسمہ سازی میں مسلمانوں کی پسماندگی اسلام سے منسوب کی گئی ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن نے اس بارے میں جو ممانعت کی وہ اُس ممانعت سے مشابہ ہے جو عہد نامہ عتیق کی کتاب احبار میں کی گئی تھی۔ یہ کوئی نئی ممانعت نہ تھی، بلکہ آئین موسوی کی تکرار تھی جس نے یہودیوں کے یہاں ''تراشیدہ بتوں کا بنانا مؤثر طریقے سے مسدود کر دیا تھا اور اس کا جواز، اعراب جاہلیت کی پرانی رسم بُت پرستی سے واضح ہے۔ چنانچہ ابتدائی مسلمان مصوری اور مجسمہ سازی کو کفر و شرک کی علامت تصور کر کے انہیں قابل نفرت اور حرام سمجھتے تھے اور اس بت شکنی نے جو اُن کی طبیعت میں رچ گئی تھی انہیں دوسری قوموں کی طرح بت پرستی میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا۔ لیکن جب مسلمانوں کا سیدھا سادہ ابتدائی معاشرہ ایک مہذت و متمدن سلطنت میں تبدیل ہو گیا اور ان کے یہاں علم و حکمت اور سائنس کو عروج حاصل ہوا تو انہوں نے اس ممانعت کے حقیقی منشاء کو سمجھ لیا اور لغوی تقلید کے بندھن توڑ دیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع کے عباسیوں اور اُندلسی خلیفوں نے فنونِ لطیفہ کی جو ہمت افزائی کی اس کی حقیقی وجہ عقلیت

کی وہ روح تھی جس نے اُن پر اتنا گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ ساری اسلامی دنیا میں ادب اور سائنس کی ترقی کے پہلو بہ پہلو مصوری اور مجسمہ سازی کا ذوق بھی ہوتا گیا۔ خلیفوں کے محل، اُن بادشاہوں کے محل جو اُن کے نقشِ قدم پر چلے اور وزراء امراء کے مکان تصویروں اور مجسموں سے مزین ہوتے تھے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے مسجدوں میں بتوں اور تصویروں کی جو ممانعت کی ہم عربوں کے فن نقاشی کے لیے اس کے ممنون ہیں، جو مشرقی عمارتوں کو عجیب وغریب دلکشی بخشتا ہے اور جس کا یورپ نے بڑی حد تک چربہ اُتارا ہے۔ جب عربوں کو دوسری قوموں کے فنون سے آشنائی حاصل ہوئی تو انہوں نے جانور، پرندے اور پھل پھول بھی اپنی نقاشی میں داخل کردیئے۔ پھر بھی مسجدوں کی زیب وزینت میں انسانوں اور حیوانوں کی شکلیں قطعاً ممنوع رہیں۔ ہیئت کی پاکیزگی، خاکے کی سادگی، وضع وقطع کی لطافت اور تناسب کی بے عیبی میں، تمام جزئیات کی ہم آہنگی میں، دستکاری کی عمدگی میں اور تخیل کی بلندی میں مسلمانوں کا فن تعمیر کسی ملک کے فنِ تعمیر سے کم پایہ نہیں۔ بالخصوص جس نزاکت اور خوش اسلوبی سے مسلمانوں کی سب سے شاندار عمارتوں کی آرائش کی گئی ہے وہ ایک ایسے نکھرے ہوئے ذوق اور نفاست طبع کی دلیل ہے جس کی نظیر یونان قدیم کی یادگاریں یا جدید یورپ کی عمارتیں پیش نہیں کرسکتیں۔ مسلمانوں کے فنِ تزئین کی ایک اور شاخ خط طغرا ہے جو مسجدوں، مقبروں اور محلوں کی آرائش میں استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن کی پوری پوری سورتیں گنبدوں اور میناروں، دیواروں اور محرابوں پر خط طغرا میں کھودی یا جڑی جاتی ہیں۔ اس مرصع کاری اور منبت کاری کا سرچشمہ وہی مذہبی پہلو ہوتا ہے جو عیسوی کلیساؤں کے اندر اولیاء شہداء کی تصویروں میں جلوہ گر دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کا مزاج خالصۃً موحدانہ ہوتا ہے۔

اشاعتِ اسلام سے پہلے عربوں کے یہاں گانے بجانے کا پیشہ یا تو اُن غلاموں اور لونڈیاں سے مخصوص تھا جو شام یا ایران سے لائی جاتی تھیں یا طوائفوں سے جنہیں قیان کہتے تھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے بدیہی اخلاقی وجوہ کی بناء پر ان رذیل طبقوں کے رقص وسرود کو ناپسند فرمایا تھا۔ لیکن عباسیوں اور اُندلسی خلیفوں کے زمانے میں جب موسیقی کو ایک علم کا درجہ حاصل ہوگیا اور اس کی مشق کو ایک فن تسلیم کیا گیا تو معاشرے کے

تمام طبقوں میں اس کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، گیت جمع کئے گئے اور راگوں اور سروں کے کے مطابق اُن کو مرتب کیا گیا۔ قدماء کے آلاتِ موسیقی کی اصلاح کی گئی اور نئے آلات ایجاد کئے گئے لیکن عقلیت اور ملائیت معنویت اور لفظ پرستی کے درمیان جو آویزش بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوئی اُس نے اس شیریں ترین فنون کو پھر اربابِ نشاط کا ذریعہ معاش یا درگاہوں کا مجرائی بنا دیا۔

تجارت، زراعت، دستکاری اور صنعت پر بہت کچھ لکھا گیا۔ دستکاری اور صنعت میں چینی کے برتنوں سے لے کر آلاتِ حرب تک بے شمار چیزیں شامل تھیں۔

تاریخی تحقیق میں بھی مسلمان زمانہ قدیم یا زمانہ جدید کی کسی قوم سے پیچھے نہیں رہے۔ شروع شروع میں زیادہ تر سیرتِ نبوی پر توجہ دی گئی۔ لیکن بہت جلد تاریخ کا تصور وسیع تر ہو گیا۔

آثاریات، جغرافیہ، علم الاقوام تینوں کو تاریخ میں شامل سمجھا جاتا تھا اور بہترین دماغ ان کے مطالعے میں مصروف رہے تھے۔ ابن اسحاق کی سیدھی سادی تصنیف اور ابن خلدون کی عالمی تاریخ میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن ان دونوں کے درمیان لا تعداد مصنف ہوئے جن کی تصنیفات سے اس امر کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام کے فیضان اثر کی بدولت مسلمانوں نے کیسے کیسے ذہنی کارنامے انجام دیئے،

بلاذری، جس کی وفات ۲۷۹ ہجری (مطابق ۸۰۶ء) میں ہوئی، بغداد میں پیدا ہوا اور ساری عمر وہیں رہا۔ اس کی ''فتوح البلدان'' نہایت دلکش پیرائے میں لکھی گئی ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں کے تاریخی مذاق میں کتنی ترقی ہو گئی تھی۔

ہمدانی نے، جس کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا اختتام اور چوتھی صدی کا آغاز تھا، دنیا کو جنوبی عرب کی ایک جامع تاریخ دی، جس میں اس نے اس خطے کی قوموں کے احوال بیان کئے، اُن کے دلچسپ آثار قدیمہ کی تفصیلات (اُن کے کتبوں کی شرحوں کے ساتھ) دیں اور بالخصوص یمن کے جغرافیہ اور اُس کے لوگوں کی نسلی خصوصیات سے بحث کی۔ لیکن جن تصنیفات میں مسلمانوں کی قدرتِ تاریخ نویسی پورے عروج پر دکھائی دیتی ہے وہ مسعودی، البیرونی، ابن الاثیر، طبری، ابن خلدون (جسے مول Mohl اسلام کا مونٹسکیو

کہتا ہے) مقریزی، مقری، ابوالفدا، نویری، میر خوند کی تصنیفات ہیں۔ یہ Montesquieu لوگ اپنے فن کے خصوصی ماہر ہی نہ تھے، بلکہ جامع العلوم تھے، یعنی فلسفی، ریاضیات دان اور ساتھ ہی ساتھ مورخ۔ مسعودی باشندہ تو بغداد کا تھا، لیکن نسلاً شمالی عرب تھا اور اس نے عنفوانِ شباب میں دنیائے اسلامی کے بیشتر حصے کی سیاحت کی تھی۔ سب سے پہلے وہ ہندوستان گیا، جہاں اس نے ملتان اور منصورہ کی سیر کی۔ پھر وہ ایران اور کرمان گیا، وہاں سے ہندوستان لوٹا اور کچھ مدت کمباجہ (Conbaga) اور دکن میں رہا پھر سیلون گیا۔ وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر کمبالو (مڈغاسکر Medagascer) پہنچا۔ وہاں سے عازم عمان ہوا اور غالباً جزیرہ نمائے ہندوچین اور چین کی سیر بھی کر آیا۔ وسطی ایشیا میں سفر کرتا ہوا وہ بحیرہ خزر تک پہنچا۔ سیاحت ختم کر کے وہ کچھ مدت بطریہ اور انطاکیہ میں مقیم رہا اور بعد میں رے کا شہری بنا جہاں اس نے سب سے پہلے اپنی عظیم تصنیف ''مروج الذہب'' شائع کی۔ بعدازاں اس نے نسطاط میں سکونت اختیار کی اور وہاں اس نے پہلے 'کتاب التنبیہ'' اور پھر 'مرآۃ الزمان'' شائع کی۔ مؤخر الذکر ایک ضخیم تصنیف ہے جس کا محض ایک حصہ باقی رہ گیا ہے[1]۔ مروج الذہب'' میں وہ اپنی زندگی کے گوناگوں تجربات کو ایک ایسے شخص کے شگفتہ اور دلنشین انداز میں بیان کرتا ہے جس نے ملک ملک کی سیاحت کی ہے اور زندگی کے سب رنگ دیکھے ہیں اور جو پڑھنے والے کو صرف سبق ہی نہیں دینا چاہتا بلکہ اس کے لیے تفریح طبع کا سامان بھی بہم پہنچانا چاہتا ہے۔ ہمارے دماغ پر سندوں کی لمبی لمبی فہرستوں کا بوجھ ڈالے بغیر، ہمیں طولانی تمہیدوں میں اُلجھائے بغیر لطف لے لے کر ایسی چیزوں کو نمایاں کرتا ہے جو اُسے عجیب و غریب نادر الوجود اور دلچسپ معلوم ہوتی ہیں اور بڑے اجمال اور محاکماتی چابکدستی کے ساتھ لوگوں اور اُن کے طور طریقوں کے نقشے کھینچتا ہے۔''

طبری (ابوجعفر محمد ابن جریر) کو عربوں کے لوی Livy کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس نے ۹۲۲ء میں بغداد میں وفات پائی۔ اس نے جو تاریخ لکھی وہ ۳۰۲ ہجری (مطابق ۹۱۴ء) پر ختم ہوتی ہے۔ اُس کے بعد المکین (Elmacin) نے اس کا تتمہ لکھا جو بارہویں

---

[1] مجھے بتایا گیا ہے کہ وی آنا کی لائبریری میں اسی مصنف کی ایک تاریخی تصنیف ہے جو تقریباً تیس جلدوں پر مشتمل ہے اور جس کا نام 'اخبار الزمان'' ہے۔ غالباً یہ وہی تصنیف ہے جو 'مرآۃ الزمان'' بھی کہلاتی ہے۔

صدی عیسوی کے اختتام تک کے واقعات پر حاوی ہے۔

ابن الاثیر، ملقب بہ عزالدین، عراق کے جزیرہ بنی عمر کا رہنے والا تھا، لیکن زیادہ تر موصل میں مقیم رہا، جہاں اس کا مکان ممتاز ترین علماء وفضلائے عصر کا مرجع تھا۔ اُس کی تاریخ عالم، جس کا نام "الکامل" ہے اور جو ۱۲۳۱ء پر ختم ہوتی ہے، جدید یورپ کی بہترین تصانیف کا مقابلہ کرتی ہے۔

مقریزی (تقی الدین احمد) ابن خلدون کا ہم عصر تھا۔ اس نے مصر پر جو کتاب لکھی وہ اس ملک کے سیاسی، مذہبی، معاشرتی، تجارتی، آثاریاتی اور انتظامی حالات کا ایک واضح نقشہ پیش کرتی ہے۔

ابوالفدا، جس کا ذکر ہم ایک جغرافیہ داں کی حیثیت سے کر چکے ہیں، چودہویں صدی عیسوی کے آغاز میں حماہ کا شہزادہ تھا۔ وہ فنونِ حرب میں اُتنا ہی ممتاز تھا جتنا علم و ادب میں۔ اپنے بے شمار اوصاف حمیدہ کی بدولت وہ مشرق کے علما اور سائنس دانوں میں اونچا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی عظیم تصنیف کا وہ حصہ جو اسلام کی سیاسی وادبی تاریخ سے اور اسلام کے بازنطینی حکمرانوں کے ساتھ مراسم سے تعلق رکھتا ہے بڑا بیش بہا ہے۔

ابن خلدون کا زمانہ چودھویں صدی عیسوی تھا۔ وہ تیونس میں ۱۳۳۲ء میں پیدا ہوا۔ چنانچہ چودھویں صدی عیسوی میں جن انقلابات نے افریقہ کو ایک ہنگامہ زار بنا رکھا تھا اس نے اُن کے درمیان زندگی بسر کی۔ اس کی مہتمم بالشان تاریخ کا مقدمہ بجائے خود معلومات اور فلسفیانہ بحثوں کا ایک گراں قدر ذخیرہ ہے۔ مقدمے میں وہ معاشرے کی ابتدا کا سراغ لگاتا ہے، تہذیب کی نشوونما کے مدارج بیان کرتا ہے اور سلطنتوں اور خاندانوں کے عروج وزوال کے اسباب کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ دوسرے مسائل کے ضمن میں وہ اس کا بھی تجزیہ کرتا ہے کہ قوموں کے شمائل و خصائل پر آب و ہوا کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ابن خلدون نے ۱۴۰۶ء میں وفات پائی۔

عربوں نے قطب نما ایجاد کیا اور علم کی تلاش میں یا تجارت کے سلسلے میں دنیا کے تمام حصوں کی سیاحت کی۔ انہوں نے افریقہ میں مجمع الجزائر ہند میں ہندوستان کے ساحل پر اور جزیرہ نمائے ملایا میں نو آبادیاں قائم کیں۔ اور تو اور، چین نے بھی اپنے ہمیشہ

بند رہنے والے دروازے مسلم نو آباد کاروں اور تاجروں کے لیے کھول دیئے۔ انہوں نے پرتگال کے مغرب میں جزائر زور دریافت کئے اور قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً ساحل امریکہ تک جا پہنچے۔ قدیم براعظموں کی سرحدوں کے اندر اُنہوں نے ہر طرح کی انسانی محنت و مشقت کو ایک ایسے طریقے سے پروان چڑھایا جس کی نظیر نہ اُن سے پہلے تھی نہ اُن کے بعد ملتی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے محنت کو ایک فرض قرار دے کر اس کی تاکید کی تھی، صنعت و حرفت کو ایک مقدس مشغلہ کہا تھا، تجارت اور زراعت کی یہ کہہ کر تلقین کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ مستحق ثواب کام ہیں۔ ان ہدایات کا نتیجہ نکلنا تھا اور نکلا۔ تاجر، دکاندار اور حرفت پیشہ لوگ اسلامی معاشرے میں عزت پاتے تھے۔ صوبوں کے عمال، فوج کے اعلیٰ منصب دار اور اربابِ علم و فضل اپنی کنیتوں یا خطابوں میں اپنے آبائی پیشوں کا اعلان کرنے میں کوئی ننگ و عار محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ امن و امان جس سے سلطنت کے طول و عرض میں کاروان آمد و رفت کرتے تھے، سڑکوں کی مکمل سلامتی اور بے خطری، وہ حوض، تالاب اور سرائیں جو سڑکوں کے کنارے ہر جگہ موجود تھیں...... ان سب چیزوں نے مل کر تجارت اور صنعت و حرفت کو سریع ترقی دی۔

جن جن ملکوں میں عرب آباد ہوئے وہاں انہوں نے جابجا نہریں بنائیں ہسپانیہ کو انہوں نے آبپاشی کا ایک ایسا نظام بخشا جو بندوں، پانی روکنے والے تختوں، پنّوں اور پمپوں پر مشتمل تھا۔ بڑے بڑے علاقے جو اب غیر آباد اور بنجر پڑے ہیں زیتون کے جھنڈوں سے سرسبز و شاداب تھے۔ دوسرے شہروں سے قطع نظر اکیلے اشبیلیہ کے گرد و نواح میں روغن زیتون نکالنے کے ہزاروں کولھو تھے۔ چاول شکر اور کپاس تینوں عربوں کے طفیل ہسپانیہ میں آئے۔ جتنے پھل اس وقت اس ملک میں ہیں اُن کے باغات پہلے پہل انہی نے لگوائے۔ ان کے علاوہ انہوں نے کئی نئی قسموں کے پودے مثلاً اورک، زعفران، مُرّ مکّی متعارف کرائے۔ اُنہوں نے تانبے، گندھک پارے اور لوہے کی کانیں کھولیں، ریشم کی پیداوار شروع کی، کاغذ سازی اور پارچہ بافی کو رواج دیا، چینی اور مٹی کی ظروف سازی، لوہے، فولاد اور چمڑے کی صنعتیں قائم کیں۔ قرطبہ کا مشجر قالین نما کپڑا، مرسیہ کا اُونی کپڑا، غرناطہ، المریہ اور اشبیلیہ کا ریشمی کپڑا، طلیطلہ کی فولاد اور سونے کی بنی ہوئی چیزیں، شاطبہ کا

کاغذ......ان سب چیزوں کی ساری دنیا میں مانگ تھی۔ مالقہ قرطاجنۃ الخلفاء، برشلونہ اور قادس کی بندرگاہیں درآمد و برآمد کی بڑی بڑی منڈیاں تھیں۔ اُندلسی عربوں کے پاس اُن کے زمانہ عروج میں ایک ہزار سے زائد تجارتی جہازوں کا بیڑا تھا۔ ڈینیوب کے کناروں پر اُن کے کارخانے اور تجارتی نمائندے تھے۔ قسطنطنیہ کے ساتھ اُن کا ایک وسیع سلسلہ تجارت تھا جو بحیرہ اسود اور بحیرہ روم کے مشرقی ساحل سے لے کر اندرون ایشیا تک پھیلا ہوا تھا اور جو ایک طرف ہندوستان اور چین کی بندرگاہوں تک اور دوسری طرف ساحلِ افریقہ کے ساتھ ساتھ مڈغاسکر تک پہنچتا تھا۔ ''دسویں صدی عیسوی کے وسط میں، جب کہ یورپ کی وہی حالت تھی جو اب کیفریریا (Caffraria) کی ہے، ابو القاسم جیسے روشن ضمیر مورتجارت اور سوداگری کے اصولوں پر رسالے لکھ رہے تھے۔'' تجارتی مہم آزمائیوں کی حوصلہ افزائی کی خاطر اور سیر و سیاحت کے شوق کو ترقی دینے کی خاطر جغرافیائی رجسٹر، فرہنگیں اور رہنمائے مسافراں کتابچے سرکاری طور پر شائع کیے جاتے تھے، اور اُن میں مختلف مقامات کی جزئی تفصیلات، راستوں کے کوائف اور دوسرے ضروری امور درج کیے جاتے تھے۔ ابن بطوطہ جیسے جہاں گرد معلومات کی جستجو میں غیر ملکوں کی سیاحت کرتے تھے اور جن جن ملکوں میں جاتے تھے وہاں کے لوگوں پر، وہاں کے جانوروں اور پودوں پر، وہاں کی معدنی پیداوار پر، اُن کی آب و ہوا اور طبعی خصوصیات پر ضخیم کتابیں لکھتے تھے جو فراست وکیاست اور صحتِ مشاہدہ کے حیرت انگیز نمونے ہوتی تھیں۔

علم وفن کا شوق صرف مردوں کی خصوصی ملکیت نہ تھا۔ عورتیں بھی مردوں کے برابر علمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں مصروف رہتی تھیں اور ادب سائنس سے شغف رکھتی تھیں۔ اُن کے علیحدہ دارالعلوم تھے[1]۔ وہ طب اور فقہ کا مطالعہ کرتی تھیں، بلاغت و بیان، اخلاقیات اور ادب لطیف کے درس دیتی تھیں اور مردوں کے دوش بدوش ایک شاندار تہذیب کے کارناموں میں شریک ہوتی تھیں۔ سلاطین اور وزراء و امراء کی بیویاں اور بیٹیاں اپنی جائدادیں دارالعلوم قائم کرنے، یونیورسٹیوں کو مالی عطیات دینے، بیماروں کے لیے شفاخانے کھلوانے اور مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کے لیے دارالامانوں کے

[1] اس قسم کا ایک مشہور ادارہ قاہرہ میں مملوک سلطان ملک طاہر کی بیٹی نے ۶۸۴ ہجری میں قائم کیا۔

بنوانے میں خرچ کرتی تھیں [1]

عرب قبیلوں کی باہمی مخالفتوں اور رقابتوں نے اگرچہ مقامی زبانوں کو ایک دوسرے میں آمیز ہو کر ایک واحد زبان نہ بننے دیا، لیکن اس قومی زبان کو جو حجاز میں بولی جاتی تھی الفاظ کے گنجینے سے مال مال کر دیا۔ عکاظ میں جو سالانہ میلہ ہوتا تھا اور جس میں شاعر ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے تھے اُس نے بھی حجاز کی زبان کو صرفی ونحوی باضابطگی اور شستگی ورفتگی بخشی۔ لیکن حقیقت میں وہ قرآن تھا جس نے عربی زبان کو اپنی اصلی اور خالص صورت میں برقرار رکھا۔ ''قرآن ہی وہ کتاب ہے جس کی مدد سے عربوں نے اسکندرِ اعظم کی فتوحات سے بھی زیادہ وسیع فتوحات کیں اور روم کی سلطنت سے بھی بڑی سلطنت قائم کی اور وہ بھی اس مدت کے دسویں حصے میں جو روم نے اپنی فتوحات مکمل کرنے میں صرف کی۔ قرآن ہی کے فیض سے انہیں یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ تمام سامی اقوام میں پہلے لوگ تھے جو یورپ میں حکمران بن کر داخل ہوئے، جہاں فینیقی تاجر بن کر آئے تھے اور یہودی پناہ گیر یا قیدی بن کر۔ یہ قرآن ہی کی برکت تھی کہ انہوں نے ایسے وقت میں جب چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، یونان کے علم وحکمت کو دوبارہ زندہ کیا، مغرب کو فلسفہ، طب، ہیئت اور موسیقی کا زرین فن سکھایا جیسے اُنہوں نے یہ چیزیں مشرق کو سکھائی تھیں، تہذیب کے گہوارے کی نگہبانی کی اور ہم بعد میں آنے والوں سے اس دن کا ماتم کرایا جب غرناطہ اُن کے قبضے سے نکل گیا۔'' قرآن کی زبان کی بے تصنع عظمت، اس کے اندازِ بیان کی بیساختہ دلکشی، اس کی تشبیہوں اور استعاروں کا تنوع، اُس کی کیفیاتِ مزاج کی بجلی کے کوندوں سی تبدیلیاں، جن میں کہیں معلم اخلاق ہدایات دے

---

[1] ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ نے اس قبیل کے بہت سے دارالامان قائم کئے۔ عضد الدولہ کی بیوی نے جو شفاخانہ بنوایا وہ اس کے شوہر کے شفاخانے سے کسی طرح ہیٹانہ تھا۔ ملک اشرف کی بیٹی خاتون نے دمشق میں ایک عظیم الشان کالج کی بنیاد رکھی۔ حمص کے سلطان ناصر الدولہ کی بیوی زمرد خاتون نے بھی حمص میں ایک کالج قائم کیا۔ کئی مسلمان عورتوں نے شعر وشاعری میں امتیاز حاصل کیا۔ حضرت فاطمہ بنتِ رسول شعرائے عرب میں اونچا پایہ رکھتی ہیں۔ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء (المتخلص بہ مخفی) بھی اسی زمرے میں ہے۔ جب ارکرٹ (Urquahrt) نے ترکی کا سفر کیا تو اس وقت وہاں تین خواتین صفِ اول کے شعراء میں شمار ہوتی تھیں اور اُن میں سے ایک سلطان مصطفیٰ کی پرائیویٹ سیکرٹری تھی۔

رہا ہے، کہیں فلسفی نظریے پیش کر رہا ہے۔ کہیں آزردہ محب وطن اپنے ہم قوموں کی اخلاق سوزی اور ذلت کی پر جوش مذمت کر رہا ہے اور کہیں خود خدائے غفور الرحیم اپنے نبی کے ذریعے اپنے بھٹکے ہوئے بندوں کو راہِ راست کی طرف بلا رہا ہے......ان سب چیزوں نے مل کر قرآن کو صحائفِ دینی میں ایک امتیازی شان بخشی ہے۔ اس کلام کو سُن کر شعرائے وقت پر جو ہیبت طاری ہوگئی اور اُن کے دلوں میں جو جذبہ تعظیم و تکریم پیدا ہوا اُس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عام لوگوں کے دلوں پر اس نے کتنا گہرا اثر کیا ہوگا۔ یہ کلام مختلف وقتوں میں نازل ہوا، کبھی ستم رسیدگی اور رنج والم کے لمحوں میں، کبھی مستعدان سرگرمیوں کے دوران کبھی لوگوں کو عملی ہدایات دینے کی ضرورت پیش آنے پر۔ لیکن وہ چاہے کسی کیفیت میں نازل ہوا، شروع سے لے کر اخیر تک اس کے ہر لفظ میں ایسی تاثیر، ایسی سنجیدگی، ایسی توانائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے جو کسی اور مذہبی کتاب میں نہیں ملتی۔

مبادا یہ سمجھا جائے کہ ہماری رائے طرف داری پر مبنی ہے۔ ہم اس عظیم مستشرق کی رائے سے، جس کا ہم پہلے بھی حوالہ دے چکے ہیں، ایک اور اقتباس پیش کرتے ہیں:۔

> ''عربی کی خطیبانہ شوکت، آواز کے زیر و بم سے خوشی و غم، محبت و شجاعت اور ولولہ و جوش کا اظہار کرنے کی قوت جس کی صرف ایک مدھم سی گونج ہمارے کانوں تک پہنچتی ہے، نزولِ قرآن کے وقت اپنی بلند آہنگی کے پورے عروج پر تھی۔ ضروری تھا کہ قرآن نہ صرف اپنے زمانے کے بہترین خطیبوں اور شاعروں کی برابری کرے، بلکہ اُن پر سبقت لے جائے تاکہ اُس کے کلام اور لحن کی فوقیت بجائے خود اس کے پیغام کی سچائی کی علامت وشہادت ہو......اس سے پہلے کے شاعروں نے عشق و محبت کے نغمے گائے تھے......عنترہ، جو خود عرب کی مشہور ترین داستان کا ہیرو ہے، اپنی محبوبہ عبلہ کے مکان کی بربادی کے مرثیے گاتا ہے۔ اُس کے خیالات اُن کھنڈروں کے اردگرد منڈلاتے رہتے ہیں لیکن عبلہ اُن سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکی ہے۔ قرآن میں اس قسم کی داستانیں نہیں ملتیں۔ اُس کا کلام عشقیہ شاعری نہیں۔ اس دُنیا کی خوشیاں، تیغ آزمائی، ناقہ سواری، رشک و رقابت

انتقام و دشمنی، قبیلوں کی بڑائیاں، اگلوں کی تعریفیں، انسان کی بے معنی اور چند روزہ زندگی...... یہ چیزیں قرآن کے موضوع نہیں۔ اُس کا موضوع ہے اسلام، اور اسلام کی تعلیم، قرآن نے آسمان کے پردے پھاڑ کر اور زمین کے طبق اُلٹ کردی، آسمان اور زمین سے شہادت پیش کر کے دی، زندوں اور مردوں کو گواہ بنا کردی۔"

ایک بڑا مصنف قرآن کے بارے میں یہ کہتا ہے:۔

"اگر قرآن کا کلام شاعری نہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ شاعری ہے یا نہیں تو وہ شاعری سے کوئی بڑی چیز ہے۔ وہ تاریخ نہیں سیرت نگاری نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پہاڑی وعظ کی طرح وہ مقولوں اور کہاوتوں کا ایک گلدستہ نہین، بدھ مت کے سوتروں کی طرح ایک فلسفیانہ بحث نہیں۔ افلاطون نے دانا اور نادان اُستادوں سے جو مذاکرے کئے اُن کی طرح دانشمندانہ نصیحتوں کا ایک مجموعہ نہیں۔ وہ ایک پیغمبر کی پکار ہے، ایک سامی پیغمبر کی پکار، سامیت کی تمام خصوصیتیں لیے ہوئے لیکن اس کی پکار کے معنی اتنے عالمگیر ہیں اور اتنی بروقت ہے کہ اُس زمانے کی تمام آوازیں، چاہے بخوشی چاہے مجبوراً، اُسے دہراتی ہیں' تا آنکہ محل اور صحرا، شہر اور ملک اُس سے گونج اُٹھتے ہیں۔ پہلے تو وہ اپنے بے حس مخاطبوں کے سینوں میں دنیا کی تسخیر کا ولولہ پیدا کرتی ہے، پھر وہ ایک تعمیری قوت بن جاتی ہے تا کہ اس کے ذریعے یونان اور ایشیا کی ساری تخلیقی روشنی عیسوی یورپ کی گہری تاریکی کا پردہ چاک کر کے اس کے اندر داخل ہو جائے، کیونکہ عیسائیت اس وقت رات کی ملکہ تھی۔"

ادب وانشاء کی تمام بڑی بڑی اصناف میں جو انسان کی ذہنی کار پردازیوں کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں، مثلاً اخلاقیات، مابعد الطبیعیات۔ منطق اور بلاغت و بیان، مسلم مصنفین سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ شاعری میں مسلمانوں پر کوئی سبقت نہیں لے گیا۔ عربوں کے شاعر متنبی سے لے کر (قطعِ نظر اُن شعراء کے جو پیغمبر اسلام ﷺ کے ہم

عصر تھے) حالی تک شاعروں کا ایک لامتناہی سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ متنبی نویں صدی عیسوی میں ہوا اور اسے امیر سیف الدولہ (ابوالحسن علی بن حمدان) کی سر پرستی نصیب ہوئی۔ اس کے بعد ابن درید، ابوالعلاء، ابن فارض، طغرائی اور بے شمار دوسرے شاعر آئے۔ اُندلسی عرب وہبی شاعر تھے: اُنہوں نے شاعری کی مختلف اصناف ایجاد کیں جن کا تتبع بعد میں مغربی یورپ کے عیسائی شعراء نے کیا۔ اُندلس کے عرب شاعروں میں مشہور ترین نام احمد ابن محمد ابو عمر کا ہے۔ محمود کے دربار میں جو شعراء ہوئے ان کا تذکرہ ہم اُوپر کر چکے ہیں۔ اُن میں فردوسی، جس نے ایران کے بادشاہوں اور بہادروں کو حیاتِ ثانیہ بخشی، شہرت میں محمود کا حریف ہے، جس کی اس نے پہلے تعریف اور بعد میں ہجو کی۔ بعد کے غزنوی بادشاہوں کے عہد میں چند بہت بڑے شاعر ہوئے۔ مثلاً سوزنی، جو فارسی عروض کا موجد تھا، رشید وطواط قصیدے کے استاد انوری، خاقانی اور ظہیر فاریابی۔ صوفی شعرا سنائی، جس کا ''حدیقہ'' فارسی شاعری کا مایۂ ناز ہے اور فرید الدین عطار۔ اور مثنوی گو نظامی جس نے خسرو اور شیریں کی داستان محبت اور سکندر کی کارگزاریاں بیان کیں۔ اتابکوں کے عہد میں، جو سلجوقیوں کے زوال کے بعد برسرِ اقتدار آئے، اخلاقی شاعر سعدی اور صوفی شاعر جلال الدین رومی ہوئے۔ تیمور کے زمانے میں حافظِ نغز گو ہوا، جسے ایران کا اینکر یوآن (Anacreon) کہتے ہیں۔ اقلیم شاعری کے ناموروں میں سے یہ محض چند ایک کے نام ہیں۔ مسلمانوں نے شاعری میں جو کمال کر دکھائے انہیں ابن خلکان اور لطف علی آذر اس سے زیادہ بلیغ پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

یہ تھے مسلمانوں کے کارنامے علم و ادب کے میدان میں، اور یہ سب کچھ معلم اسلام کے فیضان سے ہوا۔ اس کی آواز نے انہیں اُس قعرِ وحشت و جہالت سے نکالا جس میں وہ حال و مستقبل کی کسی اُمید کے بغیر پڑے ہوئے تھے اور جب وہ نکلے تو انہوں نے دنیا میں اُجالا کر دیا۔ پسماندہ اور ستم رسیدہ انسانیت کو ایک نئی زندگی اور تہذیب تمدن کی دولت مل گئی۔ اُدھر یورپ کے وحشی، جنہوں نے ایک ناتوان و نزار سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا تھا، جہالت اور بہیمیت کی تاریکی میں بھٹک رہے تھے، اور ادھر مسلمان ایک عظیم الشان تہذیب کی عمارت کھڑی کر رہے تھے۔ یورپ کی اخلاقی و ذہنی ویرانی وخراب

حالی کی طویل صدیوں میں اسلام ترقی کا ہراول تھا۔ عیسائیت نے اپنے آپ کو قیصروں کے تخت پر تو متمکن کر لیا تھا، لیکن وہ اقوام عالم کو نئی زندگی نہ بخش سکی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی تک یورپ کی تاریکی بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ شدید تعصب کے اس دور میں کلیسائیت نے تمام وہ روزن بند کر رکھے تھے جن میں سے علم، انسانیت یا تہذیب کی روشنی داخل ہوسکتی تھی۔ چنانچہ جہالت کے اس حصنِ حصین میں اسلام کی باریابی کے تمام رستے مسدود تھے۔ اس کے باوجود اسلامی تمدن کے فیض رساں اثرات رفتہ رفتہ عیسوی دنیا کے ہر گوشے میں سرایت کر گئے۔ سلرنو، بغداد دمشق، قرطبہ، غرناطہ اور مالقہ کی درسگاہوں سے فلسفے کی مشفقانہ تعلیمات اور سائنس کی مقابلۃً سخت عملی ہدایات دنیا کو تہذیب کے سبق دیتی رہیں[1]۔

عقلیت کے پہلے مظاہر مغرب کے اُس حصے میں نمودار ہوئے جو سب سے بڑھ کر اسلامی دنیا کے زیرِ اثر آیا۔ کلیسائیت نے اس نورس کلی کو مسل ڈالا اور دنیا کی ترقی کو تین صدیاں پیچھے دھکیل دیا۔ لیکن آزادی فکر کے اصول جو اسلام کی اصل واساس ہیں، مسیحی یورپ میں نئی روح پھونک چکے تھے۔ ابیلارد (Abelard) ابن رشد کی تعلیمات سے، جو ساری مغربی دنیا میں روشنی پھیلا رہی تھیں، کسب ضو کر چکا تھا۔ اس نے فکر آزاد کے حق میں اعلانِ جنگ کیا جس کی بدولت دنیا کو بالآخر عیسائیت کی حلقہ بگوشی سے رہائی ملی، ابن باجہ اور ابن رشد دیکارت (Descarts) ہابز (Hobbes) اور لاک (Locke) کے پیش رو تھے۔

ابیلارد اور اس کے مکتب کے خیالات جلد ہی انگلستان میں نفوذ کر گئے۔ وِکلف (Wycliffe) کی جدتِ فکر اور آزادی روح اس کے پیش رووں کے جرات آمیز خیالات کی مرہون منت تھی۔ بعد کے جرمن مصلحین نے اپنے خیالات ایک طرف تو قسطنطنیہ کے بت شکنوں سے اور دوسری طرف البجنیوں (The Albigenses) اور وکلفیوں (The Wycliffetes) سے مستعار لے کر اس اصلاحی کام کو، جو دوسروں نے غیر ملکی عقلیاتی

---

[1] اسلام نے ذہنی ارتقاء کو جو محرک مہیا کیا اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس کے فیض اثر سے ترقی کی دوڑ میں ایسی قوموں نے بھی حصہ لیا جو اس وقت تک بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔ اسلام نے انسانیت کی نبض میں تیزی پیدا کی اور مری ہوئی یا مرتی ہوئی قوموں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

اثرات کے تحت شروع کیا تھا پایہ تکمیل کو پہنچایا۔

جب مسیحی یورپ نے علم و دانش کو جبر و تشدد کا تختہ مشق بنا رکھا تھا، جب خلیفۃ المسیح نے خود اپنے ہاتھوں سے فکر آزاد کے طفلِ شیر خوار کا گلا گھونٹا اور اس کی ابتدائی تتلاہٹوں کو خاموش کر دیا، جب پادری لوگ ہزاروں بے ضرر انسانوں کو محض عقلی بے راہ روی کی بناء پر آگ کا ایندھن بنانے میں پیش پیش تھے، جب مسیحی یورپ لوگوں کے سروں پر خبیث روحوں کا سایہ اُتارنے اور مقدس ہڈیوں اور چیتھڑوں کی پوجا کرنے میں مصروف تھا، ایک ایسے زمانے میں مسلمان بادشاہوں کے زیر سایہ علم کا بول بالا تھا اور وہ یوں پھل پھول رہا تھا کہ جیسا پہلے کبھی نہ پھلا پھولا تھا۔ محمد ﷺ کے خلیفوں نے ترقی تہذیب کو فریضۂ منصبی بنا لیا اور آزادیٔ فکر و تحقیق کو، جس کی ابتدا خود پیغمبر اسلام ﷺ نے کی اور جسے آپ ﷺ نے اپنے قول و فعل کے ذریعے تقدس بخشا تھا، فروغ دیا۔ انہوں نے مذہب کی خاطر جبر نہ کیا اور چاہے ان کا سیاسی کردار کیسا ہی تھا، جیسی رواداری اور غیر جانبداری انہوں نے تمام مذہبوں سے برتی اُس کی نظیر اُن سے پہلے دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ طبیعی علوم کی تحصیل اور پرورش، جو کسی قوم کی ذہنی آزادی کی سب سے بڑی نشانی ہے، مسلمانوں کا ایک مرغوب مشغلہ تھا۔

عربوں کو جو دو ناکامیاں ہوئیں، ایک تو قسطنطنیہ کے محاذ پر اور دوسری فرانس میں، اُنہوں نے دنیا کی ترقی کو صدیوں کے لیے روک دیا۔ اگر عربوں کو مال غنیمت سمیٹنے کی نہ پڑ گئی ہوتی اور ان کا آپس میں اتفاق رہتا اور اگر وہ شارلز مارتل[1] (Charles Martel) کے وحشی لشکر کو مار بھگاتے تو دنیا کی تاریخ کے تاریک ترین دور کی داستان کبھی نہ لکھی جاتی۔ تحریک احیاء العلوم، تہذیب کی بحالی، عقل و فکر کی آزادی، یہ سب چیزیں جس وقت ظہور میں آئیں اُس سے کئی صدیاں پہلے آ گئی ہوتیں۔ ایلبی جنیوں (The Albigenses) اور ہوگناٹوں (The Huguenots) کے قتلِ عام اور ٹیوڈر بادشاہوں اور پروٹیکریٹ (The Protectorate) کے زمانے میں انگریز پروٹسٹنٹوں کے ہاتھوں آئیرلینڈ

---

[1] فرنگیوں یعنی Franks کا بادشاہ جس نے مسلمانوں کو تور (Tours) کے مقام پر ۷۳۲ء میں شکست دی اور اُن کی فتح یورپ کو روک دیا ۷۱۵ء تا ۷۴۱ء۔

کے کتھولکوں کے کشت وخوں کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی سرگزشتیں پڑھ کر ہمیں اپنے دل کو رنج نہ پہنچانا پڑتا۔ ہمیں برونو[1] (Bruno) اور سروتیس[2] (Servetus) کا ماتم نہ کرنا پڑتا، جنہیں ایسے لوگوں نے جنہوں نے مادر کلیسا کے خلاف بغاوت کر دی تھی، موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اوتو دافے[3] (Auto-Da-Fe) کی جگر خراش داستان، انکوئی زیشن کے بہانہ قتلوں کی روئداد، ازٹکوں[4] (The Aztecs) اور انکوں[5] (The Incas) کے قتل عام کے روح فرسا قصے سی۔ سالہ جنگ (The Thirty Years War) اور اس کی نازل کی ہوئی مصیبتوں کی دل ہلا دینے والی کہانی...... ان میں سے کسی کے لکھے جانے کی نوبت نہ آتی۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ہسپانیہ، جو کسی زمانے میں علم وفن کا ملجا و ماوئی تھا، صدیوں کی گراں بہا میراث کھو کر ذہنی اعتبار سے ایسا ویران نہ ہو جاتا جیسا وہ اب ہے۔ کون ہے جسے اس عالی ظرف قوم کے انجام کا حال پڑھ کر قلق نہ ہوا ہو جسے عیسائی بادشاہوں کے مجنونانہ تعصب نے اس وطنِ مالوف سے دیس نکالا دیا جسے اُس نے اقوامِ عالم میں ممتاز کر دیا تھا۔ کسی نے کیسے منصفانہ طور پر کہا ہے:۔

''وہ ایک منحوس گھڑی تھی جب غرناطہ کے میناروں پر صلیب نے ہلال کی جگہ لے لی۔''

ابن رُشد اور ابن باجہ (Waladch) اور عائشہ اور دوسرے رفتگان بزرگ کی روحیں اپنی قوم کی بنائی ہوئی عالی شان عمارتیں کے کھنڈروں میں بیٹھی رو رہی ہوں گی جہاں اب نہ وہ اگلی سی شاعری اور موسیقی کی محفلیں ہیں، نہ وہ سپاہ گری کے کرتب، نہ وہ علم و

---

1. جوردانو برونو ۱۵۴۸ء تا ۱۶۰۰ء۔ اطالوی فلسفی جس نے کوپرنیکس کے نظریہ فلکیات کی تائید کی اور اس جرم کے لیے ''انکوئی زیشن'' (The Inquisition) کے حکم سے زندہ جلا دیا گیا۔
2. ہسپانوی طبیب اور طبیعیات دان (۱۵۱۱ء تا ۱۵۵۳ء) جسے الحاد کے الزام پر نذر آتش کر دیا گیا۔
3. Auto-Da-Fe پرتگالی زبان کی ایک ترکیب ہے جس کے معنی ہیں ''عمل ایمان'' انکوئیزیشن کے زیر فرمان اہل بدعت پر مقدمہ چلانے، انہیں سزا کا حکم سنانے اور پھر انہیں زندہ جلا دینے کے سارے عمل پر اس ترکیب کا اصطلاحاً اطلاق ہوتا تھا۔
4. ازٹک میکسیکو کے قدیم باشندے تھے جنہوں نے ایک قدیم اور ترقی یافتہ تہذیب قائم کی تھی اور جو ہسپانیوں کے آنے سے پہلے میکسیکو میں حکمران تھے۔
5. ان کا پیرو کے قدیم باشندے تھے جو ہسپانوی فتح سے پہلے وہاں آباد تھے اور جو ایک اعلیٰ تہذیب کے مالک تھے۔

دانش کی درس و تدریس اور جہاں اگر اب کوئی آواز سنائی دیتی ہے تو صرف مذہبی مناظروں اور سیاسی مجادلوں کے شوروغل کی گونج۔ عیسائیت نے اُن مسلم اندلوسیوں کے نام لیواؤں کو نکال کر صحرا میں دھکیل دیا اور جو خوبصورت سرزمین اُن سے چھینی اس کا تمام عرق زندگی نچوڑ کر اُسے ایک ذہنی و اخلاقی صحرا بنا دیا[1]۔

اگر مسلمہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو جاتا، جو صحیح العقیدگی کی پرجوش حامی اور اپنے سگے بیٹے کی قاتلہ ملکہ آئرن (Irene) کا دارالحکومت تھا تو وہ سیاہ کارنامے جن سے اسوریوں (The Issurians) کومنیوں (The Comneni) اور پیلیوگیوں (The Palaeologi) کی تاریخ کے صفحات داغدار ہیں، وہ دہشت ناک نتائج جو لاطینیوں کی تسخیر بازنطین سے پیدا ہوئے اور اُن سے بھی بڑھ کر وہ ناپاک محارب جن میں عیسوی یورپ نے ایشیائی قوموں کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی غالباً کبھی معرضِ وقوع میں نہ آتے۔ بہرحال ایک بات یقینی ہے۔ وہ یہ کہ اگر قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جاتا تو بت شکنی کی تحریک ناکام ثابت نہ ہوتی اور عیسوی کلیسا کی اصلاح بہت پہلے ہو چکتی۔ لیکن مشیت ایزدی کو کچھ اور منظور تھا۔ فکر آزاد کی وہ لہریں جو اسلامی علاقوں سے اُٹھ کر اسوری شہنشاہوں کی مملکت میں پہنچیں جہالت، تو ہم پرستی اور تعصب کی چٹانوں پر سر پٹک کر رہ گئیں۔ فکر آزاد کی قوت اس وقت تک محسوس نہ کی گئی جب تک سیلرنو اور قرطبہ کے مکاتب کے مشترک عمل نے، یعنی ابن رشد اور غالباً چند سرچشمۂ اسلام سے فیض یافتہ یونانیوں کے مجموعی اثر نے کلیسائیت کی فصیل کو توڑ نہ دیا۔

اسلام نے ذہنی آزادی کی حکومت قائم کی صحیح طور پر کہا گیا ہے کہ جب تک اسلام نے اپنے شمائل کو برقرار رکھا اُس وقت تک وہ علم و تہذیب کا پرجوش حامی اور سرپرست ذہنی آزادی کا محب و معاون رہا۔ لیکن جب خارجی اثرات نے اُس میں نفوذ شروع کیا اسی وقت سے وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہنے لگا۔

لیکن مسلمانوں پر دورِ حاضر میں جو جمود طاری ہے اس کی توجیہ کے لیے ضروری

---

[1] مسلمانوں کے عہد حکومت میں اسپین کی جو اقتصادی حالت تھی اور علوم و فنون نے جو ترقی وہاں کی اُس کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ کیجئے: A Short History of the Saracens

ہے کہ بارہویں اور سترہویں صدی عیسوی کے درمیان ہسپانیہ، افریقہ اور ایشیا میں جو واقعات ظہور پذیر ہوئے ہم ان پر دوبارہ نگاہ ڈالیں۔ ہسپانیہ میں عیسائیت نے لوگوں کی ذہنی زندگی تلف کردی۔ مسلمانوں نے ہسپانیہ کو ایک باغ بنا دیا تھا۔ عیسائیوں نے اُسے ایک صحرا میں تبدیل کر دیا۔ مسلمانوں نے ملک کے چپے چپے پر مدرسے اور دارالعلوم قائم کیے تھے عیسائیوں نے انہیں مقدس شخصیتوں اور بتوں کی پوجا کے لیے گرجوں میں تبدیل کر دیا۔ مسلمان بادشاہوں نے علم و سائنس کے جو ذخیرے جمع کیے تھے عیسائیوں نے انہیں جلا کر راکھ کر دیا۔ مسلمان مرد، عورتیں اور بچے چن چن کر ذبح کیے گئے یا زندہ جلا دیئے گئے جو تھوڑے سے بچ گئے انہیں غلام بنا لیا گیا، جو بچ کر بھاگ نکلے وہ افریقہ کے ساحلوں پر جا جا کر بے خانماں فقیروں کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ہسپانیہ کے عیسائیوں نے اندلسی مسلمانوں پر جو مظالم توڑے اُنہیں فراموش یا معاف کرانے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ دونوں کا مشترک عفو و رحم درکار ہوگا۔ بہر حال سزا میں دیر نہ لگی۔ ایک صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ ہسپانیہ کا آتشکدہ ٹھنڈا پڑ گیا۔[1]

مغربی افریقہ میں تیسرے المؤحد حکمران کے دورِ حکومت میں ملائیت نے جو زور پکڑا اور بربروں نے جو مذہبی جوش دکھایا ان دونوں نے مل کر ترقی کے دھارے کا رُخ پلٹ دیا، صدیوں سے آگے بڑھتی ہوئی تہذیب کے قدم روک لیے اور علوم و فنون کے مرکزوں کو تعصب اور جہالت کے مراکز بنا دیا۔ بربری ساحل پر کورسیئروں (The Corsairs) کے آباد ہونے نے اور آخری مملوک سلطان کے تحت جو نراج پھیلا اُس نے پر امن علمی کارروائیوں کی حوصلہ شکنی کی۔ ایشیاء میں خاندانِ تیموری کے زوال اور غیر متمدن اور متعصب ازبکوں کے تیموری دارالحکومت پر قابض ہونے نے لوگوں کو ذہنی طاقتوں کو

---

[1] مغربی افریقہ میں فاطمی حکومتوں کے زوال کے بعد ایک خاندان جس کا جد امجد مقابی "مربوط" (ولی) تھا برسر اقتدار آیا، جسے اپنے بانی کی مناسبت سے المرابط کہا جاتا ہے۔ ابن زہر کا مربی یوسف ابن تاشفین اسی خاندان سے تھا۔ اُس کا بیٹا الموحدین کے بانی عبدالمومن کے ہاتھوں مارا گیا۔ عبدالمومن نے مراکش اور فاس کو تاخت و تاراج کیا۔ موحدین وسطی عرب کے وہابیوں اور اخوان سے قریب کا رشتہ رکھتے تھے اور غالباً لیبیا کے مہدیوں سے بھی کچھ بہت مختلف نہیں تھے۔ اس خاندان کے پہلے دو بادشاہوں، عبدالمومن اور یوسف نے علوم فنون کی پرورش کی لیکن تیسرے بادشاہ یعقوب المنصور کے عہدِ حکومت میں تعصب کو عروج ملا۔

تلف کر دیا۔ ایران میں صفویوں کے تحت سائنس اور ادب میں نئے سرے سے جان پڑ گئی لیکن یہ نشاۃ الثانیہ محض عارضی ثابت ہوئی۔ وحشی غزیوں Ghihzais کے فتنے نے بہت جلد اس کا خاتمہ کر دیا۔ وسطی ایشیا کے ان بدقسمت ملکوں پر ایک مردنی سی چھائی ہوئی ہے، البتہ افغانستان میں یہ آہستہ آہستہ رفع ہو رہی ہے۔

عثمانی قلمرو میں سلیم اول، سلیمان اور مرادین کے ماتحت علم کی قدر ہوئی، لیکن عثمانی بحیثیت مجموعی فوجی لوگ تھے۔ پہلے تو اپنے فاتحانہ عزم پورے کرنے کے لیے لیکن بعد میں مجبوراً اور اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے وہ ایک ایسے بے پناہ دشمن سے برسر پیکار تھے جس کی فتنہ پردازی کی کوئی حد نہ تھی اور جس کے ارادوں کا کچھ پتہ نہ لگ سکتا تھا۔ وہ دشمن اب نیست و نابود ہو چکا ہے لیکن ترک قوم کو ابھی اپنی بقا کے لیے جدو جہد کرنی ہوگی۔ ایسے حالات میں ادب وفن کا پنپنا معلوم۔ اسلام پر رجعت پسندی کا جو بہتان باندھا جاتا ہے اس سے بحث کرتے ہوئے موسیلو گوبینو (Gobineau) یہ لکھتا ہے کہ:

''یورپ کے کسی ملک میں ڈھائی سو سال تک اُس قسم کی فوج اور سیاسی آمریت کا تصور کیجئے جیسی کہ ترکی میں رہی ہے، اس طرح کا جنگی مزاج خیال میں لائیے جیسا کہ غیر ملکی غلاموں سرکیشینوں، گرجستانیوں، ترکیوں اور البانیوں کے زیر اقتدار مصر میں رہا ہے، وہ حملے جو افغانوں نے ۱۷۳۰ء کے بعد ایران پر کئے اُن کا نقشہ ذہن میں جمائیے، نادر شاہ کے جبر و استبداد کی اور اس ظلم و ستم اور تاخت و تاراج کی خیالی تصویر کھینچیے جو قاچاریوں کے تخت نشین ہوتے وقت ظہور میں آئی......ان سب واقعات کو ان کے اسباب وعوارض کے ساتھ یکجا کیجئے تو پھر آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ اگر کسی یورپی ملک میں یہ سب کچھ ہوا ہوتا تو ایک یورپی ملک ہونے کے باوجود اس کا کیا حشر ہوتا اور آپ کو مشرقی ملکوں کی تباہی و بربادی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے کوئی مزید تجسس نہ کرنا پڑے گا، نہ آپ کو اس امر کی ضرورت پیش آئے گی کہ اسلام پر کوئی بھی غیر منصفانہ الزام عائد کریں۔''

ساتویں صدی عیسوی سے لے کر جب کہ اسلام کا ظہور ہوا سترہویں صدی

عیسوی تک (بعد کی صدیوں سے قطع نظر) اسلام میں ایک سائنسی اور ادبی روح کارفرما تھی جو اتنی ہی قوی تھی جتنی وہ روح جس کا مظاہرہ جدید یورپ کر رہا ہے۔ اس نے مسلمانوں کو ترقی کی ایک لہر پر اٹھا کر آگے بڑھا دیا اور انہیں اعلیٰ درجے کی مادی خوشحالی اور ذہنی نشوونما حاصل کرنے کی توفیق بخشی۔ گاتھوں (The Goths) اور وینڈلوں (The Vandals) کے فتنے کے بعد سے یورپ کی ترقی کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ جب اٹیلا (Attilla) فرانس سے واپس گیا اس وقت سے لے کر اب تک یورپ کو ایسی کسی آفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جیسی تاتاریوں اور ازبکوں کی صورت میں ایشیا پر نازل ہوئی۔ اس نے جو جنگیں لڑیں وہ ضرور شدید تھیں، خونریز تھیں، انسانیت سوز تھیں، لیکن وہ انسانیت یا عدم انسانیت کی مساوی شرائط پر لڑی گئیں۔ کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں نے بیشک ایک دوسرے کو زندہ جلایا ہے، لیکن غریب اُندلسی مسلمانوں کے قتلِ عام سے لے کر اب تک یورپ کو کوئی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا جس کا مقابلہ اُس جلادانہ کشت وخون سے کیا جا سکتا ہو جو تاتاریوں نے تہذیب وثقافت کے تمام مرکزوں میں کیا اور جس نے وہ تمام صاحب کمال طبقے تباہ کر دیئے جو اُمت مسلمہ کی ریڑھ کی ہڈی تھے[1] اور اب۔

پردہ داری می کند در قصر قیصر عنکبوت　　بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

---

[1] منگولوں نے بغداد میں جو ہنگامہ تاخت وتاراج برپا کیا وہ اس ہنگامے کا نمونہ تھا جو انہوں نے دوسرے شہروں برپا کیا۔ لیکن ان وحشیوں نے جو دہشت ناک مظالم توڑے اُن کا خاطر خواہ نقشہ کھینچنے کے لیے کسی گبن ثانی کی ضرورت ہے۔ تین دن تک کوچہ و بازار میں لہو کی ندیاں بہتی رہیں، یہاں تک کہ کئی میلوں تک دریائے دجلہ کا پانی سرخ ہوگیا۔ لوٹ مار، کشت وخون حرمت شکنی، عصمت دری اور انسانیت اسوز افعال کا سلسلہ چھ ہفتوں تک جاری رہا۔ محل، مسجدیں اور مقبرے جلا دیئے گئے منہدم کر دیئے گے تاکہ اُن کے گنبدوں پر جو سونا تھا وہ اُتار لیا جائے۔ شفاخانوں میں مریضوں کو اور مدرسوں اور مکتبوں میں اُستادوں اور طالب علموں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ مقبروں میں سے مشائخ وائمہ کے فانی باقیات اور جامعوں میں سے علماء فضلاء کی غیر فانی تصنیفات نکال نکال کر راکھ کے ڈھیر کر دی گئیں۔ کتابوں کو یا تو آگ میں پھینک دیا گیا یا اگر آگ نزدیک نہ تھی اور دریا قریب تھا تو اُنہیں دریا کے سپرد کر دیا گیا۔ اس طرح پانچ صدیوں کا جمع شدہ خانہ علم وحکمت ہمیشہ کے لیے نوع انسانی کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ قوم کے برگزیدہ اشخاص کو چُن چُن کر مارا گیا لیکن ان میں سے دو اہم اشخاص بچ گئے۔ ہلاکو کا قاعدہ تھا کہ وہ جس ملک میں سے گزرتا مصلحتاً وہاں کے چند شہزادوں اور عمائدِ

سلطنت کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ اُن میں سے ایک سعد بن زنگی تھا جو فارس کا اتابک تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سعدی بھی اپنے دوست اور مربی کے ساتھ ہولیا۔ چنانچہ اُس نے بغداد کی تباہی اور اس کے باشندوں کی جگر خراش مصیبتوں کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ ذیل کے دو دردناک ابیات میں (جو اس کے مشہور شہر آشوب سے منتخب ہیں۔ مترجم اپنے جذبات کو بیان کرتا ہے:۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں　　　برزوالِ ملک مستعصم امیر المومنین
اے محمد گر قیامت سر بروں آری زخاک　　　سر بروں آر و قیامت درمیانِ خلق بیں

دسواں باب

اِسلام کی عقلیاتی اور فلسفیانہ رُوح

ازمنۂ قدیمہ کی اور تمام قوموں کی طرح زمانہ قبل اسلام کے عرب بھی بڑی سختی سے قسمت کے قائل تھے۔ ان کی قدیم شاعری کا جو حصہ اب تک محفوظ ہے اور جو اُن کے خیالات اور اوضاع و اطوار کی واحد تحریری یادگار ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اشاعت اسلام سے پہلے جزیرہ نمائے رب کے تمام باشندوں نے اس عقیدے کے آگے سپر ڈال رکھی تھی کہ ایک اٹل اور اندھی قوت اس دنیا کا کارخانہ چلا رہی ہے اور انسان اُس کے ہاتھوں میں محض ایک کھلونا ہے۔ اس عقیدے کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے دلوں میں نہ موت کا خوف تھا نہ زندگی کی کوئی وقعت۔ اسلام کی تعلیمات نے عربوں کے خیالات میں ایک انقلاب برپا کر دیا: کائنات پر ایک افضل و اعلیٰ عقل کی حکمرانی کے ساتھ ساتھ اُن کے ذہنوں میں انسانی ارادے کی آزادی پر مبنی اعتماد نفس اور اخلاقی ذمہ داری کا ادراک بھی پیدا ہوا۔ قرآن کے نمایاں اوصاف میں ایک وصف وہ عجیب و غریب طریقہ ہے جس سے وہ دو ایسے تصورات کو جو بادی النظر میں باہم متضاد معلوم ہوتے ہیں یکجا کرتا ہے: یعنی ایک طرف تو ایک ارادہ ربی کا وجود، جو صرف تمام چیزوں کا بندوبست ہی نہیں کرتا بلکہ انسانوں پر بھی براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے اور اُن کے خیالات کے سرچشموں پر اختیار رکھتا ہے اور دوسری طرف انسان کی آزادی عمل اور آزادی عقل کا دعویٰ۔ یہ وصف کچھ قرآن ہی سے مخصوص نہیں بلکہ انجیل میں بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن قرآن میں انسانی ذمہ

داری پر اتنا زیادہ زور دیا گیا ہے کہ ان دو تصورات میں مطابقت کا سوال قدرتی طور پر ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات بادی النظر میں متناقض معلوم ہوتی ہے کہ جب انسان کے تمام اعمال ایک قادرِکل ارادے کے زیرِ فرمان ہیں تو اس کے باوجود اسے اعمال کی جزاو سزا دی جائے جو کہ اسلامی اخلاقیات کا بنیادی اصول ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے دل میں ایک ہمیشہ زندہ رہنے والے اصولِ فعال پر جو ایمان تھا اور انہیں انسان کی ترقی پر جو اعتماد تھا، یہ دونوں چیزیں مل کر اس پراسرار معمے کا حل مہیا کرتی ہیں۔ میں اپنا مطلب قرآن سے دو طرح کی عبارتیں پیش کر کے واضح کر دوں گا، یعنی ایک تو ایسی عبارتیں جن میں ارادہ ربی کی مطلقیت بیان کی گئی ہے اور دوسرے ایسی عبارتیں جو انسانی ارادے کی آزادی کا دعویٰ کرتی ہیں:۔ ''خدا کا انتظام ایک معینہ قاعدے کے مطابق ہے.....سورج جو اپنی منزل کی طرف چلا جاتا ہے تو یہ اُس زبردست اور باخبر کا بنایا ہوا ایک معمول ہے.....اور اس کی نشانیوں میں سے ایک آسمانوں اور زمین کا بنانا ہے اور اُن جانوروں کا بنانا جو اس نے زمین پر بکھیر دیئے ہیں اور جنہیں وہ جب چاہے اکٹھا کر سکتا ہے.....کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے زمین اور آسمان بنائے اور اُن کے بنانے میں نہ تھکا وہ مردوں کو جلانے کی قدرت رکھتا ہے۔ کیوں نہیں؟ وہ ہر چیز پر قادر ہے.....اور ایک فتح اور بھی ہے جو تمہارے قابو میں نہیں آتی، اللہ تعالیٰ نے اس کو گھیر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے.....کوئی ایسی چیز نہیں جس کے ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدر میں نازل کرتے ہیں.....آسمان و زمین کے بھید اللہ کے پاس ہیں اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے.....اُنہیں دنیا کی زندگی کی حقیقت اس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کے پودے خوب گھنے ہو گئے اور کل وہی پودے بھس بن کر رہ گئے جنہیں ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے.....اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے.....اللہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے.....وہی ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی.....تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے.....دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ زمین کے مردہ ہونے کے بعد وہ اُسے کس طرح زندہ کر دیتا ہے۔ یقیناً وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور ہر چیز پر

قادر ہے..... آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور جو کچھ تمہارے دل میں ہے چاہے تم اُسے ظاہر کرو اور چاہے چھپاؤ اللہ بہر حال تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر اُسے اختیار ہے کہ جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے..... کہو اے اللہ' ملک کے مالک' تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے' جسے چاہے عزت بخشے اور جسے چاہے ذلت دے۔ ہر بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے..... اللہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے..... آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے، جو کچھ ان میں ہے وہ اُسی کا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے..... اللہ تعالیٰ اپنے کام کو پورا کر کے رہتا ہے۔ اس نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے..... اللہ رات اور دن کو ماپتا ہے..... اپنے رب اعلیٰ کی تعریف کو' جس نے ہر شے کو بنایا اور صورت بخشی اور پھر راہ دکھائی..... اور جو لوگ منکر ہوئے اُن کے لیے برابر ہے خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو۔ وہ کبھی ماننے کے نہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور اُن کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے..... اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا..... وہ کبھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اوصاف کو نہ بدلے..... اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اُسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔

ملاحظہ کیا گیا ہوگا کہ مندرجہ بالا آیات میں سے اکثر میں تقدیر ربی سے صراحتہً قانونِ فطرت مراد ہے۔ ہر ستارے کا مقام اور ہر سیارے کا مدار مقرر ہے۔ اسی طرح کائنات کی ہر شے کا ایک لگا بندھا دستور ہے۔ اجرام فلکی کی گردش، فطرت کے مظاہر، زندگی و موت، ہر چیز ایک قانون کی تابع ہے۔ دوسری عبارتیں بلاشک وشبہ انسانی ارادے پر خدا کی فاعلیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں، لیکن ان عبارتوں کی تشریح ایک تیسری قسم کی عبارتوں میں کی گئی ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کی فاعلیت کا انحصار انسانی ارادے پر ہے۔ خدا صرف ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس کی مدد کے طالب ہوں۔ وہ صرف ایسے لوگوں کو سعادت بخشتا ہے جو اپنے دل کو ناپاک خواہشوں سے پاک کرلیں۔ معلم عربی کے لیے، اُسی طرح جس طرح اس کے پیش رووں کے لیے ایک

قادرِ مطلق، صورت گر کائنات، حاکم موجودات کا وجود عین الیقین کا درجہ رکھتا تھا۔ تمام زمانوں میں ایک حادیٔ کل، علیم وخبیر شخصیت پر ایمان واثق انسانوں کے لیے ایک قوی محرک رہا ہے۔ دشتِ زندگی کے تھکے ہارے رہ نورد کے لیے اس ادراک سے بڑھ کر کوئی چیز ڈھارس بندھانے والی اور اس کے سینے میں ایک بہتر و پاکیزہ تر دنیا کی جو شدید تمنا ہے اس کی تسکین کرنے والی نہیں کہ ایک ایسی قوت موجود ہے جو انسانوں سے برتر و بالاتر ہے اور جو مظلوموں کی دادرس، اُمیدواروں کی امیدیں پوری کرنے والی اور بیکسوں کی یارومددگار ہے۔ ہمارے دل میں خدا پر جو ایمان ہے اس کا سرچشمہ ہی خدا کے تقدیری احکام ہیں وہ اسی طرح صحیح معنوں میں قوانین ہیں جس طرح وہ قوانین جن کے مطابق اجرام فلکی کی گردش واقع ہوتی ہے۔ لیکن خدا کا ارادہ ایک من مانا اور بے قاعدہ و بے اصول ارادہ نہیں، وہ ایک تعلیمی و تلقینی ارادہ ہے جس کی اطاعت عالم کو اپنے علمی مشاغل اور عابد کو اپنے حجرہ عبادت میں کرنی پڑتی ہے۔

بہر کیف قرآن کی جن آیات میں انسانی ذمہ داری اور انسانی ارادے کی آزادی پر زور دیا گیا ہے وہ خدا کی مطلقیت کے تصور کی تعریف و تحدید کرتی ہیں۔ ''اور جو کوئی گناہ کماتا ہے خود اپنی ذمہ داری پر کماتا ہے۔ چھوڑ دو ایسے لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا سمجھا اور جنہیں اس دنیا کی زندگی نے بہکا دیا۔ مگر تنبیہہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کرتوتوں کے وبال میں مبتلا نہ ہو جائے...... جب یہ لوگ کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر کاربند پایا ہے اور اللہ نے ہمیں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔ کہو اُن سے کہ اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیتا...... اُن لوگوں نے آپ اپنے اوپر ظلم کیا...... اُس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزہ چکھ لے گا...... جو کوئی گمراہ رہے اس کی گمراہی کی ذمہ داری خود اس پر ہے۔''

اپنے محدود دائرہ زندگی کے اندر انسان کاملاً اپنے کردار کا مختار ہے۔ وہ اپنے اعمال کے لیے اور جو قواء اُسے دیے گئے ہیں اُن کے صحیح یا غلط استعمال کے لیے جواب دہ ہے۔ اس کا سیدھی راہ پر چلنا یا بھٹک جانا خود اس کے میلانات پر منحصر ہے۔ جو شخص خدا سے توفیق و ہدایت مانگے خدا کی مدد اس کے شامل حال ہوتی ہے۔ خدا نے جس اعانت کا

وعدہ فرمایا ہے کیا اس کا طلب کرنا بجائے خود تزکیہ نفس کا باعث نہیں؟ کیا رب الاعلیٰ سے تسکین و تقویت کی دعا مانگ کر کمزوروں کو قوت اور مظلوموں کو سکونِ قلب حاصل نہیں ہوتا؟ یہ تھے ہادی اسلام کے خیالات اللہ کی حاکمیت اور انسانی ارادے کی آزادی کے بارے میں۔ قضا و قدر یا جبر و اختیار کے بارے میں آپ کے جو تصورات تھے اُن کے سمجھنے میں ہمیں آپ کے منقول ارشادات سے مدد ملتی ہے جو ہم تک ایسے وسائل سے پہنچے ہیں جنہیں ہم قطعی الثبوت قرار دے سکتے ہیں۔ نہ صرف آپ کے ارشادات بلکہ آپ کے داماد اور بابِ علم اور اُن کے اوّلین جانشینوں کے ارشادات بھی، جنہوں نے اپنے خیالات براہِ راست آپ سے اخذ کئے اِنسان کی آزادی عمل کے مسئلے کی کلید سمجھے جا سکتے ہیں جو صدیوں تک مختلف فرقوں کے درمیان مابہ النزاع رہا ہے لیکن اس مسئلے سے بحث کرتے وقت ہمیں یہ نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ جن روایات کو قدامت پرستی اور ملائیت نے عقل کی فضیلت کے خلاف حربوں کے طور پر استعمال کیا ہے اُن میں سے اکثر روائتیں قرائن سے موضوع اور من گھڑت معلوم ہوتی ہے۔ ایسی روائتیں خود زبان حال سے بیان کرتی ہیں کہ وہ کیونکر وجود میں آئیں۔ ان میں سے بعض پر جن کی بابت یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے مروی ہیں جنہیں آنحضرت ﷺ سے سرسری ملاقات کا موقع ملا متوسط راویوں کے ذہنوں اور حافظوں میں تبدیل و تحریف کے صریح نشان ثبت ہیں۔ بہر حال مستند روایات کافی بڑی تعداد میں ہیں۔ میں اُن میں سے صرف چند ایک کا حوالہ دے کر اس امر کی جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں تشریح کر دوں گا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے دل میں پہلے جہاں خدائے علیم و حکیم کی شخصیت پر بین اعتماد تھا، وہاں اس کے ساتھ ساتھ ارادہ انسانی کی آزادی کا کامل یقین بھی تھا۔ آپ نے موروثی خباثت اور جبلی معصیت کا شدومد سے انکار کیا ”ہر انسان مسلم (یعنی سلیم الفطرت) پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں اُس کے ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی یا صابی بنا دیتے ہیں، جس طرح جانور کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو کیا جب تک تم اس کا کوئی عضو خود نہ کاٹو تو تمہیں اس کا کوئی عضو کٹا ہوا دکھائی دیتا ہے؟“ نومولود بچوں کی کوئی مثبت اخلاقی سیرت نہیں ہوتی۔ جو لوگ عنفوانِ عمر ہی میں مر جاتے ہیں ”اُن کی بابت خدا ہی سب سے بہتر جانتا ہے کہ ان کا کردار کیا ہوتا۔“ (اگر وہ

سن بلوغ تک زندہ رہتے)''ہر انسان میں دو قسم کے میلانات ہوتے ہیں: ایک تو وہ جو اُسے نیکی کی طرف لے جاتے ہیں اور نیکی کرنے پر مجبور کرتے ہیں، دوسرے وہ جو اُسے بدی کی طرف لے جاتے ہیں اور بدی کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ لیکن خدا کی نصرت ہر وقت قریب رہتی ہے اور جو کوئی اپنی نفسانی خواہشات پر غالب آنے کے لیے خدا کی مدد مانگے خدا اس کی مدد کرتا ہے۔'' ''وہ تمہارے اپنے افعال ہیں جو تمہیں جنت یا جہنم میں لے جائیں گے، یوں کہ جیسے ان میں سے ایک جگہ تمہارے لیے مقدر تھی۔'' کسی شخص کا کردار قسمت کا نتیجہ نہیں ہوتا اور کوئی اٹل حکم تقدیر اُسے جنت یا جہنم میں نہیں لے جاتا۔ اس کے برعکس اس کی عاقبت اس کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، کیونکہ ہر شخص اپنے اعمال کا جوابدہ اور اپنی عاقبت کا مختار ہے۔ ''ہر اخلاقی فاعل کو عمل کے مواقع میسر آجاتے ہیں'' یا جیسا کہ ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے'' ہر شخص کو خدا کی طرف سے اپنی سیرت کے مطابق وسائل مہیا ہو جاتے ہیں۔ انسانی کردار کسی صورت میں محض اتفاقی نہیں ہوتا۔ ایک عمل دوسرے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ زندگی قسمت اور سریت کے معنی ہیں ایسے واقعات واعمال کا ایک مربوط سلسلہ جو ایک محکم قانون، یعنی مشیتِ ربی کے ذریعے ایک دوسرے علت و معلول کے رشتے میں منسلک ہوتے ہیں۔ یہ مسئلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مواعظ میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ''اس سے پیشتر کہ تمہارے اعمال کے جانچنے کا وقت آئے اپنے نفس کا جانچو، اس سے پیشتر کہ تمہاری روح کو اپنے نشیمن خاکی سے رخصت ہونا پڑے نیک و پاک کام کرنے کی کوشش کرو اور حق و راست بازی کے رستے پر ثابت قدم رہو۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر تم اپنی تنبیہہ اور اپنی ہدایت آپ نہ کرو گے تو کوئی دوسرا تمہیں راہِ راست نہ دکھا سکے گا۔'' ''میں تمہیں تلقین کرتا ہوں کہ صدق و صفا کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو۔ اس نے تمہیں نجات کی راہ بھی دکھائی ہے اور اس دنیا کی آزمائشوں سے بھی آگاہ کیا ہے۔ برائی سے بچو چاہے وہ تمہیں اچھی ہی کیوں نہ لگے۔ گناہ سے پرہیز کرو، خواہ وہ کتنا ہی خوش آئند کیوں نہ ہو''...... ''اے بندگانِ خدا، جو فرائض تم پر عائد کئے گئے ہیں اُنہیں پورا کرو کیونکہ اُن سے غفلت برتنے سے تمہیں ذلت نصیب ہوگی۔ صرف تمہارے نیک کام موت کو تم پر آسان کریں گے۔ یاد رکھو ہر گناہ قرض کے اس بوجھ کو جو

تمہارے سر پر ہے بڑھاتا ہے اور تمہاری زنجیر کو اور بھی بھاری بناتا ہے۔ رحمت کی خوشخبری تمہیں مل گئی ہے، حق کا راستہ صاف ہے۔ تمہیں جو احکامات دیئے گے ہیں اُن کی اطاعت کرو، پاک زندگیاں بسر کرو تقوے سے کام لو اور خدا سے دعا کرو کہ وہ تمہاری کوششوں میں تمہاری مدد کرے اور تمہاری خطاؤں سے درگزر کرے۔"

"اپنے اندر حلم اور عاجزی پیدا کرو، پرہیزگاری اور راست بازی سے کام لو، آپ اپنے نفس کا محاسبہ کرو، کیونکہ جو کوئی ایسا کرتا ہے اُسے اجرِ عظیم ملتا ہے اور جو ایسا نہیں کرتا بڑے گھاٹے میں رہتا ہے۔ جو کوئی تقوے پر عمل کرتا ہے اپنی روح کو سکون بخشتا ہے، جو شخص تنبیہہ پر کان دھرتا ہے وہ حق کو سمجھ لیتا ہے، جو شخص حق کو سمجھ لیتا ہے اُسے کمال علم حاصل ہو جاتا ہے۔"

ان ارشادات میں قضا و قدر کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس وہ ایک ایسے قلب کے آئینہ دار ہیں جس میں خدا پر ایک جیتا جاگتا ایمان تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھروسہ بھی تھا کہ انسان ذاتی اجتہاد کے ذریعے جس کا سرچشمہ اس کی اپنی قوتِ ارادی ہے، اصلاح ترقی کے مدارج طے کر سکتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے عقل اور علم، مقید و مطلق، محدود و غیر محدود کی جو تعریف کی وہ ہمیں ارسطا طالیسی الفاظ افکار کی یاد دلاتی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے جو کچھ ارشاد فرمایا اُس کا پڑھنا اخلاقیات، ارسطو کے مداحوں کے لیے فائدہ بخش ہوگا۔

"احتجاج الطبرسی" ہمیں ایسا مزید مواد مہیا کرتی ہے جس کی مدد سے ہم اس بارے میں صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں کہ اسلام میں قضا کا مسئلہ کیا ہے۔ ایک دن کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قضا و قدر کا مطلب دریافت کیا۔ اُنھوں نے جواب دیا "قضا کے معنی ہیں احکام الٰہی کی اطاعت اور گناہ سے پرہیز۔ قدر کے معنی ہیں تقوے کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت ایسے کام کرنے کی استعداد جو انسان کو قربِ الٰہی بخشتے ہیں اور ایسے کاموں سے پرہیز کرنے کی قابلیت جو انسان کو کمالِ الٰہی سے دور لے جاتے ہیں۔" ...... یہ نہ کہو کہ انسان مجبور ہے، کیونکہ ایسا کہنا خدا کی طرف ظلم کو منسوب کرنا ہے۔ یہ بھی نہ کہو کہ انسان کو اختیارِ کُلی حاصل ہے بلکہ یہ کہو کہ خدا کا فضل کرم ہماری نیک کام

کرنے کی کوششوں میں ہماری مدد کرتا ہے اور ہم گناہ اس لیے کرتے ہیں کہ ہم اس کے احکام سے غفلت برتتے ہیں۔'' عتبہ ابن ربیعہ نے ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' کے معنی دریافت کیے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے جوب دیا: اس کے معنی یہ ہیں کہ میں خدا کے عتاب سے نہیں بلکہ اس کی پاکی سے خائف ہوں۔ مجھ میں اُس کے احکام بجالانے کی طاقت نہیں، مجھ میں جتنی طاقت ہے وہ سب اس کی مدد سے ہے۔''

خدا نے ہمیں دنیا میں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اُس نے جو توفیق بخشی ہے اُس کے مطابق اس کا امتحان لے۔ اس کے بعد جو آئتیں تھیں اُن کا اور قرآن کی دوسری عبارتوں کا حوالہ دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا: ''خدا کہتا ہے ہم یہ دریافت کرنے کے لیے تمہارا امتحان لیں گے کہ تم میں سے کون مجاہدین اور کون صبر و تقویٰ والے ہیں اور ہم بتدریج تمہیں وہ کچھ حاصل کرنے میں مدد دیں گے جس کا تمہیں علم تک حاصل نہیں...... ان عبارتوں سے انسانی ارادے کی آزادی ثابت ہوتی ہے'' قرآن کی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہ ''خدا جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد کیا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا لوگوں کو نیکی یا بدی پر مجبور کرتا ہے۔ نہ یہ کہ وہ کسی وجہ کے بغیر ہدایت دیتا ہے یا ہدایت سے انکار کر دیتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انسانی ذمہ داری کا خاتمہ ہو جاتا۔ اس کے برعکس اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا حق کا راستہ دکھاتا ہے اور اس کے بعد انسانوں کو اختیار بخش دیتا ہے کہ اس راستے پر چلیں یا نہ چلیں۔

فلسفہ عرب نے جس کی پرورش بعد میں دوسرے گہواروں میں ہوئی، درس گاہ مدینہ میں جنم لیا۔ انسانی ارادے کی آزادی، جو اس نظریئے پر مبنی تھی کہ انسان کو اس کے مطابق جزا یا سزا ملے گی کہ اُس نے اپنی عقل کو کیونکر استعمال کیا ہے۔ ہادی اسلام کی تعلیمات کا ایک اہم جزو تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ راسخ عقیدہ بھی ان کی تعلیم میں شامل تھا کہ ایک افضل و اعلیٰ قدرت کائنات پر حکمران ہے۔ اس خیال نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد رشید کے ارشادات میں ایک زیادہ واضح اور معین شکل اختیار کر کے ایک فلسفے کی حیثیت حاصل کر لی۔ مدینہ سے یہ فلسفہ دمشق، کوفہ، بصرہ اور بغداد پہنچا اور وہاں پہنچ کر

اس نے اُن اخاذ دبستانوں کو جنم دیا جنہوں نے ابتدائی عباسی خلفاء کے ادوارِ حکومت کو آب و تاب بخشی۔

کربلا کے معرکہ قتال اور مدین کی تاخت و تاراج کے ہاتھوں اماموں کی درسگاہ بند ہوگئی تھی لیکن جب امام جعفر صادق علیہ السلام اہل بیت کے سربراہ بنے تو اُنہوں نے اُسے نئے سرے سے زندگی بخشی۔ وہ عالم بھی تھے، شاعر بھی تھے، فلسفی بھی، غیر ملکی زبانوں پر بھی قادر تھے، خیالات میں بے حد وسیع المشرب اور عقلیت پسند تھے اور عموماً یہودی، عیسائی اور زرتشتی ارباب فضل سے تبادلہ آراء اور مابعد الطبیعاتی مباحثوں میں مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دبستان مدینہ کو فلسفیانہ رنگ میں رنگ دیا۔ قضاد قدر کے بارے میں اُن کے جو خیالات تھے اُن میں سے بعض اس قابل ہیں کہ اُن کا ذکر کیا جائے۔ مسئلہ جبر کی بابت جو اس وقت دمشق میں اُٹھا، اُنہوں نے ذیل کی رائے ظاہر کی۔ جو لوگ جبر کے معتقد ہیں وہ خدا کو اپنے گناہوں میں شریک کرتے ہیں اور اُسے ایک حاکم جابر قرار دیتے ہیں جو اُنہیں ایسے گناہوں کی سزا دیتا ہے جن کے کرنے پر وہ فطرتاً مجبور ہیں؛ یہ کفر ہے۔'' پھر وہ ایک ایسے نوکر مثال دیتے ہیں جسے اس کے آقا نے بازار سے کوئی چیز خرید لانے کے لیے بھیجا ہے لیکن اُس چیز کی قیمت ادا کرنے کے لیے پورے پیسے نہیں دیئے: جب نوکر خالی ہاتھ بازار سے واپس آتا ہے تو آقا اُسے سزا دیتا ہے۔ یہ مثال دے کر وہ کہتے ہیں: ''مسئلہ جبر کی رو سے تو خدا ایک غیر منصف آقا ثابت ہوتا ہے۔'' جہاں تک مسئلہ جبر کے مخالف مسئلہ تفویض کا تعلق ہے (جس کے معنی انسانی ارادے کی آزادی نہیں بلکہ خیر و شر کے انتخاب میں مکمل اختیار) اُنہوں نے فرمایا کہ اس قسم کا اصول اخلاق کی بنیادیں اُکھیڑ کر رکھ دے گا اور تمام انسان کو اذنِ عام دے دے گا کہ جی کھول کر اپنی نفسانی خواہشات پوری کریں، کیونکہ اگر ہر شخص کو یہ اجازت دے دی جائے کہ چاہے تو نیکی پر اور چاہے تو بدی پر کاربند ہو تو کسی قسم کی تکلیف شروع باقی ہی نہیں رہتی۔ چنانچہ امام صاحب اختیار کو تفویض سے مختلف قرار دیتے ہیں۔'' خدا نے ہر انسان میں یہ صلاحیت ودیعت کی ہے کہ اُس کے احکام کو سمجھ سکے اور اُن پر عمل کر سکے۔ جو لوگ صدق و صفا کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اللہ اُن کی مدد کرتا ہے۔ یہ وہ

سن بلوغ تک زندہ رہتے)'' ہر انسان میں دو قسم کے میلانات ہوتے ہیں: ایک تو وہ جو اُسے نیکی کی طرف لے جاتے ہیں اور نیکی کرنے پر مجبور کرتے ہیں، دوسرے وہ جو اُسے بدی کی طرف لے جاتے ہیں اور بدی کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ لیکن خدا کی نصرت ہر وقت قریب رہتی ہے اور جو کوئی اپنی نفسانی خواہشات پر غالب آنے کے لیے خدا کی مدد مانگے خدا اس کی مدد کرتا ہے۔'' ''وہ تمہارے اپنے افعال ہیں جو تمہیں جنت یا جہنم میں لے جائیں گے، یوں کہ جیسے ان میں سے ایک جگہ تمہارے لیے مقدر تھی۔'' کسی شخص کا کردار قسمت کا نتیجہ نہیں ہوتا اور کوئی اٹل حکم تقدیر اُسے جنت یا جہنم میں نہیں لے جاتا۔ اس کے برعکس اس کی عاقبت اس کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، کیونکہ ہر شخص اپنے اعمال کا جوابدہ اور اپنی عاقبت کا مختار ہے۔'' ہر اخلاقی فاعل کو عمل کے مواقع میّسر آجاتے ہیں'' یا جیسا کہ ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے'' ہر شخص کو خدا کی طرف سے اپنی سیرت کے مطابق وسائل مہیا ہو جاتے ہیں۔ انسانی کردار کسی صورت میں محض اتفاقی نہیں ہوتا۔ ایک عمل دوسرے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ زندگی قسمت اور سریت کے معنی ہیں ایسے واقعات واعمال کا ایک مربوط سلسلہ جو ایک محکم قانون، یعنی مشیتِ ربی کے ذریعے ایک دوسرے علت ومعلول کے رشتے میں منسلک ہوتے ہیں۔ یہ مسئلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مواعظ میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔'' اس سے پیشتر کہ تمہارے اعمال کے جانچنے کا وقت آئے اپنے نفس کا جانچو، اس سے پیشتر کہ تمہاری روح کو اپنے نشیمن خاکی سے رخصت ہونا پڑے نیک و پاک کام کرنے کی کوشش کرو اور حق وراست بازی کے رستے پر ثابت قدم رہو۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر تم اپنی تنبیہہ اور اپنی ہدایت آپ نہ کرو گے تو کوئی دوسرا تمہیں راہِ راست نہ دکھا سکے گا۔'' ''میں تمہیں تلقین کرتا ہوں کہ صدق وصفا کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو۔ اس نے تمہیں نجات کی راہ بھی دکھائی ہے اور اس دنیا کی آزمائشوں سے بھی آگاہ کیا ہے۔ برائی سے بچو چاہے وہ تمہیں اچھی ہی کیوں نہ لگے۔ گناہ سے پرہیز کرو، خواہ وہ کتنا ہی خوش آئند کیوں نہ ہو'' ...... ''اے بندگانِ خدا، جو فرائض تم پر عائد کئے گے ہیں اُنہیں پورا کرو کیونکہ اُن سے غفلت برتنے سے تمہیں ذلت نصیب ہوگی۔ صرف تمہارے نیک کام موت کو تم پر آسان کریں گے۔ یاد رکھو ہر گناہ قرض کے اس بوجھ کو جو

تمہارے سر پر ہے بڑھاتا ہے اور تمہاری زنجیر کو اور بھی بھاری بناتا ہے۔ رحمت کی خوشخبری تمہیں مل گئی ہے، حق کا راستہ صاف ہے۔ تمہیں جو احکامات دیئے گے ہیں اُن کی اطاعت کرو، پاک زندگیاں بسر کرو تقوے سے کام لو اور خدا سے دعا کرو کہ وہ تمہاری کوششوں میں تمہاری مدد کرے اور تمہاری خطاؤں سے درگزر کرے۔"

"اپنے اندر حلم اور عاجزی پیدا کرو، پرہیزگاری اور راست بازی سے کام لو، آپ اپنے نفس کا محاسبہ کرو، کیونکہ جو کوئی ایسا کرتا ہے اُسے اجر عظیم ملتا ہے اور جو ایسا نہیں کرتا بڑے گھاٹے میں رہتا ہے۔ جو کوئی تقوے پر عمل کرتا ہے اپنی روح کو سکون بخشتا ہے، جو شخص تنبیہہ پر کان دھرتا ہے وہ حق کو سمجھ لیتا ہے، جو شخص حق کو سمجھ لیتا ہے اُسے کمال علم حاصل ہو جاتا ہے۔"

ان ارشادات میں قضا و قدر کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس وہ ایک ایسے قلب کے آئینہ دار ہیں جس میں خدا پر ایک جیتا جاگتا ایمان تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھروسہ بھی تھا کہ انسان ذاتی اجتہاد کے ذریعے جس کا سرچشمہ اس کی اپنی قوتِ ارادی ہے، اصلاح ترقی کے مدارج طے کر سکتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے عقل اور علم، مقید و مطلق، محدود و غیر محدود کی جو تعریف کی وہ ہمیں ارسطا طالیسی الفاظ افکار کی یاد دلاتی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے جو کچھ ارشاد فرمایا اُس کا پڑھنا اخلاقیات، ارسطو کے مداحوں کے لیے فائدہ بخش ہوگا۔

"احتجاج الطبرسی" ہمیں ایسا مزید مواد مہیا کرتی ہے جس کی مدد سے ہم اس بارے میں صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں کہ اسلام میں قضا کا مسئلہ کیا ہے۔ ایک دن کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قضا و قدر کا مطلب دریافت کیا۔ اُنہوں نے جواب دیا "قضا کے معنی ہیں احکام الٰہی کی اطاعت اور گناہ سے پرہیز۔ قدر کے معنی ہیں تقوے کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت ایسے کام کرنے کی استعداد جو انسان کو قربِ الٰہی بخشتے ہیں اور ایسے کاموں سے پرہیز کرنے کی قابلیت جو انسان کو کمالِ الٰہی سے دور لے جاتے ہیں۔" ...... یہ نہ کہو کہ انسان مجبور ہے، کیونکہ ایسا کہنا خدا کی طرف ظلم کو منسوب کرنا ہے۔ یہ بھی نہ کہو کہ انسان کو اختیار کُلی حاصل ہے بلکہ یہ کہو کہ خدا کا فضل کرم ہماری نیک کام

کرنے کی کوششوں میں ہماری مدد کرتا ہے اور ہم گناہ اس لیے کرتے ہیں کہ ہم اس کے احکام سے غفلت برتتے ہیں۔" عتبہ ابن ربیعہ نے ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" کے معنی دریافت کیے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے جوب دیا: اس کے معنی یہ ہیں کہ میں خدا کے عتاب سے نہیں بلکہ اس کی پاکی سے خائف ہوں۔ مجھ میں اُس کے احکام بجالانے کی طاقت نہیں، مجھ میں جتنی طاقت ہے وہ سب اس کی مدد سے ہے۔"

خدا نے ہمیں دنیا میں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اُس نے جو توفیق بخشی ہے اُس کے مطابق اس کا امتحان لے۔ اس کے بعد جو آئتیں تھیں اُن کا اور قرآن کی دوسری عبارتوں کا حوالہ دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا: "خدا کہتا ہے ہم یہ دریافت کرنے کے لیے تمہارا امتحان لیں گے کہ تم میں سے کون مجاہدین اور کون صبر وتقویٰ والے ہیں اور ہم بتدریج تمہیں وہ کچھ حاصل کرنے میں مدد دیں گے جس کا تمہیں علم تک حاصل نہیں......ان عبارتوں سے انسانی ارادے کی آزادی ثابت ہوتی ہے" قرآن کی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہ "خدا جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد کیا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا لوگوں کو نیکی یا بدی پر مجبور کرتا ہے۔ نہ یہ کہ وہ کسی وجہ کے بغیر ہدایت دیتا ہے یا ہدایت سے انکار کر دیتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انسانی ذمہ داری کا خاتمہ ہو جاتا۔ اس کے برعکس اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا حق کا راستہ دکھاتا ہے اور اس کے بعد انسانوں کو اختیار بخش دیتا ہے کہ اس راستے پر چلیں یا نہ چلیں۔

فلسفہ عرب نے جس کی پرورش بعد میں دوسرے گہواروں میں ہوئی، درس گاہ مدینہ میں جنم لیا۔ انسانی ارادے کی آزادی، جو اس نظریئے پر مبنی تھی کہ انسان کو اس کے مطابق جزا یا سزا ملے گی کہ اُس نے اپنی عقل کو کیونکر استعمال کیا ہے۔ ہادی اسلام کی تعلیمات کا ایک اہم جز تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ راسخ عقیدہ بھی ان کی تعلیم میں شامل تھا کہ ایک افضل واعلیٰ قدرت کائنات پر حکمران ہے۔ اس خیال نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد رشید کے ارشادات میں ایک زیادہ واضح اور معین شکل اختیار کر کے ایک فلسفے کی حیثیت حاصل کر لی۔ مدینہ سے یہ فلسفہ دمشق، کوفہ، بصرہ اور بغداد پہنچا اور وہاں پہنچ کر

اس نے اُن اخاذ دبستانوں کو جنم دیا جنھوں نے ابتدائی عباسی خلفاء کے ادوارِ حکومت کو آب و تاب بخشی۔

کربلا کے معرکہ قتال اور مدین کی تاخت و تاراج کے ہاتھوں اماموں کی درسگاہ بند ہوگئی تھی لیکن جب امام جعفر صادق علیہ السلام اہل بیت کے سربراہ بنے تو اُنہوں نے اُسے نئے سرے سے زندگی بخشی۔ وہ عالم بھی تھے، شاعر بھی تھے، فلسفی بھی، غیر ملکی زبانوں پر بھی قادر تھے، خیالات میں بے حد وسیع المشرب اور عقلیت پسند تھے اور عموماً یہودی، عیسائی اور زرتشتی ارباب فضل سے تبادلہ آراء اور مابعد الطبیعاتی مباحثوں میں مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دبستان مدینہ کو فلسفیانہ رنگ میں رنگ دیا۔ قضاد قدر کے بارے میں اُن کے جو خیالات تھے اُن میں سے بعض اس قابل ہیں کہ اُن کا ذکر کیا جائے۔ مسئلہ جبر کی بابت جو اس وقت دمشق میں اُٹھا، اُنہوں نے ذیل کی رائے ظاہر کی۔ جو لوگ جبر کے معتقد ہیں وہ خدا کو اپنے گناہوں میں شریک کرتے ہیں اور اُسے ایک حاکم جابر قرار دیتے ہیں جو اُنہیں ایسے گناہوں کی سزا دیتا ہے جن کے کرنے پر وہ فطرتاً مجبور ہیں؛ یہ کفر ہے۔'' پھر وہ ایک ایسے نوکر مثال دیتے ہیں جسے اس کے آقا نے بازار سے کوئی چیز خریدلانے کے لیے بھیجا ہے لیکن اُس چیز کی قیمت ادا کرنے کے لیے پورے پیسے نہیں دیئے: جب نوکر خالی ہاتھ بازار سے واپس آتا ہے تو آقا اُسے سزا دیتا ہے۔ یہ مثال دے کر وہ کہتے ہیں: '' مسئلہ جبر کی رو سے تو خدا ایک غیر منصف آقا ثابت ہوتا ہے۔'' جہاں تک مسئلہ جبر کے مخالف مسئلہ تفویض کا تعلق ہے (جس کے معنی انسانی ارادے کی آزادی نہیں بلکہ خیر و شر کے انتخاب میں مکمل اختیار) اُنہوں نے فرمایا کہ اس قسم کا اصول اخلاق کی بنیادیں اُکھیڑ کر رکھ دے گا اور تمام انسان کو اذنِ عام دے دے گا کہ جی کھول کر اپنی نفسانی خواہشات پوری کریں، کیونکہ اگر ہر شخص کو یہ اجازت دے دی جائے کہ چاہے تو نیکی پر اور چاہے تو بدی پر کار بند ہو تو کسی قسم کی تکلیف شروع باقی ہی نہیں رہتی۔ چنانچہ امام صاحب اختیار کو تفویض سے مختلف قرار دیتے ہیں۔'' خدا نے ہر انسان میں یہ صلاحیت ودیعت کی ہے کہ اُس کے احکام کو سمجھ سکے اور اُن پر عمل کر سکے۔ جو لوگ صدق و صفا کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اللہ اُن کی مدد کرتا ہے۔ یہ وہ

لوگ ہیں جو خدا کے مقبول ہیں۔ جو لوگ اُس کی حکم عدولی کرتے ہیں وہ گناہگار ہوتے ہیں۔'' آٹھویں امام علی رضا نے ان خیالات کو شدومد سے دہرایا۔ اُنہوں نے جبر تشبیہ کو کفر مطلق کہا اور اُن کے مدعیوں کو دشمنان دین گردانا، بلکہ علی الاعلان اُن پر روایات گھڑنے کا الزام لگایا۔ ساتھ ہی ساتھ اُنہوں نے اپنے پیروؤں کو تنبیہ کی کہ مسئلہ تفویض کو تسلیم نہ کریں۔ اُنہوں نے یہ کھلے کھلے عام اصول وضع کئے: ''خدا نے تمہیں دو راستے دکھائے ہیں: ایک تمہیں اس کی طرف اور دوسرا تمہیں اُس کے کمال سے دور لے جاتا ہے۔ خوشی یا رنج، جزا یا سزا کا دارومدار تمہارے اعمال پر ہے، لیکن انسان میں یہ طاقت نہیں کہ بدی کو نیکی میں گناہ کو کارِ ثواب میں تبدیل کر سکے۔''

بنی اُمیہ، جن میں سے بہت سے قبولِ اسلام کے بعد بھی دل سے مشرک ہی رہے، اپنے آباؤ اجداد کی طرح قسمت کے قائل تھے۔ اُن کے عہد حکومت میں ایک ایسا دبستان ظہور میں آیا جس کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کے عقائد سلف یعنی قدمائے اسلام سے ماخوذ تھے قدمائے اسلام سب کے سب دنیا سے رحلت کر چکے تھے، اس لیے ہر قسم کی روائتیں تراشنا اور اُنہیں اُن میں سے کسی ایک کی طرف منسوب کر دینا آسان تھا۔ اس دبستان کا نام جبریہ تھا اور اس کا بانی جہم بن صفوان تھا۔ کیلون (Calvin) کی طرح جبریہ[1] بھی اس امر سے منکر تھے کہ انسان آزاد ارادے کا مالک ہے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ ''انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں، کیونکہ اس کے اعمال خدا کی طرف سے ہوتے ہیں: نہ اس میں عمل کرنے کی قوت فیصلہ ہوتی ہے اور نہ ارادہ کرنے کی قوت۔ وہ اپنے اعمال میں خدا کی حاکمیت علی الاطلاق کا محکوم ہے اور نہ قوت عمل رکھتا ہے، وہ قوتِ ارادی اور نہ قوت، انتخاب...... خدا اُس کے اندر اسی طرح فعلیت پیدا کرتا ہے جس طرح وہ غیر ذی روح چیزوں میں کرتا ہے۔ انسانی اعمال کی جزا و سزا کا دارومدار خدا کی حاکمیت مطلقہ پر ہے۔'' صفاتِ الٰہی کے بارے میں بھی جبریہ کے چند نظریے تھے، جن کی کوئی اہمیت نہیں

---

[1] شہرستانی جبریہ کو دو گرہوں میں تقسیم کرتا ہے:۔ ایک تو خالص جبریہ اور دوسرے مقابلۃً معتدل جبریہ۔ اوالذکر کا نظریہ یہ تھا کہ نہ تو عمل انسان کا ہوتا ہے نہ اُس میں کسی قسم کی صلاحیت عمل ہوتی ہے۔ مؤخرالذکر کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان عمل کی قدرت تو رکھتا ہے لیکن وہ مؤثر نہیں ہوتا۔

شہرستانی کے قول کے مطابق جبریہ کے تین گروہ تھے۔ جہمیہ تجاریہ اور ضراریہ، جن میں چھوٹے چھوٹے جزئی اختلافات تھے لیکن جہاں تک مسئلہ قضا وقدر کا تعلق تھا تینوں اس پر متفق تھے کہ انسان آزاد ارادے کا مالک نہیں۔ نجاریہ، جو تغیر کے متعدد مراحل طے کر کے دو صدیوں کے بعد اشعریہ میں تبدیل ہو گئے یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ خدا اپنے بندوں کے اعمال کا خالق ہے عام اس سے کہ وہ اعمال نیک ہوں یا بد اور انسان اُن اعمال کے مالک بن جاتے ہیں۔ جبریہ عقائد نے اُموی خلفاء کی مقبولیت حاصل کی اور بہت جلد عوام میں پھیل گئے۔

جبریہ کا تقدیر کے بارے میں جو اٹل عقیدہ تھا اس نے اربابِ فکر کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ اس بغاوت کے سربراہ معبد الجہنی، یونس الاسوار اور غیلان دمشقی تھے جنہوں نے اپنے بہت سے خیالا ت بداہتہً فاطمیوں سے اخذ کئے تھے۔ اُنہوں نے اُمویوں کے دارالحکومت میں، یعنی نظریہ قضاء وقدر کے قلعے کی چار دیواری کے اندر، انسان کی مختاری کا اعلان کیا۔ لیکن انسانی آزادی کا دعویٰ کرتے وقت وہ کبھی کبھی مسئلہ تفویض کی سرحدوں کے قریب پہنچ جاتے تھے۔ دمشق سے یہ مباحثہ بصرہ پہنچا اور وہاں دونوں فرقوں کے اختلافات زیادہ شدید ہو گئے۔ جبریہ ایک نئے فرقے میں، جس کا نام صفاتیہ تھا، ضم ہو گئے۔ صفاتیہ مسئلہ تقدیر کے ساتھ ساتھ یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ اللہ میں چند صفات ہیں جو اُس کی ذات سے علیحدہ ہیں۔ جبریہ اس کے منکر تھے۔ جبریہ اپنے آپ کو سلف کے بلاواسطہ جانشین کہتے تھے۔ شہرستانی کے قول کے مطابق یہ پیروانِ سلف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا میں چند دائمی صفات ہیں۔ یعنی علم، قدرت، زندگی، ارادہ، سمع، بصر، کلام، جبروت، کریمی، فیاضی، رحمت، کبریائی، عظمت لیکن وہ صفات ذاتیہ اور صفات عملیہ میں کوئی تمیز نہیں کرتے...... وہ بعض صفاتِ خبریہ کو بھی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ اور منہ، اور وہ ان صفات کی کوئی تعبیر نہیں کرتے، سوئے اس کے کہ یہ خدا کی الہامی توصیف میں داخل ہیں اور اسی لیے اُنہوں نے اُن کو صفات خبریہ کا نام دیا ہے۔'' جبریہ کی طرح صفاتیہ بھی قضاء و قدر کے مردہ دلانہ نظریے پر شدت سے اڑے رہے۔ صفاتیہ سے مشبہہ کی شق نکلی جو صفاتِ باری کو مخلوقات کی صفات سے تشبیہ دیتے تھے اور جنہوں نے خدا کو اپنی ذات کی

تمثال بنا دیا[1] اس زمانے میں جو علماء حامیان قضا و قدر کے مخالف تھے اُن میں سب سے ممتاز امام حسن بصری تھے۔ امام صاحب مدینے میں پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے حکمائے بیت النبی کے سامنے زانوائے شاگردی تہہ کیا تھا۔ اُن سے انہوں نے وسیع النظری اور عقلیت پسندی اخذ کی تھی۔ بصرے میں اقامت اختیار کرنے کے بعد انہوں نے اپنی درسگاہ کھولی جس میں سارے عراق سے طلبہ جوق در جوق آنے لگے۔ اس درسگاہ میں وہ مابعدالطبعیات کے مسائل پر اپنے استادوں کی طرح آزادانہ اظہارِ خیال کرتے تھے۔

امام حسن بصری کے شاگردوں میں ایک ممتاز شاگرد واصل ابن عطاء الغزال[2] تھا، جو بڑی دماغی استعداد کا مالک اور علوم عقلیہ و نقلیہ اور روایات کا جید عالم تھا۔ اس نے بھی ابتداء میں درسگاہ مدینہ سے استفادہ کیا تھا۔ ایک مسئلہ ایمانی پر اختلاف کے باعث امام صاحب نے اُسے اپنے درس سے نکال دیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ایک علیحدہ درسگاہ کھولی۔ اس بناء پر اس کے متبعین کو معتزلہ یا اہل اعتزال یعنی اختلاف[3] کرنے والے کہتے ہیں۔ بہت جلد اُس نے اپنے اُستاد کے برابر شہرت حاصل کر لی۔ بلکہ اُستاد کا مکتب اس کے مکتب میں مدغم ہو گیا اُسے ذہنی آمریت سے جو دشمنی تھی اُس کے باعث وہ متعدد مرتبہ حد اعتدلال سے تجاوز کر گیا اور بالخصوص اُن متنازعہ فیہ مسائل پر جو امیر معاویہ کی بدولت پیدا ہوئے تھے ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا جو درسگاہِ مدینہ کے خیالات سے لگا نہ کھاتے تھے۔ بہرحال اس کے مکتب کی عمومی عقلیت پسندی نے اس زمانے کے آزاد

---

۱ شہرستانی صفاتیہ تشبیہوں کو بعد کے تشبیہوں سے ممتاز قرار دیتا ہے۔ ''جو لوگ عقیدہ سلف پر قائم تھے انہوں نے جو کچھ کہا بعد میں چند اشخاص اس سے بھی آگے نکل گئے اور انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ صفاتِ باری کو بیان کرنے والے جتنے کلمات ہیں وہ سب لغوی معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں اور ان کی تفسیر من وعن کی جانی چاہیے، یعنی کسی مجازی تاویل کے بغیر لیکن ساتھ وہی ساتھ یہ بھی واجب نہیں کہ محض ان کے لغوی معانی پر اصرار کیا جائے، کیونکہ اس طرح تو وہ خالص تشبیہ (تشبیہ الصرف) بن جاتے ہیں جو عقیدہ سلف کے منافی ہے۔''

۲ ابو خدیفہ واصل ابن عطاء الغزال عبدالملک' ولید اور ہشام کے ادوارِ خلافت میں ہوا۔ ۸۳ ہجری میں پیدا ہوا اور ۱۳۱ ہجری میں وفات پائی۔

۳ شہرستانی۔ ''گوہر مراد''۔ ''غیاث اللغات'' اور ''فرہنگ'' (لکھنؤ ۱۸۸۹ء) میں معتزلہ کا تلفظ ز کے اوپر فتحہ سے کیا گیا۔

خیال ارباب فکر ونظر کو اس کے علم کے نیچے جمع کر دیا۔ فاطمی فلاسفہ کے طریق استدلال کو اختیار کر کے، اُن کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل کر کے اور ان خیالات کو اپنا کر جو اُنہوں نے بسا اوقات زور دار الفاظ میں بیان کئے تھے، اُس نے اُن مسائل کو جن میں سے قائلین قضا وقدر سے اور عموماً تقلید پسندوں سے اختلاف تھا مستقل مباحث کی شکل دی۔ کئی صدیوں تک اس کا مکتب لوگوں کے ذہنوں پر مسلط رہا اور اس زمانے میں جو روشن دماغ حکمران برسر اقتدار تھے اُن کی حمایت کی بدولت اس نے مسلمانوں کے عقلی و فکری ارتقاء کو ایک ایسا محرک بہم پہنچایا جیسا اس سے پہلے کبھی بہم نہ پہنچا تھا۔ سربرآوردہ علماء طبعیات دان، ماہرین ریاضیات، مورخین، غرض علم وفکر کی ساری دنیا جس میں خود خلفاء بھی شامل تھے مکتبہ معتزلہ سے وابستہ تھی[1]۔

ابوالہذیل حمدان[2]، ابراہیم ابن سیار النظام[3]، احمد ابن حائط، فضل الحدثی اور ابوعلی محمد الجبائی جیسے لوگوں نے، جو یونانی فلسفہ ومنطق پر کامل عبور رکھتے تھے، بہت سے خیالات کو جو انہوں نے یونان سے اخذ کئے مدنی مکتب کے خیالات سے ملا دیا اور اس طرح مسلمانوں کے فلسفیانہ تفکر کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ ارسطو، پورفری (Porphyry) اور دوسرے حکمائے یونان واسکندریہ کی تصنیفات سے استفادہ کر کے معتزلہ نے ایک نئے علم کی بنیاد رکھی جس کا نام علم الکلام ہے (یعنی عقل کا علم۔ کلام بمعنی نطق یعنی (Logos)۔ اس نئے علم کے حربے سے اُنہوں نے اسلام کے خارجی دشمنوں کا بھی اور داخلی دشمنوں کا بھی مقابلہ کیا۔ یعنی ان غیر مسلموں کا بھی جو اسلام کی تعلیمات پر اعتراض کرتے تھے اور ان مسلموں کا بھی جو اندر سے اس کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کی کوشش کر رہے تے۔ جن سیاسی مسائل نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں خلفشار پیدا کیا تھا

---

[1] ہم یہاں دو تین چوٹی کے معتزلہ کے نام لیتے ہیں جنہیں ابھی تک شہرت عام حاصل ہے۔ امام زمخشری جن کی کتاب ''کشاف'' قرآن کی بہترین تفسیر تسلیم کی جاتی ہے، امام مسعودی، فلسفی اور مورخ الحسن بن الہیثم، ابوالوفاء اور میر خوند۔

[2] اُس نے متوکل کے عہدِ حکومت کے آغاز میں ۲۳۵ ہجری (مطابق ۵۰۔ ۸۴۹ء) میں وفات پائی (غالباً صحیح نام ہے، محمد بن الہذیل العلاف۔)

[3] ابوالہذیل کا بھتیجا یا بھانجا تھا۔

اُن کے بارے میں واصل کے جو انتہا پسندانہ خیالات تھے وہ فاطمی مکتب کی عقل پسندی میں ضم ہو گئے جس سے اُن کا خمیر اُٹھا تھا یہ ایک معروف امر ہے کہ تمام بڑے بڑے فلاسفہ معتزلہ نے فاطمیوں کی درسگاہ میں تعلیم پائی تھی اور اس معاملے میں شک کی گنجائش نہیں کہ اعتدال پسند اعتزال حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے سب سے وسیع المشرب ابتدائی جانشینوں بلکہ خود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات کی عکاسی کرتا تھا۔ معتزلہ کے عقائد کا بامعان جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ وہ یا تو حرف بحرف وہی عقائد تھے جن کی تعلیم ابتدائی فاطمیوں نے دی تھی یا اُن عقائد کی ترمیمیں تھے جو یا تو ایک ترقی یافتہ معاشرے کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر کی گئیں یا فلسفہ یونان و اسکندریہ کے مطالعے کا نتیجہ تھیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پرزور الفاظ میں ذات باری کے تمام ایسے تصورات کی مذمت کی تھی جن میں انسان سے جسمانی یا جذباتی مشابہت کا پہلو پایا جائے۔ ''خدا کسی ایسی چیز سے مشابہ نہیں جس کا تصور ذہن انسانی میں آ سکتا ہے، اُس کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب نہیں کی جا سکتی جس کا ادراک انسانوں کو اشیائے مادی کے علم کے ذریعے حاصل ہوا ہو، کمال، حقیقت اس میں ہے کہ پورے خلوص سے اس کی وحدت کو تسلیم کیا جائے اور کمالِ خلوص اس میں ہے کہ اُس کی طرف کوئی صفات منسوب نہ کی جائیں (کمال الخلاص لہ نفی الصفات عنہ) جو شخص خدا کی طرف کوئی صفت منسوب کرتا ہے وہ اس صفت کو خدا سمجھتا ہے، اور جو شخص اس طرح کسی صفت کو خدا سمجھتا ہے وہ خدا کو دو یا کسی اکائی کا ایک حصہ خیال کرتا ہے...... جو شخص یہ پوچھتا ہے کہ خدا کہاں ہے وہ خدا کو ایک چیز تصور کرتا ہے۔ خدا خالق ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ خود مخلوق ہے' خدا موجود ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ کبھی غیر موجود تھا۔ وہ ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن تشابہت یا اتصال کی وجہ سے نہیں، وہ ہر چیز سے باہر ہے لیکن اس لیے نہیں کہ وہ اُس سے جدا ہے، وہ سبب اول ہے لیکن حرکت یا عمل کے معنوں میں نہیں۔ وہ بصیر ہے' لیکن کسی کی بصارت اُسے دیکھ نہیں سکتی۔ اُسے مکان، زمان یا عدد و مقدر سے کوئی تعلق نہیں...... خدا عالم کل ہے کیونکہ علم اس کی ذات ہے' وہ قادر ہے کیونکہ قدرت اُس کی صفت ہے' وہ محبّ ہے' کیونکہ محبت اُس کی ذات ہے...... اس لیے نہیں کہ یہ صفات اُس کی ذات سے جدا ہیں...... زمان و مکان کی

قیود کا اُس پر کسی طرح اطلاق نہیں ہو سکتا۔"متبعین سلف تقدیر کی جو تشریح قضاء و قدر کے معنوں میں کرتے تھے اس کا مطلب تھا" جانچنا" امتحان لینا"، آزمائش کرنا۔"

آیئے اب ہم یہ دیکھیں کہ اعتزال کیا ہے۔ بہت سے غیر اہم اور ضمنی امور میں اکابر معتزلہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن میں یہاں اُن نظریات کا خلاصہ پیش کروں گا جن پر وہ متفق تھے۔ شہرستانی کہتا ہے: "معتزلہ[1] یہ اعلان کرتے ہیں کہ قدیم وجود باری کی امتیازی صفت ہے۔ خدا قدیم ہے، کیونکہ قدیم اس کی ذات کا ایک خاص وصف ہے۔ وہ بالا اتفاق صفاتِ قدیمہ کے (ذات باری سے جدا) وجود کے منکر ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذات میں عالمِ کل ہے، اپنی ذات میں حی و قیوم ہے، اپنی ذات میں قادرِ مطلق ہے اس لیے نہیں کہ علم، حیات اور قدرت اس کی صفاتِ قدیمہ کی حیثیت سے اُس میں موجود ہیں، کیونکہ علم حیات اور قدرت تو اس کی ذات کے اجزا ہیں۔ اگر بصورت دیگر ان صفات کو وجود باری صفاتِ قدیمہ خیال کیا جائے (یعنی اس کی ذات سے علیحدہ) تو یہ متعدد قدیم وجودوں کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا ... وہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ کلام اللہ مخلوق ہے اور مخلوق ہونے کی حیثیت سے الفاظ اور اصوات کی صورت میں ظاہر ہوا ہے...... اسی طرح وہ متفقہ طور پر اس سے منکر ہیں کہ ارادہ کرنا، سننا اور دیکھنا ایسے خیالات ہیں جو فی نفسہٖ وجود باری میں موجود ہیں۔ اگرچہ شانِ وجود اور مابعد الطبیعیاتی حیثیت کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں"...... "وہ بالا تفاق اس سے منکر ہیں کہ خدا کو دار القرا میں جسمانی آنکھوں سے دیکھا جا سکے گا۔ وہ اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں کہ خدا کی توصیف اشیائے مادی کی کسی صفت سے کی جائے چاہے

---

[1] شہرستانی کا قول ہے کہ "معتزلہ اپنے آپ کو اصحاب العدل والتواحید کہتے تھے اور کبھی کبھی قدریہ بھی۔" لیکن امرِ واقعہ ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے آپ کو قدریہ کے لقب سے ملقب نہیں کیا۔ یہ لقب اُن کے مخالفوں نے اُن انتہا پسند معتزلہ کو دیا جو مسمہ تفویض کے قائل تھے، جسے ائمہ فاطمیہ نے مذموم قرار دیا تھا۔ معتزلہ خود ہمیشہ قدریہ کے لقب کو رد کرتے تھے اور اس کا اطلاق حامیانِ قضا و قدر پر کرتے تھے جن کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا ہر انسانی عمل کا خالق ہے شہرستانی یہ تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے: "وقالوا الفظ القدريه يطلق على من يقول بالقدر خيره و شره من الله تعالىٰ۔" لیکن وہ حامیان، قضا و قدر پر لقب قدریہ کے اطلاق کی تردید کرتا ہے۔ "اس کا اطلاق ایسے لوگوں پر کیونکر ہو سکتا ہے جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔"؟

وہ جہت ہو یا مقام یا صورت یا جسم یا تغیر یا اختتام عمل یا تحلیل۔ قرآن کی جن عبارتوں میں ایسے کلمات استعمال کئے گئے ہیں جو ان صفات پر محمول کئے جا سکتے ہیں اُن کی تفسیر وہ یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ یہ کلمات مجازاً استعمال کئے گئے ہیں نہ کہ لغواً اس نظریئے کو وہ توحید کہتے ہیں، یعنی وحدت اللہ کا اقرار...... وہ اس پر بھی متفق ہیں کہ انسان اپنے اعمالِ نیک و بد کا فاعلِ خالق ہے (لا فعالد خیر ها و شر ها ان العبد قادر خالق) اور عقبیٰ میں اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا پائے گا اور کسی شر، اخلاقی سوءِ عمل، نفی عقیدہ عدم اطاعت کو خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اگر وہ ظلم یعنی گمراہی کو وجود میں لائے تو وہ خود ظالم ثابت ہوتا ہے (لا نہ لو خلق الظلم کان ظالماً)...... وہ یہ بھی متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ حکیم کل صرف ایسے کام کرتا ہے جن میں صلاح و خیر ہو اور اس لیے از روئے حکم اپنے بندوں کی بھلائی کا خیال رکھنا خدا پر واجب ہے۔ اگرچہ وہ اس مسئلے پر مختلف الرائے ہیں کہ آیا زیادہ سے زیادہ اصلاح وغیرہ کا وجود میں لانا اور بندوں پر لطف و کرم کرنا خدا کا فرض ہے۔ اس نظریئے کو وہ نظریہ عدل کہتے ہیں۔''

اُن کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ انسانی عمل کے بارے میں کوئی دائمی اور قدیم قانون موجود نہیں اور انسان کی ہدایت کے لیے جو خدائی احکام یعنی امر و نواہی ہیں وہ تدریجی ترقی کے ذریعے وجود میں آئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو شخص نیکی کرتا ہے وہ ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور جو شخص بدی کرتا ہے وہ عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ اس دعوے کو وہ مطابق عقل قرار دیتے ہیں۔ معتزلہ کا یہ خیال بھی ہے کہ علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور صرف عقل کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ نیکی و بدی کا عرفان اُن کے نزدیک عقل کا کام ہے۔ جب تک عقل ہمیں صواب و خطا کا فرق نہ بتائے ہم اُن میں تمیز نہیں کر سکتے۔ احکام شریعت کے صادر ہونے سے بھی پہلے عقل ہم پر یہ فرض عائد کر دیتی ہے کہ خدا کے احسانوں کا شکر بجالائیں۔ خدا کے عرفان کو بھی وہ عقل کے دائرے میں داخل سمجھتے ہیں۔ ذات باری کے سوا ہر چیز کو وہ تغیر پذیر اور فانی خیال کرتے ہیں۔

''اُن کا یہ ایمان بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اس مقصد سے بھیجے کہ وہ انسان کو اس کے احکام سمجھائیں...... امامت کے مسئلے پر اُن میں اختلاف رائے ہے۔ بعضوں کا خیال

ہے کہ وہ تقرر کے ذریعے ایک امام سے دوسرے امام کو ملی۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ جمہور کو اپنا امام انتخاب کرنے کا حق ہے۔" چنانچہ معتزلہ صفاتیہ کی عین ضد ہیں۔" کیونکہ وہ اور تمام دوسرے اہل سنت اس کے قائل ہیں کہ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے، کیونکہ اپنی قلمرو کا حاکم مطلق ہے اور اپنی مرضی کے مطابق حکم دیتا ہے...... اُن کے نزدیک یہ عدل ہے۔ اہل الاعتزال کہتے ہیں کہ جو چیز مطابق عقل وحکمت ہو صرف وہ چیز عدل ہوتی ہے اور وہ صرف انسان کے لیے صواب ومصلحت کی حامل ہوتی ہے...... اہل العدل کہتے ہیں کہ خدا نے مخلوق کلام کے ذریعے اوامرونواہی صادر کئے ہیں۔ اہل السنت (یعنی صفاتیہ) کہتے ہیں کہ تکالیف شرعی کا علم سمع وخبر کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ عقل کی وساطت سے صرف علمِ دنیوی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ عقل ہمیں یہ نہیں بتاسکتی کہ کون سی چیز نیک ہے، کون سی بد اور کون سی واجب (اس کے برعکس) اہل العدل کہتے ہیں کہ تمام علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ احادیث میں تقدیر کا جو لفظ آیا ہے اُس سے وہ مراد لیتے ہیں امتحان اور نجات ادبار واقبال، بیماری اور تندرستی، موت اور زندگی اور خدا کے دوسرے کام۔ خیر وشر اور حسن وقبح کو وہ انسان کی ذمہ داری اور تقدیر کے دائرے سے خارج قرار دیتے ہیں۔

ایک مکتب کی حیثیت سے معتزلہ کے جو خیالات تھے اب تک ہم نے انہیں مجموعی طور پر بیان کیا ہے۔ لیکن اس مکتب کے ممتاز حکماء نے بعد میں انفرادی آراء کا اظہار کیا جو اس کے باوجود کہ وہ اُن کے خاص خاص شاگردوں کے حلقے تک محدود رہیں ملاحظہ کی مستحق ہیں۔ مثلاً ابو ہذیل حمدان کا عقیدہ تھا کہ خدا علم کی بدولت عالم ہے لیکن اُس کا علم اس کی ذات ہے، وہ زندگی کی بدولت زندہ ہے لیکن وہ قدرت کی بدولت قادر ہے لیکن اس کی زندگی اس کی ذات ہے۔ شہرستانی کہتا ہے کہ یہی رائے ابوالہذیل نے بظاہر فلاسفہ سے لیکن دراصل درسگاہ مدینہ سے اخذ کی۔ ابوالہذیل نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ آزاد ارادہ یا اختیار (جسے وہ "سلامت" کہتا ہے) ایک عرض ہے جو کمال ترقی اور "صحت" یعنی صحیح الفطرتی) پر مستزاد ہے۔ ابراہیم ابن سیار ناظم، جس نے فلاسفہ کی کتابوں کا مطالعہ بڑی محنت سے کیا یہ رائے رکھتا تھا کہ الہامی کشف کے بغیر بھی انسان غور وفکر کی مدد سے خدا کو پہچان سکتا ہے اور نیک وبد میں تمیز کرسکتا ہے اور نیکوکار میں بدی

کرنے کی قوت ہی نہیں ہوتی۔'' معمر ابن عباد السلمی نے افلاطون کا نظریہ امثال پیش کیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ عوارض اشیاء کی جس نوع میں ہوتے ہیں اس میں دائمی طور پر موجود رہتے ہیں اور ہر عرض کسی جوہر میں ہوتا ہے لیکن اس کے وجود کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ ذہنِ انسانی میں اس کا خیال ہو۔ معمر اور اُس کے تابعین کو اس بنا پر اصحاب المعانی (Idealists) کا نام دیا گیا۔ ابوعلی محمد ابن عبدالوہاب عرف ابوعلی جبائی کا یہ خیال تھا کہ عمل کا تعلق انسان سے یوں ہے کہ انسان اُس کا موجود مبداء ہوتا ہے، چنانچہ وہ اخلاقی خیر و شر اور اطاعت و نافرمانی کو انسان کا ایک خصوصی حق سمجھتا ہے۔ اختیار کو (جسے وہ استقامت کے نام سے موسوم کرتا ہے) وہ عمل کی ایک شرف پیشیں تصور کرتا ہے اور اسے ایک ایسی قوت کہتا ہے جو جسمانی صحت اور سلامتی اعضاء پر مستزاد ہے۔ امام الحرمین ابوالمعالی الجوینی اگرچہ اپنے آپ کو معتزلی نہیں کہتے تھے بلکہ معتزلہ کے مخالفوں نے اُنہیں اپنے زمرے میں شمار کیا ہے۔ پھر بھی اُن کا دل تھا کہ انسان کو استقامت اور اختیار سے خالی قرار دینا عقل و شعور کے منافی ہے اور یہ کہنا کہ انسان میں قابلیت تو ہے لیکن کسی قسم کی موثریت نہیں قابلیت کے مکمل انکار کے مترادف ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ کوئی ناقابلِ فہم اثر عمل انسانی کا سبب و محرک بنتا ہے یہ کہنے کے برابر ہے کہ انسان پر کوئی خاص اثر کارفرما ہی نہیں ہوتا۔ چونکہ شرائط و حالات اُن لوگوں کے اصول کے مطابق جو اُن کا دعویٰ کرتے ہیں موجود یا غیر موجود نہیں کہے جا سکتے بلکہ اپنی اصل کے حوالے سے تشریح کے محتاج ہوتے ہیں، اس لیے انسان کا عمل (ایک حالت، موجودہ کی حیثیت سے) فی الحقیقت اس کی قابلیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہی بجا ہے کہ اُس کی قابلیت اُن کا مبداء خالق نہیں ہوتی کیونکہ تخلیق کے معنی ہیں قدرتِ مطلقہ کے ذریعے کسی ایسی چیز کو وجود میں لانا جو پہلے موجود نہ تھی۔ عمل کے وجود کا دارومدار انسان کی قابلیت عمل پر ہے اور یہ قابلیت خود کسی اور سبب پر منحصر ہوتی ہے جس کے ساتھ اُس کا وہی تعلق ہوتا ہے جو انسان کے عمل کا تعلق انسان کی قابلیت کے ساتھ ہوتا ہے چنانچہ اس طرح ہر سبب کا دارومدار کسی دوسرے سبب پر ہوتا ہے تاآں کہ یہ سلسلہ مسبب الاسباب پر جا کر ختم ہوتا ہے، یعنی اسباب اور اُن کی مؤثریت کے خلاق پر جو مطلقاً قائم بالذات اور مکتفی بالذات ہے۔ شہرستانی کہتا ہے کہ

''ابو المعالی نے یہ رائے موحدین (The Theistic) کے مکتب سے مستعار لی لیکن اُسے کلام کا جامہ پہنا دیا۔''[1]

یہ ہے ایک اجمالی خاکہ معتزلہ کے خیالات کا چند ایسے معرکتہ الآرا مسائل پر جنہوں نے ہر زمانے اور ہر ملک میں ذہن انسانی کو مخمصے میں ڈالا ہے اور کیا مشرق اور کیا مغرب دونوں میں بسا اوقات خونریز ہنگامے برپا کیے تھے۔

چونکہ وہ خدا کی وحدت کے ایسے طور پر مدعی تھے کہ اُس میں انسان سے شبہات کا شائبہ تک نہ تھا اور چونکہ وہ انسان کی اخلاقی ذمہ داری کے بھی حامی تھے اس لیے انہوں نے قدرتی طور پر اپنے آپ کو اصحاب العدل والتوحید کہا اور اپنے مخالفین کو مشبہہ یعنی تشبیہوں کا لقب دیا۔ ان کا طریق استدلال حسب ذیل تھا:۔ اگر معصیت کا مبداء یا خالق خدا ہے اور انسان کا اس میں مبتلا ہونا مقدر ہے تو اُسے اس کے لیے مستوجب سزا قرار دینا، خدا کو غیر منصف گردانا ہے اور یہ کفر ہے۔ لہٰذا عقل اور روح الٰہی دونوں ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ تقویٰ اور گناہگاری، نیکی اور بدی خیر و بشر انسانی ارادے کی پیداوار ہیں اگرچہ انسان کو یہ بتا دیا گیا ہے کہ کون سی چیز صحیح ہے اور کون سی چیز غلط، پھر بھی وہ اپنے اعمال پر مکمل اختیار رکھتا ہے۔ خطا و سزا کا دارومدار عدل پر ہے' کیونکہ خدا کی کائنات عدل کے زیرِ فرمان ہے۔ عقل اور عدل انسانی اعمال کے اصولِ رہنما ہیں: منفعتِ عمومی اور جمہور نوع بشر کی راحت وسعادت کا پروان چڑھانا خطا و صواب کے سب سے بڑے معیار ہیں۔ کیا خدا نے خود نہیں کہا: ''دونوں راستے انسان کی بھلائی کی خاطر اُسے دکھا دیئے گئے ہیں۔ کیا خود اس نے انسان کو اپنی عقل سے کام لینے کی تلقین نہیں کی؟'' وہ چونکہ عقلیت پسند اور افادیت پسند تھے اس لیے انہوں نے قانونِ اخلاقی کی بنیاد عقل اور آیاتِ الٰہی کی باہمی مطابقت پر رکھی۔ وہ معلم اسلام اور آپ کے ابتدائی جانشینوں کے نقشِ قدم پر چلے۔ ہر ایسے قانون کو جو انسانوں کے باہمی تعلقات کو منضبط کرتا ہے ترقی اور نشوونما کے ایک مسلسل عمل کا نتیجہ کہہ کر انہوں نے مسئلہ ارتقاء کی حمایت کی انسان کے ایک طویل مدت سے کرہ ارض پر موجود

---

[1] جوینی کے خیالات کا مقابلہ ابن رُشد کے خیالات سے کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہرستانی ائمہ فاطمی کے خیالات سے واقف نہ تھا۔ ابو المعالی کے خیالات اُس سے صحیح العقیدہ شخص کو پسند نہ آ سکتے تھے۔

ہونے کے بارے میں[1] اُن کے خیالات تھے ان کے اعتبار سے وہ دنیائے جدید کے طبعی فلاسفہ کے مقابلے میں ایک مقام تفوق رکھتے ہیں۔

معتزلی مذہب اسلامی سلطنت کے ہر گوشے کے صاحب فکر و فرہنگ طبقوں میں بڑی سرعت سے پھیلا اور ہسپانیہ میں داخل ہو کر اُس نے اندلسی دارالعلوموں اور درسگاہوں پر قبضہ جمالیا۔ منصور اور اس کے ابتدائی جانشینوں نے عقلیت کی حوصلہ افزائی کی لیکن علانیہ طور پر معتزلی عقائد کا اقرار نہ کیا۔ مامون نے جو تمام ایشیائی حکمرانوں سے بڑھ کر "اعظم" کے لقب کا مستحق ہے، مکتب معتزلہ سے وابستگی کا اعتراف کیا۔ اس نے اور اس کے بھائی معتصم اور بھتیجے واثق نے ساری دنیائے اسلام میں عقلیت کی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ ان کے ادوارِ حکومت میں عقلیت کو ایک ایسا غلبہ حاصل ہوا جیسا غالباً اُسے زمانہ حاضرہ کے یورپی ملکوں میں بھی نصیب نہیں۔ علمائے معقولات مسجدوں میں خطبے اور مدرسوں میں درس دیتے تھے، ملت کے نوجوانوں کی سیرت کی تشکیل اُن کے ہاتھوں میں تھی، خلیفوں کے مشیروں میں وہ ایک اونچے مقام کے مالک تھے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اپنے اثر و نفوذ کا استعمال دانشمندی سے کیا۔ انہوں نے پروفیسروں، خطیبوں، سائنسدانوں، طبیبوں، وزیروں اور صوبائی حاکموں کی حیثیت سے اُمتِ مسلمہ کی نشوونما کو فروغ دیا۔ جب مذہب معتزلہ کی شان و شوکت ایشیا میں ختم ہو گئی تو مغربی افریقہ میں بنی ادریس کے عروج اور دولتِ فاطمیہ کے قیام نے اُسے ایک نئی زندگی بخشی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خود پیغمبر اسلام ﷺ اور حکمائے بیت النبی نے مسئلہ تقدیر کو قبول نہ کیا اور عقل کو اندھی تقلید کا غلام بنانے کو ناپسند فرمایا تو یہ عقائد اسلامی دنیا کے فکر و عمل پر بالآخر کیونکر مسلط ہو گئے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر آیئے ہم مسلمانوں کی ذہنی سرگرمیوں کے ایک اور پہلو کی نشوونما کا سراغ لگائیں۔ مذہب معتزلہ کو، بظاہر بڑی حد تک معقول طور پر، یورپ کے قرون متوسطہ کے فلسفہ مدرسیہ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ مدرسیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "وہ ایک ذہنی تحریک تھی جس کا مقصد عیسائیت کے مسائل ایمانیہ کا جواز عقل کی مدد سے پیش کرنا تھا۔" معتزلہ مذہب نے بھی

---

[1] انہوں نے یہ خیالات ایک حدیث سے اخذ کیے جو حضرت علی علیہ السلام سے بحار الانوار (باب تکوین) میں مروی ہے۔

عقل اور مثبت الہام میں مطابقت قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نقطے پر پہنچ کر اعتزال اور مدرسیت کی مماثلت ختم ہو جاتی ہے۔ عیسوی کلیسا میں جو ایمانیات تشریح اور جواز کے محتاج تھے اُن کی تعداد بہت بڑی تھی۔ تثلیث کے اندر وحدت میں ''فطرتوں'' کا ایک فطرت میں جمع ہونا۔ جبلی معصیت، استحالہ عشائی ان سب مسائل نے بہت سی ذہنی کشمکش پیدا کی۔ لہٰذا اس سے پیشتر کہ سائنس اور فکر آزاد کو عیسائیت میں داخلہ ملتا کلیسا کے ایمانیات کو مدرسیت کی قسم کے کیمیائی محلل کی ضرورت تھی اسلام کا معاملہ جدا تھا۔ مسئلہ توحید کے سوا، جو دین اسلام کا اصل الاصول تھا، کسی مسئلہ ایمانی پر کسی ایسی صورت میں اصرار نہکیا گیا تھا کہ عقل اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی۔ مبداء و معاد (یعنی خدا سے آنا اور خدا کے پاس لوٹ جانا) اور انسانی اختیار کا مسئلہ ایک سبب اوّل یعنی مبداء جملہ موجودات کے تصورات پر مبنی تھا۔ دانشمند اور جاہل دونوں کسی نہ کسی صورت میں یہ مانتے چلے آئے ہیں کہ انا (Ego) اپنے پیراہن جسمانی سے جدا ہونے کے بعد بالکل نیست و نابود نہ ہو جائے گی بلکہ جسم کی تحلیل کے بعد ایک خود آشنا ہستی کی حیثیت سے قائم رہے گی۔ بعض لوگوں نے ایک آئندہ زندگی کا انکار کیا ہے لیکن بیشتر لوگوں نے اسے قبول کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس آئندہ زندگی کی نوعیت کے بارے میں اُن کے خیالات مختلف ہیں۔ اسی طرح جہاں تک انسانی ذمہ داری کا تعلق ہے، اس بارے میں بہت سا اختلافِ آراء ہے کہ انسان اپنے اخلاق فرائض سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتا ہے' لیکن اس موضوع پر سب متفق ہیں کہ وہ اپنی قوتوں کے صحیح یا غلط استعمال کے لیے جوابدہ ہے۔ ان دونوں مسائل پر معلم اسلام کے ارشادات آزادی رائے کی بہت سی گنجائش چھوڑتے ہیں۔ اصلی تصورات کے قائم رکھنے اور قبول کرنے کی حدود کے اندر دین اسلام وسیع المشر بانہ سے وسیع المشر بانہ اور عقلیت پسندانہ سے عقلیت پسندانہ خیالات کی اجازت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کسی ایسے عبوری مرحلے سے گزرنے کے بغیر جس کی ضرورت عیسائیت کو پیش آئی دورِ قبول سے نکل کر دورِ عمل اور دورِ ایمان سے نکل کر دورِ عقل میں داخل ہو گیا۔

یہ درست ہے کہ دورِ رسالت میں اور اسی طرح خلافت راشدہ کے دور میں قدرتی طور پر غالباً بجا طور پر، بلا روک ٹوک استفسار کی ہمت افزائی نہ کی گئی۔ لیکن ایسا کبھی

نہیں ہوا کہ اربابِ اقتدار کے خوف نے سوالات یا شبہات کی زبان بندی کر دی ہو۔ اگر مدرس کسی سوال کا جواب دینے سے معذور ہوتا تو وہ کمالِ انکسار کے ساتھ اپنی معذوری کا اقبال کرتا۔

مذہب اعتزال کو اس لیے ذہن انسانی کی ترقی میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے کہ وہ یورپ کی مدرسیت سے ملتا جلتا ہے لیکن درحقیقت طبعاً دورِ حاضر کی عقلیت سے قریب کا رشتہ رکھتا ہے۔ مدرسیت نے کلیسا کے زیر سایہ کام کیا۔ اعتزال دینِ اسلام کے پیشواؤں کا شریک کار رہا۔ اسلام کی مدرسیت نے بعد میں ظہور کیا۔

علوم طبیعیہ کی نشوونما نے مسلمانوں کی فطری طباعی کو ایک نئی جہت بخشی۔ مفکرین کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا ہوگئی۔ اُنہیں حکماء کا لقب دیا گیا (لفظ حکیم سائنسدان اور فلسفی دونوں محیط ہے) ان لوگوں کا طریقِ استدلال آج کل کی سائنس کے طریق استدلال کے مماثل تھا، ان میں سے اکثر معتزلی تھے۔ لیکن بعضوں کے خیالات پر ارسطو اور اسکندریہ کی افلاطونیت جدیدہ کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اگرچہ تعصب اور جہالت نے انہیں کافر ملحد اور زندیق کے ملامت آمیز لقب دے کر مطعون کیا لیکن تاریخی صداقت شعاری کو یہ تسلیم کرتے ہی بن آتی ہے کہ ان لوگوں نے کبھی اپنے آپ کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں کیا نہ انہوں نے کبھی کوئی ایسا نظریہ پیش کیا جس کی سند انہیں بانی اسلام یا آپ کے ابتدائی جانشینوں کے اقوال میں نہ ملی۔

ارتقا اور تدریجی نشوونما کے جس نظریے پر یہ فلاسفہ ثابت قدمی سے جمے رہے وہ اُن کے ایک ممتاز نمائندے الہیثم نے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اس کے جو فلسفیانہ خیالات ہیں اُن کا اجمال یہ ہے:۔ ''مادی موجودات کی اقلیم میں سب سے نیچے جمادات ہیں' ان کے اوپر نباتات، اُن کے اوپر حیوانات اور سب سے اوپر انسان جسمانی لحاظ سے وہ مادی دنیا کا باشندہ ہے لیکن اپنی روح کی بدولت وہ غیر مادی یا روحانی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس سے اوپر خالصتاً روحانی ہستیاں ہیں' یعنی ملائکہ؛ اُن کے اوپر صرف خدا ہے۔ اس طرح درجہ بدرجہ ترقی کے ایک سلسلے نے اسفل کو

اعلیٰ سے مربوط کر رکھا ہے لیکن انسانی روح دائماً مادے کی زنجیریں اُتار پھینکنے کی کوشش کرتی ہے اور آزاد ہو کر وہ خدا کی طرف پرواز کر جاتی ہے جس سے وہ ابتداءً آئی تھی۔"[1] بعد میں یہی خیالات مولانا روم نے، جن کی صحتِ عقیدہ پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا، اپنی مثنوی میں بیان کیے:۔

از جمادی مُردم و نامی شُدم	وز نما مردم بحیواں سر زدم
مُردم از حیوانی و آدم شُدم	پس چہ ترسم کی زمردم کم شوم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر	تا بر آرم از ملائک بال و پر
بارِ دیگر از ملک پر آں شوم	آنچہ اندر وہم نائد آن شوم
پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں	گویدم کا نا الیہ راجعون

بزرگ ترین فلاسفہ کندی، فارابی، ابن سینا، ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رُشد تھے[2]۔

کندی (ابو یوسف یعقوب ابن اسحٰق) جسے حکیم الحکماء کا لقب دیا گیا ہے۔ کندہ کے مشہور خاندان سے تھا اور اُس کے آباؤ اجداد میں عرب کے متعدد بادشاہ تھے اس کا باپ اسحٰق بن الصباح، مہدی، ہادی اور ہارون کے ادوارِ حکومت میں کوفہ کا حاکم تھا۔ کندی نے بصرہ اور بغداد میں تعلیم پائی اور مامون و معتصم کے زمانوں میں اپنی ہمہ دانی اور تعمق علمی کی بدولت شہرت پائی۔ اُس نے فلسفہ، ریاضیات، ہیئت، طب، سیاست، موسیقی اور دوسرے مضامین پر کتابیں لکھیں۔ وہ چونکہ یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کی زبانیں اچھی طرح جانتا تھا اور ان کے علوم و فلسفہ پر عبور رکھتا تھا، مامون نے اسے ارسطو اور دوسرے یونانی مصنفین کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرنے پر مامور کیا۔ منک

---

[1] مصنف "گوہر مراد" (جس سے میں آگے چل کر تفصیلی بحث کروں گا) کہتا ہے کہ جنہیں الٰہیات کی زبان میں ملائکہ کہا جاتا ہے حکمت کی زبان میں وہ قوائے فطرت ہیں۔

[2] شہرستانی اور بہت سے فلاسفہ کے نام گنواتا ہے۔ مثلاً یحییٰ نحوی، ابو الفرج مفسر، ابو سلیمان سنجری ابو بکر ثابت بن قرہ ابو سلیمان محمد مقدسی، ابو تمام یوسف بن نیشاپوری، ابو زید احمد بن سہل البلخی ابو محارب الحسن بن سہل بن محارف القمی (Al-Kumi) احمد بن طیب سرخی طلحہ بن محمد نسفی، ابو حامد احمد بن محمد الاسفزاری، عیسیٰ بن علی الوزیر، ابو علی احمد بن مسکویہ، ابو زکریا یحییٰ بن عدی۔
غالباً ابو زکریا یحییٰ بن عدی الصیمری المنطقی، مترجم۔ ابو الحسن عامری۔ وہ کسی اندلسی فلسفی کا نام نہیں لیتا۔

(Munk) کے قول کے مطابق ''کارداں (Cardan) اُسے چوٹی کے اُن بارہ اربابِ فطنت میں شمار کرتا ہے جو سولھویں صدی عیسوی تک دنیا میں آئے۔''

ابونصر فارابی (ابونصر محمد بن محمد ترخان الفارابی) جو ماوراء النہر کے شہر فاراب میں پیدا ہوا، ایک سربرآوردہ طبیب 'طبیعیات دان، ماہر ریاضیات اور فلسفی تھا۔ وہ ارسطو کے شارحین میں سب سے صاحبِ فضیلت اور دقیقہ سنج شمار کیا جاتا ہے۔ اُسے حکمران حلب، سیف الدولہ علی بن حمدان کی سرپرستی حاصل تھی۔ اُس نے دمشق میں ماہِ رجب ۳۳۹ ہجری (مطابق دسمبر ۹۵۰ء) میں وفات پائی۔ ہم اس کی متعدد تصنیفات میں سے چند ایک کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ یہ ظاہر کریں کہ اس زمانہ کثیرالتصنیفی میں ذہن عربی کا رجحان کیا تھا۔ وہ اپنی انسائیکلو پیڈیا ''احصاء العلوم'' میں متداول سائنسوں پر ایک عمومی تبصرہ کرتا ہے۔ اس تصنیف کے ایک لاطینی خلاصے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اُس کے پانچ حصے ہیں جن میں علم کے مختلف شعبوں سے بحث کی گئی ہے یعنی زبان، منطق، ریاضیات، طبیعی سائنس اور سیاسی و معاشرتی اقتصاد، فارابی کی ایک اور تصنیف ارسطو کی ارگنن (Organon) کی شرح تھی جس سے روجر بیکن (Roger Bacon) اور البرٹس میگنس (Albertus Magnus) نے بہت سا استفادہ کیا۔ اُس کا رسالہ ''الجمع بین راس الحکیمین افلاطون الالٰھی وارسطو طالیس۔'' اخلاقیات پر اس کی کتاب ''السیرۃ الفاضلہ'' سیاسیات پر اس کی ''السیاست المدنیہ'' جو ایک ضخیم تر اور جامع تر کتاب ''مبادی الموجودات'' کا ایک حصہ ہے۔ یہ سب کتابیں اس کے دماغ کی ہمہ گیری کی شاہد ہیں۔ فلسفے اور طب کے علاوہ فارابی نے موسیقی کا بھی مطالعہ کیا اور اسے منضبط علم کی حیثیت بخشی۔ اس نے موسیقی کے نظریئے اور فن دونوں پر ساتھ ہی ساتھ آلاتِ موسیقی پر بہت سے رسالے لکھے۔ ان میں سے ایک رسالے میں اُس نے قدماء کے نظامہائے موسیقی کا موازنہ اپنے وقت کے نظامِ موسیقی سے کیا۔ ابوالقاسم، جو کوئی کم پایہ اہل الرائے نہ تھا، فارابی کو ابن سینا کا ہمسر کہتا ہے[1]۔

---

[1] ملاحظہ کیجئے اُس کی 'عیون المسائل' (ریت ری جی کا ایڈیشن صفحہ ۵۲) جہاں وہ استخراجی دلائل سے ثابت کرتا ہے کہ تکوین ایک عقلِ کاملہ کا کام ہے اور اس کائنات میں کوئی چیز اتفاقی یا بے مقصد نہیں۔

ابن سینا کا ایک طبیب کی حیثیت سے میں پہلے ہی تذکرہ کر چکا ہوں۔ ایک فلسفی کی حیثیت سے اس کا مرتبہ کسی طرح ارسطو کے مرتبے سے کم نہیں۔ وہ لاریب اپنے زمانے کا استاد اجل تھا اور اس تعصب و خود غرضی نے اُس کے خلاف جو ہنگامہ برپا کیا اُس کے باوجود وہ بعد میں آنے والے زمانوں کے افکار پر اپنے غیر فانونی نقوش چھوڑ گیا۔ اس کی ضخیم اور کثیر التعداد کتابیں اس کے دماغ کی جامعیت کا ثبوت ہیں[۱] اس نے ارسطو کے فلسفے کو ایک نظام کی صورت میں مرتب کیا اور ارسطو کی نامکمل نفسیات میں خدا اور انسان کے درمیان جو خلا تھا اُسے عقول افلاک کے نظریے سے، جسے اس نے سائنسی قاعدے کے مطابق وضع کیا، پر کر دیا۔ فلاسفہ عربی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ دنیا کو وحدتِ کائنات کا ایک ایسا نظریہ عطا کریں جو نہ صرف ذہن کی بلکہ شعورِ دینی کی بھی تسکین کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے سائنس کے اخلاقی و روحانی پہلو کو اس کے فلسفیانہ پہلو سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اسی کوشش کا نتیجہ تھا اُن کا نظریہ عقلین...... یعنی ایک تو عقل منفعل (یا نفس مجردہ) جو صور مادی سے مس رکھتی ہے اور اس مس کی بدولت تغیر پذیر اور فنا پذیر ہے اور دوسری عقل فعال جس کا تعلق تغیر ناپذیر چیزوں سے ہے اور اس لیے خود بھی متغیر نہیں ہوتی۔ قلب و روح کی جفاکشانہ ریاضت سے انسان عقلِ اعلیٰ کا وصال حاصل کر سکتا ہے لیکن یہ ریاضت صرف ذہنی ہی نہیں بلکہ روحانی و اخلاقی بھی ہونی چاہئے۔ ابن سینا بدرجہ اتم ان خیالات کا نمائندہ تھا۔ وہ اپنے زمانے کے فلسفیانہ ولولوں کا صادق ترین اور مخلص ترین ترجمان تھا۔ اخلاقی سنجیدگی کے معاملے میں ابن سینا کی تعلیمات سے زیادہ رعب انگیز تحریر مشکل ہی سے دست یاب ہوگی۔" اس کی تمام تصنیفات کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے اس پر نہایت منطقیانہ طریقے سے بحث و استدلال کرتا ہے، اُس کی تمام کوششوں کا سب سے بڑا مقصد اس نظریہ کو ثابت کرنا تھا کہ روحِ انسانی اور سبب اول و مطلق کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہے۔ یہی نظریہ جلال الدین رومی کے ہر شعر سے مترشح ہوتا ہے۔

ابن سینا نے اپنی مختلف تصنیفات میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے شہرستانی نے

---

[۱] فلسفے اور سائنس پر اس کی جو دو سب سے بڑی تصانیف ہیں یعنی "شفا" اور "نجات" وہ اب تک صحیح و سالم موجود ہیں۔

ان کا ایک اجمالی لیکن جامع خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ بیان کرنے کے بعد کہ ابن سینا نے مختلف علوم منطق اور متجانس مضامین سے کیونکر بحث کی ہے، شہرستانی کہتا ہے کہ ابن سینا نے اپنے مابعد الطبیعیاتی نظام کو دس مقالوں میں پیش کیا۔ پہلے پانچ مقالوں کے مباحث ہیں علم کی اصل تحریر، استقراء اور استخراج، مادہ اور قوت، علت و معلول کا باہمی تعلق، مبادیات و حادثات، کلیات اور جزئیات۔ چھٹے اور ساتویں مقالے میں وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سبب اوّل، یعنی وہ ہستی جس کا وجود اُس کی ذات کے سبب سے واجب ہے' واحد اور مطلق ہے۔ آٹھویں اور نویں مقالے کے موضوع ہیں' کائنات کی وحدت اور انسانی روح کا تعلق سبب اوّل سے اور عقل فعال سے جو سب سے پہلے خلق کی گئی۔ آخری مقالے میں وہ آئندہ زندگی یعنی معاد کے مسئلے سے بحث کرتا ہے۔ وہ انسانی روح کی انفرادی دائمیت کا اعلان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جسم مادی سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی وہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھے گی، لیکن زندگی معاد میں جو خوشی ہوگی یا غم ہوگا اُس کی نوعیت روحانی ہوگی اور اس کا دارومدار اس پر ہوگا کہ انسان نے کمال حاصل کرنے کی دماغی، اخلاقی اور روحانی قوتوں کا صحیح یا غلط استعمال کیا ہے۔ آخری موضوع کے ضمن میں وہ اس امر پر استدلال کرتا ہے کہ نوع انسانی کو نبوت کی حاجت ہے۔ نبی انسانوں کو قوانین الٰہی سمجھاتا ہے اور ایسی تمثیلوں اور قصوں کی مدد سے جو عوام الناس کی سمجھ میں آسکتے ہیں اور جو اُن کے دل کو لگتے ہیں خدا کے اخلاقی احکام کو ان پر واضح کرتا ہے۔ نبی لوگوں کو رشک وحسد' بغض و کدورت اور افعال شنیع سے باز رکھتا ہے اور معاشرتی اور اخلاقی نشوونما کی بنیادیں ڈالتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ وہ صحیح معنوں میں روئے زمین پر خدا کا پیامبر ہوتا ہے۔

ابو بکر محمد ابن یحیٰی ان الصائغ، جو عام طور پر ابن باجہ کے نام سے مشہور ہے (جسے یورپی شارعین نے بگاڑ کر ایون پاچے (Aven Pace) بنادیا) اعراب اُندلس کے نامور ترین فلاسفہ میں شمار ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف طبیعات، ریاضیات اور ہندسہ میں ممتاز تھا بلکہ صف اوّل کا ماہرِ موسیقی بھی تھا۔ وہ گیارہویں صدی عیسوی کے لگ بھگ سرقسطہ میں پیدا ہوا۔ تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۱۸ء میں وہ اشبیلیہ میں مقیم تھا۔ بعد میں وہ افریقہ چلا گیا، جہاں وہ مرابطین کے دربار میں کسی اونچے عہدے پر فائز ہوا۔ اس کی

رحلت فاس میں ۱۱۳۸ء میں ہوئی۔ اس کی بہت سی تصنیفات بالکل صحیح و سالم ہم تک پہنچی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دماغی کارروائیوں کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔

ابن طفیل (ابوبکر محمد ابن عبدالملک ابن طفیل القیسی) بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں وادی آش میں پیدا ہوا۔ جو غرناطہ کے صوبے کا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ وہ ایک طبیب ریاضیات دان فلسفی اور شاعر کی حیثیت سے مشہور تھا اور الموحد خاندان کے پہلے دو حکمرانوں کے دربار میں ایک معزز عہدے پر مامور تھا۔

اس نے ۱۱۸۵ء میں مراکش میں وفات پائی۔ وہ فلسفہ عربیہ کے استغراقی کتب سے تعلق رکھتا ہے' جسے اشراقیہ کہتے ہیں اور جو افلاطونیت جدیدہ کی ایک شاخ اور ذوق و شوق کے اعتبار سے متاخرین کے تصوف سے مشابہ ہے' لیکن اس کا فلسفہ صوفیانہ وجد پر مبنی نہیں بلکہ ایک ایسے طریقے پر مبنی ہے جس میں وجدان اور استدلال کو یکجا کیا گیا ہے اپنی مشہور کتاب ''حی بن یقظان'' میں اس نے ایک قصے کی صورت میں انسانی عقل وفہم کی تدریجی نشوونما کو بیان کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ایک انسان میں کسی طرح دوسروں کی تعلیم وتربیت کے بغیر ادراک کی قوت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

ابن رُشد (ابوالولید محمد ابن احمد ۵۲۰ ہجری (مطابق ۱۱۲۶ء) میں قرطبہ میں پیدا ہوا، جہاں اُس کا خاندان مدتوں سے ممتاز چلا آرہا تھا۔ اُس کا دادا مرابطین کے عہد میں سارے اُندلس کا قاضی القضاۃ تھا۔ ابن رُشد اصولِ فقہ کا چوٹی کا عالم تھا اسے یعقوب یوسف کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی جہاں اُس کی بہت قدر دانی کی گئی۔ ۷۰-۱۱۶۹ء میں وہ اشبیلیہ کا اور اور ۱۱۸۲ء میں قرطبہ کا قاضی مقرر ہوا۔ جب یعقوب المنصو رموحدوں کے تخت پر بیٹھا تو چند سالوں تک ابن رُشد کی بہت قدر و منزلت ہوتی رہی، لیکن اُس کے بعد جب بربروں کے تعصب کا رکا ہوا سیلاب پھوٹ پڑا تو فقیہوں اور ملاؤں کا عتاب سب سے پہلے اس پر نازل ہوا، کیونکہ ایک تو وہ اس کی فلسفیانہ تصانیف کی بناء پر اُس سے ناراض تھے اور دوسرے اس کی قابلیت وفضیلت کے باعث اس سے حسد کرتے تھے۔

ابن رُشد کا شمار عرب دنیا کے جلیل ترین علماء وفلاسفہ میں ہوتا ہے اور مُنک (Munk) اُسے ارسطو کے سب سے عمیق النظر شارحین کے زمرے میں شامل کرتا ہے۔ ابن رُشد کا عقیدہ

یہ تھا یہ انسان کی بلند ترین مساعی کا مقصد کمال، یعنی عقلِ فعال کل کا وصال حاصل کرنا ہونا چاہئے اور یہ کمال صرف اس طرح حاصل ہوسکتا ہے کہ انسان مطالعہ اور فکر و تامل میں مستغرق رہے اور تمام ایسی خواہشات کو ترک کر دے جو اس کی روح کی سفلی قوتوں سے اور بالخصوص حواس سے تعلق رکھتی ہیں' لیکن محض بے مقصد فکر و تامل کافی نہیں۔ اس کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ نبوی کا وجود ضروری ہے' تا کہ جن دائمی حقائق کا اعلان دین اور فلسفہ دونوں نے کیا ہے اُن کی اشاعت دنیا میں کی جا سکے۔ دین خود اس کی تلقین کرتا ہے کہ علم کے ذریعے اُن حقائق کا تجسس کیا جائے۔ دین اُن حقائق کی تعلیم عام فہم زبان میں دیتا ہے۔ صرف فلسفہ تشریح و تعبیر کے ذریعے دین کی تعلیمات کے حقیقی معنی کو بے نقاب کرسکتا ہے۔ عوام الناس صرف اُن کے لغوی اور ظاہری معانی کو سمجھ سکتے ہیں۔ جہاں تک مسئلہ تقدیر کا تعلق ہے اُس کا خیال تھا کہ انسان نہ تو اپنے اعمال کا کلی طور پر مختار ہے اور نہ غیر متغیر اور اٹل احکام کا حلقہ بگوش لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ سچائی وسط میں ہوتی ہے (الامرین الامرین) یہ وہی الفاظ ہیں جو ائمہ فاطمیہ نے استعمال کئے اور جن کی تصریح اُنہوں نے اسی طریقے پر کی۔ اُس کے نزدیک ہمارے اعمال کسی حد تک ہمارے ارادے پر دار و مدار رکھتے ہیں اور کسی حد تک خارجی اسباب پر۔ ہمیں اس کا اختیار ہے کہ ایک خاص طریقے سے عمل کرنے کی خواہش کریں اور اُسی طریقے سے عمل کریں، لیکن خارجی اسباب ہمارے ارادے پر حدود و قیود عائد کر دیتے ہیں۔ یہ اسباب عام قوانین فطری کی بدولت پیدا ہوتے ہیں اور اُن کا تقدم و تاخر صرف اللہ کو معلوم ہے۔ اسی کو دینیات کی اصطلاح میں قضا و قدر کہتے ہیں۔ ابن رشد کے سیاسی نظریے ہر طرح کے انسانی جبر و استبداد کی مخالفت پر مبنی تھے۔ اس کی رائے میں خلافتِ راشدہ ایک مثالی حکومت اور افلاطون کے خواب کی تعبیر تھی۔ امیر معاویہ نے اُموی ملوکیت قائم کر کے اس خواب کو پریشان کر دیا اور اُمت مسلمہ کو ہر قسم کی آفات کا آماجگاہ بنا دیا۔ ابن رُشد عورتوں کو ہر اعتبار سے مردوں کا ہمسر تصور کرتا تھا اور اُس کا دعویٰ تھا کہ جنگ، فلسفہ، علم غرض ہر قسم کی کارروائی میں وہ مردوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں اس ضمن میں وہ عرب، افریقہ اور یونان کی جنگجو عورتوں کی مثال پیش کرتا ہے۔ بالخصوص موسیقی میں اُن کے تفوق کا ذکر کر کے وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اگر

عورتوں کو وہی حیثیت اور تعلیم و تربیت دی جائے جو مردوں کو حاصل ہوتی ہے تو وہ تمام علوم و فنون میں اپنے شوہروں اور بھائیوں کی برابری کر سکیں گی۔ اُن کی پسماندگی کو وہ اُن کے محدود دائرہ زندگی کی طرح منسوب کرتا ہے۔ ابن رُشد کی تصنیفات میں فلسفہ عرب اپنی معراج کو پہنچ گیا۔ اُس کے اور پیغمبر اسلام ﷺ کے درمیان چھ صدیوں کا فاصلہ تھا۔ ان چھ صدیوں کے دوران عربوں کے ذہن نے ہر جہت میں ترقی کی تھی۔ ابن سینا اور ابن رُشد جیسے لوگوں نے صدیوں کے جمع شدہ گنجینہ علم و دانش کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اُن تمام مہمات مسائل پر غور و فکر کیا جو زمانہ حاضرہ میں انسانی توجہ کا مرکز ہیں اور منطقی صحت و صراحت کے ساتھ اپنے خیالات پیش کئے جو آج کل کے روشن دماغ سے روشن دماغ سائنس دانوں کے خیالات سے بہت تھوڑا اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ سب مفکرین اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور اُس زمانے کے بہترین نفوس اُنہیں مسلمان تسلیم کرتے تھے۔ ابن سینا پر متعصب لوگوں نے یا حاسد دشمنوں نے کفر کے جو فتوے صادر کئے اُس نے غصے اور حقارت کے ساتھ اُن کی تردید کی۔ چنانچہ اسلام کے سب سے بڑے صوفی شعراء میں سے ایک یعنی سنائی نے، جس کی صحیح العقیدگی اس کے ذاتی دشمنوں کی نگاہوں میں تو مشکوک تھی لیکن اور کسی کی نگاہوں میں مشکوک نہیں ''بوعلی سینا'' کو ایک مشہور قصیدے میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

ابن رُشد نے دین اور فلسفہ کی باہمی مطابقت کے موضوع پر قلم اُٹھایا۔ اُس کے عزیز دوستوں میں سے ایک یعنی عبدالکبیر، جو ایک انتہائی متدین شخص تھا، کہتا ہے کہ اس کے دل میں دین و فلسفہ کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی زبردست خواہش تھی۔ انصاری اور عبدالولید دونوں کہتے ہیں کہ ابن رُشد اسلام کا والہ و شیدا تھا۔ اس کا جدید ترین سیرت نگار لکھتا ہے ''ہمیں کوئی چیز یہ تسلیم کرنے سے مانع نہیں کہ ابن رُشد خلوص دل سے اسلام کا معتقد تھا، خاص کر جب ہم اس امر پر غور کریں کہ اس مذہب کے بنیادی ایمانیات میں جو فوق العادۃ عنصر ہے اُس میں کوئی چیز منافی عقل نہیں اور یہ مذہب خالص ترین خدا پرستی (Deism) سے بہت قریب کا تعلق رکھتا ہے۔

دسویں صدی عیسوی کا آخری حصہ عقلیت اور سائنس کے حق میں نحوست کا

زمانہ تھا۔ابن سینا کا ستارہ ابھی طلوع نہ ہوا تھا لیکن کندی وفارابی جیسے اساتذہ عربوں کے آسمانِ علم پر نمودار ہو چکے تھے اور اسے ہمیشہ کے لیے منور کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ اسلامی دنیا کا جو حصہ بھی عباسیوں کے دینی یا دنیوی اقتدار کے زیر سایہ تھا اُس میں قدما پرستی کا دور دورہ تھا جن علمائے معقولات اور فلاسفہ نے مسلمانوں کا نام دنیا کی تاریخ میں روشن کیا تھا، ارباب فقہ نے اُن پر کفر و بدعت کے فتوے عائد کر دیئے تھے۔ اہل دینیات پر ایک بے حسانہ، تنگ نظرانہ اور جابرانہ ظاہر پرستی مستولی تھی۔ ایک ریا کارانہ عیش پرستی نے امیروں پر اور ایک جاہلانہ تعصب نے غریبوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ تاریکی روز بروز بڑھتی چلی جارہی تھی اور اسلام کے قدم ڈگمگاتے ہوئے اُسی گڑھے کی طرف جارہے تھے جس میں کلیسائیت نے مذہب عیسوی کو گرایا تھا۔ شیدائیانِ حق کے لیے یہ مصیبت اور غم کا زمانہ تھا۔ ایسے میں مفکرین کی ایک چھوٹی سی جماعت نے مسلمانوں کی شمع علم کو روشن رکھنے، عوام کے مزاج میں صحت پیدا کرنے مسلمانوں کو جہالت و تعصب کے بیابان کی طرف رواں دواں جانے سے روکنے، القصہ ملت کے شیرازے کو درہم برہم ہونے سے بچانے کی خاطر ایک انجمن قائم کی۔ اس انجمن کا نام اخوان الصفا تھا۔ یہ انجمن بصرے میں قائم ہوئی، جو خلافت کی تیزی سے مٹتی ہوئی مملکت میں دوسرے درجے کا شہر اور عقلی و فکری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اخوان الصفا میں صرف بے عیب سیرت اور اخلاق حمیدہ رکھنے والے لوگوں کو شمولیت کی اجازت تھی: اس حلقہ خواص میں داخلے کے لیے جو پروانہ راہداری درکار تھا وہ شیفتگی علم اور انسان دوستی تھا۔ اس میں کسی قسم کی علیٰحدگی پسندی یا رمزیت نہ تھی۔ البتہ حالاتِ وقت کے اقتضاء کے باعث اور اس زمانے میں جس مذہبی و سماجی آمریت کا دور دورہ تھا، اس کے خیال سے اُسے اپنی نقل و حرکت کو کسی حد تک پردے میں رکھنا پڑتا تھا۔ اخوان الصفا خاموشی سے اپنے سربراہ زید بن رفاعہ کے مکان پر جمع ہوتے تھے اور ہر طرح کے فلسفیانہ اور اخلاقی مسائل پر ایسی بے تکلفی اور وسیع المشربی سے تبادلہ خیال کرتے تھے کہ اس کی نظیر ہمارے زمانے میں بھی مشکل سے ملے گی۔ مملکت کے ہر شہر میں اور جہاں کہیں بھی انہیں ایسے اربابِ فکر ملے جو اُن کے سائنسی طریقے پر عمل کرنے کی خواہش اور قابلیت رکھتے تھے، اُنہوں نے اپنی شاخیں قائم کیں۔

اس انسان دوست اور علم نواز جماعت کے سرخیل زید بن رفاعہ کے علاوہ پانچ اشخاص تھے جو اس کی روح رواں تھے۔ اُن کا مسلک صحیح اور بہترین معنوں میں خذ ما صفا تھا۔ انہوں نے کسی میدانِ فکر کو رد نہ کیا بلکہ ہر گلشن کی گلچینی کی۔ اگر چہ اُن کے فلسفیانہ تصورات پر تصوف کا ہلکا سا رنگ چڑھا ہوا، تاہم معاشرتی اور سیاسی مسائل پر اُن کے خیالات بڑی حد تک عملی اور انسان نواز تھے۔ انہوں نے دنیا کو اس زمانے کی معلومات کا ایک خلاصہ متعدد رسالوں کی صورت میں عطا کیا[1] جنہیں مجموعی طور پر رسائل اخوان الصفا وخلان الوفا کا نام دیا گیا ہے۔ مخففاً اُن کا ذکر عام طور پر اخوان الصفا کے نام سے کیا جاتا ہے۔ یہ رسالے مطالعہ انسانی کے ہر موضوع کو محیط ہیں۔ مثلاً ریاضیات' ہیئت' طبیعی جغرافیہ' موسیقی، جرثقیل' طبیعیات' کیمیائیات' موسمیات' ارضیات (طبقات الارض) حیاتیات' عضویات (علم الابدان) نباتات، منطق، صرف ونحو، مابعد الطبیعیات' اخلاقیات اور مسئلہ معاد۔ سچ تو یہ ہے کہ رسالے اس زمانے کے فلسفے اور تمام علوم متداولہ کی ایک قاموس ہیں۔ حیوانات کے جسم نامی کی قرن بہ قرن نشوونما کے بارے میں دسویں صدی عیسوی کے ان ارتقائیین (Evolutionists) کا جو نظریہ تھا اس کا مقابلہ آج کل کے مقبولِ عام نظریے سے کیا جائے تو وہ کسی طرح ادنیٰ نہ پایا جائے گا۔ بہر حال مجھے اُن کی تصنیفات کے سائنسی اور عقلی پہلوؤں سے اتنا سروکار نہیں جتنا اُن کے اخلاقی پہلو سے ہے۔ اخوان الصفا کی اخلاقیات کی بنا مطالعہ نفس اور انسانی خیالات کے تزکیہ وتصفیہ پر تھی۔ انہوں نے ملکہ اخلاقی کو ملکہ دماغی سے اونچا درجہ دیا۔ جفاکشانہ ریاضتِ نفس اور ضبطِ نفس پر مبنی قوتِ روحانی کو وہ افضل المحاسن شمار کرتے تھے۔ "عمل کے بغیر عقیدہ، جاننا عبث ہے۔ صبر وتحمل، نرمی وشفقت، عدل، رحم صداقت، فضیلت تقویٰ، دوسروں کی خاطر ایثارِ نفس' یہ ہیں وہ فضائل جن کی ہر سطر میں تعلیم دی گئی ہے۔ منافقت، ریاکاری، دغابازی، رشک وحسد، کبر وغرور، ظلم وستم، دروغ گوئی، یہ ہیں وہ رذائل جن کی ہر صفحے پر مذمت کی گئی ہے۔ جذبات کی پاکیزگی' انسانوں سے گرم جوشی محبت' انسانی ترقی پر راسخ ایمان، عالمگیر عطا واحسان جس نے بے زبان مخلوق کو بھی اپنے آغوش میں لے رکھا ہے' یہ ہیں وہ اوصاف جو تمام

[1] ان رسائل کو حاجی نور الدین نے چار جلدوں میں ترتیب دے کر ۱۳۰۵ء میں بمبئی سے شائع کیا۔

رسائل میں شروع سے لے کر اخیر تک رچے ہوئے ہیں۔ انسانوں اور حیوانوں کے درمیان جو مناظرہ ہے اس سے بڑھ کر خوبصورت اور کریم النفسی سے مملو عبارت کون سی ہو سکتی ہے؟ اُن کا فلسفہ اخلاق اُن کے بعد کی تمام اخلاقیاتی تحریروں کی اساس ہے۔ اُن کے مذہبی خیالات وہی تھے جو فارابی اور ابن سینا کے تھے، یعنی یہ کہ کائنات ذاتِ باری سے صادر ہوئی لیکن براہِ راست صادر نہیں ہوئی۔ سبب مطلق اول نے عقل یا ادراک عاملہ کو پیدا کیا۔ اُس سے نفس نفوس پیدا ہوا پھر اُس سے مادہ اولیٰ وجود میں آیا جو تمام اشیائے مادی کا مخزن مایہ یا مادہ حیات ہے۔ ادراک عاملہ نے اس مادہ اولیٰ کو صورت پذیر کیا اور حرکت بخشی، جس سے افلاک اور سیارے ظہور میں آئے۔ اخوان الصفا کا فلسفہ اخلاق اس مقدمے پر مبنی ہے کہ سبب مطلق اول اپنی اسفل ترین مخلوق کے ساتھ ایک غیر منقطع سلسلے کے ذریعے مربوط ہے، کیونکہ نفسِ نفوس جس نے انسانوں کی صورت میں انفرادیت پائی ہمیشہ اس جدو جہد میں منہمک رہتا ہے کہ پاکیزہ زندگی، ضبطِ نفس اور ذہنی سرگرمی کی بدولت کمال کی منزل مقصود کو پالے یعنی اپنے منبع و مصدر کی طرف مراجعت کرے۔ یہی وہ معاد ہے جس کی تعلیم ہادی اسلام نے دی یہی وہ سکون اور قرار ہے جس کا وعدہ صحیفہ آسمانی نے کیا۔ یہ تھا اخوان الصفا کا طریقہ تعلیم ۔ ہم اُن کی نفسیات کے بارے میں چاہے کوئی رائے قائم کریں، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے جو اخلاقی تعلیم دی اس سے بلند تعلیم اور کسی نے نہیں دی۔ یہ تعلیم اُن علمائے دینیات کی تعلیم سے بالکل مختلف تھی جنہوں نے متشدد مستنجد کو اس پر آمادہ کیا کہ اخوان الصفا کی قاموس العلوم کو بغداد میں نذرِ آتش کردے۔ کچھ مدت کے بعد بغداد خود منگولوں کے ہاتھوں نذرِ آتش ہو گیا۔

لیکن ارسطو کا فلسفہ جو مشاہدے اور تجربے پر مبنی تھا، اخلاق سے بڑھ کر عربوں کے قطعیت پسند مزاج سے موافقت رکھتا تھا۔ چنانچہ قدرتی طور پر ارسطوی منطق اور مابعد الطبیعیات نے عرب سائنسدانوں اور عالموں کے تصورات پر بڑا اثر کیا۔ افلاطونیت جدیدہ نے، جو وجدان و ذوق اور ایک مبہم سے صوفیانہ استغراق پر مبنی تھی، اُس وقت تک اُن میں نفوذ نہ کیا جب تک شیخ شہاب الدین سہروردی نے اُسے مقبولیت نہ بخشی۔ لہٰذا سبب اول کا جو تصور ارسطو نے پیش کیا تھا وہ اس زمانے کی زیادہ تر فلسفیانہ اور مابعد

الطبیعیاتی تصانیف میں رچا ہوا دکھائی دیتا ہے اور یہ ارسطو کے اثرات کا ہی نتیجہ تھا کہ قدامت مادہ کے عقیدے کی طرف عرب مفکرین کے ایک گروہ کا میلان تھا۔ ان لوگوں کو دہریہ کا لقب دیا گیا (دہر بمعنی فطرت) کریمر (Kremer) کے قول کے مطابق "ان فلسفیوں کا بنیادی خیال وہی تھا جو آج کل طبیعی سائنس کے پھیل جانے کی وجہ سے مقبول ہے" لیکن وہ خدا کے منکر (Atheists) نہ تھے، جیسا کہ اُن کے دشمنوں نے اُن کے بارے میں کہا ہے۔ خدائی سے انکار کے معنی ہیں مرئی اور مادی کائنات سے باہر اور ماوراء کسی قوت یا علت کے وجود کو تسلیم نہ کرنا۔ یہ لوگ اُن معنوں میں منکرینِ خدا نہ تھے۔ اُن کا کہنا صرف یہ تھا کہ مسبب الاسباب پر نہ کسی قسم کی صفات محمول کی جا سکتی ہیں نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کائنات پر اس کا فعل کس طریقے سے واقع ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ لوگ تعلیل لاادریت (Agnosticism) کے نظریئے کے پیش کرنے والے تھے۔

ان واقعات سے صاف طور ظاہر ہے کہ اسلام محمدی میں کوئی بات ایسی نہیں جو ترقی یا عقل انسانی کی نشوونما کے منافی ہو۔ پھر ایسا کیونکر ہوا کہ بارہویں صدی عیسوی کے بعد مسلمانوں کے یہاں تقریباً کلی طور پر ختم ہو گیا اور ایک عقلیت سوز قدماء پرستی نے اُن پر غلبہ پالیا؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ مسئلہ قضاء وقدر، اگرچہ وہ قرآنی تعلیمات کا صرف ایک پہلو تھا، مسلمانوں کی اکثریت کا بنیادی عقیدہ بن گیا ہے؟ جہاں تک فلسفے کے مسلمانوں کے یہاں محو ہو جانے کا تعلق ہے، ایران میں شاہانِ صفوی کے تحت ابن سینا کے مسلک کا جو احیاء ہوا غالباً یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ عقلیت اور آزادی فکر مسلمانوں کے یہاں بالکل مردہ نہیں ہو گئی۔ لیکن میں نے جو سوال اُٹھائے ہیں اُن کا اطلاق عامتہ المسلمین پر ہوتا ہے اور میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ جس صورت حال سے یہ سوال متعلق ہیں وہ کیونکر پیدا ہوئی۔

عباسی خلیفہ متوکل کی تخت نشینی سے پہلے اسلام کا وہی حال تھا جو سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں عیسائیت کا تھا۔ اسلام اُس وقت دو بڑے بڑے مخالف فرقوں میں بٹا ہوا تھا، ایک نقل کا دوسرا عقل کا۔ اربابِ نقل اس کے قائل تھے کہ فطری اور مافوق الفطرت دونوں قسم کے امور میں انسان کو مقدم نظائر سے ہدایت حاصل کرنی چاہئے۔

اربابِ عقل کا عقیدہ یہ تھا کہ اُسے اپنی ذاتی رائے پر اعتماد کرنا چاہیے۔ البتہ جس حد تک نظائر قابلِ عمل ہوں اُس حد تک اُن سے بھی ہدایت حاصل کرنی چاہیے۔ ان دو فرقوں کے اختلافات اتنے شدید تھے کہ اُن میں موافقت پیدا کرنا ناممکن تھا۔ ارباب عقل زیادہ تر اہل فقہ تھے۔ یہ وہ طبقہ ہے جسے ہر زمانے اور ہر ملک میں بجا طور پر تنگ خیال خود رائے اور اپنے مفادات کے بارے میں متقشف سمجھا گیا ہے۔ جمہورِ انام اس طبقے کے حامی اور تابع تھے۔ ''بشپ کا جو مذہب ہوتا ہے وہی بنیئے کا بھی ہوتا ہے۔ لیکن بنیے کا فلسفہ کسی طرح پروفیسر کا فلسفہ نہیں ہوتا۔ اس لیے بشپ کی تو عزت کی جاتی ہے لیکن پروفیسر کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ عقل وہ چیز ہے جس کی خصوصی ملکیت کا انسان دعویدار ہے۔ یہ وہ واحد امتیاز ہے جو حدود عائد کرتا ہے۔ چنانچہ عوام الناس حسب ونسب یا دولت کی بزرگی کو تو بخوشی تسلیم کرتے ہیں لیکن عقل کی بزرگی کو تسلیم کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔''

جیسا کہ میں پہلے کے ایک باب میں ذکر کر چکا ہوں، پیغمبر اسلام ﷺ نے جو قانونی احکام یا فیصلے صادر کیے وہ ایک نیم متمدن اور پرانی وضع کے معاشرے کی ضروریات پر مبنی تھے۔ آپ ﷺ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دینِ اسلام کے حقائق کی توضیح کی۔ قرآن میں تشریعی احکام بہت کم تھے اور جتنے تھے وہ بھی ایسے تھے کہ اُن کی تعمیل حالات کے مطابق کی جا سکتی تھی۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اُن کی توضیح و تشریح زیادہ تر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے شاگرد حضرت ابن عباس نے کی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اُن لوگوں نے جو اُن کے خطبوں سے فیض یاب ہوئے تھے اپنے طور پر فقہ کی درسگاہیں کھول لیں۔ چنانچہ اربابِ فقہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ لوگ دینی اور شرعی مسائل پر بحث کرتے تھے، تاویلوں کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے تھے اور مذہبی آداب و رسوم اور زندگی کے روزانہ معاملوں پر روشنی ڈالتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ عوام کے ضمیر کے محافظ و امین بن گئے۔ ہر مسلمان کو قدرتی طور پر یہ دریافت کرنے کا شوق تھا کہ شارع اسلام ﷺ نے مختلف حالات میں کیا کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روائتوں کا انبار لگ گیا۔ لیکن دبستان مدینہ کے سوا کہیں بھی کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ آنحضرت ﷺ کے ابتدائی جانشین ایک معین اصول

پرکاربند تھے۔ وہ یہ کہ اگر انہیں نبوی ﷺ یا خلافت علوی کی کوئی نظیر مل جاتی جس کی توثیق اہل بیت نے کی تھی اور جس کا اطلاق زیر غور حالات پر ہو سکتا تھا، تو وہ اُسے اپنے فیصلے کی بنیاد بناتے۔ اگر ایسی کوئی نظیر نہ ملتی تو وہ اپنے ذاتی اجتہاد پر اعتماد کرتے۔ قانون اُن کے نزدیک استقرائی اور تجربی تھا۔ چنانچہ وہ ہر صورت حال کے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق حکم لگاتے تھے۔ ابتدائی خلفائے بنی اُمیہ کے زمانے میں کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ صوبوں کے عمال اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور بزور شمشیر انہیں منواتے تھے۔ انفرادی ضمیر کے معاملات کو فقیہوں پر چھوڑ دیتے تھے لیکن بعد کے اموی خلفاء کے تحت مفتیوں کو بڑا اقتدار حاصل ہو گیا، خاص کر اس وجہ سے کہ عوام میں اُن کا بول بالا تھا۔ جب عباسی مسند نشین ہوئے تو اس وقت امام جعفر صادق کی درسگاہ میں دو ایسے شخص تحصیل علم کر رہے تھے جن کا شمار بعد میں سنی مذہب کے ائمہ مجتہدین میں ہوا، یعنی امام ابوحنیفہ اور امام مالک بن انس۔ ابوحنیفہ عراق کے باشندے تھے اور مالک مدینے کے۔ دونوں نہایت متقی و پرہیزگار اور کریم النفس تھے اور دونوں کے دل میں دین کی بنیادوں کو وسیع تر بنانے کا ولولہ تھا۔ دونوں اہل بیت کے شیدائی تھے اور اس وجہ سے دونوں نے تکلیفیں اُٹھائیں۔ امام ابوحنیفہ نے کوفہ واپس آ کر ایک درسگاہ کھولی جس کی بناء پر حنفی مذہب کی عظیم عمارت کھڑی ہوئی۔ انہوں نے بیشتر روایات کو غیر صحیح قرار دے کر رد کر دیا اور صرف قرآن پر اعتماد کیا[1]۔ نظائر و اشباہ سے کام لے کر اُنہوں نے سیدھے سادے احکام کو ہر طرح کے حالات پر اطلاق کے قابل بنا دیا۔ ابوحنیفہ دنیا دار آدمی نہ تھے اور اُنہوں نے مدینہ و بغداد کے سوا کوئی شہر نہ دیکھا تھا۔ نتیجۃً وہ ایک قیاسی مقنن تھے۔ بہرحال اُن کے خیالات کو اُن کے دو شاگردوں نے منضبط کیا، یعنی ابو یوسف نے، جو بعد میں بغداد کے قاضی القضاۃ بنے اور محمد الشیبانی نے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا طریق کار جدا تھا۔ اُنہوں نے ہر طرح کے استنباط اور استخراج کو رد کر دیا۔ اس کے بجائے اُنہوں نے مدینے میں، جہاں

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ حضرات حنفیہ کے ہاں احادیث کے اخذ ورد کے سلسلہ میں اپنے اصول اور پیمانے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ فقہ حنفی کی اساس صرف قرآن ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ حنفی کی عمارت کو تین واضح بنیادوں پر استوار کیا ہے۔ قرآن، سنت مشورہ اور قیاس

رسولِ خدا کی باتیں ابھی تک لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ تھیں، آنحضرت ﷺ کی زندگی کے ہر حقیقی یا قیاسی واقعے کے بارے میں معلومات جمع کیں اور اُنہیں اپنے نظریوں کی اساس بنایا۔ ان کا مسلک ''جادہ پامال'' کی راہ نوردی تھا۔ سیدھے سادے عربوں اور افریقی قبائلیوں کے لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے صریح احکام جواُن کے قدیم الوضع معاشروں کے حسب حال تھے ائمہ فاطمیہ کی مدلل آراء اور امام ابوحنیفہ کے قیاسی نظریوں کی بہ نسبت زیادہ قابلِ قبول تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ عرصہ بعد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ آئے۔ وہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی بہ نسبت دنیا کے معاملات سے زیادہ واقفیت بھی رکھتے تھے اور ابو یوسف اور محمد الشیبانی کی بہ نسبت منطقی موشگافیوں کے کم دلدادہ بھی تھے۔ اُنہوں نے وہ مواد لے کو جو امام جعفر صادق امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فراہم کیا تھا ایک اخاذ مسلک کی بنیاد رکھی جسے متوسط طبقے کے لوگوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کا مسلک اصلی حنفی مسلک کی بہ نسبت ایک روز بروز بڑھتی ہوئی اور ملی جلی آبادی کی بدلتی ہوئی ضرورتوں سے تطبیق کی تو کم صلاحیت رکھتا تھا، پھر بھی اس میں اصلاح پذیری کا اتنا مادہ تھا کہ اگر قرون مابعد کی ظاہر پرستی اس کی عملی افادیت کو تباہ نہ کر دیتی تو وہ بہت منفعت بخش ثابت ہوتا[1] بہر حال اس طرح عقیدہ و قانون کے چار مختلف مذاہب' جو ایک دوسرے سے بڑی حد تک ممتاز تھے' دنیائے اسلام میں رائج ہو گئے۔ فاطمی مذہب زیادہ تر شیعوں میں رائج تھا جو اسلامی مملکت کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے تھے، مالکی مذہب جزیرہ نمائے عرب کے بہت سے عربوں میں، بربروں میں اور ہسپانوی مسلمانوں میں مقبول تھا۔ شافعی مذہب متمول طبقوں میں متداول تھا اور حنفی مذہب کے پیرو ایشیائے کوچک، شام اور مصر کے معزز طبقے تھے حنفی مذہب کو خلافت کے زمانے میں جو حیثیت حاصل تھی وہ اُس حیثیت سے مشابہ تھی جو فریسیت کو یہودیوں میں حاصل رہی تھی اسے دربار کی سرپرستی نصیب تھی، اس لیے وہ واحد مذہب تھا جس میں اتنی وسعت تھی کہ ایک مخلوط آبادی کی ضرورتیں پوری کر سکے۔ فاطمی مسلک کے قبول کرنے میں یہ خدشہ تھا کہ جانشینانِ نبی کو بہت وقعت مل جاتی۔ مالکی اور شافعی مسالک ایک وسیع المشرب مملکت کے تقاضوں کے لیے موزوں نہ تھے

[1] شافعی مذہب ہندوستان کے تعلیم یافتہ حنفی طبقوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔

اور اگر انہیں اختیار کیا جاتا تو مملکت کے مفادات خطرے میں پڑ جاتے۔ چنانچہ یہ ہوا کہ جامعوں اور مدرسوں میں تو عقلیت کا طوطی بولتا تھا، لیکن منبروں پر اور عدالتوں میں حنفیت کی جلوہ گری تھی۔ الٰہیاتی مسائل میں حنفیت مسلک صفاتیہ کی طرف مائل تھی، لیکن وہ بادشاہِ وقت کے خیالات کے مطابق اپنی آراء میں ردو بدل کر لیتی تھی۔ اس زمانے میں اس کی یہ ایک امتیازی صفت تھی۔ یہ حالات تھے جن میں امام احمد بن حنبل (جو عموماً امام حنبل کے نام سے مشہور ہیں) منظرِ عام پر آئے۔ وہ انتہائی درجے کے متشرع تھے اور کسی قسم کے اختلاف رائے کے متحمل نہ ہوتے تھے۔ انہیں نہ حنفی مسلک کی فریسیانہ آزاد منشی پسند آئی، نہ مالکی مسلک کی تنگ خیالی، نہ شافعی مسلک کی پیش پا اُفتادہ روش۔ چنانچہ انہوں نے ساری مملکت اسلامیہ کے لیے ایک نیا مسلک ایجاد کیا جو تمام و کمال حدیث پر مبنی تھا۔ امام ابوحنیفہ نے بیشتر متداول حدیثوں کو مسترد کر دیا تھا۔ امام ابن حنبل نے اپنے نظام فقہ میں بہت سی متناقض، مستبعد اور عقل کو خیرہ کر دینے والی روایتیں شامل کیں جو اَنمل بے جوڑ تھیں اور بدیہی طور پر گھڑی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اس وقت سے ترقی پسند اور رجعت پسندی کے طرفداروں میں ایک شدید چپقلش شروع ہوگئی۔ ابن حنبل نے صفاتیہ کے انتہا پسندانہ خیالات کو قبول کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ذات باری کو آنکھوں سے دیکھنا ممکن ہے، اس کی صفات اس کی ذات سے علیحدہ ہیں، یہ بیان کہ خدا عرش بریں پر متمکن ہے لغوی معنوں میں صحیح ہے، انسان کسی لحاظ سے ممتاز نہیں، ہر فعلِ انسانی بلاواسطہ فعلِ الٰہی ہے، وعلیٰ ہذا القیاس۔ انہوں نے علوم عقلی و تجربی کو مذموم قرار دیا[1] اور عقیدت کے برخلاف اعلان جہاد کیا۔ عامتہ الناس نے اُن کی وضاحت و بلاغت اور جوش و خروش سے مرعوب ہو کر اُن باتوں پر آمنا و صدقنا کہا۔ حنفی فقیہوں نے بھی، جن کا اقتدار عوام میں ہر دلعزیز ہونے پر موقوف تھا اور جو اس قدر و منزلت پر رشک کرتے تھے جو سائنسدانوں اور فلسفیوں کو ہارون و مامون کے دربار میں حاصل تھی، اس نئے مصلح کی ہاں میں ہاں ملائی۔ چنانچہ منبروں پر سے عقلیت کے حامیوں اور فلسفہ و سائنس کے خادموں پر آتش جہنم کے

---

[1] علامہ ابن تیمیہ نے حضرت الامام کی تصریحات کی روشنی میں اس حقیقت کی وضاحت فرمادی ہے کہ آپ نے صرف اس علم الکلام اور فلسفہ کی تردید کی ہے جو غلط، گمراہ کن اور غیر واضح تھا۔ مطلقاً علوم عقلیہ یا علوم تجربیہ کی نہیں۔

شعلے برسنے لگے اور بغداد کے کوچہ و بازار میں آئے دن خونریز جھڑپیں ہونے لگیں۔ بالآخر معتصم اور واثق نے سختی سے ان مذہبی دیوانوں کے تشدد کی روک تھام کی۔ امام ابن حنبل کو قید خانے میں ڈال دیا گیا، جہاں اُن کی وفات ہوئی۔ اُن کے جنازے میں ایک لاکھ چالیس ہزار مرد و عورت شریک ہوئے۔ حنبلی مذہب کو پیرو کاروں کی کوئی کثیر تعداد تو نصیب نہ ہوئی، لیکن اس نے حنفی مذہب سے مل کر اُسے ایک نئی شکل دے دی۔ چنانچہ اس کے بعد سے حنفی مذہب امام ابوحنیفہ اور امام ابن حنبل کی تعلیمات کا اک مخلوط مجموعہ بن گیا۔

متوکل کے تخت نشین ہونے کے وقت مختلف فرقوں کی صورتِ حال حسب ذیل تھی:۔ علمائے معقولات امورِ مملکت کے ناظم و مہتمم تھے۔ وہ اختیار و اعتبار والے تمام عہدوں پر مامور تھے' وہ کالجوں کے پروفیسر تھے، شفاخانوں کے نگراں تھے' رصد گاہوں کے منتظم تھے' تجارتی کاروبار کے سربراہ تھے' غرض انہیں مملکت کے علم و دانش اور مال و دولت دونوں کی نمائندگی نصیب تھی۔ عقلیت تعلیم یافتہ لوگوں، ارباب دانش اور ذی اثر طبقے کا مسلک غالب تھی۔ مسلک صفاتیہ معاشرے کے نچلے طبقوں میں مقبول تھا، چنانچہ بیشتر قاضی مدرس اور وکیل اس کے پیرو تھے۔ متوکل نے جو ایک جفا پیشہ حکمران ورند میخوار تھا اور جس پر وقتاً فوقتاً دیوانگی کے دورے بھی پڑا کرتے تھے، مصلحت اس میں دیکھی کہ موخر الذکر طبقے کے ساتھ اتحاد کرے اس سے اُسے عوام کا ہر دلعزیز خلیفہ بھی اور کٹ ملاؤں کا ممدوح بھی بننے کی اُمید تھی۔ چنانچہ اس نے ترقی پسندوں کو تمام سرکاری عہدوں سے خارج کرنے کا فرمان جاری کیا۔ کالج اور یونیورسٹیاں بند کردی گئیں۔ ادب، سائنس اور فلسفہ کو ممنوع قرار دے دیا گیا اور علمائے معقولات کو بغداد سے شہر بدر کر دیا گیا۔ متوکل نے اسی پر قناعت نہ کی بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اُن کے فرزندوں کے مقبرے بھی مسمار کر ادیئے۔ متعصب فقہاء جواب اسلام کے موباد اور مربی بن گئے تھے، امور سلطنت کے مختارِ کار ہو گئے۔ متوکل کی موت اور منصور کی مسند نشینی نے ایک بار پھر ترقی پسندوں کو غلبہ بخشا۔ لیکن اُن کی ظفر مندی مختصر المیعاد ثابت ہوئی۔ بے رحم اور خونخوار معتضد باللہ کے تحت ملائیت اور قدامت پرستی نے از سرنو اقتدار پر مکمل قبضہ کرلیا۔ اس نے علمائے معقول کو بری طرح ستایا۔ اُن کی تعلیم یہ تھی کہ عدل اعمال انسانی کی روح رواں ہے خدا خود

عدل کے ذریعے کائنات پر حکمران ہے بلکہ عدل اس کی ذات اس کا جوہر ہے۔ خیر و شر کا معیار انفرادی ارادہ نہیں بلکہ نوعِ بشر کی صلاح و فلاح ہے۔ یہ نظریے بلا کے انقلاب انگیز تھے، کیونکہ اُن کا ہدف خلیفہ کا حق غلط کاری تھا۔ اس سے بدتر باتیں تو تام پین بھی نہ کہہ سکتا تھا۔ اس کے برعکس ملاؤں کی تعلیم یہ تھی کہ "خدا بادشاہ ہے، چونکہ بادشاہ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔" اس بارے میں کیا شک ہوسکتا ہے کہ ان مخالف نظریوں میں سے کون سا سچا تھا؟ بہر حال اب عباسیوں کے تحت عقلیت کا دور ختم ہو چکا تھا۔ بغداد سے شہر بدر ہو کر اس نے قاہرہ میں پناہ لی۔ لیکن وہاں اُسے پناہ تو کیا ملتی، اُس کی حالت اور بھی بری ہوگئی۔ عباسیوں کو قاہرہ اور قاہرہ کی ہر چیز سے انتہائی نفرت تھی اور بغداد کے مسلم پاپاؤں کو عقلیت کے نام سے بھی چڑ تھی۔ چنانچہ فقہ کا ایک دار العلوم قائم کیا گیا اس کا مقصد یہ تھا کہ جو سائنسدان اور فلسفی ابھی تک ملائیت کے حلقہ اثر کے اندر رہتے تھے اُن کی تصنیفات کی چھان بین کی جائے، اور یہ دریافت کیا جائے کہ ان تصنیفات میں کفر و الحاد اور بدعت کا عنصر کہاں تک موجود ہے۔ جن جن تصنیفات میں عقلیت کا شائبہ بھی پایا گیا وہ جلا کر راکھ کر دی گئیں اور اُن کے مصنفین کو سزائیں دی گئیں بلکہ بعض کو قتل کر دیا گیا۔ اب عالمِ اسلام کی ہیئت کذائی وہی ہوگئی جو قدامت پرست عیسائیت کی تھی۔ اس سے پہلے ایک قوت تھا جب ملکی طاقت کی مخالفت کے باوجود عقلیت کے لیے یہ ممکن تھا کہ عوام کے دلوں پر سکہ بٹھا لیتی۔ ملاؤں نے جب کبھی علمائے عقلی سے مناظرہ کیا شکست کھائی اور اگرچہ ایسے موقعوں پر وہ اکثر تلوار اور سنگ و خشت کے دلائل سے بھی کام لیتے تھے، پھر بھی مناظرے میں اُن کی ہار کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور اُن کے پیروؤں پر پڑتا تھا۔ ایسے میں رجعت پسندوں کو ایک غیر متوقع معاون مل گیا۔ اب تک ان کے اسلحہ خانے میں صرف روایت کے ہتھیار تھے۔ اس معاون نے انہیں ایک نیا حربہ مہیا کیا۔ امام ابوالحسن الاشعری[1] ان مشہور ابو موسیٰ الاشعری کی اولاد سے تھے جن سے عمرو بن العاص نے

---

[1] اما اشعری ۲۶۰ ہجری (مطابق ۸۷۴ء) میں بصرے میں پیدا ہوئے لیکن انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بغداد میں گزارا۔ چالیس سال کی عمر تک وہ معتزلہ کے پیرو تھے۔ اعتزال سے انحراف کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ رمضان کے مہینے میں ایک رات رسول خدا ﷺ نے انہیں خواب میں اس کی ہدایت کی۔

حضرت علیؓ کی برطرفی کا اعلان کرایا تھا ان کی تعلیم معتزلہ کے طریقے میں ہوئی اور انہوں نے معتزلہ کی منطق، فلسفہ اور طرزِ استدلال سب کچھ سیکھا۔ ایک دن انہوں نے بصرے کی جامع مسجد میں ایک بڑے مجمع کے سامنے معتزلہ کے عقائد ترک کرنے اور صفاتیہ کے عقائد اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ ان کے مؤثر اور بلیغ طرز کلام سے لوگ مرعوب ہوگئے اور جو لوگ ڈانواں ڈول تھے وہ فوراً اُن کے پیچھے ہو لئے۔ بہت جلد علمائے خلافت میں انہیں چوٹی کا درجہ حاصل ہوگیا۔ فقہاء اُن کی ہر بات مانتے تھے، عوام اُن کے گرویدہ تھے اور خلیفہ اُن کی عزت کرتا تھا۔ امام اشعری نے ملائیت کو وہ چیز عطا کر دی جس کی حاجت اُسے مدتوں سے محسوس ہو رہی تھی، یعنی معتزلہ، فلاسفہ اور ائمۃ فاطمیہ کے عقلی نظریوں کے ردو ابطال اور قدامت پسندانہ دینیات کے اثبات کے لیے ایک منطقی نظم یا کم از کم ایک ایسا طریقِ استدلال جسے منطقی کہا جا سکتا تھا۔

ہم امام اشعری کے عقائد کا ایک خلاصہ پیش کرتے ہیں جو شہرستانی سے ملخص ہے اور جس سے عام مسلمانوں کے موجود ذہنی جمود کے اسباب کا پتہ چلتا ہے۔ ''ان کا اعتقاد تھا کہ خدا کی صفات ازلی اور اس کی ذات میں موجود ہیں' لیکن وہ محض اس کی ذات نہیں، بلکہ اُس پر ایک اضافہ ہیں...... وہ ایک قدیم کلام کے ذریعے بولتا ہے اور ایک قدیم ارادے کے ذریعے چاہتا ہے، کیونکہ خدا بداہتہً ایک بادشاہ ہے اور ایک بادشاہ کی حیثیت سے امر و نہی کا اختیار رکھتا ہے۔ اس لیے وہ امر و نہی صادر کرتا ہے...... خدا کا حکم قدیم ہے' اُس کے اندر موجود ہے اور اس کی ایک صفت ہے۔ خدا کا ارادہ غیر منقسم، ازلی وابدی اور تمام ایسی چیزوں کو محیط ہے جو ارادے کی تابع ہیں' چاہے وہ کو داس کے اعمال ہوں یا اس کے بندوں کے مکتسب افعال۔ خدا ہر چیز کا اخلاقاً ارادہ کرتا ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد، نافع ہو یا مضر۔ خدا چونکہ علم بھی رکھتا ہے اور ارادہ بھی لہٰذا وہ بندوں کے ایسے افعال کا ارادہ کرتا ہے جن کا اُسے علم ہوتا ہے اور جو لوحِ محفوظ میں مندرج ہیں۔ یہ مقدم علم ہی اس کا حکم ہے' اس کا فیصلہ ہے اور اس کی مشیت ہے۔ اس میں کوئی ردو بدل ممکن نہیں۔ ایک مکتب فعل وہ فعل ہے جس کا قابلیت مخلوقہ یعنی توفیق) کے ذریعے ہونا مقدر

ہے اور جو قابلیت مخلوقہ کی شرائط کے تحت واقع ہوتا ہے۔" سیدھے سادے الفاظ میں امام اشعری کی تعلیم یہ تھی کہ ہر فعل یا تو خدا کی طرف سے صادر ہوتا ہے یا اس کا کسی شخص سے ارتکاب خدا کی طرف سے مقدر ہوتا ہے۔ یہ شخص چونکہ اکتساب کی قابلیت رکھتا ہے اس لیے وہ اس فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ مؤخر الذکر قسم کا فعل اولاً خدا کا فعل ہوتا ہے اور ثانیاً بندے کا۔ مثلاً اگر کوئی شخص ایک خط لکھنے بیٹھے تو اس کا خط لکھنے کی خواہش کرنا اس حکم ازلی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ فلاں وقت ایک خط لکھے' پھر جب وہ قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو یہ بھی ایک حکم ازلی کا نتیجہ ہوتا ہے' وعلی ھذ القیاس۔ جب وہ خط لکھ چکتا ہے تو یہ ایک ایسا عمل ہوتا ہے جو اس کے اکتساب کی بدولت ظہور میں آیا۔ شہرستانی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک پتے کی بات کہتا ہے۔ وہ یہ کہ ابوالحسن کے قول کے مطابق قابلیت مخلوقہ میں ایجاد اعمال پر اثر انداز ہونے کی کوئی طاقت شامل نہیں۔ امام اشعری کے مزید عقائد حسب ذیل تھے۔

> "خدا اپنے بندوں پر ایک بادشاہ کی طرح حکومت کرتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا اور جو حکم چاہتا ہے دیتا ہے۔ اگر وہ سارے بندوں کو دوزخ میں ڈال دے تو اس میں کوئی خطا نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر وہ سارے بندوں کو داخل جنت کر دے تو اس میں کوئی ناانصافی نہ ہوگی، کیونکہ ناانصافی ایسی چیزوں کے بارے میں حکم دینے کو کہتے ہیں جو حکم دینے والے کے قبضہ اختیار میں نہیں ہیں یا چیزوں کے مقررہ علائق میں خلل پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ خدا حاکم مطلق ہے جس پر کوئی ناانصافی محمول نہیں ہو سکتی اور جس کی طرف کوئی غلطی منسوب نہیں کی جا سکتی...... عقل کی رو سے کوئی چیز خدا پر واجب نہیں...... نہ نافع عمل' نہ مفید خلائق کام، نہ کریمانہ اعانت ...... کسی کام کا بندوں پر فرض ہونا اُسے خدا پر واجب نہیں بنا دیتا۔"

امام اشعری کے عقائد بیان کرنے کے بعد شہرستانی اُن کے سب سے سر برآوردہ شاگرد ابو محمد بن کرام کے عقائد بیان کرتا ہے جس کی تعلیمات کی کثیر التعداد لوگوں نے متابعت کی۔ شہرستانی ابو محمد کو صفاتیہ میں شمار کرتا ہے۔ ابو محمد کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا

کی صفات اس کی ذات سے جدا ہیں، خدا آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق بندوں کے افعال کو وقتاً فوقتاً خلق کرتا ہے۔

اگر ہم ابن عساکر[1] کی تصنیفات کا ذکر نہ کریں تو امام اشعری کی تعلیمات کا بیان نامکمل رہ جائے گا۔ شہرستانی نے اشاعرہ کے عقائد کا جو خلاصہ پیش کیا اس میں اس کا طرز بیان فلسفیانہ اور منصفانہ ہے۔ اس کے برخلاف ابن عساکر مختلف مسالک میں توازن قائم رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ امام اشعری کی طرح وہ بھی عقلی علماء کے نظروں کو کفر محض تصور کرتا ہے اور ان کی تعلیمات کی شدت سے مذمت کرتا ہے۔ بہر حال اس نے امام اشعری کے اس تاکیدی حکم کی جو تصریح کی کہ دین کے ایمانیات کو بلاحیل و حجت تسلیم کرنا لازمی ہے اس کی مدد سے ہمیں یہ سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی ذہنی نشوونما کے ایک ابتدائی مرحلے میں کیا رجحان بروئے کار آئے اور اُنہوں نے کس طرح بالآخر مسلمانوں کی ترقی کو روک دیا اور صدیوں کے لیے اُن کے قوائے عقلی کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ دین کے مسائل کے بارے میں کسی قسم کا سوال فقدانِ ایمان اور ایک ناقابلِ معافی گناہ سمجھا جاتا تھا اور تحقیق کو تو ایک شیطانی کارروائی تصور کیا جاتا تھا۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ: ''خدا ہر چیز کو دیکھتا ہے۔'' اس سے یہ قیاسی نتیجہ نکالا گیا کہ خدا کی آنکھیں ہیں اور مومن پر لازم ہے کہ وہ اس پر چون و چرا کے بغیر ایمان لائے۔ یہ تھا امام اشعری کا طریقِ استدلال اور یہی آج تک ان کے مسلک کے تابعین کا طریقِ استدلال ہے۔

امام اشعری اور ان کے ممتاز شارح اور مفسر ابن عساکر کے درمیان اڑھائی صدیوں کا فصل تھا۔ اس مدت کے دوران الشام میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ جب تک امام اشعری نے اپنا نیا مسلک ایجاد نہ کیا اس وقت تک اقتدار کے لیے جو کش مکش تھی وہ دو مسالک کے درمیان تھی، یعنی عقلیت اور ملائیت کے درمیان۔ امام اشعری نے ملائیت کو

---

[1] ابی القاسم علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ بن عبداللہ بن الحسن علی شافعی المعروف بہ ابن عساکر جو اپنی جید تاریخ دمشق کی وجہ سے مشہور ہے۔ ۵۰۰ ہجری میں پیدا ہوا اور اس کی وفات ۵۷۱ ہجری میں ہوئی۔ وہ ایک کٹر شافعی تھا اور امام اشعری کو اسلام کا بہت بڑا مجتہد اور مؤید خیال کرتا تھا۔ اس کی کتاب کا نام ہے ''تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الامام ابی حسن الاشعری۔''

ایک ایسے حربے سے مسلح کیا جو اُسے پہلے میسر نہ آیا تھا۔ جیسا کہ ابن عساکر نے کہا ہے:
"امام اشعری پہلے متکلم باللسان تھے جنھوں نے ارباب عقل اور دوسرے بدعت نظریے چونکہ ملائیت اور عقلیت' تقلید اور بدعت کے درمیان تطبیق کی ایک کوشش تھے اس لیے انہیں انتہا پسند علمائے دین کی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اُن لوگوں نے دیکھا کہ عقلیت کو مامون اور اس کے دو جانشینوں کے دَور میں جو جاہ و اقتدار حاصل ہو گیا تھا اُسے ختم کرنے کا یہ ایک نہایت مفید وسیلہ ہے۔ آل بویہ کے ابتدائی حکمرانوں نے بھی عقلیت کی حمایت کی تھی اور اُن کے زیر سرپرستی اس کا اثر و نفوذ وسطی ایشیا میں پھیل گیا تھا۔ ابن عساکر کا قول ہے۔" فنا خسرو[1] (عضد الدولہ) کے زمانے تک معتزلہ کو عراق میں بہت اقتدار حاصل تھا۔" عضد الدولہ کے عہد حکومت میں اشعریت کو دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور وہاں سے وہ عوام میں پھیل گئی۔ پانچویں صدی ہجری تک اکثر اشاعرہ کو معتزلہ کی ایک شاخ سمجھا گیا، کیونکہ امام اشعری ابتدا میں معتزلہ کے پیرو تھے۔ اس اشتباہ کی وجہ سے بارہا ایسا بھی ہوا کہ قدامت پسندوں کے ہاتھوں امام اشعری کے تابعین کو تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔

سلجوقی خاندان کے بانی سلطان طغرل کے عہد حکومت میں امام اشعری کے تابعین پر الحاد و بدعت کا شبہ ہوا اور انہیں زباں بندی اور جلا وطنی کی سزائیں دی گئیں سلطان خود امام ابو حنیفہ کا مقلد اور حنفی مسلک پر سختی سے کاربند تھا۔ اس نے مسجدوں میں جو خطبے دیئے اُن میں اس نے ملحدوں پر تبرا بھیجنے کا حکم دیا۔ ابن عساکر کی روایت کے مطابق طغرل کے وزیر نے، جو معتزلہ کا معتقد تھا، ان تبروں میں اشاعرہ کو بھی شامل کیا اور امام اشعری کے سربرآوردہ تابعین کو تکلیفیں پہنچائیں۔

---

[1] الملک فنا خسرو نے قصر خلافت کے ناظم کی حیثیت سے ۳۶۷ ہجری سے ۳۷۲ ہجری تک بغداد پر حکومت کی۔ ابن عساکر سے روایت ہے کہ ایک موقع پر جب وہ قاضی القضاۃ کے مکان پر علماء کے ایک جلسے میں شریک ہوا تو اُس نے دیکھا کہ مسلک اشاعرہ کا ایک عالم بھی جلسے میں موجود نہیں۔ اس نے سبب پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ بغداد میں اشعریہ کے فرقے کا کوئی عالم نہیں۔ اُس نے قاضی القضاۃ کو تاکید کی کہ کوئی عالم باہر سے بلوایا جائے۔ چنانچہ اُس کے حکم پر امام اشعری کے ایک ممتاز شاگرد ابن الباقلانی کو بغداد بلایا گیا۔ فنا خسرو نے اپنے لڑکوں کی تعلیم اُس کے سپرد کی۔ خواہ یہ روایت صحیح ہو یا غلط، حقیقت یہ ہے کہ اشعریوں کا ستارہ عضد الدولہ عہد میں بلندی پر آیا۔

طغرل بیگ کی وفات پر اشاعرہ کے دن بدلے اور الپ ارسلان کے تخت نشین ہوتے ہی اور نظام الملک کے عروج میں آتے ہی اشعریت کو از سر نو غلبہ حاصل ہو گیا۔ نظام الملک اہل سنت کا حامی تھا۔ ''اس نے جلا وطن علماء کو واپس بلوایا، ان کی عزت وتکریم کی اور ان کے ناموں پر دار العلوم اور مدرسے کھولے۔'' چنانچہ یوں ایک ایسا شخص جو مسلمانوں میں علوم وفنون کی فیاضانہ سرپرستی کے لیے سر برآوردہ تھا غیر شعوری طور پر ایک ایسے رجحان کا معاون بن گیا جو تمام دوسرے اسباب سے بڑھ کر مسلمانوں کے قوائے عقلی کو عقیم بنانے کا ذمہ دار ہے۔

ابن عساکر نے اشعری مسلک کی ترقی کی جو روائداد بیان کی ہے وہ جوش و خروش سے مملو ہے۔ عراق سے وہ ایوبیوں کے تحت شام میں اور مملوکوں کے تحت مصر میں پھیلا۔ عراق ہی سے اُسے ابن تومرت مغربی افریقہ لے گیا اور وہ مغرب (مراکش) میں جڑ پکڑ گیا۔' ابن حنبل کے چند مقلدین اور ابو حنیفہ کے مٹھی بھر تابعین کے سوا اسلام میں کوئی فرقہ ایسا نہ رہ گیا جو اشعری کے پیروؤں کا مقابلہ کر سکتا۔'' ابن عساکر کا قول ہے:

''اپنے مذہبی خیالات میں ابن حنبل اور الاشعری کاملاً متفق تھے۔ نہ کسی فروعی معاملے میں، نہ ارکین عقیدہ میں اور نہ روایات کے قبول کرنے کے بارے میں اُن میں کوئی اختلاف تھا...... یہی وجہ ہے کہ حنبلیوں نے ہمیشہ بدعتی لوگوں کے مقابلے میں اشعریوں پر اعتماد کیا ہے۔ صحیح العقیدہ لوگوں میں صرف اشاعرہ متکلمین تھے۔''

امام اشعری کی تعلیمات کے بڑے بڑے اصولوں کو واضح کرنے کی خاطر ابن عساکر مختلف فرقوں کے عقائد کا مقابلہ کرتا ہے۔

چند دوسرے فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ امام اشعری کے الفاظ میں معتزلہ عقائد کو بیان کرتا ہے (''جن میں راہِ حق سے گمراہ ہو گئے'') وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ معتزلہ اس خیال کی تردید کرتے تھے کہ خدا کو جسمانی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے یا یہ کہ یومِ حساب کو حشر اجساد ہوگا۔'' وہ عذاب قبر کے مسئلے کا بھی ابطال کرتے ہیں۔'' وہ اس پر بھی اعتقاد نہیں رکھتے کہ رسولِ خدا اپنی امت کی شفاعت کریں گے۔ اُن کا خیال ہے کہ بندوں کے گناہوں کی معافی یا تخفیف صرف خدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے اور نہ خدا کے رحم نہ اس

کے عدل پر بشری شفاعت کا کوئی اثر ہو سکتا ہے۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے نبی پر مکشوف ہوا، اور شریعت کے قوانین انسانی ضروریات کے مطابق وضع کیے گئے۔"

معتزلی عقائد کو بیان کرنے کے بعد ابن عساکر اشاعرہ کے عقائد کو با تفصیل بیان کرتا ہے۔ اُن کی تعداد چوبیس ہے۔ لیکن امام اشعری کے دینیاتی عندیئے کو اور عقلی اسلام سے انہیں جو زبردست اختلاف تھا اس کو واضح کرنے کے لیے اُن میں سے چند ایک کا مجمل ذکر کافی ہے، توحیدِ الٰہی اور نبوت محمدی ﷺ پر ایمان کا اقرار کرنے کے بعد' جن پر تمام مسلمان متفق ہیں، مسلکِ اشاعرہ اپنے عقائد کو یوں بیان کرتا ہے:۔

"ہم اقرار کرتے ہیں کہ جنت اور جہنم حق ہیں' یوم حساب کا آنا یقینی ہے' لاریب خدا مردوں کو قبروں سے اُٹھائے گا اور انسانوں کی آنکھوں کو اپنا جلوہ دکھائے گا[1]۔ ہم اقررا کرتے ہیں کہ کلام اللہ (یعنی قرآن) اور اس کا ہر لفظ غیر مخلوق ہے' دنیا کا کوئی واقعہ چاہے وہ اچھا ہو یا برا، خدا کے ارادے کے بغیر ظہور میں نہیں آتا، اُس کی مرضی کے بغیر کوئی چیز وجود میں نہیں آتی۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ قادرِ مطلق اپنے بندوں کے افعال اور اُن کے نتائج و عواقب سے واقف ہے۔ وہ اُن افعال سے بھی واقف ہے جو وجود میں نہیں آتے۔ ہمارا ایمان ہے کہ تمام اعمالِ انسانی کا مؤجد خدا ہے اور اُس نے اُنہیں اوّل روز ہی سے مقدر کر دیا ہے۔ انسان میں یہ استطاعت نہیں کہ خود (یعنی خدا کی مدد کے بغیر) کوئی چیز ایجاد یا خلق کر سکے، وہ اس کی قابلیت نہیں رکھتا کہ مشیت الٰہی کے بغیر کوئی ایسا کام کر سکے جو اس کی روح کے حق میں نفع بخش ہے یا کسی ایسے کام سے بچ سکے جو اُس کے لیے مضر ہے۔"

"ہم رسولِ خدا ﷺ کی شفاعت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ خدا اُن مومنوں کو جن سے گناہ سرزد ہوئے ہیں عذاب نار سے نجات بخشے گا" "ہم یوم حشر پر

---

[1] یہ عقیدہ یوں ہے کہ تدفین کے تیسرے دن فرشتے جن کے نام منکر اور نکیر ہیں' قبر میں آتے ہیں اور اپنے عصاؤں کی ضربوں سے مردے کو اٹھا دیتے ہیں۔ پھر وہ اس کی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں اُسے سے سوال کرتے ہیں اور ایک نامہ اعمال میں اُس کے جواب درج کرتے جاتے ہیں۔ وہ گویا مقدمے سے پہلے واقعات کی تفتیش کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ' جو بداہتہً مصری خیالات سے ماخوذ ہے' اشاعتِ اسلام سے پہلے عربوں کی لوک کہانیوں میں رچا ہوا تھا۔

ایمان رکھتے ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ دجال کا ظہور ہوگا ہم اقرار کرتے ہیں کہ منکر نکیر قبر میں مواخذہ کریں گے۔ ہم معراج[1] نبی ﷺ کے معتقد ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ تمام برے خیالات شیطان کے پیدا کیے ہوئے وسوسے ہوتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ امام برحق کے خلاف بغاوت کرنا گناہ ہے[2]۔"

مسلمانوں کی ترقی کے بارے میں امام اشعری کا جو نقطہ نگاہ تھا اُسے اوپر کا خلاصہ شہرستانی کے فلسفیانہ تجزیے کی بہ نسبت زیادہ واضح کرتا ہے۔

معتزلہ کا مقابلہ خود اُن کے حربے سے کرنے کی خاطر امام اشعری نے اُس کی ٹکر کا ایک علمِ کلام ایجاد کیا۔ یہ مسلمانوں کا حقیقی مدرسی علم دین ہے۔ اگرچہ اسے معتزلہ کے ایجاد کیے ہوئے علم کلام کی ایک شاخ تصور کیا جاتا ہے، لیکن یہ بہت سی بنیادی باتوں میں اُس سے مختلف ہے۔ مثلاً بیشتر معتزلی تصوری تھے۔ اس کے برخلاف اشعری متکلمین یا تو وجودی تھے یا ایک قسم کے اسمی۔ جہاں اشاعرہ کا عقیدہ تھا کہ جہالت کی طرح کی ایک منفی صفت ایک وجود واقعی ہے وہاں معتزلہ یہ کہتے تھے کہ وہ محض ایک صفت کی نفی ہے، یعنی تعلیم کا عدم۔ اشعری متکلمین کا عقیدہ تھا کہ قرآن غیر مخلوق اور قدیم ہے۔ اس کے مقابلے میں معتزلہ کا دعویٰ تھا کہ قرآن خدا کا وہ کلام ہے جو وقتاً فوقتاً حسب ضرورت رسول اللہ ﷺ پر القاء ہوا۔ ورنہ ناسخ و منسوخ بے معنی ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ بعد کی بعض آیتوں نے پہلے کی بعض آیتوں کو منسوخ کر دیا تھا۔

اس طرح اشعریت مشرق پر چھا گئی۔ جب روشن خیال بویہ قصر خلافت کے منصرم بنے تو عقلیت کا بغداد میں پھر چرچا ہوا۔ لیکن اشعریت نے عوام کے دلوں پر جو

---

[1] معراج نبوی ﷺ پر اعتقاد مسلمانوں میں عام ہے۔ اشاعرہ اور قدامت پسندوں کا عقیدہ ہے کہ رسول خدا ﷺ جسمانی طور پر زمین سے آسمان پر گئے تھے۔ لیکن عقلی علماء کا خیال یہ ہے کہ معراج روحانی تھا، یعنی رسول خدا ﷺ کی روح کو مرحلہ بہ مرحلہ ایسا صعود بخشا گیا کہ بالآخر اُسے روحِ کل سے ربطِ مطلق حاصل ہو گیا۔

[2] مقلد سُنیوں کا جو یہ عقیدہ ہے کہ خلیفہ کی بیعت کرنے کے بعد اُس سے سرکشی کرنا گناہ ہے، یہ اُسی کا نتیجہ کہ تمام مسلم حکمرانوں نے خلیفہ کے ہاتھوں اپنی تخت نشینی کرانے کی درخواست کی، چاہے خلیفہ خود کتنا ہی کمزور کیوں نہ تھا۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ اُن کی رعایا کے لیے اُن کے خلاف بغاوت یا اُن کی حکم عدولی شرعاً ممنوع ہو گئی۔

تسلط جمالیا تھا وہ اس کے قبضے ہی میں رہا اور اعتزال کو اپنا پرانا اقتدار پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ بو وید عقلیت پسند تھے، لیکن سلجوقی علم وفن کی تربیت کرنے کے باوجود مسلکِ اشعریہ کے معتقد تھے۔ رینان کہتا ہے کہ چونکہ اسلام تاریخ کے ایک اتفاق کی بدولت ہسپانیوں، بربروں اور ایرانیوں جیسی مذہب پرست قوموں کی ملکیت بن گیا اس لیے اُس نے اُن سے ایک شدید قسم کی اذعانیت کا رنگ پکڑ لیا۔ ''کتھولک مذہب پر ہسپانیہ میں جو افتاد پڑی اور اگر وہ مذہبی احیاء جو سولھویں صدی کے اختتام اور سترہویں صدی کے آغاز میں ہوا قومی ترقی کو روک دیتا تو یورپ پر بھی وہی افتاد پڑتی۔'' یہ قول بالکل صحیح ہے۔ ایرانی ہمیشہ اپنے بادشاہوں کو خدا تصور کرتے تھے۔ ترک، منگول اور بربر اپنے سرداروں کو خدا کے جانشین سمجھتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ان قوموں کے یہ تصورات نہ بدلے۔ ہسپانیوں کے دلوں میں جو تعصب عیسائی پادریوں نے کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا عرب صدیوں تک اُسے دور کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ناکام رہے۔ وزیر منصور نے اپنی ہوس اقتدار پوری کرنے کے لیے عقلیت کے خلاف آواز بلند کی تو جس ہجوم نے بعد میں فلسفی خوشی عیسائی بدعتیوں کو سرعام نذر آتش کیا، اُسی نے قرطبہ کے بازاروں میں مسلم فلاسفہ کی تصنیفات کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا۔ صلاح الدین کی فوج ظفر موج اشعریت کو اپنے ساتھ مصر لے گئی۔ اُدھر عقلیت اپنے پرانے دشمن کے ہاتھوں اپنے آخری مورچوں سے ہٹائی جا رہی تھی، ادھر امام غزالیؒ نے، جن کی تصنیفات کا سب سے بڑا ہدف فلسفے کا مطالعہ تھا، قدامت پرستی کو کمک پہنچائی۔ امام ابو حامد محمد ابن محمد الغزالی بلاشک وشبہ اعلیٰ درجے کی قابلیت اور بے داغ سیرت کے مالک تھے۔ انہوں نے دشت فلسفہ کی سیاحی بھی کی تھی اور سائنس کے سمندر کی غواصی بھی، بلکہ فکرِ آزاد کا شوق بھی پورا کیا تھا۔ یکا یک اُن کے دل میں یہ ولولہ پیدا ہوا کہ کوئی ایسی مضبوط چٹان ڈھونڈ نکالی جو اُن کی تھپیڑ کھا کھا کر تھکی ہوئی روح کے لیے جائے قرار بنے۔ یہ وہی ولولہ تھا جو اُن کے بعد آنے والے طالبان حق کے سینوں میں بھی پیدا ہوا۔ اس ولولے نے انہیں فلسفی سے صوفی بنا دیا۔ ''المنقذ من الضلال'' میں جو یا تو اُن کے زبانی خطبات کا مجموعہ ہے یا برادران ملت کو مخاطت کر کے لکھی گئی، وہ قدرے سادہ لوحی سے بیان کرتے ہیں کہ انہیں

علم کا کتنا شوق تھا اور اس کی تلاش میں انہوں نے کیونکر جگہ جگہ کی خاک چھانی، ہر دریا میں غوطے لگائے اور ہر مضمون سے واقفیت بہم پہنچائی اور بالآخر کیونکر اُن خیالات سے توبہ کی جو ابتدائے عمر ہی سے اُن کے دل میں جاگزیں ہو گئے تھے۔ وہ رسولِ اکرم کے اس ارشاد کا حوالہ دیتے ہیں کہ ہر بچہ فطری حقیقت کا علم لے کر پیدا ہوا ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ اُن کے دل میں اس حقیقت کو دریافت کرنے کی آرزو تھی۔ پھر وہ بتاتے ہیں کہ کیونکر تشکک نے اُن پر قبضہ کر لیا اور کیونکر انہوں نے دین و ایمان کی بلندیوں پر' یعنی صوفیانہ ذکر و فکر اور مجاہدہ و ریاضت میں' پناہ لے کر اس سے چھٹکارا پایا۔ ان خطبوں میں امام صاحب نے فلاسفہ پر زبردست حملہ کیا ہے۔ وہ انہیں تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں:۔

۱۔ دہریہ' جو مادے کو قدیم تصور کرتے ہیں اور صانعِ عالم یعنی خدا کے وجود سے منکر ہیں۔

۲۔ طبیعیون، جو ایک خالق خائنات کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اس بات کے بھی قائل ہیں کہ جب روح انسانی جسم سے علیحدہ ہو جائے تو معدوم ہو جاتی ہے اور اس لیے نہ کوئی یوم حساب ہے اور نہ انسانی اعمال کی جزا و سزا۔ یہ دونوں گروہ امام صاحب کے نزدیک کافر ہیں۔

۳۔ الٰہیون (افلاطون و سقراط) ''انہوں نے پہلے دونوں گروہوں کی کلیتہً تردید کی ہے اور اس طرح خدا نے سچے مومنوں کو اس مجادلے سے بچایا ہے۔''

باایں ہمہ افلاطون و سقراط کی تکفیر واجب ہے اور اسی طرح اُن مسلم فلاسفہ کی جنہوں نے اُن کی پیروی کی ہے' بالخصوص ابن سینا اور فارابی کی، کیونکہ ان سب کا فلسفہ اس قدر اُلجھا ہوا ہے کہ اس میں حق کو باطل سے جدا نہیں کیا جا سکتا تاکہ باطل کی تردید کی جائے۔ ان لوگوں کی جو تصنیفات ہمیں ملی ہیں اُن کی بناء پر علم کو تین شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک شاخ کے عالموں کو کافر اور دوسری شاخ کے عالموں کو اہلِ بدع کہنا لازم ہے۔ تیسری شاخ کے عالموں کی بابت کچھ کہنا ضروری نہیں۔'' لیکن اس سادگی کے باوجود امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں میں بہت سی عملی فراست ہے۔ وہ دانشمندی کو اعتقادِ محض پر فوقیت دیتے ہیں اور اس متعصبانہ اذعانیت کی مخالفت کرتے ہیں۔ جو ہر قسم کی عقلی تحقیق

اور علم کو رد کر دیتی ہے' کیونکہ یہ اذعانیت ان فلاسفہ الٰہیین میں پائی جاتی تھی جن سے اُنہیں چڑ تھی۔ وہ اس اذعانیت کو اسلام کی دوستی ناداں کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے شخصی آزادی، ضبط اخلاق، تزکیہ نفس، عملی احسان و مروت اور نوجوانوں کی تعلیم کے بارے میں جو باتیں کہیں اور اپنے وقت کے ملاؤں کی اخلاق سوز اور بے مصرف زندگیوں کی جس طرح مذمت کی یہ سب چیزیں اُن کی نیک سیرتی کی گواہی دیتی ہیں۔

اس وقت سے عقلیت اور مقلدیت میں ایک پیہم آویزش شروع ہوگئی۔ ابن سینا کی جو تصنیفات اور اخوان الصفا کے جو رسالے سرکاری یا نجی کتب خانوں میں تھے وہ سب کے سب ۱۱۵۰ء میں خلیفہ مستنجد کے حکم سے جلا دیئے گئے۔ ۱۱۹۲ء میں حکیم الرکن عبد السلام پر دہریت کا الزام لگایا گیا اور اس کی کتابیں عوام اور ملاؤں نے مل کر سر بازار جلائیں۔ جس ملاّ نے اس تقریب کی صدارت کی اُس نے ایک کرسی پر کھڑے ہو کر فلسفے کے خلاف ایک دھواں دھار وعظ دیا۔ لوگ کتابیں اٹھا اٹھا کر اُسے دیتے جاتے تھے اور وہ اُن کے کفر کے بارے میں چند کلمات کہہ کر اُنہیں آگ میں پھینکتا جاتا تھا۔ ابن میمون کا ایک شاگرد اس عجیب غریب منظر کے تماشائیوں میں تھا۔ اس کی روداد پڑھنے کے قابل ہے:۔

"میں نے اس عالم کے ہاتھ میں ابن الہیثم کی ہیئت پر تصنیف دیکھی۔ لوگوں کو وہ دائرہ دکھا کر جس سے مصنف نے کرہ سماوی کو ظاہر کیا تھا، عالم نے بڑے غیظ و سے کہا 'ہیہات! ہیہات! غضب! غضب!'

اور یہی کلمات کہہ کر کتاب کو آگ میں جھونک دیا۔" بہر حال امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت نہ بادشاہِ وقت کی تقلید پروری (اگرچہ اُن میں سے بعض در پردہ عقلیت پسند تھے) عقلیت کو بالآخر جامد تقلید پر غالب آنے سے روک سکی۔ اگر اس اثناء میں منگول آکر تقلید کا پلہ بھاری نہ کر دیتے۔ "ایک خان، ایک خدا۔ جس طرح خان کا فرمان اٹل ہے۔ اُسی طرح خدا کا حکم بھی اٹل ہے۔" جب اس نظریے کی پشت پر لاکھوں تلواریں تھیں تو کیا اس سے بہتر کوئی برہان قاطع ہو سکتی تھی عقلیت فلسفہ، سائنس، علوم و فنون سب بربریت کے اس سیلاب میں بہہ گئے اور ہمیشہ کے لیے بہہ گئے۔ روشنی کی وہ شعاعیں جو ہم نے ہلاکو کے جانشینوں کے تحت مغربی ایشیا میں چلتی دیکھتی ہیں وہ ڈوبتے ہوئے سورج

کی آخر شعاعیں تھیں۔ ملکی تدبیر نے انتہائی تعصب سے کام لے کر عالم اسلام میں عقلیت اور فلسفے کو عود کر آنے سے روک دیا۔ فقیہہ اور متقنن نہ صرف خود صاحب اقتدار تھے، بلکہ امریت و جابریت کے پشت پناہ بھی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ' جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' ملائیت اور تقلید پرستی نے بیشتر مسلمانوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا اور رفتہ رفتہ اُن کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ وہ ملائیت کی عینک لگائے بغیر کوئی چیز نہیں دیکھ سکتے۔ ہادی اِسلام ﷺ نے عقل سے کام لینے کی تلقین کی۔ آپ ﷺ کے متبعین نے اُس سے کام لینے کو گناہ قرار دیے دیا ہے۔ آپ ﷺ نے انسان پرستی اور انسانوں سے غلو آمیز عقیدت کی ممانعت کی۔ اہل سنت نے سلف اور اپنے ائمہ اربعہ کو اور اخباری شیعوں نے اپنے مجتہدین کو ولایت کا درجہ دے دیا ہے۔ دونوں نے ان بزرگوں کی تعلیمات سے کسی قسم کے انحراف کو گناہ قرار دے رکھا ہے چاہے وہ انحراف ہادی اِسلام ﷺ کی اپنی تعلیمات سے اور عقل کے تقاضوں سے کتنی ہی مطابقت کیوں نہ رکھتا ہو۔ پیغمبر نے کہا تھا کہ "بھوت پریت اور اس قسم کی چیزیں اسلام سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں۔" آپ ﷺ کے پیروان چیزوں پر راسخ ایمان رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے انہیں کافروں کے ملکوں میں جا کر علم کی تلاش کرنے کی تاکید کی تھی لیکن اُنہیں اپنے ملک میں بھی علم دیا جائے تو وہ اُسے وہاں بھی قبول نہیں کرتے۔

صفویوں کے عہد میں عقلیت اور فلسفے نے دوبارہ زندگی پائی۔ اولین عباسیوں کے عہد کی سی توانائی کے ساتھ نہ سہی۔ بارہویں صدی عیسوی سے لے کر پندرہویں صدی تک ایران پر بہت برا وقت گزرا تھا اور اس تاریک دور میں شیعہ ملاؤں نے سنی فقیہوں سے بھی بڑھ کر وہی اقتدار حاصل کر لیا تھا جو عیسائیت میں پادریوں کو حاصل تھا۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ آئمہ فاطمیہ کے جانشینوں کی حیثیت سے وہ قوانین شریعت کی تشریح کے واحد اور مطلق مختار تھے۔ ملا صدرہ نے (جن کا تذکرہ میں اصولی عقائد کی، یعنی دینِ محمدی کی جیسا کہ پیغمبر کے اولین جانشینوں نے اُسے سمجھا اور قبول کیا، تجدید کے سلسلے میں کر آیا ہوں) اپنے ہم وطنوں میں فلسفہ اور سائنس کے مطالعے کو دوبارہ رواج دینے کی کوشش کی۔ یہ ایک آسان کام نہ تھا، لیکن انہوں نے نہایت خوش اسلوبی اور فراست سے انہیں نمٹایا۔ ابن سینا کا فلسفہ پھر سے زندہ ہو گیا اور ایران کے سیاسی تغیرات افغانوں کے دورِ

اقتدار کے کشت و خون اور قاچاریوں کے تخت نشین ہونے کے باوجود اس کا تسلط شائستہ طبقوں پر ابھی تک قائم ہے۔ سینائی فلسفے کی ایک بہترین کتاب عبدالرزاق بن علی بن الحسین لاہجی نے شاہ عباس ثانی کے عہدِ حکومت میں "گوہر مراد" کے نام سے لکھی۔ اس کتاب میں اس نے ابن سینا کے خیالات کا خلاصہ پیش کیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، اُن کے جانشینوں اور امام فخر الدین رازی، ناصر الدین طوسی، امام تفتازانی اور دوسرے حکماء اور طبیعیات دانوں کی آراء کے حوالے سے اُن کی تشریح بھی کی ہے۔

عبدالرزاق کی بعض رائیں بڑی دلچسپ ہیں۔ مثلاً معتزلہ اور اشاعرہ سے بحث کے ضمن میں وہ کہتا ہے: "معتزلہ نے علمِ کلام اس مقصد سے ایجاد کیا کہ دین کے احکام اور معاشرے کے تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کریں اور عقلی اصولوں سے قرآن کی آیات کی اور ایسی روایات کی جو بظاہر غیر معقول معلوم ہوتی ہیں تفسیر و توضیح کریں۔ اُن کا مخالف فرقہ کسی حد تک تعصب اور کسی حد تک مصلحت کی بناء پر قرآنی آیات اور احادیث کو لغواً قبول کرنے کا قائل تھا اور اس نے ہر قسم کی تاویل کو ممنوع قرار دیا، معتزلہ کی تاویلوں اور ان کی تمام رایوں کو بدعت کہا، معتزلہ کو مستبدعین کا لقب دیا اور اپنے آپ کو معتزلہ کے مقابلے میں اہل سنت والجماعت کے نام سے موسوم کیا...... اُن میں سے بہت سے خدا کو ایک وجودِ جسمانی سمجھنے کے گناہ میں مبتلا ہو گئے ہیں اور سب کے سب تشبیہ کی معصیت میں ڈوبے ہوئے ہیں...... یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ اُنہوں نے تاویل کا دروازہ بند کر دیا ہے اور خدا کے تخت نشین ہونے سے متعلق آیتوں اور روئتِ الٰہی کے بارے میں روائتوں کی تفسیر لغوی معنوں میں کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ان سے تجسیم اور تشبیہ استنباط کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس شروع شروع میں منطقی دلائل پیش کرنے کا کوئی طریقہ نہ تھا، وہ صرف قرآن اور احادیث کے لغوی الفاظ پر اعتماد کرتے تھے۔ انہیں یہ طریقہ ابوالحسن

---

[1] اس بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے عظیم پیش رو شاہ عباس اول کی طرح تمام مذاہب سے رواداری برتتا تھا۔ اس معاملے میں اپنے اصولِ عمل کو وہ اکثر ذیل کے الفاظ میں بیان کیا کرتا تھا: "لوگوں کے دلوں کا محاسبہ میرا کام نہیں بلکہ خدا کا کام ہے۔ خالقِ کائنات اور مالک کل کی عدالت کے معاملوں میں میں کبھی دخل نہیں دوں گا۔"

الاشعری نے سکھایا جو معتزلہ کے کبار ائمہ میں سے ایک یعنی ابو علی جبائی کا ایک ممتاز شاگرد تھا۔ ابو الحسن نے منطق اور استدلال میں بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ اس نے مذہب اعتزال کو ترک کر کے اہل سنت والجماعت کا مسلک اختیار کیا اور اس فرقے کو جو اس کے زمانے تک کوئی اثر ونفوذ نہ رکھتا تھا۔ ترقی دینے کی سعی بلیغ کی۔ اُس وقت سے یہ فرقہ اُسی کے نام سے موسوم ہوگیا۔ اس نے اہل اعتزال کے نمونے پر قواعد و ضوابط مرتب کئے...... جابر خلفاء نے اس مذہب کے قواعد کو اپنی مصلحتوں کے موافق پا کر اس کی حمایت کی۔ چنانچہ اس طرح اشعریت اہلِ اسلام میں پھیل گئی۔ لیکن چونکہ اعتزال کے قواعد اصولِ عقلیہ پر مبنی تھے، اس لیے وہ بہت سے طالبانِ حق کے دلوں میں جاگزیں ہو گئے اور چونکہ معتزلہ نے فلسفہ اور سائنس کی تصنیفات کا غائر مطالعہ کیا تھا لہٰذا وہ مابعد الطبیعیاتی اور الٰہیاتی مسائل پر بحث کرتے وقت اُن سے دلائل پیش کرتے تھے۔ جب اشاعرہ کو اس کا علم ہوا تو چونکہ وہ ہر ایسی چیز کو جو صدر اسلام میں معمول نہ تھی بدعت سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے فوراً کتبِ حکمت کے مطالعے کو خلافِ شرع اور مضر دین قرار دے دیا۔ یہ اُس فرقے کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ فلسفہ اہلِ اسلام میں اس قدر غیر مقبول ہو گیا کہ علمائے معتزلہ نے بھی اس سے اجتناب شروع کر دیا۔ لیکن فلسفے کی اس مخالف کے اصلی موسس اشاعرہ ہی تھے کیونکہ فی الحقیقت فلسفہ کسی صورت بھی دین اور اسرارِ قرآن و احادیث کے منافی نہیں انبیاء اور اُن کے اوصیاء نے حکمت کے حقائق کی تشریح کی ہے اور یہ حقائق تمثیلاً قدسی ہیں''...... ''انسان کے مختارِ عمل ہونے کے بارے میں تین مذاہب میں۔ پہلا نظریہ جبر کا ہے اور یہ اشاعرہ کا مذہب ہے: ان کا عقیدہ ہے کہ انسانی اعمال بلا واسطہ خدا کے خلق کردہ ہیں اور ان میں انسانی ارادے کو کوئی دخل نہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص آگ جلائے تو وہ آگ کو بھی خدا کی جلائی ہوئی کہتے ہیں۔'' پھر اس نظریے کی اخلاقی مضرت کو بے نقاب کرنے کے بعد عبدالرزاق کہتا ہے: ''دوسرا مذہب یعنی تفویض کا نظریہ بعض اہل اعتزال نے اختیار کیا، جو اس کے قائل ہیں کہ انسان نیک و بد میں تمیز کرنے کی قابلیت اور ان میں سے ایک پر عمل کرنے کی پوری پوری قوت رکھتا ہے۔ تیسرا مذہب ائمہ فاطمیہ کا اور فلاسفہ وعلمائے عقلی کی اکثریت کا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسانی افعال بلا واسطہ خدا کے

خلق کردہ ہوتے ہیں، لیکن خدا بتاتا ہے کہ کوئی سا کام نیک اور کون سا بد"

عیسائیت میں جو کلیسا صحیح العقیدہ ہونے کا مدعی ہے اُس کی جو موجودہ حالت ہے ہمارا دل بے اختیار چاہتا ہے کہ اس کا مقابلہ اس فرقے کی موجودہ حالت سے کریں جو اسلام میں اسی طرح کی حیثیت کا مدعی ہے۔ چوتھی صدی سے لے کر، یعنی جب سے اس کی بنیاد رکھی گئی، لوتھر کی بغاوت تک کیتھولک مذہب نے اپنے آپ کو سائنس، فلسفہ اور علم و تعلیم کا جانی دشمن ثابت کیا۔ اس نے بدعت کے الزام پر لاکھوں انسانوں کو نذرِ آتش کیا۔ جنوبی فرانس میں فکرِ آزاد کی پہلی تلاہٹوں کا گلا گھونٹ دیا اور عقلی دینیات کی تمام درسگاہیں جبراً بند کر دیں لیکن لوتھر اور کیلون کے رخنہ عظیم کے بعد کیتھولک مذہب پر یہ منکشف ہوا کہ نہ سائنس کی تربیت نہ فلسفے کا مطالعہ اہلِ ایمان کو کافر بنا دیتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنی بنیادوں کو وسیع کیا اور اب اس کے دائرے میں بڑے بڑے عالی ظرف اور وسیع الخیال لوگ ہیں۔ سائنس دان بھی، ادیب بھی، عالم بھی۔ باہر کے کسی آدمی کو وہ اصلاح یافتہ عیسائی کلیساؤں سے بھی زیادہ آزاد خیال دکھائی دیتا ہے۔ اسلام نے پانچ صدیوں تک نوعِ انسانی کی آزادانہ نشوونما کی اعانت کی، لیکن اس کے بعد اس میں ایک رجعت پسندانہ تحریک شروع ہو گئی اور انسانی فکر کے دھارے کا رخ یکا یک بدل گیا۔ سائنس اور فلسفے سے شغف رکھنے والے لوگ دائرہ اسلام سے خارج قرار دیئے گئے۔ کیا سُنی مذہب کے لیے کلیسائے روم سے سبق لینا ناممکن ہے؟ کیا اس کے لیے یہ محال ہے کہ کلیسائے روم سے عبرت پکڑ کر اپنے آپ کو زیادہ وسیع اور کثیر الاطراف بنائے؟ تعلیماتِ محمدی میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کو مانع ہو اسلام کا پروٹسٹنٹ مسلک اپنے ایک ایک مرحلے میں، یعنی اعتزال کے دور میں اس کی راہ پہلے ہی سے ہموار کر چکا ہے۔ اہل سنت کا عظیم مذہب اپنے پرانے طوق و سلاسل کو کاٹ کر کیوں نہیں پھینک دیتا اور آزاد ہو کر ایک نئی زندگی کا آغاز کیوں نہیں کرتا؟

گیارھواں باب

اِسلام کی صوفیانہ اور مثالی رُوح

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ

وہ صوفیانہ فلسفہ جو جدید فارسی کی روح رواں ہے صریحاً اس مخفی معنویت کی پیداوار ہے جو مسلمانوں کا ایک اہم طبقہ قرآن کے الفاظ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اسلامی تصوف کا اصلی سرچشمہ نفوسِ قدسی کا وہ سرشار جذبہ ہے جو رسولِ خدا ﷺ کے کلام سے اکثر ٹپکتا تھا اور وہ سوز و گداز اور ذوق و شوق سے بھری ہوئی وجد کی سی کیفیت جو آپ کی عبادات کی خاصیت تھی۔ آپ کی زندگی میں عملی فرائض کی انجام دہی کو دینی فکر پر ترجیح دی گئی۔ اس لیے اسلام کے مفکرانہ اور صوفیانہ عنصر کو مکمل نشوونما کا موقع نہ ملا۔ یہ مفکرانہ اور صوفیانہ عنصر ہر مذہب اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ افراد اور اقوام کے طبعی خصائص کے مطابق مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے اور اس کا دارومدار بڑی حد تک اس پر ہوتا ہے کہ ان میں مجردات اور محسوسات کو باہم غلط کرنے کا رجحان کہاں تک ہے۔ ہندو متناہی کے لامتناہی میں جذب ہو جانے کو سعادت اُخروی تصور کرتا ہے اور اس منزل مقصود کو حاصل کرنے کی خاطر ایک ہی مقام پر ساکن رہتا ہے اور اپنے آپ کو مکمل بے حسی کے سپرد کر دیتا ہے۔ لامتناہیت کا جو احساس اس پر مستولی ہے اُس کے باعث اس کے لیے یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ پروہت اور دیوتا میں یا اپنے آپ میں اور دیوتا میں تمیز کر سکے۔ بالآخر وہ خدا کو اُن مختلف صورِ فطری سے خلط ملط کر دیتا ہے جن میں اس کے عقیدے کے مطابق خدا اپنے

آپ کو آشکارا کرتا ہے۔ یہ سلسلۂ خیال جیسا کہ بھگوت گیتا سے ظاہر ہے' اس نتیجے پر ختم ہوتا ہے کہ خالق ومخلوق ہم ذات ہیں۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہمہ اوست کا عقیدہ کیسے عجیب طور پر اپنی انتہائی شکل میں مادی چیزوں کی پرستش بن جاتا ہے جو الٰہیات کے دوسرے تصور سے پہلے وجود میں آئی۔ اپنے عہد طفلی میں نفسِ انسانی خالص خوف کے سوا کسی روحانی جذبے سے آشنا نہیں ہوتا۔ دنیا کے اولین دور کا جنگل' جسے انسانوں نے ابھی ہاتھ نہیں لگایا، اونچے اونچے پہاڑ جو بھیانک دیووں کی طرح راستہ روکے کھڑے ہیں، رات کا اندھیرا جس میں ڈراؤنی اور انجانی شکلیں منڈلاتی پھر رہی ہیں، درختوں کی پھنگوں میں چیخم دھاڑ مچاتی ہوئی ہوا...... یہ سب چیزیں ابتدائی انسان کے طفلانہ دل پر خوف اور ہیبت طاری کر دیتی ہیں۔ چنانچہ جو مادی چیز بھی اُسے اپنے یا اپنے قریبی ماحول سے زیادہ طاقت ور اور خوفناک دکھائی دیتی ہے وہ اُسی کی پوجا کرنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ مادی چیزوں کو خیالی ہستیوں میں تبدیل کرنا شروع کر دیتا ہے اور پھر ان خیالی ہستیوں کو اپنا معبود بنالیتا ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ مختلف خیالی ہستیاں ایک عالمگیر اور محیط کل خیال میں ضم ہو جاتی ہیں۔ بت پرستی سے اوپر کی طرف پہلا قدم مادی وحدت الوجود ہے۔

افلاطونیت جدیدہ نے جو خود مشرقی فکر کی پیداوار تھی' عیسائیت کو متاثر کیا تھا اور غالبًا عشائے ربانی کا تصور اسی کا نتیجہ تھا۔ جو ہینز سکوٹس (Johannes Scotus) اور ایکہارٹ (Eckhart) کے سوا قرونِ وسطیٰ کے تمام یورپی صوفیہ نے صرف اس مسئلے کے خلاف جہاد کیا تھا۔ صحیح معنوں میں تصوف' جو لامحدودیت کی ایک بلند ہمت آرزو ہے، مسلمانوں کے نظریہ "نورِ باطن" کی بدولت وجود میں آیا۔

عالمِ اسلام کے اشرف نفوس کا جو یہ خیال تھا کہ قرآن کے الفاظ میں کوئی عمیق تر مطلب پنہاں ہے یہ خیال قرآن کے ظاہری متن کی سخت گیری سے فرار کی خواہش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کا سرچشمہ یہ صمیمی ایمان تھا کہ عام مفسرین عباراتِ قرآنی کا جو مفہوم بیان کرتے ہیں، اُن میں اُس سے کم نہیں بلکہ زیادہ معانی ہیں۔ ایک تو یہ ایمان اور دوسرے ذاتِ باری کے ہر چیز میں ساری ہونے کا گہرا احساس، جو قرآن کی تعلیمات اور صاحب قرآن کی ہدایات سے پیدا ہوا اور اُن سے پوری پوری مطابقت رکھتا تھا...... ان

دونوں نے مل کر مسلمانوں کے یہاں وہ استغراقی اور عینی فلسفہ پیدا کیا جسے تصوف کا نام دیا گیا ہے اور جسے غالباً افلاطونیت جدیدہ کے خیالات نے جو مسلمانوں میں رائج تھے پھیلنے میں مدد دی۔ مشرق میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ہر اس نظامِ فلسفہ کو جو علم کی بنا تجربے یا عقل پر رکھتا تھا ناقص پا کر، تصوف کا دامن پکڑا تھا۔ ان کے اثر ونفوذ کی بدولت تصوف مشرقی مسلمانوں میں پھیل گیا اور مشرق اسلامی کے سب سے بڑے ذہنوں نے فلسفے کو شوق سے قبول کیا۔ مولانا جلال الدین رومی، جن کی مثنوی صوفیاء کی حرز جان ہے، سنائی جسے خود رومی نے اپنا اُستاد مانا ہے۔ فریدالدین عطار، شمس الدین حافظ، خاقانی، سعدی، نظامی، یہ سب اسی دبستان کے رُکن ہیں۔

لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں میں پہلے شخص ہیں جس نے ''نورِ باطن'' کا تصور پیش کیا۔ عرفانِ الٰہی اسلام کے مایہ خمیر میں مضمر ہے۔ قربت الٰہی کی نیت حقیقی عبادت کا ایک لازمی مقدمہ ہے۔ معراجِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی ہی تھے محدود کا لامحدود سے کامل ربط۔ صرف یہی نہیں کہ خدا اُن لوگوں کے دلوں سے کلام کرتا ہے جو خلوصِ نیت سے اُس کی مدد اور ہدایت کے طالب ہوں بلکہ ہر قسم کے علم منبع عقل کل ہے۔ انبیاء پر علم کا القاء وحی کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ اکثر اپنے خاص الخاص بندوں کو فی سِرّۃ قلبی، کسی متوسل کے بغیر علم بخشتا ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں اُسے علم لدنی کہتے ہیں۔ قرآن نے اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: ''وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْماً'' (کہف۔ ۶۵) خدا سے رابطۂ قریبی کا یہی تصور ایک مشہور حدیث میں بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔

''میری زمین اور میرے آسمان مجھ کو احاطہ نہیں کر سکتے، لیکن میں اپنے مومن، متقی اور متورع بندے کے دل میں سما جاتا ہوں[۱]۔''

مالو سعی ارضی ولا سمائی ولکن و سعتی قلب عبدی المؤمن

---

[۱] ملاحظہ ہو ضمیمہ دوم۔ ڈاکٹر رینالڈ نکلسن (Dr. Renold Nicholson) نے بھی اپنی کتاب ''صوفیائے اسلام'' میں یہ روایت نقل کی ہے۔ یہ تصنیف، جو ایک ایسے عالم کی لکھی ہوئی ہے جو صوفیانہ ادب سے واقفیت میں یورپ بھر میں کوئی ہمسر نہیں رکھتا، انسانی تصوف کا ایک عمدہ خلاصہ پیش کرتی ہے۔

التقی النقی الورع ......'' اور دل انسانی نشاط عبادت میں اس خدائی وعدے کا جواب یوں دیتا ہے: ''سَمِعَ اللهُ لِمن حمده ربّنا ولكَ الحمد۔''

یہی ماورائیت دوسری حدیثوں میں پائی جاتی ہے۔ حضرت علیؓ اپنے مواعظ میں نور باطن پر بحث کرتے ہیں[1]۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ اپنے خطبات میں اس کا ذکر کرتی ہیں: اور سید الشہداء امام حسینؓ کی مناجاتیں تو اس کی تجلی سے لبریز ہیں۔ لیکن اس ابتدائی تحریروں میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ رسول اللہ ﷺ نے یا آپ ﷺ کے وصیٔ روحانی نے تلاش حق کی خاطر کاروبار دنیا کو ترک کرنے اور رہبانیت اختیار کرنے کی تلقین کی۔ اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ نے تو سختی سے رہبانیت کی مذمت کی[2]۔ لیکن اس کے باوجود اسلامی تصوف اس جادہ ممنوع پر گامزن ہو گیا۔ روحانی کمال[3] حاصل کرنے کی کوشش میں بہت سے مسلمانوں نے یہ نکتہ فراموش کر دیا ہے کہ انسانی زندگی کا دارومدار پیہم عمل پر ہے۔ یہ کیونکر ظہور میں آیا اس کی روداد دلچسپی سے خالی نہیں۔

---

[1] ''نہج البلاغۃ'' کی دو شرحیں ہیں، ایک ابن ابی الحدید کی اور دوسری فارسی میں لطف اللہ کاشانی کی۔ ابن ابی الحدید اپنی شرح کے دیباچے میں اپنا پورا نام یوں دیتا ہے: ''ابوحامد عبدالحمید بن ہبۃ اللہ بن محمد بن محمد بن حسین بن ابی الحدید۔'' وہ مدائن میں ذی الحج ۵۸۶ ہجری (دسمبر ۱۱۹۰ء) میں پیدا ہوا۔ وہ معتزلی بھی تھا اور شیعہ بھی اور دیباچے میں اس کا صریحاً تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ اوّل درجے کا فقیہ، عالم، متکلم اور شاعر تھا۔ خلفاء ناصر اور ظاہر کے تحت وہ ایوان میں کسی عہدے پر مامور تھا۔ ابن خلکان (ڈی سلین De Slane جلد سوم، صفحہ ۵۴۳، سوانح ضیاء الدین ابن الاثیر اس کا ذکر اس الفاظ میں کرتا ہے: ''فقیہ عزالدین ادیب''۔ لیکن وہ ابن الحدید کی عظیم تصنیف یعنی شرح ''نہج البلاغۃ'' کا نام نہیں لیتا۔ وہ یہ بھی نہیں بتاتا کہ ابن ابی الحدید معتزلی اور شیعہ تھا۔ ابن ابی الحدید اپنی شرح کے آغاز میں، جہاں وہ کہتا ہے کہ خدا کا شکر بجالانا اور اس کی عبادت کرنا انسان کا فرض ہے، رویت الباری فی الآخرت یعنی روز قیامت خدا کے جسمانی آنکھوں سے دیدار کے بارے میں اشاعرہ کے عقیدے کی تردید کرتا ہے۔ ابن ابی الحدید نے ۶۵۵ ہجری (۱۲۵۷ء) میں بغداد میں وفات پائی۔ یعنی منگولوں کی تاخت بغداد سے ایک سال پیشتر (فارسی ایڈیشن قیاساً ۱۳۰۴ ہجری میں شائع ہوا)

[2] آنحضرت ﷺ اور متقدمین صحابہ ''رات کا بیشتر حصہ عبادت میں اور دن کا بیشتر حصہ لوگوں کے کاموں میں صرف کرتے تھے۔'' یہی حال پانچویں اُموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا تھا جو بہت سے دوسرے لوگوں کی بہ نسبت ولی کے لقب کے زیادہ مستحق ہیں۔

[3] یعنی صوفیہ کی اصطلاح میں ''انسان کامل'' بننے کی کوشش میں۔

نہ عیسائیت میں نہ اسلام میں تصوف کوئی نیا مسلک ہے۔ یہ رومی دنیا میں بھی تھا اور یہودی بھی اس سے نا آشنا نہ تھے۔ آریائی ہندوستان میں تو یہ حدود سے تجاوز کر گیا اور اس پر لاتعداد صورتوں میں عمل ہوتا ہے۔ ہندوستان سے چل کر یہ مغربی اور وسطی ایشیا میں پہنچا، جہاں اُس نے عجیب وغریب روپ دھارے۔ جہاں کہیں اس نے رنگ جمایا وہاں اس نے لوگوں کو یہی سکھایا کہ خارجی دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ خاندانی رشتوں اور ذمہ داریوں کے بندھن توڑ دیں اور ہر چیز سے منہ موڑ کر صرف ایک چیز سے لو لگائیں۔ اس کا سارا نچوڑ ہی ترک دنیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام صوفیوں کی صدیوں پرانی تعلیم کی ایک صدائے بازگشت تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کے برخلاف خدمت بشر کو وہ عبادت کہا جو خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول ہے۔ آپ کا پیغام پرانے تصورات کی عین ضد تھا۔

بدقسمتی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور خلافت راشدہ کے ختم ہو جانے کے بعد عالم اسلام میں جو ہنگامے برپا ہوئے، مدینے کی تباہی نے جو مصیبتیں مسلمانوں پر نازل کیں اور دمشق کے اموی خلیفوں کے تحت جو بے لگامیاں معاشرے میں عام ہو گئیں، ان سب اسباب نے سنجیدہ مزاج مسلمانوں کو اس پر مجبور کیا کہ گوشہ اعتکاف میں بیٹھ کر یاد خدا میں مصروف رہیں۔ تقوے سے توکل تک صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ چنانچہ اس کے بعد مسلک تصوف کی جو نشو ونما ہوئی وہ ایک قدرتی سلسلہ واقعات تھی۔ خرقہ درویشی کا تو یہ اور ترک دنیا کے امتیازی لباس کے طور پر اختیار کرنا ایک پرانی رسم ہے جو قرون اولیٰ سے چلی آرہی ہے[1]۔ روحانی ترقی کے بارے میں صوفیہ کا جو نظریہ ہے وہ مکمل ترکِ نفس اور ذکر و فکر الٰہی میں پورے پورے انہماک پر مبنی ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے

---

[1] عیسائیت میں بھی ٹاٹ کے جامے یا اون کے پیراہن کا یہی مصرف تھا۔ خرقہ تکیئے کے غلاف کی طرح کا ایک لمبا سا لبادہ ہے۔ ''صوف'' کے معنی ہیں اُون اور صوفیوں کو یہ نام اسی لیے دیا گیا کہ وہ اُونی کپڑے پہنتے ہیں۔ لفظ ''صوفی'' اہل صُفہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جو مسجد نبوی ﷺ کے باہر پڑے رہا کرتے تھے اور جنہیں رسول کریم ﷺ اپنے ہاتھ سے کھانا تقسیم کیا کرتے تھے۔ اخوان الصفا سے بھی اُسے کوئی مناسبت نہیں۔

کہ اس انجذاب اور توجہ قلب سے[1] وہ ذات باری کا قرب اور حق کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس عقیدے نے جہاں بہت سے پارسا اور خدا پرست لوگوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی زندگی دین کے لیے وقف کر دیں، وہاں اس نے انوکھے اور بے ڈھنگے خیالات کا ایک طوفان بھی برپا کر دیا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ بیت النبی کو اعلیٰ درجے کا علم باطن عطا ہوا تھا۔ ابونصر سراج اپنی کتاب "اللمعہ"[2] میں حضرت جنید بغدادی[3] کے حوالے سے کہتا ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ و جدل میں معروف نہ رہتے تو اللہ نے انہیں علم لدنی کی جو دولت بے پایاں بخشی تھی اسے وہ دنیا کو مال مال کر دیتے[4] خواجہ فرید الدین عطار[5] اپنے تذکرۃ الاولیاء میں امام جعفر صادق کو اولیائے متصوف میں سب سے اُونچا درجہ دیتے ہیں۔ یہ بات قابلِ ملاحظہ ہے کہ تقریباً ہر صوفی ولی کا روحانی سلسلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ

---

۱ روایت ہے کہ ابوسعید بن ابی الخیر، جو زمرہ صوفیہ میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ہندو یوگیوں کی طرح اپنے نفس کو اپنی ناف پر مرکوز رکھا کرتے تھے۔ ابوسعید بن ابی الخیر کی ایک نہایت عمدہ سوانح عمری ڈاکٹر نکلسن (Dr. Nicholson) نے اپنی کتاب Studies in Islamic Mysticism میں دی ہے۔ پروفیسر ای جی براؤن Professor E.G. Broune کی Literary History of Persia بھی ملاحظہ کیجئے۔ کہتے ہیں کہ (ابوسعید بن ابی الخیر ابن سینا کے ہم عصر تھے۔ ان کی وفات ۱۰۴۹ء میں ہوئی۔

۲ "اللمعہ فی تصوف" Studies in Islamic Mysticism کے فاضل مصنف نے حال ہی میں بڑی کاوش اور علمیت سے کام لے کر اس کتاب کی تالیف کی ہے۔ نورالدین عبدالرحمٰن جامی (نفحات الانس، کلکتہ ایڈیشن، صفحہ ۳۱۹) کے قول کے مطابق السراج کو صوفی اولیاء میں بڑا اونچا مقام حاصل ہے۔ جامی کے تذکرے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اعلیٰ پائے کا ریاضیات دان اور علوم مجردہ کا عالم متبحر بھی تھا۔ السراج کی وفات ۳۷۸ ہجری (۹۸۸) میں ہوئی، یعنی امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے ایک سو سال پہلے۔

۳ "اللمعہ" صفحہ ۱۲۹۔ حضرت جنید اسلام کے اولین صوفیاء میں تھے۔ اُن کی وفات ۲۹۷ ہجری (۹۱۰ء) میں ہوئی۔ انہوں نے فرمایا: "صوفیوں کا نظام معتقدہ دین کے ایمانیات اور قرآن سے ایک راسخ رشتے میں مربوط ہے (ابن خلکان)۔

۴ دبیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو "رموز دانِ خدا" کہتا ہے۔

۵ ملاحظہ ہو صفحہ ۵۷۸ خواجہ فرید الدین عطار ۵۴۵ ہجری (۱۱۵۰ء) میں پیدا ہوئے اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ منگولوں کے ہاتھوں ۶۲۷ ہجری (۳۰-۱۲۲۹ء) میں شہید ہوئے۔

سے اور اُن کی وساطت سے آنحضرت ﷺ سے جا ملتا ہے۔ صرف چند ایک کا سلسلہ حضرت بوبکر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

پہلی دو اسلامی صدیوں میں جو مقدس لوگ تھے وہ اتنے صوفی نہ تھے جتنے ارباب توکل تھے۔ اُنھوں نے دنیا ترک کر کے زہد و تقویٰ اختیار کیا تھا۔ اُن کے ممتاز نمائندے ہیں امام حسن بصری[1]، ابراہیم بن ادہم[2]، معروف کرخی[3]، جنید[4]، رابعہ[5] (جن کا نام اسلام کی مقدس خواتین کی فہرست میں ممتاز ہے) بایزید بسطامی اور متعدد دوسرے صوفیہ۔ تیسری صدی ہجری میں، یعنی حضرت جنید رضی اللہ عنہ کے زمانے میں، تصوف فلسفہ اسلامی کی ایک مسلمہ شاخ بن چکا تھا لیکن چونکہ اس میں فکری بے راہ روی کی بہت گنجائش تھی اس لیے اُس نے مختلف لوگوں کے ذہنوں میں غیر اسلامی شکلیں اختیار کرنی شروع کر دیں۔ پرانے خیالات و تصورات کے گڈ مڈ ہو جانے سے جو ڈانواں ڈول رجحانات پیدا ہوئے ابونصر سراج اُن کی مذمت کرتا ہے۔ مسلکِ تصوف کے بعد راہ نوردوں نے تو یہ اعلان کر دیا کہ کامل عرفان عارف کو شرع کی تمام پابندیوں سے آزاد کر دیتا ہے[6]۔

---

[1] بانیٔ اعتزال واصل بن عطاء امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد تھا۔ امام صاحب کی وفات ۱۱۰ ہجری (۷۲۸ء) میں ہوئی۔

[2] ابو اسحٰق ابراہیم ابن ادہم ابن منصور کی بابت ''تذکرہ الاولیا'' میں لکھا ہے کہ وہ بلخ کے شہزادے تھے اُن کے والد ایک رئیس التجار تھے۔ اُنھوں نے ترکِ دُنیا کر کے اپنی ساری دولت غریبوں میں لُٹا دی اور زہد و ریاضت کی زندگی بسر کی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے ۱۶۱ ہجری میں وفات پائی۔

[3] معروف کرخی کا باپ عیسائی تھا۔ وہ امام علی رضا بن بن امام موسیٰ کے ہاتھ سے مشرف بہ اسلام ہوئے اور اُن کے شاگرد تھے، امام صاحب اُن سے پدرانہ شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے'' (علی موسیٰ رضا از روئے رضا بود) '' معروف کرخی امام صاحب کے مکان کے باہر ایک بلوے میں مشہد میں جاں بحق ہوئے۔

[4] حضرت جنید کے وقت تک کیتھولک مذہب کے راہب خانے اور جماعت گاہیں بن چکی تھیں۔

[5] حضرت رابعہ بصری کی وفات ۱۶۰ ہجری میں ہوئی۔ اُنہیں صوفیائے اسلام میں بڑا اونچا رتبہ حاصل ہے۔ اُن کے بعد اور خواتین بھی ولایت سے مشرف ہوتی رہیں، جس کا سلسلہ پاک بی بی پر ختم ہوتا ہے جنھوں نے گزشتہ صدی کے لگ بھگ لاہور میں وفات پائی۔

[6] یہ صوفی جو ہندوستان میں درویش کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں، بے شرع کہلاتے ہیں۔

ابونصر سراج نے امام غزالی ؒ سے بھی پہلے صوفیانہ فلسفے کو منظم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی کوششوں کے باوجود تصوف اپنی پرانی عارفانہ اور قلندرانہ روشوں پر گامزن رہا۔ بہر حال اُن پانچ صدیوں میں جو وفاتِ نبوی اور امام غزالی ؒ کے خروج کے درمیان گزریں ایسے متعدد افراد منصۂ شہود پر آئے جن کا احترام علم و فضل، زہد و تقویٰ اور اوصاف حمیدہ کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک امام غزالی ؒ کے اُستاد امام الحرمین تھے۔

مشرقی تصوف میں جو ربط و نظم اور خوبصورتی و دلکشی ہے وہ بڑی حد تک امام غزالی ؒ کی مرہونِ منت ہے۔ وہ بہت بروقت دنیا میں آئے، کیونکہ سُنی مذہب چند در چند وجوہ کی بناء پر جن سے میں آگے چل کر بحث کروں گا تجدید کا محتاج تھا۔

امام اشعری نے ۳۲۰ ہجری میں وفات پائی۔ امام غزالی ؒ اس کے ۱۳۰ سال بعد، یعنی پانچویں صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوئے اور اُنہوں نے چالیس برس کی عمر میں احیائے دین کا کام شروع کیا۔ چھٹی صدی ہجری اسلام کی تاریخ کا نازک ترین وقت تھی۔ ایک طرف تو دین محمدی ﷺ عیسائیت سے ایک جان جوکھوں کی جنگ میں گتھم گتھا تھا اور دوسری طرف ایک اندرونی دشمن اس کے چشمہ حیات کو مسموم کر رہا تھا۔ حسن بن صباح اپنے آپ کو فاطمی خلیفہ نزار کا، جسے اس کے پیرو امام مجسم سمجھتے تھے، نائب کہتا تھا اور اس بناء پر اپنے پیروؤں سے بے چون چرا اطاعت کا تقاضا کرتا تھا۔ وہ اپنے پیروؤں کو یہ تعلیم دیتا تھا کہ اُس کی ذات جادہ حق ہے۔ اُس کے مرید حشیش کے نشے میں دُھت اُس کے احکام سے سر مو انحراف کئے بغیر اُن کی تعمیل کرتے تھے اور ہوش میں آنے پر انہیں بطور انعام ان نعمتوں کا تھوڑا سا مزہ چکھا دیا جاتا تھا جن کا وعدہ وہ اُن سے آئندہ کی زندگی میں کرتا تھا۔ دُنیا کے ہر گوشے سے جمع کی ہوئی حسین عورتیں اُس کی وہ حورانِ بہشتی تھیں جو اس کے مریدوں کو غلامی کا طوق پہناتی تھیں۔ اُس کے کارکن وسطی اور مغربی ایشیا کے ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں موجود تھے اور مختلف مقاصد کے تحت، لیکن سب کے سب ایک زبردست محرک کے زیرِ اثر، اس کے تفویض کئے ہوئے کاموں کو انجام دیتے تھے۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں اس ہلاکت پیشہ فرقے کا کوئی نہ کوئی رکن بھیس بدل کر

مصروف کار نہ تھا۔ نہ دین کی خدمت، نہ علمی فضیلت، نہ پارسائی، نہ نیک سیرتی کسی شخص کو ان مخربین اسلام کے ہاتھوں سے بچانے کی کفیل تھی۔ لاتعداد بہترین اور افضل ترین مسلمان ان دشمنانِ انسانیت کے ہاتھوں جاں بحق ہوئے۔ ان کی تبلیغ صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھی۔ یہودی، عیسائی، زرتشتی اور ہندو بھی اُن کے دام تزویر میں گرفتار ہوگئے۔ کیا مرد اور کیا عورتیں' بلکہ بچے بھی آسمانی نعمتوں کے فوراً مل جانے کے لالچ میں پڑ کر دین سے منحرف ہوگئے اِن دشمنان اسلام کا مقابلہ کرنے کی خاطر ضروری ہوگیا تھا کہ اسلام کا تحفظ کرنے والی قوتوں کوئی زندگی بخشی جائے۔ مسلک اشاعرہ ایک جامد ظاہریت اور پابندی مراسم بن کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس کے خلاف ردعمل یوں ہوا تھا کہ عوام میں تصوف بے پناہ طور پر پھیل گیا تھا جو کوئی فرائض دینی کو ایک بارِ گراں سمجھتا وہ تصوف کی طرف رجوع کرتا، جس میں تکالیف شرعی سے آزادی تھی۔ لوگوں کے ذہنوں پر خارجی اور داخلی دشمنوں کا ایسا خوف چھایا ہوا تھا کہ فلسفیانہ استدلال سے اُن کی ڈھارس نہ بندھ سکتی تھی۔ اخلاقی ضابطے ڈھیلے پڑ گئے تھے اور بلند خیالی کا فقدان تھا۔ اسلام کی زندگی کا یہ نازک مرحلہ تھا جس میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو صوفیانہ طریقت اور خدا سے براہِ راست لو لگا کر معرفت حق حاصل کرنے کی دعوت دی۔ مضطر اور پریشان دلوں نے اس پر لبیک کہا۔ اس دعوت نے تمام کشمکش رفع کر دی اور صحیح العقیدگی کو حسن صباح کے اسلام کش مبلغوں کی تفرقہ انگیز تعلیمات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک نیا حربہ عطا کر دیا۔

مشیتِ ایزدی کا ایک قاعدہ ہے کہ جب کبھی کوئی مذہب نری ظاہریت بن کر رہ جاتا ہے تو روحِ انسانی کے اعماق سے کوئی ایسی نئی لہر اُٹھتی ہے کہ جس سے اس مذہب میں ایک نئی روحانی قوت پیدا ہو جاتی ہے The Forerunners and Rivals of Christianity کا مصنف ایسے لوگوں کے نام گنواتا ہے جنہوں نے فلسطین کے قدیم مذہب میں زندگی پیدا کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ لیکن وہ نبی ناصری ہی تھا جس نے اسرائیل کے قومی خدا کی جگہ روحِ کل کی پرستش کی دعوت دے کر یہودیت میں نئے سرے سے جان ڈال دی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے ائمہ بیت النبی کے علاوہ وجدانیت کے اور بھی معلم گزرے ہیں مثلاً اُن سے پیشتر سراج اور قشیری تھے۔ لیکن امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی

شروع کی ہوئی عمارت کی تکمیل کی اور سُنی مذہب کو شعریت کی اذعانیت سے نجات دلائی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جو سرگزشتِ حیات بیان کی ہے وہ روحانی نشوونما کی ایک دلچسپ روداد ہے۔ اُس میں وہ اپنے امتحانوں اور ابتلاؤں، اپنے شبہوں اور وسوسوں، اپنی اُمیدوں اور آرزوؤں اور بالآخر اپنے تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا حال سناتے ہیں اُن کے سفر کی آخری منزل توکل تھی یعنی ایک قسم کا روحانی سکون و اطمینان جس میں شک کے سمندر کے تھپیڑے کھانے والے اکثر دلوں کو امان ملتی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ۴۵۰ ہجری (۱۰۵۸ء) میں طوس میں پیدا ہوئے جو صوبۂ خراسان میں مشہد کے قریب ایک مقام ہے۔

انہیں یقیناً ایک خاص طور پر مردانہ اور آزاد روطبیعت عطا ہوئی ہوگی، کیونکہ جیسا کہ وہ ''منقذ'' میں بیان کرتے ہیں، انہوں نے عنفوان شباب ہی میں تقلید ترک کر دی تھی جو تمام مذاہب میں صحیح العقیدگی کا معیار ہے۔ تقلید کو ترک کرنا اور دینی فکر کی اقلیم میں ذاتی رائے کے ایک نئے راستے پر چل نکلنا ایک ایسا کام ہے جسے تمام زمانوں اور تمام مذہبوں میں تحکم پیشہ علمائے دین نے ایک گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔ سنی مذہب میں صحیح العقیدگی کے معنی تھے فقہ کے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے اصولوں کی پیروی کرنا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے قابلِ تعریف جرأت سے کام لے کر ذاتی تحقیق کے بغیر کسی تحکمی مسلک کا اتباع کرنے سے انکار کر دیا۔ بہر حال چونکہ انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو شافعی کہا اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ شافعی مسلک کی کم وبیش پیروی کرتے تھے بلکہ ابن خلکان تو انہیں مسلک شافعی کے علماء میں شمار کرتا ہے۔ ''ان کے آخر عمر میں مسلکِ شافعی میں اُن کے پائے کا کوئی عالم نہ تھا۔'' اپنی عمر کے بیسویں سال میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ طوس سے نیشاپور چلے گئے۔ نیشاپور منگولوں کی تاخت وتاراج سے پہلے جو ۱۲۵۶ء میں واقع ہوئی، علم کا ایک بڑا مرکز تھا۔ وہاں انہوں نے دارالعلوم نظامیہ میں داخل ہو کر، جو چند سال پیشتر قائم ہوا تھا، امام الحرمین الجوینی کی شاگردی اختیار کی۔ جب تک امام الحرمین زندہ رہے یعنی ۴۷۸ ہجری (۱۰۸۴ء) تک امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ امام الحرمین کی شاگردی میں رہے۔ امام الحرمین کی وفات کے وقت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اٹھائیس برس کے تھے اولی العزم کئی

کارِ نمایاں کرنے کے لیے بے تاب اور تمام علوم متداولہ پر حاوی۔ چنانچہ ملک شاہ سلجوقی کے جلیل القدر وزیر نظام الملک کے دربار میں پہنچے۔ نظام الملک نے علوم و فنون کی فیاضانہ سرپرستی کی بدولت علماء و حکماء کا ایک درخشاں حلقہ اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ اس نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی قدر دانی کی اور کچھ عرصے تک اپنے مقربین میں رکھنے کے بعد انہیں بغداد کے ایک مدرسے میں معلم مقرر کر دیا۔ سلجوقی اپنے عروج کے زمانے میں جس وسیع سلطنت پر حکمران تھے اس میں جس طرح سرکاری منصب دار، جن میں مدرس اور معلم بھی شامل تھے، ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جاتے تھے وہ دنیائے اسلام کے ذہنی اتحاد اور اس کے مختلف حصوں کے باہمی ارتباط کا ایک بین ثبوت ہے۔

بغداد میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ چھ سال تک فرائض معلمی انجام دیتے رہے۔ انہوں نے اتنی شہرت پائی کہ مملکت کے گوشے گوشے سے ہر طبقے کے طلباء دینیات الٰہیات اور منطق پر آپ رحمۃ اللہ علیہ کے خطبے سننے کے لیے آنے لگے۔ ۴۸۴ ہجری کے اخیر میں وہ درس و تدریس سے دل برداشتہ ہو کر بغداد سے چلے گئے۔ جن مضامین کا وہ درس دیتے تھے اُن کے غائر مطالعے نے اُن کے دل میں مدرسی علماء کی تعلیمات کے بارے میں شکوک راسخ کر دیئے۔ امام اشعری نے صرف پندرہ دنوں تک گوشہ عزلت میں بیٹھ کر عقلیت اور مقلدیت کے محاسن کا موازنہ کیا تھا اور اس کے بعد وہ صریح نتائج پر پہنچ گئے تھے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی روح کے لیے ایک جائے قرار ڈھونڈنے میں دس سال صرف کئے۔ وہ جائے قرار انہیں ارشاداتِ نبوی میں ملی جن کی صحیح تفسیر کا ملکہ اُن کے قول کے مطابق صانع کائنات نے طالب حق کے دل میں ودیعت کیا ہے۔ اپنی طویل سیاحت کے دوران وہ ہر مرکز علم میں گئے اور ہر ایسی درسگاہ اور خانقاہ کی زیارت کی جس میں علماو اصفیاء دینی یا دنیوی علوم کی تحصیل میں مصروف تھے۔ یروشلم پر صلیبی محاربوں کا طوفان ٹوٹنے سے ایک سال پہلے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اُس مقدس شہر میں تھے۔ ان کا طویل ترین قیام دمشق میں تھا جہاں وہ دریا کے مغربی کنارے پر ایک مسجد میں درس دیتے رہے۔ مسجد میں اُن کا جو حجرہ تھا وہ آج زاویہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے موسوم ہے۔ جب وہ اپنی جہاں گردی ختم کر کے نیشاپور کو لوٹے تو اُن کی عمر کا اڑتالیسواں سال تھا۔ وہ بہت کچھ گرم سرد

زمانہ سہہ چکے تھے، لیکن جس چیز کی تلاش میں وہ سرگرداں رہے تھے وہ اُنہیں مل گئی تھی، یعنی خدا کا علم اور روح کا سکون۔ جن دنوں وہ بغداد میں مدرسی کر رہے تھے اُنہی دنوں یعنی ۴۸۸ ہجری (۱۰۹۲ء) میں اُن کا جلیل القدر اور فیاض مربی نظام الملک حسن بن صباح کے ایک فدائی کے ہاتھوں جاں بحق ہو گیا تھا۔ ملک شاہ بھی اپنے وفادار خادم اور اپنی سلطنت کے رُکن رکین کی وفات کے چھ مہینے بعد اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکا تھا۔ ملک شاہ کا بیٹا سلطان سنجر طغرل اور الپ ارسلان کی سمٹی ہوئی سلطنت پر حکمران تھا اور نظام الملک کا بیٹا فخر الملک اُس کا وزیر تھا۔ فخر الملک اپنے برگزیدہ باپ کی طرح علم پرور تھا۔ اُس نے فوراً امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ و نیشاپور کے دارالعلوم میمونیہ نظامیہ میں ایک اعلیٰ منصب مدرسی پر مامور کر دیا۔ یہاں ایک جید اور کثیر الخلق دماغ کی وہ حیرت انگیز سرگرمیاں شروع ہوئیں جو اسلام کے جذباتی اور صوفیانہ پہلو پر اپنا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت کر گئی ہیں۔

''منقذ من الضلال'' بدیہی طور پر اسی زمانے میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں' جو محض ایک مقالہ ہے' امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے طالبان حق کو تین اصناف میں تقسیم کیا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اُن پر جچی تلی تنقید کر کے اُن کے تحکمانہ نظریات کو رد کیا ہے۔ دوسرا گروہ باطنیہ اور اسمٰعیلیہ کا ہے، جن کا یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے ایک امام معصوم سے سینہ بہ سینہ تعلیم پائیے۔ فلسفیوں کے خیالات کا جائزہ لینے کے بعد، جن میں وہ اخون الصفا کو بھی شامل کرتے ہیں، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیمیہ (یعنی اسمٰعیلیہ) کی دھجیاں اُڑائی ہیں اور اُنہیں منافی اسلام ثابت کیا ہے۔ اُن کا جو یہ دعویٰ ہے کہ وہ ایک زندہ امام کے پیرو ہیں اُس کا جواب امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ یوں دیتے ہیں:۔ ''جب پیغمبر خدا موجود ہیں تو ہم کسی اور رہنما کی پیروی کیوں کریں؟'' پھر وہ کہتے ہیں کہ اگر اُن زندیقوں کے مخالف (یعنی علمائے منقولات) براہین و دلائل میں اتنے بودے نہ ہوتے تو انہیں اتنی کامیابی حاصل نہ ہوتی۔ چوتھا گروہ صوفیوں پر مشتمل ہے، یعنی اہل وجدان اور ارباب مکاشفہ و مشاہدہ۔ جہاں دوسرے لوگ ذاتِ باری کا استنباط عقلی استدلال سے کرتے ہیں، وہاں یہ لوگ جلوہ

حق کے عینی مشاہدے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ابن الاثیر مورخ جس نے اپنی عظیم تصنیف امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد موصل میں لکھی، کہتا ہے کہ ''احیاء العلوم''[1] امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے نیشاپور لوٹنے سے بہت پہلے لکھی۔ اس بارے میں کچھ اختلاف آراء ہے۔ لیکن اس پر تمام اہل الرائے کا اجماع ہے کہ یہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات میں سب سے اہم ہے۔ یہ کتاب ایک قاموس العلوم ہے جس میں تصوف کے فلسفے اور خلاقیات کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا۔

امام اشعری نے اسرارِ وجود کی چھان بین کو ممنوع قرار دیا تھا۔ اگرچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بھی فلاسفہ اور فلسفہ، عقلیت اور اس کے مقاصد کو اسی تحکمانہ انداز سے راندہ درگاہ گردانتے ہیں، پھر بھی وہ اُن کے مقدمے کی سماعت کرنے کے بعد ایسا کرتے ہیں۔ وہ اُن کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں اور اس جائزے کی روشنی میں اُنہیں ناقص پاتے ہیں یعنی اس لحاظ سے ناقص کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نوعِ انسانی کی جو منزل مقصود ہونی چاہیے اُن میں اُسے حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں لیکن اس کے باوجود وہ فلاسفہ اور علمائے معقولات کو مسلمانوں کا ہم قبلہ ہونے کی حیثیت سے دائرہ اسلام میں داخل تسلیم کرتے ہیں۔ مقام تعجب ہے کہ بعد کہ قرنوں کے اکابر صوفیہ شاذ و نادر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا

---

[1] احیاء علوم الدین۔ قاہرہ کا ایڈیشن۔ انڈیا آفس کا نسخہ جن موضوعوں سے یہ کتاب بحث کرتی ہے ان کے ایک اجمالی خاکے ہی سے واضح ہو جائے گا کہ اس کا دائرہ بحث کتنا وسیع ہے اور اس کے مصنف نے کتنی محنت سے کام لیا اور اس کی دماغی استعداد کس پائے کی تھی۔ کتاب کی پہلی جلد علم کی فضیلت پر ایک مقالے سے شروع ہوتی ہے جسے شواہد عقلیہ و نقلیہ سے ثابت کیا گیا ہے۔ پھر عقل کے شرف اور نفس اور عقل، اسلام اور ایمان کے فرق پر ایک بحث ہے۔ جو لوگ ایک ہی قبلے کی طرف سربسجود ہوتے ہیں اُن سب سے رواداری کی تلقین کی گئی ہے۔ دوسری جلد کے مباحث ہیں انسانوں کے ایک دوسرے کے بارے میں فرائض اور والدین اور اولاد کی ایک دوسرے کے بارے میں ذمہ داریاں نفس اور روح قلب اور عقل کی تعریف اور الہام و تعلم میں جو فرق ہے اس کی توضیح کی گئی ہے۔ اس جلد میں اُنہوں نے تصوف کے سارے فلسفے پہ سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور اس بحث کا عنوان اُنہوں نے یہ قائم کیا ہے:۔ ''طریق السوفیہ فی استکشاف الحق و طریق النظار'' تیسری اور چوتھی جلد کا تعلق زیادہ تر اخلاقیات اسلام سے ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ غرور غصہ، انتقام لالچ اور کنجوسی کی مذمت کرتے ہیں اور مروت، علم، عفو، رحم سخا اور مہربانی کو سراہتے ہیں۔ اہل تشیع کے یہاں بھی ''احیاء العلوم'' کا بہت احترام یا جاتا ہے۔ چنانچہ بحار الانوار میں عقل پر علم رجو مقالہ ہے اس میں ''احیاء العلوم'' سے سند پیش کی گئی ہے۔

تذکرہ کرتے ہیں۔ جلال الدین رومی عطار اور سنائی کو تو خراج عقیدت پیش کرتا ہے لیکن غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ ماورائیت کے بار احسان کا نام بھی نہیں لیتا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جذباتی اسلام میں جو حرکت پیدا کی اُس کی قوت زندگی و موت کی اُس جنگ میں زائل ہوگئی جو مسلمانوں کو دو صدیوں تک صلیبی جنگجوؤں کے ساتھ لڑنی پڑی؟ تباہی بغداد کے بعد جو تاریکی مدتوں تک عالمِ اسلام پر چھائی رہی وہ اولاً عیسائیوں کے مغربی ایشیا پر حملہ آور ہونے کا نتیجہ تھی اور ثانیاً منگولوں کے اُس بے پناہ سیلاب کا جس نے وسطی ایشیا کو غرقاب کر کے تہذیب و تمدن کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ بعید از قیاس نہیں کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے فوراً بعد گلشن اسلام پر جو خزاں آئی اس نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے قول و عمل کی مثال کو پھلنے پھولنے نہ دیا۔ پھر بھی تقرب الٰہی ایمان، اپنے تمام حوصلوں اور ولولوں کو لیے ہوئے اُن کے صاحب تب و تاب شاگردوں کے دلوں میں زندہ رہا، اور جہاں فلاسفہ اور علمائے معقولات عقل کے ذریعے خدا کا علم کا حاصل کرتے تھے وہاں عارفین نے مشاہدہ حق کا دعویٰ کیا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے متصوفانہ فلسفے کے جذباتی حصے کو درویشوں کے تکیوں میں پناہ ملی۔ زاویئے رباط اور خانقاہیں چاروں طرف وجود میں آگئیں۔ جہاں کہیں اللہ والے لوگوں نے جو عقل سے ماوراء ایک باطنی بصیرت کے مدعی تھے، ڈیرا ڈالا وہیں مرید آ کر اُن کے گرد جمع ہوگئے۔ ان لوگوں نے سلسلے قائم کیے اور اپنے مریدوں کو تصوف کی رموز سے آشنا کیا۔ ان میں بہت سے مخلص اور راست باز تھے اور بہت سے پاکھنڈی۔ اوّل الذکر کی مثال اور تعلیمات کا اثر جب تک قائم رہا مفید ثابت ہوا۔ مؤخر الذکر کا اثر ان کے منافی اسلام رجحانات کی وجہ سے مخرب اخلاق نکلا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ علم کلام پر بھروسا نہ کرتے تھے اور اُنہوں نے اُسے خلاف عقل کہہ کر اس کی مذمت کی لیکن وہ علوم قطعیہ یعنی حساب، ہندسہ اور اُن کے فروعات کو مضبوط دلائل پر مبنی، نا قابلِ تکذیب اور شک و نزاع سے ماورا تصور کرتے ہیں۔ نیشا پور میں انہوں نے اور کتابوں کے علاوہ "مقاصد الفلاسفہ" اور تہافتہ الفلاسفہ" لکھیں لیکن دونوں کتابیں فلسفہ اور فلاسفہ کی مخالفت میں ہیں اور دونوں میں اُنہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فلسفیانہ استدلال عبث ہے اور فلسفے کی تعلیمات تسلی بخش نہیں۔

جب ماہ محرم ۵۰۰ ہجری میں شیخ الجبل حسن بن صباح کے ایک فدائی نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے سر پرست اور دوست الملک کو قتل کر دیا تو امام صاحب کو بہت قلق ہوا اور وہ اپنے آبائی شہر طوس میں واپس چلے گئے جہاں اُنہوں نے اپنے شاگردوں کے لیے ایک مدرسہ اور اپنے مریدوں کے لیے ایک خانقاہ بنوائی تھی ۔ یہاں وہ درس بھی دیتے رہے اور وہ کتابیں بھی لکھتے رہے جنہوں نے انہیں عالم اسلام کی ایک برگزیدہ شخصیت بنا دیا ہے۔ اس صوفی عظیم کی وفات چودہ جمادی الثانی ۵۰۵ ہجری (۱۸/ دسمبر ۱۱۱۰ء) میں ہوئی۔

اُن کے صوفیانہ میلانات کے باوجود ان میں ایک ایسی مردانہ وار ہمت و جرأت تھی جس کا اثر ان کی وفات کے مدتوں بعد تک قائم رہا۔ چونکہ وہ امام شافعی کے پیرو تھے اس لیے وہ امام ابو حنیفہ کے سخت مخالف تھے، جن کی قیاسی استدلال اور تمثیلی استنباط کی حوصلہ افزائی انہیں بہت ناپسند تھی۔ اس صوفی منش امام نے ایک تو اپنے فلسفہ توکل سے امت مسلمہ کی رگوں میں خون کی گردش سست کر دی اور اُن کے قوائے نشوونما میں اضمحلال پیدا کر دیا، لیکن دوسری طرف اس نے مسلکِ اشاعرہ کو وہ بلند خیالی عطا کی جو اس میں پہلے موجود نہ تھی۔

جس مذہب میں بھی اہل کلیسا اور ارباب فقہ نے اقتدار حاصل کیا ہے اُس میں تقلید کو عائد کرنے اور بدعت کو روکنے کی خواہش نے ایک لعنت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسلام اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں، اگرچہ اس نے کافروں پر اتنی سختی نہیں کی جتنی اہلِ بدعت پر کی ہے۔ کیا مجذوب لوگ یا ایسے لوگ جو نفس کشی اور ریاضت کی افراط کے باعث ہوش حواس کھو بیٹھے تھے اور کیا علمائے عقلی اور مصلحین، ان سب کو اذیتیں پہنچائی گئیں۔ تصوف کی تاریخ میں سب سے دردناک داستان منصور حلاج کی ہے۔ فرید الدین عطار فردوسی کی طرح دلدادہ اہل بیت بھی تھا اور درجہ اول کا صوفی بھی۔ ''مظہر العجائب'' میں وہ اپنی مصیبتوں کی سرگزشت بیان کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کیونکر وہ اپنی جائے ولادت سے شہر بدر کیا گیا، کیونکر اس کا مال و متاع ضبط کر لیا گیا اور پھر کیونکر وہ اُس کے بعد مختلف بلاد و امصار میں پھرتا رہا۔ متعدد صوفیہ ایسے تھے جنہیں سزائے موت دی گئی، متعدد ایسے

ا البیرونی کی ''انڈیکا'' (Indika) کا مشہور معروف مترجم ڈاکٹر شاشو (Dr. Sachau) کہتا ہے: ''اگر عربوں میں اشعری اور غزالی رحمۃ اللہ علیہ پیدا نہ ہوئے ہوتے تو عرب قوم کا ہر فرد گلیلیو (Galileo) اور نیوٹن (Newton) ہوتا۔''

تھے جنہیں موت کے بعد سزا ملی، یعنی اُن کی تصنیفات نذرِ آتش کر دی گئیں۔ اور تو اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی ''احیاء العلوم'' کو اسی طرح نوازا گیا، اور کہاں؟...... قرطبہ میں' جو کسی زمانے میں اسلامی ثقافت و شائستگی کا مرکز رہ چکا تھا۔ لیکن یہ ظلم و ستم تصوف کو پھیلنے سے نہ روک سکا۔ ہر مقدس شخص جس کے گرد چند مرید جمع ہو گئے ولی بن گیا۔ اولیاء کو صاحب کشف و کرامت سمجھا گیا۔ اگر ابتدائی ایام کے ممتاز ترین صوفیہ مثلاً جنید بغدادی اور بایزید بسطامی نے، جنہیں اب اولیاء اللہ کی صف اول میں شمار کیا جاتا ہے، کرشمہ نمائی اور شعبدہ بازی کو مذموم قرار دیا، پھر بھی ''تذکرہ اولیاء'' اور ''نفحات الانس'' میں اولیاء کے بے شمار ایسے عمال بیان کئے گئے ہیں جو عام انسانی تجربے سے باہر ہیں۔ ان خارقِ عادت کاموں کو کرامات کہا جاتا ہے کیونکہ وہ خدا کی طرف سے ودیعت کی ہوئی خاص قوتوں کے ذریعے ظہور میں آئے۔ آج کل ہم غالباً انہیں نفسیاتی اثر انگیزی پر محمول کریں گے۔ ہپنٹزم (Hypnotism) اور مسمریزم (Mesmerism) جنہیں ''تاثیر الانظار'' کا نام دیا جاتا تھا اور اشراق یا ابلاغِ نفسی (Telepathy) مدتوں سے مشرق میں معروف ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اولیاء کے بعض کرشمے غیر شعوری ہپنٹزم کا نتیجہ تھے۔

تصوف عراق اور ایران سے شروع ہو کر بہت جلد ہندوستان پہنچا جہاں اُسے سازگار فضا میسر آئی۔ شمالی ہندوستان میں بھی اور دکن میں بھی بہت سے صوفیا و اولیاء گزرے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی ہی میں تقدس اور اعمال حسنہ کی بدولت بڑی شہرت پائی۔ اُن کے مزار آج تک مسلمانوں کی، بلکہ ملاحظہ طلب بات ہے کہ ہندوؤں کی بھی زیارت گاہیں ہیں۔ یہ اولیاء اُن مریدوں اور عقیدت مندوں کو جو اُن کے قائم کئے ہوئے مدرسوں اور خانقاہوں میں جمع ہوئے تھے اسلامی معرفت اور صوفیانہ طریقت کی تعلیم دیتے تھے۔ اپنے جانشینوں کی طرح یہ سجادہ نشین کہلاتے تھے اور حقیقت میں روحانی معلم تھے۔ مغرب میں روحانی معلم کو شیخ کہتے ہیں اور ہندوستان میں پیر یا مرشد۔ پیر کی وفات پر اس کے جانشین کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ مریدوں کو درویشی اور تصوف کا محرم اسرار بنائے۔ بیعت لینے اور روحانی علم عطا کرنے کا کام اُن وظائف میں سے ہے جن کی ذمہ داری سجادہ نشین پر عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنے مورث کے مزار کا متولی مہتمم اور اُس کے

روحانی سلسلے کی ایک کڑی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں جو درگاہیں جا بجا دکھائی دیتی ہیں وہ مشہور و معروف درویشوں کے مرقد ہیں جو اپنی زندگی ہی میں اولیاء اللہ تسلیم کیے گئے۔ ان میں سے بعضوں نے خانقاہیں بنائی تھیں جہاں وہ رہتے بھی تھے اور صوفیانہ عقائد کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ بہت سے ایسے تھے جن کے پاس کوئی خانقاہ نہ تھی لیکن ان کی وفات کے بعد اُن کے مرقد زیارت گاہیں بن گئے۔ ان میں زیادہ صوفی تھے لیکن بعض بلاشک و شبہ میاں روشن بایزید کے پیرو تھے، جو اکبر کے عہد میں گزرا اور جس نے ایک علیحدہ باطنی سلسلہ قائم کیا جس میں سربراہ کو ایک خاص طور پر ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو درویش یا فقیہ کہتے تھے، اس مفروضے کی بناء پر کہ وہ دنیا کو ترک کر چکے تھے اور خدا کے ادنیٰ خادم تھے۔ اُن کے پیرو اُنہیں شاہ کے معزز لقب سے پکارتے تھے۔ اگرچہ فارسی کا لفظ ''درویش'' اپنے ماخذ و معنی کے لحاظ سے اسلامی لفظ ہے، درویش ہمیشہ سے مغربی ایشیا میں موجود رہے ہیں۔ عبرانیوں کے عام پیشوا جنہیں نبی کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے، محض آج کل کے درویشوں کا نمونہ اصلی تھے۔ یوحنا اصطباغی جس نے ہیرڈ (Herod) کی بیوی کے حضور گستاخی کی وجہ سے اپنی جان گنوائی، اُس نے بالکل وہی کیا جو اُس کے بعد سینکڑوں درویشوں نے کیا ہے ان سب نے بادشاہوں کو اپنے محلوں اور بھرے درباروں میں ٹوکا اور للکارا۔ ہندوستان کے صاحب ولایت درویشوں میں جو لوگ سب سے زیادہ مشہور ہیں اُن میں ایک شاہ نظام الدین اولیاء ہیں، جو غزنی سے آئے اور جن کا مزار دہلی کے مضافات میں ہے، جہاں اُنہوں نے سالوں قیام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات[1] ۱۳۲۵ء میں ہوئی۔ خواجہ معین الدین چشتی معلوم ہوتا ہے کہ نظام الدین اولیاء سے پہلے ہندوستان آئے انہوں نے ستانوے سال کی عمر پائی اور ۶۶۳ھ (۱۲۶۵ء) میں اجمیر کے مقام پر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کا مزار سارے ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی زیارت گاہ ہے[2]۔

---

[1] علاؤالدین خلجی کے عہد حکومت میں۔ علاؤالدین ان کا مرید تھا۔

[2] خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ (جنہیں عموماً ہندوستان کے ارباب تصوف میں مولانا حضرت سلطان المشائخ کے نام و لقب سے یاد کیا جاتا ہے) ابراہیم ادہم کے سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک اور ولی برہان الدین کا مزار وسطی ہندوستان کے شہر برہان پور میں ہے جس کا نام اُن کی نسبت سے رکھا گیا۔ شاہ کبیر درویش اٹھارہویں صدی عیسوی میں فرخ سیر کے عہدِ حکومت میں ہوئے۔ وہ بہار کے شہر سا سرم میں مدفون ہیں۔ اُن کے اخلاف اُن کے مزار کے سجادہ نشین ہیں۔ دہلی کے پٹھان بادشاہ علاؤ الدین خلجی کے درباری شاعر امیر خسرو کو بھی صوفی اعلیاء میں شمار کیا جاتا ہے۔

مغرب میں بھی اسی طرح ہر طرف درویشوں کے حلقے قائم ہو گئے۔ ان سب سے مشہور اور غالباً سب سے زیادہ صاحب نفوذ سلسلہ قادریہ ہے جس کے بانی سنی ولی شیخ محی الدین عبدالقادر گیلانی تھے[۱] ایک اور سلسلے کی بناء مولانا جلال الدین رومی نے ڈالی۔ اس سلسلے کا نام مولویہ ہے اور اس کے پیرو زہد و ورع میں ممتاز ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور سلسلہ نقشبندیہ ہے جس کے ہندوستان میں ہزاروں تابعین ہیں۔

لیکن ولایت صرف معدودے چند لوگوں کے حصے میں آئی ہے اور ان سے بھی کم لوگوں کے حصے میں یہ سعادت آئی ہے کہ زہد و اتقا میں بھی منہمک ہیں اور آئے دن کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸۰) ابراہیم ادہم کی وساطت سے ان کا سلسلہ طریقت امام حسن بصری سے اُن کے ذریعے حضرت علیؓ اور اُن کے ذریعے سرور کائنات رسول خدا ﷺ سے جا ملتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی ؒ سلسلہ چشتیہ کے بانی ہیں۔ تین سو سال بعد اسی سلسلے کے ایک بزرگ شیخ سلیم چشتی اکبر اعظم کے مرشد بنے اور اکبر نے اپنے بیٹے اور ولی عہد جہانگیر کا نام اُنہیں کی نسبت سے سلیم رکھا۔ اسی طرح مولانا جلال الدین رومی جنید بغدادی کے ذریعے اپنا سلسلہ آٹھویں امام بیت النبی حضرت موسیٰ رضا سے، اور اُن کے ذریعے حضرت علیؓ اور رسول خدا ﷺ سے جوڑتے تھے۔

۱؎ شیخ عبدالقادر گیلانی حضرت علیؓ کی اولاد میں سے تھے اور ان کی طرف بہت سی کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ کردوں کے محافظ ولی ہیں اور ہندوستان کے سنی صوفیہ ان کا حد درجہ احترام کرتے ہیں۔ انہیں عموماً غوث اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ Les Confreries Religieuses Musulmanes (MM Dupont ET Coppolani Vol, 1, P, 393) کے مصنفین کے قول کے مطابق سلسلہ قادریہ مشرق میں بہت وسیع اثر و نفوذ رکھتا ہے اور اس کے پیرو جاوا اور چین میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے زاویے مکہ اور مدینہ میں بھی ہیں۔ Confereries کے مصنفین لکھتے ہیں: ''خدمت خلق کی خاطر ترک نفس و وجد و حال جو بیہوشی کی حد تک پہنچ جاتا ہے، اعلیٰ درجے کی خدمت نوع بشر بلا امتیاز مذہب و ملت، انتہائی جود و سخا، زبردست پاکبازی، ہر کام میں عجز و انکسار اور شفقت و احسان۔ ان خوبیوں نے شیخ عبدالقادر گیلانی کو اسلام کا سب سے محبوب اور ہر دلعزیز ولی بنا دیا ہے۔''

زندگی کے فرائض بھی ادا کریں۔ عامتہ الناس کے لیے دنیا کو ترک کرنے اور خدا کے ذکرو فکر میں ہمہ تن محو رہنے کی دعوت دماغی جمود و عطل کی ترغیب ہوتی ہے مسلم اقوام کے موجودہ انحطاط کی ذمہ داری میں اشعری مسلک کی ظاہری پابندی شرع اور صوفیہ کی تعلیم توکل دونوں برابر کی شریک ہیں جس قسم کی صوفیانہ تعلیم ذیل کے اشعار میں دی گئی ہے اس کا نتیجہ ذہنی مفلوجیت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔

کشکول کو تاج خسروانی سمجھے　　　دنیائے دنی کو محض فانی سمجھے
دریائے حقیقت کو وہی جاوے پیر　　　جو قصہ عمر کو کہانی سمجھے

اب ضروری ہے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا صوفیانہ حب الٰہی اور صوفیانہ طریق زندگی کے بارے میں جو تصور تھا اُس کی طرف رجوع کیا جائے۔ (امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا یقیناً یہ دعویٰ نہ تھا کہ رموزِ کائنات کا علم انہی تک محدود ہے اور اُن کے عقائد میں اتنی باطنیت و سریت بھی نہ تھی جتنی بعد کے صوفیہ کے مسلکوں میں پیدا ہوگئی۔ انہوں نے علامہ سراج کی طرح ایک لائحہ حیات مرتب کیا جسے وہ قرب الٰہی اور مشاہدہ حق کی سعادت حاصل کرنے کا صحیح طریقہ خیال کرتے تھے۔ لیکن چونکہ انہوں نے اس طریقے پر جو زور دیا اس کا دارومدار اُن کے نظریہ کائنات پر ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم مؤخرالذکر کے بنیادی خصائص کے بارے میں کچھ کہیں۔ انہوں نے جو یہ کہا کہ ساری فطرت اور ساری موجودات بلاواسطہ قادرِ مطلق کی تخلیق ہے یہ قرآن کے ارشادات کی ایک صدائے بازگشت تھا۔ جب وہ من حیث الکل کائنات کے بارے میں اپنا تصور پیش کرتے ہیں تو اُن کے نظریے کا احاطہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ اُنہوں نے کائنات کو دو اصناف میں تقسیم کیا یعنی مرئی اور غیر مرئی۔ مرئی دنیا (جسے وہ عالم الملک کے نام سے موسوم کرتے ہیں) مادے کی دنیا ہے اور یہ دنیا ارتقاء اور تغیر و تبدل کے قانون کی تابع ہے یہاں ہو معتزلہ کے ہم نوا ہیں۔

غیر مرئی دنیا کو جس کا ادراک انسانی حواس نہیں کر سکتے وہ دو ذیلی اصناف میں تقسیم کرتے ہیں؛ اوّل عالمِ جبروت جو مادہ خالص اور روحِ خالص کے مابین ہے۔ وہ کلیتہً مادہ بھی نہیں اور کلیتہً روح بھی نہیں، بلکہ دونوں کے خواص کا حامل ہے۔ قوائے فطری اس ذیلی صنف میں داخل ہیں۔ اگر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ آج کل زندہ ہوتے تو غالباً وہ جدید

سائنس کے بعض انکشافات مثلاً ریڈیم کے خواص کو عالم جبروت میں جگہ دیتے۔ اُن کے نظریے کا سب سے دلچسپ حصہ اُن کا خالص روح کی دنیا (یعنی عالم ملکوت) کے بارے میں تصور ہے۔ عالم ملکوت عالم امثال (عالم معانی) ہے۔ روح انسانی اس عالم کی رہنے والی ہے۔ وہ ایک شرارے کی طرح اپنے مرز بوم سے آتی ہے اور اپنے جسدِ ارضی سے جدا ہوتے ہی جہاں سے آئی تھی وہیں واپس چلی جاتی ہے۔

یہ تقسیم امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن سے اخذ کی۔ انہیں قیاسی استدلال سے جو نفرت تھی وہ انہیں دلائل و براہین کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچنے میں مانع نہ ہوئی۔ نہ ان کا نظریہ نیا تھا، نہ اُن کی تقسیم نئی تھی۔ فارابی ''عیون المسائل'' میں اُن کی پیش قدمی کر چکا تھا۔ قرآن میں جو میزان مذکور ہے جس میں اعمالِ انسانی تولے جائیں گے، جو قلم مذکور ہے جس سے خدا کے تقدیری احکام درج کئے جاتے ہیں اور جو لوح مذکور ہے جس پر وہ درج ہوتے ہیں، ان تینوں کو معتزلہ تمثیلی اور مجازی کہتے تھے۔ جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے، امام اشعری انہیں واقعی اور جسمانی اشیاء سمجھتے تھے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ایک نئی روش اختیار کرتے ہیں۔ وہ انہیں عالم ملکوت (یعنی عالم امثال یا عالم معانی) کی چیزیں تصور کرتے ہیں۔ یہ تھا وہ اسلوب جس سے انہوں نے ظاہریت اور مقلدیت کو اپنے نورِ باطن اور روح انسانی کی خواہش صعود کے نظریے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

بعض انتہا پسند صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ جب روح انسانی کو قرب الٰہی حاصل ہو جاتا ہے تو وہ ذاتِ باری میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ اُسے وہ کبھی حلول اور کبھی اتحاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں لیکن علامہ سراج اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ دونوں نے اس وحدت الوجودی تصور کی تردید کی، اگرچہ دونوں کبھی کبھی ذات باری کے قرب کو واضح کرنے کے لیے وصال یا وصلت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جب صوفی فنا فی اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو اُس وقت بھی ان کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ روح انسانی روح کل میں ضم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اپنے عظیم پیش رو کی طرح امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل ہیں کہ انفرادی روح عالمِ ملکوت سے آتی ہے، جو ذات باری سے قریب ترین ہے اور اپنے جسدِ مادی سے جدا ہونے پر اپنے اصلی وطن کو لوٹ جاتی ہے۔ اُن کے نزدیک قرآن کے اس اعلان کا کہ

"انا للہ وانا الیہ راجعون" یہی مفہوم ہے۔

جہاں تک لوازم دین کا تعلق ہے، معتزلہ، اشعریہ اور امام غزالیؒ کے تابعین میں کوئی اختلاف نہیں۔ اُن میں جو اختلاف ہے وہ اُس زاویہ نگاہ کا ہے جس سے وہ ایمانیات اسلام کو دیکھتے ہیں۔ حامیانِ عقل کہتے ہیں کہ خدا کا علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ وہ عقل سے اس لیے استناد کرتے ہیں کہ قرآن نے خدائے واحد کی عبادت کی جو دعوت دی وہ عقل پر مبین ہے۔ اشعریہ کسی چیز پر ایمان لاتے ہیں تو اس لیے کہ اُنہیں اس کی تعلیم دی گئی اور صوفیہ اس لیے کہ اُن کا نورِ باطن انہیں وہ چیز دکھاتا ہے۔ صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ طالب حق اپنے اندر گم ہو کر اور خدا سے لو لگا کر درجہ بدرجہ ایک ایسے مقام پر پہنچ سکتا ہے، جہاں اُسے ذات باری کا دیدار نصیب ہو جاتا ہے۔ مبتدی کے لیے پہلا قدم نیت ہے اور دوسرا قسم توبہ۔ یہ مجاہدے کا مرحلہ ہے۔ ایک طویل مدت تک اس مرحلے میں رہنے کے بعد طالب حق کی روح ذاتِ باری کے حضور میں حاضر ہوتی ہے، لیکن ابھی پردہ ہٹا نہیں ہوتا۔ حافظ ایک بے خودانہ انداز سے ذیل کے شعر میں اس مرحلہ حضور کی طرف اشارہ کرتا ہے، جسے اصطلاحاً مظاہرہ کہتے ہیں اور جس میں روح دنیا اور اس کی بے حقیقت چیزوں کو ترک کر کے اپنے آپ کو کلیتہً خدا کے سپرد کر دیتی ہے:۔

حضوری گر ہمی خواہی ازو غائب مشو حافظ ۔۔۔ متیٰ ما تلق من تہوٰ دع الدنیا و اہملہا

اس کے بعد مرحلہ مکاشفے کا ہے جس میں پردہ غیب اُٹھ جاتا ہے اور ذاتِ باری کی تجلی طالب کے دل پر آشکار ہو جاتی ہے۔ آخری مقام مشاہدہ ہے، جس پر پہنچ کر عاشق صادق کی روح اپنے آپ کو عین حضورِ حق میں پاتی ہے اور قریب سے اُس کے نور کا دیدار کرتی ہے۔

ابتدائی مرحلے میں بھی اپنی تمام توجہ کو ایک خیال پر مرکوز کرنے کی نفسیاتی کوشش کے باعث مرید کو رویتیں دکھائی دیتی ہیں اور ملائکہ و انبیاء کی آوازیں سنائی دیتی ہیں جن سے وہ ہدایت حاصل کرتا ہے۔ عیسائیت میں بھی وجد و بے خودی کی بالکل اسی طرح کی نفسیاتی کیفیتیں ہر زمانے میں معروف رہی ہیں۔ صوفیہ کی اصطلاح میں انہیں حال کہتے ہیں۔ حال میں ایک سرخوشی اور ذوق و شوق کا عالم ہوتا ہے۔ حال آتے ہی

طالب پر ایک از خود رفتگی سی طاری ہو جاتی ہے خانقاہوں میں درویش اکثر سر دُھن دُھن کر اپنے اوپر یہ کیفیت طاری کرتے ہیں ہوئے دیکھے جاتے ہیں[1]۔

صوفیہ کا یہ دعویٰ ہے کہ انہیں نورِ باطن کے ذریعے خدا کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ مدعیانِ عقلیت کہتے ہیں کہ وہ عقل کے ذریعے خدا کو پہچانتے ہیں جو خود خدا کا ایک عطیہ ہے کیا قرآن انسان کی عقل اور سمجھ بوجھ سے بار بار یہ تقاضا نہیں کرتا کہ وہ خدا کی کائنات اور فطرت کے اسرار پر غور و فکر کرے؟ اگر قرآن عقل سے کام لینے کو برا سمجھتا تو وہ اپنے مخاطبوں کو بار بار یہ تلقین کیوں کرتا کہ وہ قدرت کے عجائبات پر نظر ڈالیں اور خود نتیجہ نکالیں کہ آیا یہ حیرت انگیز دنیا اتفاقاً ظہور میں آ گئی یا اسے ایک عقلِ کل نے خلق کیا؟ دین اور عقل لازم و ملزوم کے رشتے میں مربوط ہیں۔ اگر ہمیں قرآن میں کوئی ایسی بات دکھائی دے جو سطحی نظر میں فلسفے کے نتائج سے متصادم معلوم ہوتی ہے تو ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ اس کے کوئی مکتوم معانی ہیں جن کا بے نقاب کرنا عقل کا کام ہے۔ ابن رشد اپنی ''فصل المقال'' میں بڑی صراحت سے یہ دعویٰ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دین اور فلسفے میں کوئی اختلاف نہیں، دین وحی الٰہی کے ذریعے مکشوف ہوتا ہے، فلسفہ نفسِ انسانی کی تخلیق ہے۔ چنانچہ اُس کے اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے اندازِ فکر میں کوئی زیادہ تبائن نہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ یہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ زمین سپاٹ ہے محض اس وجہ سے کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ ''خدا نے اُسے ایک فرش کی طرح بچھا دیا ہے۔'' وہ سائنس کے تمام انکشافات کو اور ریاضی و ہیئت کے تمام نتائج کو قبول کرتے تھے۔ ستارے اور سیارے مقدور قوانین کے مطابق گردش کرتے ہیں۔ فطرت خود اُس قدرت، رحمت اور حکمت کا ثبوت مہیا کرتی ہے جس نے اُسے پیدا کیا۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ابن سینا اور ابن رُشد اور من حیث العموم علمائے عقلی سے کلیتہً متفق ہیں۔ اگر بامعانِ نظر دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے اشعریت کو ایک یخ بستہ ظاہریت بن کر رہ جانے سے بچا لیا اور

---

[1] جس مجلس میں درویش جمع ہو کر اپنے اوپر حال طاری کرتے ہیں اُسے مجلس ذکر کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ڈی، بی میکڈانلڈ (Dr. D.B. Macdonald) نے اپنی کتاب Aspects of Islam میں ایک مجلسِ ذکر کا جو ایک مصری زاویے میں منعقد ہوئی بڑا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ ہندوستان میں ذکر کی محفلیں عموماً اولیاء کے عرسوں کے موقعہ پر منعقد ہوتی ہیں۔

اُسے ایک مرتفع جذباتیت سے وابستہ کر کے اس میں نئے سرے سے جان ڈال دی۔ ان حکمائے کبار کے ہم خیال و ہمنوا تھے۔

سنوسی جماعت سلسلۂ قادریہ کی طرح ایک باقاعدہ سلسلہ نہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی ترقی تہذیب اور اصلاح کا جو کام وہ شمالی اور مشرقی افریقہ میں کر رہی ہے اس کے ذریعے وہ اخوان الصفا کی تعلیمات میں ایک صوفیانہ معنویت پیدا کر رہی ہے۔ اس جماعت کے مشائخ اپنے مقلدوں اور مریدوں کو اس جدو جہد اور ترقی کی دنیا سے منقطع کیے بغیر انہیں علم باطن کے سبق سکھاتے ہیں۔

وہ فکر بلند پرواز پیغمبر اسلام ﷺ کے ارشادات میں اماموں کے خطبات میں اور نورِ باطن کے مفسروں کی تعلیمات میں چاہے وہ علمائے معقولات ہوں یا فلاسفہ یا صوفیہ جیتی جاگتی دکھائی دیتی ہے، اسلام کے اشرف ترین افراد کی زندگیوں کو ایک مثالی ڈھانچے میں ڈھالتی رہی ہے اور اُن کے کارناموں کا ایک الہامی محرک رہی ہے۔ عماد الدین زنگی جیسے شجاعوں اور صلاح الدین ایوبی جیسے حکمرانوں نے اُسے اپنا قطب تارا، اپنا کوکب رہنما پایا ہے۔ سنائی عطار اور جلال الدین رومی جیسے شعراء نے جوش و خروش اور سوز و گداز کے ساتھ اُس ہمہ گیر ملکوتی محبت کے گیت گائے ہیں جو اسفل ترین مخلوق سے لے کر اعلیٰ ترین مخلوق تک ساری کائنات فطرت کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے اور ان کے کلام کا جو احترام ہزاروں مسلمان کرتے ہیں اُس سے زیادہ احترام وہ قرآن کے سوا کسی کا نہیں کرتے۔

لیکن جہاں تک تصوف کے عملی اثرات کا تعلق ہے اس نے اسلامی دنیا میں بہت سے ایسے مضر نتائج پیدا کیے ہیں جیسے اس کے مد مقابل نے عیسوی دنیا میں کیے۔ کامل طور پر موزوں طبیعتوں میں تصوف ایک بلند عینی و مثالی فلسفے کی شکل اختیار کر لیتا ہے لیکن جب عوام الناس ذاتِ باری کی رموز اور اس کے ساتھ اپنے تعلقات پر سوچ بچار کرنے میں مگن ہو جائیں تو اُن کے دماغ اکثر ماؤف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر جاہل اور نکما شخص جس نے صحیح علم سے نفور ہو کر حقیقی فلسفے کے میدان سے منہ موڑ لیا اور تصوف کی اقلیم میں مداخلتِ بیجا کی اپنے آپ کو اہل معرفت کے زمرے میں شمار کرنے لگا۔ یہ امر کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں فی الواقعہ ایسا ہوا اُن کی اس تلخ کامانہ شکایت سے ظاہر ہے

کہ اور تو اور کسان بھی کھیتی باڑی چھوڑ کر رہبرانِ طریقت ہونے کے دعوے کر رہے تھے۔
درحقیقت عامیانہ تصوف پر، چاہے وہ اسلام میں ہو یا عیسائیت میں، سب سے بڑا اعتراض ہی یہ عائد ہوتا ہے کہ چونکہ وہ بجائے خود کوئی مذہب نہیں اس لیے جہاں کہیں بھی اس کا چرچا ہوتا ہے وہاں لوگوں کے دماغ مختلف ہو جاتے ہیں۔ معاشرے کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور انسان کی قوتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے۔ عامیانہ تصوف قدرتی طور پر انسان پرستی اور فطرت پرستانہ وحدت الوجود کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اس کے باوجود عینی فلسفے کی اشرف صورتوں نے انسانوں کو اتنے فائدے پہنچائے ہیں کہ اُنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ابن رُشد کی عینیت نے یورپ میں آفاق گیر الوہیت کے تصور کو جنم دیا۔ عیسوی یورپ میں جو داخلی وحدت الوجود بہار پر آئی اور جس نے اُسے ایک صنمیاتی مذہب کو شدید مادیت سے نجات بخشی وہ اس امر کی مرہون منت تھی کہ نفس مغربی میں اسلامی عینیت کا پیوند لگ گیا۔ وہ ابن رُشد کی تصنیفات کا ہی اثر تھا جس نے عالم مادہ اور عالم نفس کے باہمی تعلقات کے مسئلہ عظیمہ کی طرف غور و فکر کرنے والے لوگوں کی توجہ مبذول کرائی اور ایک محیط کل روح کے تصور کو دوبارہ زندہ کیا...... یعنی ایک ایسی روح جو "پتھروں کے اندر سوتی ہے، حیوانوں کے اندر خواب دیکھتی ہے اور انسانوں کے اندر جاگتی ہے" اور "یہ عقیدہ کہ وہ پوشیدہ اصولِ حیات جو تنظیم کی متنوع صورتیں پیدا کرتا ہے اس ذاتِ باری کے من کی ایک موج ہے جو ہر چیز میں موجود ہے۔"

جانِ عالم گویمش گر ربطِ جاں دانم بہ تن
دردلِ ہر زرہ ہم پنہاں وہم پیدا ستی

ضمیمہ ۳

ضمیمہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ حذف کر دیے گئے ہیں اس لیے کہ ضمیمہ نمبر ۱ میں عربی اشعار کا ترجمہ ہے، جو متن میں دے دیا گیا ہے اور ضمیمہ نمبر ۲ میں قرآن شریف کی آیات ہیں، جن کا ترجمہ متن میں آ گیا ہے۔

ہیئت دان علی ابنِ یونس ہر فن مولا تھا۔ ابن خلکان لکھتا ہے کہ اگرچہ اُس نے ہیئت میں خصوصیت پیدا کی، تاہم وہ دوسرے علوم میں بھی مہارت رکھتا تھا اور ایک قادر الکلام شاعر بھی تھا۔

بمبئی کے جریدہ انڈین سوشل ریفارمر (The Indian Social Reformer) کے شمارہ بابت ۲۸ جولائی ۱۹۰۱ء میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں میری تحریر بعنوان ''دی لبرل مومنٹ ان اسلام'' (The Liberal Movement in Islam) کی داد دی گئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ میری توجہ موسیو ریناں (M. Renan) کے بعد دعاوی کی طرف مبذول کرائی گئی تھی جو انہوں نے اپنے ایک لکچر میں کیے تھے جو انہوں نے سوربون (Sorbonne) یونیورسٹی میں مارچ ۱۸۸۳ء میں دیا تھا۔ اس لکچر میں موسیو ریناں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام سائنس کا مخالف ہے اور مسلمانوں کو سائنس سے شغف پیدا ہوا تو اس وقت جب اُن کے مذہبی انہماک میں کمی واقع ہوئی۔ وہ کہتے ہیں: ''خلیفہ عمرؓ کو جو الزام اکثر دیا جاتا ہے کہ انہوں نے اسکندریہ کے کتب خانہ کو نذرِ آتش کر دیا یہ الزام درست نہیں، کیونکہ وہ کتب خانہ اُن کے وقت تک تقریباً نیست و نابود ہو چکا تھا لیکن انہوں نے جس اصول کو تسلط بخشا وہ حقیقی معنوں میں عملی تحقیق اور گونا گون دماغی مشاغل کے حق میں مہلک تھا۔''

اس بے سروپا اور بے محابا دعویٰ پر، جو اس لیے خاص طور تعجب انگیز ہے کہ

(Averroes and Averroism) کے مصنف نے کیا ہے، شیخ جمال الدین افغانی نے، جو اُس وقت پیرس میں مقیم تھے، اعتراض کیا۔ موسیو رینان نے اس اعتراض کا جو جواب دیا وہ سبق آموز ہے۔ فاضل فرانسیسی کو اپنے تعمیمی دعوے کی تخصیص کرنی پڑی اور یہ عذر پیش کرنا پڑا کہ اسلام سے ان کی مراد وہ دین محمدی تھا جس پر مسلم جماعتوں کے ناخواندہ اور متعصب افراد اعتقاد رکھتے اور عمل کرتے ہیں۔ میں ذیل میں وہ عبارت پیش کرتا ہوں جس میں موسیو رینان نے یہ تخصیص کی ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ اس کی بدولت مسلمانوں میں اپنی ذمہ داریوں کا کچھ احساس پیدا ہو سکے:

''اس بحث کا ایک پہلو یہ ہے جس میں میں نے شیخ صاحب کے نزدیک انصاف سے کام نہیں لیا۔ میں نے اپنے اس نظریے کی پوری پوری صراحت نہیں کی کہ تمام الہامی مذاہب مثبت طبعی علوم کی مخالفت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور اس معاملے میں عیسائیت کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اسلام پر تفوق کا دعویٰ کرے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام نے ابن رُشد کے ساتھ جو سلوک روا رکھا عیسائیت نے گلیلیو (Galileo) کے ساتھ اس سے بہتر سلوک نہیں کیا۔ گلیلیو نے کیتھولک مذہب کی مخالفت کے باوجود ایک کیتھولک رہتے ہوئے ایک طبعی حقیقت کا انکشاف کیا، بالکل اسی طرح جس طرح ابن رُشد نے ایک اسلامی ملک میں رہتے ہوئے اسلام کی مخالفت کے باوجود فلسفیانہ تحقیق و تدقیق کی۔ میں نے اگر اس نکتے پر زیادہ زور نہیں دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس بارے میں میری جو رائے ہے وہ اتنی معروف ہے کہ ایک ایسے مجمع کے سامنے جو میری تصنیفات سے بخوبی واقف ہے مجھے اس کے دہرانے کی ضرورت نہ تھی۔ میں یہ بات اتنی بار کہ چکا ہوں کہ اس کی تکرار تحصیل لا حاصل ہے کہ اگر ذہن انسانی اپنا اصلی کام انجام چاہتا ہے، جو یہ ہے کہ وہ مثبت علوم کی نشو و نما کرے، تو اُسے ہر طرح کی مافوق الفطرت اور خارقِ عادت چیزوں پر اعتقاد ترک کرنا ہوگا۔ اس میں نہ کوئی شدت آمیز تخریب مضمر ہے اور نہ کوئی جلد بازانہ قطع تعلق۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ عیسائی عیسائیت کو اور مسلمان اسلام کو ترک کر دیں۔ اس کے معنی صرف اتنے ہیں کہ عیسائی اور مسلم جماعتوں کے روشن دماغ افراد کو اپنے اندر ایک ایسی بے لاگ اور بے لگاؤ کیفیت

پیدا کرنی چاہیے، جس میں مذہبی عقائد مضرت سے خالی ہو جاتے ہیں۔ یہ کام آدھے کے قریب عیسائی ممالک میں ہو چکا ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ایک دن مسلم ممالک میں بھی ہو جائے گا۔ اس دن شیخ صاحب اور میں متفق الرائے ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کی دل کھول کر داد دیں گے...... میں نے یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ تمام مسلمان با امتیاز نسل جہالت میں غرق ہیں اور ہمیشہ غرق رہیں گے۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ اسلام سائنس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے اور جو ممالک اس کے زیرِ نگیں ہیں اُن میں اُس نے گزشتہ پانچ چھ صدیوں کے دوران سائنس کو پروان چڑھنے سے روکے رکھا ہے، جو اپنے ملکوں کے لیے انتہائی درجے کی کمزوری کا باعث ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میری رائے میں ان ملکوں کا احیاء، اسلام کی وساطت سے کبھی نہ ہوگا، بلکہ اگر ہوا تو اسلام کے تسلط میں کمی ہونے کی بدولت ہوگا، بالکل اسی طرح جس طرح عیسائی ممالک کی ترقی اس وقت شروع ہوئی جب قرونِ وسطیٰ کے استبداد شیوہ کلیسا کا خاتمہ ہوگیا۔ بعض لوگوں نے میرے لکچر کو ایسے معنی پہنائے ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مجھے اُن افراد سے عداوت ہے جن کا مذہب اسلام ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ مسلمان خود سب سے پہلے اسلام کے تختہ مشقِ ستم ہیں۔ مشرقی ممالک کی سیاحت کے دوران مجھے بارہا یہ مشاہدہ کرنے کا موقعہ ملا ہے کہ مذہبی دیوانگی کس طرح چند ایسے خطرناک اشخاص کے ہاتھوں پیدا ہوتی ہے جو دہشت انگیزی کے ذریعے دوسرے لوگوں پر مذہبی احکام کی تعمیل عائد کرتے ہیں۔ مسلمان کو ایسے اسلام کے چنگل سے چھڑانا اس کے حق میں ایک ایسی خدمت ہے جس سے بڑھ کر کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔ جب میں مسلمان قوموں کو، جن میں بہت سے اچھے لوگ بھی ہیں، اسلام کی قید و بند سے آزاد دیکھنے کی خواہش کرتا ہوں تو اس میں اُن سے ذاتی عناد کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ چونکہ شیخ جمال الدین مجھ سے اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ میں مختلف مذاہب کا موازنہ کرتے وقت انصاف کی ترازو کو ہاتھ سے نہ جانے دوں، اس لیے میں یہ بھی کہہ دوں کہ اگر میں بعض یورپی ممالک کے بارے میں یہ خواہش کروں کہ اُن پر عیسائیت کا جو تسلط ہے اس میں کمی ہو جائے تو میری اس خواہش میں بھی اس ملکوں کے باشندوں سے دشمنی کا کوئی عنصر نہ ہوگا۔"

یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ یورپی اہل علم اسلام کی بدترین صورتوں کا موازنہ عیسائیت کی بہترین صورت حال سے کیا کرتے ہیں۔ تمام مذاہب کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ آب و ہوا، اقتصادی حالات، ماحول، تعلیم، قومی خصوصیات اور بہت سے دوسرے عوامل کے مطابق اس کی صورت بدلتی رہتی ہے۔ جدید زمانے کی مثالیت کو عیسائیت کا مقابلہ اسلام کی ایک زوال یافتہ صورت سے کرنا عقل سلیم کی توہین ہے۔ اس کتاب میں میں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام نے کیونکر انسان کی ذہنی سرگرمیوں کو فروغ دیا، کیونکر ایک جاں بلب دنیا کو نئی زندگی بخشی اور کیونکر تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھایا۔ یہ وہ اسلام تو نہ تھا جس کا دعویٰ آج کل کے جاہل اور کٹر لوگ یا اپنا الو سیدھا کرنے والے خودغرض لوگ کرتے ہیں، لیکن پھر بھی اسلام تھا، یعنی اسلام اپنی بہترین، برگزیدہ ترین اور نیک ترین صورت میں۔ میں نے یہ بتانے کی بھی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں پر جو افتاد پڑی ہے اس کے اسباب کیا ہیں۔ امکان غالب ہے کہ نکتہ چیں ابتدا ہی سے اسلام کے بارے میں سوئے ظن رکھتے ہیں یا جو آج کل کے نام نہاد مسلمانوں کی حالت سے اسلام کا اندازہ لگاتے ہیں وہ میری آرا کو تسلی بخش نہ پائیں گے۔ تاہم میں یہ دعویٰ کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ میری آرا تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔

موسیو ریناں کا ایک دعویٰ قطعی تردید کا مستحق ہے۔ وہ اپنے لکچر میں کہتے ہیں:
"یہ بات خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے کہ اُن حکماء و علما میں جنہیں عرب کہا جاتا ہے صرف ایک تھا، یعنی الکندی جو عربی النسل تھا: باقی تمام کے تمام یا ایرانی تھے یا ماوراالنہری یا ہسپانوی یا بخارا، سمرقند، قرطبہ یا اشبیلیہ کے باشندے۔ صرف یہی نہیں کہ یہ لوگ عربی النسل نہ تھے، بلکہ ذہنیت میں بھی عرب نہ تھے۔" یہ عظیم فرانسیسی محقق، جس کی واقفیت کا فخر مجھے حاصل تھا، اس کا مستحق ہے کہ اُسے عزت سے یاد کیا جائے۔ لیکن یہ عمومی دعویٰ حقیقت سے بہت بعید ہے۔ ابن خلکان کو مشہور تصنیف وفیات الاعیان یا تاریخ الحکما یا اسی قبیل کی اور کتابوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو اس کا بے بنیاد ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ جن اکابر و مشاہیر کے حالات ان کتابوں میں درج کیے گئے ہیں اُن کے سلسلہ نسب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کثیر التعداد علماء و حکما اور محققین اگرچہ عرب سے باہر پیدا

ہوئے تاہم عربی الاصل تھے۔

غالباً موسیو رینان حضرت علیؓ کو حکیم تسلیم نہ کرتے، لیکن اُن کے اخلاف امام جعفر صادق اور امام علی رضا یقیناً زمرہ حکما میں شمار کیے جانے کے مستحق تھے۔ امام جعفر صادق فلسفی ہی نہ تھے بلکہ سائنس دان بھی تھے۔ جدید علم کیمیا کے بانی جابر بن حیان نے اپنے انکشاف وایجادات کی بنیاد اس مواد پر رکھی جو امام جعفرِ صادق نے فراہم کیا تھا۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ حکیم الاعراب الکندی کندہ کے شاہی خاندان سے تھا، اور خالصۃً عرب۔ لیکن یہ عام طور پر معروف نہیں کہ یحییٰ بن علی منصور بھی خالصۃً عرب تھا۔ یہ بھی معروف نہیں کہ علی ابن یونس قبیلہ صدف سے تھا، جسے ابن خلکان بنی حمیر کی ایک اہم شاخ کہتا ہے جو مصر میں جا کر آباد ہوگئی تھی۔ الجاحظ ابوعثمان عمرو الکنانی، جو ایک معتزلی فلسفی تھا اور جس نے ۲۵۵ ہجری میں بمقام بصرہ وفات پائی، خالص عرب تھا اور بنی کنانہ کے قبیلے سے تھا۔ ابن ماجہ نسباً تجیبی تھا ابن خلکان لکھتا ہے: ''تجیبی، جس کا تلفظ تحسیبی بھی کیا جاتا ہے، تصیب کی اولاد کو کہتے ہیں، جو اشرس بن السکون کے فرزندان عدی اور سعد کی ماں تھی۔ تجیب ثوبا بن سلیام ابن مزبس کی بیٹی تھی اور اُس کے بیٹوں کا نام اس کے نام پر رکھا گیا۔''

ابن زُہر عرب قبیلہ ایاذ ابن نزار سے تھا اور اسی لیے الایاذی کہلاتا ہے۔ مشہور نحوی خلیل ابن احمد قبیلہ اُزد سے تھا۔ ہسپانوی مؤرخ اور فلسفی ابن بشکوال مدینہ کے ایک انصاری کی اولاد میں سے تھا جو اِسپین میں جا کر آباد ہوگیا تھا۔ مسعودی ایک صحابی رسول ﷺ ابن مسعود کے اخلاف میں سے تھا اور اسی نسبت سے مسعودی کہلاتا تھا۔ ابن الاثیر مشہور قبیلہ شیبان سے تھا۔ ماہر سیاست مدن وفقہ الماوردی بصرے کا رہنے والا تھا، اور خالصۃً عرب تھا۔ ماہر سیاست مدن فقہ الماوردی بصرے کا رہنے والا تھا، لیکن خالصۃً عرب تھا۔ ہمیر (Von Hammer) نے بہت تعریف کی ہے۔

غازی، مدبر، اور حلیم اُسامہ قبیلہ بنی کنانہ کا ایک فرد تھا۔

الغرر والدرر کا مصنف شریف المرتضیٰ جو اپنے وقت کے اکابر علما میں تھا، امام علی رضا کی اولاد میں سے تھا۔

ابن طفیل قبیلۂ قیس سے تھا اور اسی لیے القیسی کہلاتا ہے۔

ابن خلدون ایک یمنی خاندان سے تھا جس نے سپین میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ خاندان حضر موت سے آیا تھا اور اسی نسبت سے ابن خلدون الحضرمی کہلاتا ہے۔

میں نے بطور نمونہ مشتے از خروارے چند نام گنوائے ہیں۔ شائقین علم کو اُن کتابوں میں جن کا حوالہ میں نے دیا ہے اور بے شمار نام مل جائیں گے۔

نیز ملاحظہ ہوں: وسٹن فیلڈ (Wustenfeld) کی کتاب ذہبی کی تاریخ الاسلام اور کاسیری (Casiri) کی Billiotheca Arabica یہ کہنا کہ یہ لوگ عرب نہ تھے اور ان کی رگوں میں عربی خون نہ تھا، ایک بے دھڑک دعویٰ ہے۔ میں چاہوں تو ایسی ہی ڈھٹائی سے کہہ سکتا ہوں کہ چونکہ لانگ فیلو (Longfellow) چیننگ (Channing)، ایمرسن (Emerson) اور ڈریپر (Draper) امریکہ میں پیدا ہوئے تھے اس لیے وہ اینگلو سیکسن (Anglo - Saxon) نہ تھے۔

ابن خلکان (الفارابی کو مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی کہتا ہے اور اس کا تذکرہ ذیل کے الفاظ میں کرتا ہے:

"ابو نصر محمد بن محمد طرخان بن اوزلغ الفارابی الترکی الحکیم المشهور صاحب التصانیف فی المنطق و الموسیقی وغیره هما من العلوم وهو اکبر فلاسفته المسلین لم یکن فیهم من بلغ رتبته فی فنونه والرئیس ابو علی سیناء المقدم ذکرهٔ بکتبه تخرج بکلامه و انتفع فی تصانیفه"۔

"ابو نصر محمد بن محمد طرخان بن اوزلغ الفارابی الترکی ایک مشہور فلسفی اور منطق اور موسیقی اور دوسرے علوم میں کتابوں کا مصنف۔ وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی تھا اور ان میں سے کوئی اور فنون میں اس کے رُتبے کو نہ پہنچا۔ اور رئیس الفلاسفہ بوعلی ابن سینا نے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اُس کے کلام سے اکتساب کیا اور اس کی تصانیف سے فائدہ اٹھایا۔"

ابو القاسم کندرسکی اٹھارویں صدی عیسوی میں ایران کا ایک مشہور شاعر اور ابن سینا کے مکتب فکر کا فلسفی تھا۔

حی ابن یقظان کا انگریزی ترجمہ ۱۶۸۶ء چھپا تھا۔
سنائی نے ابن سینا اور اس کے فلسفے کو ذیل کے اشعار میں خراجِ تحسین پیش کا ہے:

نخواہم لا جرم نعمت نہ در دنیا نہ در جنت
ہمی گویم بہر ساعت چہ در سرا چاہ در صحرا
کہ یارب مرسنائی راضائی دہ تو در حکمت
تواں کزوی برشک آید روانِ بوعلی سینا

سنائی کو دنیا اسلام میں جو درجہ حاصل ہے وہ جلال الدین رومی کے اشعارِ ذیل سے واضح ہے:

عطار روح بود و سنائی دو چشم او — ما در پئ سنائی و عطار آمدیم

امام ابوالحسن علی الاشعری اور امام احمد الغزالی کے اثر نے رجعت پسندی کو جو فروغ دیا وہ بے اندازہ تھا۔ البیرونی کی الآثار الباقیہ کے فاضل ایڈیٹر نے اس کا لب لباب نہایت عمدہ الفاظ میں دیا ہے: ''اگر الاشعری اور الغزالی نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ عرب قوم میں کئی گلیلیو (Galileo)، کیپلر (Cepler) اور نیوٹن (Newton) پیدا ہوتے۔'' یہ دونوں بزرگ سائنس اور فلسفے کی مذمت کر کے اور اس پر زور دے کر کہ دینیات اور فقہ کے علاوہ کوئی علم قابلِ تحصیل نہیں اسلامی دنیا کی ترقی کو مسدود کرنے میں سبقت لے گئے۔ اُن کی مثال آج تک جہالت اور ذہنی جمود کے جواز میں پیش کی جاتی ہے۔

اشعری۔۴۔۸۸۳ء (مطابق ۲۷۰ھ) بمقام بصرہ پیدا ہوئے اور بغداد میں وفات پائی۔ ان کا سن وفات تحقیقی طور پر معلوم نہیں۔ غالباً ۹۴۱ء اور ۹۵۲ء کے درمیان تھا۔ وہ ابتداء معتزلی تھے اور عقلی نظیروں کو تعلیم دیا کرتے تھے لیکن جب انہیں علمائے عقلی میں امتیاز حاصل کرنے کا کوئی موقعہ دکھائی نہ دیا تو انہوں نے شہرت اور اقتدار کی خاطر رجعت پسند مکتب کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اُن کا پہلے جو عقیدہ تھا کہ انسان اپنے اعمال کا مختار ہے اور قرآن مخلوق ہے اس سے انہوں نے مجمع عام میں توبہ کی۔ یہ واقعہ بصرے کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن ہوا۔ وہ اپنے شاگردوں کو درس دیتے دیتے یکا یک اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجمع سے یوں بہ آوازِ بلند مخاطب ہوئے: ' جو لوگ مجھے

جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ میں کون ہوں۔ جو لوگ نہیں جانتے میں اُن سے اپنا تعارف کراتا ہوں۔ میں علی بن اسمٰعیل الاشعری ہوں۔ میرا یہ عقیدہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے، انسانوں کی آنکھیں خدا کو نہ دیکھ پائیں گی، اور ہم خود اپنے بد افعال کے موجد اور مختار ہیں۔ اب میں حق کی طرف واپس آتا ہوں، ان عقائد سے توبہ کرتا ہوں اور معتزلہ کی تردید اور اُن کی غلط اندیشیوں اور غلط بیانیوں کی قلعی کھولنے کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔'' جیسے جیسے وہ ایک ایک کر کے اپنے سابق عقیدوں سے توبہ کرتے رہے ویسے ویسے ایک کے بعد ایک جامہ پھاڑ کر پھینکتے چلے گئے اور ہر بار یہ اعلان کرتے رہے کہ ''میں اس عقیدے کو یوں ترک کرتا ہوں جیسے اس جامے کو پھاڑ کر پھینک رہا ہوں۔'' سب سے پہلے تو انہوں نے پگڑی اتار پھینکی، اس کے بعد جبہ وعلٰی ہذا القیاس دوسرے کپڑے بصرے کے زود اعتقاد لوگوں پر اس کا بڑا اثر ہوا اور امام اشعری کی شہرت اس تیزی سے پھیلی بہت جلد انہیں امام وقت تسلیم کر لیا گیا۔ ابن خلکان انہیں دین حنیف کا بہت بڑا حامی کہتا ہے۔

آخری فاطمی خلیفہ العاضد الدین اللہ کی وفات پر صلاح الدین ایوبی نے، جو اس کا سپہ سالار اور وزیر اعظم تھا، مستضی عباسی کی خلافت کا اعلان کر کے مصر کو از سرِ نو بغداد کے روحانی دائرہ اقتدار میں داخل کر دیا۔ اس وقت سے مصر میں اشعری مذہب کا دور دورہ شروع ہوا۔

علمائے دینیات نے جو زیادہ تر امام احمد بن حنبل کے پیرو تھے، عباسی خلافت کے زمانۂ زوال کے دوران بغداد میں بڑا ہنگامہ برپا کیا۔ وہ لوگوں کے عقائد و اعمال کے محتسب بن بیٹھے، لوگوں کے گھروں میں زبردستی گھس جاتے، آلاتِ موسیقی کو توڑ ڈالتے اور ہر طرح کی تباہ کاریاں کرتے۔

ضمیمہ نمبر ۳۔ مزید حاشیے

"اقراء" کے معنی تلاوت بھی ہو سکتے ہیں۔

اس صفحے کے ذیلی حاشیے میں جس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اُسے سعدی نے اپنی ایک نظم کا موضوع بنا کر ایک یادگاری حیثیت بخش دی ہے۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے:

کرم کن بحالِ من اے محترم　　　　که مولائے من بوذر اہلِ کرم

اسلامی رواداری۔ سر ٹامس آرنلڈ (Sir Thomas Arnold) اپنی کتاب "تبلیغ اسلام (Preaching of Islam) میں لکھتے ہیں: "عربوں کی حکمرانی کی پہلی صدی میں عیسوی گرجاؤں سے ایسی رواداری برتی گئی اور انہیں ایسی مذہبی آزادی نصیب ہوئی جیسی بازنطینی سلطنت کے تحت انہیں پشتوں سے نصیب نہ ہوئی تھی۔" وہ مزید لکھتے ہیں:

"بازنطینی سلطنت کے ساتھ جو طویل کشمکش رہی اس کے دوران ایسے موقعے آئے جب خلیفہ کو اپنی عیسائی رعایا کی وفاداری پر شک ہوا اور گمانِ غالب ہے کہ نکوفور (Nikophoros) کی غداری اُن اسباب میں سے ایک سبب تھی جن کی بنا پر ہارون نے یہ فرمان جاری کیا کہ عیسائی جداگانہ لباس پہنا کریں اور بڑے بڑے عہدوں سے سبکدوش کر دیے جائیں۔"

ابو یوسف نے غیر مسلم رعایا کے حق میں ہارون الرشید سے جو سفارش کی وہ قابلِ ملاحظہ ہے: "امیر المومنین (خدا آپ کی مدد کرے) آپ پر واجب ہے کہ آپ کے نبی اور جدِ امجد محمد ﷺ کے جن لوگوں کے ساتھ میثاق ہیں آپ اُن کے ساتھ نرمی کا سلوک کریں اور اس بارے میں احتیاط رکھیں کہ اُن پر کوئی زیادتی یا بدسلوکی نہ ہو، ان پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالا جائے جو اُن کی قوت برداشت سے باہر ہے اور جو کچھ ادا کرنا ان پر

واجب ہے اس کے علاوہ اُن کے اموال و املاک میں سے کچھ نہ لیا جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ جو شخص کسی ذمی پر ظلم کرے گا یا اس پر ایسا بوجھ ڈالے گا جس کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں قیامت کے دن اس شخص کو موردِ الزام ٹھہراؤں گا۔ (آرنلڈ)

اہل ذمہ۔ جب (۶۳۸ میں) یروشلم فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے ذیل کا فرمان جاری کیا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ یہ وہ امان کی ضمانت ہے جو خدا کا بندہ عمر امیر المومنین، ایلیا کے باشندوں کو دیتا ہے۔ وہ سب لوگوں کو چاہے وہ بیمار ہوں، یا تندرست، جان کی، اموال کی، املاک کی، گرجاؤں کی، گرجاؤں کی صلیبوں کی اور ہر اُس چیز کی جو اُن کے دین سے تعلق رکھتی ہے حفاظت کا عہد کرتا ہے۔ ان کے گرجا نہ سکونتی مکانوں میں تبدیل کیے جائیں گے اور نہ مسمار کیے جائیں گے۔ نہ گرجاؤں کی تعداد میں اور نہ ان کے ساز و سامان میں کسی طرح کی کمی کی جائے گی، نہ اُن کی صلیبیں اور نہ ان کی اور مملوکات ان سے لی جائیں گی، نہ دین و مذہب کے معاملے میں ان پر کوئی پابندیاں عائد کی جائیں گی۔ اور نہ ان میں سے کسی کو کوئی گزند پہنچایا جائے گا۔"

بلاذری صفحہ۱۳۲، کتاب الخراج صفحہ۵۴،

پیغمبر اسلام ﷺ کا اعلان:

من ظلم معاهدًا او كلفه فوق طاقته فانا حجيجه۔

(جو کسی ذمی پر ظلم کرے گا یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالے گا میں اُسے موردِ الزام ٹھہراؤں گا)

من اذى ذمّيا فانا خصمه

(جو کوئی کسی ذمی کو اذیت پہنچاتا ہے میں اس کی طرف سے جھگڑتا ہوں)

حضرت علیؓ کی ہدایت حضرت عثمانؓ کو: "میں رسول اللہ ﷺ کے ذمیوں کی دیکھ بھال تمہیں سونپتا ہوں۔ اُن کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا ہے اس پر عمل کیا جائے، اُن کے دشمنوں سے ان کی حفاظت کی جائے اور ان کی طاقت سے بڑھ کر اُن پر کوئی بوجھ نہ ڈالا جائے۔" (ابو یوسف ص ۷۱)

اسی قسم کی ہدایت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد ابن ابو بکر حاکم مصر کو ۳۲ھ میں کی۔
طبری۔ D, Ohhson صفحہ ۴۴۔

متاخرین خلفائے عباسی کے عہد میں تین اور دیوان قائم کیے گئے۔ یعنی دیوان القضا (محکمۂ عدل)، دیوان العرض (تنخواہیں بانٹنے والا محکمہ) اور دیوان الطغرا (وہ محکمہ جس میں مہر شاہی رکھی جاتی تھی اور تمام دستاویزوں کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی)

میں نے اس کتاب کے سابق ایڈیشن میں ذیل کی عبارت لکھی تھی:

"حکمرانوں پر رعایا کے بارے میں جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُن کو اسلام جو اہمیت دیتا ہے اور جس طریقے سے وہ لوگوں کی مساوات و آزادی کو فروغ دیتا ہے اور انہیں حاکموں کے ظلم سے محفوظ رکھتا ہے، اسے امام فخر الدین رازی نے ایک نہایت نمایاں کتاب میں، جو انہوں نے حاکم و محکوم کے باہمی حقوق کے موضوع پر لکھی، بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و توسیع بعد میں محمد بن علی بن طباطبائی المعروف بہ ابن طقطقی نے کی۔"

میرا یہ بیان ہندوستان کے علماء کی عمومی رائے پر مبنی تھا۔ بروکل من اپنی تاریخ ادبیات عرب میں اس رائے سے متفق معلوم ہوتا ہے اور بعض دوسروں یورپی محققین نے بھی اس رائے کا اظہار کیا ہے، مثلاً نویل دیورجرا اور دساسی لیکن ہارٹ ڈِگ ڈیرن بورگ اس رائے سے شدید اختلاف کرتا ہے اور بروکلِ من نے بھی اپنی بعد کی تصنیف (The Nachtrage Vol II) میں اپنی رائے تبدیل کر دی۔ بہر حال جس وجہ سے میں نے موجودہ ایڈیشن میں تاریخ الدّول کو امام فخر الدین رازی کی طرف منسوب نہیں کیا وہ یہ ہے کہ ابن خلکان نے امام رازی کی تصنیفات کی فہرست میں تاریخ الدول کو شامل نہیں کیا یہ ایک حتمی ثبوت تو نہیں کیونکہ ابن خلکان نے بار بار نہایت اہم تصنیفات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً اُس نے ابن ابی الحدید کے تذکرے میں اس کی مشہور شرح نہج البلاغتہ کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ بہر حال میں نے یہی سمجھا کہ ابن خلکان پر اعتماد کر کے نئے ایڈیشن میں عبارت منقولہ بالا قلم انداز کر دوں۔

عدل کتاب المیزان الحکمتہ میں، جو بارہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی، عدل کی تعریف ذیل کے الفاظ میں کی گئی ہے:

''عدل تمام محاسن اخلاق کا مدار اور تمام فضائل کی بنیاد ہے۔ عدل کو درجہ کمال تک پہنچانے کی خاطر باری تعالیٰ نے اپنے آپ کو عادل کا لقب دے کر اپنے برگزیدہ ترین بندے سے اپنے آپ کو متعارف کرایا۔ اور نورِ عدل کی بدولت دنیا مکمل کی گئی اور اس کے نظام کو کامل بنایا گیا، جس کی طرف نبی ﷺ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا: ''عدل ہی پر زمین و آسمان قائم کیے گئے۔''

اگرچہ بعض مغربی محققین نے اس روایت کی صحت پر شک کیا ہے کہ نظام الملک، عمر خیام اور حسن بن صباح ہم مکتب تھے، لیکن ''شیخ الجبال'' کے تازہ ترین سوانح نگار نے اس دعوے کی توثیق کی ہے کہ یہ تینوں بیک وقت امام موفق الدین کے شاگرد تھے۔ میرا اشارہ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کی طرف ہے جنھوں نے حسن بن صباح کی زندگی اور مقاصد اور اس کی فتنہ انگیز تبلیغ کا ایک نہایت جامع خلاصہ اپنی کتاب میں دیا ہے۔

حسن بن صباح۔ مولوی عبدالحلیم شرر نے بیان کیا ہے کہ حسن بن صباح کے پیرو کیونکر اپنی شر آمیز تبلیغ کے سلسلے میں حشیش کا استعمال کرتے تھے اور اُس وقت کے دینی و معاشرتی نظم کو درہم برہم کرنے کی خاطر کیونکر اپنے دائرے میں شامل ہونے والے مبتدیوں کے دماغوں کو ماؤف کر دیتے تھے۔ ان دشمنانِ ملت کے سری عقائد میں وبا کی طرح پھیلنے کی جو قوت تھی شرر صاحب اُسے بھی تفصیلاً بیان کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ قرامطہ کی بربادی کے بعد اسمٰعیلیہ کیونکر وجود میں آئے۔

بابی۔ یہ فرقہ جو اب بہت سے فرقوں میں منقسم ہو گیا ہے، زیادہ تر غیر ممالک میں پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اس فرقے کے لوگوں کی بڑی تعداد ہے۔ یہ لوگ بیروت، بمبئی اور کلکتہ میں بھی کافی تعداد میں آباد ہیں۔ مذہب باب کے مستند ترین محقق پروفیسر ای جی براؤن کا قول ہے کہ مذہب باب اور تصوف میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ ان میں ایک بنیادی فرق ذہنی زاویے کا ہے: جہاں تصوف دوسرے نظامہائے عقیدہ کے بارے میں وسیع المشربی سے کام لیتا ہے، وہاں مذہب باب انتہا درجہ متعصب اور تنگ نظر ہے۔

صفوی۔ حال ہی میں ایک نیا نظریہ ایجاد کیا گیا ہے، جس کے مطابق لفظ

''صفوی'' جو اُس خاندان کا لقب ہے جس کی بنیاد ایران میں شاہ اسمٰعیل نے ڈالی۔ شاہ اسمٰعیل کے جد امجد صفی الدین کے نام سے ماخوذ ہے نہ کہ اُن کے لقب ''صوفی'' سے۔ میں نہایت ادب کے ساتھ اس نظریے کی تردید کرتا ہوں۔ ایران کی سلطنت کے قیام سے لے کر کئی صدیوں تک یورپی سیاحوں، تاجروں اور وقائع نگاروں کا دستور تھا کہ وہ شاہانِ ایران کو صوفی اعظم'' (The Grand Sophi) کے لقب سے پکارتے تھے۔ یہ لقب وہ شاہان ایران کو ''مغل اعظم'' (The Grand Mogul) اور ''ترک اعظم (The Grand Turk) سے ممتاز کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس کا سبب واضح ہے۔ مشرقی مصنفین نے ہمیشہ لفظ ''صفوی'' کو لفظِ ''صوفی'' سے مشتق خیال کیا ہے، اسی طرح جس طرح اس خاندان کا دوسرا لقب ''موسوی'' امام موسیٰ کاظم کے نام پر مبنی ہے۔ رضوی سید اپنا سلسلہ نسب امام علی بن امام موسیٰ سے متعلق کرتے ہیں۔

قضا و قدر۔ قضا و قدر کے بارے میں رسولِ اکرم ﷺ کا جو عقیدہ تھا، اُس پر یہ حدیث نبوی جو عبید بن کعب سے مروی ہے، بہت سی روشنی ڈالتی ہے:

''سب سے خوشحال شخص وہ ہے جو اپنی محنت سے خوشحال بنے اور سب سے بد حال شخص وہ ہے جو اپنے اعمال کے طفیل بد حال بنے۔''

روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے حاضر کیا گیا جو ایک جرم کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ اُس نے اپنے جرم کا یہ عذر پیش کیا کہ جرم حکم الٰہی سے ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے دہری سزا دی۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے جو جنگ صفین میں شریک ہوا تھا پوچھا کہ آیا مسلمانوں کو قضائے الٰہی ملک شام میں لائی تھی۔ آپ نے حسب ذیل جواب دیا:

''غالباً تم لوگ ہی سمجھتے ہو کہ تقدیر ربی اٹل ہے اور اللہ کا کوئی حکم بدلا نہیں جا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو جزا و سزا کا کوئی فائدہ نہ ہوتا، ثواب کا وعدہ اور عذاب کی دھمکی دونوں بے سود ہوتے، خدا کی طرف سے نہ گناہ گار پر نفرین اور نہ نیکوکار پر آفرین ہوتی، نہ نیکوکار بدکار کی بہ نسبت جزا کا زیادہ مستحق ہوتا اور نہ بدکار نیکوکار کی بہ نسبت سزا کا زیادہ مستحق۔ تم نے جو کچھ کہا، وہ کہا، وہ کلمہ ہے اخوان الشیاطین کا، بت پرستوں کا خدائے رحیم و رحمٰن

کے دشمنوں کا، اُن لوگوں کا جو باطل کی تائید کرتے ہیں، اُن لوگوں کا جو اپنے معاملات میں حق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں، مثلاً تقدیر پرست اور مجوسی۔ خدا نے انسانوں کو اختیار دیا ہے اور انہیں خوف دلا دلانے کو منع کیا ہے۔ اُس نے انسانوں پر جبراً فرائض عائد نہیں کئے اور نہ اس نے اپنے پیغمبر محض تفنن کی خاطر بھیجے ہیں۔ ایسا عقیدہ کافروں کا ہے، اور کافروں پر جہنم میں عذاب الیم نازل ہوگا۔'' اس پر بوڑھے سپاہی نے سوال کیا: ''یہ قضا وقدر اور یہ خاص تقدیر الٰہی جو ہمیں یہاں لائی وہ کیا ہے؟'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ خدا کا حکم اور منشا۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو اور اپنے ماں باپ کے ساتھ شفقت سے پیش آؤ۔''

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے اہل بصرہ کو جو خط لکھا اس میں ذیل کی قابل ملاحظہ عبارت تھی: ''جو شخص خدا کو اپنے گناہوں کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے وہ راہِ حق سے منحرف ہے۔ خدا بندوں کو مجبور نہیں کرتا کہ اپنے ارادے کے خلاف اس کے احکام کی تعمیل کریں، نہ وہ انہیں اس پر مجبور کرتا ہے کہ اپنے ارادے کے خلاف گناہ کریں۔

معتزلہ۔ ''غیاث اللغات'' اور ''فرہنگ'' (لکھنو) میں لفظ ''معتزلہ'' کا جو املا ہے اُس میں زے پر فتحہ ہے، یعنی یہ لفظ یوں ہے: معتزَلہ۔ ''فرہنگ'' ہندوستان کے تین سب سے بڑے عالموں کی تالیف اور اپنی قسم کی بہترین اور جامع ترین لغات ہے، جسے صحیح معنوں میں انسائیکلو پیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کی تالیف میں مؤلفین نے ہر سابق لغت سے استفادہ کیا، جن میں ''کشف اللغات'' ''صراح'' ''تاج اللغات'' اور کئی اور لغتیں شامل تھیں۔ چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے یہ فیصلہ کما حقہ، تحقیق کے بغیر کیا۔ رچرڈ سن کی ڈکشنری میں بھی لفظ ''معتزلہ'' کا املا اس طرح کیا گیا ہے۔

''لسان العرب'' میں ''ز'' کے نیچے کسرہ ہے، جس کے مطابق لفظ یوں ہے، معتزِلہ۔ تقریباً تمام مغربی مستشرقین نے اسی اِملا کو قبول کیا ہے۔

جو لوگ عربی سے نابلد ہیں انہیں ایسا معلوم ہوگا کہ یہ ایک تمیز بلا فرق ہے۔ لیکن ان دو املاؤں میں فی الواقع فرق ہے۔ اور یہ فرق اس سوال سے پیدا ہوتا ہے کہ آیا واصل بن عطا نے خود مجلس سے قطع تعلق کیا، یا اسے امام سے اختلاف رائے کی بنا پر مجلس

سے قطع تعلق کرنے کو کہا گیا۔ ابن خلقان کا قول ہے کہ اُسے مجلس سے خارج کیا گیا۔ پہلی صورت میں زیر بحث لفظ کا صحیح املا ''معتزلہ'' ہوگا: دوسری صورت میں ''معتزلہ''۔ ہندوستانی علماء کی رائے یہ ہے کہ واصل بن عطا کو نکالا گیا، اور اس رائے کی تائید ابن خلکان نے کی ہے لیکن اس کے باوجود ''دافیتہ العیان'' کے مترجم ڈی سلین (De Slane) نے انگریزی میں لفظ معتزلہ کے ہجے معتزلہ کیے ہیں۔

میں نے اپنی سابقہ تصنیفات میں غیاث اللغات'' اور ''فرہنگ'' کی تقلید کی ہے، لیکن مغربی مستشرقین کے اتفاق رائے کے پیش نظر اور قارئین کو ذہنی پریشانی سے بچانے کی خاطر میں اس ایڈیشن میں مغربی مستشرقین کا تتبع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بہر حال اس کے معنی یہ نہیں کہ اپنے ملک کے ارباب علم کی رائے کے اتباع سے منحرف ہوگیا ہوں۔

معتزلہ کے عقائد۔'' معتزلہ متفق الرائے ہیں کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے، ازلی وابدی، قادرِ کل، عالم کل، حی۔ وہ نہ جسم ہے نہ عرض اور نہ جوہر۔ وہ مکتفی بالذات ہے، حواس سے ماورا ہے، عادل ہے، حکیم ہے۔ نہ وہ غلطی کرتا ہے اور نہ غلطی کا قصد کرتا ہے۔ وہ مکافات کا وعدہ کر کے انسانوں پر فرائض عائد کرتا ہے۔ وہ انسانوں کو عمل کی قوت بخشتا ہے، اُن کے رستے سے مزاحم کو دور کرتا ہے۔ مکافات مطلقاً لازمی ہے۔ مزید بریں معتزلہ اس پر متفق ہیں کہ جب نبی کی ضرورت ہوتی ہے تو اللہ نبی بھیجتا ہے۔ ضروری ہے کہ نبی یا تو ایک نئی شریعت لے کر آئے یا کسی ایسی شریعت کا احیا کرے جس کے کوئی آثار باقی نہیں رہے اور نوعِ انسانی کو ایک نئی زندگی عطا کرے۔ وہ اس پر بھی متفق ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نبی آخر الزمان ہیں اور ایمان اقرار بھی ہے، علم بھی ہے اور عمل بھی۔ اُن کی متفقہ رائے ہے کہ انسان کا عمل اس کے اندر مخلوق نہیں۔ وہ اصحاب نبی ﷺ سے مودت کے بارے میں ہم خیال ہیں، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جن واقعات کا باعث بنے اُن کی بنا پر وہ اُن کے بارے میں متفق نہیں۔ بہر حال اُن مین سے اکثر و بیشتر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مودت کا رشتہ رکھتے ہیں اور اُن کے کاموں کے بارے میں تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ اُن کی اکثریت معاویہ اور عمرو بن العاص سے کوئی واسطہ نہ رکھنے کے بارے میں متفق ہے اور اس پر بھی متفق ہے کہ نیک کاموں کی تلقین اور برے کاموں کی ممانعت ضروری ہے۔''

امیر خسرو۔ اگرچہ امیر خسرو کو کبھی کبھی زمرہ اولیا میں شمار کیا جاتا ہے وہ صحیح معنوں میں صوفی نہ تھے۔ ہندوستان کے اکثر مسلم شعرا تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور اپنے کلام میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ میں دبیر کا تذکرہ پہلے ہی کر چکا ہوں۔ انیس، مونس اور اُنس (تین بھائی جن کے تخلص ایک ہی مادے سے ماخوذ تھے) دبیر کے ہم عصر تھے اور اِن کے کلام میں بھی تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ الطاف حسین حالی اور اسد اللہ کاں غالب دہلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ کی طرح (جسے بغاوت کی بنا پر مشہور قصیدے میں بہادر شاہ کی طرف ذیل کے الفاظ میں اشارہ کرتا ہے:

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی اس پہ سرتاسر کھلا!

سنوسی۔ سلسلۂ سنوسی (اگر اسے اس لقب سے ملقب کیا جا سکتا ہے) محمد بن علی السنوسی الادریسی نے قائم کیا تھا۔ اُن کا سلسلۂ نسب ادریس کی وساطت سے، جنہوں نے یزید کے لشکریوں کے ہاتھوں مدینہ کے قتل عام سے بچنے کے لیے مغرب میں پناہ لی تھی۔ اُن کی پیدائش الجزائر کے شہر مستغنم میں ۱۷۸۷ء میں ہوئی۔ وہ ایک جری اور جانباز مجاہد تھے۔ انہوں نے اسلامی ممالک کی بہت سیاحت کی اور اس کے دوران اس اخلاقی انحطاط کا مشاہدہ کیا جو بحیرہ روم کے ساحلی باشندوں سے ارتباط کی بدولت عربوں اور شمالی افریقہ کے دوسرے مسلمانوں پر مستولی ہو گیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ مسلمان کیونکر اسلام کی قدیم تعلیم سے منحرف، جامد اور قسمت پرشاکر ہو گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو ایسی صنعتوں کی طرف متوجہ کیا جن سے خوشحالی حاصل ہو سکتی تھی اور اُن کے ذہنوں میں فرائضِ دینی کا ایک نیا احساس پیدا کیا۔

سری محمد بن علی نے اپنی وفات سے پہلے، جو ۱۸۵۰ء میں واقع ہوئی، حجاز، یمن صحرائے لیبیا کے نخلستانوں، سرنیائیکا اور الجزائر میں متعدد زاویے قائم کیے۔ ان میں سے جو زاویئے وسطی افریقہ میں تھے انہوں نے بالخصوص بڑا قوی اخلاقی اثر مرتب کیا۔ لیکن مراکش میں اُن کے مریدوں کو جو اخوان کے لقب سے پکارے جاتے تھے، کوئی خاص اثر و نفوذ حاصل نہ ہو سکا، کیونکہ وہاں سلسلہ مولائے طیب کا سکہ جما ہوا تھا۔ سری محمد نے

بعد اُن کے بیٹے محمد المہدی گدی نشین ہوئے۔

ارتداد۔ اسلام کے شرعی قانون نے ارتداد کی جو سزا مقرر کی ہے اس سے متعلق انگلستان کے ارباب سیاست اور اہل الرائے کی طرف سے حال ہی میں بہت چہ میگوئیاں ہوئی ہیں۔ قدیم ترین زمانوں ہی سے ارتداد کو ہر مذہب اور قانونی نظام نے ایک مستوجب سزائے موت جرم تصور کیا ہے، کیونکہ وہ ایک معین نظام سے انحراف و سرکشی کے مترادف ہے۔ اہل روما نے ابتدائی عیسائیوں کو اس لیے موت کی سزا دی کہ انہوں نے حکومت اور سرکاری مذہب کے خلاف بغاوت کی تھی۔ جب عیسائیوں نے غلبہ حاصل کر لیا تو انہوں نے اہل روما کی مثال کی تقلید کی۔ رومن کلیسا نے مرتدوں اور ملحدوں کو مرد، عورت اور بچوں کی تمیز کیے بغیر اپنی ساری قلمرو میں نہایت بے دریغی سے نذرِ آتش کیا۔ اصلاح یافتہ کلیساؤں نے بھی صحیح العقیدگی کی حمایت میں کچھ کم سرجوشی کا مظاہرہ نہ کیا۔ ابھی کل تک انگلستان میں بھی مرتدوں کو سزا وار موت سمجھا جاتا تھا۔ اگر آج کل کوئی شخص مذہب عیسوی سے روگرداں ہو تو اسے موت کی سزا تو نہیں دی جاتی، لیکن اسے معاشرے سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے آزادی ضمیر کو کبھی مذموم قرار نہیں دیا، پھر بھی مملکتِ اسلامی کے خلاف بغاوت کی سزا موت تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ اہل مکہ نے مدینے میں داخلے کی اجازت حاصل کرنے کی خاطر اسلام کا زبانی اقرار کیا، لیکن جب وہ اس چھوٹی سی اسلامی مملکت کے نظم تحفظ کے بارے میں ہر طرح کی معلومات فراہم کر چکے تو مکہ جا کر اسلام سے منحرف ہو گئے۔ ایسے لوگ جب کبھی پکڑے جاتے تھے تو انہیں موت کی سزا دی جاتی تھی۔ مملکت سے غداری آج کل بھی ساری دنیا میں قابلِ سزائے موت جرم تصور کی جاتی ہے، اور اس پر کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہئے۔ اسلامی شریعت کا یہ قانون کہ مرتدوں کو سزائے موت ملنی چاہیے، اسی عالمگیر قانون پر مبنی ہے۔ بہرحال عورتوں کو موت کی سزا نہیں دی جاتی، بلکہ صرف قید کی جاتا ہے۔ اور بچوں کو بھی سزائے موت نہیں دی جاتی۔ انسانیت اور آزادی ضمیر کے بارے میں اسلام اور عیسائیت میں یہی فرق ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ترکہ میں ارتداد کے لیے سزائے موت سلطان سلیم ثانی کے عہدِ حکومت میں، یعنی اٹھارہویں صدی کے اختتام کے قریب منسوخ ہو گئی تھی۔

ضمیمہ ۴

مسلمان خلفا اور سلاطین کے سلسلہ ہائے نسب کے لیے میری کتاب Short History of the Saracens ملاحظہ کیجیے۔ ذیل میں ہسپانیہ کے اُموی خلفا، بغداد کے عباسی خلفا اور قاہرہ کے فاطمی خلفا کے نام اور سنین تخت نشینی کی فہرست دی گئی ہے:

خلفائے راشدین

۱۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ	۱۱ ہجری	٦٣٢ عیسوی
٢۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ	۱٣ ہجری	٦٣۴ عیسوی
٣۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ	٢۴ ہجری	٦۴۴ عیسوی
۴۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ	٣۵ ہجری	٦۵٦ عیسوی

دمشق کے اُموی سلاطین (خلفاء)

۱۔ امیر معاویہ	۴۱ ہجری	٦٦۱ عیسوی
٢۔ یزید	٦۱ ہجری	٦٨۱ عیسوی
٣۔ معاویۂ ثانی	٦۴ ہجری	٦٨٣ عیسوی
۴۔ مروان اوّل	٦۵ ہجری	٦٨۴ عیسوی
۵۔ عبدالملک	٦۵ ہجری	٦٨۵ عیسوی
٦۔ ولید اوّل	٨٦ ہجری	٧٠۵ عیسوی
٧۔ سلیمان	٩٦ ہجری	٧۱۵ عیسوی
٨۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز	٩٩ ہجری	٧۱٧ عیسوی
٩۔ یزید ثانی	۱٠۱ ہجری	٧٢٠ عیسوی
۱٠۔ ہشام	۱٠۵ ہجری	٧٢۴ عیسوی
۱۱۔ ولید ثانی	۱٢۵ ہجری	٧۴٣ عیسوی
۱٢۔ یزید ثالث ابراہیم	۱٢٦ ہجری	٧۴۴ عیسوی

۱۳۔	ابراہیم	۱۲۶ ہجری	۷۴۴ عیسوی
۱۴۔	مروان ثانی	۱۲۷ ہجری	۷۴۵ عیسوی

بغداد کے عباسی خلفاء

۱۔	سفاح، ابوالعباس عبداللہ	۱۳۲ ہجری	۷۵۰ عیسوی
۲۔	منصور ابوجعفر	۱۳۶ ہجری	۷۵۴ عیسوی
۳۔	مہدی (محمد)	۱۵۸ ہجری	۷۷۵ عیسوی
۴۔	ہادی (موسیٰ)	۱۶۸ ہجری	۷۸۵ عیسوی
۵۔	ہارون الرشید	۱۷۰ ہجری	۷۸۶ عیسوی
۶۔	امین (محمد)	۱۹۳ ہجری	۸۰۹ عیسوی
۷۔	مامون (عبداللہ)	۱۹۸ ہجری	۸۱۳ عیسوی
۸۔	معتصم باللہ (ابواسحق محمد)	۲۱۸ ہجری	۸۳۳ عیسوی
۹۔	واثق باللہ (ابوجعفر ہارون)	۲۲۷ ہجری	۸۴۲ عیسوی
۱۰۔	متوکل علی اللہ (جعفر)	۲۳۲ ہجری	۸۴۷ عیسوی
۱۱۔	مستنصر باللہ (محمد)	۲۴۷ ہجری	۸۶۱ عیسوی
۱۲۔	مستعین باللہ (احمد)	۲۴۸ ہجری	۸۶۲ عیسوی
۱۳۔	معتز باللہ (محمد)	۲۵۲ ہجری	۸۶۶ عیسوی
۱۴۔	مہتدی باللہ (محمد ابواسحق)	۲۵۵ ہجری	۸۶۹ عیسوی
۱۵۔	معتمد علی اللہ (احمد ابوالعباس)	۲۵۶ ہجری	۸۷۰ عیسوی
۱۶۔	معتضد باللہ (احمد ابوالعباس)	۲۷۹ ہجری	۸۹۲ عیسوی
۱۷۔	مکتفی باللہ (جعفر ابوالفضل)	۲۸۹ ہجری	۹۲۰ عیسوی
۱۸۔	مقتدر باللہ (محمد ابومنصور)	۲۹۵ ہجری	۹۸۰ عیسوی
۱۹۔	قاہر باللہ (محمد ابومنصور)	۳۲۰ ہجری	۹۳۲ عیسوی
۲۰۔	راضی باللہ (محمد ابوالعباس)	۳۲۲ ہجری	۹۳۴ عیسوی
۲۱۔	متقی باللہ (ابراہیم ابواسحق)	۳۲۹ ہجری	۹۴۰ عیسوی
۲۲۔	مستکفی باللہ (عبداللہ ابوالقاسم)	۳۳۳ ہجری	۹۴۴ عیسوی
۲۳۔	مطیع باللہ (فضل ابوالقاسم)	۳۳۴ ہجری	۹۴۶ عیسوی
۲۴۔	طائع باللہ (عبدالکریم ابوبکر)	۳۶۳ ہجری	۹۷۴ عیسوی
۲۵۔	قادر باللہ (احمد ابوالعباس)	۳۸۱ ہجری	۹۹۱ عیسوی
۲۶۔	قائم بامر اللہ (عبداللہ ابوجعفر)	۴۲۲ ہجری	۱۰۳۱ عیسوی

۲۷۔ مقتدی بامراللہ (عبداللہ ابوالقاسم)	۴۶۷ ہجری	۱۰۷۵ عیسوی
۲۸۔ مستظہر باللہ (احمد ابوالعباس)	۴۸۷ ہجری	۱۰۹۴ عیسوی
۲۹۔ مسترشد باللہ (فضل ابوالمنصور)	۵۱۲ ہجری	۱۱۱۸ عیسوی
۳۰۔ راشد باللہ (منصور ابوجعفر)	۵۲۹ ہجری	۱۱۳۵ عیسوی
۳۱۔ مکتفی بامراللہ (محمد ابوعبداللہ)	۵۳۰ ہجری	۱۱۳۶ عیسوی
۳۲۔ مستنجد باللہ (یوسف ابوالمظفر)	۵۵۵ ہجری	۱۱۶۰ عیسوی
۳۳۔ مستضی بامراللہ (حسن ابومحمد)	۵۶۶ ہجری	۱۱۷۰ عیسوی
۳۴۔ ناصرالدین اللہ (احمد ابوالعباس)	۵۷۵ ہجری	۱۱۸۰ عیسوی
۳۵۔ ظاہر بامراللہ (محمد ابونصر)	۶۲۲ ہجری	۱۲۲۵ عیسوی
۳۶۔ مستنصر باللہ (منصور ابوجعفر)	۶۲۳ ہجری	۱۲۲۶ عیسوی
۳۷۔ مستعصم باللہ (عبداللہ ابواحمد)	۶۴۰ ہجری	۱۲۴۲ عیسوی

مصر کے فاطمی خلفاء

۱۔ مہدی عبیداللہ	۲۹۶ ہجری	۹۰۸ عیسوی
۲۔ قائم بامراللہ	۳۲۲ ہجری	۹۳۴ عیسوی
۳۔ منصور بامراللہ	۳۳۴ ہجری	۹۴۵ عیسوی
۴۔ معزالدین اللہ	۳۴۱ ہجری	۹۵۳ عیسوی
۵۔ عزیز باللہ	۳۶۵ ہجری	۹۷۵ عیسوی
۶۔ حاکم بامراللہ	۳۸۶ ہجری	۹۹۶ عیسوی
۷۔ طاہر الاعزاز الدین اللہ	۴۱۱ ہجری	۱۰۲۱ عیسوی
۸۔ مستنصر باللہ	۴۲۷ ہجری	۱۰۳۲ عیسوی
۹۔ مستعلی باللہ	۴۸۷ ہجری	۱۰۹۴ عیسوی
۱۰۔ آمر باحکام اللہ	۴۹۴ ہجری	۱۱۰۱ عیسوی
۱۱۔ حافظ الدین اللہ	۵۲۴ ہجری	۱۱۳۰ عیسوی
۱۲۔ ظافر بامراللہ	۵۲۴ ہجری	۱۱۴۰ عیسوی
۱۳۔ فائز بامراللہ	۵۴۹ ہجری	۱۱۵۴ عیسوی
۱۴۔ عاضد الدین اللہ	۵۵۵ ہجری	۱۱۶۰ عیسوی

قرطبہ کے اُموی خلفاء

۱۔ عبدالرحمٰن اوّل (الداخل)	۱۳۸ ہجری	۷۵۶ عیسوی
۲۔ ہشام اوّل (ابوالولید)	۱۷۲ ہجری	۷۸۸ عیسوی
۳۔ حکم اوّل (المنتصر)	۱۸۰ ہجری	۷۹۶ عیسوی
۴۔ عبدالرحمٰن ثانی (الاوسط)	۲۰۶ ہجری	۸۲۲ عیسوی
۵۔ محمد اوّل	۲۳۸ ہجری	۸۵۲ عیسوی
۶۔ مُنذر	۲۷۳ ہجری	۸۶۸ عیسوی
۷۔ عبداللہ	۲۷۵ ہجری	۸۸۸ عیسوی
۸۔ ناصرالدین اللہ عبدالرحمٰن ثالث	۳۰۰ ہجری	۹۱۲ عیسوی
۹۔ مستنصر باللہ حکم ثانی	۳۵۰ ہجری	۹۶۱ عیسوی
۱۰۔ موید باللہ ہشام ثانی	۳۶۶ ہجری	۹۶۷ عیسوی
۱۱۔ مہدی محمد ثانی	۳۹۹ ہجری	۱۰۰۹ عیسوی
۱۲۔ مستعین باللہ سلیمان	۴۰۰ ہجری	۱۰۰۹ عیسوی
۱۳۔ محمد ثانی (دوسری بار)	۴۰۰ ہجری	۱۰۱۰ عیسوی
۱۴۔ ہشام ثانی (دوسری بار)	۴۰۰ ہجری	۱۰۱۰ عیسوی
۱۵۔ سلیمان (دوسری بار)	۴۰۳ ہجری	۱۰۱۳ عیسوی
۱۶۔ علی بن حمود (ناصرادریسی)	۴۰۷ ہجری	۱۰۱۶ عیسوی
۱۷۔ عبدالرحمٰن رابع (مرتضٰی)	۴۰۸ ہجری	۱۰۱۸ عیسوی
۱۸۔ قاسم بن حمود (مامون)	۴۰۸ ہجری	۱۰۱۸ عیسوی
۱۹۔ یحیٰی بن علی بن حمود (مستعلی)	۴۱۲ ہجری	۱۰۲۱ عیسوی
۲۰۔ قاسم بن حمود (دوسری بار)	۴۱۳ ہجری	۱۰۲۲ عیسوی
۲۱۔ عبدالرحمٰن خامس (مستظہر باللہ)	۴۱۴ ہجری	۱۰۲۳ عیسوی
۲۲۔ محمد ثالث (مستکفی باللہ)	۴۱۴ ہجری	۱۰۲۴ عیسوی
۲۳۔ یحیٰی بن علی بن حمود (دوسری بار)	۴۱۶ ہجری	۱۰۲۵ عیسوی
۲۴۔ ہشام ثالث (معتز باللہ)	۴۱۸ ہجری	۱۰۲۷ عیسوی

روحِ اسلام

میں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ ایک عالمی مذہب کی حیثیت سے اسلام کی تاریخ پیش کروں اور یہ بیان کروں کہ وہ کتنی سُرعت سے دنیا میں پھیلا۔ اس نے کیونکر ایک قلیل مُدّت میں کروڑوں انسانوں کے ضمیروں اور ذہنوں پر ایک حیرت انگیز غلبہ حاصل کر لیا۔ اسلام نے نوعِ انسان کی نشو و نما کو جو فروغ بخشا اُس کا تو عام طور پر اعتراف کیا جاتا ہے۔ لیکن اس نے نوعِ انسانی کی حالت بہتر بنانے کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اُن میں یا تو تجاہل برتا جاتا ہے یا اُن کی کماحقہ قدردانی نہیں کی جاتی۔ اسی طرح اس کی عقلی اساس اور اس کے مقاصدِ غائی کو پوری طرح سمجھا نہیں جاتا۔ میں نے اسلام کا جو تاریخی جائزہ پیش کیا ہے اس میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ تاریخِ ادیان میں اس کا جو حقیقی مقام ہے اُسے واضح کروں۔ اسلام کی عقلی اساس اور اس کے مقاصدِ غائی کا جو مرقع میں نے کھینچا ہے وہ ہے تو بالکل سرسری لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو جو حال ہی میں واقع ہونے والے حادثہ عظیمہ کی پیدا کی ہوئی کشمکشوں کے بعد کسی ایسے تعمیری نظامِ عقائد کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو نفسِ انسانی کو قرار بخش سکے۔

سیّد امیر علی

سیّد امیر علی کی شہرۂ آفاق تصنیف سپرٹ آف اسلام (تاریخ اسلام) کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ایک مغربی اہلِ قلم نے ۱۹۴۳ء میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ عہدِ حاضر کے مصری ادب میں مذہب کے متعلق کسی جدید کتاب کے اتنے حوالے نہیں ملتے جتنے سیّد امیر علی کی سپرٹ آف اسلام کے ہیں۔ ایک اور اہلِ علم کی رائے ہے کہ اسلام کے خلاف اعتراضات کے جواب میں اور اسلام کے حق میں جو کچھ کہا جا سکتا تھا، اسے بڑی خوش اسلوبی سے سپرٹ آف اسلام میں کہہ دیا گیا ہے۔ دنیائے اسلام میں اس کتاب کو بجا طور پر بڑی مقبولیت حاصل ہے۔